ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR
NEW DELHI

Please examine the books before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

DUE DATE

Cl. No. ________ *Acc. No.* ________

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

سالنامہ

۱۲۲

جنوری ۱۹۷۷ء

138

مدیر

محمّد طفیل

ادارۂ فر[illegible]و [illegible] ایبک روڈ [illegible]
انارکلی

قیمت موجودہ شمارہ
۲۰ روپے

ترتیب

طلوع — محمد طفیل
اس شمارے میں — محمد طفیل

منظومات

۱ — لینن گراڈ کا گورستان — فیض احمد فیض ، ۲
۲ — یہ خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا — فیض احمد فیض ، ۳
۳ — پیامِ مشرق سے تراجم — فیض احمد فیض ، ۴
۴ — مری نوا سے جل اُٹھے ہیں بحر و بر پہ چراغ — فراق گورکھپوری ، ۵
۵ — آنے والے منظروں کی نذر — احمد ندیم قاسمی ، ۶
۶ — اہلِ ثروت پہ خدا نے مجھے سبقت دے دی — احمد ندیم قاسمی ، ۷
۷ — اداسیوں کے سوا دل کی زندگی کیا ہے — معین احسن جذبی ، ۸
۸ — ولایتی زعفران (۳۶ نظمیں) — ترجمہ ضمیر جعفری ، ۵۱۷

مقالے

۱ — ابو الکلام آزاد الہلال کے آئینے میں — غلام رسول مہر ، ۹
۲ — مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی — ڈاکٹر محمد سلیم اختر ، ۳۵
۳ — کلیاتِ انشا کے دو قدیم مخطوطے — ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری ، ۶
۴ — انجمن پنجاب کے مشاعرے — ڈاکٹر بیگم صفیہ تمنائی ، ۱۹۷
۵ — سالک کے خطوط ابنِ سالک کے نام — ڈاکٹر عبد السلام خورشید ، ۰
۶ — طفیلیات — ڈاکٹر محمد حسن ، ۱۲۳
۷ — آزادیٔ نسواں — بانو قدسیہ ، ۱۲۶
۸ — نظام رامپوری پرشاد عارفی کی تحقیقات — شبیر علی خان شکیب ، ۱۴۷
۹ — تخلیق کار، تخلیق اور جنون — سلیم اختر ، ۱۶۲
۱۰ — بڑے عروضی ، بڑی غلطیاں — جابر علی جابر ، ۱۷۶

افسانے

۶V0۲

۱ — ایک درخت کا قتل — اختر اورینوی ، ۲۲۳
۲ — روغنی پتلے — مفتی ، ۲۲۷
۳ — سہرا — مستور ، ۲۳۹
۴ — حسن زن ، حسن ظ — احسن فاروقی ،

Accession Number
170421
29.9.93

۵ — پسیتا پھوا کاجل — آغا بابر، ۲۵۰
۶ — نہ آئیں تم کو محبتیں کرنیں — آغا بابر، ۲۶۰
۷ — انتقام — جیلانی بانو، ۲۷۸
۸ — دلی شہر میں ایک حادثہ — کرتار سنگھ دگل، ۴۹۵
۹ — زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا — صالحہ عابد حسین، ۲۸۳
۱۰ — درد کا ایک نیا موڑ — رام لعل، ۲۸۷
۱۱ — آخری سلام — شکیلہ اختر، ۳۰۶
۱۲ — لہو کے مول — شکیلہ اختر، ۳۱۲
۱۳ — سواریاں — جوگندر پال، ۳۲۰
۱۴ — چیونٹی اور راج ہنس — اختر جمال، ۳۲۶
۱۵ — کھلی آنکھ کا سپنا — سائرہ ہاشمی، ۵۰۰
۱۶ — ایک لمحے کا خدا — رتن سنگھ، ۳۳۲

ڈرامے

۱ — لوک ریت — ممتاز مفتی، ۳۲۱
۲ — آنکھیں — قاضی عبدالستار، ۳۳۵
۳ — گوارا ہو نیشِ عشق — آغا بابر، ۳۴۱
۴ — بد دعا — ابو سعید قریشی، ۳۶۸

فکاہیے

۱ — ایک مصرع کا جشنِ اجرا — فکر تونسوی، ۵۷۸
۲ — میر کلو کی گواہی — احمد جمال پاشا، ۴۹۷
۳ — فکر تونسوی کا اغلاط نامہ — مجتبیٰ حسین، ۵۷۱
۴ — بھولنے کی مصیبت — سرور جمال، ۵۱۲

خاکے اور سوانحی مضامین

۱ — میرا دوست، میرا بھائی — منظور الٰہی، ۵۴۶
۲ — سید وقار عظیم — ڈاکٹر معین الرحمٰن، ۵۸۸
۳ — عصمت چغتائی — میرزا ادیب، ۵۵۴
۴ — احمد ندیم قاسمی — رحیم گل، ۵۵۸
۵ — بانو قدسیہ — پروین عاطف، ۵۶۴
۶ — میرزا ادیب — محمد طفیل، ۵۸۴

تبصرے، ۶۲۱

محمد طفیل ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

ہمارے ایک بھائی الٰہ آباد میں رہتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں۔ میں مسلمان، وہ شاعر ہیں۔ میں مُدیر ہوں۔ میرا نام محمد طفیل ہے۔ اُن کا نام رگھوپتی سہائے، میں معروف محمد نقوش کے نام سے ہوں۔ وہ معروف فراق گورکھپوری کے نام سے — نوید کہ اُن کا ایک خط آیا ہے۔

" میرے دل و جگر بھائی طفیل، وہ دن تو آیا کہ میرے دل و دماغ اور کلیجے کے جو دو ٹکڑے ہوگئے تھے جن میں سے ایک پاکستان میں رہ گیا تھا اور صرف آدھا ہندوستان میں، اب وہ دونوں ٹکڑے پھر مل گئے۔ میرا دل و دماغ اور کلیجہ پُورے کا پورا پاکستان میں بھی ہے اور پورے کا پورا ہندوستان میں بھی ہے۔ محبت بڑے سے بڑے فاصلے کی بھی نفی نہیں، شاعرِ اعظم ٹیگور نے کیا خوب کہا ہے کہ ہم کئی ہیں اس لیے اور بھی ہم ایک ہیں۔ کیونکہ جو خلائیں ہمارے ٹکڑے ہو جانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں ہم محبت سے بھر دیتے ہیں۔ کچھ اس سے بڑھ کر عاصی غازی پوری کا یہ مطلع ہے ؎

تمھیں کثرت سے وحدت اور محوِ ذوقِ وحدت ہو
کچھ اس سے اور بڑھ جاؤ تو وحدت ہو نہ کثرت ہو

چنانچہ یہ غزل جو آج سے کئی برس پہلے دس یا بارہ اشعار پر ختم ہو گئی تھی۔ کسی غیبی سبب سے میرے وجدان میں پھر عود کر آئی۔ اور کچھ کم چالیس اشعار کی غزل ہو گئی۔ اب یہ پوری غزل اپنے پیغامِ محبت کے ساتھ آپ کی خدمت میں نقوش کے لیے حاضر ہے۔ بھائی! اب میں موت اور زندگی کے درمیان سانس لے رہا ہوں"۔ آپکا فراق

سنہ ۱۹۷ء میں میری آپا کا بھی ایک خط آیا تھا۔ آپا سے مراد عصمت چغتائی! بے شک میں لاہور میں تھا۔ وہ بمبئی میں تھیں۔ بڑا فاصلہ تھا مگر اس پر بھی کوئی فاصلہ نہ تھا۔ ذہنی قرب کی حدیں آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھنے کی آرزو بھی تھی۔ مگر جلد دیکھ نہ پایا۔ کوئی ۲۶ برس کے گیان دھیان کے بعد آپا خود ہی لاہور آنکلیں۔ پوچھا۔ کہو طفیل کیسے ہو؟ جواب میں میں نے بھی پوچھا آپ کیسی ہیں؟ میرا جواب مختصر تھا۔ مگر آپا کا جواب پُوری ایک کتاب ہے۔ جو میں لکھ لوں تو آپ کو پڑھنے کے لیے دوں۔ بس ذرا فرصت کی بات ہے۔ اس وقت تو میں آپا کے سنہ ۱۹۷ء کے ایک خط کا ذکر کرنے نکلا تھا۔

" طفیل صاحب! آپ کا خط پا کر دل کی عجیب حالت ہوئی۔ کوئی کہانی بغیر چھپی نہیں تھی۔ جلدی سے لکھی کہ آپ کی فرمائش کیسے بھی پُوری ہو جائے۔ بہت جلدی میں لکھی ہے۔ جی چاہتا تھا کوئی بڑی چیز بھیجتی مگر مہلت نہیں ہے — اور سنو دروازے ضرور کھلیں گے۔ پچیس برس سے انتظار ہے۔ ہم لوگ یہاں زمین ہموار کر رہے ہیں۔ دراصل اب تک کچھ کیا بھی تو نہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ دونوں ملک کوئی راستہ نکالیں۔ دونوں طرف محبت بھرے دل ہیں۔ پھر یہ دُوریاں کب تک؟ پُرسانِ حال کو سلام! پورے پاکستان کو دعائیں اور سلام"۔ عصمت

خدا کرے یہ پیار کی کہکشاں سدا سلامت رہے۔ صرف ذرا سی بات ہماری طرف سے کہ "ہمیں اپنی آزادی بڑی عزیز ہے۔ ہم دونوں ایک ہیں" کے نعرے کا بھی ساتھ نہیں دے سکتے۔"

بقول فراق گورکھپوری دل و دماغ اور کلیجے کے ٹکڑے پھر مل گئے ہیں۔ عصمت چغتائی کی خواہش کے مطابق دروازے کھل گئے ہیں — مگر میرے کرمفرماؤ! پیار کے جو راستے کھُل گئے ہیں۔ اب اُن راستوں سے ٹینکوں اور توپوں کا گزر نہ ہو۔

محمد طفیل

عصمت چغتائی

ادارۂ نقوش
کی ایک تقریب میں

لاہور کے نامور ادبا و شعرا
نے ان کا استقبال کیا۔

خطبۂ صدارت

جسٹس عطا اللہ سجّاد

خواتین و حضرات، میں آپ کی اِس غلط بخشی کے لئے بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے
تقریب کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ میں نے جناب محمد طفیل سے عرض کیا تھا کہ اس اجتماع می
ادیبوں۔ شاعروں اور صحافیوں کی ایک کہکشاں دورِ حاضر کی عظیم اُردو افسانہ نویس محترمہ عصم
کو خوش آمدید کہنے کے لئے موجود ہوگی۔ میرے جیسے انگارۂ نیم سوز کی موجودگی ماحول کی
برقرار نہیں رکھ سکے گی لیکن انہوں نے یہ عذر تسلیم نہ کیا اور مجھے اُن کے اصرار کے سامنے جھ
پڑا۔

خواتین و حضرات! میں نے اخبارات میں پڑھا کہ عصمت چغتائی آجکل لاہور میں موج

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے لے کر آج تک لاہور میں کونسی ادبی محفل تھی جس میں وہ موجود نہیں تھیں۔ وہ جغرافیائی حدود کے علی الرغم روسی ادبی تحریک کا حصہ تھیں جو لاہور، علی گڑھ اور دلی سے اُٹھی۔ اُن کا متحرک اور جیتا جاگتا فن ان تمام سالوں میں اُن کی نمائندگی لاہور اور پنجاب کے ادبی گوشوں میں کرتا رہا۔ وہ اُردو ادب کے نئے دور کے طائران پیش رس میں سے تھیں۔ یہ وہ دَور تھا جب اُردو ادب میں نئی نسل کی بغاوت کے نتیجے میں نئے نئے تجربات ہو رہے تھے اور نئی نئی تحریکات جنم لے رہی تھیں۔ ادھر فیض اور راشد کی شاعری بوسیدہ دبستانوں کو للکار رہی تھی، اُدھر منٹو اور عصمت چغتائی نے اُردو افسانوی ادب کو سینما کے اثرات اور الف لیلے کی جھوٹی رومانیت سے آزاد کیا۔ ایک شور مچ گیا۔ علم و ادب کے اجارہ داروں نے فیض اور راشد کے تجربات کو الحاد سے تعبیر کیا اور راشد کی شاعری کو چونکہ وہ ہئیت اور اور تجربہ کے لحاظ سے بالکل نئی چیز تھی۔ وفور استہزا سے ہلاک کرنا چاہا۔ منٹو اور عصمت چغتائی کے فن پر عریانی کی چھاپ لگانے کی کوشش کی گئی اور عصمت کے متعلق بالخصوص کہا گیا کہ عورت ذات ہو کر 'لحاف' ایسے افسانے لکھتی ہے ـــ انہوں نے 'عریانی عریانی' کا نعرہ اس کثرت

سے بلند کیا کہ جیسے انہوں نے اپنے آپ کو ادبِ اردو کے حمام میں ننگے دیکھ پایا ہے۔

عصمت کے نقاد یہ بھول گئے کہ ادب خواہ کسی زبان کا ہو جب تک آفاقی اقدار کا حامل نہ ہو ایک بوسیدہ کھنڈر کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ عصمت نے اردو افسانے کو داستانِ امیر حمزہ اور فسانۂ آزاد کی تنگنائیوں سے نکال کر فطرتِ انسانی کی وسیع دنیا میں لا کھڑا کیا۔ اس سلسلہ میں ان کا عورت ہونا ان کے فن کی افادیت پر اثر انداز نہیں ہوتا لیکن یہ ضرور ہے کہ جس زمانے میں انہوں نے اردو افسانہ کو نئی ڈگر پر چلایا اور اسے نفسیاتِ انسانی کی نئی نئی راہوں سے روشناس کرایا اُس زمانے میں کسی درمیانہ درجہ کے مسلمان گھرانے کی عورت کے لئے ایسا کرنا الحاد اور زندقہ سے کم نہیں تھا۔ عصمت صاحبہ میں چغتائی خون ہے۔ انہوں نے اپنے وقت کے اردو ادب پر نظر ڈالی تو روایت اور کھوکھلے پن کی سڑاند کے سوا اور کچھ نہ پایا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ماحول، اپنے عورت پن کو بالائے طاق رکھ کر جرأتِ مردانہ سے کام لیتے ہوئے فطرتِ انسانی کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا کہ قدامت پسند منافقین جو زندگی کے حقائق سے منہ چرانے کے عادی تھے منہ پر رومال رکھ کر بیٹھ گئے۔

عصمت چغتائی کے فن نے اپنے علم و فضل سے اردو ادب کی دنیا میں جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ ان کا شمار رہتی دنیا تک اردو کے عظیم افسانہ نگاروں میں ہوگا۔ ہماری نئی نسل میں ان کی تقلید میں لاتعداد

فیض احمد
فیض

عصمت
چغتائی

افسانہ نگار پیدا ہوئی ہیں اور اُن سے متاثر بھی ہوئی ہیں۔ لیکن اُن کا سا اسلوب نہیں اپنا سکیں عورت کی اکثریت ابھی تک بیمار رومانیت سے نجات نہیں پا سکی۔ ہندوستان میں تو شاید رسم الخط اور تلفظ کی تبدیلی کی وجہ سے اُردو زبان کا مستقبل کچھ اتنا اُمید افزا نظر نہیں آتا لیکن پاکستان کی نئی نسل اُن سے اکتساب کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے لئے ایسا عالمی ماحول پیدا کر سکیں جو عصمت نے گہرے مطالعہ سے اپنے لئے پیدا کیا تھا۔ اگر پاکستان کے پبلشر عصمت کی تصنیفات طبع کرنے پر آمادہ ہوں اور اس سلسلہ میں محترمہ عصمت چغتائی کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ اُردو ادب کی بے حد خدمت ہوگی۔

مجھے فخر اور خوشی ہے کہ آج مجھے اُردو کی اِس عظیم افسانہ نویس سے روبرو ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جو ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے اور جس کا ادب دُنیا کی کسی زبان کے ادب سے کم تر نہیں۔

مَیں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جنابہ عصمت چغتائی سے غالب کی زبان میں کہتا ہوں

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

جسٹس عطاء اللہ سجاد   محمد طفیل   عصمت چغتائی

عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، محمد طفیل

احمد ندیم قاسمی کی ۶۰ ویں سالگرہ پر

پاکستان کے ہر شہر میں جشن منائے گئے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ ساری ہی دنیا کے اہل قلم، اس خوشی میں شریک ہوئے

احمد ندیم قاسمی ڈاکٹر سید عبداللہ محمد طفیل

مزاح نگار سید ضمیر جعفری

افسانہ نگار آغا بابر

اس شمارے میں

آج اس شمارے میں جو کچھ بھی ہے۔ اس کا ذکر کروں گا۔ [illegible] سے ہٹ کر، ان باتوں کا ذکر کیا جو شمارے میں موجود ہوتی تھیں۔ مسلّمات بدل گئے۔ ہم کیوں نہ بدلیں؟

بندہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ شمارہ بھی، تاخیر سے آپ تک پہنچا۔ کیا عرض کروں کہ ماجرا کیا ہے۔ بس اتنا جان لیجیے کہ بکھر کے رہ گیا ہوں۔ بکھرنا دل کا نہیں، دماغ کا بھی نہیں۔ یہ تہمت ہجومِ کار کے سر ہے۔ بہرحال اب اپنے آپ کو پھر سے سمیٹ رہا ہوں۔

میں اپنے طور پر رسولؐ نمبر کی تیاریوں میں مگن تھا۔ مضامین لکھوائے بھی جا رہے تھے۔ اُن کی کتابت بھی ہو رہی تھی۔ ایک مرحلے پر جا کر یہ بھی سوچا کہ گرہ میں جو کچھ ہے۔ اگر اتنا کچھ بھی اہلِ نظر کے سامنے پیش کر دوں تو بھی بات بن جائے گی مگر کسی طاقت نے مجھے روکا۔ اتنی جلدی کیوں؟ وہ کونسی طاقت ہے۔ میں نہیں جانتا۔ اس وادیٔ عشق میں کچھ عرصہ اور قیام رہے۔ یہی اذن ہے۔

یہ وادی وہ ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ جتنی مسافت بھی طے ہو جائے۔ وہی نیک بختی، تکمیل کی خواہش ایسی، جیسے آسمان پر تارے گننے کا شغل، بہرحال بساط بھر کوشش جاری رہے گی۔ اس وقت تک بارہ سو صفحات کی کتابت ہو چکی ہے۔ کوئی چار جلدوں میں یہ چاند ہویدا ہوگا۔

یہ بات تو تھی رسول نمبر کی۔ اعلان ہُوا ہے کہ یہ سال علّامہ اقبال کا ہے۔ سوچا ہے کہ ساتھ ساتھ اس عاشقِ رسولؐ کے بارے میں بھی ایک نمبر پیش کرنا چاہیے۔ یہ انسب بھی ہے اور فرض بھی، اگر ہم غالب کے بارے میں تین شمارے چھاپ سکتے ہیں (چوتھا مرتب شدہ رکھا ہے) تو اقبال کے بارے میں بھی بہت کچھ چھاپ سکتے ہیں۔

سر عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچے میں لکھا تھا کہ "غالب کی روح نے عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا" میں یہ کہتا ہوں کہ اگر اقبالؔ غالبؔ ہی کی روح ہیں۔ تو اللہ نے دوبارہ جنم پر، آدھے مسلمان کو پورا مسلمان بنا کر بھیجا۔ پھر مسلمان بھی ایسا کہ ساری دنیا اس پہ ناز کرے۔ بہرحال ہم جلد ہی اقبال نمبر پیش کریں گے اور انشاءاللہ اقبالؔ پر ہونے والے جملہ کاموں میں اس کی اہمیت بھی ہوگی۔

پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ ہم اپنے سابقہ نمبروں کے نئے ایڈیشن چھاپ رہے ہیں۔ جوں کے توں نہیں بلکہ کچھ اضافے کر رہے ہیں اور کچھ حذف، بہرحال پہلے جن کوتاہیوں نے راہ پا لی تھی۔ ان سے بچاؤ کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ وہ نمبر جب سامنے آئیں گے تو وہ نئے نمبر ہوں گے۔ پرانے نمبر نہ ہوں گے۔ غزل نمبر اور شخصیات نمبر پہلے نذر کروں گا۔ ان نمبروں کو ہم نے لائبریری ایڈیشن کا نام دیا ہے۔ کیونکہ وہ حوالے کی دستاویزیں ہوں گی۔ کئی کئی جلدوں میں اچھے کاغذ پر اور کئی کئی رنگوں کی چھپائی سے آراستہ!

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ان دنوں، میں دوسرے موضوعات میں مگن تھا کہ اچانک مجھے یہ شمارہ چھاپنا پڑا۔ ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنی گدڑی اُٹھاؤں اور اس میں جتنے لعل ہوں۔ وہ سب آپ کی نذر کر دوں اور اس کے بعد پھر اپنے انہی کاموں کی طرف لوٹ جاؤں کہ جو ادب کا بھی مقدر ہوں اور میرا بھی۔

محمد نقوش

لینن گراڈ کا گورستان

فیض احمد فیض

(لینن گراڈ شہر کے قریب ایک وسیع و عریض سبزہ زار میں دہ لاکھوں شہری مدفون ہیں جو گزشتہ جنگ عظیم کے دوران اس شہر کے سہ سالہ محاصرے کے دوران کام آئے تھے، مختلف روشوں پر پتھر کے کتبے نصب ہیں۔ جن پر کسی کا نام نہیں صرف سن درج ہے، مرنے والوں کے اعزا اور سب نو بیاہتا جوڑے ان کتبوں پر پھول چڑھانے آتے ہیں، آخر میں ایک معمر خاتون کا مجسمہ نصب ہے، جو دونوں ہاتھوں میں ایک ہار لیے کھڑی ہے)

سرد سلوں پر
زرد سلوں پر
تازہ گرم لہو کی صورت
گلدستوں کے چھینٹے ہیں
کتبے سب بے نام ہیں لیکن
ہر اک پھول پہ نام لکھا ہے
غافل سونے والے کا
یاد میں رونے والے کا
اپنے فرض سے فارغ ہو کر
اپنے لہو کی اوڑھ کے چادر
سارے بیٹے خواب میں ہیں،
اماں اکیلی جاگ رہی ہے،

اگست ۶۴ء

فیض احمد فیض

یہ کس خلش نے پھر اِس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

غمِ جہاں ہو، رُخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ، قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا

خوشا، کہ آج ہر اک مدّعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

وہ حیلہ گر جو وفا جُو بھی جفا خو بھی
کیا بھی فیضؔ، تو کس بُت سے دوستانہ کیا

؁۷۶ء

پیامِ مشرق سے تراجم

فیض احمد فیض

سحر می گفت بلبل باغباں را
دریں گِل جز نہالِ غم نگیرد
بہ پیری می رسد خارِ بیاباں
ولے گُل چوں جواں گردد بمیرد

سحر کہتی تھی بلبل باغباں سے
یہاں بس غم کا بوٹا بارور ہے
بہت جیتا ہے یاں خارِ بیاباں
حیاتِ گل بہت ہی مختصر ہے

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نرنجی با تو گویم
صنم از آدمی پایندہ تر بود

برہمن نے کہا محشر میں رب سے
مرا جینا تو اک رقصِ شرر تھا
میں سچ کہہ دوں بُرا گر تُو نہ مانے
ترے بندے سے بُت پایندہ تر تھا

گزشتی تیز گام اے اخترِ صبح
مگر از خوابِ ما بیزار رفتی
من از ناآگہی گم کردہ راہم
تو بیدار آمدی، بیدار رفتی

تو گزرا تیز گام اے اخترِ صبح
سرہانے سے مرے بیزار گزرا
میں رہ گم کر گیا غفلت سے اپنی
تو بیدار آیا اور بیزار گزرا

—

ز رازی معنیٔ قرآں چہ پُرسی
ضمیرِ ما بآیاتش دلیل است
خرد آتش فروزد، دل بسوزد
ہمیں تفسیرِ نمرود و خلیل است

نہ پوچھ حضرتِ رازی سے معنیٔ قرآں
کہ میری ذات ہے خود اسکی آیتوں پہ دلیل
خرد سے آگ بھڑکتی ہے، دل سلگتے ہیں
یہی ہے قصۂ نمرود اور حدیثِ خلیل

فراق گورکھپوری

○

مری نوا سے جل اُٹھتے تھے بحر و بر پہ چراغ
کہاں سے لاؤں عزیزو، مگر وہ دل وہ دماغ
یہ نرم نرم ہوا، جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
بدن جہانِ تبسم ہے سر سے تا بہ قدم
جہاں سے دیکھیں اسے مسکرا رہے ہیں چراغ
ترے جمال سے دُنیائے عشق رنگا رنگ
ترے خیال سے سینوں میں لہلہاتے ہیں داغ
دلوں کو ترے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جھلملا اُٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ
جھلکتی ہے کھنچی شمشیر میں نئی دنیا
حیات و موت کے ملتے نہیں ہیں آج دماغ
حریفِ سینۂ مجروح و آتشِ غمِ عشق
نہ گُل کی چاک گریبانیاں نہ لالے کے داغ
وہ جن کے حال میں، لَو دے اُٹھے غمِ فردا
وہی ہیں انجمنِ زندگی کے چشم و چراغ
تمام شعلۂ گُل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ
سرے سے بزم میں انگڑائیوں کا یہ عالم
یہ بادِ صبح کی موجیں یہ جھلملاتے چراغ
حکومت اہلِ حماقت کی اہلِ دانش پر
وہ خر دماغ کہ ملتے نہیں ہیں جن کے دماغ
نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
سُنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اُٹھے ہیں چراغ

جو تہمتیں نہ اٹھیں اک جہاں کو ان کے سمیت
گناہگارِ محبت نکل گئے بے داغ
پھری جن اہلِ نظر سے تری نگاہِ کرم
اب ان سے آنکھ چراتے ہیں بام و در کے چراغ
مری نظر میں ہیں سب جلوہ ہائے ظلمت و نور
نہ ہر اندھیرا اندھیرا نہ ہر چراغ چراغ
مجھے بہار و خزاں کیا ہے کچھ نہیں معلوم
میں کہہ رہا ہوں غزل اور کھلتے جاتے ہیں باغ
لگاؤ کان کہ عیسیٰ نفس ہے سازِ غزل
ہر ایک شعر سے جلتا ہے زندگی کا چراغ
وہ سر سے تا بہ قدم ہے بہار کی تصویر
وہ عضو عضو گلستاں بغل میں سیکڑوں باغ
دیوالی آج غریبوں کے گھر بھی ہے لیکن
قریب ہو کے بھی ہیں ان سے کتنی دور چراغ
جلا گیا تھا انھیں کب تبسمِ پنہاں
کہ زخم زخم ہیں اب تک یہ تھرتھراتے چراغ
تلاشِ دوست میں، میں ہوں ازل سے سرگرداں
اسی تلاش سے پانے لگا ہوں اپنا سراغ
یہاں کسی کو بھی ملتا نہیں پتہ اپنا
میں ہوں وہاں کہ خود اپنے کو ڈھونڈتے ہیں چراغ
گناہِ عشق کی معصومیاں جز اک اللہ
سیاہ نامۂ اعمالِ عشق ہے بے داغ
شراب خانہ کی مٹی سے ہے سرشت مری
کہ ذرّے ذرّے سے میرے چھلک رہے ہیں ایاغ
مرا کلام سراسر ہے صبحِ نَو کی نوید
کہ اب تو لینے لگا ہچکیاں فسردہ چراغ
مجھے بھی آج مری موت نے، مجھے پوچھا
مجھے بھی ملنے لگا آج زندگی کا سراغ
ملا لو شاعرِ آوازِ، درد سے آواز
اس اک چراغ سے تم بھی جلا لو اپنے چراغ
وطن رہ کے بھی غربت کا ہے وہی عالم
دھواں دھواں سی ہیں شامیں اداس اداس چراغ
شبِ سیاہ میں بن بیٹھے ہیں جو مشعلِ راہ
بہت اندھیرے وہ دل ہیں بہت اندھیرے داغ

دیارِ ہند ہے، یا کوئی مرکزِ دریافت
کہ پا سکی ہے یہیں زیست، زندگی کا سراغ
تمام دھر میں بادِ فنا کے جھونکے ہیں
کوئی بتاؤ کہاں جا کے میں جلاؤں چراغ
جہانِ راز ہوئی جا رہی ہے آنکھ تری
کچھ اس طرح وہ دلوں کا لگا رہی ہے سراغ
تمام جسم میں عالم ہے جگمگاہٹ کا
کہ عضو عضو میں پیہم لہک رہے ہیں چراغ
زمانہ کود پڑا آگ میں یہی کہہ کر
کہ خون چاٹ کے ہو جائے گی یہ آگ بھی باغ
نگاہیں مطلعِ نو پر ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ
دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ
رہے گی یاد، دلوں کو یہ نرمیِ گفتار
بجھائے سے نہ بجھیں گے یہ جھلملاتے چراغ

فراقؔ بزمِ چراغاں ہے محفلِ ساقی
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

آنے والے منظروں کی نذر

احمد ندیم قاسمی

سنہرے، ڈوبتے سورج نے
قرطاسِ فلک پر
اک عجب تصویر کھینچی ہے —
مگر تصویر میں جو رنگ برتے ہیں شعاعوں نے
وہ کچے ہیں —
انھیں الفاظ میں محفوظ کر کے
آنے والے منظروں کی نذر کرنا
انتہائے فن پرستی بھی ہے
خلاقی بھی
اور فن کی دیانت بھی
عبادت بھی

جو بادل دور ہیں
لاکھوں کروڑوں کوس پر ہیں —
اور جو نزدیک ہیں
ان کو اگر چھو لو
تو پوریں رنگ جائیں سات رنگوں میں —
قریب و دور میں جو فاصلہ ہے
اس میں گہرا اور نیلا اور چمکیلا فلک یوں پُرسکوں ہے

جیسے تا حدِ نظر پھیلے سمندر پر سے جب کشتی گزر جائے
تو وہ آسودگی کی سانس لیتا ہے

جو بادل دور ہیں
اب تک طلائی تھے، مگر اب زرد ہیں —
اور جو نزدیک ہیں
اب تک گلابی تھے، مگر اب شعلہ وش ہیں —
اور نیلا آسماں اب سبز ہے
اب سرمئی ہے
اب فقط لا انتہائی کے خلا کا ایک صحرا ہے —
جو بادل زرد تھے
اب کھلتے جاتے ہیں —
جو بادل شعلہ وش تھے
بجھتے جاتے ہیں —
اُدھر مشرق سے جو سیلابِ شب اُمڈا ہے،
سنّاٹے کی لہروں کی زبانوں سے
گئے خورشید کی اقلیمِ فن کو چاٹ لیتا ہے

مگر طغیانِ تاریکی کے اس آشوب میں
پہلا ستارہ آسماں پر جب چمکتا ہے
تو وہ اپنی ہنسی پہ ضبط کرتا،
نرم سرگوشی میں کہتا ہے
کہ سورج ڈوبتا کب ہے !!

احمد ندیم قاسمی

○

اہلِ ثروت پہ خدا نے مجھے سبقت دے دی
اُس کی رحمت نے قلم کی مجھے دولت دے دی
خیمہ زنِ حسن کو دیکھا افقِ فردا پر
میں نے فن میں، اِسی اک خواب کو وسعت دے دی
وہ کبھی مہر، کبھی ماہ، کبھی دن، کبھی رات
اتنی کثرت کو مرے ذوق نے وحدت دے دی
اپنے اللہ سے شکوے کا محل ہو تو کروں
غم دیے — ساتھ ہی غم سہنے کی راحت دے دی
اس کا احساں، کہ جو نفرت کا ہدف ہیں کب سے
مجھ کو اُن خاک نشینوں کی محبت دے دی
مجھ سے کافر پہ فرشتے کا اُترنا ہی غضب
پھر ستم یہ — اُسے انسان کی سیرت دے دی
آئنہ دیکھتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا
عشق نے جیسے مجھے بھی تری صورت دے دی
علم نے آخری نکتہ مجھے یوں سمجھایا
لے کے تکمیل کی نخوت — مجھے حیرت دے دی

معین احسن جذبی

○

اُداسیوں کے سوا دل کی زندگی کیا ہے
کسے بتائیے خوابوں کی برہمی کیا ہے

کبھی چمن سے جو گزرے چمن سے خود پوچھے
صبا مزاجِ چمن ہم سے پوچھتی کیا ہے

یہ تیرگیٔ مسلسل ہزار بار قبول
مگر یہ دُور چراغوں کی روشنی کیا ہے

یہ اہلِ دل کہ اُڑاتے ہیں میرے غم کا مذاق
یہ بے حسی جو نہیں ہے تو بے حسی کیا ہے

نہ پُوچھ مجھ سے جو کارِ ثواب میں ہے مزہ
یہ پُوچھ مجھ سے گناہوں میں دلکشی کیا ہے

مشامِ جاں نہ معطّر ہو جس سے وہ گل کیا
جو نشّہ لا نہ سکے وہ شراب ہی کیا ہے

نظر سے دُور ہے جذبی سوادِ منزل تک
نہ جانے ذوقِ طلب میں مرے کمی کیا ہے

ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینے میں

مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر اپنی زندگی میں دو چار کام اور بھی کرنا چاہتے تھے۔ افسوس کہ مہلت نہ ملی۔ ادب کا زیاں ہو گیا مثلاً —— تاریخ صحافت پر کام شروع کر دیا تھا۔ دفتر لکھ گئے تھے۔ دوسرے وہ ڈائری بھی نکال رکھی تھی جو علامہ اقبال سے متعلق یادداشتوں پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب سامنے آجاتی تو بڑے عقدے کھلتے۔ تیسری کتاب "ابوالکلام آزاد کے سوانحی حالات" پر سپرد قلم کر رہے تھے کہ پیغام آگیا۔ جتنے صفحات لکھے تھے وہ مولانا محمد عالم کے وسیلے اور مولانا مہر کے لواحقین کی نوازش سے قارئین کی نذر ہیں۔ (ادارہ)

—— (پہلا باب) ——

ولادت و خاندان

ولادت: احمد نام، محی الدین لقب، ابوالکلام کنیت جس نے شہرت نام کی بنا پر علم کی حیثیت حاصل کر لی، آزاد تخلص۔ ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے۔ خود فرماتے ہیں:-

"یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا، خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد مدعو بابی الکلام ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ ہجری میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔ الناس نیام، اذا ماتوا انتبھوا:-

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ، غنودیم[1]

مولانا نے ولادت کا مہینا اور سال تحریر فرما دیا۔ یوم ولادت کا ذکر میرے علم کی حد تک کہیں نہ کیا۔ ایک مرتبہ میرے ساتھ مختلف مسائل پر بات چیت ہو رہی تھی۔ یوم ولادت کا مسئلہ بھی زیر غور آیا۔ چند لمحوں کے تامل کے بعد فرمایا: ذوالحجہ کی آٹھویں یا نویں تاریخ تھی، یعنی ۱۶ یا ۱۷ اگست ۱۸۸۸ء بروز جمعہ یا شنبہ۔

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرعہ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا:

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد"[2]

---

[1] "تذکرہ" طبع اول ص ۲۸۷۔ اس کتاب میں تمام حوالے طبع اول ہی کے ہیں۔ شعر غزالی مشہدی کا ہے۔

[2] "تذکرہ" ص ۲۸۸۔

دوسری جلد کا المیہ: "تذکرہ" کی پہلی جلد چھپ گئی۔ اس زمانے میں مولانا نظر بند تھے۔ دوسری جلد کا مسودہ نیز پہلی جلد سے الگ کی ہوئی تین فصلیں اور چار فٹ نوٹس فضل الدین احمد مرزا ہی کے پاس تھے۔ پہلی جلد چھپ جانے کے بعد دوسری جلد کی طباعت سے جو انقطاع و توقف کا سبب غالباً یہ تھا کہ پہلی جلد کی فروخت سے کچھ سرمایہ واپس آ جائے تاکہ دوسری کے مصارف طباعت برداشت کیے جا سکیں۔ اسی اثنا میں اچانک مرزا مرحوم کو کاروبار چھوڑ کر پنجاب لوٹنا پڑا جو ان کا وطن تھا (غالباً ضلع گورداسپور کا کوئی مقام)۔

مولانا ۱۹۱۹ء کے اواخر میں رانچی کی نظر بندی سے رہا ہوئے اور اوائل جنوری ۱۹۲۰ء میں کلکتہ پہنچے۔ اسی میں تاخیر ہی کے باعث وہ امرتسر کے اجتماعات میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ ادھر مجلس خلافت بنگال نے ۲۸ اور ۲۹ فروری کو صوبائی خلافت کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا جس میں مولانا کو صدر منتخب کیا گیا۔ چنانچہ مولانا کلکتہ پہنچتے خطبہ صدارت کی ترتیب میں مصروف ہو گئے۔ جس میں مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کے بعد آئندہ کے لئے پروگرام کا خاکہ بھی پیش کر دیا تھا اور یہی خطبہ ہے جو شرعی اور دینی نقطۂ نگاہ سے ترک موالات (جسے تحریک لاتعاون بھی کہتے ہیں) کی واحد اور جامع دعوت بنا رہا اور یہ ایک ہی چراغ تھا، جس سے بے حد و شمار فداکاران قوم و ملت نے اپنے دیئے روشن کئے اور ہندوستان کی وسیع سرزمین میں تحریک آزادی کے لئے ایسے چراغاں کا انتظام ہو گیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

مولانا کی قومی مصروفیات بڑھتی گئیں۔ وہ دل میں مطمئن ہوں گے کہ مسودہ فضل الدین احمد مرزا کے پاس موجود ہے، جب فرصت پائیں گے تو اسے منگا کر چھاپ دیں گے۔ مرزا مرحوم کے متعلق مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ وہ دور ترک موالات میں بلدیہ لودھیانہ کے سیکرٹری مقرر ہو گئے تھے۔ غالباً وہاں بھی مولانا کی ذات گرامی سے ان کا تعلق ہی سب سے بڑی سفارش بنا ہو گا۔ کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے وطن میں انتقال کیا۔ مولانا تحریک ترک موالات میں قید ہو گئے۔ رہائی کے بعد اس مسودے کے حصول کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا تھا کہ آدمی بھی مرزا مرحوم کے وطن بھیجے گئے تھے، لیکن مسودہ نہ مل سکا اور یہ نہایت قیمتی مجموعہ ضائع ہو گیا۔ اسے نہایت دردناک المیہ قرار دینے میں کسے تامل ہو سکتا ہے؟

داستان درد: لیکن مولانا کو تو پے در پے ایسے کئی المیے پیش آئے، جن میں ان کی نہایت قیمتی تالیفات تلف ہو گئیں۔ یہ داستان درد انہوں نے کئی مقامات پر بیان فرمائی ہے:-

ا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ حدود بنگال سے اخراج کا حکم پا کر رانچی روانہ ہوئے تو تفسیر (البیان) کے چھ فارم چھپ چکے تھے اور ترجمہ قرآن کی کتابت شروع ہو رہی تھی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ پریس بدستور جاری رہے اور ترجمہ و تفسیر کی طباعت میں کوئی خلل نہ آئے لیکن ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو انھیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ یوں طباعت کا وہ کام رک گیا۔

ب۔ پھر دو مرتبہ کلکتہ میں ان کے پریس اور سکونتی مکان کی تلاشی ہوئی اور مسودات نیز مطبوعہ فارم پولیس اٹھا کر لے گئی۔ ان میں ایک ہزار کے قریب یادداشتوں کے کاغذات بھی تھے جنھیں وہ دماغ کا حاصل اور زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے اور یہ تحریرات عربی یا فارسی میں تھیں۔ پھر انھیں نہ احتیاط سے اٹھایا گیا اور نہ احتیاط سے رکھا گیا۔ یہاں تک پولیس کے دفتر میں دو مرتبہ آگ لگی اور ان کاغذات کے مختلف حصے جل گئے۔ نیز یادداشتوں کی ترتیب درہم برہم ہو گئی۔ رانچی میں بھی تلاشیاں ہوئیں۔ جن مکمل یا قریباً مکمل کتابوں کا

ذکر مولانا نے فرمایا ہے ان کی فہرست ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ تاریخ معتزلہ ۔ ۲۔ سیرۃ شاہ ولی اللہ ؒ ۔ ۳۔ دیوان شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ

۴۔ دیوان غالب اردو پر تبصرہ ۔ ۵۔ خصائص مسلم ۔ ۶۔ امثال القرآن ۔

۷۔ مقدمہ تفسیر کے نامکمل اجزا ۔ ۸۔ ترجمان القرآن کا مسودہ سورہ ہود تک ۔ ۹۔ تفسیر "البیان" سورہ نسا کے ابتدائی حصے تک

۱۰۔ وحدت قوانین کائنات ۔ ۱۱۔ قانون انتخاب طبیعی اور معنویت کائنات ۔ ۱۲۔ اتحاف النلف ۱۳۔ الکلم الطیب ۔

۱۴۔ القول الثابت ۔ ۱۵۔ سیرۃ مجدد ؒ ۱۶۔ سیرۃ طیبہ صرف قرآن مجید سے ۔

یادداشتیں ان کے علاوہ تھیں ۔ یہ سب کچھ تلاشیوں میں برباد ہو گیا ۔ چھپی ہوئی تفسیر کے مختلف فرموں میں سے ایک فرمہ مطبع کی کسی مشین میں رہ گیا تھا ، جسے مولانا کی وفات کے بعد "ام القرآن" (تفسیر سورۂ فاتحہ) کے ساتھ چھاپا گیا ۔ وہ بالکل بجا فرماتے ہیں کہ :

> لوگوں نے گوشہ ہائے چمن کے سکون اور کتب خانوں کے بے خلل استغراق میں علم و نظر کے مرحلے طے کیے ہیں ، لیکن یہاں جو کچھ پیش آیا یہ تھا کہ سیاسی و ملکی صف آرائیوں کے ہنگامے تھے یا نظر بندی کی سختیاں اور قید خانے کی کوٹھڑیاں تھیں تاہم دماغ اپنے کاموں میں مشغول اور فکر اپنی کاوشوں میں سرگرم تھا ۔

پھر فرماتے ہیں :

> ایک طرف میں اپنا سرمایہ فکر جمع کرتا جاتا تھا ، دوسری طرف دست برد زمانہ اسے پوری بے دردی کے ساتھ منتشر کرتا جاتا تھا ، چونکہ یہ اپنی اختیار کردہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا اس لئے صبر کے سوا چارۂ کار بھی نہ تھا :
>
> ایں کار چہ خود کردم ، با خود چہ توانم کرد ؟

یہ نقصان مولانا کا نہ تھا ، پوری ملت بلکہ پورے عالم انسانیت کا نقصان تھا ۔ جس کے دل و دماغ کی تیرگی اور فکر و نظر کی ژولیدگی کے لیے خدا جانے روشنی اور سلجھاؤ کے کیسے کیسے سامان تھے ۔

(دوسرا باب)

خاندان کے علمی رشتے

تین خاندان : مولانا نے "تذکرہ" کے آغاز میں فرمایا ہے :

> میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں ۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواہش نہیں کی ، لیکن دنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انہوں نے قبول کیا اور کبھی رد کر دیا[1]

---

[1] تذکرہ ص ۳ ۔

"مولاناؒ بن شیخ خیرالدین، بن شیخ محمد ہادی، بن شیخ محمد افضل بن شیخ محمد محسن[1]

ان میں سے زیادہ تر اصحاب کے صرف نام معلوم ہیں، حالات معلوم نہیں۔ بلکہ یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ شیخ محمد محسن کے پیشتر کے بزرگوں کا وطن بھی دہلی ہی تھا یا دوسرے سیکڑوں خاندانوں کی طرح مولانا کا خاندان بھی کسی بیرونی مقام سے اٹھ کر دہلی میں سکونت پذیر ہو گیا تھا تاکہ ملک کے اس سب سے بڑے مرکزی شہر میں علم و ارشاد کی بہتر اور وسیع تر خدمات انجام دے سکے۔

مولانا کے والد ماجد نے ان سب کے حالات و مناقب فراہم کر لیے تھے اور ایک رسالہ مرتب فرما دیا تھا[2] جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ ہم قرائن سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیخ محمد محسن کی ولادت اٹھارویں صدی کے دوسرے یا تیسرے عشرے میں ہوئی ہو گی جب محمد شاہ تکرانی کا تخت سنبھالے بیٹھا تھا۔ اگرچہ سلطنت مغلیہ میں فساد و انتشار کا عمل جاری ہو چکا تھا۔ تاہم اس کی ساکھ تخریب کی اس منزل پر نہیں پہنچی تھی جس پر محمد شاہ کے آخری دور میں نادر شاہ افشار اور احمد شاہ درانی کی یورشوں سے پہنچ گئی تھی اور لال قلعے ہی نہیں بلکہ شمالی ہند کے بیشتر مقامات کے در و دیوار کی زبان حال اس شکوے کے لیے وقف تھی:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

شیخ محمد محسن کے صاحبزادے شیخ محمد افضل نے جنھیں آبائی خاندان میں سے علم و طریقت کے اعتبار سے اولین سربرآوردہ شخصیت قرار دیا گیا ہے[3]۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ پایا ہوگا۔

ترتیب "تذکرہ" کی داستان: "تذکرہ" اس زمانے میں مرتب ہوا تھا۔ جب مولانا کو حکومت بنگال نے اپنے حدود سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا اور وہ اپریل ۱۹۱۶ء میں رانچی (صوبہ بہار) میں چلے گئے تھے۔ وہیں انھیں بعد میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ کتاب مرتب کرنے کے اصل ذمہ دار مولانا کے ایک دوست فضل الدین احمد مرزا تھے اور انہی نے اسے چھاپا تھا غالباً مولانا نے مرزا مرحوم کو اپنے مطبع وغیرہ کی دیکھ بھال کا کام سونپ دیا تھا۔ خود مرزا نے "تذکرہ" کی تمہیدی تحریر میں بتایا ہے کہ مولانا کی نظر بندی کے ساتھ ہی ان کے احوال و سوانح کی جستجو بہت بڑھ گئی۔ بیشتر اصحاب کا اصرار تھا کہ مولانا کے حالات خود ان سے لکھوائے جائیں۔ اہل ذوق کے اس عام تقاضے کی بنا پر مرزا مرحوم مئی ۱۹۱۶ء میں خود رانچی گئے اور سخت کوششوں کے بعد مولانا کو ترتیب سوانح پر راضی کیا۔ یہ شرط بھی منوالی کہ مولانا جو کچھ لکھتے جائیں۔ مرزا صاحب کے پاس کلکتہ بھیجتے جائیں۔ چنانچہ مولانا نے خاندانی حالات سے سلسلہ تحریر کی ابتدا کی اور جون ۱۹۱۶ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک کم و بیش چار ساڑھے چار مہینے مولانا کی تحریرات پہنچتی رہیں۔ اس طرح محض خاندانی حالات ہی مرتب نہ ہوئے بلکہ ضمناً بہت سے قیمتی اور ضروری مسائل و مباحث بھی معرض نگارش میں آ گئے۔ خاندانی حالات میں مولانا نے والد ماجد کے رسالے کے علاوہ بعض دوسرے مآخذ بھی پیش نظر رکھ لئے تھے، لیکن اپنے حالات پر پہنچ کر انہوں نے سکوت اختیار کر لیا۔ پیہم تقاضوں کے بعد بیس صفحے کی ایک فصل لکھ کر بھیج دی جو "تذکرہ" کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے[4]

---

[1] "تذکرہ" ص ۸۔ [2] تذکرہ ص ۹۔ [3] "تذکرہ" ص ۱۰۔ [4] "تذکرہ" کی تمہیدی تحریر ص ح و ط۔

لیکن ظاہر ہے کہ وہ فصل بجائے خود کتنی ہی قیمتی ہو تاہم اسے احوال و سوانح کا نام دینا صحیح نہ ہوگا۔

مرزا مرحوم کا بیان: مرزا مرحوم لکھتے ہیں کہ اس حالت میں میرے لیے خود ان کے حالات قلمبند کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ چونکہ نظر بندی کی وجہ سے خط و کتابت کی سہولت و آزادی بھی جاتی رہی تھی۔ لہٰذا میں فروری ۱۹۱۷ء میں خود رانچی گیا اور مسلسل چھ مہینے ان کے پاس مقیم رہا:

> "میں نے ان کے حالاتِ زندگی کے متعلق پندرہ سوال لکھ لیے تھے۔ سخت سعی و اصرار سے ان کے جوابات لکھوائے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ جہاں ایک مرتبہ اس موضوع پر ان کا قلم اٹھ گیا۔ پھر کسی تحریک کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور ان کے جوشِ فکر کا سیلاب کسی کے روکے رک نہ سکے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گو نہایت بے توجہی اور بے دلی کے ساتھ وہ جوابات لکھنے پر مستعد ہوئے لیکن پھر بھی ان پندرہ سوالوں کی تحریک نے ان کے خیالات کو جنبش دے دی اور حالات کا ایک معتدبہ حصہ ان کے قلم سے بے اختیار نکل گیا۔ سوالات کے جواب لے کر میں رائے پور[1] واپس آیا۔ جہاں تک ممکن تھا جا بجا خود ان کی تحریر کو بجنسہٖ درج کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے حالات میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ ان سے بھی مدد ملی اور اس طرح ایک کتاب مرتب ہوگئی۔[2]

اصل کتاب کے متعلق مرزا مرحوم لکھتے ہیں کہ مولانا تفسیر قرآن اور بعض دوسری اہم تصانیف میں شب و روز مشغول رہتے تھے۔ جب کسی وجہ سے دماغ آرام لینا چاہتا تو دو چار گھنٹے کے لیے اس طرف متوجہ ہو جاتے۔ جو کچھ قلم برداشتہ لکھا جاتا میرے پاس بھیج دیتے تھے اور آئندہ ربطِ تحریر کے لیے آخری صفحے کی آخری سطر اور بعض حالات میں صرف چند الفاظ ایک سادہ صفحے کی پیشانی پر باقی رہتے تھے۔[3]

"تذکرہ" کی طباعت: تذکرہ کی طباعت شروع ہوئی تو مرزا مرحوم کو اندازہ ہوا کہ پورا مسودہ ایک جلد میں چھاپا گیا تو کتاب کی ضخامت شاید سات آٹھ سو صفحے تک پہنچ جائے تو انھوں نے کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلی جلد جو چھپ گئی جو فہرست مطالب اور مقدمہ یعنی تمہیدی تحریر کے علاوہ تین سو بیس صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مولانا کے خاندانی حالات نہیں آئے، البتہ شیخ محمد محسن تک تمام بزرگوں کے نام آ گئے ہیں۔ یا ذاتی سوانح کے متعلق مولانا کے تحریر فرمائے ہوئے صفحات ہیں، جنھیں سوانح کا نام دینا مشکل ہے۔ دوسری جلد کا جو مسودہ مرزا مرحوم کے پاس محفوظ رہا۔ اس کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں مولانا کے لکھے ہوئے خاندانی حالات:

> دوسرے حصے میں خود مولانا کی سوانح عمری ہے جو خاکسار نے ترتیب دی ہے اور اس کا بھی اکثر حصہ سوالات کے جواب میں خود ان کا لکھا ہوا ہے۔[4]

مرحوم خود فرماتے ہیں کہ میں نے پہلی جلد کے مسودے میں سے بھی تین بڑی فصلیں اور چار لمبے فٹ نوٹس الگ کر لیے تھے:

> یہ جس قدر فصلیں اور حواشی نکالے گئے، سب محفوظ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان شاء اللہ ان کو بھی کسی نہ کسی عنوان سے عنقریب شائع کر دوں گا یا بہ شرطِ گنجائش دوسری جلد کے آخر میں بطور ضمیمہ کے درج کرنے کی کوشش کروں گا۔[5]

---

[1] معلوم نہیں اس سے مراد بنکورہ کا رائے پور ہے یا نواکھالی کا رائے پور۔ وہاں مرزا مرحوم یا ان کے بھائی کا کاروبار تھا یا وہ ملازم تھے۔ [2] تمہیدی تحریر ص ط دی۔ [3] تمہیدی تحریر ص ک۔ [4] "تذکرہ" کا مقدمہ یا تمہیدی تحریر ص م۔ [5] ایضاً۔

تاریخی نام نیز مصرعۂ تاریخ سے بیان کردہ سال ولادت یعنی ۱۳۰۵ھ کی توثیق ہوتی ہے۔

ہمایوں کبیر مرحوم کا بیان: ہمایوں کبیر مرحوم نے مولانا کی پہلی برسی کی تقریب پر مختلف اہل علم و قلم کے انگریزی مقالات کا ایک مجموعہ بطور یادگار شائع کیا تھا۔ جس میں "تاریخ ولادت شمسی تقویم کے مطابق ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء درج کر دی گئی۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس سلسلے میں مرحوم نے کون سی سند پیش نظر رکھی۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء کو قمری "تاریخ ۵ ربیع الاول ۱۳۰۶ھ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ "تاریخ مولانا کی تحریر ہی نہیں، ان کے "تاریخی نام اور مصرعۂ تاریخ ولادت سے بھی متفاوت تھی۔ ۱۳۰۵ھ ۶ ستمبر ۱۸۸۸ء کو ختم ہو چکا تھا اور ۷ ستمبر سے ۱۳۰۶ھ کا آغاز ہو گیا تھا۔ اگر معین یوم ولادت لکھنے کا کوئی قرینہ موجود نہ تھا تو کم از کم مستند ماہ و سال سے تو تجاوز کسی بھی اعتبار سے مناسب نہ تھا قمری و شمسی سنین کے تقابل سے یہ معلوم کر لینا مشکل نہ تھا کہ ۱۱ نومبر کا تعین ان حقائق کو تو قطع نہیں کرتا، جن کی صحت و محکمیت میں کسی کے لیے بھی کلام کی گنجائش نہیں ہو سکتی؟

بلند ارضی نسبتیں: مولانا فرماتے ہیں۔

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے:

سلامٌ علی نجدٍ ومن حلّ بالنجد

مگر مادری وطن سرزمین مطہر طیبہ[1]، دار الہجرۃ سید الکونین، شہرستان وحی و نبوت ہے، قبلۂ عبادت گزاران عشق اور کعبۂ ارادت مندان شوق۔ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ:

دارم دلے گرواں کہ من قبلہ نماے خوانمش
روسوے ابروئیش کند ہر چند مے گردانمش[2]

مزید لکھتے ہیں:

مولد و منشاے طفولیت" وادی غیر ذی زرع" عند بیت اللہ المحرم[3] یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً و کرامتہً۔ محلہ قدوہ متصل باب السلام[4]:

بلادٌ بہا حل الشباب تمائمی
و اول ارضٍ مسّ جلدی ترابہا[5]

---

[1] طیبہ بفتح اول و سکون یا و فتح با، مدینہ منورہ کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم۔ [2] یہ شعر ملک محمود پیادہ گجراتی کا ہے۔

[3] "تذکرہ" ص ۲۸۹۔ ظاہر ہے کہ پیش نظر سورہ ابراہیم کی یہ آیت ہے: ربنا انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرعٍ عند بیتک المحرم (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں، اے ہم سب کے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں اسمٰعیل کو اس وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس لا بسایا جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں۔

[4] مغربی جانب یعنی سعی کی طرف حرم پاک کا مشہور دروازہ جسے دور جاہلیت میں باب بنی عبد شمس کہتے تھے۔ اب باب بنی شیبہ بھی اس کا نام ہے۔ باب السلام اس لئے کہنے لگے کہ طواف قدوم کے لئے جو حرم پاک کا سلام ہے اسی سے حرم میں داخل ہوتے ہیں۔ محلہ قدوہ اس کے پاس ہے۔

[5] "تذکرہ" ص ۲۸۸۔

انتسابات کی حقیقت : آخری دو نسبتوں کی انتہائی رفعت و برتری کسی سند و شہادت کی محتاج نہیں جو شخص باری تعالیٰ کی رحمت سے مولانا کے حلقے میں آئیں یقین ہے کہ ایک خاص سرخوشی کے عالم میں ان کا ذکر بے اختیار زبانِ قلم پر آ گیا۔ لیکن رسمی نسبتوں میں کیا رکھا ہے جب تک انسان اعمالِ حسنہ کی لازوال برکتوں اور سعادتوں سے اپنے اندر ان کی اہلیت و صلاحیت نہ پیدا کرلے۔ ارضی انتسابات کی حقیقت خواجہ شیراز نے ایسے انداز میں بیان فرمادی ہے کہ اس پر کوئی اضافہ ہو نہیں سکتا اور دلیل ایسی پیش کر دی ہے، جسے کوئی قطع نہیں کر سکتا۔ یعنی

حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی است

نیز کیا قرآن مجید کا یہ ارشاد ہمارے لئے عالم افروز روشنی کی سب سے بڑی مشعل نہیں؟!

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم	خدا کے نزدیک سب سے بڑھ کر شریف و معزز وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔

انسان کے شرف و اکرام کا پیمانہ کسی خاص مقام میں پیدا ہونے یا کسی خاص نسل، رنگ اور قوم سے تعلق رکھنے پر موقوف نہیں۔ اصل پیمانہ ایک اور صرف ایک ہے یعنی تقویٰ اور پرہیزگاری جو مقصودِ انسانیت ہے۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں نہیں فرمایا تھا؟

ایہا الناس! الا ان ربکم واحدٌ وان اباکم	لوگو بے شک تمہارا رب ایک ہے تمہارا باپ ایک
واحد۔ الا لا فضل لعربیٍ علی عجمیٍ ولا	ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر یا گورے کو
لعجمی علی عربیٍ ولا لاحمر علی اسود	کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر
ولا لاسود علی احمرٍ الا بالتقوی۔	تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر۔

خود مولاناؒ نے "تذکرہ" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

لیس لاحدٍ فضل علی احدٍ لا بدینٍ وتقوىٰ	کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں مگر دین اور تقویٰ کی
والناس کلہم من آدم وآدم من تراب[1]	بنا پر۔ تمام لوگ حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اور حضرت
	آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔

یہ نسبتیں بے شک و شبہ بڑی ہی بلند اور بڑی ہی مبارک ہیں، مگر اسی کے لئے جس کے قلب و روح ان کی عظمت کے احساساتِ صحیحہ کی سرمدی دولت سے گراں مایہ ہوں اور جو یقین رکھتا ہو کہ اعمال و اخلاق کو رضائے الٰہی کے سانچے میں ڈھال لینا ہی انسانی آرزوؤں کا حاصل اور انسانی مساعی کا سرجوش ہے۔

آبائی خاندان : مولاناؒ دہلی کے ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، جس میں بہ یک وقت پانچ پانچ علمائے درس و افتا اور اصحابِ سلوک و طریقت پیدا ہوئے ہیں[2] پانچویں جد تک سلسلہ نسب یوں ہے :

---

[1] "تذکرہ" ص ۲ - [2] "تذکرہ" ص ۴۔

تین خاندانوں کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ مولانا کے دادا شیخ محمد ہادی تھے، جن کا تعلق دہلی کے ایک مشہور خاندان علم و فضیلت سے تھا۔

۲۔ مولانا کی والدہ ماجدہ حضرت شیخ محمد بن طاہر وتری کی بھانجی تھیں[1]، جو گزشتہ دور کے اکثر علمائے حجاز کے استاذ حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے ابعد مکہ معظمہ کے آخری محدث تھے۔ ان کے بعد اس درجے کا کوئی شیخ حدیث حرمین میں پیدا نہیں ہوا۔

۳۔ مولانا کے والد مرحوم کے نانا "رکن المدرسین" مولانا منور الدین اپنے عہد کے مشاہیر اساتذۂ علم و درس اور اصحاب طریقت سلوک میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علوم ظاہر و باطن کی جامعیت عطا کی تھی۔ ان کا شمار شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے اجلہ تلامذہ میں سے تھا۔

__**مولانا جمال الدین دہلوی**__ : یہ تو مولانا اور جدہ دا" ان کے والد ماجد کی علمی میراث کا نقشہ تھا۔ پیشتر بھی اس خاندان کو علم و عمل کی بعض اہم شخصیتوں سے رشتہ و تعلق کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ جن میں سے ایک کا ذکر مولانا نے خود خاصی تفصیل سے "تذکرہ" میں کیا ہے بلکہ "تذکرہ" کی ابتدا انہی کے ذکر سے ہوئی ہے۔ یعنی مولانا جمال الدین دہلوی معروف بہ شیخ بہلول جو شیخ محمد افضل (مولانا کے والد شیخ خیر الدین کے جد امجد اور مادری سلسلے میں مورث اعلیٰ تھے۔

جب شیخ مبارک کے خاندان کو اکبری دربار میں عروج حاصل ہوا اور فیضی و ابو الفضل بادشاہ کے مشیران خاص میں شامل ہو گئے تو انہی کی کوششوں سے بعض علما نے اکبر کے لیے امام وقت کا محضر تیار کیا جس پر مختلف بلاد و اطراف کے علما سے دستخط لینے منظور تھے۔ یہ محضر دہلی میں مولانا جمال الدین کے سامنے بھی تصدیق و امضا کے لیے پیش ہوا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے کافی ہے۔ ہم فقیروں اور گوشہ نشینوں کو کیوں تکلیف دی جاتی ہے؟ پھر علمائے مشرق کی طرف سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ اکبر دین سے منحرف ہو چکا ہے۔ اس پر محضر امامت کے حامیوں کو خیال ہوا کہ یہ فتویٰ علمائے مشرق اور بعض علمائے دہلی کے درمیان نامہ و پیام کا نتیجہ ہے اور غالباً سختی شروع ہوئی۔ مولانا جمال الدین نے حالات مخدوش دیکھے تو تلامذہ و مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ بہ قصد حج حجاز چلے گئے[2]۔ گویا اس بزرگ کی میراث میراثِ علم ہی نہیں میراث عزیمت بھی شیخ محمد افضل کے واسطے سے خاندان مولانا کو حاصل ہو گئی۔

__**حجاز میں مدت قیام**__ : اگر حجاز میں مولانا جمال الدین کی مدت قیام کے متعلق مولانا کے اندازے درست ہیں، تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ سنہ ۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء میں ہندوستان سے تشریف لے گئے اور خان اعظم میرزا عزیز کوکہ کے ساتھ کم و بیش تیرہ چودہ

---

[1] انڈیا ونس فریڈم میں مولانا کی والدہ کو شیخ محمد بن طاہر کی صاحبزادی لکھا ہے۔ (ص: ۱) اگر مولانا نے انڈیا ونس فریڈم کا مسودہ لفظاً لفظاً پڑھا تو وہ حقیقت حال کے متعلق خود اپنی معلومات ہی نہیں بلکہ اپنی تحریر کو کیوں کر نظر انداز فرما سکتے تھے؟ نیز انڈیا ونس فریڈم کی اشاعت کا انتظام کرنے والے خود مولانا کی تحریرات و تصانیف سے کس قدر ناواقف تھے کہ ان کی نظر سے تذکرہ بھی نہیں گزرا تھا

[2] تذکرہ ص: ۱۰ - ۱۲ -

برس کے بعد سنہ ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں واپس آئے[1] یہ پوری مدت انہوں نے حجاز ہی میں اطمینان کے ساتھ گزاری۔ اگرچہ ایک اجنبی سرزمین میں ظاہری وسائل معاش کے فقدان کے ساتھ اتنا لمبا وقت گزار لینا آسان نہ تھا۔ پھر خان اعظم تو محض حسن اتفاق سے حجاز پہنچ گئے تھے اور ان کی معیت میں واپس آجانا ایک خدا ساز معاملہ تھا۔ اگر وہ حجاز نہ جاتے تو مولانا جمال الدین کی مدت غربت خدا جانے کتنی لمبی ہو جاتی؟ مگر ان کے اطمینان میں ایک لمحے کے لیے بھی خلل نہ آیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وقت کے عام علما و اصحاب سلوک کی طرح دنیوی مال و جاہ اور مادی وسائل راحت سے مولانا جمال الدین کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ مولانا درست فرماتے ہیں۔ مولانا جمال الدین عہد اکبری کے بعض دوسرے دنیا پرست علما سے بالکل مختلف تھے، جن کا حال یہ تھا کہ

> پہلے تو دربار شاہی سے روٹھ کر خانۂ خدا کا رستہ لیتے لیکن جب حرص دنیا چین سے نہ بیٹھنے دیتی تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندوستان کی طرف دیوانہ وار دوڑتے اور اسی گھر کو پیٹھ دکھلاتے جس کے لیے دنیا کو پیٹھ دکھائی تھی:۔

رنجیدہ مے روی ز سرکوے دوستیم　　چوں مے شود نیاید اگر از قفا کسے؟[2]

خاندانی نسبتیں: ارضی انتسابات کے باب میں جو کچھ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اسے خاندانی انتسابات کے بارے میں بھی حرفاً حرفاً درست سمجھنا چاہیے۔ کوئی خاندان محض اس وجہ سے رفعت منزلت کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے بڑے بڑے بیوت علم و فضل سے رشتہ ہائے نسب حاصل ہوئے۔ ہر خاندان کے اعزاز و اکرام کی بنیاد و اساس، اس کے افراد و ارکان کا سرمایۂ علم و فضل اور خدمت دین و خلق ہے۔ اونچے درجے کے خاندانوں کے ساتھ محض نسبتیں کسی کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔

بندۂ عشق شدی، ترک نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی برکات و حسنات شایاں سے حصۂ وافر عطا کیا۔ ان کے ماحول کی ہر زبان اس رحمت ایزدی کی شاہد عادل ہے۔ جن بزرگوں سے انتسابات باعث فخر سمجھے جا سکتے ہیں، ان کے اسمائے گرامی بھی ہمیں صرف مولانا کی وجہ سے اور ان کے ذریعے سے معلوم ہوئے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ خود ان کا اپنا عقیدہ کیا تھا؟ یہ کہ:

> خاندان کے فخر کا بت بھی دنیا کے عہد جاہلیت کی ایک یادگار شگون ہے اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کل کو ایک نو مسلم چمار اپنے حسن عمل سے وہ مرتبہ پائے جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات ہے اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ عمل کا نوشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے[3]

نا ٹھیک فرماتے ہیں کہ کسی خاندان میں علم و صلاح کا عرصے تک باقی و جاری رہنا بغیر ان دو نعمتوں کے ممکن نہیں کہ آبا کو د صالح اور اولاد کو آبائے صالح نصیب ہوں۔ سچی عظمت کی راہ یہ نہیں کہ افریڈرک یا نپولین کی تلواریں دوسروں کو دکھائی جائیں۔ ظمت کی راہ وہی ہے جو خود ہماری تلوار کو ہماری نسبت سے ملی ہو۔

---

[1] "تذکرہ" ص ۱۶ [2] [illegible] [3] "تذکرہ" ص [illegible]

شیخ خیرالدین کے نانا رکن المدرسین مولانا منورالدین کا معاملہ ہے ۔

"آزاد کی کہانی" میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا منورالدین کے والد قاضی سراج الدین ہرات کے مشہور خاندان قضاۃ میں سے تھے ۔ احمد شاہ درانی نے انھیں پنجاب کے افغان نائب السلطنت کا مشیر مقرر کر دیا تھا ۔ ان کی مستقل سکونت قصور میں تھی ، جہاں کا نواب ان کا معتقد تھا ۔ پھر رنجیت سنگھ کے ہاتھوں فتح ملتان تک جو کچھ سپرد قلم ہوا ہے ، وہ مسلمہ تاریخی حقائق و وقائع سے متناقض ہے ۔ یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ مولانا ۱۹۲۱ء تک پنجاب و افغانستان کے تاریخی وقائع سے اتنے بے خبر تھے جتنے "آزاد کی کہانی" کے پردے پر معلوم ہوتے ہیں درآں حالیکہ وہ اس دور میں بھی اس تاریخ کے تمام جزئیات پر اس درجہ حاوی تھے کہ طالبان علم و نظر کی رہنمائی بعض غیر معروف مآخذ کی جانب فرماتے رہتے تھے ۔ یقیناً مولانا کو ان متناقض بیانات کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔

زیرِ غور کتاب کے ذہنی مولف کا طریقہ یہ تھا کہ مولانا سے جو حالات سن لیتے صحبت سے اٹھ کر علیحدگی میں حافظے کی بنا پر انھیں قلمبند کر لیتے ۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ حافظے نے ہر مقام پر ان کی پوری مساعدت نہ کی خصوصاً اس وجہ سے کہ اس دور کے پنجاب و افغانستان کے تاریخی حالات پر ان کی نظر نہ تھی اگر نظر ہوتی تو وہ خود حواشی میں ضروری تصریحات فرما دیتے ۔ مولانا سے استصواب میں تو یہ خوف مانع رہا کہ انھیں علم ہو جائے گا ، جو کچھ وہ بیان فرماتے رہے ۔ قلمبند ہو چکا ہے لہٰذا مسودہ نظر ثانی کے لئے طلب فرما لیا جائے گا اور ان کے دوسرے بے شمار مسودات کی طرح یہ بھی غائب ہو جائے گا ۔ تاہم وہ خود ان تاریخی وقائع پر ایک نظر ڈال لیتے یا کسی تاریخ دان کو یہ حصے دکھا لیتے تو غلطیوں سے محفوظ ہو جاتے اور مولانا کو بھی ان کے انتساب سے بچا لیتے ۔ مولانا کے متعلق زیادہ معلومات منظر عام پر لانے کا شوق و اضطراب بجائے خود کتنا ہی قابل قدر ہو لیکن اسے یہ صورت دے دینا تو کسی بھی حالت میں مناسب نہ تھا ، جو دے دی گئی ۔ اسی طرح بھوپال کی تاریخ کے واقعات بھی محل نظر ہیں ۔ زمان شاہ درانی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے ، وہ بھی اس مرحوم کی مستند تاریخی تصویر سے متفاوت ہے ۔

حقیقت اور افسانہ : غرض یہ تسلیم کر لینے میں تو تامل کی کوئی وجہ نہیں کہ مولانا منورالدین کے والد قاضی سراج الدین ہرات کے مشہور خاندان قضاۃ میں سے تھے ۔ اگرچہ ان کے مشاغل و واجبات کا مرکز لاہور تھا لیکن ان کے خاندان کی سکونت قصور میں تھی ۔ مگر یہ کیوں کر مانا جا سکتا ہے کہ جب رنجیت سنگھ نے مظفر خاں حاکم ملتان پر آخری دھاوا بولا تو زمان شاہ کو بھی مظفر خاں کی امداد پر آمادہ کیا گیا تھا ۔ افسوس کہ ایران اور بھائیوں سے لڑائیاں زمان شاہ کے لیے رکاوٹ کا باعث بن گئیں ۔ امداد میں تاخیر ہوئی ۔ مظفر خاں مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہو گیا ۔ قاضی سراج الدین نے بھی اسی معرکے میں شہادت پائی[1]

برگس اپنی کتاب میں جولائی ۱۷۹۹ء کے اہم واقعات کے تحت لکھتا ہے :

> زمان شاہ ہندوستان پر حملے کے لئے تیار تھا ، مگر ایران کی طرف سے (افغانستان پر) حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا جس کے لئے انگیخت کے ذمہ دار انگریز تھے اور زمان شاہ کی توجہ اس طرف پھر گئی[2]

---

[1] آزاد کی کہانی ص : ۶۴ ۔

[2] THE CHORONOLOGY OF MODERN INDIN BY JAMES BURGESS . P 276

واضح رہے کہ ہندوستان پر زمان شاہ کا اقدام ٹیپو سلطان شہید فرمانروائے میسور کے ساتھ طے شدہ منصوبے کا ایک جزو تھا۔ انگریز سلطان پر حملے کے لیے تیار تھے، کیونکہ مرہٹوں اور نظام کو اپنے ساتھ ملا چکے تھے اور سلطان شہید کے یہ دونوں ہمسایے، ملکی مقاصد کے لیے نہیں صرف ذاتی اغراض کے لئے سلطان کے دشمن تھے۔ زمان شاہ کا وظیفہ یہ تھا کہ شمالی ہند میں انگریزوں کے لیے اضطراب و سراسیمگی کی ایسی حالت پیدا کر دی جائے جس کی وجہ سے وہ اپنی قوت کا بڑا حصہ سلطان کے خلاف لے جانے کے بجائے شمالی ہند میں رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ سلطان انگریزوں، مرہٹوں اور نظام سے لڑتا ہوا شمالی جانب پیش قدمی کرے، زمان شاہ قلب ہند پر حملہ آور ہو، اس طرح دونوں قومی مجاہد وسط ہند کے کسی مقام پر باہم اتصال پیدا کر لیں۔ سلطان اور زمان شاہ دونوں کو قوی امید تھی کہ کامیاب ترکتازوں کے بعد مرہٹے، نظام اور دوسرے رؤسائے ہند ساتھ مل جائیں گے۔ اس طرح انگریزوں کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔

انگریزوں نے ایک طرف ایران کو ابھار کر افغانستان کی مغربی جانب جنگ کا انتظام کر دیا، دوسری طرف شاہ زمان کا بھائی شاہ محمود ایران کا طرفدار تخت کابل کا آرزومند تھا۔ غرض بھائیوں اور ایران سے رزم و پیکار کا ذمہ دار شاہ زمان نہ تھا، یہ مصیبت انگریزوں، ایران اور شاہ محمود نے پیدا کی تھی۔ ایران کی آرزو یہ تھی کہ ہرات اسے مل جائے، جو امیر دوست محمد خاں نے ۱۷۶۲ء میں ایران سے چھینا تھا۔ شاہ محمود سلطنت کابل لینا چاہتا تھا۔

زمان شاہ کا انجام: زمان شاہ اپنے عہد و پیمان کے مطابق بھاری فوج کے ساتھ شمالی ہند پر حملہ آور ہوا۔ اس اثنا میں شاہ محمود کابل پر قابض ہو گیا۔ زمان شاہ تھوڑی سی فوج لے کر اس فتنے کی سرکوبی کے لیے پلٹا مگر بھائی کے مقابلے میں شکست کھائی۔ وہ شکست کی تلافی کے لئے تدبیریں کر رہا تھا اور شنواری قبیلے کے ایک رئیس کے ہاں ٹھہر گیا۔ اس بدبخت نے بدعہدی کر کے زمان شاہ کو شاہ محمود کے حوالے کر دیا جس نے مجبور اور صاحب عزیمت بھائی کی آنکھوں میں آناً فاناً سلائی پھروا دی اور اسے معذور بنا دیا۔ یوں گردش روزگار نے اس غریب کے لئے مجاہدانہ اقدامات کی کوئی صورت ہی باقی نہ چھوڑی۔ وہ پہلے افغانستان سے نکل حرمین شریفین پہنچا، حج و زیارت سے مشرف ہو کر انگریزوں کے پاس لودھیانہ میں مقیم ہو گیا۔ وہیں ۱۸۴۵ء میں وفات پائی اور سرہند شریف میں دفن ہوا۔

غرض اس کے متعلق جو بیانات مولانا سے منسوب ہیں، وہ قطعاً قابل یقین نہیں۔

رنجیت سنگھ نے ملتان پر آخری حملہ ۱۸۱۸ء میں کیا تھا۔ زمان شاہ اس دردناک واقعے سے کم و بیش اٹھارہ سال پیشتر معذور محض ہو کر افغانستان سے رخصت ہو چکا تھا۔ مظفر خاں شہید حاکم ملتان کی امداد کے لئے اسے آمادہ کرنے کی کون سی صورت تھی۔ یقیناً یہ بیان مولانا کا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے بیان کردہ حالات سامع کے حافظے میں بری طرح خلط ملط ہو گئے۔ چونکہ تاریخ پر ان کی نظر نہ تھی، اس لئے وہ کسی بھی الجھن کو سلجھا نہ سکے اور ایک ایسی داستان مرتب فرما دی، جو تاریخ سے کہیں بڑھ کر ایک بے سر و پا افسانہ ہے۔

مولانا منورالدین کا عزم دہلی: تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم رہتی ہے کہ مولانا منورالدین دہلی جا کر شاہ عبدالعزیزؒ محدث سے تعلیم حاصل کرنے کے بڑے آرزومند تھے، کیونکہ اٹھارویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں صدی کے ربع اول میں شاہ عبدالعزیز کی درس گاہ کو مشرقی اسلامی دنیا

شاہ داؤد نے پوچھا کہ مجھ گوشہ نشین فقیر کو کیوں طلب فرمایا گیا؟ مخدوم الملک بولا: میں نے سنا ہے کہ آپ کے مرید ذکر کرتے وقت "یا داؤد" کہتے ہیں۔ فرمایا: سننے میں اشتباہ ہوا ہوگا۔ ورنہ یہ لوگ "یا ودود" "یا ودود" کہتے ہیں[1]۔

شاہ داؤد کا بذل و ایثار : بدایونی نے شاہ داؤد کے بذل و ایثار کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ بڑی عجیب ہے یعنی جب آپ کے حجرے میں کچھ مال جمع ہو جاتا تو مٹی کا ایک کوزہ اور ایک پرانا بوریا الگ کر لیتے اور باقی سب کچھ غربا و مساکین میں تقسیم فرما دیتے۔ یہ عمل سال میں ایک بار یا دو بار ضرور ہوتا۔ اس بذل و ایثار کے باوصف جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا عرس آتا تو عوام و خواص میں سے کم و بیش ایک لاکھ آدمی جمع ہو جاتے اور ان سب کو کھانا حضرت کے لنگر سے ملتا۔

یہ درویشی تھی جس نے اسلامیت کی روشنی دور دور تک پہنچائی۔ جس کی وجہ سے حقانیت ہر خاص و عام پر آشکارا ہوئی مردانِ حق کا منصب و وظیفہ اس دنیا میں یہی تھا اور یہ وہ کارِ خیر تھا۔ جس سے سلطنتوں کے فرمانروا اور ملکوں کے والی عموماً محروم رہے۔

حضرت کی مہر کا سجع جو خود آپ نے کہا تھا یہ تھا:

محی داؤد عن اسم و رسم
فانّ الفقر یمحوا کل و سم[2]

وفات : شاہ داؤد کی وفات سنہ ۹۸۲ھ میں ہوئی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "مشتاق منان" سے تاریخ نکالی۔ معین تاریخ مجھے صرف "وفیات الاخیار" میں ملی یعنی ۲۷ رجب سنہ ۹۸۲ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۵۷۴ء[3]۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت کے بھتیجے شاہ ابوالمعالی (ابن شاہ رحمت اللہ) آپ کے جانشین ہوئے۔ وہ بھی بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ یہ بزرگ تھے، جن سے سلوک و طریقت کی تکمیل مولانا جمال الدین نے کی تھی اور مولانا کے بارے میں جو کچھ ہمارے سامنے آیا ہے، اس میں حضرت شاہ داؤد کے اطوار و اوضاع مقدسہ کی جھلک صاف پائی جاتی ہے۔

سید رفیع الدین شیرازی : مولانا لکھتے ہیں:

"سید رفیع الدین شیرازی نویں صدی کے اعاظم محدثین اور کملائے روزگار سے ہیں اور بہ یک واسطہ ان کا سلسلہ تلمذ حافظ ابن حجر عسقلانی تک پہنچتا ہے۔ وہ حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد ہیں، حافظ سخاوی، حافظ عسقلانی کے[4]"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ سید رفیع الدین فضائل حسب و نسب کے جامع تھے۔ ان کے تمام آبائے کرام علماً و صلحاً و اتقیا تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ میر معین الدین صاحب "تفسیر معینی" کہ کئی برس تک مدینہ منورہ میں مجاور رہے اور ان کی اولاد اب بھی مکہ مکرمہ میں موجود ہے تفسیر معینی، منقح اور مفید ہے۔ نیز انہوں نے اور رسالے مرتب کئے ہیں جو تحقیقات غریبہ پر مشتمل ہیں۔

---

[1] ایضاً۔ [2] ایضاً۔ [3] "وفیات الاخیار" مطبوعہ مطبع شاہ اودھ لکھنؤ۔ ص: ۳۹۔ [4] "تذکرہ" ص: ۱۱۔

ـــــ ایضاً ـــ منتخب التواریخ جلد سوم۔ ص: ۳۴

ایک بزرگ صفی الدین عبدالرحمٰن ہیں، جن کی وجہ سے اس خاندان کو خاندانِ سادات صفویہ کہنے لگے۔ انھیں سادات سلامیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مشہور تھا (کہ) سید رفیع الدین کے کسی بزرگ نے روضۂ مقدسہ رسالت مآب صلعم سے "سلام" کا جواب سنا تھا۔

> میر سید رفیع الدین نیز دانشمند و محدث و نہایت جود و سخا و خلق و لطف داشت[1]

سید موصوف نے معقولات کی تعلیم مولانا جلال الدین سے پائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا دوانی سید رفیع الدین کے آباد اجداد کی بزرگی کا لحاظ فرماتے۔ ان کے مکان پر آکر درس دیتے تھے۔ حافظ سخاوی نے پچاس سے اوپر کتابوں کی سند اجازت لکھ کر سید رفیع الدین کے پاس شیراز بھیج دی تھی۔ اس کے بعد سید موصوف خود براہِ راست استفادے کی غرض سے حافظ سخاوی کی خدمت میں مصر پہنچے۔ خود ان کی زبان مبارک سے حدیث سنی اور مدت مدید تک شاگردی سے شرف اندوز ہوئے[2] حافظ سخاوی نے اپنی مشہور کتاب "ضوء اللامع فی اعیان القرن التاسع" میں سید رفیع الدین کا مفصل ترجمہ لکھا ہے[3]۔

سید رفیع الدین شیراز ہی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ پھر ان کے آبائے کرام حرمین شریفین چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ سید رفیع الدین سکندر لودھی کے عہد میں (۱۴۸۸ - ۱۵۱۷) گجرات کے راستے دہلی آگئے۔ سلطان ان کا بہت معتقد تھا اور اسی کے ایما سے سید موصوف نے آگرہ میں سکونت اختیار کی[4] اور اپنی بیش بہا زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمت دین میں بسر کیا۔ ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں واصل بحق ہوئے اور اپنے خانۂ مبارک ہی میں آسودۂ خواب ہیں[5] یہ سلیم شاہ سوری کا عہد حکومت تھا۔

محدث شیرازی کا فیضان : مولانا فرماتے ہیں کہ سکندر لودھی سے سلیم شاہ سوری تک تمام فرمانروایان ہندان کے خدمت گزار رہے ہیں اور بڑے بڑے علمائے وقت نے فن حدیث میں ان کی شاگردی کی۔ شیخ عبدالحق محدث کے عہد سے پیشتر ان اطراف میں فن حدیث کے درس و تدریس کا جس قدر چرچا ہوا۔ وہ انہی کے قیام ہند کا فیض ہے :-

> جب ہمایوں کو شیر شاہ سے شکست ہوئی اور آگرہ آیا تو سید موصوف کے مکان پر جا کر طالب دعا ہوا۔ "تذکرۃ الواقعات" میں ہے کہ ایران جانے کا مشورہ سید موصوف ہی نے دیا تھا۔ ملا مبارک اور شیخ عبدالنبی کے معرکوں میں یہ ملا مبارک کے مددگار رہے اور انہی (کی) اعانت و یاری سے ملا موصوف کو آگرہ میں رہنا نصیب ہوا[6]

یہی بزرگ تھے، جن سے مولانا جمال الدین عرف بہلول دہلوی نے علوم کی تکمیل کی اور اس طرح انھیں دو واسطوں سے حافظ ابن حجر صاحب "فتح الباری" کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ ایک واسطہ سید رفیع الدین شیرازی کا اور دوسرا حافظ سخاویؒ کا۔

(تیسرا باب)

مولانا منوّرالدین

آزاد کی کہانی" کا بیان : اب رشتے کے ذریعے سے خاندان کے ساتھ اتصال کا صرف ایک معاملہ باقی رہ گیا اور وہ مولانا کے والد

---

[1] اخبار الاخیار ص: ۴۵۱۔ [2] اخبار الاخیار، ص: ۲۵۱ - ۲۵۲۔ [3] تذکرہ ص: ۱۱۔ [4] اخبار الاخیار ص: ۲۵۲۔ [5] اخبار الاخیار ص: ۲۵۲۔ نیز تذکرہ علمائے ہند، ص: ۶۵۔ [6] تذکرہ ص ۱۱۔ "تذکرۃ الواقعات" جوہر آفتابچی کی کتاب ہے، جو ہمایوں کا وفادار غلام تھا اور سفر ایران میں بھی آقا کے ساتھ تھا۔

فیض و تربیت کے دو چشمے: مولانا فرماتے ہیں کہ مولانا جمال الدین نے سلوک و طریقت کی تکمیل شیخ محمد داؤد" جھنی وال" کی خدمت میں کی اور علوم معقول و منقول میں وہ سید رفیع الدین شیرازی کے شاگرد تھے[1]

ان دونوں بزرگوں کے حالات بھی اختصار سے بیان کر دینے چاہئیں، جو اس لیے بھی ضروری ہیں کہ خود مولانا جمال الدین کے طبعی رجحانات کا اندازہ کرنے میں مدد مل سکے۔ مرید و مسترشد اپنی فطری پیاس بجھانے کے لئے جن سرچشموں پہ پہنچتا ہے، وہی اس کے ذوق و وجدان کا بہترین معیار اور اسی کی طلب و جستجو کے جائزے کی بہترین میزان ہیں۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے کہ انسان کے اخلاق و خصائل کی جانچ مطلوب ہو تو اس کے رفیقوں اور ہم مشربوں کی تلاش کرو، جن کی صحبت میں وہ زندگی کے بیشتر اوقات گزارتا ہے۔ میرزا غالب کیا خوب کہہ گئے ہیں:

ہر آنچہ درنگری جز بہ جنس مائل نیست
عیارِ بیکسی ما شرافتِ نسبی است

یقیناً ضروری نہیں کہ ہر شاگرد محض زانوئے تلمذ تہ کر لینے سے استاد کا ہمسر بن جائے یا ہر مرید محض مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینے سے سلوک و معرفت کی منزلیں طے کر جائے۔ اس لیے کہ صلاحیت اخذ و استفادہ سب میں یکساں نہیں ہوتی اور اس باب میں درجات کا تفاوت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، تاہم کسی حامل علم و فضل یا کسی صاحب ارشاد و طریقت سے طالب کے ذوق و رجحان کا پتا ضرور لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ محمد داؤدؒ: حضرت شاہ محمد داؤد اپنے دور کے نہایت بلند پایہ بزرگ تھے۔ ان کے آبائے کرام عرب سے آکر سیت پور میں مقیم ہوئے[2]۔ جسے مختلف کتابوں میں "از نواحِ ملتان" قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے عہد کی جغرافیائی تقسیمات میں سیت پور موجودہ ضلع مظفر گڑھ (قسمت ملتان) کے جنوبی گوشے میں اس مقام کے نزدیک ہے، جہاں پنجاب کے پانچوں دریا (پنج ند) دریائے سندھ میں ملتے ہیں۔ اوچ بھی سیت پور سے قریب ہے یعنی دونوں کے درمیان صرف پنج ند حائل ہے۔

"خزینۃ الاصفیا" میں حضرت شاہ محمد داؤد کو "کرمانی" لکھا گیا ہے[3] جس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ حضرت کے آبائے کرام عرب سے نکلے تو پہلے کرمان (ایران) میں مقیم رہے۔ بعدازاں سیت پور پہنچے اور کرمان میں اتنی دیر ضرور مقیم رہے جس کی بنا پر یہ خاندان "کرمانی" مشہور ہو گیا۔ نیز "خزینۃ الاصفیا" نے "شجرۃ الانوار" کے حوالے سے حضرت شاہ داؤد کا سلسلہ نسب امام علی رضاؓ تک پہنچایا ہے[4]

ابتدائی حالات: حضرت شاہ داؤد کی ولادت سیت پور میں ہوئی۔ ولادت سے قبل ہی ان کے والد شاہ فتح اللہ راہی عالم بقا ہوئے اور ولادت سے تھوڑا عرصہ بعد والدۂ ماجدہ بھی انتقال کر گئیں اور شاہ داؤد نے دریتیم کی حیثیت میں اپنے بڑے بھائی شاہ رحمت اللہ کی آغوشِ محبت میں تربیت پائی[5]

---

[1] تذکرہ، ص: ۱۰۔ [2] منتخب التواریخ جلد سوم ص: ۲۸، یہ کتاب حضرت داؤد کے حالات میں مستند ترین ہے کیونکہ مصنف کے ذاتی روابط حضرت کے ساتھ خاصے گہرے تھے۔ [3] خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۱۲۸۔ [4] ایضاً ایضاً ۱۲۹ [5] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۸۔

معلوم ہوتا ہے کسب معاش کی ضرورتیں اس خاندان کو سیت پور سے اس مقام پر لے آئیں جسے بدایونی نے "جہنی" لکھا ہے[1]۔ اور اسی نسبت سے شاہ داؤد "جہنی وال" کہلائے۔ "خزینۃ الاصفیا" میں اس مقام کا نام "چونی" بتایا گیا ہے[2] اور صاحب "خزینۃ الاصفیا" نے حضرت شاہ داؤد کو "چونی وال" کہا ہے۔ حقیقتاً یہ وہی قصبہ ہے جسے آج کل "چونیاں" کہتے ہیں اور یہ ضلع لاہور کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ مولانا نے بھی شاہ داؤد کو "جہنی وال" ہی لکھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر مقام کی تحقیق نہ تھی۔

تعلیم اور غیر معمولی ریاضتیں: شاہ داؤد سن بلوغت کو پہنچے۔ مولانا اسمٰعیل (اوچ) سے تحصیل علوم کا آغاز کیا، جو مولانا عبدالرحمٰن [illegible] کے شاگرد تھے۔ اسی دوران میں طبیعت ریاضتوں اور مجاہدوں کی طرف مائل ہو گئی۔ بعض اوقات پوری رات قیام میں گزار دیتے، پھر سجدے میں گرتے تو اسی حالت میں رات تمام ہو جاتی۔ بیابانوں اور ویرانوں میں بھی کئی سال بسر کیے۔ کبھی کبھی حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ کے مزار کا طواف شروع کر دیتے۔ غرض اس دور کی ریاضتیں اور مجاہدے ایسے تھے جو عام انسانوں کی طاقت و استطاعت سے بالا معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی روح پاک سے نسبت اویسی پیدا کر لی۔ پھر حضرت ہی کے ایمائے روحانی سے سید حامد گنج بخشؒ گیلانی بن سید عبدالقادرؒ ثانی سے بیعت کی۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے دل پر عراق کی جانب سے ایسی ہوا آتی ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشبوؤں میں سے ایک خوشبو ہوتی ہے[3]۔ پھر بقول بدایونی:

> از سیر عروجی بہ سیر رجوعی باز آمدہ در معمورۂ جدیدۂ شیر گڑھ نزدیک بہ جہنی بساط اقامت گستری و در وسط
> جائے ملتان و پٹن میاں در سلسلہ عالیہ سہروردیہ چشتیہ . . . . سلسلہ قادریہ را رواج دادہ و کار
> بہ قوت ربانی و نسبت حقانی از پیش چناں برد کہ غلغلۂ آں از نفخ صور فرو نشیند[4]

شیر گڑھ ایک نئی بستی تھی، جو چونیاں سے نزدیک ہے۔ مگر ضلع ساہیوال میں ہے۔ یہ مقام انہوں نے غالباً خود پسندیدہ سمجھ کر اختیار کر لیا اور اسی مقام پر حیات مستعار کے باقی اوقات ارشاد و اصلاح خلق میں بسر فرماتے۔ ملتان سلسلہ سہروردیہ کا بڑا مرکز تھا، سلسلہ چشتیہ کا مرکز ان اطراف میں پاک پٹن تھا۔ شاہ داؤد نے ان دونوں کے درمیان شیر گڑھ کو سلسلہ قادریہ کا ایک عالی شان مرکز بنا دیا۔

ایک ابتلا: مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری نے بقول بدایونی اہل اللہ کے استیصال پر کمر باندھ لی تھی اور اس دور دار و گیر میں حضرت شاہ داؤد کے نام بھی سلطان سلیم شاہ سوری کی طرف سے فرمان بھجوایا کہ گوالیار میں حاضر ہوں۔ حضرت مرحوم دو خادموں کے ساتھ گوالیار پہنچے۔ مخدوم الملک سے ملاقات ہوئی۔ وہ شاہ داؤد کا چہرہ مبارک دیکھتے ہی پکار اٹھا:

> از یں روئے دروغ نیاید[5]

---

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص: ۲۰۔ بدایونی کی عبارت ہے: "قصبہ ایست از توابع لاہور" دارا شکوہ نے لکھا ہے "قصبہ ایست از مضافات لاہور" سفینۃ الاولیا ص: ۱۹۳۔
[2] خزینۃ الاصفیا جلد اول ص: ۱۲۰۔
[3] اخبار الاخیار ص: ۲۰۷۔
[4] منتخب التواریخ جلد سوم ص: ۳۱۔
[5] ایضاً ایضاً ص: ۳۲۔

میں یگانہ شہرت حاصل تھی۔ یقیناً لاہور اور قصور میں بھی درسگاہیں تھیں، لیکن شاہ عبدالعزیز سے تلمذ کے ذوق کی تسکین کسی دوسری جگہ ہو نہیں سکتی تھی۔ ان کے والد ماجد اور دوسرے عزیز مفارقت (پر) راضی نہ تھے۔ دوسرے وجوہ کے علاوہ وقت کی ہمہ گیر افراتفری اور بدنظمی بطور خاص باعث تشویش ہوگی۔ مختلف چھوٹی بڑی قوتیں بے لگام ہر طرف پھر رہی تھیں۔

مولانا منورالدین نے عام درسی کتابیں یقیناً لاہور یا قصور میں پڑھ لی ہوں گی۔ کیونکہ عازم دہلی ہونے سے پیشتر وہ عمر کی سولہ منزلیں طے کر چکے تھے اور ایک معروف علمی خاندان کا چشم و چراغ سولہ سال کی عمر تک علم سے کورا نہیں رہ سکتا تھا۔ اصل طلب شاہ عبدالعزیز سے استفادہ و سند کی طلب تھی، جس سے بڑھ کر سند اس ماحول میں کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

اعزہ کی نارضامندی نے مولانا منورالدین کو چھپ چھپا کر نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس زاد و توشہ کا سامان بھی محض برائے نام ہوگا۔ لیکن ان (کا) شوق نہ ذوق تمام مشکلات (پر) غالب آیا اور وہ پیدل گھر سے نکل پڑے۔ سرہند تک سفر میں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ آگے بڑھے تو مرہٹوں کا ایک جیش مل گیا۔ جس نے انہیں بیگار میں پکڑ لیا۔ کبھی گھوڑوں اور کبھی خچروں کی سائیسی کا کام ان سے لیا جاتا اور کبھی گاڑیاں کھچوائی جاتیں۔ کرنال تک اسی حالت میں سفر کیا۔ کرنال سے آگے بڑھے تو ایک انگریزی فوج نظر آئی جسے دیکھتے ہی مرہٹے سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اسی فوج کے ساتھ مولانا منورالدین دہلی پہنچے۔

بظاہر یہ ستمبر ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہونا چاہیے، کیونکہ انگریز جرنیل لارڈ لیک اگست ۱۸۰۳ء میں علی گڑھ کول کو مسخر کرتا ہوا ستمبر میں دہلی پہنچا تھا اور شہر سے باہر سندھیا اور ہلکر کی فوجوں کو شکست دے کر ۱۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو شاہ عالم ثانی فرمانروائے دہلی کی دعوت پر شہر میں داخل ہوا۔[1] یوں تخت گاہ دہلی انگریزوں کے تصرف میں آئی۔ جس پر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک ایک سو چوالیس سال قابض رہے۔

شاہ عبدالعزیز سے تلمذ، شاہ عبدالعزیز سے تلمذ کا سلسلہ باقاعدہ شروع کیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ مولانا صدرالدین آزردہ، شاہ اسمٰعیل شہید شاہ احمد سعید[2]۔ مولانا رشیدالدین وغیرہ مولانا منورالدین کے ہم درس تھے یا سمجھ لیجیے کہ اسی زمانے میں شاہ عبدالعزیز سے پڑھتے تھے۔ لیکن یہ بیان صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا منورالدین نے دہلی پہنچ کر بھی اپنے متعلق کوئی اطلاع اعزہ کو نہ بھیجی کچھ سال بعد والد کی شہادت کا علم ہوا تو وہ قصور آئے تھے[3]

مولانا منورالدین کے اعزہ کو تحصیل علم کے لیے دہلی جانے سے بدیں وجہ اختلاف تھا کہ زمانہ بدامنی کا تھا، راستوں کا امن مفقود تھا۔

---

[1] "آزاد کی کہانی" میں یہ واقعہ درست طریق پر بیان نہیں ہوا۔ لارڈ لیک نے دہلی کا محاصرہ نہیں کیا تھا۔ علی گڑھ کی تسخیر کے بعد وہ دہلی پہنچا۔ مرہٹے سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور لیک دہلی میں داخل ہو گیا۔ یہی لیک ہے، جسے شاہ عبدالعزیز مرحوم نے ایک (ہجوں) قرار دے کر اپنے ایک عربی خط میں "اسے قمل" تحریر فرمایا۔

[2] "آزاد کی کہانی" میں شاہ احمد سعید ہی ہے (ص: ۹۸) لیکن شاہ احمد سعید مجددی کی ولادت ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء کی ہے وہ مولانا منورالدین کے ہم درس نہیں ہو سکتے۔ یہ یقیناً شاہ احمد سعید کے دادا شاہ ابوسعید ہوں گے۔ جن کی ولادت ۹ اکتوبر ۱۷۸۲ء (۲ ذی قعدہ ۱۱۹۶ھ) کی ہے اور انہوں نے حجاز سے واپسی پر ۲۱ جنوری ۱۸۳۵ء (یکم شوال ۱۲۵۰ھ) کو ٹونک میں وفات پائی۔ [3] "آزاد کی کہانی" ص: ۹۶۔

قافلے لٹتے تھے، اکا دکا مسافر کے لیے طویل سفر کا تو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ نفس تحصیل علم سے اختلاف کی کون سی وجہ تھی؟ لیکن جب وہ اعزہ کی مرضی کے خلاف دہلی پہنچ گئے تھے، تو اس معاملے کو اخفا میں رکھنے یا اقربا کو تشویش اور خلجان اور تفکر و تردد سے نجات نہ دلانے میں کون سی مصلحت حائل ہو سکتی تھی۔ مولانا منورالدین ایک نہایت شریف گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور ان کا احساس شرافت و ذمہ داری کیوں کر گوارا کر سکتا تھا کہ اقربا مسلسل و متواتر اضطراب و بے یقینی کا تختۂ مشق بنے رہیں۔ یقیناً انہوں نے جلد سے جلد گھر اطلاع بھیج دی ہوگی کہ میں بہ خیریت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچ گیا ہوں۔ علوم کی تکمیل کے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گا۔ یہ اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا کہ اقربا میں سے کوئی فرد دہلی آ جائے گا اور انھیں تکمیل علم کے بغیر دہلی سے قصور لے جائے گا۔ بعض اوقات تو یہ خیال آتا ہے کہ انہوں نے چند منزلیں طے کر لینے کے بعد ہی اطلاع گھر بھیج دی ہوگی یعنی قصور کی طرف جانے والے کسی فرد سے تاکیداً کہہ دیا ہوگا کہ ان کے گھر خیریت کا پیغام پہنچا دیا جائے۔

والد کی شہادت: یہ بیان بھی میرے نزدیک صحیح نہیں کہ تیرہ سال بعد والد کی شہادت کا علم ہوا تو مولانا منورالدین گھر پہنچے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ والد کی شہادت ملتان کی آخری جنگ میں ہوئی، جس میں نواب مظفر خاں اور اس کے پانچ جگر بند — شاہ نواز خاں، ممتاز خاں، حق نواز خاں، ایاز خاں اور شہباز خاں — شہادت سے سرفراز ہوئے، ۲ر جون ۱۸۱۸ء کی تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا تو یہ ۱۸۰۳ء کے بعد پندرہ سال کا واقعہ ہونا چاہیے نہ کہ چھ سال کا۔ اگر والد کی شہادت کا واقعہ درست مان لیا جائے تو مجھے بار بار احساس ہوتا ہے کہ یہ ملتان کا نہیں قصور کا واقعہ ہوگا، جس پر رنجیت سنگھ نے فروری ۱۸۰۷ء میں حملہ کیا تھا۔ اگر مولانا منورالدین کے والد قصور میں رہتے تھے تو اغلب ہے انہوں نے اپنے عقیدت مند افغان رئیس کی حمایت میں جنگ کی ہو اور شہادت پا گئے۔ خاصی مدت گزر جانے کے بعد مولانا منورالدین کو علم ہوا ہوگا۔ کیونکہ اس زمانے میں تاروں یا اخباروں کا سلسلہ جاری نہ تھا اور دہلی میں غالباً کوئی اخبار بھی نہ تھا۔ پھر وہ قصور آئے اور باقی ماندہ اقربا کو ساتھ لے گئے۔

دہلی میں توطن: غالباً مولانا منورالدین اس وقت تک دہلی میں قیام پذیر ہونے کا فیصلہ فرما چکے ہوں گے اور ممکن ہے درس گاہ کی داغ بیل بھی ڈال چکے ہوں۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد حالات کی ابتری ان کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی وجہ سے اقربا کے لیے دہلی کا قیام مناسب سمجھا جہاں فی الجملہ امن تھا اور انتظام بھی سب سے بہتر تھا۔ اگرچہ کارفرمائی کی باگ ڈور انگریزوں کے حوالے ہو چکی تھی۔

یہ علم نہ ہو سکا کہ اقربا میں اس وقت کون کون موجود تھے۔ ۱۸۵۶ء کے اواخر یا ۱۸۵۷ء کے اوائل میں انہوں نے خود بہ قصد ہجرت حجاز کے لیے رخت سفر باندھا تو بظاہر اقربا میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ ایک وہ خود تھے اور دوسرے ان کے نواسے شیخ خیرالدین تھے، جن کی عمر اس وقت پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔

دہلی کی زندگی: بہرحال مولانا منورالدین نے دہلی میں شادی کی۔ ان کے صرف دو بیٹیاں ہوئیں۔ نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔ بیٹیوں میں سے ایک کی شادی کسی اور سے کر دی۔ ایک بیٹی کا نکاح مولانا کے دادا شیخ محمد ہادی (بن شیخ محمد افضل) سے کر دیا اور انھیں خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس لیے بھی کہ وہ نرینہ اولاد سے محروم تھے اور اس خیال سے بھی کہ شیخ محمد ہادی درسگاہ کی ذمہ داریاں سنبھال

لینے کے اہل تھے۔

شیخ محمد ہادی نے علوم کی تکمیل مفتی صدر الدین آزردہ سے کی تھی، جو مولانا منور الدین کے گہرے دوست اور مشیر خاص تھے۔ محمد ہادی اپنے عہد میں غیر معمولی ذہانت اور قوت حفظ کی وجہ سے ضرب المثل تھے۔ پوری قاموس اور تمام کتب درسیہ مع حواشی اس طرح از بر تھیں کہ اساتذہ کہا کرتے تھے، یہ کتابیں گم ہو جائیں تو شیخ محمد ہادی اپنے حافظے سے انہیں پھر لکھ کر دے سکتے ہیں۔ قریبًا پچیس سال کی عمر پائی۔ ان کے انتقال کے وقت مولانا کے والد تین یا چار برس کے تھے۔

مولانا کے والد ماجد کی ولادت کا سال ۱۸۳۱ء ہے (۱۲۴۷ھ) گویا شیخ محمد ہادی کی وفات ۱۸۳۴ء یا ۱۸۳۵ء میں ہوئی۔ اگر پچیس برس کی عمر کا اندازہ درست ہے تو ان کی ولادت ۱۸۰۹ء یا ۱۸۱۰ء میں ہوئی۔ جب مولانا منور الدین کو دہلی پہنچے ہوئے سات برس گزر چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی دادی (اہلیہ شیخ محمد ہادی، دختر مولانا منور الدین) کا بھی انتقال ہو گیا۔

خاندان مولانا کے عام طریق تسمیہ کے خلاف نواسے کے نام میں "الدین" کا پیوند لگانے سے بھی ظاہر ہے کہ مولانا کے والد کا نام "خیر الدین" مولانا منور الدین نے رکھا ہوگا اور عقائد میں بھی وہ اسی مسلک کے پابند تھے، جو مولانا منور الدین کا تھا بلکہ اس مسلک میں ان کا تشدد بظاہر درجۂ کمال پر پہنچ گیا تھا۔

محمد ہادی کے بھائی: شیخ محمد ہادی، شیخ محمد افضل کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی دو تھے: ایک شیخ محمد یوسف، دوسرے شیخ محمد متقی۔ ان کی مختصر سی کیفیت بھی ملاحظہ فرما لیجیے:

۱۔ شیخ محمد یوسف سب سے بڑے تھے۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیزؒ سے علوم کی تکمیل کی اور طب بھی پڑھی، تا کہ معاش کے لئے کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ بہ حیثیت طبیب نمایاں شہرت حاصل کی۔ مولانا فرماتے ہیں:

> بہت بڑے خوش نویس تھے اور ان کے لکھے ہوئے قطعات دور دور لے جائے جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں خود میں نے دیکھی ہیں اور نہایت خوب ہیں، جو انھوں نے محض اپنے شوق سے نقل کی تھیں۔ اگرچہ انھیں تمام علوم میں دخل تھا، مگر معقولات سے زیادہ شوق تھا[1]

شیخ محمد یوسف نے شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے ساتھ ہجرت کی[2] اور مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کر لی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ غدر سے پانچ چھ سال بعد انتقال کیا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے[3]

۲۔ شیخ محمد متقی نے بھی تحصیل شاہ عبدالعزیزؒ سے کی تھی لیکن علوم کی تکمیل مولانا منور الدین کی خدمت میں ہوئی۔ وہ اپنے والد شیخ محمد افضل کے جانشین ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے الم انگیز سانحے کے بعد وہ بھی ہجرت کر گئے اور مدینہ منورہ میں اپنے بھائی کے ساتھ رہے[4]

---

[1] "آزاد کی کہانی" ص: ۸۵۔ [2] یہ ہجرت ۱۲۵۷ھ ۱۸۴۱ء میں ہوئی

[3] "آزاد کی کہانی" ص: ۸۶۔ [4] ایضًا ایضًا۔

پتا نہ چل سکا کہ شیخ محمد یوسف یا شیخ محمد متقی کے اخلاف میں کوئی ایسا بھی تھا یا نہیں، جو گھرانے کا نام روشن رکھ سکتا۔ مولانا نے اپنے والد ماجد کے مرتبہ رسالے کی بنا پر خاندانی حالات کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا تھا، وہ فضل الدین میرزا نے "تذکرہ" کی جلد دوم کے ساتھ محفوظ رکھ لیا تھا۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، وہ "تذکرہ" جلد دوم کا مسودہ لے کر مولانا کی نظربندی کے زمانے میں پنجاب آگئے اور کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔ اس طرح وہ مسودہ گم ہوگیا۔

میری کتاب "غالب" کا بھی ایک نسخہ مولانا کی تصریحات سے مزین ہوا۔ یہ تمام تصریحات مرتب کر کے میں نے "نقش آزاد" کے آخر میں لگا دی تھیں۔ ان میں ایک مقام پر مفتی صدرالدین آزردہ کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> والد مرحوم اپنے چچا کا جنھوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی تھی۔ جب کبھی ذکر کرتے تھے تو مفتی صاحب کا یہ شعر ضرور پڑھتے تھے

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گیا
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے[1]

بظاہر یہ اشارہ شیخ محمد یوسف کی طرف ہوتا ہے۔ اگرچہ شیخ محمد متقی بھی مدینہ منورہ ہی کی خاک مقدس میں آسودۂ خواب ابدی ہیں۔

مولانا منورالدین کے عام حالات: اگر مولانا منورالدین کی ولادت کا سال (۱۷۸۰ء) ہمارے قیاس کے مطابق صحیح ہے یا قرین صحت ہے تو انھوں نے سنہ ۱۸۱۱ء سے ہجرت تک پورا وقت دہلی ہی میں گزارا۔ ہجرت کے وقت وہ ستر سال کے ہو چکے تھے۔

دہلی میں ان کی درسگاہ خاص مشغولیت کی متقاضی ہوگی کیونکہ وہ بظاہر آخری دور کی مشہور درسگاہ تھی۔ وقت کے اکابر میں سے مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا رشید الدین سے مولانا منورالدین کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> مفتی صاحب[2] چونکہ مولانا منورالدین کے ہم درس ہوئے تھے، اس لیے دونوں میں برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے ... والد مرحوم[3] (نے) مفتی صاحب سے بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے فضل و کمال اور جامعیت کے بے حد معترف تھے۔ فرماتے تھے ان کا سلوک مجھ سے ایسا تھا، جیسا اپنے خاص عزیزوں سے ہوتا ہے۔ عید کے دن ہمارے یہاں آتے اور جس طرح اپنے عزیزوں کو بطور عیدی کے کچھ دیا کرتے تھے، ایک اشرفی میرے لئے بھی ضرور لاتے۔ نانا مرحوم[4] فرماتے، یہ اشرفیاں بطورِ تبرک کے جمع رکھو[5]

درس کے علاوہ مولانا منورالدین جمعہ کے روز وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> اُن کا وعظ سننے کے لئے لوگ ہر جمعہ کو جوق در جوق آتے اور تیس تیس چالیس چالیس میل پیدل جاتے۔ بڑے بڑے علماء مشائخ، امرا اور شہزادے ان کے وعظ کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور متاثر ہو کر معاصی سے تائب ہو جاتے[6]

---

[1] "نقش آزاد"۔ ص: ۲۹۹۔ [2] مفتی صدرالدین آزردہ۔ [3] مولانا شیخ خیرالدین۔

[4] مولانا منو[illegible]ن۔ [5] "نقش آزاد" ص: ۲۹۸-۲۹۹۔ [6] "آزاد کی کہانی" ص: ۸۲۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ نہ کسی امیر کے مکان پر جاتے اور نہ ضیافت قبول کرتے۔ البتہ فقرا کے یہاں بے تکلف جاتے اور انھیں اپنے یہاں بلاتے[1]

ایک مباحثہ: مولانا منورالدین کے سلسلے میں ایک مباحثے کا ذکر ہے جسے "۱۲۴۸ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد" کہا گیا ہے اور اس میں:

> ایک طرف مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحی، دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علمائے دہلی تھے[2]

یہ روایت کیوں کر درست مانی جا سکتی ہے۔ ۱۲۴۸ھ سے دو سال پیشتر تو مولانا شاہ اسماعیل بالاکوٹ میں شہادت پا چکے تھے اور وہ ۱۲۴۳ھ میں سرحد پہنچ گئے تھے۔ مولانا عبدالحی مرحوم بالاکوٹ کے حادثۂ المیہ سے بھی بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا ہوگا۔ اسے فاضل مؤلف کتاب محفوظ نہ رکھ سکے۔

خود مولانا فرماتے ہیں:

> مولانا منورالدین اور ان کی جماعت جابجا استناد و استشہاد بعض علما کی کتابوں، شاہ عبدالعزیز کے خاندان کے طرزِ عمل اور مختلف مکاتیب و ملفوظات سے کرتے تھے اور اسے دلیل و حجت سمجھتے تھے۔ مولانا اسمٰعیل صرف قرآن و حدیث سے سند مانگتے تھے[3]

ظاہر ہے کہ اس حالت (میں) مباحثے یا مناظرے کا کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا تھا۔

آخری "دلیل":

مولانا آخر میں فرماتے ہیں:

> جب تمام دلائل ختم ہو گئے تو ان (مولانا منورالدین) کی طرف سے یہ دلیل پیش کی گئی کہ شاہ عبدالعزیز پنج شنبہ (کو) شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کے مزارات پر جاتے اور توسل و استغاثہ کرتے تھے اور تم لوگ (شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی) بھی ان کے ساتھ وہاں حاضر ہوتے تھے۔ لیکن مولانا عبدالحی نے جب یہ جواب دیا کہ دلیل قرآن و حدیث سے چاہیے۔ نہ کہ زید و عمرو کے افعال سے تو اسے شاہ صاحب کی توہین پر محمول کیا گیا۔
>
> مجلس میں شور اٹھا کہ یہ لوگ اپنے بزرگوں اور استادوں سے بھی برگشتہ ہو گئے ہیں۔

یہ امر محتاج تصریح نہیں کہ مولانا منورالدین کا مؤقف کسی بھی اعتبار سے درست نہ تھا۔

بہرحال اگر یہ مباحثہ یا مناظرہ ہوا تو بہت پہلے کا ہونا چاہیے یعنی اس وقت کا جب شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی سفر حج سے واپس آ چکے تھے، شاہ عبدالعزیز مرحوم وفات پا چکے تھے اور جہاد کی نیت سے سرحد کا سفر شروع نہیں ہوا تھا۔

---

[1] "آزاد کی کہانی" ص: ۷۲۔ [2] "آزاد کی کہانی" ص: ۷۹۔

[3] "آزاد کی کہانی"۔ ص: ۷۹۔ ۸۰۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مولانا منور الدین مرحوم کا مذہبی مسلک یہاں کے عام علما کا سا تھا اسی لیے میں نے پہلے عرض کیا کہ ان کے نواسے مولانا شیخ خیر الدین (والد ماجد مولانا ابو الکلام) کا مسلک بھی وہی تھا جو ان کے نانا کا تھا بلکہ مولانا شیخ خیر الدین کا تشدد زیادہ بڑھ گیا تھا۔

قلعہ معلی سے تعلق: مولانا منور الدین پرانے اساتذۂ علم میں سے تھے، اس لیے کہ وہ قلعہ معلی میں خود بھی جاتے ہوں گے اور مختلف تقریبات میں بلائے بھی جاتے ہوں گے۔ "آزاد کی کہانی" میں جو حالات بتائے گئے ہیں میرے نزدیک وہ سراسر غیر مستند ہیں۔ مثلاً میرزا ابوبکر کو بہادر شاہ کا ولی عہد قرار دیا گیا ہے۔ تاریخ کو بہادر شاہ کے صرف دو ولی عہدوں کا علم ہے: اول دارا بخت، جس کا انتقال ۱۸۴۹ء میں ہوا، دوم فخر الملک شہزادہ غلام فخر الدین عرف میرزا فخرو، جس کی ولی عہدی کے وقت بہادر شاہ نے بیگم زینت محل کے پاس خاطر سے شہزادہ جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی کوشش کی تھی، جو ناکام ہوئی۔ میرزا فخرو کا انتقال جولائی ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ تیسرے ولی عہد کا فیصلہ ہی نہیں ہوا تھا کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یکایک ایک ایسا تیز جھکڑ چلا کہ نہ قلعہ معلی رہا اور نہ بادشاہی کا وہ سایہ سا باقی رہا جو کئی پشتوں سے تیموریوں کی عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ خوش تھے کہ وہ بہرحال بادشاہ ہیں۔ جو لوگ حکمرانی کے تمام اختیارات سنبھالے بیٹھے تھے، وہ رفتہ رفتہ بادشاہی کی بساط لپیٹتے جا رہے تھے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اچانک ایک تیز و تند طوفان بادبرپا ہوا۔ وہ تھا تو نہ قلعہ، قلعہ معلی تھا اور نہ بادشاہی کا وہ سایہ باقی تھا جسے تیموریوں کی عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ لہذا جواں بخت اور کسی دوسرے شہزادے کے درمیان ولی عہدی کے لیے کشمکش کا سوال ہی خارج از بحث ہو چکا تھا۔

میرزا ابوبکر ان شہزادوں میں سے ایک تھا، جنھیں شقی القلب ہاڈسن نے شاہ جہان آباد کے دہلی دروازے کے باہر "خونی دروازے" کے پاس (پرانے جیل کی عمارت کے سامنے) بے دردانہ گولیاں مار کر شہید کر ڈالا تھا۔ ان میں سے ایک شہزادہ مغل بیگ، دوسرا شہزادہ خضر سلطان اور تیسرا میرزا ابوبکر تھا، جو رشتے میں میرزا فخرو کا بیٹا اور بہادر شاہ کا پوتا تھا۔

وفات: مولانا منور الدین نے اپنے نواسے کو ساتھ لے کر ۱۸۵۶ء کے اواخر یا ۱۸۵۷ء کے اوائل میں بہ نیت ہجرت حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ بھوپال پہنچے تو ہنگامہ ۱۸۵۷ء شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے وہاں رکے رہے۔ جب امن ہوا تو بمبئی گئے۔ یہ بظاہر ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہونا چاہیے۔ بمبئی پہنچ کر مولانا منور الدین بیمار ہو گئے اور خود مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ان کا انتقال بمبئی ہی میں ہو گیا تھا۔ مولانا کے والد ماجد ہجرت کی نیت سے نکل چکے تھے اور ہندوستان سے ان کا کوئی خاص تعلق بھی نہیں رہا تھا۔ اس لیے حجاز چلے گئے۔

چوتھا باب

نسب و خاندان اور دہلویت

تمہید: مولانا ابو الکلام مرحوم و مغفور کے نسب اور خاندان کے متعلق جو کچھ مختلف ذرائع سے معلوم ہو سکا، وہ گزشتہ ابواب میں بے کم و کاست پیش کر دیا گیا۔ اس کے کسی حصے سے معقول اختلاف یا کسی بیان کی مبنی بر حقائق تردید گناہ نہیں! انسانوں کے احوال و وقائع میں ایسے امور کا راہ پا جانا تعجب انگیز نہیں سمجھا جا سکتا، جو غلط یا محل نظر ہوں۔ لیکن اختلاف کی جائز صورت کیا ہو سکتی ہے؟ یہ کہ غلط اور محل نظر امور کے مقابلے میں مستند اور

محقق بیانات پیش کئے جائیں۔ بتایا جائے کہ فلاں واقعہ کس وجہ سے محلِ نظر قرار پایا اور فلاں سانحے کو کس بنا پر ناقابلِ قبول سمجھنا چاہیے۔ ایسے اختلافات پر نہ محض اعتراض ہی نہیں ہو سکتا بلکہ خوشی ہوتی ہے کہ اہلِ علم و نظر نے حقیقت کی تہ تک پہنچنے میں گراں قدر امداد دی اور مفصل سوانح مرتب کرنے والے ہی پر نہیں، بلکہ ان سوانح کے خوانندگان کرام پر بھی احسان فرمایا اور معاملات کو زیادہ محقق و منقح بنانے کی کوشش سے علم کی خدمت انجام دی۔ لیکن نہایت نازیبا اور بالکل بے بنیاد افسانہ بافیوں سے اصل مقصد کو کیا تقویت پہنچ سکتی ہے؟ ایسی افسانہ بافیوں سے تو تاریخ کی نہایت مقدس، نہایت پاک اور نہایت معصوم ہستیاں بھی محفوظ نہ رہیں۔ کیا عرفی نے نہیں کہا؟

یوسفؑ این را متحمل شد و مریمؑ بر داشت

پھر مولانا ابو الکلام مرحوم اگر ایسی خدنگ افگنوں کا ہدف بنے تو اس پر حیرت و استعجاب کیوں ہو؟

دورِ حاضر کا شیوہ : دورِ حاضر کا عام شیوہ و شعار یہی ہے کہ جب کسی فرد سے کسی معاملے میں اختلاف رونما ہو جائے تو دینِ حق کے مقررہ ضابطے اور شرافت و انسانیت کے تمام تقاضوں سے یکقلم آنکھیں بند کر کے وہ پوری سیاہی محض مخالف ہی نہیں بلکہ اس کے آبا و اجداد کے چہروں پر بھی مل دینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے، جو حق و انصاف سے ناآشنا دل و دماغ اپنی ہر صلاحیت و صنع و ساخت سے کام لے کر تیار کر سکتے ہیں اور اس نازیبا کام کو جہاد کا درجہ دے دینا چاہیے۔ یہی ہوا اور اس غیر شایاں کام کے ذمہ دار ناخواندہ یا کم خواندہ اصحاب نہیں ہوئے جنھیں یہ اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ان اصحاب کے ہاتھوں انجام پایا جو بہ زعمِ خود علم و فضل کے یکہ تھے اور اپنے لیے شرافت و ثقافت کے بلند ترین مدارج مخصوص سمجھتے تھے، حالانکہ اس فعل کو ہر علم و فضل کی واضح تردید اور ہر شرافت و ثقافت کی کھلی ہوئی نقیض کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا اور کسی شریف و حق شناس قوم کا کوئی فرد اس پر فخر نہیں کر سکتا جس اختلاف کو چند افراد انتہائی دنائت اور ناقابلِ تصور بددیانتی کی دستاویز بنا لینے پر فخر کریں۔ اس کے بارے میں کچھ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

میرزا غالب کے لیے "برہانِ قاطع" کی بحث کے سلسلے میں ایسی ہی صورت پیش آگئی تھی تو میرزا نے مولوی احمد علی جہانگیر نگری صاحب "مؤید برہان" سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

بہر ما نفریں و بہر خویش تحسیں جا بجا
ہم مرا ہم خویش را در دہر رسوا کردہ است

مولانا ابو الکلام مرحوم کی روح بھی شاید عالمِ بقا میں ان اصحاب کے لئے یہی شعر دہرا رہی ہوگی۔

نسب کا مبحث : کتاب کے آغاز ہی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ نسب یا خاندان کسی کے لیے بھی باعثِ فخر و شرف نہیں۔ قرآن حکیم نے عالمِ انسانیت کے سامنے زندگی کا جو بنیادی تصور پیش کیا ہے، اس میں نسب یا خاندان کے لئے کوئی بھی درجہ نہیں رکھا گیا بلکہ عملِ صالح اور تقویٰ کے سوا ہر اضافی شے کو یکسر ٹھکرا دیا گیا ہے۔ خواہ وہ دولت و ثروت کا غرور ہو یا عہدے اور منصب کی تمکنت یا رنگ و نسل کا افتخار۔ ان میں کسی بھی شے کو پرِ کاہ کی حیثیت حاصل نہیں۔ مقصود و مطلوب صرف حسنِ عمل اور پرہیزگاری ہے اور اسی پر انسانوں کے درجات کا انحصار ہے۔ اقبال نے جب فرمایا تھا:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ بھی ایک اعتبار سے انسانی مساوات کا اعلان تھا۔ انسان ہونے کے اعتبار سے سب کا درجہ ایک ہے اور اس میں کوئی اونچ نیچ موجود نہیں۔ البتہ ہر انسان حسنِ عمل سے اپنا درجہ جتنا بلند کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اعزاز و اکرام دولت یا خون یا نسل یا خاندان یا رنگ یا منصب پر نہیں صرف تقویٰ پر موقوف و منحصر ہے۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کے مطابق مسابقت کا میدان خدا کے اوامر و نواہی پر زیادہ سے زیادہ پختگی سے کاربندی کے سوا کچھ نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کے مطابق قریش اس بت کے سب سے بڑے پجاری تھے، جو نسب اور خاندان کے نام سے مشہور تھا۔ کیا یہ معلوم نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اس میں یہ الفاظ بھی تھے؟

یا معشر قریش قد اذهب عنکم نخوة	اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار
الجاهلیة و تعظمه بالآبآ الناس من آدم	خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم
و آدم من تراب	مٹی سے بنے تھے۔

کیا اس ایک ارشادِ مقدس نے پورے عالمِ انسانیت کے تمام گروہوں اور تمام طبقوں کو پستی و بلندی کے خود ساختہ اور خود تراشیدہ درجے توڑ کر ایک سطح پر نہ کھڑا کر دیا؟ کیا ایک باپ کی اولاد کے ہر فرد کا درجہ اصلاً ایک نہیں ہوتا؟ اگر روئے زمین پر بسنے والے انسان آدم کی اولاد ہیں، تو ان کے درجات میں اونچ نیچ کیوں ہو؟ وہ کالے ہوں یا گورے، شرقی ہوں یا غربی، عربی ہوں یا عجمی، دولت مند ہوں یا غریب، عالم ہوں یا ناخواندہ، انھیں عارضی طور پر کسی وقت کارفرمائی کا درجہ مل جائے یا وہ محض کارکن ہوں۔ مگر ان میں انسان ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ سب ایک باپ کی نسل سے ہیں۔ ہاں، تفاوتِ درجات کا انحصار حسنِ عمل اور تقویٰ پر ہے۔ وہ بھی اللہ کے نزدیک، یعنی اجر و ثواب کے معاملے میں، نہ کہ انسان ہونے (کے) معاملے میں۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ اس ایک اعلانِ حق نے پوری انسانیت کے لئے مسابقت کا ہر عامل ختم کر دیا، جو ایک باپ کی اولاد میں نزاع کا باعث تھا۔ صرف حسنِ عمل میں مسابقت کا معاملہ باقی رہ گیا جس میں نزاع و کشمکش ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ حسنِ عمل اور تقویٰ کے منافی ہو گی۔

قوامین للہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

یا ایها الذین آمنوا کونوا قوامین للہ	اے ایمان والو! تم اللہ کے لیے راستی پر قائم رہنے اور
شهداء بالقسط لا یجرمنکم شنان	انصاف کے لیے گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی
قوم علی الا تعدلوا اعدلوا هو	تمھیں اس بات کے لئے نہ ابھار دے کہ عدل سے روگرداں
اقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ	ہو جاؤ۔ عدل کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔
خبیر بما تعملون۔ (مائدہ : ۸)	اللہ (کی نافرمانی کے نتائج سے) ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو
	اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

شیخ الہند مرحوم کے مترجم و محشی قرآن مجید میں اس آیت پر مفصل حاشیہ ہے جس کے بعض مطالب ذیل میں درج ہیں:

۱۔ عدل کا مطلب ہے کسی شخص سے افراط و تفریط کے بغیر وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی دونوں پلوں میں سے کسی کو جھکا نہ سکے۔

۲۔ تحصیل تقویٰ کے اسباب قریبہ و بعیدہ بہت ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ "عدل و قسط" یعنی دوست اور دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملے میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا حصول تقویٰ کے مؤثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے۔

ہمارے بھائی سوچیں کہ آیا ان کے اقدام کو اس فرمانِ الٰہی کی تعمیل سے کوئی مناسبت ہے؟ جس سبب کو تحصیل تقویٰ کے مؤثر ترین اور قریب ترین اسباب میں شامل سمجھا گیا ہے، اس کا کوئی لحاظ انہوں نے فرمایا؟

قابلِ غور حقائق علاج بالمثل جسمانی عوارض کے سلسلے میں کتنا ہی مفید و نفع بخش ہو لیکن اگر اخلاقی ذمائم کے تعلق میں اس سے کام لیا جائیگا تو نتیجہ اخلاقی پستی اور گراوٹ کے سوا کیا نکلے گا؟ اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آج جن مشکلات میں اپنے آپ کو محصور پاتے ہیں، ان کا بیشتر حصہ اسی قرآنی تعلیم اور اسی اسلامی اصل کو نظرانداز کیے رکھنے کا نتیجہ ثابت ہوگا جس میں فرمایا گیا تھا کہ ایمان والوں کو ہر حال میں عدل پر استوار رہنا چاہیے اور وہ کسی کی محبت یا عداوت کے باعث عدل سے منحرف نہ ہوں۔

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجیے کہ مولانا کے بزرگ کھتری نہیں بلکہ شودر رہتے۔ انھیں علم و فضل سے کبھی کوئی واسطہ یا تعلق نہ رہا۔ اس سلسلے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، وہ پورے کا پورا بے اصل ہے۔ مولانا کے والد یا ان کے نانا کا وطن کھیم کرن تھا۔ وہ غیر مسلم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انھیں دینِ حق کی ہدایت فرمائی اور مولانا کے خاندان کا طول و عرض صرف اتنا ہی تھا۔ باقی جو کچھ ہے محض داستان طرازی ہے۔ مگر اس سے خود مولانا کے فضائل کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ کیا پاکستان و ہند کے ہزاروں نجیب الطرفین سید یا نسب و خاندان کی برتری کے دوسرے استخواں فروش یا خود یہ محققین مل کر اور متحد ہو کر "الہلال"، "البلاغ"، "الجامعہ"، "تذکرہ"، "قول فیصل"، "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب"، "غبار خاطر" یا "ترجمان القرآن" جیسی ایک بھی چیز پیدا کر سکتے ہیں؟ مولانا کی دعوت قرآن نے لاکھوں سینوں میں دین حق سے عشق و شیفتگی کی بھٹیاں سلگا دیں اور ان کی زندگیاں بدل ڈالیں۔ مگر کیا یہ محققین چار صفحے بھی ایسے پیش کر سکتے ہیں جن سے کسی قلب میں چند لمحوں کے لئے مطلوب حرکت پیدا ہوئی ہو؟ مولانا نے اپنے مقاصد و عزائم کی خاطر (اور ان مقاصد و عزائم کا سرچشمہ اسلام تھا) ساڑھے دس سال قید و نظر بندی میں گزارے۔ ان کا بیش بہا علمی اندوختہ تباہ ہو گیا۔ کیا یہ محققین اپنی پوری زندگی کے چند ثانیے بھی پیش کر سکتے ہیں، جن میں ایسی قربانی کی کوئی جھلک ہو؟ اگر مولانا نے ایک نو مسلم خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت میں ایسے یگانہ علمی کارناموں کی توفیق پائی، تو یہ امر باعث تحقیر و تعریض نہیں۔ موجب صد اعزاز و افتخار ہے اور جن لوگوں کو دس دس بیس بیس یا پچاس پچاس پشتوں سے مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے، کیا یہ بات ان کے لیے کسی وجہ سے بھی باعث فخر سمجھی جا سکتی ہے کہ صدیوں سے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے باوجود ایک بھی ایسے درخشاں کارنامے سے شرف یاب ہونے کا نشان پیش نہ کر سکے حالانکہ اس طویل حلقہ بگوشی پر انھیں اتنا فخر ہے کہ اس کے سامنے نو مسلم خاندان کے ایک فرد کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں؟ بے شک باعث

فخر نسب و خاندان نہیں۔ باعث فخر صرف حسن عمل اور تقویٰ ہے۔ صرف اسلامی فرائض کی بجا آوری ہے۔

حیرت افزا طرزِ عمل: پھر ہمارے دور میں حضرت علامہ اقبال اسلام کے بہت بڑے داعی اور ترجمان تھے اور یہ معلوم ہے کہ ان کے جدِ امجد مشرف باسلام ہوئے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری گوت "سپرو" ہے۔ نیز فرماتے ہیں:

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز "برہمن پسرے" محرم اسرار کجاست

قائد اعظم مرحوم کا خاندان بھی کچھ ہی عرصہ پیشتر مسلمان ہوا تھا۔ یقیناً شرف و عزت نسب و خاندان میں نہیں بلکہ ہر انسان کے حسن عمل اور ذاتی کارناموں میں ہے۔ مولانا عبید اللہ مرحوم و مغفور جو سندھ میں خاصی مدت گزارنے کے باعث "سندھی" مشہور ہوئے، خود دائرۂ اسلام میں آئے۔ پھر ان کی حیاتِ گرانمایہ کا ایک ایک لمحہ اسلام و مسلمین اور آزادی کے لیے وقف رہا۔ کیا کوئی شخص یہ جرأت کر سکتا ہے کہ ان کارناموں کی تحقیر کے لئے انھیں "نو مسلم" قرار دے کر خوش ہو جائے؟

یہ سب کچھ اسی ذہنیت کا کرشمہ ہے جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے خطبۂ عالیہ میں "جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار" قرار دیا تھا۔ ہجرت کے آٹھویں سال فرما دیا تھا کہ خدا نے اسے مٹا دیا۔ ان مدعیان اسلام کی جسارت حیرت افزا ہے جو چودہ سو سال بعد نسب کی بنا پر لوگوں کے درجات کا فیصلہ کرتے ہیں!

دہلویت: مولانا کی "دہلویت" کا معاملہ زیادہ گفتگو کا محتاج نہیں۔ مولانا کے نزدیک ان کے اجداد پشتوں سے دہلی میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ ابتدا ہی سے اپنے آپ کو "دہلوی" لکھتے رہے۔ انہوں نے پہلا رسالہ "لسان الصدق" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس کی پیشانی پر بھی "ایڈیٹر ابوالکلام دہلوی" لکھا جاتا تھا۔ وہ کچھ مدت "الندوہ" میں رہے۔ اس میں بھی اپنے نام کے ساتھ "دہلوی" لکھتے رہے۔ نہ مولانا شبلی مرحوم نے اس پر اعتراض کیا، نہ کسی دوسرے نے اسے محل نظر قرار دیا۔ جب "الہلال" جاری ہوا تو اس پر بھی پہلے دن سے چھپتا رہا:

مدیر مسئول و محرر خصوصی
احمد المکنی بابی الکلام "الدھلوی"

اس میں کوئی خاص تقدس نہ تھا۔ دہلی سے لاکھوں افراد مختلف دوروں میں وابستہ رہے اور "دہلویت" ان کے لئے محض اظہار سکونت و وطنیت کا ایک ذریعہ تھی۔ اس کے سوا کچھ مقصود نہ تھا۔ اگر مولانا ابوالکلام مرحوم نے اپنے آبا و اجداد کی دیرینہ وطنیت کی بنا پر اپنے آپ کو "دہلوی" لکھنا پسند کیا تو محض "دہلویت" کے انتساب سے انھیں کون سا خاص شرف حاصل ہو سکتا تھا؟

لطف یہ کہ یہ اعتراض بھی پچاس سال گزر جانے کے بعد ان اصحاب کو یاد آیا اور اس وقت یاد آیا، جب انھیں ایک سیاسی معاملے میں اختلاف کی بنا پر مولانا کے خلاف گوناگوں تعریضات کے طومار باندھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اے حسن گر از راست نرنجی سخنے ہست
ناز ایں ہمہ یعنی چہ؟ کمر ہیچ دہاں ہیچ

(پانچواں باب)

مولانا خیرالدین

(۱)

ابتدائی حالات: مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور کے والد ماجد، مولانا خیرالدین ۱۸۳۱ء (۱۲۴۷ھ) میں پیدا ہوئے[1]۔ تین یا چار سال کے تھے کہ ان کے والد شیخ محمد ہادی کا انتقال ہو گیا، جنھیں مولانا منورالدین مرحوم نے خانہ داماد بنا لیا تھا۔ گویا شیخ محمد ہادی کو اپنی پوری وراثت سپرد کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا خیرالدین کی والدہ ماجدہ نے بھی قضا کی اور کم سن نواسے کی تعلیم و تربیت کے لیے نانا کی آغوشِ شفقت کے سوا کوئی مقام نہ رہا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں مولانا منورالدین مرحوم نے کوئی ممکن کوشش اٹھا نہ رکھی ہوگی۔ اس لئے بھی کہ بچہ ان کی مرحومہ صاحبزادی کی اکلوتی نشانی تھا۔ اس لیے بھی کہ یہ اس جواں مرگ کا یتیم لختِ جگر تھا، جسے مولانا منورالدین نے ایک لحاظ سے بیٹے کا مقام دے دیا تھا۔ سب سے آخر میں اس لیے بھی کہ تنہا نواسہ ہی ان کا وارث رہ گیا تھا۔

مولانا منورالدین کے تعلقات وقت کے مشہور علمائے کرام سے بہت گہرے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نواسے کو ہر چشمۂ فیض سے دلخواہ اخذ و استفادہ کا موقع ملا ہوگا۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ مولانا خیرالدین نے اپنے نانا کے علاوہ مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم سے بھی تحصیلِ علوم کی، جنھیں علوم و فنون کے علاوہ عربی و فارسی ادب میں فضیلت کا وہ مرتبہ حاصل تھا کہ ان کے بعد پھر کوئی ویسا عالم نہ ہوا۔ معقولات کی کتابیں دوسرے اساتذہ کے علاوہ مولانا رشیدالدین صاحب "رشیدیہ" سے بھی پڑھیں[2] اور حدیث کی تکمیل حجاز پہنچ کر شاہ محمد یعقوب دہلوی نیز دیگر علمائے حجاز سے کی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں مولانا خیرالدین تکمیلِ علوم سے فارغ ہو چکے تھے۔ دوسرے علوم کے علاوہ طب بھی پڑھی بلکہ ڈاکٹری سے بھی آگاہی حاصل کی جس کے جاننے والے اس دور میں موجود تھے۔ تکمیل کے بعد مروجہ دستور کے مطابق درس بھی شروع کر دیا[3]۔

ورزشیں اور فنونِ جنگ: اس زمانے کے نوجوان ورزشیں بھی کرتے تھے اور ان فنونِ جنگ میں بھی مشق بہم پہنچاتے تھے، جن کا رواج پہلے سے چلا آتا تھا۔ مثلاً شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیراندازی نیز کشتی کے مختلف فنون۔ مولانا خیرالدین نے بھی یہ فنون سیکھے اور ان میں خاصی مشق بہم پہنچائی۔

---

[1] "آزاد کی کہانی" ص: ۸۷۔ یعنی سنہ ۱۲۴۷ھ میں۔ ۱۱ اگست ۱۹۰۸ء میں انتقال ہوا یعنی شعبان ۱۳۲۶ھ میں۔ اسی وجہ سے ان کی عمر باعتبار سنین قمری نواسی سال کی بتائی جاتی ہے۔ بہ لحاظ تقویم شمسی وہ ۷۷ سال کے ہوئے۔

[2] ان کے اساتذہ میں مولانا فضل امام خیرآبادی کا نام بھی مذکور ہے ("آزاد کی کہانی" ص: ۸۷) یہ بداہتہً غلط ہے۔ کیونکہ مولانا فضل امام خیرآبادی کا انتقال مولانا خیرالدین کی ولادت سے کم و بیش دو برس پیشتر ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۲۹ء کو ہو گیا تھا۔ غالباً مولانا نے یہاں مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام لیا ہو۔

[3] "آزاد کی کہانی" ص: ۸۹-۹۰۔

مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی

عہدِ جہانگیری کا ایک غیر معروف تذکرہ

ڈاکٹر محمد سلیم اختر

مغلیہ دورِ ہندوستان میں فارسی ادب کی بہار کا زمانہ تھا۔ اس دور میں بے شمار علما و فضلا، صوفیہ و مشایخ اور شعرا و ادبا ایران و توران سے ہندوستان وارد ہوئے اور شاہانِ مغلیہ کے جود و سخا اور ادب پروری نے نہ صرف یہ کہ بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا بلکہ ان کی دیکھ بھال اور تشویق و تجلیل میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ علم و دانش کی یہ قدر اور معارف پروری کا یہ سلسلہ صرف دربار تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہر وزیر کی دستگاہ اور ہر امیر کی محفل، علم و فضل کا مرکز اور شعر و ادب کا گہوارہ تھی۔[1] چنانچہ اس دور میں جو افراد آسمانِ فضیلت پر علم و ہنر اور فضل و کمال کے تابندہ ستارے بن کر نمودار ہوئے ان کے نام اس دور کی کتبِ تاریخ و سیر اور تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض کتب طبع ہو چکی ہیں باقی ہنوز محققین کی دقیقہ رس اور نکتہ یاب نگاہوں کی متمنی اور محتاج ہیں۔ مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی انہی موخرالذکر کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کا مؤلف ملا قاطعی ہروی ہمایوں، اکبر اور جہانگیر کا ہمعصر تھا اور اس نے اپنے معاصر بہت سے شعرا کا ذکر اس تذکرے میں کیا ہے۔ یہ تذکرہ دراصل تین دفاتر پر مشتمل تھا۔ پہلے دو دفاتر تو دستبردِ حوادث کی نذر ہو گئے، تیسرا باقی ہے اور اس کا منحصر بفرد نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ کے ذخیرۂ مخطوطاتِ اوزلی[2] میں محفوظ ہے۔ موجودہ مقالہ اسی دفترِ ثالث کی معرفی اور اس کے مؤلف — ملا قاطعی ہروی — کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالنے کی غرض سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

مجمع الشعرائے جہانگیر اور مؤلف سمیت ایک سو پچاس شعرا کے حالات پر محیط ہے جن کے ذکر میں کسی خاص ترتیب کا التزام نہیں کیا گیا چنانچہ اس سلسلے میں مؤلف کا بیان ہے:-

> تقدیم و تاخیری کہ درین مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی[3] ..... واقع شدہ باشد، بی وجہ نخواہد بود، یا

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: مولینا شبلی نعمانی، شعرالعجم (۵ جلد، چھاپ اعظم گڑھ)، جلد سوم، ص ۴ بعد، نیز ملاحظہ ہو:

BROWNE, E.G., A LITERARY HISTORY OF PERSIA (4 VOLS. C.U.P. 1959-64), VL. 4. P.16

GHANI, M.A., A HISTORY OF PERSIAN LANGUAGE AND LITERATURE AT THE MUGHAL C

(3 PARTS, ALLAHABAD, 1929-30), PART 2, P.149

[2] MS OUSELEY-186 — (SIR WILLIAM OUSELEY 1767-1862) مشہور برطانوی مستشرق ملاحظہ

کے لیے دیکھئے:

STEPHEN, SIR LESLIE AND SIR SIDNEY LEE, DICTIONARY OF NATIONAL BIOGRAPHY, (C.U.P. 1963-64), VOL. XIV. P.1257

[3] مجمع الشعرا کے صفحۂ آغاز پر اسے "تذکرۃ الشعرائے جہانگیر شاہیہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے (تصویر ملاحظہ ہو) لیکن متن میں ہر جگہ اس کا نام "مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی" لکھا ہے اور یہی نام مقالہ ہٰذا میں اختیار کیا گیا ہے۔

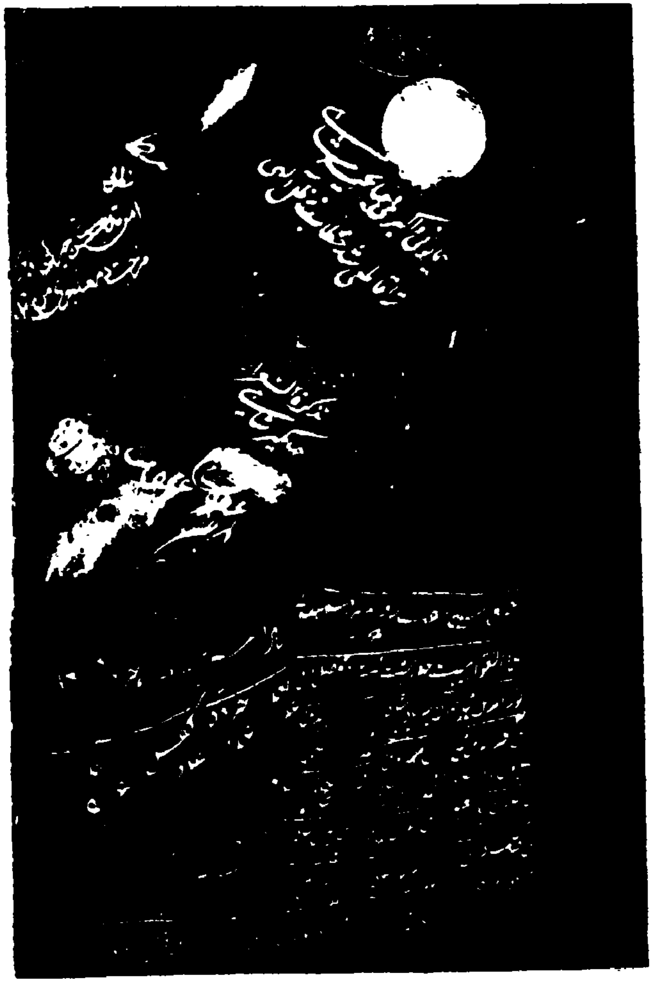

مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی کا صفحۂ آغاز (ملاحظہ ہو، مقالہ ہذا، صفحہ ۱ ، نوٹ ۲)

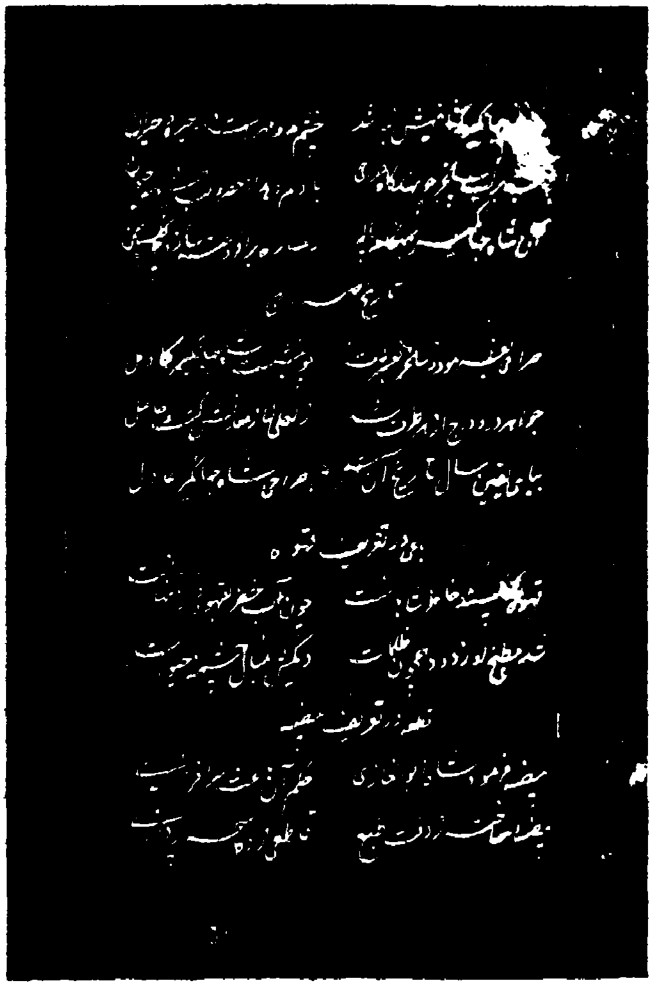

مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی کا آخری صفحہ

از رہگذرِ سیادت یا از رہگذر منصب پادشاہی و عزتِ آں یا تاخیر الزمان یا تاخیر جامعیت (است) ہرجا
تقدیم و تاخیر شدہ باشد، شرف المکان بالمکین است (ورق ۵)

مجمع الشعرائے 'دفتر ثالث' کا آغاز مختصر سے مقدمے سے ہوتا ہے جس میں حمد و نعت کے بعد اکبر کی مدح میں جہانگیر کے دورِ شہزادگی کے، ایک قصیدے کا یہ مطلع ہے

"تا کہ باشد بر فلک خورشید انور پادشاہ
پادشاہِ پادشاہاں باد اکبر پادشاہ

اور آخر میں اُس کی ایک رباعی نقل ہوئی ہے۔ مقدمے کے بعد جن شعرا کے حالات درج ہیں۔ اُن کے نام -- اور جن دوسرے مآخذ و مصا میں اُن کے حالات ملتے ہیں -- اُن کی ترتیب یہ ہے :-

ذکرِ خیر میرزا عرب خراسانی[1]	(ورق ۹ ب)	ذکرِ خیر مولانا فصیحی انصاری[2]	(ورق ۸)
" " ملا قیدی شیرازی[3]	(ورق ۱۰ ب)	" " ملا ذکی	(ورق ۱۱)
" " ملا نظیری (نیشاپوری)[4]	(ورق ۱۱ ب)	" " قاضی نوری اصفہانی[5]	(ورق ۱۲)
" " ملا مظہری (کشمیری)[7]	(ورق ۱۲ ب)	" " ملا صیقلی (ہمدانی)	(ورق ۱۷)
" " ملا ضمیری (ہمدانی)[8]	(ورق ۱۷ ب)	" " میر سید حسن غزنوی	(ورق ۱۸ ب)
" " ملا طلوعی (کشمیری)	(ورق ۲۱ ب)	" " ابو المنصور منطقی	(ورق ۲۲ ب)
" " شاہ منجان	(ورق ۲۳ ب)	" " ملا داعی مشہدی	(ورق ۲۴)
" " محرم بیگ کوکہ	(ورق ۲۴ ب)	" " ہمدم کوکہ	(ورق ۲۵ ب)
" " خواجہ کلاں بیگ المتخلص بہ سپاہی	(ورق ۲۶)	" " فیضی ہروی	(ورق ۲۸)

---

[1] فرید بھکری، شیخ، ذخیرۃ الخوانین بتصحیح ڈاکٹر سید معین الحق (در دو جلد، کراچی، ۱۹۶۱ - ۱۹۷۰) جلد دوم ص ۲۵۶ - ۲۷۰۔

[2] RYPKA, JAN, HISTORY OF IRANIAN LITERATURE, KARL JAHN (ED.), (DORDRECHT-HOLLAND, 1968), P.300.

[3] NIZAMUDDIN AHMAD KHWAJAH, TABAQAT-I-AKBARI. B. DE, (TR.), (3 VOLS CALCUTT 1927 - 1939), VOL, P.721-

دایونی، ملا عبدالقادر ملوک شاہ، منتخب التواریخ باہتمام مولوی احمد علی و دیگران (در سہ جلد، کلکتہ، ۱۸۶۵ - ۱۸۶۸) جلد سوم ص ۲۱۵ - ۲۱۶؛ ابو الفضل، آئین اکبری در سہ جلد، نولکشور، ۱۸۹۳) جلد اوّل ص ۱۷۹؛ امین احمد رازی، ہفت اقلیم بتصحیح جواد فاضل (در سہ جلد، تہران) جلد اول ص ۲۴۷ - ۲۴۹ -

طبقات اکبری، جلد دوم ص ۴۸۷ ؛ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۳۷۵، آئین اکبری ص ۱۷۵؛ عبدالباقی نہاوندی، ملا، مآثر رحیمی بتصحیح محمد ہدایت حسین (در سہ کلکتہ، ۱۹۲۴ - ۱۹۳۱) جلد سوم ص ۱۱۵۱ - ۲۶۳، ہفت اقلیم جلد دوم، ص ۱۷۵ - ۶ آئین اکبری ص ۴ (تکملہ ص ۱۸۲ از جلد اول) ص ۹ طبقات اکبری جلد دوم ۴۸۷، منتخب التواریخ جلد سوم، ص ۳۴۴ - ۳۴۵، آئین اکبری ص ۱۷۶، مآثر رحیمی جلد سوم ص ۷۲۱ - ۷۲۲، ہفت اقلیم جلد دوم ص ۱۱۴ -
ایضاً ص ۴۱۷ - ۸ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۴۵ -

ذکر خیر طاہر نجمی	(ورق ۲۸ ب)	ذکر خیر ملا صنعانی[1]	(ورق ۳۰ ب)
〃 〃 ملا چلپی علامہ	(ورق ۳۱)	〃 〃 شیخ ابونصر فراحی (کذا)	(ورق ۳۱ ب)
〃 〃 میر جان سیاقی (کذا)	(ورق ۳۲ ب)	〃 〃 حکیم قطران	(ورق ۳۳ ب)
〃 〃 ملا محمد صوفی (ماژندرانی)	(ورق ۳۴)	〃 〃 ابوالفرج سنجری (کذا)	(ورق ۳۴ ب)
〃 〃 میرزا مشربی	(ورق ۳۵)	〃 〃 حکیم محمد المتخلص بہ رضائی	(ورق ۳۵ ب)
〃 〃 رضی الدین نیشاپوری	(ورق ۳۵ ب)	〃 〃 ملا محسن کابلی	(ورق ۳۶)
〃 〃 ملا خضری قزوینی	(ورق ۳۷ ب)	〃 〃 بو علی	(ورق ۳۸)
〃 〃 میرزا شانی (تکلو ہروی)	(ورق ۳۸ ب)	〃 〃 بابا طالب اصفہانی[3]	(ورق ۳۹ ب)
〃 〃 ملا قاسم خبیشہ	(ورق ۴۰)	〃 〃 میرزا اشرف	(ورق ۴۲)
〃 〃 قاضی میرک (غزنوی)	(ورق ۴۲)	〃 〃 ملا ظہیر	(ورق ۴۳ ب)
〃 〃 ملا آتشی شیروانی	(ورق ۴۴)	〃 〃 ملا شاہ واقعہ نویس (المتخلص بہ بانسی)	(ورق ۴۴ ب)
〃 〃 اشرف خاں (ہروی)	(ورق ۴۵ ب)	〃 〃 میر کلنگ[5] (ہروی)	(ورق ۴۶ ب)
〃 〃 خواجہ عبداللہ مروارید	(ورق ۴۷ ب)	〃 〃 تردی رودہ[6]	(ورق ۴۹ ب)
〃 〃 حکیم عین الملک[4]	(ورق ۵۰ ب)	〃 〃 ملا صدر حنا تراش	(ورق ۵۲ ب)
〃 〃 قاضی زادہ کاشان	(ورق ۵۳)	〃 〃 قاضی لاغر[8]	(ورق ۵۴)
〃 〃 ملا طرزی	(ورق ۵۵)	〃 〃 ملا خواجہ خرد مکہ	(ورق ۵۸)
〃 〃 شیخ گدائی (دہلوی)[9]	(ورق ۶۰)	〃 〃 ملا جانی (بخاری)	(ورق ۶۲)

---

[1] ہفت اقلیم جلد سوم ص ۴۴۳۔

[2] آئین اکبری ص ۱۷۷

[3] ایضاً ص ۱۸۱۔ ہفت اقلیم جلد دوم ص ۱۳۴۔

[4] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۸۱ - ۱۸۳ - آئین اکبری ص ۷۵ - ذخیرۃ الخوانین جلد اوّل ص ۲۱۱ - ہفت اقلیم جلد دوم ص ۲۰۸۔

[5] آئین اکبری ص ۷۶۔

[6] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۰۰ - ۲۰۱ ہفت اقلیم جلد سوم ص ۳۸۵ - صبح گلشن ص ۸۴۔

[7] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۳۰ - ۲۳۱ - ذخیرۃ الخوانین جلد اوّل ص ۱۰۱ - ۱۰۳ ۔

[8] ہفت اقلیم جلد اول ص ۲۹۹ - آذر لطفعلی بیگ بن آقا خان بیگ ولی شاملو، آتشکدۂ آذر (در سہ بخش، تہران، ۱۳۳۶ - ۱۳۴۰ شمسی) جلد اوّل ص ۴۲۲۔

[9] منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۷۶ - ۷۷

ذکر خیر میر حضوری (قمی)[1]	(ورق ۶۲ ب)	ذکر خیر میر حزنی (اصفہانی)[2]	(ورق ۶۳)
〃 〃 ملا سبزواری	(ورق ۶۳)	〃 〃 ملا جیرانی (قمی)	(ورق ۶۳ ب)
〃 〃 ملا حالتی[3] (یادگار محمد)	(ورق ۶۳ ب)	〃 〃 ملا حالتی خراسانی	(ورق ۶۴ ب)
〃 〃 ملا خواجہ زادہ کابلی	(ورق ۶۴ ب)	〃 〃 ملا خلقی	(ورق ۶۵)
〃 〃 خلقی ہروی (میر محمد یوسف)	(ورق ۶۵)	〃 〃 دوری ہروی[4]	(ورق ۶۵)
〃 〃 ملا محمد دعائی	(ورق ۶۶ ب)	〃 〃 حسن علی (رجائی خراسانی)[5]	(ورق ۶۶ ب)
〃 〃 ملا رجائی ہروی	(ورق ۶۷ ب)	〃 〃 مولانا سائل	(ورق ۶۹ ب)
〃 〃 ملا شعوری[6] (ہروی)	(ورق ۷۰)	〃 〃 ملا علمی[7]	(ورق ۷۱ ب)
〃 〃 میر عزیز اللہ[8] (قزوینی)	(ورق ۷۲)	〃 〃 میر سید علاء الدین (قنوجی)	(ورق ۷۳)
〃 〃 مولانا عاطفی	(ورق ۷۳ ب)	〃 〃 قاضی عبد الغفار تاشکندی	(ورق ۷۳)
〃 〃 ملا عابد	(ورق ۷۳ ب)	〃 〃 خواجہ عبد اللہ فرنخودی	(ورق ۷۳ ب)
〃 〃 مولانا فخری	(ورق ۷۴)	〃 〃 عبدی[9] (خواجہ محمد رحیم واند	(ورق ۷۴)
〃 〃 غباری (قاسم علی خان)[10]	(ورق ۷۵)	〃 〃 ملا فہمی[11]	(ورق ۷۵ ب)
〃 〃 ملا شاہ فنائی چغتائی	(ورق ۷۵ ب)	〃 〃 ملا فیضی (اصفہانی)	(ورق ۷۶)
〃 〃 ملا فہمی استرآبادی	(ورق ۷۶ ب)	〃 〃 ملا فریبی (بخاری)	(ورق ۷۶ ب)
〃 〃 ملا حلوائی[12]	(ورق ۷۷)	〃 〃 شاد صفی	(ورق ۷۷ ب)

---

[1] آئین اکبری جلد اول (تکملہ ص ۱۸۲) ص ۳ —

[2] منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۲۱۹ - آئین اکبری ص ۱۷۲ —

[3] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۲۱، آئین اکبری ص ۱۷۰، ہفت اقلیم جلد اول ص ۴۰۳ —

[4] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۲۷، ہفت اقلیم جلد دوم ص ۱۵۹ —

[5] آتشکدۂ آذر، جلد دوم ص ۷۶۵، صبح گلشن ص ۱۷۲ —

[6] ہفت اقلیم جلد دوم ص ۲۱، منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۵۴ —

[7] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۷۹ —

[8] ایضاً ص ۲۷۵

[9] ہفت اقلیم جلد اول ص ۴۷۳ —

[10] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۸۹، صبح گلشن ص ۲۹۹ —

[11] ہفت اقلیم جلد دوم ص ۴۷۰، منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۹۴ —

[12] طبقات اکبری جلد دوم ص ۶۸۶، منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۵۵، ہفت اقلیم جلد دوم ص ۳۸۴ —

ذکر خیر ملا صنعی	(ورق ۷۸ ا)	ذکر خیر ملا صلحی (ہروی)	(ورق ۷۸ ب)
〃 〃 ملا صبوحی[1]	(ورق ۷۹ ب)	〃 〃 ملا صالحی[6] (ہروی)	(ورق ۸۰ ب)
〃 〃 صدقی[2] (استرآبادی)	(ورق ۸۱ ب)	〃 〃 ملا صبری[7] (محمد قاسم کوہر)	(ورق ۸۲)
〃 〃 شاہ طیب (نجفی)	(ورق ۸۳ ب)	〃 〃 مولانا طفیلی (مشہدی)	(ورق ۸۴)
〃 〃 مولانا طفیلی اصفہانی	(ورق ۸۴ ب)	〃 〃 ملا طالعی (یزدی)	(ورق ۸۵)
〃 〃 عارف (شیخ بایزید)	(ورق ۸۵ ب)	〃 〃 معصوم خواجہ	(ورق ۸۶ ب)
〃 〃 عادل (حاکم لار)	(ورق ۸۶ ب)	〃 〃 میر عبدالحیی (مشہدی)	(ورق ۸۷ ب)
〃 〃 صفی الدین عیسی	(ورق ۸۷ ب)	〃 〃 عیدی ناگوری	(ورق ۸۸)
〃 〃 ترخان نورالدین محمد خان[3]	(ورق ۸۸ ب)	〃 〃 ملا بدیعی (سمرقندی)[8]	(ورق ۸۹ ب)
〃 〃 ملا پرتوی[4]	(ورق ۹۰ ب)	〃 〃 تقی اصفہانی[9]	(ورق ۹۰ ب)
〃 〃 ملا تذروی[5]	(ورق ۹۱ ب)	〃 〃 ثانی خان[10]	(ورق ۹۳ ب)
〃 〃 شیخ جلال (بخاری)	(ورق ۹۴)	〃 〃 ملا جانی (مروزی)	(ورق ۹۵)
〃 〃 ملا فہمی (ہروی)[11]	(ورق ۹۶)	〃 〃 ملا فکری (نوربخشی)	(ورق ۹۶)
〃 〃 ملا قدسی (ماوراء النہری)	(ورق ۹۷)	〃 〃 میر فضل اللہ (شیرازی)	(ورق ۹۷)
〃 〃 شیخ روزبہان	(ورق ۹۷ ب)	〃 〃 خواجہ حسین مروزی	(ورق ۹۹)
〃 〃 مولانا علی نیازی (استرآبادی)	(ورق ۱۰۰)	〃 〃 ملا نوری (ہروی)	(ورق ۱۰۱)
〃 〃 ملا واقفی (ہروی)	(ورق ۱۰۲)	〃 〃 ملا لطفی تبریزی	(ورق ۱۰۲ ب)
〃 〃 ملا آلی	(ورق ۱۰۴)	〃 〃 ملا فضلی	(ورق ۱۰۴ ب)
〃 〃 ملا ثاقی	(ورق ۱۰۵)	〃 〃 ملا حاتی (خراسانی)	(ورق ۱۰۵)
〃 〃 حکیم عارف	(ورق ۱۰۶)	〃 〃 ملا وارثی (سبزواری)	(ورق ۱۰۶ ب)
〃 〃 ملا طبعی (لاہوری)	(ورق ۱۰۸)	〃 〃 ملا خواجگی (کشمیری)	(ورق ۱۰۸ ب)
〃 〃 ملا نگاہی	(ورق ۱۰۸ ب)	〃 〃 ملا نزہتی	(ورق ۱۰۹)

---

[1] آئین اکبری ص ۱۷۵، منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۵۶، صبح گلشن ص ۲۴۸۔ [2] آئین اکبری ص ۱۷۶، منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۵۸، ہفت اقلیم جلد دوم ص ۱۹۰۔ [3] آتشکدۂ آذر بخش دوم ص ۹۰۷۔ [4] آئین اکبری ص ۱۸۳۔ [5] منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۱۹۷، [6] ہفت اقلیم جلد سوم ص ۳۸۴۔ [7] ایضاً جلد اول ص ۲۵۴۔ [8] ایضاً ص ۲۶۳۔ [9] ایضاً جلد سوم ص ۱۹۴۔ [10] ایضاً جلد اول ص ۱۷۴۔ [11] ایضاً جلد دوم ص ۴۷۰۔

ذکر خیر ملا وجہی (ہروی)	(ورق ۱۱۰ا)	ذکر خیر ملا یقینی	(ورق ۱۱۰ا)
〃 〃 ملا یقینی	(ورق ۱۱۱)	〃 〃 ملا مظفر (ہروی)	(ورق ۱۱۱ب)
〃 〃 ملا خفیفی (شیرازی)	(ورق ۱۱۱)	〃 〃 میر نقتہ	(ورق ۱۱۲ب)
〃 〃 مولانا نامی (فراہی)	(ورق ۱۱۲)	〃 〃 احمد بیگ کابلی	(ورق ۱۱۳)
〃 〃 محمد میرک ہروی	(ورق ۱۱۳ب)	〃 〃 ملا سہمی (بخاری)	(ورق ۱۱۳ب)
〃 〃 ملا طالب ترمذی	(ورق ۱۱۴)	〃 〃 ملا دانی	(ورق ۱۱۵ب)
〃 〃 ملا جرمی	(ورق ۱۱۵ب)	〃 〃 ملا خلدی	(ورق ۱۱۶ب)
〃 〃 ملا فروی	(ورق ۱۱۶ب)	〃 〃 ملا فاضل لاہوری	(ورق ۱۱۷)
〃 〃 ملا فطرتی	(ورق ۱۱۸)	〃 〃 ملا رسمی	(ورق ۱۱۸ب)
〃 〃 ملا روانی	(ورق ۱۱۸ب)	〃 〃 ملا کلامی (کاپی)	(ورق ۱۱۹)

لجامعہ (= ملا قاطعی ہروی) (ورق ۱۲۱ب)

مندرجہ بالا فہرست میں، بلائین کے درمیان جو عبارت مرقوم ہے۔ وہ تذکرے میں عناوین کا حصہ نہیں۔ یہ عبارت متعلق شاعر کے حالات ہی سے ماخوذ ہے اور محض اس لئے درج کر دی گئی ہے کہ دیگر کوالف سے لاعلمی اور پھر ناموں کی یکسانیت یا بیش از حد تشابہ کے باعث، قاری کے ذہن میں جو غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کے امکان کو حتی المقدور کم کیا جا سکے۔ اِس کوشش کے باوجود بھی یہ خلل بعض جگہوں پر موجود ہے۔

اس امر کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ متذکرہ بالا عناوین کے علاوہ بعض اور شعرا و اکابرینِ وقت کے حالات بھی تذکرہ ہذا میں ضمناً بیان ہو گئے ہیں۔ اِن میں سے جن افراد کے نام نفسِ مقالہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے بارے میں مزید اطلاع کے لئے، جہاں تک ممکن تھا، ہم نے مآخذ و منابع کی نشاندہی مناسب جگہوں پر حواشی میں کر دی ہے۔ اِسی طرح مندرجہ بالا فہرست میں مذکور افراد کے حالات کی تکمیل و تتمیم کے لئے ـــ جہاں تک وقت اور جگہ کی محدودیت نے اجازت دی ہے ـــ بعض مصادر و مدارک کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ جن افراد کے ضمن میں ایسی رہنمائی نہیں کی جا سکی اُن میں سے کئی کے حالات تو سکون سے تلاش کرنے سے حواشی میں مذکور مآخذ ہی سے مل جائیں گے[1] باقی کے لئے دوسرے مآخذ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

یہ خیال کہ مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی، ان شعرائ کے حالات پر مشتمل ہے، جو جہانگیر کے مدح گو تھے[2]۔ صحت پر مبنی نہیں چونکہ

---

[1] مثال کے طور پر 'ابوالفرج سجزی' (ورق ۴۴ب) کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: آتش کدۂ آذر، بخش نخست، ص ۴۲۰-۴۲۲ ۔

[2] STOREY, C.A., PERSIAN LITERATURE: A BIO-BIBLIOGRPHICAL SURVEY. (LONDN, 1953), VOL.I, PART 2, P.815.

Accession Number 170421
Date 24.9.97

اس میں ایسے شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جو جہانگیر کی تخت نشینی و ولادت تو کیا، خود مغلیہ سلطنت کی تاسیس سے بھی قبل دارِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ ایسے شعرا میں سے روزبہان[1] دیلمی (۵۲۲ - ۶۰۶ھ) کا نام مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ باقی شعرا کے بارے میں بھی اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے بھی بعض ہمایوں اور اکبر ہی کے دور میں وفات پا چکے تھے اور انہوں نے جہانگیر کا دور نہیں دیکھا۔ رہا تذکرے کی وجہ تسمیہ کا مسئلہ تو ہماری رائے میں اس کے مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی موسوم کئے جانے کا سبب یہ ہے کہ یہ عہدِ جہانگیری میں مکمل ہوا اور یہی نہیں بلکہ مؤلف نے اس میں مندرج کم و بیش ہر شاعر کے حالات کے آخر میں جہانگیر کے لیے درازیٔ عمر اور بقائے سلطنت کی دعا کے اندراج کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ ان دعائیہ جملوں کی نوعیت ایک ہی ہے لیکن شرائط میں حسبِ موقع تبدیلی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند جملے ملاحظہ ہوں۔

> الٰہی تا از بزرگ زادہائی با اخلاص و از بزرگان آثار و نتائج در عالم است، عمر و دولتِ حضرت نورالدین محمد جہانگیر پادشاہِ عادلِ غازی لایزال باد! (ورق ۷ ب)
>
> الٰہی تا از خوشنویسانِ ماضی و حال نام و نشان است، عمر و دولتِ نورالدین محمد جہانگیر غازی برقرار باد (ورق ۸۶)
>
> الٰہی تا دعای درویشان قبول و مستجابست، عمر و دولتِ نورالدین محمد جہانگیر پادشاہ عادل غازی بردوام باد! (ورق ۹ ب)
>
> الٰہی تا شعرا رشتۂ سخن را بمعنی مقید می سازند و مذکور و مسطور میگردانند، عمر و دولتِ حضرت محمد جہانگیر پادشاہِ عادل غازی برقرار باد! (ورق ۱۱)
>
> الٰہی تا پاکیزگی در اہلِ طاعتِ آئندہ و حال مضمر است، عمر و دولتِ نورالدین محمد جہانگیر پادشاہِ عادلِ غازی در تزاید باد! (ورق ۱۱ ب)

مجمع الشعرا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ہمارے خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ قاطعی نے سارے تذکرے میں کسی ایک شاعر کے بارے میں بھی یہ نہیں لکھا کہ وہ جہانگیر کا مدح گو تھا اور نہ ہی نمونے کے طور پر کسی شاعر کا کوئی شعر (ماسوا اپنے اشعار کے!) جو جہانگیر کی مدح میں ہو پیش کیا ہے۔

سٹوری[2] کا بیان ہے کہ بوڈلین لائبریری میں موجود تذکرے کا یہ منحصر بفرد نسخہ خود مؤلف کا دست نوشتہ ہے صرفِ نظر اس سے کہ فاضل محقق نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی شہادت پیش نہیں کی۔ اگر مخطوطے کے اندر موجود املا کی غلطیوں ہی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بھی ذوقِ سلیم فاضل مستشرق کی اس بات کو تسلیم کرنے سے ابا کرتا ہے۔ اغلاط کی نوعیت یہ ہے:-

فطرات بجائے فترات (ورق ۶۰، ۶۱ب، ۹۵)
فراح بجائے فراہ (شہر) (ورق ۲۴ مکرر، ۵۴ب)

---

[1] مجمع الشعرا ورق ۹۷ ب - ۹۸ ب -

[2] سٹوری جلد اول، جزء دوم، ص ۸۱۳ -

[redacted]

فراحی	بجائے	فراصی	(ورق ۳۱ ب)
سدد	بجائے	صدد	(ورق ۷۹ ب)
سلہ	بجائے	صلہ	(ورق ۵۳ ب)
صورت	بجائے	سورت (شہر)	(ورق ۶۵ ب)

اسی طرح صبوحی شاعر کی وفات (۹۷۳ھ) کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس کی "تاریخ وفات" "صبوحی میخوارہ" سے برآمد ہوتی ہے حالانکہ اس میں (۵) زائد ہے۔ ایسا شخص جو خود شاعر ہو اور جس کی ساری زندگی ارباب علم و فضیلت کی مصاحبت میں بسر ہوئی ہو، اُس کے قلم سے ایسی اغلاط کا سرزد ہونا اگر بالکلیہ خارج از امکان نہیں تو مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے۔

"تذکرہ ہذا میں بعض تراکیب اور اشعار کا جا و بے جا اور بکثرت تکرار اور استعمال" طبع پہ گراں گذرتا ہے لیکن اس کے باوجود، انداز بیان مجموعی طور پر شگفتہ، رنگین اور دل نشین ہے۔ بعض جگہوں پر مقامی الفاظ بھی مشاہدے میں آتے ہیں۔ نمونے کے طور پر شیخ گدائی دہلوی کے حالات ملاحظہ ہوں:-

ذکر خیر شیخ گدائی

شیخ گدائی پسر شیخ جمالی دہلویؒ صاحب کتاب مہر و ماہ است، دران مرتبہ کہ فطرات (کذا) ہند شد بیرم خان بکہ بگجرات افتاد، و شیخ گدائی آنجا بایشان آشنا شد و خان دردمند بودند و دران پریشانی دردمندی ایشان زیادہ شد و ہیچ گہ بی سوزِ عشق نبودند۔ و مردم گجرات مؤنث و مذکر صاحب جمال و صاحب حسن اند و عمارات خوب دارند و در ہر کوچہ مسجدہای غیر مکرر از سنگ تراشیدہ بنا کردہ اند و چاہہای آبِ شیرین دارد۔ در یک گذر چاہی عظیم بود، و درخت بزرگ بر سرا و سایہ افگندہ بود، و آب خوشگوار داشت و مردمانی کہ دران گذر بودند، آبِ آن چاہ بدلوہا میکشیدند و میبردند۔ بیرم خان را آن سر منزل خوش آمدہ بود، درآن جامی نشست و مؤنثی پاکیزہ روی آفتاب طلعت مشکین موی۔ بآب کشیدن آمدہ بود۔ اتفاقاً درویشی مجنون صفت عاشق پیشہ بر سرآن چاہ نشستہ بود۔ جوانی لیلیٰ وشی خوش لقائی دلربائی کہ از دیدنش عشاقِ بی نوا بیخود شدہ از جامی رفتہ کہ ناگاہ تیری از کمان خانۂ ابروی او بر دلِ درویش چنان نشستہ کہ بیخود شدہ، سر در قدم آن رعنا نہاد، و کفِ دست بر لب نہادہ میگفت کہ "پانی! پانی!" و محبوب ہر چند آب میریخت از انگشتان

---

[1] حالات کے لئے دیکھئے: نعمت اللہ، خواجہ، تاریخ خانجہانی بتصحیح ایس۔ ایم۔ امام الدین (دو جلد، ڈھاکہ، ۱۹۶۰) جلد اول ص ۱۸۹، ۲۲۵-۲۲۰۔ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ، اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (دہلی، ۱۳۰۹ھ) ص ۲۲۱-۲۲۲ ۔ عابدی، وزیر الحسن (مرتب)، مقالات منتخبۂ مجلۂ دانشکدۂ خاور شناسی (دو جلد، لاہور، ۱۹۶۷ء) جلد دوم، ص ۱۷۵-۱۹۳، ۱۹۴-۲۰۵ ۔ نیز ملاحظہ ہو منتخب التواریخ ۔ جلد دوم ص ۳۲۵ ۔

آب بدر میرفت، و بزمین می افتاد، و بگلویش نمی رفت، و او "پانی!" میگفت۔ جوان از روی محبوبی و استغنای حسن، دلو را پرتاب داد، و گفت: هر چند که آب میدهیم، میگوید پانی! پانی! و سیری ندارد۔ و آن مغرور حسن ندانسته بود که آتش عشق بآب زلال وصال فی الحال تسکین نمی یابد چنانکه مجنون درین معنی فرموده:۔

آه من العشق و آیاته   احرق قلبی بحراراته
ما نظر العین الی غیرکم   اقسم بالله و آیاته

چند روز برین نهج جانبین تفرج می نمودند و آن درویش بر چاه افتاده بود۔ نواب خان هم شبها آن جا می بودند، و حالت عشق و عاشقی را ملاحظه می فرمودند تا آنکه بطریق عادت وقت آمدن آن دلربا می شد۔ چون دلو بدست میگرفت باز درویش دست بر لب نهاده "پانی! پانی!" میگفت تا آنکه بر سر چاه هجوم خلق شد و شهرت کرد که این چنین شغلی عاشق جوانی شده است مطلوب از این کثرت در پردهٔ حجاب رفت و چندی بیرون نیامد و آن درویش آن جا که از قدم نهاده بود بر سر خود می ماند و "پانی!" می گفت تا مردم آن گذر را از درد او دل بدرد آمد او را گفتند: تو بیا! این چاه عشق است. لهذا خوردن ثواب است، حرام نیست۔ و تاثیر جذبت عشق در دل جوان کار کرده بود۔ در رنگ عاشقان مست خود را آراسته کوزه برداشته بالای چاه در رنگ ماه نخشب برآمد و دلو را گرفت و از روی مهربانی و دلنوازی گفت: ای فقیر تا چند "پانی" "پانی!" بگوئی، لبه پانی! و در آن وقت نواب این مطلع بدیهه گفت:

صد بار بگفتیم که تمکه انی جیو   یکبار نگفتی که "پیا پانی پیو!"

چون چند روز گذشت این قصه در گجرات شهرت عظیم پیدا کرد، و آن درویش را آتش عشق از کانون سینه علم میزد۔ شب و روز "پانی!" "پانی!" میگفت، و تا روزی آن شهرهٔ شهر از خانه برآمده بالای چاه آمده و دلو را گرفته گفت: ای فقیر آب میخواهی؟ رمقی از جان حزین او باقی بود۔ چشم باز کرده، بکمال او نگریست و جان بحق تسلیم نمود:

عشق ازین بسیار کردست و کند

مردم نماز گزارده، او را بر سر چاه دفن نمودند۔ و عشق او در دل مطلوب چنان اثر کرده بود که هرگاه بر سر قبر او می آمد در رنگی که آب از دلوش میریخت۔ اشک از چشم ابرشانش بر رخسارش میدوید، استغفار، استغفار حسن خود می کرد۔ و تا زنده بود روز و شب زیارت قبر او می نمود۔

عشق می نازد بحسن و حسن می نازد بعشق
آری آری این دو معنی عاشق یکدیگر اند

چون سخن دور گشت از ربطش   بر سر مدعای پیش رویم

شبی در قندهار حضرت خان بی اختیار آهی از دل کشیدند و دلتنگی شد۔ بعد از آن سر برآوردند و مجلسیان با ایشان

گفتند۔ ضرب آہی بود۔ خان واقعۂ گجرات کہ بالا مسطور شد، بیان فرمودند کہ رفتنِ آن در دیش بخاطرم رسید، این آہ از دیدنِ آن واقعہ بود۔ پس بمیر فہمی و ملا نویدی و ملا شوخی فرمودند کہ ہر کسی این واقعہ را در مثنوی بگوید و مصنف ہم چند بیتی گفتہ بود، در فطرات (کذا) از دست رفت۔

چوں سخن دور گشت از ربطش   بر سرِ مدعای پیش رویم

شیخ گدائی پیشِ بیرم خان در آگرہ اعتبار تمام پیدا کردہ، اختیار کل داشت و باو ہمیشہ می فرمودند: "بہائی شیخ گدائی"۔ شیخ اشعار بسیار دارد۔ این چند بیت درین تذکرۂ جہانگیر شاہی۔ مرقوم گشت:

گہی جاں منزلِ غم شد، گہی دل   غمت را میبرم منزل بمنزل
مشو غافل ز جان دردمندی   کہ از یادِ تو یک دم نیست غافل
دلِ دیوانہ در زلفِ تو بستم   گرفتم خوبانِ مشکین سلاسل[1]
بجاں دادن اگر آساں شدی کار   نبودی عاشقاں را کار مشکل
گدائی جاں بنا کامی بر آمد
نشد کامم ز لعلِ یار حاصل   (ورق ۶۰-۶۲)

شعرا کے نمونۂ کلام سے قبل، تذکرہ ہذا میں، یہ شعر بکثرت دیکھنے میں آتا ہے:

آنچہ ز نظمش دم تقریر یافت   این دو سہ بیتی است کہ تحریر یافت

ایسے موارد بھی مشاہدے میں آتے ہیں جبکہ نمونے کا صرف ایک ہی بیت پیش کیا گیا ہے لیکن یہ تمہیدی شعر پھر بھی من و عن موجود رہا ہے۔ بعض موقعوں پر بیت مذکور میں حسب موقع ردّ و بدل بھی نظر آتا ہے، مثال کے طور پر:

آنچہ ز نظمش دم تقریر یافت   این دو غزل بود کہ تحریر یافت

نمونے کے اشعار کی تعداد متعین نہیں۔ کسی جگہ تو دو ایک شعروں پر ہی اکتفا کر لیا گیا اور کہیں ان اشعار کی تعداد سو کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے۔ اس ضمن میں مؤلف نے البتہ ایک بات کا التزام ضرور کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہجویہ اشعار نقل نہ ہوں چونکہ بقول اس کے:

ہجو آزردنِ دلست (ورق ۶۲)

اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے شاعروں کے حالات اور کئی ایک کے نمونے کے بہت سے اشعار پہلی مرتبہ اسی تذکرے میں ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ فارسی ادب کی بسوط تاریخ کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں بہت سے دوسرے تذکروں کا متمم ثابت ہو سکتا ہے۔ مؤلف نے بعض چشم دید واقعات کو تذکرے میں شامل کر کے تاریخی اور معاشرتی لحاظ سے بھی اسے مفید و کارآمد بنا دیا ہے۔ اس قسم کے واقعات بادی النظر میں پیش پا افتادہ معلوم ہوں تو ہوں لیکن ان سے مؤلف کے زمانے کی سماجی زندگی کی جو تصویر ابھرتی

---

[1] "گرفتارم بآں مشکین سلاسل" منتخب التواریخ جلد سوم، ص ۷۷۔

ہے اور لوگوں کے رہن سہن، رسوم و رواج اور عادات و اطوار کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، اہلِ تحقیق کی نظر سے ان کی اہمیت مخفی نہیں۔ اس سلسلے میں بیرم خان کا چشم دید واقعہ تو ہم مؤلف کی زبانی سن ہی چکے ہیں، اُس کا اپنا قیامِ ہرات کا زمانہ بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ — وہ ملا شاہ محمد نامی ایک صراف کے لڑکے پر عاشق تھا۔ اِسی صراف زادے پر اُس کے دو اور ہمعصر — ملا حسن علی رجائی اور ملا حاجتی — بھی دل و جان سے فدا تھے۔ چنانچہ ان تینوں میں بلا کی رقابت چلتی تھی۔ ملا حسن علی تو خوش طبعانِ ہرات میں سے تھے لیکن حاجتی پرلے درجے کا ہزّال اور طرفگی میں اپنی نظیر آپ تھا۔ ملا شاہ محمد اپنے دوست احباب کو جمع کر کے خوب مجلسیں جماتا جن میں اُس کے لڑکے بھی شریک ہوتے۔ ملا حاجتی ان لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی غرض سے بار بار ملا شاہ محمد کی دکان کے سامنے سے گزرتا کہ شاید اُسے بھی شریکِ مجلس کر لیں لیکن کوئی بھی اُسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتا۔ ایک دفعہ جاڑے کے دن تھے۔ ملا شاہ محمد صراف دکان پر بیٹھا تھا کہ اچانک برفباری شروع ہو گئی۔ شاہ محمد کی دکان کچھ اس طرح واقع تھی کہ بازارِ خوش میں مجرموں کو پھانسی دینے کے لئے جو طاق بنی ہوئی تھی وہ بالکل اس کے سامنے پڑتی تھی یہ جگہ شہر کے عین مرکز میں واقع تھی اور ہرات کی سب سے بڑی تفریح گاہ سمجھی جاتی تھی۔ ایسے میں ملا حاجتی کو عجب شرارت سوجھی اُس نے ململ شاہی قمیص زیبِ تن کی، فرنگی ران پہ آویزاں کی، کمر پہ مضبوطی سے پنکھا باندھا اور بغل میں تربوز لے کر بازار کی چھت پہ آن چڑھا اور پھر عین طاق میں جا کر بیٹھ گیا۔ اِتنے میں برف اور بھی شدت سے پڑنے لگی۔ ملا حاجتی گرد و نواح سے بے خبر تربوز کی "قاشیں" بنا بنا کر کھاتا جاتا اور جب ذرا فرصت ملتی تو سر سے ٹوپی ہٹا کر پنکھے سے ہوا لینے لگتا۔ اہلِ ہرات اُس کی اِس شرارت پر سٹپٹا کر رہ گئے۔ شاہ محمد سے بھی یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک نہ دیکھی گئی اور وہ دکان بند کر کے گھر چلا گیا.... قاطعی لکھتا ہے:

> فغان از اہلِ ہرات برآمد کہ اینک حاجتی بشاہ محمد این چنین ظرافتی پیش آوردہ است۔ آخر شاہ محمد نتوانست دید، دکان بستہ بخانہ رفت و کس پیش او فرستاد کہ بیا، با تو صحبت داریم۔ غرض این چنین رقیبان داشتیم۔ (ورق ۶۸)

قاطعی اپنے دوسرے رقیب ملا حسن علی رجائی کے بارے میں لکھتا ہے کہ ان کا شمار "خوش طبعانِ ہری[1]" میں ہوتا تھا۔ انہوں نے جب یہ سنا کہ میرزا اشرف جہان قزوینی[2] سب کچھ چھوڑ کر عزلت نشین ہو گئے ہیں، تو درج ذیل قطعہ ان کی خدمت میں ارسال کیا:

القطعۃ للرجائی

حکایتیست غریب ای سمر بدانش و فضل — کہ عرضِ این نتوان کرد جز بچون تو کسی[3]
گذشتہ از وطن آوردہ ایم رو بسفر — گسستہ ایم دل از ہر ہوا و ہر ہوسی[4]
بغیر گوشۂ چشمی ز صاحبانِ نظر — نگشتہ در دلِ ما ہیچگونہ ملتمسی
ہمای اوجِ کمالی چہ نقص بودی اگر — ز فتہ سایہ تو بہرہ ور شدی مگسی؟

---

[1] مجمع الشعرا ورق ۶۷ ب۔

[2] حالات کے لئے دیکھیے، آتشکدۂ آذر بخش سوم ص ۱۱۷۴-۱۱۸۷۔

[3] فی الاصل: "کہ عرضی کہ آن نتوان کرد جز بچون تو کسی"

[4] فی الاصل: "گسستہ ایم دل از ہر ہوائی و ہوسی"

حریمِ گلشن کویت نشد نشیمنِ ما   نیافتیم دریغ اعتبارِ خار و خسی
بروی خستہ دلان بستن در اقبال   ز حسنِ خلقِ کریمت عجب نمود بسی[1]
بصدق، خاکِ درت غائبانہ میبوسم   بپای بوسِ مکانت چو نیست دست رسی

میرزا اشرف جہاں نے بھی جواباً ایک قطعہ آپ کو بھیجا، جو درج ذیل ہے:

ایا ستودہ خصالی کہ سالہا دل را   ہوای صحبت جان پرور تو بود بسی[2]
حکایتیست نہانی[3] ز خلق با تو مرا   خدای را بشنو از من و مگو بکسی
ازان زگلشن[4] دہرم گرفت دل کہ نماند   ز سبزہ و گلِ این باغ غیرِ خار و خسی
چو غنچہ گر نفسم تنگ میشود ز انست   کسی نماندہ کہ با او بر آورم نفسی
وصالِ ہمچو تو[5] یاری نمی دہد دستم   وگرنہ در دل من نیست غیر این ہوسی   (ورق ۶۸-۶۸ ب)

فاطمی نے لا حسن علی رجائی نام کے ایک اور بزرگ کا بھی مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی میں ذکر کیا ہے[6]۔ جن کی ہرات کے بازار فیروزآباد[7] میں خراس کی دکان تھی۔ خراس پر ان کے غلام انار کے چھلکے پیستے جو رنگسازوں کے ہاتھ بڑے اچھے داموں فروخت ہوتے۔ اس آمدنی سے مولانا کی اچھی خاصی گذر اوقات ہو جاتی اور وہ بڑی آسودہ زندگی بسر کرتے۔ یہی نہیں بلکہ بقول فاطمی:

عزت و حرمت عظیم داشت۔ (ورق ۶۶ ب)

دکان کے بالائی طبقے پر آپ کا مدرسہ تھا جہاں طُلاب علوم آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اکتساب فیض کرتے، ہمایوں جب ایران جاتے ہوئے ہرات پہنچا تو سب سے پہلے آپ ہی کو بلا کر ملاقات کی اور طرح طرح کے انعام و اکرام سے نواز کر رخصت کیا۔ فاطمی کے الفاظ یہ ہیں:-

چون حضرت جنت آشیانی در ہرات تشریف آوردند، اوّل کسی را کہ پیش خود طلبیدند ملا حسن علی بود چون بمجلسِ پادشاہ مشرف شد، حالتِ ملّا بر آنحضرت ظاہر گشت و بالطاف گوناگون سرفراز ساختند۔ (ورق ۶۷)

بعد کے تذکرہ نویسوں نے متذکرہ بالا ہمنام افراد کو — جن میں سے ایک فاطمی کا رقیب رہ چکا تھا اور دوسرا اس کی موجودگی میں ہمایوں کی خدمت میں شرف یاب ہوا — ایک ہی شخص سمجھ کر ان کے حالات کو ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے۔ چنانچہ لطف علی بیگ آذر لکھتا ہے[8]۔

---

[1] آذر، لطف علی بیگ بن آقا خان بیگ دلی شاملو، آتشکدۂ آذر بکوشش حسن سادات ناصری (در سہ بخش، تہران، ۱۳۳۶-۱۳۴۰ شمسی) بخش دوم، ۱۳۴۰ شمسی، ص ۷۶۶: "ز حسنِ خلقِ کریمت عجب نبود بسی"۔ [2] فی الاصل: بودہ بسی۔ [3] فی الاصل: نہفتہ۔ [4] فی الاصل: نماند۔ [5] فی الاصل: توئی۔ [6] مجمع الشعرا ورق ۶۶ ب - ۶۷ ب۔ [7] بازار فیروزآباد، ہرات کے مشہور بازاروں میں سے تھا۔ اس کا نام مجمع الشعرا سے پہلے کی کتب میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو عبداللہ واعظ، سید اصیل الدین: مقصد الاقبال سلطانیہ و مرصد الآمال خاقانیہ، بکوشش مایل ہروی (تہران، ۱۳۵۱ شمسی) ص ۱۱۴۔ [8] آتشکدۂ آذر بخش دوم ص ۷۶۵-۷۶۶۔

رجائی : اسمش مولانا حسن علی خراس است، درویشی دل ریش و فاضلی نیک اندیش مقبول ارباب کمال و رفیق اہل حال، ہمدم امرا و ہم نفس فقرا بودہ۔ و در اوائل حال اسیر کمند عشق جوان صرافی شدہ و اکثر اوقات بر در دکانِ معشوق (ساکن د) وکان خراسی در مقابل دکان وی ساختہ۔ لہذا مشہور بہ خراس شدہ وگاہی طبعش بشعر مائل گویند، در خواب از جناب افصح الشعرا شیخ نظامی، رجائی تخلص یافتہ۔ در حین سفر حجاز، وارد قزوین و در آں وقت میرزا اشرف جہان از اہل جہان کنارہ گرفتہ، منزوی بودہ (چون مولانا اورا ندیدہ) بنا علیہ این قطعہ راگفتہ بہ میرزا اشرف جہان فرستادہ، واز و لقطعۂ دیگر جواب یافتہ و بصحبتِ یک دیگر رسیدند۔ غیر ازین قطعہ شعری از و ملاحظہ نشدہ ۔ (امامیتوان یافت کہ طبع شوخی داشتہ است)

اِس کے بعد آذر نے مذکورہ بالا ہر دو قطعے نقل کئے ہیں۔ سید علی حسن خان[1] بھی آذر ہی کے ہم خیال ہیں۔ اُن کا بیان ہے :۔

رجائی، حسن علی خراس ہروی طبعش مائل صراف پسری بود کہ دکان صرافی بر در خراس خانہ می چید بدین ملابست مشہور بخراس گردید۔ از فضلا و شعرا بودہ و از میرک شاہ محدث علم حدیث سند نمودہ و از خدمت مولوی جامی و دیگر اکابر فیضہا ربودہ و برای تحصیل شرف حج و زیارات راہ حجاز بپای عزیمت پیمودہ و بعد عود در قزوین چندی بصحبت میرزا اشرف جہان گذراندہ قدم سوی شہر زنجان فرسودہ و ہمانجا در سنہ خمس و ستین و تسعمایہ ندای ارجعی شنودہ و بجوار مزار شیخ ابوالفرج زنجانی آسودہ :

خرم کسی کہ دامن یاری گرفتہ است ‏ ‏ ‏ ‏ وز مردم زمانہ کناری گرفتہ است
دل جان سپرد بسکہ در آغوش من تپید ‏ ‏ ‏ ‏ من خوش بایں گمان کہ قراری گرفتہ است

ملا حسن علی رجائی کے ماجرائے عشق کی جو جزئیات دونوں تذکرہ نگاروں نے بیان کی ہیں، ان کا باہمی اختلاف محل نظر ہے۔ ان کے برعکس قاطعی چونکہ خود ہراتی الاصل تھا اور دونوں افراد ـــ حسن علی رجائی و حسن علی رجائی خراس ـــ کا ہمعصر بھی۔ اِس لئے اس کی فراہم کردہ معلومات مستند ہونے کے ساتھ ساتھ واضح اور دقیق بھی ہیں۔ اُس کے بیان کے مطابق ملا شاہ محمد صراف کی دکان بازارِ خوش[2] میں تھی جبکہ حسن علی خراس کی چکی بازار فیروز آباد میں ۔

مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی کے بارے میں اب تک ہم نے جو کچھ رقم کیا ہے اس سے اس تذکرے کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے تاہم اس کے مطالعے کے دوران ایک کمی جو بڑی شدت سے اور قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے وہ سال و ماہ کے ذکر سے مؤلف کا کلی اجتناب ہے چنانچہ سارا تذکرہ پڑھ جائیے دو ایک جگہوں کے سوا شاید ہی کوئی تاریخ آپ کو نظر آئے گی۔

آئیے اب مؤلف کے حالات زندگی پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ عرفات العاشقین[3] کے سوا، قاطعی کا نام کسی دوسرے تذکرے

---

[1] علی حسن خان، سید، صبحِ گلشن (بھوپال، ۱۲۹۵ھ) ص ۱۷۲-۱۷۳ ۔ [2] ہرات کا مشہور بازار جس کا ذکر مجمع الشعراء سے قبل کی کتب میں بھی ملتا ہے ۔ دیکھئے: مقصد الاقبال سلطانیہ، ص ۱۴۱، ۵۳ ۔ [3] تقی الدین محمد اوحدی، عرفات العاشقین و عرصات العارفین (خطی) ورق ۴۹۵ بنقل از گلچینِ معانی، احمد: تاریخ تذکرہ ہای فارسی، (تہران، انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۴۸-۱۳۵۰ شمسی) جلد دوم، ۱۳۵۰ شمسی ص ۱۴۲، ۱۴۳ ۔

میں نہیں ملتا ۔ اندریں حالات اُس کی سوانح عمری کی ترتیب کا ایک ہی طریقہ باقی تھا اور وہ تھا اُس کی نگارشات کا تجزیہ و تحلیل ۔ ہم نے اس کے تذکرے میں موجود اشارات کی مدد سے اس کے حالات زندگی ترتیب دینے کی کوشش کی ہے ۔ جو پیشِ خدمت ہے ۔

ساقی بیا کہ عشق ندا میکند بلند　　کانکس کہ گفت قصہ ما ہم ز ما شنید　(حافظ)

ملا قاطعی ہروی

قاطعی ہرات کا رہنے والا تھا ۔ زندگی کا ابتدائی دور بھی اسی شہر میں گذرا ۔ باپ کا نام معلوم نہیں ۔ دادا کا نام ملا کمال الدین حسین تھا ، جو اس دور کے مقبول ترین ناموں میں سے تھا ۔ یہ ملا کمال الدین حسین کون اور کس پائے کے آدمی تھے اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ بہرحال اس قدر مسلم ہے کہ یہ کمال الدین حسین ، واعظ کاشفی نہیں تھے ۔ اُن کے صاحبزادے فخری ہروی[1] کا ذکر بھی اس تذکرے میں موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ قاطعی کا اس خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ اُس کے اجداد غالباً فراہ کے رہنے والے تھے ۔ چنانچہ ابو نصر فراہی کے حالات کے ضمن میں لکھتا ہے :۔

فقیر را با آن بزرگوار نسبت ہم ہست و مرقد منور ایشان را در فرح (کذا) زیارت نمودہ ام　(ورق ۳۲)

یہ ابو نصر بدر الدین محمود بن ابوبکر بن حسین بن جعفر فراہی ۔ بہرام شاہ بن تاج الدین حرب[2] ، بادشاہ سیستان (مقتول ۶۱۸ھ) کے دربار کے ممتاز علماء میں سے تھے ۔ آپ کے آثار میں سے نصاب الصبیان کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ یہ کتاب آپ نے بہرام شاہ کے وزیر نظام الملک حسن کی فرمائش پر لکھی ۔ اس کتاب میں آپ نے عربی لغات کے معانی فارسی میں نظم کئے ہیں ۔ اس کتاب کی جو متعدد شروح لکھی گئیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں[3] :

شرح علامہ میر سید شریف جرجانی (قرن ہشتم)
شرح نظام بن کمال بن جمال بن حسام ہروی معروف با بن حسام (قرن نہم)
شرح قاضی محمد بن فصیح بن محمد بن محمد کریم الدین دشت بیاضی
شرح محمد حسین بن محمد رضا طالقانی
شرح محمد بن جلال بن سیلمان قہستانی ۔
شرح علی اکبر بن حاج میرزا محمد جعفر متطبب لغوی یزدی بنام درۃ الثمینیہ (قرن سیزدہم)

موخر الذکر شرح کا تتمہ درۃ الیتیمہ فی تتمات درۃ الثمینہ کے نام سے عباس بن محمد رضا قمی نے ۱۳۱۶ھ میں مکمل کیا ۔

ابو نصر فراہی نے جامع صغیر شیبانی کو بھی ۶۱۲ھ میں نظم کیا لیکن اب یہ کتاب مفقود الاثر ہے[4] ۔ میر خواند[5] نے آپ کے درج

---

[1] مجمع الشعرا ورق ۴۷ ۔　[2] تاریخ سیستان بتصحیح ملک الشعرا بہار (تہران ، کتابخانہ زوار) ص ۲۹۵ ۔ میر خواند ، محمد بن سید برہان الدین خواند شاہ ، تاریخ روضۃ الصفا ، تہران جلد چہارم ص ۶۵۷ - ۶۵۸ ۔　[3] سعید نفیسی ، تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی (در دو جلد) تہران ، ۱۳۴۴ شمسی ، جلد اول ص ۹۰ ۔　[4] ایضاً ۔　[5] تاریخ روضۃ الصفا ص ۶۵۸ ۔

ذیل اشعار بہرام شاہ کی مدح میں نقل کئے ہیں:

شہ نیمروزی دور روز ملک (کذا)   خجستہ ہنوز اوّل بامداد است
درین سیب کاندر قہستان نمودی   جہانی پراز عدل و انصاف اوست
بمالی در جہان تا جہان را طراوت   ز آب و ز آتش ز خاک و ز باد است
نماند فراموش بریاد خسرو   ثنای فراہی اگر ہیچ یاد است

قاطعی نے آپ کے درج ذیل چار اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے ہیں جن میں خلفائے راشدین کی مدح اور تاریخ خلافت کا ذکر ہے

صدیق تقی سہ ماہ و دو سال   بر مسند شرع پیشوا بود
دو سال خلیفہ بود و شش ماہ   فاروق کہ حاکم قضا بود
عثمان زکی دوازدہ سال   بر اہل صحابہ مقتدا بود
شش سال و چہار ماہ دیگر   ایام علی مرتضیٰ بود   (ورق ۳۲ب)

قاطعی کے اساتذہ

قاطعی نے سبحۃ الابرار جامی کے مشکل مقامات ملا صلحی کے والد، ملا آتشی ہروی سے پڑھے[۱] جن کے حلقۂ درس کا بڑا شہرہ تھا۔ فن خطاطی میں اُس نے ملا دوست سلمان سے کسب فیض کیا[۲]۔ یہ وہی ملا دوست سلمان تھے جن کے شاگرد رشید محمد اصغر کو ہفت قلم میں یکساں تبحر حاصل تھا۔ یہی محمد اصغر تھے جو ہمایوں و اکبر کے دور میں میر منشی کے منصب پر فائز رہے اور جنہوں نے آگے چل کر اشرف خان کے لقب سے شہرت پائی۔ فنون شعر میں قاطعی نے ملا نیازی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا[۳]۔ جو خود ملا قاسم کاہی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ملا نیازی بخارا کے رہنے والے تھے۔ شعر، عروض، معما، تاریخ گوئی اور دیگر اصناف سخن میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا اور آپ صحیح معنوں میں شاعر تھے۔ آپ نے شعر و شاعری کے بارے میں بعض کتابیں بھی تالیف کیں جو اب ناپید ہو چکی ہیں۔ آپ ادب آداب کے بارے میں بڑے لاپروا تھے اور مزاج میں بلا کی تندی تھی۔ بدایونی[۴] نے اس ضمن میں بعض واقعات بھی نقل کئے ہیں جن کی تائید کسی حد تک قاطعی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ ایک دفعہ آپ نے شاہ طہماسپ کے ندیم اور درباری شاعر ملامی نیازی استرآبادی کو، جن کا شمار "بے بدلان روزگار" میں ہوتا تھا، چند غزلیں ارسال کیں اور کہلا بھیجا کہ یا ان کا جواب کہو یا اس تخلص کو چھوڑ دو۔ قاطعی کے الفاظ یہ ہیں:

> خدمت استاذی ملاذی عارف حقیقی و مجازی مولانا نیازی، استاد فقیر یک مرتبہ چند غزل خود را
> بہ ملا نیازی فرستادند کہ این غزلہا را بگوی و الّا تخلص را بگذار   (ورق ۱۰۰ ب)

ایک اور بزرگ جن کا قاطعی بڑے احترام سے ذکر کرتا ہے وہ ملا زین الدین محمود القواس الہمدانی[۵] تھے۔ مولانا ہمدانی کو ملا عبدالرحمٰن

---

[۱] مجمع الشعرا ورق ۷۵ب۔ [۲] ایضاً ورق ۴۶۔ [۳] ایضاً ورق ۱۰۰ ب۔ [۴] منتخب التواریخ: جلد سوم ص ۲۶۲ - ۲۶۳۔
[۵] مجمع الشعرا ورق ص ۵۰، ۷۹۔

جامی اور عبدالغفور لاری سے شرفِ ملاقات حاصل تھا۔ بیرم خان آپ کا شاگرد تھا اور آپ کے حلقۂ درس میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کرتا۔ یوسف زلیخا کے درس کے دوران اگر بیرم خان بیچ میں کہیں بول پڑتا تو مولانا فرماتے: بیرم خان! کیا تو نے اپنے لیے کوئی اور یوسف زلیخا بنالی ہے؟ ہمایوں جب قندھار گیا تو بیرم خان کی معرفت مولانا بہدائی کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ ایک دن ہمایوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کھانا پکوایا تو مولانا کو بھی مدعو کیا۔ ہاتھ دھلانے کے وقت ہمایوں نے خود اپنے ہاتھ میں آفتابہ اٹھایا اور طشت بیرم خاں نے سنبھالا۔ اسی وقت مولانا نے سید جمال الدین محدثؒ کے پوتے میر حبیب اللہ کی طرف اشارہ کر کے ہمایوں سے کہا: اس کو بھی جانتے ہو یہ کون ہے؟ ہمایوں کو ان کے سامنے بھی آفتابہ لے جانا پڑا۔ میر صاحب گھبرا گئے اور تھوڑا سا پانی جلدی جلدی ہاتھوں پر ڈال لیا لیکن اس کے برعکس مولانا نے نہایت اطمینان کے ساتھ اچھی طرح ہاتھ دھوئے۔ اس موقع پر ہمایوں نے مولانا سے پوچھا کہ کتنے پانی سے ہاتھ دھونا مسنون ہے؟ مولانا نے فرمایا جس قدر پانی سے ہاتھ اچھی طرح دھل جائیں۔ ہمایوں آپ کی صحبت سے بہت خوش ہوا اور اس نے آپ سے بہت کچھ استفادہ کیا۔[1]

قاطعی کو بھی مولانا زین الدین سے ارادت قیام ہرات ہی کے زمانے سے تھی۔ مولانا کے ایک مرید اور سجادہ نشین محمد امین، برصغیر میں آکر لاہور کے مضافات میں ملک پور کے مقام پر بس گئے تھے۔ قاطعی کے روابط ان کے ساتھ بھی بڑے صمیمانہ تھے۔ جہانگیر جب متوجہ لاہور ہوا تو مولانا محمد امین ملک پوری نے بھی اس سے ملاقات کی۔ بادشاہ نے زر و زمین کا نذرانہ پیش کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا:

ما درویشانیم وجہت کفاف بدولت شما دو صد بیگہ زمین ہم داریم ۔۔۔۔ (ورق ۷۹)

قاطعی تلاش معاش میں

قاطعی نے ہرات کو کب خیرباد کہا اور دربارِ مغلیہ تک اس کی رسائی کب اور کیونکر ہوئی اس ضمن میں اس کی تحریر سوانح نگاری کی کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ جب وہ سن شعور کو پہنچا تو علم و ہنر کا آفتاب کمال برصغیر کے افق پر ضوفگن تھا چنانچہ جلد سازی، رنگ آمیزی اور تذہیب کاری کے فنون میں تبحر حاصل کرنے کے بعد، اس زمانے کے دوسرے صاحبانِ کمال کی طرح تلاشِ معاش کے لئے وہ بھی ہندوستان چلا آیا۔ ہمایوں جب ایران جاتے ہوئے ہرات پہنچا تو قاطعی اس کے ملتزمین رکاب میں شامل تھا۔ ایران سے اس کی واپسی کے بعد جب قندھار فتح ہو گیا تو ہم اسے بیرم خان کے وابستگانِ دست گاہ میں پاتے ہیں۔ اسی طرح مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو وہ کبھی فراہ کے اکابرِ علم کی مجلس میں نظر آتا ہے۔ کبھی کابل میں علمی مجلس لگائے دکھائی دیتا ہے۔ کبھی حج کے ارادے سے صحراؤں اور بیابانوں کا سینہ چیرتا نظر آتا ہے اور کبھی ہم اسے برصغیر کے مختلف شہروں میں مغل امرا کی محافل میں معاصرین کیساتھ نوک جھونک اور بحث و مجادلہ کرتا دیکھتے ہیں۔

قاطعی فراہ میں

فراہ میں قاطعی کا قیام چار ماہ تک رہا۔ اس عرصے میں وہ جن لوگوں سے ملا جلا ان میں سے قاضی ابو البرکہ میر قاسم لطیفہ خواجہ حافظ دیوان، خواجہ محمد یوسف اور ان کے صاحبزادے خواجہ محمد باقی، اور حسین سلطان و سنجر سلطان شامل تھے۔

---

[1] حالات کے لئے دیکھیے: منتخب التواریخ۔ جلد دوم۔ ص ۲۴۲.

[2] منتخب التواریخ (ترجمہ اردو) ص ۳۰۳ - ۳۰۴۔

موخرالذکر دونوں حکام شہر میں سے تھے جبکہ خواجہ محمد یوسف اور آں کے صاحبزادے کا شمار اکابر شہر میں ہوتا تھا۔ قاضی ابوالبرکہ اکابر فضلا میں سے تھے۔ آپ صاحب دیوان شاعر اور کئی مثنویوں کے خالق تھے۔ فن معما میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ کے معماہر دور دور سنے جو دارا کے نام سے تھا بڑی شہرت پائی[1]۔ یہ معما ہفت اقلیم[2] میں یوں نقل ہوا ہے:

بفرمان ہر کس کہ دوران برآمد
دو سہ دور گردید و آخر سر آمد

اس پر روشنی ڈالتے ہوئے امین احمد رازی لکھتا ہے[3]۔

> دوسہ دور گردید در (فی الاصل: دو) مصراعِ اخیر ترکیب و تحلیل یافتہ است و از دو سہ شش میخواہد و از (فی الاصل: ا) گردیدن آن مضاعفِ آن ارادہ میکند، و از در باب می خواہد و از دورِ ثالث طرفین باب قصد می نماید و از سہ دور مذکور کلمۂ طرفین باب بحصول می پیوندد باز دور در می خواہد و از درِ ثالث آں قصد می کند کہ رد باشد پس از شش دور مذکور طرفین باب رد حاصل شد ہر گاہ طرفین باب کہ دو بی است رو باشد اسقاط خواہد یافت الف بحصول پیوست و باز از شش دور تتمہ بدستور شش دور اول طرفین باب رو بہم می رسد و مراد از آن تبدیل بای اول است بہ ری و بای ثانی بدال کہ با الف مخصوص سابق کلمۂ ارا دبحصول می رسد و آخر سر آمد مشعر بہ تقدیم دال است بر باقی۔

قاطعی قندھار میں ہمایوں قندہار فتح کر چکا تو اسکا انتظام و انصرام بیرم خان کے سپرد کر کے خود کابل چلا آیا۔ بیرم خان دس برس تک بلا واسطہ قندھار پر حاکم رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ترکمان زادے کو دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں ودیعت کی تھیں۔ اگر ایک طرف اس کی تلوار کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی تو دوسری طرف اس کی معاملہ فہمی نے شاہ و گدا کو اس کی فراست کا گرویدہ کر لیا تھا۔ اپنی ادبی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی وہ امرا میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتا تھا اس پر مستزاد یہ کہ بلا کا دور اندیش اور مردم شناس واقع ہوا تھا۔ جو کوئی بھولے سے بھی اس کی بزم میں آنکلتا خانِ عالی شان کی فیاضیٔ طبع اور ہنر پروری اسے اپنا غلام بے دام بنا لیتی اور وہ وہیں کا ہو کر رہ جاتا۔ بیرم خان کی انہی گوناگوں صفات کی بدولت قندھار میں اس کے گرد اکابر و اشراف، فضلا و علما اور شعرا و ادبا کی ایک عظیم جماعت جمع ہو گئی تھی[4]۔ قندھار میں قیام کے دوران قاطعی کو نہ صرف یہ کہ مطلع ادب کے اس درخشندہ آفتاب کی

---

[1] مجمع الشعرا ورق ۳۲۔ [2] ہفت اقلیم۔ جلد اول ص ۲۰۱۔ [3] ایضاً ص ۲۰۱-۲۰۲۔

[4] بیرم خان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۱۹۰-۱۹۲۔ مآثر رحیمی جلد اول ص ۵۹ بعد، ایضاً جلد دوم ص ۱۶ بعد۔ عارف قندھاری، حاجی محمد: تاریخ اکبری باہتمام حاجی سید معین الدین ندوی و ڈکتور سید اظہر علی، و بنظر ثانی امتیاز علی عرشی (رامپور، ۱۹۶۲) ص ۵۶-۶۶۔ فرید بھکری شیخ، ذخیرۃ الخوانین بتصحیح ڈاکٹر سید معین الحق (کراچی، ۱۹۶۱) جلد اول ص ۱۱-۲۰۔ دیوان بیرم خان خانخاناں باہتمام دکتر محمود الحسن و دیگران (کراچی، ۱۹۷۱) مقدمہ ص ۱-۱۸ (انگریزی)

خدمت تربیت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا بلکہ اور بھی بے شمار اصحابِ علم و فضیلت کی مصاحبت کی سعادت نصیب ہوئی - جن میں سے حکیم عین الملک، ملا پیر محمد شیروانی، میر بارمی سیستانی، میر جان سیانی، قاضی لاغر اور ملا صدر حنا تراش کے نام بالخصوص قابلِ ذکر ہیں

حکیم عین الملک شیرازی الاصل تھے - امراضِ چشم اور جراحی میں بے نظیر تھے - بیرم خان کے زمانے میں باپ کے ہمراہ وارد قندھار ہوئے - ان دنوں قاطعی بھی بیرم خان کی ملازمت میں تھا چنانچہ اس کا بیشتر وقت حکیم کے ہمراہ کتب خانے ہی میں گذرتا اور کتب خانہ چونکہ خان کے نزدیک ہی تھا اس لیے قاطعی کو خان سے براہِ راست بھی تماس حاصل رہتا - مجمع الشعراء میں لکھتا ہے:

> اکثر اوقات با حکیم در کتاب خانہ می بودیم و کتاب خانہ نزدیک بخان می بود، و خان می آمدند و بزبان
> فصیح ہمزبانی می فرمودند (ورق ۵۱)

ہمایوں جب ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو حکیم بھی اُس کے متوسلین رکاب میں شامل تھا - قاطعی کا بیان ہے کہ ہندوستان پہنچ کر آپ کچھ عرصہ حاکمِ دہلی بھی رہے - آپ نے لوگوں کے ساتھ بڑی محبت اور رواداری کا سلوک کیا اور کرم و مروت سے ان کے دل جیت لیے - ابوالفضل نے آپ کو 'دانش اندوزان جاوید دولت' کے زمرے میں شامل کیا ہے - آپ کو دربارِ اکبری میں پانصدی کا منصب حاصل تھا -

ملا پیر محمد شیروانی کے بارے میں قاطعی کا بیان ہے کہ وہ وادیٔ علم میں ثانی میر سید شریف جرجانی[1] تھے - فتح مند ہونے کے بعد آپ نے عجب مقام و مرتبہ پایا اور اپنے جود و کرم اور کمال انسانیت سے لوگوں کو خوب نوازا - دربارِ اکبری میں پنج ہزاری کے منصب پر فائز تھے - 'پیٹے خان' کا پھر 'ناصر الملک' کا خطاب عطا ہوا - قاطعی لکھتا ہے کہ خان موصوف عینِ امارت کے زمانے میں ایک دفعہ ہزار قبچاق سواروں اور طرح طرح کے خیل و حشم کے ہمراہ بازارِ دہلی سے گذر رہا تھا - سواروں نے ابریشمی لباس پہن رکھا تھا جب یہ لشکر مدرسۂ دہلی کے سامنے پہنچا تو خان نے بآوازِ بلند کہا:

> وای بر آن سپاہی کہ جامۂ پارچہ می پوشد کہ من دوبارہ روی او نخواہم دید! (ورق ۵۱ ب)

دروازۂ لعل[2] سے خان کے نقارے کی آواز آ رہی تھی اور سوار گھوڑوں کو اِدھر اُدھر دوڑا رہے تھے - ایسے میں خان کی آواز پھر بلند ہوئی: لوگو! جانتے ہو یہ کس کا نقارہ بج رہا ہے؟ لوگ حیران تھے کہ کیا جواب دیں - خان نے اپنا سوال پھر دہرایا لیکن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خان کا مطلب کیا ہے - بالآخر خان نے خود ہی سکوت کو توڑتے ہوئے کہا: یہ اس کا نقارہ ہے جسے ایک دفعہ

---

[1] صاحبِ "کتاب التعریفات" (بیروت، مکتبۃ لبنان، ۱۹۶۹ء) حالات کے لیے دیکھئے: فخر الدین علی بن حسین واعظ کاشفی، رشحاتِ عین الحیات (مخطوطہ شمارہ ۵۰۷/۰/۱ - انڈیا آفس) ورق ۹۱ بعد، معصوم علی شاہ، محمد معصوم شیرازی، طرائق الحقائق با تصحیح محمد جعفر محجوب (در سہ جلد، تہران ۱۳۳۹ - ۱۳۴۵ شمسی) جلد دوم ص ۶۸۹ - ۶۹۴ -

[2] سید احمد خان (آثار الصنادید، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۹۵) کے بقول دہلی کے کابلی دروازے ہی کا دوسرا نام "دروازۂ لال" ہے - نیز ملاحظہ ہو: بشیر الدین احمد، واقعات دار الحکومت دہلی (در سہ حصہ، دہلی، ۱۹۱۹ء) حصہ دوم، ص ۶۴۴ -

مشہد مقدس مطہر میں غسل کرنے کی حاجت ہوئی تو حمامی کو دینے کے لئے اُس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ وہی جزوہ جس کا مطالعہ کر رہا تھا بغل میں دبایا اور حمام میں جا گھسا۔ جیب میں پیسہ تو کوئی تھا نہیں۔ حمام سے نکل کر حمامی سے کہنے لگا کہ اے یارِ عزیز، میرا یہ جزوہ تم اپنے پاس رکھو میں تمہارے پیسے ابھی لا کر دیتا ہوں۔ حمامی کے شاگرد نے اُسے کندھے سے پکڑ کر باہر دھکا دیا اور کہا: ای طالب علم گرسنہ، دور شو از غوغا۔ کہ دنیا میں انسان پر ہر طرح کا دور آتا ہے۔

میر ہادی[1] سیستانی خان کے وکیلِ مطلق تھے۔ وکالت آپ کو زیب دیتی تھی۔ طبع موزوں پائی تھی اور بڑے اچھے شعر کہتے تھے۔

خواجہ میر جان سیاقی[2] بیرم خان کے بخشی تھے۔ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی بڑے اچھے تھے۔ چند سال تک قندہار میں بخشی باستقلال رہے۔ ہندوستان آئے تو بھی بیرم خان کے معتمدین میں شمار ہوتے تھے اور جب خان کی شہادت ہوئی تو بقولِ قاطعی آپ ہی نے اس کی لاش کو مشہد مقدس لا کر سپرد خاک کیا[3]۔ قاطعی کے الفاظ یہ ہیں:

چوں نواب سعید شہید گردید، خواجہ جسدِ منور مطہر نواب را بمشہد مقدس بردہ و زر بسیار نذرِ سادات آں جا گذرانید

و در باغچہ پایان پای حضرت امام دفن نمود۔ (ورق ۴۳)

قاطعی اور میر جان سیاقی کے درمیان "نسبت تیاری" بھی موجود تھی اور دونوں چھ برس تک قندہار میں اکٹھے رہے۔

قاضی لاغر کا اصل نام قاضی احمد تھا لیکن چونکہ سیستان کے ایک اور قاضی کے مقابلے میں ضعیف الجثہ تھے، قاضی لاغر مشہور ہو گئے[4] مختلف علوم میں عالم متبحر تھے اور مستعدانِ روزگار میں شمار ہوتے تھے۔ حاکم سیستان بڑا خوش رو انسان تھا ایک دفعہ مجلس عیش و نوش گرم تھی، اُس نے قاضی کو بھی بلا بھیجا۔ آپ نے جواباً یہ اشعار لکھ بھیجے:

ز خدمت تو مرا مانع است امر قضا ۔۔۔ تو خود بگو کہ با امر قضا چہ چارہ کنم

ز بادہ منع تو نتوانم ذکر ہم نیست ۔۔۔ "کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم[5]" (ورق ۵۴)

آپ صاحب دیوان شاعر تھے۔ امین احمد رازی[6] نے مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ آپ کی یہ رباعی بھی نقل کی ہے:

خوبان گلِ گلشنِ حیاتند ہمہ ۔۔۔ لب شکر و شیریں حرکاتند ہمہ

از آدمیان غرض ہمیں ایشانند ۔۔۔ باللہ کہ باقی حشراتند ہمہ

---

[1] آپ کا نام "حاجی محمد سیستانی" ہونا چاہیے۔ عارف قندہاری (تاریخ اکبری ص ۵۸) لکھتا ہے: ۔۔۔۔ جناب حاجی محمد خان کہ نسبت وکالت خانی داشت۔۔۔۔" لیکن مجمع الشعرا (ورق ۵۰) میں میر ہادی سیستانی ہی مرقوم ہے۔

[2] آپ کا تخلص "سیاقی" تھا (منتخب التواریخ، جلد سوم ص ۲۰۵) مجمع الشعرا (ورق ۴۳) میں "سیاقی" مرقوم ہے۔

[3] مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: دیوان بیرم خان خانخانان۔ مقدمہ ص ۱۵، فٹ نوٹ ۵۔ [4] ہفت اقلیم، جلد اول ص ۲۹۹۔

[5] حافظ گوید: سخن درست بگویم نمی توانم دید کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم (دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی باہتمام محمد قزوینی و قاسم غنی تہران ص ۲۴۰)

[6] ہفت اقلیم جلد اول ص ۳۰۰۔

آپ بیرم خان کے زمانے میں قندہار تشریف لائے تو قاطعی کی آپ کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ خود لکھتا ہے:

در قندہار آمدہ در زمانِ بیرم خان، و مجلس ایشان مشرف گردیدیم و صحبت ہا بایشان داشتیم (ورق ۵۴ ب)

ملا صدر رضا تراش ہرات کے رہنے والے تھے۔ طبع بچپن ہی سے موزوں پائی تھی لیکن اس کے باوجود شعر کم ہی کہتے تھے قاطعی کا بیان ہے کہ آپ نے درج ذیل رباعی اپنے استاد کی ایک رباعی کے جواب میں کہی:

خوبانِ جہاں مظہرِ ذاتند ہمہ　　مطلوب تمام کائناتند ہمہ
عیسیٰ نفسانند کہ جاں می بخشند　　پاکیزہ تر از آبِ حیاتند ہمہ　　(ورق ۵۲ ب)

استاد کی رباعی یہ ہے:

خوبانِ گلِ گلشنِ حیاتند ہمہ . . . .　　(ورق ۵۲ ب)

ملا قاطعی نے ملا صدر رضا تراش کے استاد کا نام ذکر نہیں کیا لیکن جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے امین احمد رازی[1] کے بقول یہ باتی قاضی لاغر کی ہے۔ قاطعی ملا صدر رضا تراش کو ہرات ہی سے جانتا تھا لیکن قندہار میں قیام کے دوران تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔

فقیر در ہرات ہم بایشان خصوصیت داشتیم و در قندہار بیشتر شد (ورق ۵۲ ب)

قاطعی کابل میں قاطعی جب قندہار سے کابل ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے خواجہ خرد مکہ کے مدرسے میں قیام کیا۔ خواجہ موصوف اصلاً ہراتی تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گئے تو وہیں مقیم ہو گئے۔ بارہ دفعہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور عرصہ دراز تک سرزمینِ بطحا و طیبہ میں یادِ الٰہی میں محو رہنے کے بعد کابل چلے آئے اور یہیں حصارہ نامی مقام پر اقامت اختیار کی۔ آپ کی خانقاہ اور مدرسہ غریب الدیار درویش اور طلبا کی اقامت گاہ تھی، جہاں دو وقت کا کھانا بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ ہمایوں کی طرف سے آپ کا وظیفہ مقرر تھا آپ اس رقم کو درویش اور حاجتمند طلبا کو لباس وغیرہ کی فراہمی پر صرف کرتے۔ ایام متبرکہ میں بادشاہ سے ملنے کے لئے بھی تشریف لے جاتے۔

آپ کا مدرسہ اندرون شہر بابر بادشاہ کی مسجد کے پہلو میں واقع تھا اور اس کے بیچ میں سے ایک نہر گزرتی تھی۔ قاطعی جب یہاں پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ رہائش کے لئے جگہ کافی نہیں چنانچہ معماروں کو بلا کر اس نے چند ہی دن کے اندر اندر ایک بڑا ہی پُرتکلف بالاخانہ تعمیر کرا لیا جس کی کھڑکیاں مدرسے کی جانب کھلتی تھیں اور دروازے کے باہر گلاب و یاسمین اور طرح طرح کے دوسرے پھولوں کی حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی کیاریاں دیکھنے والوں کے لئے ضیافتِ دیدہ و دل کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ جگہ کی قلت دور ہو گئی تو قاطعی کے بالاخانے پر ہر روز شاعروں اور ادیبوں کا ہجوم ہونے لگا۔ جو لوگ بڑی باقاعدگی سے آتے ان میں سے میرامانی، ملا زردی اور ملا واصلی کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں[2]

---

[1] ہفت اقلیم جلد اوّل ص ۳۰۰۔

[2] مجمع الشعرا ورق ۵۹ ب۔

خواجہ خرد کہ کا مدرسہ چونکہ سر بازار واقع تھا جہاں کاسبوں کی آمد و رفت اکثر رہتی تھی۔ ان لوگوں کے شور شرابے سے بعض اوقات ملا قاطعی کے دوست احباب کو سخت کوفت ہوتی۔ قاطعی اگر ان لوگوں کو شور کرنے سے روکتا تو یہ الٹا خواجہ خرد کہ کے پاس گلہ کر چلے جاتے۔ ایک دن قاطعی بھی آپ سے ملنے کے لئے گیا۔ آپ بڑے اخلاق اور مروت سے پیش آئے۔ دیر تک صحبت رہی۔ اثنائے گفتگو یہ راز کھلا کہ خواجہ خرد کہ، قاطعی کے والد ۔۔۔ کمال الدین حسین ۔۔۔ کے مصاحب رہ چکے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے منہ بولے بھائی تھے بہر حال خواجہ خرد کہ قاطعی سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ مدرسے کی تولیت میں نے ملا شاہ محمد کیہ فروش کے سپرد کر رکھی تھی۔ مجھے یہ جان کر انتہائی افسوس ہوا کہ اُس نے ایسے لوگوں کو وہاں بسا رکھا ہے۔ آج کے بعد مدرسے کی تولیت تمہارے سپرد ہے۔

حالا شما را متولی ساختیم و اختیار بدست شما دادیم از ہر کس کہ می خواہید بگیرید و بہر کس کہ خواہید بدہید۔ (ورق ۵۹ ب)

قاطعی غزنین میں

میرزا ہندال کی شہادت[1] (۹۵۸ ھ) کے بعد اُس کی تمام جاگیر اور غزنین وغیرہ کے علاقے ہمایوں نے شاہزادہ اکبر کے سپرد کر دیئے۔ اسی طرح ہندال کے سب ملازمین بھی اکبر ہی کو منتقل ہو گئے۔ انہی دنوں خواجہ جہان، میر کاتب، قاسم علی خان غباردی اور قاطعی کو بھی کابل سے غزنین آنا پڑا۔ اتفاق سے قاطعی کا ارادہ حج بیت اللہ کو جانے کا ہو رہا تھا۔ ملا شاہ واقعہ نویس تخلص بہ انسی بھی ایک عرصے سے یہی خواہش سینے میں لئے بیٹھے تھے۔ چنانچہ ملا ایک جماعت کے ساتھ قاطعی سے پہلے روانہ ہو گئے۔ راستہ خطرناک تھا اور افغان راہزنوں کے حملے کا ہر لمحے کھٹکا تھا۔ ملا شاہ کے پاس بہت سی اشرفیاں تھیں۔ انہوں نے یہ اشرفیاں پہلوؤں میں سی لیں اور اوپر سے معمولی سا لباس پہن لیا۔ ابھی راہزن پہنچے بھی نہیں تھے کہ ملا نے مہمیز لگائی اور دس کروہ کا فاصلہ چشم زدن میں طے کر کے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ملا قاطعی نے اپنے ساتھیوں سمیت جن میں حلیمہ بیگ، میرزا عسکری، کمال الدین حسین کتابدار اور خواجہ کلاں سوداگر شامل تھے۔ سیوی میں ملا سے ملاقات کی اور ان کی چابکدستی، تیز رکابی اور جرأت پر داد دی[2]۔

حج بیت اللہ

قاطعی سیوی سے قندھار، قندھار سے بھکر اور بھکر سے ٹھٹھ پہنچا، ٹھٹھ سے وہ حج پر گیا یا نہیں؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال اُس کی درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے ساتھیوں سمیت واپس ہندوستان پہنچا تو مغلیہ سلطنت ہندوستان میں پھر سے بحال ہو چکی تھی اور ہر کسی کو اس کی خدمات کے مطابق صلے سے نواز اگیا تھا۔ عبارت یہ ہے:

...... جماعتی بجانب قندہار روان شدند، احرام بستہ بہمراہی ایشان بقندہار آمدم و از قندہار بہ
بکر و تتہ روان شدیم و باز کہ بہند افتادند ہر کس کہ خدمت کردہ بودند رعایت تمام یافتند، خان و
سلطان و خوجہ جہان شدند (ورق ۵۷)

---

[1] بایزید بیات، تذکرہ ہمایوں و اکبر باہتمام م۔ ہدایت حسین (کلکتہ، ۱۹۴۱ء) ص ۱۴۷۔

[2] مجمع الشعراء ورق ۴۵۔

قاطعی ٹھٹھہ میں قاطعی کے استاد ملا نیازی معلوم ہوتا ہے آخری عمر میں ٹھٹھہ منتقل ہو گئے تھے[1]۔ ایک دفعہ قاطعی کسی مناسبت سے ٹھٹھہ گیا تو اس کی ملاقات وہاں ملا جانی[2] سے ہوئی۔ ملا جانی مروزی الاصل تھے۔ آگرہ آکر ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر ہندوستان سے بھاگا تو ملا جانی بھی انتہائی تنگ دستی کے عالم میں ٹھٹھہ کی جانب نکل گئے۔ ان کی شیریں سخنی، فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی نے میرزا شاہ حسین[3] کو بہت متاثر کیا۔ اسی زمانے میں بندر لاہری پر کچھ کام ہو رہا تھا۔ انھیں وہیں کچھ ماموریت مل گئی چنانچہ انہوں نے وہاں خوب دولت اکٹھی کی۔ بندر لاہری سے جب کبھی وہ ٹھٹھہ آتے تو ملا نیازی کے لئے بہت سے تحفے تحائف ہمراہ لاتے اور انہی کے پاس قیام کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے قاطعی سے کہا کہ آپ کبھی بندر لاہری تشریف لائیں تو آپ سے گپ شپ ہو۔ ہم نے وہاں ہرات کے باغات کے نمونے پر دو باغ بنائے ہیں، آپ آ کر دیکھیں اور بتائیں کہ کیسے لگتے ہیں۔ چنانچہ قاطعی جب بندر لاہری گیا تو ملا نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی — قاطعی کی پذیرائی کے لئے اعلیٰ قسم کے قالین بچھائے گئے۔ انواع و اقسام کے کھانے تیار کئے گئے۔ سمع نوازی کے لئے چرکسی، ختائی اور ہندوستانی غلام حاضر تھے۔ جو سازندگی اور گانے بجانے میں ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ ملا جانی بنفس نفیس سونے چاندی کی مرصع صراحیوں میں طرح طرح کے مشروبات لا کر پیش کرتے۔ قاطعی ملا کی یہ خوشحالی دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ خود ملا جانی بھی خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ انہوں نے قاطعی کو بتایا کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میں مرو میں سری بلکہ پکانے والوں اور نان فروشوں کے لئے ایک آدھ قطعہ کہتا تھا اور انہی کی دی ہوئی آش سے پیٹ بھر لیتا تھا۔ ملا قاطعی اب ایک یہ بھی زمانہ ہے! وہ عجب قادر مختار ہے کبھی اس حال میں رکھتا ہے تو کبھی اس حال میں۔ قاطعی نے آپ کے درج ذیل اشعار نقل کئے ہیں۔

چوں گرد باد ہر گز جائی گذر نکردم　　کز دست وقت تو خاکی بسر نکردم
در ہیچ جا نکردم دور از رخ تو منزل　　کز گریہ آں زمیں را صد بار تر نکردم
جائی نگشتم آگاہ از توتیای بینش　　تا خاکپای او را کحل بصر نکردم
شگفتہ لالہ نبود سرو من در رہگذار تو　　بود صبر لالہ چشمی براہ انتظار تو　　(ورق ۹۵ ب)

اسی طرح ایک دفعہ ملا قاطعی کا قاضی زادہ کاشان[4] کے ہمراہ ٹھٹھہ جانا ہوا۔ میرزا عیسی بہادر ترخان[5] نے قاضی زادہ کی آمد کی خبر سنی تو انہیں دیوان باستقلال بننے کی پیش کش کی جو آپ نے قبول کر لی۔ قاضی زادہ کاشان کا تعلق سادات صحیح النسب استرآباد

---

[1] آپ پہلے جنت آشیانی ہمایوں کی خدمت میں تھے۔ پھر اکبر کی خدمت میں رہے۔ زندگی کا بیشتر حصہ سندھ میں گذارا، اور ٹھٹھہ میں فوت ہوئے دیکھئے نظام الدین احمد۔ مرزا۔ طبقات اکبری ترجمہ (انگریزی) از بی۔ ڈے۔ (در سہ جلد، کلکتہ ۱۹۲۷۔ ۱۹۳۹) جلد دوم ص ۳۲۷، منتخب التواریخ جلد سوم ص ۳۶۲۔۳۶۴۔ [2] مآثر رحیمی (جلد دوم) ص ۳۲۲ میں آپ کا صرف نام مذکور ہے۔ [3] حالات کے لئے دیکھئے: مآثر رحیمی، جلد دوم ص ۳۴ بعد [4] مآثر رحیمی (جلد دوم ص ۳۲۸) میں میرزا عیسی بہادر ترخان کے بیٹے میرزا باقی کے معاصر کے ضمن میں "قاضی کاشانی" کا نام مذکور ہے جس سے مراد غالباً قاضی زادہ کاشان ہی ہیں۔ [5] حالات کے لئے ملاحظہ ہو: مآثر رحیمی جلد دوم ص ۳۲۲ بعد۔

سے تھا۔ ٹھٹھہ میں آپ نے اپنی حویلی میں ایک شاندار حمام بنوایا۔ حمام کے باہر ایک باغیچہ تھا جس کے درمیان میں ایک فوارہ دار حوض تھا۔ حوض کے چاروں طرف رنگا رنگ کے پھول لگے ہوئے تھے جن کی خوشبو سے باغیچہ اور دیوان خانہ مہکے رہتے۔ ملا قاطعی اور ملا نیازی بڑی باقاعدگی سے آپ کی مجلس میں شریک ہوتے۔

قاضی زادہ کے احباب میں سے جب کوئی شخص حمام میں جاتا تو آپ کے ملازمین بڑا پرتکلف قسم کا ایک بقچہ پیش کرتے جس میں لباس ہوتا۔ چنانچہ وہ شخص خلعت پہن کر آپ کی مجلس میں وارد ہوتا۔ ایک دن صبح سے نماز مغرب تک محفل جمی رہی۔ اس اثنا میں ملا طریقی دوسری دفعہ حمام گئے اور ملازمین سے تازہ لباس طلب کیا۔ ملازمین ایک دن میں دوسری دفعہ لباس دینے پر آمادہ نہ ہوئے اور قاضی سے شکایت بھی کی۔ قاضی نے ملازمین کو دوبارہ لباس نہ دینے پر سرزنش کی اور واپس کر دیا۔ چنانچہ ملا طریقی نئی خلعت پہن کر مجلس میں آئے۔ قاطعی لکھتا ہے:

این چنیں مردم صاحب کرم دیدیم (ورق ۵۳ ب)

میر جب دیوان ہو گئے تو قاطعی بھی اُن کے وابستگان خدمت میں شامل ہو گیا۔ قاطعی اگر کوئی قصیدہ یا غزل کہتا تو قاضی زادہ کا نشان اُسے میرزا عیسیٰ ترخان تک پہنچا دیتے اور اگر کوئی صلہ وغیرہ ملتا تو مجلس میں لا کر قاطعی کے حوالے کر دیتے۔ آپ خود بھی بڑے اچھے قصیدہ گو اور طویل قصاید کہنے کے شوقین تھے۔ قاطعی لکھتا ہے:

قصیدۂ ہفتاد و ہشتاد بیت مضمون پر معنی رنگین جانفزای دلربای میگفتند چنانکہ ـــــ

از بہارِ طبعِ او گلزارِ معنی خرم است　　از نسیمِ لطفِ او باغِ سخن گلزار شد (ورق ۵۳ ب)

خط نستعلیق بڑا عمدہ لکھتے تھے۔ آپ نے یہ رباعی قاطعی کی بیاض میں بدستِ خود رقم کی:

رباعی

دل سوخت ز داغ آشنائی فریاد
وز دست غمت نیست رہائی فریاد
افسوس ز شادی وصالت افسوس
فریاد ز محنت جدائی فریاد (ورق ۵۳ ب)

قاطعی آگرے میں

قاطعی ہرات، فراہ، قندہار، کابل، غزنین اور ٹھٹھہ وغیرہ میں پھرنے پھرانے اور قیام کرنے کے بعد بالآخر آگرہ چلا آیا اور پھر آخری دم تک اسی شہر میں رہا۔ آگرہ میں قیام کے دوران بھی اکابر عہد کے ساتھ اس کے روابطِ حسنہ میں کوئی فرق نہ آیا، اور اس کی آمد و رفت ان کی مجالس میں بدستور قائم رہی، جہاں معاصرین سے ملاقات اور علمی و ادبی مسائل پر مذاکرہ ہوتا اور ایک دوسرے کے جواب میں غزلیں کہی جاتیں۔ موسیقی کی محفل ہوتی تو سب اس میں شریک ہوتے اور اہل فن کو داد و تحسین کا خراج پیش کرتے۔ یوں تو آگرے میں قیام کے دوران قاطعی کے تعلقات بیشمار افراد سے رہے ہوں گے لیکن مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی سے، اس کے صرف درج ذیل افراد کے ساتھ روابط کا پتا چلتا ہے:۔

خواجہ حسین ہروی: ہرات میں پیدا ہوئے۔ عبید اللہ کے زمانے میں بخارا تشریف لائے۔ معقولات میں مولانا عصام الدین ابراہیم اور شرعیات میں خاتم العلماء و محدثین شیخ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی، انشا پردازی، صنایع بدایع، فصاحت و بلاغت اور مزاح و ظرافت میں بے نظیرِ وقت تھے۔ ابوالفضل[1] لکھتا ہے:۔

از اہلِ نشست قدسی محفل جنت آشیانی بود و دریں دولت ابد طراز نیز اعتبار یافت

ہمایوں بادشاہ آپ کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ: خواجہ حسین نمکِ مجلسِ ماست[2]۔ خطاطی میں آپ ملا علی[3] کے شاگرد تھے اور رنگہ نویسی بھی بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ اکبری دور میں آپ کی رہائش گاہ دریا کے اس پار آگرہ میں بڑے ہی لطیف اور دلکشا مقام پر واقع تھی جہاں ہمہ وقت علماء و فضلاء اور شعراء کا ہجوم رہتا جو آپ کی محفل سے لطف اندوز ہوتے۔ قاطعی جن دنوں ہمایوں کی خدمت میں تھا، خواجہ موصوف سے اُسے بڑا قرب حاصل تھا اور وہ ان کے فضل و کمال سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ خواجہ بھی اس کا بہت خیال رکھتے یہاں تک کہ انہوں نے آگرے میں اُسے بڑا اچھا گھر بنا کر دیا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے تو اُسے جاگیر ملی ہی ہوئی تھی، خواجہ نے بھی اپنی جاگیر میں سے ایک گاؤں اُس کے نام کر دیا اسی طرح چند گاؤں خواجہ نے اور لوگوں کے نام بھی کئے ہوئے تھے۔ خواجہ حسین ہروی کے اپنے پاس جو زمین تھی اس کا رقبہ قاطعی کے اندازے کے مطابق ستر اسی لاکھ (بیگھہ) تھا[4]۔

خواجہ حسین صاحبِ دیوان شاعر تھے اور میر کلنگ سارا وقت انہی کا دیوان کتابت کرتے رہتے۔ چنانچہ خواجہ جب حج کے لئے گئے تو انھیں بھی ہمراہ لے گئے[5]۔

ملا محسن کابلی: کابل میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ہمایوں بادشاہ کے ندما میں سے تھے اور ان کا شمار ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ ملا خود بھی فضلائے روزگار میں سے تھے۔ بچپن ہی سے والد کے ہمراہ مجلس شاہانہ میں شرفیابی حاصل کر چکے تھے۔ علوم دینی میں مولانا علاء الدین لاری[6] کے تلامذہ میں سے تھے۔ آگرہ میں مدرسۂ خس[7] مولانا علاء الدین میں مقیم تھے۔ قاطعی اور ملا محسن کابلی ایک دفعہ سالہا سال تک ہم خانہ بھی رہے۔ دونوں کے درمیان انتہائی صمیمانہ روابط تھے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملا محسن قاطعی کے والد کے ارادتمندوں میں سے تھے۔ قاطعی کا بیان ہے:

ملا محسن نسبت بوالدِ جامع داشتند (ورق ۳۹ ب)

ملا نے اپنے کلام کے دو دیوان مرتب کئے تھے اس کے علاوہ آپ کئی کتب کے مصنف تھے۔ آپ نے رسالۂ میر حسین معمائی کی شرح بھی لکھی تھی جس میں اپنے "یاران اہل فضل" کو بھی بتقریب یاد کیا تھا، جن میں قاطعی کا نام بھی شامل تھا۔ آپ نے قاطعی کے لئے ایک موشح الاطراف بھی بطریقِ مثنوی نظم کیا تھا جس سے دونوں کے تعلقات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

می سزد گر خوانمش ماہ تمام　　مطلعِ مہر است چوں آں نیکنام

---

[1] آئین اکبری ص ۱۰۴　[2] مجمع الشعرا ورق ۹۹۔ [3] حالات کے لئے ملاحظہ ہو: آئین اکبری ص ۵۰۷۔ [4] مجمع الشعرا ورق ۹۹۔

[5] ایضاً ورق ۹۹ب۔ [6] حالات کے لئے دیکھئے: تذکرہ ہمایوں و اکبر ص ۱۸۸-۱۸۹۔ [7] مزید اطلاع کے لئے ملاحظہ ہو: منتخب التواریخ، ترجمہ از راحت ۲۵۴

لب چو بگشاید بہنگام خیال　　لال ماند عقل با چندین کمال
از ہمہ سر خرد سر تا بپا　　آمدش آگاہی از لطف خدا
قطع چون از ماسوی گشتش رفیق　　قاطعی شد نام آن صاحب طریق
طبع او با مہر دارد ارتباط　　طرز او را چون نمودم احتیاط
عقل خود را ہم فزودم ارتفاع　　عین مہرش یافتم از انتفاع
یافتم او را چو مہر خاوری　　یک دل و یک روی خلق از یاوری　(ورق ۳۷)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مونس الاطراف سے قاطعی کا نام قطعی برآمد ہوتا ہے حالانکہ چوتھے شعر میں اُس کا نام بالصراحت قاطعی مرقوم ہے۔ ظاہراً پانچواں شعر دوران کتابت فوت ہو گیا ہے۔

ملّا چلپی علامہ: شیخ کمال الدین ابوالفضل تبریزی معروف بچلپی بیگ علامی بزرگ زادگان تبریز میں سے تھے آپ کے والد میرزا علی بیگ شاہ طہماسپ کے زمانے میں اُس شہر کے کوتوال تھے۔ چلپی بیگ نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی پھر شیراز چلے آئے۔ یہاں آپ نے ملا شیرازی سے حاشیہ تجرید پڑھا۔ شیراز سے آپ قزوین آئے جہاں اکابر علما کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور شفا و اشارات کی تکمیل بھی کی۔ آپ کے اساتذہ میں سے افضل الدین ترکہ اصفہانی کا نام بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ شطرنج بازی اور شاعری میں یکتا اور ممتاز تھے۔ اکبر نے شہرت سنی تو بلا بھیجا اور منصب قضا پر فائز کیا، یہ منصب کچھ عرصے تک آپ کے پاس رہا لیکن چونکہ آپ ہمیشہ ذہنی خلفشار کا شکار رہتے تھے اور رہی سہی کسر افیون کی عادت نے پوری کر دی تھی، اس لئے آپ نے اس ذمے داری سے سبکدوشی اختیار کر لی۔ قاطعی کے آپ کے ساتھ بڑے گہرے مراسم تھے۔ لکھتا ہے:

فقیر بالشان آشناہ (کذا) مخصوص شدیم و خدمت ایشان خالی از خلق دہمتی نبود (ورق ۴۱ ب)

شاعری میں پہلے شیدا اور پھر فارغ تخلص کرتے تھے۔ یہ شعر آپ کا ہے:

محالست این کہ عاشق را شود یک کام دل حاصل
تمنا بہ تمنا بشکند تا جبان برون آید　(ورق ۴۱ ب)

ملّا میرک صالحی: معززین ہرات میں سے تھے۔ شعر و انشا میں بڑے خوش سلیقہ تھے۔ انواعِ خطوط میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور عرصے تک دربار اکبری میں منشی کے طور پہ کام کرتے رہے! ابوالفضل[2] کا بیان ہے؛

خود را بہ نظام الملک طوسی می رساند

آپ قاطعی کے رشتے دار تھے۔ آگرہ میں جب ایک دوسرے کے ساتھ ان کی نشست ہوتی تو شعر و شاعری کا خوب دور چلتا۔ قاطعی لکھتا ہے:

---

[1] ہرمان اتہ (تاریخ ادبیات فارسی، رضا زادہ شفق (مترجم) تہران، ۱۳۳۷ شمسی ص ۷) نے اپنی کتاب کے مآخذ کا ذکر کرتے ہوئے مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی کے مؤلف کا نام "قاطع" لکھا ہے جو متعدد دیگر شواہد کے علاوہ، اس شعر کی رو سے بھی غلط ہے۔ [2] آئین اکبری ص ۱۷۶۔

گاہی غزلی ہم در آگرہ بایشان درمیان انداختہ می گفتیم (ورق ۸۱)

آپ صاحب دیوان اور صاحب طرز شاعر تھے۔ یہ شعر آپ کا ہے:

مرا میگویند بیداران بزن دستی بدامانش
مرا دستی اگر بودی گریبان پارہ میکردم

ملا صبوحی: میرزادہ ہائے چغتہ میں سے تھے اور اکبری دور کے سربرآوردہ شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے دیوان میں رنگین اشعار بکثرت تھے۔ خواجہ معظم[1]، میر معز الملک اور میر علی اکبر کی مجالس میں اکثر آتے۔ قاطعی کے ساتھ بھی آپ کی آشنائی انہی مجالس میں ہوئی، جو بعد میں رفاقت میں بدل گئی۔ لکھتا ہے:

اکثر مجلسہا یک دیگر مخصوص بودیم و شعرہا درمیان می افتاد و می گفتیم (ورق ۸۰)

آخری عمر میں حج بیت اللہ کے لئے گئے تو ایک عرب نوجوان کو دل دے بیٹھے۔ یہ شعر اسی کی مدح میں ہے:

جناب خواجہ ابراہیم آن سلطان مہ رویان
کہ یادش میبرد از خاطر محزون علم بیرون (ورق ۸۰)

شراب کے بڑے دلدادہ تھے، ۹۷۳ھ میں آپ نے وفات پائی تو فیضی نے ”صبوحی میخوار“ سے تاریخ نکالی[2]

ترخان نورالدین محمد خان: ہندسہ، ریاضی، نجوم اور حکمت میں ماہر اور ممتاز تھے۔ ہمایوں کے ندمائے خاص میں شمار ہوتے تھے ہمایوں جب فتح قندہار کے بعد متوجہ کابل ہوا تو آپ اس کے ہمراہ تھے۔ جب ہندوستان دوبارہ فتح ہوا تو بھی آپ عساکر شاہی میں شامل تھے اکبر بھی آپ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ ترخان کا خطاب بھی، آپ کو اسی نے دیا تھا (حالانکہ آپ تمری ترخان نہیں تھے) آپ کئی سال تک سرہند کے مضافات میں سفیدون نامی پرگنے میں جاگیردار رہے اس لئے حاکم سفیدون اور سفیدونی کے نام سے معروف ہوگئے۔ سخاوت و فیاضی اور مجلس آرائی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ شعر کہنے اور پرکھنے کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔

ایک دفعہ مخزن اسرار الٰہی، ملا قاسم کاہی[3] کا سفیدون کی طرف جانا ہوا تو ترخان نورالدین نے بہ نفس نفیس آپ کا استقبال کیا اور باغ خاص میں ٹھہرایا۔ قاسم کاہی اور ان کے شاگرد کئی دن تک سفیدون میں رہے۔ ہر روز شعر و ادب کی محفل جمتی اور مہمانوں کی ضیافتیں ہوتیں۔ ملا قاسم کے شاگردوں میں سے جس کسی نے کوئی شعر پیش کیا، ترخان نے اس کی ہمت افزائی کی، اور صلے سے نوازا۔

ملا قاسم کاہی جب سفیدون سے لاہور آنے لگے تو ملا نورالدین نے ان کے ہمرکاب بیس کے بیس شاگردوں کو ساز و سامان سے آراستہ ایک ایک گھوڑا عنایت کیا اور ملا قاسم سے کہا کہ آپ کے ہمراہیوں کو پیدل نہیں بلکہ آپ کی سواری کے پیچھے پیچھے سوار ہو کر چلنا چاہیے۔ اس واقعے کو بیان کرنے کے بعد قاطعی لکھتا ہے:۔

ملایان کہ آب و ہوائی ہند دریافتہ اند، این چنین ہمت دارند (ورق ۸۹)

---

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۳۸ ۔ [2] ایضاً ص ۲۵۸ ۔ [3] آئین اکبری ص ۱۸۱۔ طبقات اکبری (ترجمہ انگریزی) جلد دوم ص ۷۱۵، منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۷۲-۱۷۶ ۔ تذکرہ ہمایوں و اکبر ص ۱۸۵۔ ہفت اقلیم ۳۷۶-۳۸۳ ۔

مجمع الشعرائے میں آپ کی درج ذیل غزل نقل ہوئی ہے:

دلتنگ دورا زاں لب خنداں نشستہ ام　　مانند غنچہ سر بگریباں نشستہ ام
از تند باد ہجر تو، وز آتش درون　　گریاں چو شمع با دل سوزاں نشستہ ام
چوں دست ما بدامن وصلت نمی رسد　　پا ہی طلب کشیدہ بدامان نشستہ ام
جز نالہ و فغان چو نداریم ہمدمی　　در کنج غم بنالہ و افغان نشستہ ام
رہ در حریم وصل تو ما را نمی دہند　　محروم از ان بگوشہ ہجران نشستہ ام
با درد آرمیدہ بغم دل نہادہ ایم　　خو با فراق کردہ بحرمان نشستہ ام
ترخان ببزم شاہ گدا را چو نیست راہ　　زان بینوا بکلبۂ احزان نشستہ ام (ورق ۸۹)

قاطعی نے ایک دفعہ ایک قصیدہ خان موصوف کی خدمت میں ارسال کیا جسے سن کر حاضرین عش عش کر اُٹھے۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ قصیدے کی ترسیل سے میرا مطلب اپنے آپ کو شاعر ثابت کرنا نہیں بلکہ شاعری کا صحیح اسلوب اور تازہ و بکر مضامین کی طرف توجہ دلانا تھا۔ ترخان بھی قصیدہ سن کر خوش ہوئے اور بقول قاطعی:

نہ نقرہ پارچۂ اعلیٰ از سفید و نی با گرہ صلہ فرستاد (ورق ۸۹ ب)

ملا صبری: محمد قاسم کوہ بر المتخلص بہ صبری، ہمایوں کے مہرسانہ تھے، آپ کا تعلق اُلُس چغتہ کے ایک انتہائی ممتاز قبیلے سے تھا۔ ہمایوں جب کابل سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو قاسم کوہ بر بھی اس کے ہمرکاب تھے[1]۔ بعد میں جب سرہند کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا تو بڑی بے جگری سے لڑے اور دل کھول کر داد شجاعت دی[2]۔ موسیقی میں آپ کو عجیب ملکہ حاصل تھا۔ ابو الفضل نے آپ کو دور اکبری کے سر شناس موسیقاروں میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ نے ایک ساز بھی اختراع کیا تھا۔ ابو الفضل[3] کے الفاظ یہ ہیں:

میان قبزہ و رباب سازی اختراع کردہ۔

قاطعی کا بیان ہے کہ آپ فن موسیقی کو نہ صرف یہ کہ بہت اچھی طرح جانتے تھے آپ نے اس فن میں کتابیں بھی تالیف کی تھیں۔

علم موسیقی را خوب می دانست و دوازدہ مقام و بیست و چہار شعبہ و شش آویزہ بعمل می آورد و درین علم تصنیفات دارد (ورق ۸۲ ب)

ایک زمانے میں ملا قاطعی، ملا طاہر علوی اور ملا قاسم خان کوہ بر تینوں بہادر خان[4] کی سرکار سے وابستہ تھے۔ یہ لوگ خان نواب کے اس قدر قریب تھے کہ بقول قاطعی:

بہ بہادر خان بسیار مربوط می بودیم و ما کہ کس جز و لاینفک بودیم (ورق ۸۲ ب)

---

[1] تذکرۂ ہمایوں و اکبر ص ۱۷۰　[2] تذکرۂ ہمایوں و اکبر ص ۱۹۳ ۔　[3] آئین اکبری ص ۱۸۳ ۔

[4] حالات کے لئے دیکھئے: طبقات اکبری (ترجمہ انگریزی) جلد دوم ص ۶۵۱، ذخیرۃ الخوانین جلد اول ص ۲۶-۳۱ ۔

اگر بہادر خان گھر پہ نہ ہوتا تو اُس کے ملاقاتی جن میں بڑے بڑے امرا بھی شامل ہوتے ملا قاسم خان کے مکان پر ہی جمع ہو جاتے۔ ایک رات بہادر خان استراحت کر رہا تھا اور اس کا دربار بھی بند تھا۔ دربار کے راستے میں کچھ دکانیں تھیں۔ قاطعی اور ملا قاسم اپنے احباب سمیت ایک فقاعی کی دکان پر بیٹھے تھے کہ دوستوں کی فرمائش پر قاسم خان کو ساز ہاتھ میں لینا پڑا۔ آپ نے نغمہ چھیڑا اور بقولِ قاطعی "از نغمہ جان می ستاند و جان می داد"۔ اتنے میں حافظ برہان نے بھی تان چھیڑ دی۔ ابھی چند شعر ہی پڑھے تھے کہ حاضرین عش عش کر اُٹھے۔ اِن "عشاقِ بے نوا" کی آہ آہ اور واہ واہ کی آواز جب خان کے کانوں تک پہنچی تو بے اختیار کوٹھے پر چڑھ دوڑا اور سب کو پکارنا شروع کیا — ہَی حافظ برہان! ہَی محمد قاسم! ہَی ملا قاطعی! لوگوں کا ایسا ہجوم تھا اور شور کا یہ عالم کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ خان نے نیچے آکر دروازہ کھلوایا اور سب کو بلا بھیجا۔ مجلس اب اس کے ہاں گرم ہوئی۔ چاندنی رات تھی۔ دلکشا موسم تھا۔ مکان بڑا خوبصورت تھا اور درمیان میں نہر بہہ رہی تھی۔ خان نے پوچھا، چہ خوردہ اید و چہ میل دارید؟ قاطعی نے بتایا کہ محمد حسین تحویلدار شراب کی صراحی لایا تھا لیکن ہم لوگوں نے پی نہیں۔ اتنے میں محمد حسین تحویلدار نے دسترخوان بچھا کر اس پر نبات کا ایک بڑا طبق لا کر رکھا اور طرح طرح کے نقلات اور ہر قسم کی گزیں لا کر خوان پر سجا دیں۔ مشروبات کی صراحیاں الگ دھری تھیں۔ خان جب شراب کا ایک پیالہ نوش کر چکا تو طبیعت میں سرخوشی سی آگئی۔ نبات کی ایک ڈلی ہاتھ میں لی اور اُسے ہوا میں اچھالنے لگا۔ حاضرین میں سے ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ یہ ڈلی اُسے ہی ملے گی۔ خان نے ڈلی کو جب دوبارہ اچھالا تو محمد قاسم نے ہاتھ دراز کر کے اُسے دبوچنے کی کوشش کی۔ قاطعی نے چستی سے کام لیا اور ڈلی کو ہوا ہی سے اچک لے گیا۔ حاضرین اُس کی اس چابک دستی پر اُسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکے اور بہادر خان بھی بیحد محظوظ ہوا۔[1]

ملا تردی رودہ : ماوراء النہر کے رہنے والے تھے۔ علم و فضل اور شاعری میں آپ کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ اکبر کے زمانے میں کچھ عرصہ تک گجرات اور دکن میں رہنے کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک قصیدہ ادھم خان[2] کی خدمت میں پیش کیا۔ خان نے صلے کی کمیت و کیفیت کا فیصلہ آپ پر ہی چھوڑ دیا۔ آپ نے ایک لاکھ ٹنکہ طلب کیا جو فی الفور پیش کر دیا گیا۔ اِس کے بعد ادھم خان نے جب یہ کہا کہ ملا تم نے پست ہمتی سے کام لیا ورنہ میں ایک کروڑ ٹنکہ بھی دینے پر تیار تھا تو ملا کو سخت صدمہ ہوا۔[3] ملا تردی صاحب دیوان شاعر تھے۔ اِس کے علاوہ آپ نے مختلف فنون پر کئی کتابیں بھی تالیف کیں۔

قاطعی کی آپ کے ساتھ ملاقات بہادر خان کی مجلس میں ہوئی۔ دونوں خان موصوف کی مجلس میں حاضر تھے کہ ملا نیازی کا "معماءِ دقیق" پڑھا گیا۔ ملا تردی معما کی لطافت کی داد نہ دے سکے اور الٹا دخلِ بے جا کر بیٹھے۔ قاطعی کی جوانی کے دن تھے۔ استاد کے کلام پر یہ انگشت نمائی اُس سے برداشت نہ ہو سکی اور اُس نے ملا کو 'کودن' کہہ دیا۔ بات تلخ کلامی تک پہنچ گئی لیکن حاضرین کی بروقت مداخلت سے صورتِ حال

---

[1] مجمع الشعرا ورق ۸۳۔

[2] صبح گلشن ص ۸۴۔

[3] ذخیرۃ الخوانین جلد اول ص ۱۲۴۔ ۱۲۶۔

بگڑنے سے بچ گئی۔ بہادر خان سارا ماجرا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ ملا قاطعی ملا نیازی کا ہونہار شاگرد ہے اور معما وغیرہ اِس کی شان کے منافی ہیں۔ بہادر خان کے الفاظ یہ ہیں۔

ہی ، ملا قاطعی شاگرد خوب ملا نیازیست و معما دون مرتبۂ ملا قاطعیست (ورق ۵۰)

قاطعی نے ملا عبدالرحمٰن جامی کا قول نقل کیا کہ معما کاہدان میں گری ہوئی سوئی کی مانند ہے۔ تلاش بسیار کے بعد اگر مل بھی جائے گی تو اس کی حیثیت سوئی سے زیادہ نہ ہوگی۔ اِس کے بعد اس نے مولانا زین الدین محمود القواس ابہدائی کا بھی ایک قول نقل کیا۔ مولانا کے بقول علم معما سور کے اُس شکار کی طرح ہے جس میں گھوڑا اسقط کر جائے۔ تیر ٹوٹ جائیں اور کمان ناکارہ ہو جائے۔ اِن سب باتوں کے باوجود اگر سور مارا بھی جائے تو کسی کام کا نہیں۔ اِس کے بعد قاطعی نے اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ علم اگر کوئی ہے تو تفسیر و حدیث کا ہے باقی جملہ علوم ہیچ ہیں۔ یہ باتیں سن کر ملا تردی نے قاطعی کو سینے سے لگا لیا اور کہا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا سب بجا ہے میں اپنے کئے پر معذرت خواہ ہوں[1]

ملا قاسم خبیثہ : ملا قاسم کاہی کے شاگردِ ان رشید میں سے تھے۔ مختلف علوم میں عالم متبحر تھے۔ خاص طور پر علم ہیئت میں آپ کا جواب نہیں تھا۔ آپ کی ذات جامع جمیع صفات تھی لیکن اس کے باوصف آپ اپنے آپ کو ہمیشہ خبیثہ لکھتے تھے۔ قاطعی کا بیان ہے۔

بوی خوشش از نسیم خلق ایشان پیدا و انوار خوبی بر چہرۂ ایشان ہویداست (ورق ۴۰ ب ۱۲۵)

تصنیف سازی۔ موسیقی۔ ساز آواز اور نکتہ رسی و نکتہ دانی میں فردِ فرید تھے۔ دوازدہ مقام اور شش آوازہ کو نہ صرف علمی حیثیت سے اچھی طرح سمجھتے تھے بلکہ عملاً بھی ان میں صاحبِ کمال تھے اور بقول قاطعی :

بضرب و نطق ید بیضا می نماید (ورق ۴۱ ۔ ۱۲۵ ب)

ہجویہ گوئی کے بڑے دلدادہ تھے اور اِس صنف میں قاطعی آپ کی پیروی کرتا تھا۔ قاطعی نے تو آپ کا درج ذیل قطعہ نقل کیا ہے :

دوشم آمد این ندا از قاسم کاہی کہ گفت　　آنکہ ہم پیر است و ہم استادِ من در شاعری
پایۂ شعر است بالاتر ز ہفتم آسمان　　رتبہ عالیست اہلِ شعر را چون بنگری
گر نبودی وحی منزل شعر ہم در طورِ خود　　نسبتِ شاعر چرا کردند با پیغمبری
سالہا باید کہ طفلی را ز ابنای زمان　　پرورد در مہدِ معنی دور چرخ چنبری
مادرِ ایام ہم عمری ز پستانہای طبع　　بر لبانِ او لبن ریزد ز مہرِ مادری
تا شود ناطق بسانِ سعدی و ملای روم　　ہمچو فردوسی شود در شعر، یا چون انوری
فرض کردم فی المثل چون این بزرگانِ سخن　　معنی رنگین و لفظ خوش ادا می آوری
مر کلامِ خویش را باید نباشی معتقد　　معجزِ عیسی اگر داری و سحرِ سامری

---

[1] مجمع الشعراء ص ۵۰ ب۔

تا قبض این قطعہ را از شخص شاعر طبع پرس   قدرِ زر زرگر شناسد قدرِ جوہر جوہری

س کے جواب میں قاطعی نے بھی ایک قطعہ کہا جو درج ذیل ہے :-

بشنو ای یارِ عزیزِ من اگر یارِ منی   آورد بابائی فطرت چو نیکو بنگری
گر رسد فیضِ الٰہی در سخن من ہم کنم   یا کند پیرم یا طبع عذرا یاوری
مدحِ خاقانی شود آگاہ در ملکِ سخن   گر رسانم یک سخن در گوشِ روحِ انوری
گر کنم تعریف شعرِ خود نباشد ہیچ عیب   زانکہ من بنمودہ ام در شعر سحرِ سامری
ہیچ کس از حالتِ شاعر نگفتہ شمۂ   نظم فخریہ از آن گفتند اندر شاعری
کی بیایہ جامعِ دیگر بمثلِ من بدہر   گر بگردد پیرِ گردون زیرِ چرخِ چنبری
بستہ بودم اسب را ہواری گرو اندر سخن   گر ز خاطر رفتہ باشد مولوی! یاد آوری
گر زنندش بر محک خالص بود این زرِ ناب   شعرِ من رایج بشہر آمد چو زرِ جعفری
قاطعی بر نظم دُرّت را بہ پیشِ دُر شناس   قدرِ زر زرگر شناسد قدرِ جوہر جوہری   (ورق ۴۱م ۱۲۶۰)

ملا طرزی : ملا علی احمد[1] کے قرابت داروں میں سے تھے۔ مختلف علوم میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ شعر گوئی میں آپ کی منفرد روش تھی۔ ملا قاطعی کے ساتھ آپ کے جو مخلصانہ روابط تھے ان کا اندازہ قاطعی کی مدح میں آپ کے درج ذیل قصیدے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے :

قصیدہ فی مدح فضیلت مآب واقعی مولانا قاطعی

خدیوِ چرخ چو در قوس کرد نصب لوا   گرفت روی زمین فوج لشکرِ سرما
ہواست بہان حدو مرتبہ کہ زبان   نمی شود بدہن از فسردگی گویا
اگر ز ابر شود قطرۂ جدا اکنون   شود میانِ ہوا ہمچو لولوی لالا
مگوی برف کہ از آسمان ہمی بارد   کز آسمان شدہ نازل زبہرِ خلق بلا
ز باد شعلۂ آتش نمی کند حرکت   کہ لرزہ دارد ہمچون برہنہ سرتاپا
سپہر برہنہ اندام گرنہ سرما خورد   بدین صفت تنِ او نیلگون شدست چرا
زبسکہ آئینہ چرخ تیرہ شد زنفس   سزد اگر نکند شکل مردمان پیدا

---

[1] طبقات اکبری (ترجمہ انگریزی) جلد ۲، ص ۴۰۷۔ منتخب التواریخ جلد سوم ص ۲۴۹-۲۶۰۔ محمد ہادی، مرزا (مرتب) توزک جہانگیری (لکھنؤ) ص ۱۱۱، ۱۸۲ نیز دیکھیے

JAHANGIR, THE TUZUK--i-JAHANGIRI OR MEMOIRS OF JAHANGIR, ALEXANDER-ROGRS (TR.), HENRY BEVERIDGE (ED.), (2 VOLS., DELHI, 1968), SEC EDN., VOL. I, PP, 159, 169, 228.

سخن ز نوکِ زبان تا بگوشش نتواند   رسید ز آنکه شود بسته در ره از سرما
پناهِ خویش ز سرما ندید چون جائی   برفت و کرد سمندر درونِ آتش جا
ولیک از همه این طرفه‌تر که آتش نیز   ز ترسِ دی شده پنهان در آهن و خارا
رسیده روز کنون در کمالِ کوتاهی   چو روزِ عمرِ عدوی امیرِ خضر لقا
محیطِ فضل و هنر میر تالمی که بفضل   درین زمانه بود بی نظیر و بی همتا
لطیف طبع و هنرپرور و فاضل دوست   سخن شناس و حقیقت پژوه و نکته سرا
طبیعتش چمنی پر شقایقِ مضمون   دلش محیط صفت پر ز دُرِّ بیش بها
رسیده است بصد سال عمرِ او لیکن   بعقل و فهم و خرد همچو مردمِ برنا
خدا عنایت و لطفی که کرده در حقِ او   درین زمانه نکرده بهیچ شخص عطا
بآستانهٔ او بُرده فاضلان سجده   که هست درگهِ عالیش مرجعِ شعرا
زهی بلطف و کرم بینظیر و بی مانند   زهی بجود و سخا بی مثال و بی همتا
سپهرِ پیر ز پیری در آمدی ز پای   اگر بدست نکردی ز خامهٔ تو عصا
درین زمانه اگر زنده میشود حاتم   بگیرد از دل و طبعِ تو رسمِ جود و سخا
اگر ز رشکِ وقارِ تو می نگرید کوه   چگونه چشمه روان شد ز دیدهٔ خارا
چنانکه نور ز خورشید و نکهت از عنبر   نباشد از دلِ تو علم و فضل و جود جدا
ادب ز خوی تو زیبا چنانکه تن از جان   هنر بطبعِ تو نازد چو دوستی بوفا
عبارتِ تو چو آبِ حیات جان بخشد   دلِ تو کرده معانیِ مرده را احیا
چنان نه جود و سخای تو زر پریشان شد   که هر دو حرفِ زر از یکدگر بماند جدا
هنر ز ذاتِ شریفِ تو یافت عز و شرف   خرد ز طبعِ لطیفت گرفت قدر و بها
اگر ز چشمهٔ لطفِ تو پرورشش یابد   ز بارِ حنظل یابند لذتِ خرما
در آن زمان که کند یادِ لطفِ تو افعی   بجای زهر دهانش شود پر آبِ بقا
محیط مدح[1] و ثنایت عمیق دریائیست   که فکر از و نتواند برون شدن بشنا
سخن شناسا خواهم ز روی گستاخی   ز حالِ خویش کنم عرضه گر اصغا
مرا ز خوانِ جهان شد حوالهٔ لقمهٔ غم   مرا ز شیشهٔ گردون نصیب درد و بلا

---

[1] فی الاصل: محیط و مدح -

بزیرِ پہلوی من خار بسترِ سنجاب   زخشت زیرِ سرم بالشی است از دیبا
زمانہ را ہنری نیست غیرِ جور و ستم   سپہر را عملی نیست غیرِ ظلم و جفا
امید ہست کہ یابم خلاصی از غمِ دہر   چو جا گرفتہ ام اندر پناہِ لطفِ شما
سخن طویل شد اکنون دعا کندن طرزی   کہ نیست از پیِ ختمِ کلام بہ ز دعا
ہمیشہ تا کہ زند سر ز فیض لا ریبی   قصیدہ و غزل تر ز خاطرِ شعرا
دلِ تو مخزنِ اسرار باد تا دمِ صور   رخِ تو باد منور بنورِ لطفِ خدا   (ورق ۵۵ ب)

غزل

بالای بام چون قدِ آن حور شد بلند   گفتم کہ شعلۂ ز سرِ طور شد بلند
آن شہسوار میرسد اینک نگہ کنید   گرد و غبارِ راہ کہ از دور شد بلند
بالای سدرہ بال و پرِ جبرئیل سوخت   زین آتشی کہ از دلِ محرور شد بلند
گر قدر و جاہ خود طلبی عشق باز شو   کز عشق قدر و پایۂ منصور شد بلند
انجام کار جای تو باشد بزیرِ خاک   گر قدرِ تو چو رتبۂ فغفور شد بلند
سیلابِ خون ز دیدۂ قدوسیان گشاد   دی شب کہ نالۂ منِ رنجور شد بلند
آمد بہار رو بتفرج بلالہ زار   بنگر کہ ہر طرف علمِ نور شد بلند
ناصح خموش کین دلِ ما را اثر نکرد   حرفی کہ از زبانِ تو مذکور شد بلند
طرزی برآر پنبۂ غفلت ز گوشِ ہوش   ہشیار شو کہ غلغلۂ صور شد بلند   (ورق ۵۷)

قاطعی بحیثیت شاعر

قاطعی کے حالاتِ زندگی طرح، اُس کے کلام کے بارے میں بھی ہماری معلومات اُس کے اپنے تذکرے پر ہی مبنی ہیں۔ اُس نے طبعِ موزوں پائی تھی، شاعری کے ہنر سے آگاہ تھا، موسیقی اور راگ رنگ کا رسیا تھا، علمی محافل میں باقاعدگی سے شریک ہوتا، ادبی موضوعات پر بحث و گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا، دوسروں کا کلام سنتا اور تفننِ طبع کے طور پر خود بھی شعر کہتا۔۔ یہی نہیں بلکہ اگر طبیعت آجاتی تو کسی امیر و وزیر حتیٰ کہ بادشاہ کی مدح میں بھی مدحیہ غزل یا قصیدہ کہہ لیتا — لیکن ان سب باتوں کے باوجود اُس نے عام شعرا کی طرح، شعر گوئی کو ذریعہ معاش کبھی نہیں بنایا۔ وہ "تذہیب و جلدسازی و رنگ آمیزی" میں یگانۂ وقت تھا، اور یہی فنون اُس کی گزر اوقات کا ذریعہ تھے۔ ایک دفعہ اُس نے اپنے کمالِ فن کے بارے میں ایک غزل لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ غزل سن کر بہت خوش ہوا اور انعام کے طور پر اُسے "زروافر" عطا کیا۔ غزل یہ ہے:

از خامہ بین کہ معجزِ عیسیٰ نمودہ ام   وز پنجۂ ہنر یدِ بیضا نمودہ ام
ہرگہ کہ کردہ ام رقمِ معنیٔ متین   از لفظِ مردہ معجزِ عیسیٰ نمودہ ام
ہرگہ توجہی بدلِ زندہ کردہ ام   ہر حرفِ شعر را دمِ احیا نمودہ ام

غواص وار رفته بدریای دل فرو از نظم چون گهر دریکیت نموده ام
از غلبندی سخن دلفریب خویش از شاخ هر شگوفه ثریا نموده ام
دل داده ام بزلف و خریدم بلای جان با زلف مشکبار تو سودا نموده ام
هر گه خیال خال تو کردم بشام هجر از دل بسان لاله سویدا نموده ام
شاه جهان و عادل غازی که سده اش من قبله گاه این دل شیدا نموده ام
هر گه سگت بسوی من آید ز مردمی بر چشم در فشان خودش جا نموده ام
چون من غلام و مخلص میراثی توام اخلاص و بندگی بتو شاها نموده ام
من درمیانه نیستم ای قاطعی بدان از صانع کریم تمنا نموده ام (ورق ۱۲۲)

قاطعی لکھتا ہے:

چون این غزل بسمع شاه دقیق طبع نکته سنج رسید، هر بیت را تعریف می فرمودند و این بیت را دو مرتبه تکرار فرمودند و گفتند که خوب گفته ای۔

دل داده ام بزلف و خریدم بلای جان
با زلف مشکبار تو سودا نموده ام (ورق ۱۲۲)

"قاطعی نے جہانگیر کی مدح میں مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی میں، اپنے مندرجہ ذیل تین قصیدے نقل کئے ہیں۔

قصیده

در مدح حضرت شاه نورالدین جهانگیر

ای طبع تو تو امان معنی وی خامهٔ تو زبان معنی
ای رای تو آسمان افلاک وی خاطر تو جهان معنی
گشته است قلم بمدحت شاه گویا بسخن لسان معنی
یا به همگی ادای غرا در حسن کلام آن معنی
گر می طلبی تو معنی خاص در ذهن تو هست جان معنی
گوی تو سخن زبان چو چوگان میدان تو بوستان معنی
هر حرف تو چون دریست در گوش داری تو بهوشش کان معنی
از نکهت طبع روح بخشت جان یافته استخوان معنی
از دانش و از علوم حکمت گشته است دلت مکان معنی
تا لفظ لطیف تو در آورد تازه شده هم روان معنی

طبعِ تو بزیرکی بصد رنگ   میکرد روان بیانِ معنی
مرغِ دلِ من بلطف که زلفش   جا کرده در آشیانِ معنی
تا کرده مداد جا بخامه   پر شهد شده دهانِ معنی
فهمیدنِ این نکاتِ موزون   ختمست بر آستانِ معنی
دعوی نرسد بشاعرِ خام   پر زور بود کمانِ معنی
امروز بمدحِ شاه در هند   مائیم بر آستانِ معنی
در مدحِ شهِ بلند همت   تا سر شده هم زبانِ معنی
از بهرِ دعا قبول کردند   این شعرِ مرا شهانِ معنی
عمرِ تو زیاد تا که باشد   این گردشِ آسمانِ معنی
شد ابلق نظم قاطعی رام   میدار بکف عنانِ معنی   (ورق ۱۲۲ ب)

قصیدهٔ دیگر

در مدح حضرت شاه نورالدین محمد جهانگیر عادل غازی

ای ذاتِ تو توامانِ دانش   از فطرتِ تست شانِ دانش
ای عقل مرو بجای دیگر   سر نه تو بر آستانِ دانش
شاهنشهِ با ادب جهانگیر   از عقل کند بیانِ دانش
بنوشته بآب زر نامش   منشی ازل نشانِ دانش
در مدحتِ ذات و فهم عالیش   لال است مرا زبانِ دانش
طوطی خیال سوی مدیحش   رفتست در آشیانِ دانش
در وقتِ تکلمش شگفته   چو غنچهٔ تر دهانِ دانش
آن نیست بدانش سخن آن   در طبعِ تو هست آنِ دانش
هرگاه ببزم نکته گیرد   بندد همه را لبانِ دانش
در فکرِ نکات می نگرده   اندیشهٔ تو زیانِ دانش
از تیغِ زبان مسخرت شد   اقلیمِ سخن جهانِ دانش
در مدح نوشتن وصفاتش[1]   گشتست قلم لسانِ دانش

---

[1] فی الاصل: خطاتش ـ

فیاض که فیض در رویش ریخت   از لوح وز آسمانِ دانش
آمد همه به نشانهٔ فکر   تیرِ سخن از کمانِ دانش
خوش طایفهٔ لطیف طبع اند   در ملکِ سخن شهانِ دانش
پایند همه بقای جاوید   یارب همه سروران دانش
کوی تو ز غیرتست کعبه   درگاهِ تو آستانِ دانش
فیضِ تو رسد به بے نوایان   ای بحرِ سخا و کانِ دانش
از فضل بگوی قاطعی هیچ   داری تو بجود گمانِ دانش
بحریست علوم بی نهایت   پیدا نبود کرانِ دانش
این نظم که هست چون گلستان   نامش شده بوستانِ دانش
ذاتِ تو همیشه باد محفوظ!
قایم بتو باد جانِ دانش!   (ورق ۱۲۳ ب)

قصیدهٔ دیگر

در مدح حضرت جهانگیر عادل غازی

ای آنکه آمدی بخرد شهریارِ عقل   این رتبه داده است بتو کردگارِ عقل
هر جا سمندِ فکر دوانی پی سخن   پس مانده است پیشِ تو گویا سوارِ عقل
عقل است آفرینشِ اول بآدمی   بر طبعِ استوارِ تو آمد مدارِ عقل
هرگه بنطق لب بگشائی شود روان   دُرهای تازه سخنت گوشوارِ عقل
تا رای عالی تو بنای خرد نهاد   پُرخون غیرتست ز دیده کنارِ عقل
فهمت که هست حصن گشای خرد بدهر   از تیغ رائی گردد مسخر دیارِ عقل
تا سوی فهم یک نظر انداختی بلطف   هم روزِ او نکو شده هم روزگارِ عقل
تا برفروختی گلِ رخسار در چمن   رنگش ز روی رفت و خزان شد بهارِ عقل
شوری فگندهٔ زکمالات در جهان   تاراج کردهٔ تو بود همه یارِ عقل
شاهِ یگانه شاهِ جهانگیرِ دو جهان   بود است دایما بسخن کامگارِ عقل
اهلِ خرد که فیض ربایند بر درت   گویا که دادهٔ تو بدر بار بارِ عقل
ای کانِ رائی و بحرِ خرد وای جهانِ علم   بی فکر و بی خیالِ تو خاست کارِ عقل
دادی بهوش آنچه ز امکان برون بود   در ذهنِ عالی تو بود اختیارِ عقل   (ورق ۱۲۴)

قاطعی شاعرانہ تعلی کا بادشاہ تھا۔ ایک دفعہ اُس نے سارنگی (غچک) کے بارے میں ایک غزل لکھی اور سب شعرا کو اُس کا جواب دعوت دی۔ مسابقہ میں شرکت کی شرط یہ تھی کہ اگر کوئی شاعر جواب میں اس کی جوڑ کی نظم لکھے گا تو قاطعی انعام کے طور پر اُسے ایک گھوڑا ہ اُس کی نظم اِس پائے کی ثابت نہ ہوئی، تو اُسے ایک گھوڑا تاوان کے طور پر قاطعی کو دینا پڑے گا!

غزل غچک کہ با شعرا اسب شرط نمودہ کہ ہر کہ برابر این بگوید اسب بگیرد و اگر نتواند
حسب الحکم حضرت پادشاہ اسب بدہد

"بود غچک چو کمان ابروی کہ عاشق زار　　کشیدہ در بغل و می نوازدش بکنار
غچک نگوی کہ شاخ گلیست نبات او　　کہ گشتہ ظاہر ازان شاخ ناخہای زار
نہ شاخ گل کہ بود عاشقی بنطق و بیان　　کہ میکند بزبان سر عشق اظہار
کمانچہ اش چو ہلال و کدو چو بدرِ منیر　　زنار مہر بستہ است زہرو سہ تار
طبیبِ عشق چو بر نبضِ او نہد انگشت　　ز دردِ عشق برآرد ہزار نالۂ زار
ز غچکش تو ای قاطعی چہ وصف کنم　　ز نالہای حزینش دلم بود افگار"
بستم گرو بگفتنِ این شعر چو گہر　　بر شاعران دہر ہر یکی اسب اہوار
امّا بشرطِ آنکہ با نصاف اہلِ نظم　　در گوش بکرِ فکر بسازند گوشوار
انصاف را ممیزہ سازند و آورند　　تشبیہِ خوب و لفظ چو در معنی آبدار
من ہم ز روی صدق شوم خاکسارِ شان　　صد آفرین بگویم و تحسین بے شمار
ور ناکہ دور رفتہ ز انصاف و از حیا　　گیرم بحکم شاہ یکے اسب کامدار
حقا کہ این لالی سیراب بی بہا　　وارد شدہ است بر منِ خاکی خاکسار
ورنہ کجاست قاطعی و لاف این گزاف　　وارد ز کذب گوئی خود روی شرمسار　　(ورق ۱۲۶ اب)

ع الشعرائے جہانگیر شاہی کی تالیف کے وقت تک اِس غزل کو لکھے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا لیکن اِس کے باوجود کوئی شاعر اس کا اب نہ لکھ سکا اور نہ شرط جیتی۔ قاطعی لکھتا ہے:

مدتیست کہ این غزل گفتہ شدہ اما از شعرا تا غایت کسی جواب گفتہ و این شرط نبردہ　　(ورق ۱۲۶ اب)

جیسا کہ متذکرہ بالا غزل سے ظاہر ہے قاطعی کے کلام میں تشبیہات بکر اور نوادرِ فکر کے علاوہ ایک اور چیز جو جاذبِ توجہ ہے وہ ہے اُس کی اپنے ماحول کی عکاسی وہ صرف اکابرین کی مدح کے گیت ہی نہیں گاتا اور گنگناتا، بلکہ اُن کی زندگی کی دوسری اشیا رعی طبع آزمائی کے لئے انتخاب کرتا ہے۔ اُس کا واقعیت سے سروکار اور ماحول سے یہ دلچسپی۔ اُس کے کلام کو قاری کے لئے اور بھی چسپ بنا دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

قطعہ

در تعریف صراحی حضرت نور الدین محمد جہانگیر پادشاہ عادل غازی

آن شاہ جہانگیر بفرمود صراحی   کردند مرصع ہمہ با لعل بدخشان
ہر گوہر یکدانۂ او دُرّ یتیم است   ہر دُرِّ گرانمایہ خراجیست زعمان
فیروزہ او رنگ فزودہ بزمرد   یاقوت درو آمدہ چون کوکب رخشان
مستند و فرح جوی حریفان طربناک   زان بادہ کہ خوردند بدلہا ہمہ نستان
در بزم جہانگیر کہ تا نیش نباشد   چشم مہ و مہر است درو خیرہ و حیران
لب بر لب ساغر چو نہد گاہ صراحی   یادم دہد از خضر و لب چشمۂ حیوان
آن شاہ جہانگیر بہنگام پیالہ   رخسارہ برافروختہ سازد چو گلستان   (ورق ۱۲۷)

تاریخ صراحی

صراحی بفرمود و ساغر بعشرت   چو بنشست شاہ جہانگیر کال[لہ]
جواہر در و درج از ہر طرف شد   ز لعلی کہ از معدنش گشت حاصل
بپای یقین سال تاریخ آن شد   صراحی شاہ جہانگیر عادل   (۱۰۰۹)   (ورق ۱۲۷ ب)

رباعی در تعریف قہوہ

قہوہ کہ پسند خاطر شاہانست   چون آب خضر بقہوہ دان پنہانست
شد مبلغ او ز دود ہمچون ظلمات   دیگش بمثال چشمۂ حیوانست   (ورق ۱۲۷ ب)

قطعہ در تعریف بیضہ

بیضہ فرمود شاہ ابو الغازی   حکم آن باعث سرافرازی
بیضہ ساختہ ز دقت طبع   قاطعی کردہ سحر پردازی   (ورق ۱۲۷ ب)

متذکرہ بالا کلام کے علاوہ قاطعی کے درج ذیل اشعار بھی تذکرے میں ملتے ہیں:۔

در مدح جہانگیر

جہانگیری محمد نام یعنی شاہ ابو الغازی   علم را ہم بنور دین او بودہ سرافرازی
ترا صاحب قران چون جد ممتازیست ز شاہان   ز شاہان جہان اندر نسب بسیار ممتازی
شوم ممتاز اندر شاعران و مردم فاضل   بیابم گر نظر از بندگان شاہ ابو الغازی
قلم را چون دہم جولان بگاہ فکر و معنی   بمدح او عجب در جست و خیزست ابلق تازی
سزد گر سر برافرازی برین گردون گردندہ   بمدح شاہ دین اگر ای قاطعی نازی   (ورق ۶)

[لہ] فی الاصل: کاول (تصویر ملاحظہ ہو: مقالہ ہذا ص (۱) ک)

مدگری سخن چو فروزندہ آتشم   بہرِ حسود بین کہ چہ سوزندہ اخگرم (ورق ۴۴)

ہمایونی و اکبری و جہانگیر شاہی   ترا قاطعی شد خطاب ز ظلِ الٰہی (ورق ۳)

بردہ سخن بکرسی ہشتم، بہم قرین   گر التفات شاہ بود یار و یاورم (ورق ۲۰)
آں یا کہ ندانی نسب و نسبت حالش   او را نبود ہیچ گواہی چو فعالش (ورق ۶ ب)

نادرۂ معمورۂ فضل و کمال   خلوتیِ انجمنِ اہلِ حال
من کہ و تقریرِ کمالاتِ او   عاجزم از شرحِ کمالاتِ او
لوح طلب کرد و قلم برگرفت   سلسلۂ لوح و قلم در گرفت
آنچہ ز نطقش درم تقریر یافت   این دو سہ شعریست کہ تحریر یافت (ورق ۷)

غزل

تا چترِ خسرو فلک از دور شد بلند   بہرِ نثار او طبق نور شد بلند
از یمنِ ہمتِ شہ اکبر جلال دین   این خانۂ مقرنس معمور شد بلند
ہر گہ بر اسپ او ہم خود شاہ شد سوار   گویا کہ ماہ در شبِ دیجور شد بلند
تا جلوہ کرد حسنِ خودش دید در نظر   مستی نمود مور و دمِ مور شد بلند
بہرِ نظارۂ رخِ آن ماہ چاردہ   بنشست آں پری و قدِ حور شد بلند (ورق ۵ ب)

ولہ ایضاً

امشب ز پرتوِ رخِ او نور شد بلند   یا نور موسوی ز سرِ طور شد بلند
شاید بگوشِ خسروِ عادل فغان رسد   فریاد و دادِ این دلِ رنجور شد بلند
تا جرعۂ ز بزمِ محبت باو رسید   آوازۂ انا الحق منصور شد بلند
ای قاطعی ز ہجرِ قد سرو نازِ او   افغان و نالۂ دلِ مہجور شد بلند (ورق ۵ ب)

قاطعی نے قصۂ حمزہ کو بھی نظم کیا تھا جو مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی کے پہلے دو دفاتر کی طرح اب مفقود الاثر ہے۔ خواجہ میر کلنگ کے حالات کے ضمن میں لکھتا ہے:

> میر از خوشنویسانِ وقت بودند و از شاگردانِ رشید میر علی اند۔ ایشان و خواجہ محمود اسحق و میر در ہند بخدمت شاہ اکبر آمدہ مشرف شدند، و از جملہ کتاب کتاب خانہ بودند۔ ایشان و میر دوری و حافظ محمد امین شاگرد میر سید احمد باجینہ

خوشنویس بی بدل۔ قطعہ حزوہ کہ مصنف ساختہ و پرداختہ و مجلد کردہ، درآنجا خوشنویسی عینمودند۔۔۔۔ (ورق ۴۷)

وفات قاطعی نے بڑی طویل عمر پائی۔ تقی الدین اوحدی[1] جو اُس کے معاصرین میں سے تھا ——— اور آگرے میں اس سے ملتا رہتا تھا ——— لکھتا ہے کہ قاطعی ایک سو تین برس کا ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا ڈیل ڈول اچھا تھا اور وہ فراغ بال کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ جہانگیر کی ملازمت میں تھا اور اس سے قبل اُس کے باپ دادا کی خدمت میں بھی رہ چکا تھا آخری وقت تک آگرے میں رہا۔ اور ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) کے اوائل میں وہیں فوت ہوا۔

مآخذ

آتشکدۂ آذر تالیف لطف علی بیگ بن آقا خان بیگ دلی شاملو متخلص بہ آذر با تصحیح و تحشیہ و تعلیق حسن سادات ناصری (سہ بخش، تہران، ۱۳۳۶-۱۳۴۰ شمسی)

آثار الصنادید تصنیف سر سید احمد خان بہادر، ترتیب و تدوین خالد نصیر ہاشمی (دہلی، ۱۹۶۵ء)

آئینِ اکبری تصنیف ابو الفضل علامی (سہ جلد، نولکشور، ۱۸۹۳ء)

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار تصنیف شاہ عبد الحق محدث دہلوی بتصحیح و اہتمام مولوی محمد عبد الاحد (دہلی، مطبع مجتبائی)

تاریخ ادبیات فارسی اثر ہرمان اتہ، ترجمۂ فارسی از رضا زادہ شفق (تہران - ۱۳۳۷ شمسی)

تاریخِ اکبری معروف بہ تاریخِ قندہاری تالیف محمد عارف قندہاری بتصحیح و تحشیہ سید معین الدین ندوی و دکتور سید اظہر علی دہلوی و بنظر ثانی امتیاز علی عرشی (رامپور، ۱۹۶۲ء)

تاریخ تذکرہ ہای فارسی تالیف احمد گلچین معانی (۲ جلد، تہران، ۱۳۴۸-۱۳۵۰ شمسی)

تاریخ خانجہانی تصنیف خواجہ نعمت اللہ بتصحیح ایس- ایم- امام الدین (۲ جلد، ڈھاکہ، ۱۹۶۰ء)

تاریخِ روضۃ الصفا از محمد بن سید برہان الدین خاوند شاہ الشہیر بمیر خواند (۷ جلد، تہران، ۱۳۳۸-۱۳۳۹ شمسی)

تاریخِ سیستان بتصحیح ملک الشعرا بہار (تہران، کتابخانہ زوار)

تاریخِ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی، تالیف سعید نفیسی (۲ جلد تہران - ۱۳۴۴ شمسی)

تذکرۂ ہمایون و اکبر از بایزید بیات باہتمام م ہدایت حسین (کلکتہ: ۱۹۴۱ء)

تزکِ جہانگیری مرتبہ مرزا محمد ہادی (لکھنؤ)

دیوانِ بیرم خان خان خاناں باہتمام دکتر محمد الحسن صدیقی، سید حسام الدین راشدی و دکتر محمد صابر (کراچی، ۱۹۷۱ء)۔

---

[1] عرفات العاشقین بنقل از تاریخ تذکرہ ہای فارسی، جلد دوم ص ۱۴۲-۱۴۳ ۔

ذخیرۃ الخوانین تصنیف شیخ فرید بھکری، بتصحیح ڈاکٹر سید معین الحق (۲ جلد، کراچی، ۱۹۶۱ء - ۱۹۷۰ء)

رشحات عین الحیات اثر فخر الدین علی بن حسین واعظ کاشفی (مخطوطہ، انڈیا آفس I.O. 507)

شعر العجم از مولینا شبلی نعمانی (۵ جلد، اعظم گڈھ)

صبح گلشن تصنیف سید علی حسن خان (بھوپال، ۱۲۹۵ھ)

طرائق الحقائق از محمد معصوم شیرازی معصوم علی شاہ با تصحیح محمد جعفر محجوب (۳ جلد، تہران، ۱۳۳۹ - ۱۳۴۵ شمسی)

عرفات العاشقین و عرصات العارفین تصنیف تقی الدین محمد اوحدی (خطی - بنقل از تاریخ تذکرہ ہای فارسی)

کتاب التعریفات للعلامۃ علی بن محمد الشریف الجرجانی (بیروت، ۱۹۶۹ء)

مآثر رحیمی تصنیف ملا عبدالباقی نہاوندی بتصحیح محمد ہدایت حسین (۳ جلد، کلکتہ، ۱۹۲۴ - ۱۹۳۱ء)

مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی (مخطوطہ در ذخیرہ مخطوطات اوزلی، کتاب خانۂ بوڈلین)

مقالات منتخبۂ مجلۂ دانشکدہ خاورشناسی مرتبہ وزیر الحسن عابدی (۲ جلد، لاہور، ۱۹۶۷ء)

مقصد اقبال السلطانیہ و مرصد الآمال خاقانیہ تصنیف سید اصیل الدین عبداللہ واعظ، بکوشش مایل ہروی (تہران، ۱۳۵۱ شمسی) ۔

منتخب التواریخ تصنیف عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی باہتمام مولوی احمد علی و دیگران (۳ جلد، کلکتہ، ۱۸۶۵ - ۱۸۶۸ء)

منتخب التواریخ تصنیف عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی مترجمہ محمود احمد فاروقی (لاہور، ۱۹۶۲ء)

واقعات دار الحکومت دہلی تصنیف بشیر الدین احمد (۳ حصہ، دہلی، ۱۹۱۹ء)

ہفت اقلیم اثر امین احمد رازی با تصحیح و تعلیق جواد فاضل (تہران، کتاب فروشی علی اکبر علمی)

BROWNE, E.G., *A LITERARY HISTORY OF PERSIA* (4 VOLS., C.U.P., 1959-1964).

GHANI, M.A., *A HISTORY OF PERSIAN LANGUAGE AND LITERATURE AT THE MUGHAL COURT* (3 PARTS, ALLAHABAD, 1929-1930).

JAHANGIR, *THE TUZUK-I-JAHANGIRI OR MEMOIRS OF JAHANGIR*, ALEXANDER ROGERS (TR.), HENRY BEVERIDGE (ED.), (2 VOL, DELHI, 1968), SECOND EDN, (FIRST PUBLISHED) 1909.

NIZAMUDDIN AHMAD, KHWAJAH, THE *TABAQAT-I-AKBARI*, B. DE. (TR.) (3 VOLS., CALCUTTA, 1927-1939).

RYPKA, JAN, *HISTORY OF IRANIAN LITERATURE*, KARL JAHN (ED.), (DORDRECHT-HOLLAND, 1968)

STEPHEN, SIR LESLIE AND SIR SIDN'EY LEE, *DICTIONARY OF NATIONAL BIOGRAPHY*. (C.U.P., 1963-1964) VOL, XIV

STOREY, C.A., *PERSIAN LITERTURE: A BIO-BIBLIOGRHICAL SURVEY*, (LONDON, 1950) VOL, I, PART II.

کلیاتِ انشا کے دو قدیم مخطوطے

اور انشا کا غیر مطبوعہ کلام

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

سید انشا اللہ خان نام انشا تخلص خلف فخر الدولہ سید ماشاء اللہ خان بہادر[1] جناب مالک رام صاحب کی دریافت کے مطابق انشا مرشد آباد، بنگال میں صفر سنہ ۱۱۶۶ھ مطابق ۵ سنہ جلوس احمد شاہ بادشاہ شب یکشنبہ کو پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں ۲ جمادی الثانی روز شنبہ سنہ ۱۲۳۲ ہجری کو انتقال کیا[2]۔ اور آنا باقر کے امام باڑہ میں دفن ہوئے[3]۔

کم و بیش سبھی پرانے تذکروں میں انشا کا ذکر پایا جاتا ہے لیکن۔ شیخ احمد علی ہاشمی سندیلوی نے ان کا ترجمہ تمام تذکرہ نویسوں کے مقابلے میں تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے[4]۔

انشا اردو کے مشہور، مستند اور زبردست قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کا شمار مسلم الثبوت اساتذہ میں ہوتا ہے۔ سولہ برس کے سن میں انہوں نے فیض آباد میں دیوان مرتب کیا تھا۔ صاحب مخزن الغرائب لکھتا ہے کہ

> "انشا در صغر سن کتب صرف و نحو و منطق و حکمت تا "صدرا" خوانده۔ چوں به شانزده سال رسید، بحضور نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ[5] داخل جلسا شده در آں وقت دیوان ہندی بطور خود و بطرز نوی بے استاد ردیف وار تمام نموده در بارهٔ از اشعار فارسی و عربی ہم بر اوراق ثبت داشت[6]۔"

راقم الحروف نے مصحفی کا تذکرۂ ہندی بخط مصنف ترتیب دیا ہے۔ یہ ابھی تک نہیں چھپا ہے۔ اس میں اور مطبوعہ نسخے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولف تذکرہ نے دلی کے ایک معرکہ آرا مشاعرہ کا چشم دید واقعہ پیش کیا ہے۔ یہ سنہ ۱۱۹۹ ہجری سے قبل ہوا تھا۔ اس میں قاسم، ہدایت، ہادی اور مرزا عظیم شاگرد سودا بھی موجود تھے۔ عظیم اپنے کو صائب ہند سمجھتے تھے۔ مشاعرہ میں انشا نے ان کی خوب خبر لی اور اس کا بڑا چرچا ہوا تھا چونکہ یہ واقعہ کسی تذکرہ نویس نے بیان نہیں کیا ہے اس لئے ذیل میں من و عن درج کیا جاتا ہے

---

[1] مخطوطہ مثنوی شیر برنج انشا زیر نمبر ۱۳۳، کتاب خانہ راجہ صاحب محمود آباد۔ (بخط مصنف سنہ ۱۲۰۵ھ)

[2] تحریر، دہلی شمارہ ۲ جلد ۷ ص ۴۳

[3] آب حیات ص ۲۶۹ محمد حسین آزاد۔

[4] مخزن الغرائب قلمی و غیر مطبوعہ مکتوبہ سنہ ۱۲۲۹ ہجری ص ۹۷ کتاب خانہ راجہ صاحب محمود آباد

[5] متوفی سنہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۵ء

[6] مخزن الغرائب ص ۹۷۔

"حسب اتفاق میر موصوف (انشاؔ) در مشاعرۂ شاہ جہان آباد غزل عربی کہ مطلعش این است

شربت شربا کاس نور من هوینا قد تجلی
اذا تلألأ سجدت ربی فضل سبحانہ تعالیٰ

و غزل ہندی بہ ردیف "ناز پانچوں[1] نیاز پانچوں" خواندہ، فروغ تمام یافت، شعرائے دہلی مثل میاں ثنا اللہ خان فراقؔ و میر قدرت اللہ قاسمؔ و ہدایت خان ہدایتؔ و میر محمد جواد ہادی و مرزا عظیم بیگ عظیمؔ کہ خود را صاحب ریختہ می شمردہ، حسد و کاوش بود۔ در مشاعرہ در جواب ایشان غزل عربی و خمسہ اں درست کردہ آوردند و در جواب غزل ہندی کہ "نیاز پانچوں" بود "نیاز ساتوں" قرار دادند۔ جاسوساں خبر رسانیدند کہ صورت حال این است۔ مشارٌ الیہ از بس ماجرا مطلع شدہ در جوابِ "ساتوں" غزل "آٹھوں[2]" کہ مطلعش این است ؎

سر چشم صبر دل دین تن مال جان آٹھوں
صدقے کئے تھے تم پہ اے مہربان آٹھوں

ہنگاشت و در جواب خمسہ غزل عربی بریں قطعہ اکتفا کرد ؎

حاسد سے میرے یہ کہو گو سو غزل عربی کہے خورشید سے کب ہمسری کی کرمکِ شب تاب نے
امواج قلزم کی بھلا کب ہو سکے ہے سلسلے کچھ جوش گر گاہے کیا، برسات کے تالاب نے
صادق بلا تشبیہہ ہے یہاں وہ مثل جس طرح سے الحاقہ پہ رشک کھا کر کہا مسیلم کذّاب نے
الفیل وما الفیل وما ادراک ما الفیل کہا
سنتے ہی جس کو ہنس دیا ہر ایک شیخ و شاب نے

بمجرد استماع این قطعہ مجلس برہم خوردہ بحدے چہ چہ در پیوستہ شد گویا شورِ قیامت برخاست[3]۔"

کلیات انشاؔ کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ وہ ہے جو مولوی محمد حسین آزادؔ کے اہتمام سے ۱۸۵۵ء مطابق رجب ۱۲۷۱ہجری میں ان کے والد مولوی محمد باقر کے مطبع دہلی اردو اخبار میں چھپا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ ہجری میں لکھنؤ میں مطبع نولکشور میں شائع ہوا۔ اسی مطبع میں ایک اور مرتبہ ۱۸۹۴ء مطابق ۱۳۱۲ ہجری میں چھپا۔ آخر میں مرزا محمد عسکری نے ۱۹۵۱ء میں "کلام انشاؔ" کے عنوان سے انشاؔ

---

[1] یہ غزل کلیات انشاؔ نسخہ محمود آباد مکتوبہ ۱۲۴۲ ہجری میں بھی درج ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

چشم و ادا و غمزہ، شوخی و ناز پانچوں دشمن ہیں میرے جی کے، بندہ نواز پانچوں

[2] یہ غزل بھی کلیات انشاؔ نسخۂ مذکورہ میں موجود ہے۔ مقطع یہ ہے ؎

رخ خال زلف خط لب دندان ذقن زنخداں اس گھر میں اپنے دشمن انشاؔ ہر آن آٹھوں

[3] تذکرۃ الشعراء معروف بہ تذکرۂ ہندی بخط مصنف۔

کا مجموعہ کلام از خود بڑی کاوش و محنت سے مختلف قلمی و مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا جسے بعد میں ہندوستانی اکادمی الہ آباد نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔

کلیات انشا کے چند مخطوطے رامپور، علی گڑھ، لکھنؤ، پٹنہ اور حیدر آباد کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں بھی ہے۔ جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے ان میں سے کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ ایسا نظر سے نہیں گزرا جو ہر لحاظ سے مکمل ہو اور جس میں انشا کا سارا کلام درج کیا گیا ہو۔

راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں کلیات انشا کے دو قدیم اور نادر الوجود مخطوطے بہت اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ دونوں نسخے اہم اور مکمل ہیں اہم اس لئے کہ ان میں انشا کا غیر مطبوعہ کلام بھی درج ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:۔

کلیات انشا (نسخۂ اوّل)

نمبر مخطوطہ ۴، سائز ۱۳" × ۹"، سطر ۱۷، خط نستعلیق، اوراق ۲۳۶ کلیات میں پہلے انشا کا فارسی کلام ہے۔ ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

اے عشق قطع کردہ رہِ سلسبیل را   از ما سلام شوق رساں جبرئیل را
پیوستہ آہوانِ حرم یاد می کنند   آں اولیں زمانِ بنائے خلیل را
در راہِ عشق ہم سفراں وجد می کنند   چوں بشنوند نعرۂ کوسِ رحیل را

کلیات میں فارسی غزلیں ورق ۲۰ ب تک ہیں۔ ورق ۲۱ الف سے ورق ۷۴ ب تک فارسی میں ایک مثنوی "شیر برنج" کے نام سے درج ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں یہ عبارت ہے۔

"آغاز مثنوی شیر برنج من تصنیف میر انشا اللہ خان"

مثنوی کا ابتدائی حصہ عربی میں ہے۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

بسکٔ المحمود یا رب الفلق   انت خلاق السحاب والشفق

یہ مثنوی ۱۲۰۵ہجری میں تصنیف کی گئی۔ مادۂ تاریخ "خروشِ موجِ یم" ہے
۵ ۰ ۱۲

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں ؎

تا بود در عالم از توحید گنج   ماند انشا اللہ ایں شیر و برنج
غرۂ شوال سال نغزہ بود   تا کہ آمد ایں کلام اندر شہود
ہمدریں وادی چو فکر من شتافت   "نغمۂ آہنگ دل" تاریخ یافت
سید انشا اللہ ام فرح شیم
گفت تاریخ "خروشِ موجِ یم"
۵ ۰ ۱۲

ورق ۷۴ ب سے ۸۷ الف تک قصائد ہیں۔ تفصیل یہ ہے ؎

پہلا قصیدہ حمد میں ہے۔ مطلع ؎

اے خداوندِ مہ و مہر و ثریا و شفق   لمعۂ نور سے ہے تیرے جہاں کو رونق

۲۔ قصیدہ در مدح حضرت امیر المومنین ؎

گرچہ افلاک کے سب پھونک دے اطباق آتش   منہ تو دیکھو کہ کرے آ مجھے اِحراق آتش

۳۔ قصیدہ در مدح منقبت حضرت امیر المومنین ؎

دارم آہے کہ بود جسد صفاتش آتش   مادرش برق و پدر شعلہ و دانش آتش

۴۔ قصیدہ بے نقط در مدح شاہ ولایت ؎

بلا مرِدحہ آہِ سرد کو ہر گام   کہ دل کو آگ لگا کر ہوا اٹھوا آرام

ورق ۵۳ ب پر "مطالع در صنعت بے نقط" کے تحت فارسی میں یہ عبارت درج ہے۔

بدین تاویل از نہانخانۂ فکر بعالم ظہور ثبت شد۔ یعنی ان شاء اللہ این کہ اگر بخواہد خدا و معنی گوارا واللہ این کہ ارادہ کند خدا ایش ہر دو را در معنی متحد داشتہ۔۔۔۔ ازیں جا صنائع دیگر کہ ہم داخل قصیدہ می تواند شد و ہم خارج از قصیدہ مقلوب کل لفظین۔

رواج اور یہ ہے دہ ہوا آشنا انشا   کہ ہو رہا ہو وہ آگاہِ رسم اہل کلام

باید دانست کہ مشکل ترین صنعتہا مقلوب مثنویست کہ امیر خسرو دراں گفت ع

شکر بترازوئے وزارت برکش

دریں شعر در مدح امام علیہ السلام در دو صنعت جمع شد، یکی ہماں مقلوب مثنوی و دویم ہمہ بے نقط الحمد اللہ علی ذلک۔

ہوا ارادۂ دل، رو، کرو ادھر رشد   کہ ہو معطل و معکوس کا سراسر کام
مراد روح وِرد او رُوح درد ارم   مآل کلِ امور سرو مآل کلام

ہر دو مصرع مقلوب مثنوی کہ صنعت متحمل اللغات کہ امیر خسرو دراں گفتہ اند۔ مشکہ چنیں بوہری باکی خوشبوئی کہ در عالم مشہور است۔ و نثر بود بفضل الٰہی بتصدیق ممدوح علیہ السلام تمام مصرع موزوں با معنی بہم رسید کہ در ہر سہ زبان یعنی فارسی و عربی و ہندوی معنی خیز است ؎

ولا دو مصرع کہہ کہ ملک کو کرے سامع   اور اس کا مصرع اول ہو مصدرہ سر کلام
پیا پیا جب من جالیا پیا کی باشش   پیا پیا جب من جالیا پیا کی باشش
بیا بیا جب من جالیا بیا کی باشش   کہ مدح سرور والا سرودہ ام سرعام

کلیات میں ایسی ہی فارسی کی کئی عبارتیں درج ہیں۔

ورق ۵۵ الف پر ایک قصیدہ بلا عنوان ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

نوعِ بشر تھے نہاں آتش و باد و آب و خاک   عشق نے کر دیئے عیاں آتش و باد و آب و خاک

اس کے بعد فارسی میں ایک قصیدہ الماس علی خان بہادر کی مدح میں ہے۔

ورق ۵۸ الف پر امام رضاؑ کی تعریف میں فارسی قصیدہ ہے ؎

بازوقت است کہ چوں کیکاؤس   انگر لالہ کند جشن جلوس

ورق ۶۰ ب۔ قصیدہ در مدح بادشاہ عالی گہر ؎

جشن ونشاط وخوشی دلی وعشرت ونعیم   عیش وخوشی میں چین سے خوش وقت ہو بہم

ورق ۶۳ الف۔ قصیدہ در فارسی بمدح سلیمان شکوہ۔

ورق ۶۴ الف۔ قصیدہ در مدح سلیمان شکوہ (فارسی)

ورق ۶۷ الف۔ قصیدہ فی المدح سالگرہ سلیمان شکوہ ؎

صبحدم میں نے جو لی بستر گل پہ کروٹ   جنبش باد بہاری سے گئی نیند اچٹ

ورق ۷۰ الف۔ قصیدہ در مدح نواب سعادت علی خان بہادر (فارسی)

ورق ۷۱ ب۔ قصیدہ جلوس میمنت نواب یمین الدولہ سعادت علی خان بہادر ؎

نظر آئی مجھے کل باظفر وصوغ وعلم   صورت فتح، مجسم ہو بہ شکل آدم

ورق ۷۴ ب۔ قصیدہ فی المدح نواب سعادت علی خان بہادر ؎

کیا چیز دیو، مرد سخنداں کے سامنے   پر جلتے ہیں فرشتوں کے انساں کے سامنے

ورق ۷۶ الف۔ قصیدہ در مدح دولہن جان ؎

سحر بہار کی خوشبو میں آ گئی یہ لپٹ   کہ صاف چاند سے مکھڑوں کے کھل گئے گھونگھٹ

ورق ۷۸ ب سے اردو غزلیں ردیف وار شروع ہوتی ہیں ؎

ابتدا ؎ صنا برب کریم یاں ترے ہیں ہر ایک یہ مبتلا   کہ اگر "الست بربکم" تو ابھی کہے تو کہیں "بلیٰ"

ورق ۱۷۷ الف سے فارسی اور اردو رباعیاں درج ہیں۔ رباعیوں کے بعد کچھ تاریخیں ہیں۔

ورق ۱۸۶ الف پر الماس علی خان کی تاریخ وفات ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے ؎

"حیف اے آہ از الماس علی خاں افسوس"

۱۲۲۳ ہجری

تاریخوں کے بعد ورق ۱۹۳ الف سے پہیلیاں شروع ہوتی ہیں۔ اور پھر مخمسات ہیں۔ ایک طویل مخمس قصیدہ مولوی حیدر علی کی تعریف میں ہے۔

ورق ۲۰۷ ب سے فارسی میں بے نقط مثنوی درج ہے ؎

الحمد لمسکر اسکارا   کو داد مدام روح مارا

اللہ اللہ الہ عـالم   علام و دود کرد گارم
ممدوح امم رسول اکرم   در علم الہ اصل آدم

ورق ۱۰۰ ـ ۱۲۱ الف ـــ فارسی میں نواب سعادت علی خان کی تعریف میں مثنوی شکار نامہ درج ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۲۰ھ ہجری میں تصنیف کی گئی تھی۔ ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے ؎

حمد خداوند وحوش و طیور   نور دہ چشم غزالان حور

مثنوی کی تاریخ تصنیف یہ ہے ؎

فوج ظفر موج بایں عز و جاہ   گرد رسانید چو بر اوج ماہ
شوکتش انشا بخط زر نوشت   فقرۂ تاریخ مظفر نوشت
۱۲۲۰ھ

اس کے بعد انشا کی اردو مثنویاں درج ہیں۔ مثنوی در ہجو زنبور، در ہجو مگس، مثنوی در ہجو (مخش) مرغنامہ، در ہجو مگس، در ہجو گیان چند ساہوکار، حکایت زمانہ نا فرجام، مثنوی در لہجہ اردو، مثنوی فیل۔

کلیات انشا کا یہ نسخہ ۱۲۴۲ھ ہجری میں لکھا گیا ہے۔ ترقیمہ کی عبارت یہ ہے۔

”تمت تمام شد۔ کلیات میر انشا اللہ خان بتاریخ دوازدہم شہر جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ ہجری عہد نواب غازی الدین حیدر بہادر در بحر سخا و کرم بے بہادر“

کلیات انشا (نسخہ ثانی)

نمبر مخطوطہ ۵، سائز ۷" × ۱۱"، اوراق ۳۵۵، سطر ۱۵، خط نستعلیق۔

اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انشا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلیات سے نقل کیا گیا ہے۔ کلیات میں پہلے ۲۳ اوراق میں ردیف وار فارسی غزلیں۔ اس کے بعد مثنوی فارسی مسمی شیر برنج پھر ۱۵ الف سے شرح مأۃ عامل فارسی میں ۵۴ ب تک ہے۔

ورق ۵۵ الف سے ۸۸ الف تک حضرت علیؑ، نواب سعادت علی خان، سلیمان شکوہ اور الماس علی خان کی تعریف میں قصیدے ہیں۔ حضرت علیؑ کی تعریف میں ایک بے نقط قصیدہ بھی ہے۔ اس کا آٹھواں شعر ترکی میں درج ہے اس کے بعد قصیدہ کے سلسلے میں ورق ۶۱ الف پر ”اشعار عربی بکمال درستی ترکیب نحوی“ کے عنوان کے تحت عربی میں کچھ اشعار درج کئے گئے ہیں۔

ورق ۸۹ ب سے ۲۴۱ ب تک اردو غزلیات ”دیوان ہندی“ کے عنوان کے تحت درج ہیں۔

ورق ۲۴۲ الف سے ۲۴۳ الف تک فردیات ہیں۔ پھر ۲۴۳ ب سے ۲۵۳ ب تک اردو اور فارسی میں رباعیات ہیں۔ ۲۴۵ ب پر یہ عبارت ہے:

”جناب عالی حکایت فرمودہ بودند کہ شخصے شراب خوردہ بود۔ رہگذرے باو پرسید خوش مستی او با وضاع مستی ہمیں قدر گفت کہ میخوش۔ بندۂ انشا بخانہ مراجعت نمودہ ایں رباعی درست کردہ ؎

کیا ہاتھ ہلا کے پوچھتے ہو ہے خوش   ہم جیسے ہیں خوش کبھی نہ ہوگا کے خوش
مسکر سہ دانہ سمجھو تو سکر کہیں   می ہے پی کے مزاج ہو رہا ہے میخوش

ورق ۲۴۷ الف پر یہ عبارت ہے۔

" رباعی فارسی در صنعت تجاہل عارفی کہ لفظ فارسی را عربی فہمیدہ در غلط افتد و ایں صنعت ایجاد بندہ "

شکر است کہ حافظیم خیانت کردہ است   قاضیم شکوک در دیانت کردہ است
انشاء اللہ خان شاید خواندہ است   گفت است کہ آں شخص خیانت کردہ است

در جواب تجاہل مذکور

ہر چند کہ لفظ خان ماضی باشد   اکنون زچہ اعتراض قاضی باشد
الماضی لا یذکر مشہور ایں است   قاضی می باید ایں کہ راضی باشد
زاہد جو ہیں ہے انہوں کو طاعت پہ گھمنڈ   اہل دنیا رکھے ہیں دولت پہ گھمنڈ
واقف ہوں نہ طاعت سے نہ دولت سے میں   بس مجھ کو ہے ایک تری رحمت پہ گھمنڈ

ورق ۲۵۴ الف اور ب پر مقطعات ہیں۔ اس کے بعد ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس کا کوئی عنوان درج نہیں ہے۔ ورق ۲۵۵ الف پہ یہ عبارت ہے:

ملاقات بار اول؛ ورق ۲۵۵ ب -- ملاقات بار دوم، ورق ۲۵۶ الف ملاقات بار سوم و یکجا ماندن تا یک ماہ۔ اس مثنوی کا نام مطبوعہ نسخوں میں "شکایت زمانہ" ہے ابتدا ؎

کروں کیا جور گردوں کی شکایت   جہاں دیکھو اسی کی ہے حکایت
نہیں یہ دیکھ سکتا خانہ آباد   کہ ہو کوئی کسی ڈھب سے کہیں شاد

اس کے بعد مثنوی فیل درج ہے۔ اس میں ۲۱۰ شعر ہیں۔ پہلے ۲۶ شعر ساقی نامہ کے ہیں ساقی نامہ کے بعد مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

قصہ نہیں ایک باغ ہے یہ   مسرور کن دماغ ہے یہ

مطبوعہ نسخوں میں اس مثنوی میں ۱۹۰ شعر ہیں۔ انشا نے اس میں "بہادر" ہاتھی اور "پیاری" ہتھنی کی جفتی کا نظارہ پیش کیا ہے۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۷۹۲ء میں ہوا تھا اور انشا نے اسے نواب سعادت علی خان کے حکم سے تصنیف کیا ؎

حسب الحکم جناب عالی   منظوم ہوئے ہیں یہ لآلی

ورق ۲۶۵ پہ دیوان ریختی کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

جب سے کہ سامنا ہے اس جاہ کی گلی کا   ہے مدد مجھکو "حضرت مشکل کشا علی" کا

دیوان ریختی کے بعد تاریخی قطعات ہیں۔ ذیل میں چند کے مادے درج کئے جاتے ہیں۔

ورق ۲۷۴ الف۔ تاریخ وفات الماس علی خان ۱۲۲۳ھ

ورق ۲۷۵ ب۔ تاریخ جلوس جناب عالی متعالی نواب سعادت علی خاں بہادر سنہ ۱۲۱۲ھ

ورق ۲۷۵ ب۔ تاریخ مسجد سالار بخش ؎ "ہے یہی تاریخ مسجد واہ رے سالار بخش"

۱۲۱۲ھ

ورق ۲۷۹ ب۔ در تاریخ نادر شاہ کہ در دہلی آمدہ قتل عام نمود ؎

"آہ قتل عام شہر" = سنہ ۱۱۵۱ ہجری

ورق ۲۸۰ الف۔ تاریخ وفات شاہ عالم :

" سال وفاتش آہ دریغا" = سنہ ۱۲۲۱ ہجری

تاریخ تخت نشینی اکبر شاہ ثانی ۔ ؎ "نوشت اوج ملک مدظلہ العالی"

۱۲۲۱ ہجری

ورق ۲۸۱ الف۔ تاریخ وفات زین العابدین ؎

رفت زین العابدین خاں رحلتش ہر کس شنفت   سال تاریخ وفاتش آوخ زوخ آہ گفت

۱۲۱۴ھ

ورق ۲۸۱ ب سے ۲۸۳ ب تک چیستان و پہیلیاں ہیں ۔

ورق ۲۸۳ ب سے ۲۹۵ ب تک مخمسات ہیں ۔

ورق ۲۹۷ الف ــ دیوان ہندی بے نقط ۔ ابتدا ؎

اور کس کا آسرا ہو سرگروہ اس راہ کا   آسرا اللہ کا اور آل رسول اللہ کا
اہل عالم کا سہارا آسرا کس کام رکھ   ہر سحرگہ آسرا والا اس درگاہ کا

دیوان بے نقط ورق ۳۰۴ الف پر شروع ہوتا ہے ۔

ورق ۳۰۴ ب ۔ حکایت نثر در صنعت مذکور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ کہ آس مراد کا گل کھلا، عطر سہاگ کا رنگ کہ اہلا گہلا رسما دولہ سا ہو کہ وہ امرد کم عمر سادہ ملک ماہرو ہمراہ ملکۂ گوہر آرا وارد آرام محل ہوا سلسلۂ کاکل کا محاورہ اردو کا کھلا اور کلہ اور کلام کا دروا ہوا ؎

دل کھلا انشا ادھر سہاگ کا رنگا رنگا
لاک کا رنگا رنگا اور آگ کا رنگا رنگا۔

اللہ کا رحم رسم و رسوم ادا کرا اس ہم عمر محرم اسرار دلآرام کا گلگلا سا گال گلا اور گدگدا کر اس کو کہا مورکھ کا ادھر اس لٹھار کا اور لہرا لہرا گل کھلا۔

ورق ۳۰۵ الف پر صنعت بے نقط کی تعریف میں مثنوی ہے۔ ورق ۳۰۸ ب پر فارسی میں مثنوی شکار نامہ ہے۔ ورق ۳۱۲ ب پر مثنوی در ہجو زنبور ہے۔ ابتدا ؎

ان بھڑوں نے کیا یہ اب کی قہر   کہ ہوا زرد پوش سارا شہر
دیکھیے ان کی ٹک جوانمردی   سب پہ ایک اپنی پھیر دی زردی

ورق ۳۱۳ ب - ہجو مخمس

ابتدا ؎
مکھیاں اب کی یہ چنڈ دل   کہ لگا ایک جی کو ان کے ہول
کس طرح ہو بہار تازہ دماغ   کرتے ہیں آبشار استفراغ

ورق ۳۱۴ ب - حکایت (مثنوی)

ابتدا ؎
مرد تھا ایک ایک تھی رنڈی   پر وہ رنڈی تھی مرد سے سنڈی

یہ مثنوی فحش گوئی کا دفتر ہے۔ اس لیے مزید کوئی شعر نقل نہیں کیا جا سکتا۔ مطبوعہ نسخوں میں یہ غائب ہے اور اس میں ۱۵ اشعار ہیں۔

ورق ۳۱۴ ب - مثنوی مرغ نامہ

ورق ۳۲۴ الف - مثنوی در ہجو گیان چند ساہوکار - اس میں شاعر نے ایک مارواڑی سیٹھ صاحب کی ہجو کی ہے - مثنوی میں ۲۹ شعر ہیں۔ ابتدا ؎
ایک تھا بنیا ساہوکار نام تھا اس کا گیان چند   بھنگی امیر بخش جو آئی اِسے بہت پسند

ورق ۳۲۶ الف پر "مثنوی ابتدائے کلام تمہید شکایت نامہ زمانۂ فرجام" درج ہے۔ ابتدا یوں ہے ؎
کروں کیا جور گردوں کی شکایت   جب دیکھو اسی کی ہے حکایت

کلیات میں اس مثنوی کے دو حصے کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے چار ملاقاتیں درج ہیں۔ ابتدا یوں ہے ؎
حقیقت کی نہ پوچھو بعد چندے   ملا اُن نے دیا تھے جس کے بندے
تصدق تری قدرت کے خدایا   کہ دو بچھڑے ہوؤں کو پھر ملایا

ورق ۳۲۹ ب - قطعہ در بیان اہل برن درج ہے۔

ورق ۳۳۱ ب - مثنوی در ہجو کھٹمل۔

ابتدا ؎
کچھ یہ کھٹمل بڑھے ہیں اب کے سال   کہ ہوئی سب زمین لالوں لال

ورق ۳۳۵ - مثنوی در ہجو پشہ

ابتدا ؎
مچھروں کو ہوا ہے اب کی یہ اوج   دب گئی جن سے مرہٹوں کی فوج

اس کے بعد دیوان ریختہ اور پہیلیاں ہیں۔

آخری صفحہ پہ یہ عبارت ہے:

"تمت - کلیات میر انشا اللہ خان مرحوم
نقل مسودہ ہائے خان موصوف - تمت بالخیر"

مذکورہ بالا کلیات انشا کے دونوں نسخے مستند اور قدیم ہیں۔ ان میں انشا کا غیر مطبوعہ کلام بھی درج ہے۔ ایک ہجو یہ مسدس نو بند کا ہے۔ اس پر کوئی عنوان درج نہیں ہے لیکن قیاس سے پتہ چلتا ہے کہ شاید مصحفی کی ہجو میں کہا گیا ہو۔ ذیل میں پہلا اور آخری بند درج کیا جاتا ہے ؎

شریک نطفہ حلت جہاں سحق و سنبورا ہو خصوصاً جس کی ماں سارنگی اور باپ تمبورا ہو
وہ گھنڈو کیوں نہ پھر جس تان میں دیکھا دھوا ہو غنیمت تناری سے میں ہے اپنی جو پورا ہو
بھلا کیا آدمیت جانے مجہول النسب ایسا
مٹوسا پن یہ ہو جس میں نسب ایسا حسب ایسا
کبھی ہاروت بیٹھے ہے کبھی ماروت کی صورت نہ نکلا کھاوے اس سے دیو کی اور بھوت کی صورت
عرق سے اس کے ٹپکے ہے شمر کی موت کی صورت عیاں ہے اس کی اک اک بک بک سے برج حوت کی صورت
کہا جن نے اسے ہے یہ اک لنڈھور کا بیٹا
خدا بخشے کہنہ اس کے غرض ہے وہ بہت خاصا

کلیات انشا کے قدیم مطبوعہ نسخوں میں مثنوی مرغ نامہ میں ۴۶ شعر درج ہیں۔ کلام انشا میں مرزا محمد عسکری نے ۲۱۴ شعر نقل کئے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کی رائے میں انشا کی طویل ترین اور مفصل مثنوی فیل ہے[1] راجہ صاحب محمود آباد کے متذکرہ بالا کلیات انشا کے نسخوں میں مرغنامہ طویل ترین مثنوی ہے۔ اس میں ۲۴۰ شعر ہیں۔ بقول ڈاکٹر اسپرنگر یہ مثنوی سنہ ۱۲۱۱ھ میں تصنیف کی گئی تھی[2]۔ انشا کی تمام مثنویوں میں بس صرف یہی ایک مثنوی ہے جو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں مرغبازی کے جملہ اصول و قواعد جو اس زمانے میں رائج تھے نظم کئے گئے ہیں ذیل میں یہ پوری مثنوی جس میں لگ بھگ ۲۰۰ شعر غیر مطبوعہ ہیں من و عن درج کئے جاتے ہیں ؎

مثنوی مرغنامہ

دربیان حمد الٰہی بگوید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد ہے فرض اس کی وقت سحر جس نے کاٹے ہیں مرغ روح کے پر
کر دیا ہے اُسے جسد میں بند کہ وہ یک چندواں رہے خورسند
مرغ زریں آفتاب فلک سر طائر سے لیک تا بہ ملک
اور سلطان عالم لاہوت یاد میں جس کی ہیں سبھی مبہوت
کنہ میں جس کے ذہن کا طاؤس خلق کرتا ہے طائر افسوس
کیا کہوں وہ بڑے کھلاڑی ہے اس سے غافل ہے وہ اناڑی ہے
کر کے تن مرغ روح کا ڈھانپا جس نے ڈھانپا ہے سپہر کا کھانچا
حکم سے جس کے اس زمانے میں یعنی دنیا کے مرغ خانے میں

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۲۵۸ ۔ [2] اودھ کیٹلاگ ص ۶۱۴ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۴ء

رات[1] وہ ماکیان روح سپہر   روز دیتی ہے ایک بیضۂ مہر

دربیان مواعظ شب بیداری

نیند کو چھوڑ صبح ہے نزدیک   بانگ ہوتی ہے چونک صاح الدیک
دیکھ تو کیا سرور[2] کا ہے وقت   طرفہ نور و ظہور کا ہے وقت
محو ذکر خدا ہیں جملہ طیور   آدمی ہو کے تو کرے ہے قصور
سن نصیحت مری بہ سمع قبول   تو بھی کچھ[3] یاد حق میں ہو مشغول
وقت، سیمرغ کرکے یہ معلوم   قاف پر بولتا ہے یا قیوم
اٹھ کہ وقت نماز آتا ہے   وقت راز و نیاز جاتا ہے
آگ لگ جاوے تیری غیرت کو   وائے[4] اس تیری آدمیت کو

مرغ جو جانور ہے دیوے اذاں
اور سویا کرے تو لے انساں

درنعت حضرت سید کائنات

کر ثنائے رسولؐ راہنما   جس کی نعلین کا ہے سایہ ہما
صلوات اس پہ بھیجیے جاوید   ہے جو ایک آسمان پہ مرغ سفید
گر حمایت کریں نہ اس کی آل   نہ جمیں مرغ عقل کے پر و بال

درتعریف مرشدزادۂ آفاق

بسکہ شاہ جہاں مہر تمثال   وہ شکوہ سلیمان[5] با اقبال
مالک ملک و صاحب دیہیم   وارث تاج و تخت ہفت اقلیم
بادشہزادۂ ہمایوں فر   فخر تیمور و بابر و اکبر
اور جناب وزیر آصف جاہ   جس کے اختر سے ہے زیادہ سپاہ
آصف الدولہ اعظم الوزرا   جس کے ادنا غلام ہیں امرا
لڑنے بھڑنے سے ذوق رکھتے ہیں   مرغبازی کا شوق رکھتے ہیں
کیوں اولی العزم کو بھاوے رزم   اس کی تقریب میں ہے صحبت بزم
شغل ہے جن کو ترکتازی کا   کھیل ہے ان کو مرغبازی کا

---

[1] مطبوعہ نسخہ "دن"۔ [2] مطبوعہ "نور"۔ [3] مطبوعہ "تک"۔ [4] مطبوعہ "لعنت"۔ [5] مطبوعہ "سلیمان شکوہ"

گوش دل سے یہ سن لے میری بات   آن میں ہیں انبیاؑ کے چند صفات
صبح خیزی ہے اور شجاعت ہے   اور ہمت ہے اور غیرت ہے
کیوں انہوں کا نہ جنگ پر ہو مزاج
صرف اس قوم کو ہے تاج کی لاج

در بارہ شوق خود گوید

اب مجھے بھی یہ شوق ہے اس کا   کہ سمجھتا ہوں مرغ کو عنقا
قصد پالی کا جب کہ کرتا ہوں   کیا ہی ڈگ لمبے لمبے دھرتا ہوں
داب اپنے بغل میں ایک مُرغا   چلتا رپ رپ قدم ہوں میں یرغا
چمنستاں میں دیکھ تاج خروس
چاہتا ہوں کہ لیجیے اس کو بھی چوس

در تعریف مرغہائے خود گوید

مثل فولاد مرغ ہیں اپنے   داد بیداد مرغ ہیں اپنے
پہلوانوں کی ہے انہوں میں صفات   تیک آہنگراں ہے ان کی لات
پاس اپنے جو مرغ ہے جاوا   ہے وہ اسفندیار کا باوا
ہے جو بیٹھا وہ سامنے ہوتا   بیٹا رستم کا زال کا پوتا
بڑھ مواشا جو ایک ہے لاکھا   جوں نریماں کرے ہے وہ جاکھا
اور زردا جو ایک ہے بیٹھا   اس کا پالی میں ہے بندھا لٹھا
وہ ہے دھونگڑ وہ ایک ہے آفت   کیا کہوں اس کی جرأت اور قوت
چاہے گر چونچ سے تو وہ سنڈا   توڑ ڈالے سپہر کا انڈا
ہیں غرض خوب خوب عالی مرغ
ہے بجا ان کو کہیے گر سیمرغ

در تمہید تعریف مرزا قاسم علی[2] خاں

تاکہ اس کھیل بیچ جنبد نہ ہو   اس کے لکھتا ہوں میں قواعد کو

---

[1] مطبوعہ "منہا آسا"

[2] نواب قاسم علی خان۔ نواب آصف الدولہ کے ماموں زاد بھائی اور نواب سالار جنگ بہادر کے بیٹے تھے۔ مخطوطہ دیوان ناسخ مملوکہ راجہ صاحب محمود آباد میں ۱۲۳۴ھ ہجری ان کی تاریخ وفات درج ہے۔

ہیں جو اس علم میں بڑے استاد
ان کو اللہ کیجئے خرم و شاد
معدن علم و مظہر اخلاق
مجھ پہ مخصوص رکھتے ہیں اشفاق
کیوں نہ ہوں روشناس عالم کے
ہیں وہ بھائی وزیر اعظم کے
واقعی ان کا ہے بلند مقام
مرزا قاسم علی ہے ان کا نام
رہے ان پہ وزیر کا سایہ
ہے انہوں نے مجھے یہ فرمایا
مرغ کا کھیل ہو اگر منظور
مرغبازی کا سیکھ لے دستور
جنھیں اس فن میں خوب قابو تھا
نام ان کا خلیفہ بابو تھا
مرغبازی میں سب سے فائق تھے
یعنی اس فن میں وہ محقق تھے
تھے اجی قبلہ گاہ کے وہ رفیق
ان سے ہم سیکھتے تھے اس کا طریق
قاعدے جو خلیفہ مسطور
سامنے اپنے کرتے تھے مذکور
اور جو بات کرتے تھے ظاہر
ان سے ہم کرتے ہیں تجھے ماہر

الغرض ان سے جو سنی تقریر
میں نے منظوم اسے کیا تحریر

در شروع کتاب و اصول جنگ بازی مرغاں

اب وہ کہتا ہوں میں قواعد کل
تا نہ دے بیٹھے کوئی آگے چل
مرغبازوں کی ہے یہی پالی
مثلاً ہو چکی ہوں دس پالی
گیارھویں پالی اپنا دے رومال
اگلے نے پھر لڑایا ہو فی الحال
اور وہ جو حریف ہو غالب
جس کی باقی ہوں پالی اے صاحب
مرغ کا کانٹا دیکھ لے موٹا
تو غرض اس نے بس اسے لوٹا
بازی دینی پڑے اسے لاریب
شدت اگلا کرے تو ہے یہ عیب
جس کی باقی ہوں پالی لے دارار
ان نے کیا تو پھر مختیار

باندھے کانٹے ٹانک دیوے پلک
ہے یہ جاری سلف سے آج تلک

در بیان ڈھنگ بستن مرغاں

جوڑ مرغان کا تب بندھے ہے اجی
جبکہ دونوں طرف کی ہو مرضی
چاہیے یوں ہی ڈالت ڈنکا
جس کے راون کے کانپ اٹھے لنکا

نہیں کوئی کرے جو ڈنکے بعد   تو وہاں یونہی گرجے جیسے رعد
لیجے بازی اس سے ہوکے حریف   اس میں یکساں ہیں سب قوی و ضعیف
اور جو دونوں طرف کی مرضی ہو   کہ نہیں اب لڑاتے جاتے دو
تو نہ اس کو خطر نہ اُس کو ظفر
ترک شدت ہے اس گھڑی بہتر

دربیان کانٹا

ہے یہی کانٹے باندھنے کا طور   اس کو تو اپنے دل میں کرے غور
دونوں مرغوں کے کانٹوں کی اینان   کیجے سوہان سے خوب سے یکساں
اور آہنی جو ہوں انی والے   ان کو بس رے کے جھٹ رگڑ ڈالے
ایک کپڑے کی چار پٹی پھاڑ   مرغبازوں کے کھیل کو بے تاڑ
دو تو اپنے کے واسطے سے لے   دو اُسی میں سے دوسرے کو دے
دھجیاں آٹھ آٹھ تہہ کر کر   باندھ مضبوط کانٹوں کے اوپر
ایناں کانٹوں کی یوں ٹھونک کے بیچ   کچھ نہ رہ جائے اس میں اونچ اور نیچ
پھر نہ دوڑا انی کے اوپر آئے
کہیں ایسا نہ ہو اناڑی کھائے

دربیان تعین پالی

کل مقرر ہیں اس میں پالی دس   اس کے آگے جو ہو کسی کو ہوس
تو وہ رومال دے کے پالی اک اور   چھوڑ سکتا ہے مرغ کو فی الفور
یوں لڑانے کو ہے لڑا سکتا   مرغ کو پھر اٹھا نہیں سکتا
گر اٹھا دے تو ہارے پھر بازی   کچھ نہیں کام آتی دمسازی

دربیان ترک کردن رومال درعین جنگ

لڑنے میں مرغ کے اگر رومال   کوئی یوں سے بھگا تو پھر فی الحال
ایک پالی وہ ہار جاوے وہیں   پر جو دونوں کی ہو خوشی یو نہیں
چپکے سے ترک کرے جو وقت مصاف   وہ بھی ایک پالی ہار جاوے صاف
کرے رومال کو چھپا کے جو تر   اور قسم کھا کے جاوے صاف مکر
نہیں کچھ چاہیے دہاں تکرار   یہی تدبیر ہے کہ ہو لاچار

دونوں رومالوں کو ملا کے عیاں
سب کے آگے نچوڑ ڈالے وہاں

دربیان احتیاط عدم شرو شدت بیجا

طبع کو شر پہ تو نہ کر مرغوب   مرغ ہمیشہ ہی ہیں لڑاتے خوب
کھینچ تا شر کرے نہ کوئی شریر   آدھی کر کے مفاصلہ سے لکیر
ایک اپنی طرف اور ایک اودھر   خیر سے تا کہ دیکھیں جملہ بشر
کیوں قضایا میں ہاتھ مونہہ ٹوٹیں
مرغ دونوں لکیریں پر چھوٹیں

دربیان زدن چشم مرغ

غیر کے مرغ کی گئی ہو جو چشم   تو تجھے واں نہیں ہے لازم خشم
دوسرے شخص کے نہ دل کو توڑ   ایک کا بے بچا کے مرغ کو چھوڑ

دربیان آمدن نیم بازوئے مرغ بر مرغ دیگر

ایک کا آدھا بازو آیا ہو گر   دوسرے جانور کی گردن پر
ہے حریف ایک ہاتھ کا مختیار   کہ جو چاہے تو لیوے بازو اتار
اور جو دونوں لگا دے اپنے ہاتھ   ہار پال کی پھر ہے اس کے ساتھ

دربیان آمدن تمام بازوئے مرغ بر مرغ دیگر

سارے بازو جو مرغ کی گردن   ڈھانپ لیوے تو واں یہ ہے قدغن
کہ نہ چھیڑے کوئی نہ ہاتھ لگائے   اور جو چھیڑے تو پالی ہار ہی جائے

دربیان آمدن پر در دہن مرغ

آگیا ہووے مونہہ میں مرغ کے گر   تو الگ کھینچ لیوے چٹکے سے پر
شرط ہے احتیاط اس میں بڑے   دوسرے مرغ کو نہ ہاتھ لگے

دربیان جزائے مرغ باز شدہ

گر شرارت سے مرغباز نے ہاتھ   مارا ہو مرغ کو تو اس کے ساتھ
اسے پالی سے کیجئے باہر   اور کہیئے کہ دور گیدی خر

دربیان برداشتن مرغ

مرغ دونوں جو کر کے جنگ و جدال   حد پہ پالی کی پہونچے ہوں فی الحال

مارنا لات مرغ کو گر ہو چونچ سے اپنی پکڑے ہو اس کو
کھیل کی بات ہے یہی لاریب واں اٹھا لینا کچھ نہیں ہے عیب
نہ اُٹھے حد سے تو بھی پالی کی ہار
وقنا ربنا عذاب النار

دربیان آمدن دم مرغ بہ حد پالی

ہے وہ مختار جس کے مرغ کی دم نکلے پالی کی حد سے اے مردم
نہ اٹھا دے وہ یا کہ لیوے اٹھا ہار جیت اس میں کچھ نہیں اصلا
مرغ جس کا طرف ہو پالی کے وہ اٹھا دے تو پالی بس ہارے
پالی باہر سے کوئی شخص جھپٹ لے اٹھا مرغ کو تو بس عبث پٹ
خیر وہ پالی ہارے وہ بے شک اس میں کرنی عبث کو ہے بک بک
کب چھڑاتے ہیں چشم مرغ سے خاک عین لڑنے میں ہے جنھیں ادراک
اور پہ کا نہیں مضائقہ پر
رکھتے جائز نہیں اس کو اہل ہنر

دربیان برآمدن خار مرغ از بیرون پارچہ در عین جنگ

مرغ کا لڑتے میں جو ٹوٹا خار ہو گیا ہو دے سب ٹھونگے پار
آدمی غیر کا جتا دیوے ٹھونگا ٹوٹا بتا دیوے
کھول کر کانٹے دیکھ لیوے یہ بھید سب ٹھونگے جو وار پار ہوں چھید
تو تو البتہ پالی ہارے وہ ورنہ پھر ادلی ہار ہے اس کو
کانٹے کھلوائے غیر سے لیکن اس میں بہتر ہے رات ہو یا دن
اور ایک نہ بھی رہ گیا ہو اگر تو نہیں ٹوٹا خار لے دیر
کانٹے پھر کھول باندھ آئے وہیں
جس میں اگلے کے دل کو ہو تسکیں

دربیان شبہ برآمدن خار

گاہ باشد اگر یہ شبہ ہوا یعنی ٹوٹا ہے کانٹا مرغے کا
دونوں راضی ہوں اُن تو خلط کی راہ کچھ نہیں ہے مضائقہ باللہ
کیوں عبث تہمہ مفت کا باندھے پھر نئے سر سے کھول کر باندھے

در بیان کاری خوردن مرغ

اور اگر مرغ کے لگے کاری   اس کو میداں سے جھٹ بطرآری
دو سرا ے اٹھا تو وہیں پھر   پالی ہارے یہ بات ہے ظاہر
جانور حد پہ جا پڑے جو پھڑک   تو اُسے جلد چابکی نہ دھڑک
اس میں پالی کے اس کو ہار نہیں   اور تکرار زینہار نہیں
کاری کھائے گر اٹھا لیوے   حد سے پالی کے اور لگا دیوے

در بیان نشستن مرغباز در عین پالی

بیٹھ پالی ہی میں کہے جو وہ یوں   پھر اُسے ٹھونک کر لگاتا ہوں
دیکھیے اس کو مہلت کہ وہ کھڑے   کہ مصیبت غریب پر ہی پڑے
ہے وہ مہلت کی قدر کا مختار   اس میں شایاں نہیں ہے کچھ تکرار
چاہے آٹے کی گولیاں توڑے   چاہیے مرغے کو سامنے چھوڑے
اس نے پہلے جو مرغے کو چھوڑ   تاکہ گولی دے کیوں نہ دے آٹے سے توڑ
تو ہے معلوم نزد اہل تمیز   پالی بے شبہہ پھر وہ ہارے عزیز
اس کی ہے اطلاعِ مرغ اگر   اگلا لے جائے پالی کے باہر
سن لے پھر میرے اے رفیق شفیق   ہار پالی کی ہے اُسے تحقیق
گیارھویں پالی کر کے دمسازی   مرغ اپنا چھوڑے سو دے بازی

بیان بکشتہ شدن مرغ و احکام او

لڑتے لڑتے جو مرغ مر جاوے   چاہیے دوسرا نہ گھبرائے
کرے تختے پہ اس کو وہاں کھڑا   اور ٹک جی کو اپنے کرے کڑا
دوسرا ان کا والا لات جڑے   تو یہ بازی کے دینے پر ہی اڑے
ڈنکے اور لات کی نہ ٹھہرے تو   پھر برابر ہے وہاں دونو
نہ ہوئی جیت ہار کچھ مطلق
مٹ گئی سب گر جو تھی رق رتی

منع آمدن مردمان دیگر درون پالی

چاہیے یہ کہ مرغباز سوائے   کوئی پالی میں اے عزیز نہ جائے
یا وہ دو مرغباز جاویں اور   جو کہ کانٹوں کے دیکھ لیویں طور

یا جو پالی سے رنگ کو تاڑیں
بھم اس طور جنگ کو تاڑیں

دربیان قواعد شب خون بعد جنگ

رات ہو جائے اس میں تو مجبور   واں بتا چار ہے یہ بات ضرور
مشعلیں گرد و پیش دکھلا دیں   چار مشعلیں پالی میں جا دیں
رکھیں ایسا ہی روشنی کو جانچ   کہ نہ مرغوں کو پہونچے مطلق آنچ
نہ لگے مرغوں کو کہیں مشعل   کہ مبادا کچھ اور آوے خلل
یعنی آپس میں ہووے دت دبک   اور برپا ہو مفت کی بک بک
اور ترکیب مجھ کو ہے سوجھی   آگے حاضر ہوں آٹھ مشعلیں
چار تو ہوویں چاروں کونوں پر   اور ہوں چار پالی کے اندر
مرغ لگنے ہیں اور بھاگنے میں   سب کو لازم ہے دور سے دیکھیں
بیچ پالی کے اس گھڑی آنا   عیب رکھتے ہیں وہ جو ہیں دانا
گو بڑا آدمی ہو یا سردار   چاہیے اس سے کرتے یہ تکرار
کھیل سے یہ بعید ہے حضرت   یہ ہوئے آپ سے بڑی حرکت
دوسری بار یوں ہی ہو تو غرض   دیں روپے پانچ پھر وہ اسکے عوض

کوئی اس بات سے جو ہو باہر
کھیل کا اس سے ترک ہے بہتر

دربیان منع گفتگوئے بیجا

نہ کڑکیے بسانِ رعد و برق   چاہیے رکھئے مرتبہ کا فرق
باادب بات کھیل کے کہیئے   اور آتے ہو تو چپ رہیئے
بولنا مرغباز کا بیجا   کسی سردار سے نہیں اچھا
اور بولے تو جس کا ہے نوکر   اس کو لازم ہے ہو خفا اس پر
چاہیے اس کو دیوے ایسی سزا   کہ وہ اس بات کا اٹھاوے مزا
اس کا آقا کرے نہ گر تنبیہ   تو نہایت ہے کھیل میں یہ کریہہ
چاہیے حاضروں کی صف کی صف   ہوں سب اس مرد آدمی کی طرف
تاڑ اس کے مزاج کا گھر گھاٹ   کھیل سے اس کے دل کو لیجے چاٹ

در بیان مکان علیحدہ نمودن برائے تیمار مرغان

اور لازم ہے ایک جدا ہو مکان
مرغ آ کر کے بیٹھکے جاویں جہاں
چو پنج جوڑے جہاں کہ باندھ سکیں
چاہیے سو مرغباز اپنی بکیں
رکھیں گودی میں اپنے مرغوں کو دھانک
تا کہ پیکوں کو دیویں ان کے ٹانک
یا دوائیں کچھ ان کو دیویں کھلا
مطلق ان چیزوں کا نہیں ہے گلا
یا کہ سرمہ دیں ان کی آنکھوں میں ڈال
جس طرح چاہیں اپنے لیویں سنبھال
ایک کاتڑں کا کچھ دوا ملتا
ہے قیامت یہ ہے نکل چلنا
اس میں ہوتی کہ سب ہے گفت و شنید
کھیل کی راہ ہے سمیٹ لے اس کو
ہو لہو مرغ کا اگر جاری
تو دوا لئے واں بنا چاری
کچھ نہیں ہے مضائقہ اس کا
پر جو چاہے کہ دوڑ آیا کپڑا

لا کے باندھے یہ بات ہے ممنوع
عذر ہرگز نہیں وہاں مسموع

در بیان تعداد جوڑہائے مرغاں

جوڑا اگر ہووے یا دو ہوں
تین ہوں چار پانچ ہوں جو ہوں
تا بحد کہ ہوں بندھے چھ جوڑ
تو بھی پالی میں ہر سے بھر سے چھوڑ
پانچ پالی تک ایک ایک کے بعد
آیا جایا کریں بساعت سعد
فرق دو دو گھڑی ہوتے کا
مقتضا ہے یہ قدر دانی کا
ہے کھلاڑی کو طور یہ بھاتا
یونہی ایک آتا ایک ہو جاتا
چھٹے پالی سے تین تین گھڑی
چاہیے دیر کیوں کہ پھر ہے کھڑی

در بیان قواعد اخیر شب

یہی استاد نے کہی ہے بات
جب گھڑی پانچ رہ گئی ہو رات
دونوں مرغوں کو صاحب تیمار
ہیں پھر اس آن فاعل و مختار
شوق سے مرغوں کو سلا رکھیں
دو گھڑی دن تلک جدا رکھیں
اس سے آگے جو اور بھی ہو دیر
تو نہ عاید ہے ہار پالی کے پھیر
اور اگر ہو اجازت طرفین
تو گھڑی چار پانچ لیجیے چین
یہی دستور ہے یہی معمول
دونوں راضی ہوں جو کہیں سو قبول

ہمدگر کی نہ ہو رضا مندی
جس میں وہ بات ہے خبر خندی

دربیان بستن پر مرغان بعد شروع ڈنکا درست نزول خار

ڈنکا جب پڑ چکا ہو مرغے پر   دوسرا چاہے تو سے باندھے پر
چھلے بیٹھے اپنے مرغ کے خار   تو پھر البتہ کیجئے تکرار
شرط کرنی ہو پہلے سے تو پسند
نامناسب ہے آگے جد و کد

دربیان بازی بستن مرغبازاں

ہووے جو کوئی مرغبازی پر   اس پہ لازم ہے باندھے یہ کمر
دو روپے سے بدے نہ بازی زیاد   اس میں گو وہ خفا ہو یا کہ ہووے شاد
ہے نہایت روپے وہ تین بدے   فائدہ کیا کہ لک جین بدے
اس سے آگے بدے تو ہے تقفیع   نہیں رکھتیں اس کی بازی صحیح
جتنے کا مرغباز ہو نوکر   دعیان آئے وہ اپنی آید پر   (کذا)
پاک اس کا نہیں اگر جاہا   بد دیا اس نے آدھا در ماہا
اور اس سے زیادہ جھوٹ ہے بات   آٹھویں روز ہو کے تکے لات
بازی جب تک نہ آوے آٹھویں دن
پھر لڑائی حرام ہے اس بن

دربیان تعذیر گنہگار

ہے گنہگار کا وہی انصاف   کیجئے ایک بار جرم معاف
پھر جو تقصیر ہووے بار دگر   کرے غصہ وہ جس کا ہو نوکر
اور سردار اس کا دیوے جو ٹال   سب کو لازم ہے دیویں اس کو نکال
کریں باہر اسے ملنے سے
کہ وہ تدبیر ہے ا انیلے سے   (کذا)

دربیان جنگ خار

چھلے کانٹوں بھی مرغ لڑتے ہیں   لاتیں کھا کھا بہم بچھڑتے ہیں
دھجیوں کا نہیں ہے کچھ مذکور   اور سب کچھ ہے ویسا ہی دستور

اس کی بھی ہے اسی طرح کی ریت   ہے اسی ڈھب کی ہار ویسی جیت
چاہیے لیجئے جتنی بازی بد
ہے جدا مونہہ کا بات ہے یہ پسند

دربیان جنگ مرغان با خارہائے آہنی

دوبے کانٹوں کا اور ہے اک کھیل   واقعی جس کو جنگ سے ہو میل
سو وہ انگریز نے نکالا ہے   اچھے سے اچھا مرغ پالا ہے
چاہیے اس کو کانٹے انگریزی   کہ دھواں دھار جن کی ہو تیزی
مرغ اس میں نہ پر لڑتا ہے   لاتیں کرچوں کی طرح جڑتا ہے
حد سے پالی کے ان کو ہاتھوں پر   لئے آتے ہیں پالی کے اندر
لینے دیتے نہیں پر اصلا صبر   پھڑ پھڑا دیتے ہیں پر خیر و جبر
دونوں مرغے جو کھاتے کھاتے مار   تھک کھڑے ہوں تو واں نہ جیت نہ ہار
مرغ کے مونہہ میں گرتے ہیں بیتی   ———
چاہے اگلے کے پر اس میں رضا   آگے جو کچھ کہ ہو سو حکم قضا
مرغ جس شہر کا کہ جاوے مر   یا کہ چھٹ جاوے بھاگ قیں قیں کر
ٹک گیا مرغ کا ہے جب کانٹا   پھر تو جھگڑا رہا نہ کچھ چرچا
تو تو لازم ہے بازی دیوے وہیں   اس میں کچھ بات جیت اور نہیں
ہمدگر واں نہ ظلم ہے نہ ستم   جتنے قصے تھے ہو گئے سب ختم

دربیان خاتمہ کتاب

آفریں باد سید انشا واہ   مرحبا مرحبا جزاک اللہ
ہیں قواعد جو کھیل کے مرقوم   نثر سے تو نے سب کئے منظوم
سخت قصے کڈھب بکھیڑے   ان کی سلجھائے تو نے الجھیڑے
فضل حق سے ہوئی کتاب تمام   کر دعا پر اب آ کے ختم کلام
یا الٰہی تو بخش میری مراد   بہ نبیؐ و آلہ الامجاد
رکھ سلیماں شکوہ کے سر تاج   دیویں سب بادشاہ اس کو خراج
ہو نصیب اس کو فتح و فیروزی   سلطنت جلد اس کو ہو روزی
جب تلک آسماں ہو اور زمیں   جب تلک مشتری ہو اور پروین

جب تلک زہرہ ہووے اور ناہید   جب تلک ماہ ہووے اور خورشید
آصف الدولہ کو سلامت رکھ   اس کی دولت کو تا قیامت رکھ
ہووے جب تک جہاں میں کہنہ باط   تب ہے حاصل اسے سرور و نشاط
جب تلک ہو قیام دوراں کو   رکھ سلامت مرے سلیماں کو
بار الٰہا بحق شاہ نجف   یہ سلیماں شکوہ اور آصف
بادشاہت کریں وزیر رہیں   اور رفیق ان کے سب امیر رہیں
دیوے اس کو خراج قیصر روم
ربع مسکون ہو اس کے سب محکوم

مثنوی شیر برنج

راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں انشا کی ایک فارسی مثنوی "شیر برنج" کا نایاب مخطوطہ بھی محفوظ ہے۔ یہ نسخہ منف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر مخطوطہ ۱۳۴ ، سائز ۵½" × ۸" ، ورق ۴۴ ، سطر ۱۱ ، خط شکست

انشا نے یہ مثنوی ۱۲۰۵ھ ہجری میں تصنیف کی مادۂ تاریخ "خروش مدح یم" ہے جس سے ۱۲۰۵ھ برآمد ہوتے ہیں آغاز ہی سے پہلے ابتدا میں ایک ورق پر "یا غنی یا علی" لکھا ہے۔ اس کے بعد "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہے۔ پھر مثنوی اس شعر سے روع ہوتی ہے ؎

لبسمک اللّٰھم یا رب الفلق   انت خلاق السحاب والشفق

دی ہیں کہیں کہیں اصلاح بھی کی گئی ہے۔ اور بعض اشعار قلمزد کئے گئے ہیں۔ کئی صفحوں پر بیچ میں "صبح البیاض" کے الفاظ بھی ج ہیں۔ مثنوی متن میں ہے لیکن حاشیے پر بھی کچھ اشعار موجود ہیں۔ آخری صفحہ پر یہ عبارت درج ہے۔

"نسخہ شیر برنج درجواب نان و حلوا من تصنیف سید انشاء اللہ خان خلف فخر الدولہ
سید ماشاء اللہ خان بہادر"

مسدس[1]

شرابِ لطف طلعت جہاں سحق و سنبورا ہو   خصوصاً اس کی ماں سارنگی اور باباطنبورا ہو
وہ چھندر کیوں نہ پھر جس تان میں دیکھو دھورا ہو   غنیمت تنا رسے رسے میں ہے اپنے جڑپورا ہو

---

[1] یہ مسدس بغیر کسی عنوان کے نسخہ محمود آباد میں درج ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔

بھلا کیا آدمیت جانے مجہول النسب ایسا
مٹو ساپن یہ ہو جس میں نسب ایسا حسب ایسا
بنے اس کے باپ کا بیٹا سو نالہ زاد بھائی ہے   یہ دعویٰ ہے کہ بی بی اس کی ماں کی چیلا بائی ہے
سو یہ سن اوسی کری بھی یہ بولی کیا جدائی ہے   نگوڑی ان نے کی بھوڑے کے دل میں یہ سمائی ہے
فلانے کا بھلا بیٹا فلاں الملک کب ٹھہرا
پھر اس شکل ہی ایسی کی بدل دھندورا مہرا
یہ بھونڈا پن نہ جس پہ آنکھ ہرگز خوک و سگ ڈالے   یہ ہاتھی جو مسافر کی گلی میں یہاں سے بھگ ڈالے
فوارہ یہ بڑے ساکھو سے ہوویں جوں الگ ڈالے   تندیلا یہ کہ اک فیروز شہ کی لاٹ ٹک ڈالے
عجب کوریکنیش اس کی وہ شکل پرکدورت ہے
معاذاللہ ایک ماہی مراتب کی سی صورت ہے
تجیب ایسا نہ ہو دنیا کے کیونکر کارخانے میں   مکرر ہو گیا ہے اس گھرانے میں
ہوئی ہے صرف سب اوقات واں گانے بجانے میں   غرض کچھ ذات اس کی مغتنم ہے اس زمانے میں
سلیقہ بات کا یہ کچھ زباں جب اپنی کھولے ہے
تو اپنے والد مرحوم کو محروم بولے ہے
کمنڈان ڈومڑاں کا یہ نہایت مجھ کو بھاتا ہے   جو کہتے ہیں کہ ہم کو بادشاہوں ساتھ ناتا ہے
جب اس کو دیکھتا ہوں ماں جان کیا یاد آتا ہے   اصالت دیکھیو اس کی کہ اک پردے میں گاتا ہے
نہ سرگم گاتے پہ لازم ہوا اس کو شرط کیوں بدنے
کہا ہے اس کو بھوپت خاں نے یوں سالے کے باپ نے
کمر سا سر شکم کچھ سوس سے بھی اور بدتر ہے   سرائیں مار آسا ہر غضب مانند اژدر ہے
پتھورا کے محل جو نزد یہ تقان صرصر ہے   وہ جی جیسے کچھوے ناک مینڈک مونہہ چھچھوندر ہے
تو الدالی پہ کہنے سے دل بادل کا کر ضہاوا
تو اس کو بھی نہ کہہ سکتے کہ ہے اس شخص کا باوا
تراشا ہے یہ بھنیا سر عجائب صنع آذر نے   بجا ہے اس کے دروازے پہ کنڈی دیں اگر دھرنے
لگے ہے دو قدم چلنے میں الٹی سانس یوں بھرنے   تیری گرمی مارے بھیسلنے جیسے ہوں ارنے
قیامت نوع انسانی میں الٹا قسم ہے اس کا
بنی آدم میثاق بلیغ اسم ہے اس کا

مناسب ہے بہت سا ہو بنے گو ایسے سنڈے سے   وہ اس کے دست و پائے شبیہ میں شیطاں کے بچھوٹے سے
مشابہ شکل ہے اس کی بھوانی جی کے پنڈے سے   نہ بچا اس طرح سے ہو کبھی ز ققنس کے انڈے سے
ہزاروں طرح کے سر لہرا رہے ہیں غار میں اس کے
نہ کیوں کر چھید پھیرا تنے بھی ہوں منقار میں اس کے
کبھی ہاروت بیٹھا ہے کبھی ماروت کی صورت   نہ لگا کھاوے اس سے دیو کی ادبھوت کی صورت
عرق سے اس کے ٹپکے ہے سوزر کے موت کی صورت   عیاں ہے اس کے اس یک بک سے برج حوت کی صورت
کہا جن نے اُسے ہے یہ ملک لندھور کا بیٹا
خدا بخشے گنہ اس کی غرض ہے وہ بہت خاصا

سالک کے خطوط، ابنِ سالک کے نام

ڈاکٹر عبد السلام خورشید

والدِ مرحوم مولانا عبد المجید سالک کے ساتھ تین ادوار میں مسلسل خط و کتابت رہی۔ پہلے اُن دنوں۔ جب "انقلاب" بند ہونے کے کچھ عرصہ بعد وہ حکومتِ پاکستان کی دعوت پر کچھ عرصہ کراچی میں رہے اور تعمیری موضوعات پر مقالہ نگاری کرتے رہے، دوسرے ان دنوں، جب میں موسم گرما کی چھٹیاں مری میں گذارا کرتا تھا۔ تیسرے اُن دنوں، جب میں یورپ میں رہا۔ دونوں طرف سے خطوط کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ میرے پاس دو سو کے قریب خط موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر نجی اور خانگی امور کا تذکرہ ہے۔ بہرحال بعض خطوط میں ایسی باتیں بھی ہیں۔ جن سے دوسروں کو بھی دلچسپی ہو سکتی ہے اور جن سے اُن کی شخصیت کے بعض پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے خطوط میں سے اقتباسات چُنے ہیں۔ جو اس مقالے میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں جو نام آتے ہیں۔ اُن کے بارے میں کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔ ساحی میرا قلمی نام تھا۔ جس سے میں ۵۲-۱۹۵۱ء میں روزنامہ "احسان" میں ایک مستقل کالم لکھتا تھا۔ جس کا عنوان تھا۔ "ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے"۔ سرور سے مراد پروفیسر محمد سرور جامعی ہیں۔ جو لاہور کے روزنامہ "آفاق" کے مدیر تھے۔ اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں میکش سے مراد مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ہیں۔ جو پنجاب کے نامور صحافی تھے۔ حسرت سے مراد مولانا چراغ حسن حسرت ہیں۔ جن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُس زمانے میں "امروز" کے مدیر تھے۔ "میر صاحب" سے مراد میر نور احمد تھے۔ "مارشل لا سے مارشل لا تک" کے مصنف اور ماہرِ تعلقاتِ عامہ۔ اکرام صاحب سے شیخ محمد اکرام مراد ہیں۔ جو اُن دنوں حکومتِ پاکستان کے سیکرٹری اطلاعات و نشریات تھے۔ اور ایک مصنف کی حیثیت سے بھی اُن کا نام سب جانتے ہیں۔ مقبول الٰہی ان دنوں بیرسٹر ہیں۔ اُس زمانے میں "احسان" کے منیجنگ ایڈیٹر اور شعبۂ صحافت میں میرے طالب علم تھے۔ خواجہ صاحب سے مراد خواجہ شہاب الدین ہیں۔ جو اُن دنوں وزیرِ داخلہ تھے۔ اور احمد صاحب جی۔ احمد ہیں۔ جو وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری تھے۔ وحید اور خلیفہ محمد حسن "انقلاب" کے انتظامی عملے کے ارکان تھے۔ نعیم صاحب مشہور انکم ٹیکس پریکٹیشنر ہیں۔ شفیع سے مراد میاں محمد شفیع (م۔ش) ہیں۔ الطاف حسین "ڈان" کے ایڈیٹر تھے۔ خورشید علی خان سے نواب زادہ خورشید علی خان مراد ہیں۔ جو نواب سر ذوالفقار علی خان کے فرزند تھے۔ ملک صاحب کا مطلب ہے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ۔ کرمانی سے جناب ایوب کرمانی مراد ہیں۔ جو مشہور صحافی تھے۔ عبد الوکیل میرے بہنوئی تھے۔ تمہاری آپا سے مُراد میری والدہ تھیں۔ کیونکہ ہم بہن بھائی انہیں آپا جی کہا کرتے تھے۔ نصرت میری بیوی کا نام ہے۔ نذری میرا لڑکا ہے۔ ریحانہ اور رخشی میری بیٹیاں ہیں۔ محمد امین میرے بہنوئی ہیں۔ جو پبلشرز یونائیٹڈ کے منیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ باقی اسما کی تفصیل یہ ہے:-

چھلاپتی۔ "نیشنل ہیرلڈ" لکھنؤ کے مدیر جنھیں میں نے پیرس کانفرنس میں نیچ کیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیرِ اطلاعات و نشریات تھے۔ جناب محمد شعیب وزیرِ امورِ کشمیر تھے۔ فضلی سے مراد فضل کریم فضلی تھے۔ ندیم (احمد ندیم قاسمی)۔ فیض (فیض احمد فیض)۔ بخاری (احمد شاہ بخاری، پطرس) جو اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب تھے۔ امتیاز (امتیاز علی تاج)۔ عابد علی (عابد علی عابد)۔ خلیل الرحمٰن (مدیر جنگ)۔ قیصر (ملک لال دین قیصر، جو میرے خالو تھے) اقبال (قیصر کے فرزند) رئیس (ایس۔ آر۔ رئیس، نیوز ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ)۔ مجید ملک (پرنسپل انفارمیشن آفیسر، حکومتِ پاکستان) سبطِ فاروق (مدیر معاون ڈان)۔ اوج (حبیب اللہ اوج) خوشتر (خوشتر گرامی۔ مدیر "بیسویں صدی"۔ دہلی) احسن اور محسن (قومی کتب خانہ کے مالک جناب محمد نصیر ہمایوں کے فرزند) سلہری (زیڈ اے سلہری مدیر ٹائمز آف کراچی) حمید الدین (تاریخ کے پروفیسر، جو اب امریکہ میں پڑھاتے ہیں) جہاں جہاں کتابوں کے سیٹوں کی منظوری یا عدمِ منظوری کا تذکرہ ہوا ہے۔ ان سے مراد درسی کتابوں کے سلسلوں سے ہے۔ جن کے لئے اب سے ربع صدی پہلے کھلا مقابلہ ہوا کرتا تھا اور حکومت بہترین سیٹوں کا انتخاب کرکے انہیں رائج کر دیتی تھی۔ اب خطوط کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

تار بھی مل گیا تھا۔ خط بھی مل گیا۔ مجھے میرے پرائمری سیٹ کے مسترد ہونے کی خبر ۱۴ مارچ کو مل گئی تھی۔ ریاض صاحب (خلف شیخ ہمایوں) آئے اور دو دن "نگارہ" میں ٹھہرے۔ انہوں نے بتایا تھا۔ میں نے کہا۔ بھائی یہ تو قمار بازی کا کھیل تھا۔ ہار گئے۔ ہار گئے۔ سچ ہوا لیکن تھوڑی دیر کے لئے۔ تمہارے سیٹ کی منظوری کی مجھے اور تمہاری والدہ کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس لئے کہ تم بال بچے دار ہو۔ اس زمانے میں اگر کوئی اچھی رقم مل گئی اور سلیقے سے صرف کی گئی تو آئندہ زندگی ذرا بے فکری سے گذر جائے گی۔ میرا کیا ہے۔ دو متنفس ہیں۔ تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ جو اللہ کسی نہ کسی طرح پہنچا ہی دیتا ہے۔ آج کل عمریں ہی کون سی لمبی ہیں کہ انسان لمبا فکر کرے، تمہارے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو میرے سیٹ کے مسترد ہونے سے خاص پریشانی ہوئی۔ لیکن اس کی ضرورت نہ تھی۔ تمہارے سیٹ کا منظور ہونا میرے لئے باعثِ فخر اور میرے سیٹ کا منظور نہ ہونا اربابِ اختیار کے لئے باعثِ شرم و ذلت۔ تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔ خدا کرے، تمہارا تاریخ کا سیٹ بھی منظور ہو جائے۔ بہرحال میری طرف سے اور تمہاری والدہ کی طرف سے تم کو اور نصرت کو بہت بہت مبارکباد پہنچے۔

تمہارے لکھنے سے معلوم ہوا کہ مہر صاحب کا صرف ایک پرائمری کا سیٹ منظور ہوا ہے اور شہریت اور تاریخی کہانیوں کا کورس بھی۔ باقی سب کچھ مسترد ہوگیا۔ میری طرف سے ان سے اظہارِ ہمدردی اور افسوس کرنا اور پرائمری سیٹ کی مبارکباد دینا۔ (۲۱ مارچ ۵۱ء)

مہر صاحب کو میں نے انکم ٹیکس کے حساب کے متعلق لکھ دیا ہے کہ خلیفہ محمد حسن کو بلا لیں۔ یا حسابات کے رجسٹر لے کر نعیم صاحب کے ہاں جائیں اور ان سے کہیں کہ حسابات بنوا دیں۔ نعیم ہی اس معاملے میں بہترین مشیر ہیں اور ہمیشہ بلا معاوضہ خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ بے حد تعجب ہے کہ مہر صاحب لاہور میں۔ رجسٹر لاہور میں۔ نعیم لاہور میں۔ وحید شاہ لاہور میں، خلیفہ لاہور میں۔ انکم ٹیکس کا محکمہ لاہور میں۔ میں آٹھ سو میل دور بیٹھا ہوں اور مجھے لکھا جا رہا ہے کہ تم کچھ کرو۔ آخر میں کیا کروں؟ میرے نام نہ انکم ٹیکس والوں کا کوئی نوٹس پہنچا ہے۔ نہ میں نے وصول کیا ہے۔ نہ اس پوزیشن میں ہوں کہ اس کے متعلق کچھ کروں کیونکہ یہاں بیٹھا ہوا ہوں اور میری واپسی کا ابھی کچھ ٹھیک اندازہ نہیں۔ آخر مہر صاحب، تھوڑی سی تکلیف کیوں برداشت نہیں کرتے۔ وحید شاہ لاہور ہی میں ہے۔ شورش

کے ہاں جائیں۔ وہاں وحید شاہ اور خلیفہ کو بلائیں۔ رجسٹر نکالیں۔ نعیم سے ملیں۔ ہر چیز درست ہو سکتی ہے لیکن وہ تو اپنے دولت کدے سے تین میل بھی حرکت نہ کریں اور میں آٹھ سو میل دور بیٹھا ہوا مضطرب رہوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

درسی کتابوں کا سارا جھگڑا میں اخباروں میں پڑھتا رہتا ہوں لیکن سوچتا اور چاہتا کچھ نہیں۔

ہر چہ شد شد۔ ہر چہ باشد باشد۔ (۲، اپریل ۵۱ء)

مہر صاحب کے ساتھ گفتگو کا قصہ معلوم ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ جو مسائل میرے ہوتے ہوئے ایک دو گھنٹوں میں حل ہو گئے ہوتے۔ ان میں کتنی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مہر صاحب حسابات کے متعلق جو کچھ فرماتے ہیں۔ اس کا فیصلہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں، مہر صاحب اور وحید تینوں بیٹھ کر بات کریں۔ لیکن میں محض اس کام کے لئے تو لاہور نہیں آ سکتا۔ البتہ اگر میری یہاں ایک دو کوششیں کامیاب ہو جائیں اور کچھ روپیہ مل جائے۔ جو قرض خواہوں کو دیا جا سکے۔ تو میں چند روز کے لئے ضرور آ سکتا ہوں تاکہ ایک تو حسابات صاف ہو جائیں۔ (۲) میں بعض رقوم کی ادائی اپنے ذمے لوں۔ بعض کی ادائی مہر صاحب پر ڈالوں۔ (۳) اپنے ذمے کی رقمیں کلاً یا جزواً ادا کر دوں۔ (۴) تم لوگوں سے مل لوں۔ دوستوں سے ملاقات کروں۔ گھر کی حالت درست کرنے کا کچھ انتظام کروں اور واپس کراچی پہنچ جاؤں۔

لیکن اگر کسی کو کچھ دیا نہ جا سکے تو میں کیا اس لئے آؤں کہ تمام جمع ہو کر پھر میرا سر کھائیں اور میں ان سے پھر ٹالے بالے کروں اور ان سے چھپتا پھروں اور محض مہر صاحب سے حساب کر کے واپس آ جاؤں۔ مجھے اس بے مقصد سفر کی مصلحت تو محسوس نہیں ہوتی۔ بہرحال میں مہر صاحب کے خط کا منتظر ہوں۔ جب خط آئے گا۔ تو جواب لکھوں گا۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ میں انقلاب کے قرضوں کے سلسلے میں کن کن مصیبتوں میں گھرا رہا ہوں اور اب تک گھرا ہوا ہوں۔ بس میری دعا اور کوشش یہی ہے کہ چند ہزار روپے مل جائیں تو میں قرضوں کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ اس کے بعد ما بخیر و شما سلامت۔ "انقلاب" کے جاری کرنے کا میں خواہاں نہیں ہوں۔ نہ لاہور میں، نہ کراچی میں۔ حالانکہ کراچی میں ایک ہفتے کے اندر اندر انتظام ہو سکتا ہے۔

سرور صاحب دو دفعہ ملے تھے۔ اُن سے مفصل باتیں بھی ہوئی تھیں۔ علمی، ادبی، دینی، ثقافتی مشیری کا معاملہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں مطالب کو سمجھ لینے کے بعد بھی اچھا لکھنے والا نایاب ہے۔ میں اب تک چالیس پچاس آرٹیکل لکھ چکا ہوں۔ جن میں سے کوئی چھتیس چھپ چکے ہیں اور یہ نتائج (بغیر کسی کوشش اور سفارش کے) اکرام صاحب، احمد صاحب اور خواجہ صاحب کے نزدیک بے نظیر اور حیرت انگیز ہیں ورنہ اتنے مضامین کسی پبلسٹی یونٹ کی طرف سے بھی اخباروں کو بھیجے جائیں۔ ان میں سے ایک چوتھائی سے زیادہ شائع نہیں ہوا کرتے۔ اب تین چار ماہ تک تو یہ لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے اور اس کے بعد بھی پچانوے فی صد توقع یہی ہے کہ مزید مدت کے لئے رکھنا چاہیں گے۔ (۶، اپریل ۵۱ء)

مہر صاحب کا خط آ گیا تھا اور میں نے اس کا جواب لکھ دیا تھا۔ میں نے ایک دو جگہ کوشش کر رکھی ہے کہ کچھ روپیہ

ل جائے۔ تو قرضے کی مصیبت ختم ہو لیکن یہ معاملہ کوشش کے کامیاب ہونے پر منحصر ہے۔ اور کوششوں کے انجام کو اکثر بھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ "انقلاب" کو جاری کرنا بالکل بے کار ہے۔ پاکستان میں معیار گر گئے ہیں۔ ہم لوگ اب کامیاب نہیں ہو سکتے بتہ موجودہ معیار پر اتر آئیں۔ تو کامیابی ممکن ہے لیکن وہ کامیابی پستیِ معیار کی ہو گی ہماری نہ ہو گی۔ (۱۲ اپریل ۵۱ء)

کارپوریشن کا نوٹس ملا۔ میرے نزدیک مسلم ٹاؤن کے تمام باشندوں کو چاہیے کہ مسلم ٹاؤن سوسائٹی کی طرف سے اس معاملے ے خلاف احتجاج کریں اور ایک وفد لے کر میاں عبدالصمد چیف ایگزیکٹو آفیسر کے پاس جائیں ان کو صاف کہہ دینا چاہیے کہ تم یہ رقم ادا نہیں کر سکتے۔ جب لوگوں میں ادا کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو کیا کارپوریشن ان کے مکانوں کو قرق کرائے گی؟ یہ سارا صہ ہی خرافات ہے۔ قمر صاحب، ماسٹر فقیر اللہ، میاں محمد صادق، مولوی محمد علی۔ بابو عبدالرحمٰن ایس ڈی او، ڈاکٹر بشیر وغیرہ ضرات کو جلد از جلد اس بارے میں متحدہ یادداشت لکھ کر چیف آفیسر کو بھیجنی چاہیے۔ بلکہ وزارت لوکل سیلف گورنمنٹ کو توجہ دلانی چاہیے کہ اس حکم کو منسوخ کرائے۔ میں خود بھی میاں عبدالصمد کو پرائیویٹ خط لکھوں گا۔ (یکم مئی ۵۱ء)

میں الطاف حسین سے ضرور ملوں گا اور شفیع کے متعلق ذکر کر دوں گا۔ "افقِ آفاق" کا روزنامہ ہونا مشتبہ ہے۔ سرور صاحب تو اس میں شامل ہونے پر آمادہ نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا خط، جو میرے نام آیا ہے۔ یہی ظاہر کرتا ہے۔ بہرحال الطاف حسین سے ذکر ضرور کروں گا۔ بلکہ مجید ملک صاحب سے بھی کہلوانے کی کوشش کروں گا۔

"تاریخِ اسلام" کے متعلق افسوس ہے۔ لیکن اس میں بھی وہی قصہ ہوا۔ کہ ڈاکٹر عنایت اللہ اور سرور جیسے لوگوں کی تاریخیں مسترد ہو گئیں۔ حالانکہ ڈاکٹر عنایت اللہ ہی سلیبس کے مصنف تھے۔ تمہاری تاریخ کے منظور رہنے کی بے حد خوشی ہوئی۔ چلو۔ دو چیزیں ہو گئیں اور انشاء اللہ چند سال تک کے لیے آمدنی کا اچھا ذریعہ پیدا ہو گیا۔ اللہ اپنا فضل رکھے۔ صحت تندرستی قائم رہے۔ تمہاری آپا بھی بہت خوش ہیں اور بہت بہت مبارکباد دیتی ہیں۔

حسرت صاحب کو فون کر کے "تاریخِ اسلام" کی تعزیت کرو۔ اور کہو کہ انہوں نے اب تک نہ حالی والے روپے بھیجے ہیں نہ سرگزشت کے۔ حالانکہ انہوں نے لکھا تھا کہ میں ہفتے بھر کے اندر بھیج دوں گا۔

خورشید علی خان کو فون پر میرا اسلام پہنچا دینا اور کہنا کہ میں نے آپ کو جو خط لکھا تھا۔ اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے پوچھا تھا کہ ملک صاحب کب تک ولایت جا رہے ہیں اور جب روانہ ہوں تو مجھے ضرور اطلاع دی جائے۔ تاکہ یہاں ان سے مل لوں۔

(۸ مئی ۵۱ء)

آج تم نے تاریخِ اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا۔ اس سے اطلاع ہوئی۔ میں دستی صاحب کو بالکل نہیں جانتا۔ ان کی صورت کا بھی واقف نہیں ہوں۔ پھر میرا تار یا خط کیا معنی رکھے گا۔ بہرحال آج دستی صاحب کو تار دے دوں گا پھر جو خدا کو منظور۔ (۱۱ مئی ۵۱ء)

ممتاز احمد خان کو میرا نہایت مخلصانہ سلام پہنچا دینا۔ وہ بہت محبت پرور دوست ہیں۔ اُن سے کہہ دیجئے کہ میں خود لاہور واپس آنے کے لئے مضطرب ہوں۔

چونکہ سرگزشت کی کئی قسطوں کے پیسے امروز والوں نے باوجود میرے تقاضوں کے نہیں بھیجے۔ اور حالی کی مسدس پر کچھ لکھنے کے تین سو روپے بھی اُن کی طرف بقایا ہیں اور حسرت صاحب نے میرے خط کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لئے آج میں نے "ایڈیٹر صاحب امروز" کو اطلاع دے دی ہے کہ مزید قسطیں نہیں بھیجی جائیں گی۔ جب تک واجب رقمیں بے باق نہیں کی جائیں گی۔ ذرا حسرت صاحب کو فون کر کے پوچھو کہ معاملہ کیا ہے کم ازکم وہ خط کا جواب تو دیں۔ (۴؍جون ۵۱ء)

سرگزشت میں جو کچھ "زمیندار" والوں کے متعلق آنا تھا۔ وہ تو آچکا۔ اب کیا آئے گا؟ یہ تو تاریخ ہے۔ اس کے واقعات سے کسی کو تکلیف ہو تو مورخ کا کیا قصور؟۔ چودھری غلام حیدر خان نے اپنے جواب میں دو تین چیزیں بالکل غلط لکھی ہیں۔ لیکن چونکہ میں سرگزشت کے مندرجات کے متعلق کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس لئے خاموش ہوں۔ حسرت صاحب کا کوئی خط تا ایں دم نہیں آیا۔ لیکن تمہارے لکھنے پر میں نے ارادہ کر لیا ہے۔ کہ کل یا پرسوں مزید قسطیں سرگزشت کی لکھ کر بھیج دوں۔

یہاں بیٹھے ہوئے مجھے بعض اوقات واقعات کی تاریخوں کے متعلق پریشانی ہو جاتی ہے۔ آخر حافظہ کہاں تک کام دے سکتا ہے۔ تم ذرا تکلیف کرو۔ مہر صاحب کی طرف جاؤ اور "انقلاب" کے پہلے دو چار فائل نکلواؤ۔ ورق گردانی کرنی پڑے گی۔ لیکن "تاریخوں کو یاد کرنے میں مہر صاحب ضرور تمہاری مدد کریں گے۔ مثلاً میں چاہتا ہوں کہ معلوم کروں۔ انقلاب افغانستان ۱۹۲۹ء کے کس مہینے میں واقع ہوا۔ سائمن کمشن کب آیا۔ نہرو رپورٹ کن دنوں میں مرتب ہوئی۔ میاں فضل حسین۔ والد مرحوم، والدہ مرحومہ، مشتاق مرحوم، رؤف مرحوم، مولانا محمد علی، ڈاکٹر اقبال۔ سکندر حیات کے انتقال کی تاریخیں۔ وحیدہ کی شادی۔ رشید سلام کی شادیاں۔ رشیدہ کی شادی حمیدہ کی شادی کی "تاریخیں۔ احمد شاہ بخاری صاحب کب ولایت گئے اور کب واپس آئے۔ یہ موٹی موٹی باتیں معلوم کر کے جلد از جلد لکھو۔ کوئی تفصیلات مطلوب نہیں۔ صرف تاریخیں۔ باقی میں خود یاد کر لوں گا۔

ریڈیو پر ہر جمعرات کو سوا آٹھ بجے شام "افکار و حوادث" ہوتے ہیں۔ اور ہر جمعہ کو سوا نو بجے میں "دانش کدہ" کا میر سوال بنتا ہوں، بڑے بڑے ذی علم آدمی آتے ہیں۔ جن سے سوال کر کے فی البدیہہ جوابات طلب کئے جاتے ہیں۔ (۱۱؍جون ۵۱ء)

میں تم لوگوں سے جدا ہو کر دن بھر گرمی کھاتا خاک پھانکتا ہوا کل صبح کراچی پہنچ گیا۔ رستے میں کچھ امرتسری نوجوان ہم سفر تھے وہ بہت خدمت تواضع کرتے آئے اور چودھری فخر الدین صاحب کے آم بھی کھاتے رہے۔ شام کو جب خان پور پہنچے۔ تو سید عنایت حسین ایم اے میرے لئے کھانا لائے ہوئے تھے۔ پلاؤ۔ چوزہ مرغ۔ سبزی۔ فیرنی۔ چونکہ اس وقت میں کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لئے کھانا ایک ہم سفر کے ناشتہ دان میں بھر لیا اور برتن واپس کر دیئے۔ رحیم یار خان پہنچ کر میں نے اور ایک نوجوان ظہیر الدین آفندی پسر سردار عبدالقادر آفندی پسر امیر ایوب خان (کابل) نے وہ کھانا بہت لطف سے کھایا۔ یہ ظہیر الدین آفندی

ماڈل ٹاؤن میں عطاءالرحمٰن کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ عبدالوکیل کو جانتے ہیں اور بہت شگفتہ طبع آدمی ہیں . . . . .

مجید ملک ابھی بیمار ہیں۔ آج ان کی طرف بھی جاؤں گا۔ دو مضمون آج لکھ کر دفتر بھیج دیئے ہیں۔ اکرام صاحب سے کل ملاقات کروں گا۔ اور حسرت، کرمانی، سرور، مہر اور تمہارے متعلق بات چیت ہوگی۔

شورش کو تاکید کر کے اُن سے فائلیں ضرور منگا لو۔ ورنہ مہر صاحب منگا لیں گے۔ اپنا فائل مکمل کر کے باقی فائل (متفرق) الگ کر دینا اور مہر صاحب کو موقع دینا کہ اپنا فائل مکمل کر لیں۔ باقی زائد فائل تقسیم کر لئے جائیں۔ شورش سے کہنا کہ اپنے فائل مکمل کرنے کے بعد ہم زائد فائلوں میں دو چار آپ کو دے دیں گے عارضی طور پر۔ تاکہ آپ ان سے بشرطِ ضرورت استفادہ کر سکیں۔ (۱۳ر جولائی ۔ ۵۱ء)

تمہارے سر درد کا حال سن کر فکر ہوا میرا خیال ہے۔ نزلے کا اثر ہوگا۔ بہر حال اکسیرِ اوجاع تو اُس وقت تک کھانی چاہیے جب تک درد باقی ہو یا اس کے عود کر آنے کا اندیشہ ہو۔ البتہ خمیرہ گاؤ زبان بہت اچھی چیز ہے۔ اس کی خوراک حکیم صاحب سے تجویز کرا کے روزانہ بلاناغہ کھانی چاہیے۔ اور دو تین مہینے مسلسل کھانی چاہیے۔ اس سے دماغ کو تقویت ہوگی۔ نزلے کا اثر جاتا رہے گا اور اعصاب پر اچھا اثر پڑے گا۔

نواب زادہ خورشید علی خان کو اس وقت خط لکھوں گا۔ جب ان کے ایک دو کاموں کے متعلق کچھ کر لوں گا۔ یہاں کے سرکاری افسروں کی یہ حالت ہے کہ میں ۱۳ر کو یہاں پہنچا تھا۔ خواجہ صاحب اور رجی احمد سے تو رات ریڈیو سٹیشن کے افتتاح پر کھڑے کھڑے مختصر ملاقات بھی ہو گئی۔ لیکن اکرام صاحب ابھی تک نہیں مل سکے۔ آج پانچ بجے جانے کا ارادہ ہے۔ مجید ملک ابھی صاحب فراش ہیں۔ ان کی کوٹھی پر اُن کو دیکھنے گیا تھا۔ لیکن ابھی وہ دفتری قسم کی بات کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

مجھے ایک طرف "نوائے وقت" والوں کا تار آیا ہے کہ "سرگزشت" آئندہ ہمارے لئے لکھئے۔ آپ کی جو شرائط ہوں گی۔ منظور ہوں گی۔ دوسری طرف سرور صاحب کا خط آیا ہے کہ "آفاق" کے لئے سرگزشت لکھو۔ سوچ رہا ہوں کہ کس کے ساتھ فیصلہ کروں۔ "نوائے وقت" کی اشاعت بہت زیادہ ہے۔

"امروز" کو آج کل کون لوگ ایڈٹ کرتے ہیں۔ میں نے اس دن کے بعد "امروز" کا پرچہ نہیں دیکھا۔ کیونکہ یہاں وہ آتا ہی نہیں۔ حسرت صاحب کے متعلق اکرام صاحب سے بات ہو جائے تو ان کو چٹھی لکھوں۔ اس سے قبل لکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔

(۱۷ر جولائی ۵۱ء)

میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ سرگزشت "جہاد" کے لئے لکھوں گا۔ (نوائے وقت بند ہونے کے بعد حمید نظامی کے اخبار کا نام) اور آج حمید نظامی کو خط بھی لکھ دیا ہے کہ دو تین روز تک ایک دو قسطیں بھیج دوں گا۔ نظامی تو کہتے تھے کہ افکار بھی لکھیے۔ میں نے ٹال دیا کہ لاہور آ کر دیکھا جائے گا۔ "شرائط" وہی دس روپے کالم۔ حسرت خوب ہیں کہ "آفاق" اور "جہاد" دونوں میں لکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تو چار دن کی بات ہے۔ یہاں اُن کی ملازمت بہ سلسلہ ریڈیو کا فیصلہ ہو چکا ہے وہاں حسرت صاحب گورمانی سے بھی بات کر آئے ہیں اور اپنی پبلسٹی سکیم بھی دے

آئے ہیں - دیکھیں - وہ راولپنڈی جاتے ہیں یا کراچی آتے ہیں - پھر یہ سب حرف و حکایت "ختم ہو جائے گی" - "آفاق" کی اشاعت بڑھ رہی ہوگی - لیکن اب تک روپیہ کافی نہیں ہوگا - یہ اخبار ہرگز نہ چلے گا - ان سے اپنے مضامین کے پیسے وصول کر لینے چاہئیں - مولانا صلاح الدین صاحب سے پوچھئے کہ وہ کون سا کلام ہے جو میں نے اُردو کانفرنس میں پڑھا تھا؟ اُردو کانفرنس میں تو کوئی مشاعرہ نہیں ہوا - نہ نظمیں پڑھی گئیں - وہ اُس کلام کا اتا پتا بتائیں - تو میں فوراً بھیج دوں گا - "شہریت" کا حساب معلوم ہوا - خیر - اس سے زیادہ توقع بھی نہیں تھی - تاریخ اسلام میں شاید اس سے دگنے پیسے آ جائیں اور یہ بھی چلو غنیمت ہے - تمہیں بھی پبلشروں کی طرف سے رقم مل گئی ہے یا نہیں - وہ وصول کر لینی چاہیے - خمیرہ گاؤزبان بطورِ خاص بنوا کر اپنے پاس رکھو اور روزانہ کھایا کرو - یہ دماغ کے لئے ، دردِ سر ، نزلہ وغیرہ ہر چیز کے لئے مفید ہے بشرطیکہ اچھا بنا ہوا ہو - (۲۴؍ جولائی ۵۱ء)

پیسے واقعی اس دفعہ بہت کم آئے ہیں - قومی کتب خانے کی ریڈروں ، سرحد کی شہریت ، پنجاب کی شہریت اور تاریخ اسلام سب ملا جلا کر بھی مجھے پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے - غالباً یہی حالت تمہاری ہوگی اور پھر تم سابقہ روپے میں سے کافی روپیہ خرچ بھی کر چکے ہوگے - اس دفعہ خلافِ توقع اتنی کم رقم آنے سے بہت رنج ہوا لیکن کیا کیا جائے؟ قیوم صاحب سے میں نے بات کی تھی - کمشن میں اُن کا معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے - اب وہ باقاعدہ تین ماہ کا نوٹس دے کر مستعفی ہو رہے ہیں - غالباً اس کے بعد یونیورسٹی والے اشتہار اور انٹرویو اور تقرر کی منزلیں طے کریں گے - (۱۸؍ جولائی ۵۲ء)

سامی کا کالم باقاعدہ پڑھتا ہوں - ہمیشہ اچھا ہوتا ہے - تنقید لکھ بھیجوں گا - ذرا احسان کے پرچے جمع کر لوں - سرور صاحب کئی دن سے لاہور جا چکے ہیں - تعجب ہے کہ اب تک تم سے نہیں ملے - میکش صاحب آفاق میں آ جائیں - تو اچھا ہے - ذرا دیکھنا ہیں رہنا پڑے گا - حسرت استعفیٰ دے چکے ہیں - ابھی فیصلہ نہیں ہوا لیکن وہ نوائے وقت میں باغ و بہار کا کالم لکھ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب تک نوائے وقت کراچی سے بھی جاری ہو جائے - (۲۸؍ اپریل ۵۲ء)

سرور میکش کے آنے سے بہت مضطرب ہیں - حقیقت یہ ہے کہ سرور کے لئے میر صاحب نے زندگی وبال کر دی ہے - خدا کرے کوئی بہتر صورت نکلے - میں آج اکرام صاحب سے بات کر رہا ہوں - ہاں - ذرا سرور صاحب سے بتاکید کہہ دینا کہ مضامین ذرا تیزی سے شائع کر دیا کریں - آفاق کا موجودہ روپیہ میرے لیے کافی اطمینان بخش نہیں - مقبول الٰہی سے بھی کہہ دینا کہ سنڈے جو کاربن کاپی مضمون کی آتی ہے وہ ضرور درج کر دیا کریں - پہلے بھی احسان میں کافی چیزیں چھپ رہی ہیں لیکن رفتار زیادہ سریع ہونی چاہیے - حسرت نے یکم سے نوکری چھوڑ دی - آج میں اور تمہاری آپا شام کا کھانا ان کے ہاں کھانے جا رہے ہیں - اب کچھ نوائے وقت کچھ اجرت کا کام ، کچھ کراچی کے سکولوں کے لئے ریڈریں - ان میں میں اُن کا شریک نہیں ہوں - مظفر حسین شمیم (جو پاکستان کے ایجوکیشنل ایڈوائزر کے بھائی ہیں) گزارا ہوتا رہے گا - (۵؍ مئی ۵۲ء)

خط ملا تھا۔ میں ذرا آج کل "اکابرِ ملت" کے خطباتِ سالگرہ کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ اس لئے جواب جلد نہ دے سکا۔ ہِٹی کے ترجمے کا مسودہ مع اصل بھیج دو۔ بڑی احتیاط سے رجسٹرڈ پارسل (A.D) کر کے بھیجنا۔ میں فراغت کے بعد اس کو دیکھ لوں گا۔ اور دیباچہ بھی لکھ دوں گا۔ (۷/ اگست)

دونوں خط مل گئے۔ مسودہ بھی مل گیا۔ اس کو دیکھ رہا ہوں۔ چند روز میں فارغ ہو کر واپس بھیج دوں گا۔ اخباری نمائش کے متعلق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے ضرور ذکر کروں گا اور انہیں افتتاح پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ پچھلے دنوں مجھے ۱۴/ اگست کی تقریب وغیرہ کے سلسلے میں بہت مصروفیت رہی اور ڈاکٹر قریشی سے بھی اکثر ملاقاتیں رہیں۔ اب کل پرسوں ان سے پھر ملوں گا۔ اور بات چیت کروں گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اکرام صاحب اس ماہ کے آخر میں بیرونِ پاکستان جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر وہ اکتوبر تک واپس آ گئے۔ تو افتتاح ممکن ہوگا۔ ورنہ خیر۔ (۱۴/ اگست)

میں نے ڈاکٹر اشتیاق قریشی وزیرِ اطلاعات کو آمادہ کر لیا ہے کہ وہ لاہور میں آ کر نمائشِ اخبارات کا افتتاح کریں۔ وہ سوئٹزرلینڈ گئے ہیں۔ غالباً ۱۵/ ستمبر تک واپس آ جائیں گے۔ اس کے بعد تم اُن کو باقاعدہ دعوت دینا اور نمائش کی متوقع کیفیت اور اس کی تاریخوں وغیرہ سے مطلع کر کے مجھے بھی لکھ دینا۔ تاکہ میں دوبارہ یاددہانی کر کے منظوری بھجوا دوں۔ ہِٹی کی کتاب کا ترجمہ دیکھ رہا ہوں اور فقرہ بہ فقرہ مقابلہ کر کے اصلاح کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام لمبا ہے۔ اب تک تمہارے ترجمے کے ساٹھ صفحے دیکھ چکا ہوں۔ چالیس پچاس باقی ہیں۔ تین چار دن میں یہ بھی ہو جائیں گے۔ پھر مکمل ترجمہ بھیج دوں گا۔ (۲۶/ اگست)

مسودہ بذریعہ رجسٹری آج بھیج رہا ہوں۔ اس میں جہاں جہاں میں نے تصحیح کی ہے۔ اس کو ذرا غور سے دیکھ لینا۔ بعض مقامات پر لفظوں اور فقروں کے ترجمے میں غلطی ہوئی ہے۔ بعض جگہ لفظوں کی املا صحیح نہیں تھی۔ بعض مقامات پر ترجمے کا انداز بالکل انگریزی کا چربہ معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال جہاں تک ممکن ہوا۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اب یہ مسودہ پبلشر کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اس پر کسی دیباچے وغیرہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آخر محض ترجمہ ہی ہے۔ کوئی طبعزاد چیز تو ہے نہیں۔ میں نے بڑی مصروفیت کی حالت میں اس کام کو ختم کیا ہے۔ ایک ترجمہ میرے زیرِ قلم بھی تھا۔ اس کو ملتوی کیا۔ ندیم کا مجموعۂ کلام آیا تھا۔ اس کو بھی بالائے طاق رکھا۔ ریڈیو کے لئے ایک فیچر اور "ماہِ نو" کے لئے ایک مضمون لکھنا تھا۔ وہ بھی التوا میں ڈالا۔ اب تمہاری کتاب سے فارغ ہونے کے بعد ان کاموں کی طرف متوجہ ہوں گا۔ (۲۹/ اگست)

مجید لاہوری "نمکدان" نکال رہے ہیں۔ لیکن اب پندرہ روزہ ہے۔ پہلے ماہوار نکالتے تھے۔ تم نے جو "تماشا" (احسان بی میرا مستقل کالم) خلیل الرحمان کے متعلق لکھا تھا۔ وہ مجید نے "جنگ" میں نقل کیا تھا کیونکہ مجید "جنگ" میں حرف و حکایت کا کالم روزانہ

لکھتا ہے۔ "نمکدان" بھیجنے کے لئے کہہ دوں گا۔ دوسری کتاب کا مسودہ جلد بھیج دو۔ ورنہ میں پھر "واقفیتِ عامہ" میں مصروف ہو جاؤں گا۔
(۱۵ ر ستمبر)

زلزلے کی کیفیت سن کر بہت شکر کیا۔ کہ اللہ نے خیریت رکھی۔ یقیناً اس حالت میں تم لوگ سخت پریشان ہوئے ہوگے۔ خیر اللہ آئندہ خیر و عافیت رکھے۔ تمہارے کمروں کے کونوں میں جو باریک دراڑیں ہیں۔ وہ باعثِ تشویش نہیں۔ یہ نقص ہماری کوٹھی کے اکثر کمروں میں تعمیر کے وقت ہی سے چلا آتا ہے۔ آخر نوکری میں کون سا پیچ پڑ گیا ہے، جس کی وجہ سے تنخواہ نہیں مل رہی۔ وائس چانسلر تو تمہارے بہت قدردان ہیں پھر یہ دقت کیوں ہے؟ (۲ ر جنوری ۵۴ء)

مجھے یہی معلوم ہوا ہے کہ لاہور کے دولتانی اخبارات کو کوئی ہدایت دی جا چکی ہے جس کے ماتحت وہ مضامین درج نہیں کر رہے ہیں۔ خیر۔ اس کی پروا نہیں۔ (۲۴ ر فروری)

ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا اقبال کی شادی واقعی ۵ ر اپریل کو ہو سکے گی۔ اگر مارشل لاء رہا۔ تو کیا شادی بخوبی ہو سکے گی؟ میرا خیال ہے کہ ابھی قیصر صاحب نے دعوت نامے جاری نہیں کئے۔ اگر مارشل لاء رہے تو شادی ضرور ملتوی کرنی چاہیے۔ آئندہ اختیار بدستِ مختار۔ اب صورت یہ ہے کہ بخاری صاحب کے دوسرے لڑکے کی شادی غالباً ۲۵ ر اپریل کو ہوگی۔ میں تو جان چھڑاتا ہوں لیکن بھابی سخت مصر ہیں کہ جب بخاری صاحب نیویارک سے نہیں آ سکتے تو پھر آپ کے سوا اور کون ہے جس کی نگرانی میں شادی ہو۔ اس لئے آپ ضرور چلئے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر اقبال کی شادی ہفتہ بھر آگے بڑھ جاتی اور دونوں شادیاں قریب آ جاتیں۔ تو میں دس دن کے لئے لاہور چلا جاتا۔ اب یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ میں پورا اپریل لاہور ہی میں رہوں۔ بہرحال جو مرضیِ مولا۔ میں اقبال کی شادی پر یعنی ۵ ر اپریل کو تو لاہور نہیں آ رہا ہوں۔

سرور صاحب نے غالباً اب تک "انقلاب" کے اقتباسات لے لئے ہوں گے۔ یہاں کام جاری ہے۔ مضامین، پمفلٹ پوسٹر، ہینڈ بل، ریڈیو۔ لیکن اربابِ حکومت تامل کرتے ہیں۔ بھرپور پبلسٹی سے گھبراتے ہیں۔ مصلحت اندیشیاں کرتے ہیں۔ خیر۔ ہم تو اپنا فرض بوجہِ احسن ادا کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو مضامین وغیرہ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ کراچی میں "جنگ" اور "انجام" کوئی مثبت پبلسٹی دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ناچار "اقبال"۔ "نئی روشنی"۔ "مسلمان"۔ "عصرِ جدید" وغیرہ سے کام لیا جا رہا ہے۔ اور میری کیفیت یہ ہے کہ میں لے یہ اخبارات کبھی دیکھے بھی نہیں۔

مولانا مولوی محمد ابراہیم علی صاحب چشتی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق صرف غالب کا شعر پڑھ کر بغرضِ احتیاط خاموش ہوتا ہوں ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے (۲۱ ر مارچ)

انٹرویو کی کامیابی سے مجھے اور تمہاری آپا کو بے حد خوشی ہوئی ۔ ہم کئی دن سے فکر میں تھے اور ہمیشہ تمہاری کامیابی کی دعا مانگتے تھے ۔ غالباً سنڈیکیٹ نے اب تک اس کو منظور کرلیا ہوگا ۔ جن لوگوں نے نوٹس کی مدد کی ۔ ان کے خلاف شکایت نہ ہونی چاہیے ۔ یہ ضروری نہیں کہ اُن سب نے تمہارے خلاف عناد کی وجہ سے ایسا کیا ہو ممکن ہے ۔ وہ اپنے تعلقات نباہنے کے لئے یہ کوشش کر رہے ہوں اور اس میں ہر انسان معذور ہوتا ہے ۔ نذر احمد کا معاملہ خاص ہے ۔ اُس سے کبھی خیر کی توقع کسی کو بھی نہ رکھنی چاہیے ۔ خورشید کی اس نے مخالفت کی اور نوٹس کو اُس کی حمایت کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی لہٰذا وہ ہر شخص کے لئے مضر ہے ۔ (۸ر اپریل)

خدا کرے ۔ تمہاری تنخواہ کا فیصلہ خاطر خواہ ہو جائے ۔ یہ بالکل صحیح ارادہ ہے کہ اب عمر بھر "ہیڈ" ہی رہنا ہے ۔ میں نے اس خاندان میں اخبار نویسی شروع کی ۔ تم نے جاری رکھی ۔ بلکہ استادی اختیار کی ۔ اب آئندہ پچاس سال تک یہ کیفیت رہے گی کہ زیادہ تر اخبار نویس ہمارے ہی خاندان کے صحبت یافتہ یا شاگرد ہوں گے ۔ یہ کوئی معمولی شرف نہیں ۔ اس شرف کو باقی رکھنے اور آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ ریحانہ ، تنویر اور رخشی کو بھی کسی نہ کسی طرح صحافت ہی سے وابستہ رہنا چاہیے ۔ (۲۴ر مئی)

تنخواہ کی ترقی کے التوا سے افسوس ہے لیکن خیر ۔ وقت آنے پر سب کچھ ہو جائے گا ۔ اسلامی ملکوں کے اخباروں کی نمائش کا خیال اچھا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ وہاں سے مرکزی حکومت کے نام چٹھی ضرور لاؤ ۔ گو بہ حالتِ موجودہ مجھے امداد کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی ۔ یہاں سے اسلامی ملکوں کے اخباروں رسالوں کے متعلق معلومات اپ ٹو ڈیٹ ضرور مل جائیں گی ۔ (۷ر جون)

آج خط لکھنے کی ضرورت یوں پڑی کہ وزیرِ تعلیم ایک سیلکشن کمیٹی بنا رہے ہیں یعنی ایک ایسی مجلس جو یونیورسٹی کے لئے پروفیسروں کے انتخاب میں مدد دے سکے ۔ دوسرے لوگوں کو وہ تجویز کر چکے ہیں ۔ اب پنجاب سے ایک فارسی کا اور ایک تاریخ کا اچھا تجربہ کار پروفیسر مطلوب ہے ۔ اب ذیل کے سوالوں کا جواب دو ۔ اور اگر ضرورت ہو تو ایس اے ۔ رحمان صاحب سے بھی پوچھ لو ۔ اُن کو زیادہ بہتر معلومات ہوں گی ۔

۱۔ کیا ڈاکٹر عنایت اللہ عربی کے پروفیسر ہیں یا تاریخ کے ؟
۲۔ کیا ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اب تک ریڈر ہی ہیں یا پروفیسر بن چکے ہیں ؟
۳۔ لاہور میں فارسی کا سب سے زیادہ تجربہ کار اور سینئر اور تاریخ کا سب سے زیادہ تجربہ کار اور سینئر پروفیسر کون ہے ؟

یاد رہے کہ لکچرار اور ریڈر وغیرہ نہیں ۔ بلکہ پروفیسر مطلوب ہیں ۔ اس خط کا جواب فی الفور یعنی آج ہی سب کچھ دریافت کرنے کے بعد لکھ دو تاکہ میں وزیرِ تعلیم کی خدمت میں نام تجویز کر سکوں ۔ (۷ر جولائی)

ایک خط میں نے لکھا تھا کہ پنجاب میں تاریخ اور فارسی کے ممتاز پروفیسروں کے نام مطلوب ہیں ۔ اس کا جواب ابھی تم نے نہیں دیا ۔ فیروز کی درخواست کے متعلق ڈاکٹر اشتیاق قریشی سے بات چیت کروں گا ۔ پروفیسر حلیم (اے ۔ بی ۔ اے حلیم) آج کل سمندر پار

گئے ہوئے ہیں۔ شاید ہفتے ڈیڑھ ہفتے میں واپس آئیں گے۔ اس وقت ان سے بھی بات کروں گا۔ نمائش کے متعلق بھی مجید ملک سے پوچھوں گا۔ کرمانی صاحب کے متعلق تم نے اخباروں میں پڑھ لیا ہوگا۔ وہ تین منزل سے گر پڑے یا بہ نیت خودکشی کود پڑے۔ اب ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ حالت ایسی ہے کہ بچ بھی گئے۔ تو کہیں تین مہینے میں ٹھیک ہوں گے۔ اور ابھی کچھ معلوم نہیں کہ اس واقعہ یا اس اقدام پر پولیس کا نقطۂ نظر کیا ہو۔ (۲ر جولائی)

دونوں خط ملے۔ پروفیسروں کے متعلق میں نے وزیر تعلیم کو ساری صورتِ حالات بتا دی ہے۔ آئندہ جو ان کی مرضی ہوگی۔ وہ کریں گے۔ مجید ملک صاحب نے کہا ہے۔ کہ سلام صاحب سے کہہ دیجئے کہ روپیہ تو ملنے کی کوئی صورت نہیں البتہ باقی امور کے لئے سفارتوں وغیرہ کو ہدایات دے دی گئی ہیں اور جو چیزیں ہمارے بس کی ہوں گی۔ ان کے مہیا کرنے میں کوتاہی نہ کی جائے گی۔

قاضی عبدالغفار کا خط آیا تھا۔ انہوں نے تمہاری کتاب کی اور تمہاری جذبۂ ہدیہ کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کتاب میں مزید اضافے ممکن ہیں۔ جو یہاں کرا لئے جائیں گے۔ قاضی صاحب نے میرے مطالعہ کے لئے اپنی ایک تازہ کتاب "حیاتِ اجمل" بھی بھیجی ہے۔ جو پڑھ چکا ہوں۔ اور آج قاضی صاحب کو خط بھی لکھ رہا ہوں۔ (۱۸ جولائی)

(نوٹ: میں نے والدِ مرحوم کے توسط سے اپنی قبل از آزادی مطبوعہ تالیف "اردو کے ہندو شعرا" کی اشاعت کے حقوق برائے ہندوستان انجمن ترقی اردو ہند کو بلا معاوضہ پیش کر دیئے تھے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اسی جذبۂ ہدیہ کی تعریف فرمائی تھی۔ خورشید)

مختصر خط ملا۔ تسخیرِ قدرت کے متعلق کوئی مواد سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے ابھی کتابیں لکھنے میں ابتدا بھی نہیں کی۔ بارشوں نے حواس بگاڑ رکھے ہیں۔ میں نے جب تسخیرِ قدرت کا عنوان دیکھا تھا۔ تو اس وقت میرے ذہن میں اس کے مواد کا ماخذ بالکل نہیں آیا تھا۔ نہ اب تک آیا ہے۔ میرے خیال میں پانی، بھاپ، بجلی اور ایٹم وغیرہ کے قوائے قدرت کو قابو میں لا کر انسان جو ہزاروں کام لے رہا ہے اور قدرت کی دوسری طاقتوں کو بھی قابو میں لانے کے لئے شبانہ روز محنت کر رہا ہے۔ اس کا ذکر ذرا دلچسپ اور آسان پیرائے میں کر دیا جائے۔ تو بالکل ٹھیک ہوگا۔ اس کے لئے کسی خاص مواد کی کیا ضرورت ہے؟ مواد تو وہاں چاہیے۔ جہاں قوائے قدرت کی تسخیر کے سلسلے میں کچھ سائنٹفک تفصیلات پیش کرنی ہوں۔ یہاں چوتھی، پانچویں میں اس کی کیا گنجائش ہے۔ بچوں کو سادگی سے بتا دینا چاہیے کہ انسان کون کون سے قوائے قدرت کو تسخیر کر کے کیا کیا کام کر رہا ہے؟ (۸ر اگست)

درسی کتابوں کے متعلق میں نے ابھی کام ہی شروع نہیں کیا۔ مواد نہیں ہے اور بارشوں نے طبیعت پست کر رکھی ہے۔ خیال ہے کہ ایک دو روز تک شروع کر دوں۔ حضرت صاحب بھی کریں اور پندرہ دن کے اندر "واقفیتِ عامہ" کی دونوں کتابیں مکمل کر دی جائیں تاکہ میں لاہور جاتے ہوئے مسودہ ساتھ لے جاؤں۔

دینِ محمدی والوں کی حالت عجیب ہے۔ اس دفعہ میں نے فروری میں تاریخِ اسلام اور شہریت (پنجاب) اور شہریت سرحد کے حساب میں صرف ایک سو سات روپے وصول کئے۔ اتنے ہی حسرت صاحب نے۔ اب لکھا کہ حساب بھیجو۔ تو جواب آیا کہ کتابیں تو فروخت ہی نہیں ہو رہی ہیں۔ جب کچھ فروخت ہو جائیگی حساب بھیج دیا جائیگا یعنی جماعت بندی کے موقع پر شہریت پنجاب میں نہ سرحد میں فروخت ہوئی۔ میں نے کوشش کر رکھی ہے کہ مجھے لاہور میں رہ کر کام کرنے کی اجازت مل جائے۔ اگر دو تین ماہ میں بھی کامیابی ہو گئی تو میں لاہور پہنچ جاؤں گا۔ (۱۱ اگست)

میں نے سبطِ فاروق سے کہہ دیا ہے کہ ”ڈان“ کا وہ پرچہ تم کو بھجوا دیں۔ جس میں مجھ پر ابنِ انشا کا مضمون اور تمہارا لوک ناچ والا مضمون چھپا ہے۔ ابنِ انشا کے متعلق میں بھی کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن وہ پنجابی نوجوان ہیں۔ پہلے ریڈیو میں تھے۔ اب سنٹرل اسمبلی کے دفتر میں ہیں۔ شاعر بھی اچھے ہیں اور اردو و انگریزی میں مضمون نگاری بھی خاصی کر لیتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج کے قاضی اسلم صاحب کل اتفاق سے بیچ لگژری ہوٹل میں مل گئے جہاں جماعتِ احمدیہ کراچی نے ”حضرت صاحب“ کے اعزاز میں کوئی پانسو آدمیوں کو پارٹی دے رکھی تھی۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ سلام نے دو لڑکوں کی داخلے کیلئے لکھا ہے۔ اس لئے میرا ایک خط آپ کے پاس پہنچے گا۔ ذرا خاص توجہ فرمائیے گا۔ کہنے لگے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا۔ ضرور کر دوں گا۔

حسرت صاحب کا کچھ ٹھیک پتہ نہیں۔ خدا جانے کب لاہور جاتے ہیں لیکن لیکچروں وغیرہ کے لئے وہ غالباً آمادہ نہ ہوں گے۔ کیوں کہ وہ اس کینڈے کے آدمی نہیں ہیں۔ مالی منفعت ہے ہی نہیں۔ اور نوجوانوں کو اپنی معلومات سے فائدہ پہنچانے کا جذبہ کاملاً مفقود۔ پھر وہ لیکچروں کی زحمت گوارا کریں گے تو کیوں؟ (۲۰ اگست)

سبطِ فاروق اکثر آتے ہیں ابھی بیٹھے تھے۔ وہ اردو زبان و ادب کے متعلق کچھ مضامین ”ڈان“ میں مختلف آدمیوں سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشورے کے لئے آئے تھے۔ میں نے چند موضوع اور ان کے لکھنے والے تجویز کر دیئے ہیں۔ عابد علی، امتیاز، حمید احمد خاں، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ وقار عظیم۔ ابواللیث۔ عبادت وغیرہ کے نام دیئے ہیں۔ تمہارا نام ”مثنویاتِ اردو“ کے سلسلے میں دیا ہے۔ اس خیال سے کہ کچھ مدت ہوئی۔ ایک لکھنؤی سکالر نے مثنویاتِ اردو کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جو شاید کہیں میری کتابوں میں بھی پڑی ہے۔ لیکن غالباً لائبریری میں آسانی سے مل جائے۔ میں نے یہ اس لئے تجویز کیا کہ تم کو ریسرچ کی کمائی مل جائے اور صرف کتاب پڑھ کر انگریزی میں مضمون مرتب کر دو۔ یہ اس لئے لکھ دیا ہے کہ جب ”ڈان“ سے تم کو خط ملے۔ تو تم تیار رہو۔ (۲۰ ستمبر)

”واقفیتِ عامہ“ کے سیٹوں کے متعلق مجھے احسن صاحب نے اطلاع دے دی تھی۔ دیکھیں۔ اب ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ دعا کرنی چاہیے —— یہاں خیر و عافیت ہے۔ حسرت صاحب رات لاہور روانہ ہو گئے۔ غالباً انہیں مصری شاہ میں کوئی مکان مل گیا ہے اب وہ لاہور میں ہی رہیں گے۔ ان کا پتہ لینا ہو تو ”امروز“ میں ظہیر بابر سے پوچھ لینا —— میرا معاملہ ابھی وہیں کا وہیں ہے۔ بنگالی پنجابی کشمکش کی وجہ سے سر لپیٹے پڑا ہوں۔ دوستوں کا مشورہ بھی یہی ہے کہ ذرا ہنگامے ختم ہوں۔ اسمبلی کا قصہ گزر جائے۔ پھر نہایت احتیاط سے اپنا معاملہ پیش کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گڑبڑ ہو جائے۔ (۱۰ نومبر)

"تعمیر" کا افتتاحیہ اور نوٹ لکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن خواہ مخواہ اتنے کام بھی جمع نہ کرو کہ زندگی وبال ہو جائے۔ اس کے علاوہ "تعمیر" تو گویا جماعت اسلامی کا پرچہ معلوم ہوتا ہے۔ آج کل جو فراغت تم کو حاصل ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور اتنا ہی کام کرنا چاہیے جو بے تکلفی سے اور بلا کراہت و تکلیف ہوتا چلا جائے۔ روزانہ اخبار کی پابندی آگے چل کر کہیں ناگوار نہ ثابت ہو۔ . . . . "انقلاب کے کالموں سے خوشہ چینی" میں دیکھ رہا ہوں۔ اچھا ہے۔ کوئی کام کی بات نکل آئے۔ تو اس کو دہرانے میں کیا حرج ہے؟ "دارالفرقان" کے لئے ضرور لکھوں گا۔ اور سرور صاحب کو بھی توجہ دلاؤں گا۔ (۱۵ نومبر)

اختر علی خان کا خط آیا تھا۔ مضمون کے لئے شکریہ ادا کیا ہے اور لکھا ہے کہ آئندہ "زمیندار" آپ کو ادیب الملک مولانا سالک لکھا کرے گا۔ گویا سرکارِ زمیندار سے مجھے خطاب مل گیا۔ لیکن یہ وہی خطاب ہے جو آج سے بیس سال پہلے نیرنگ خیال نے بھی دیا تھا۔
PREDICTION (جوتش کے بارے میں غیر ملکی رسالہ) کے اقتباس سے خاصی دلچسپی ہوئی اب میں غور کر رہا ہوں کہ قادیانیوں کی طرح ان پیش گوئیوں کو پورا کرنے کے لئے کیا تدبیر کی جائے۔ نواب زادہ خورشید علی خان دو چار دن کراچی رہے۔ اور بہت ملاقاتیں رہیں۔ رات وہ روانہ ہو گئے۔ سنا ہے کہ ایک دو روز میں خضر حیات اور مہر صاحب بھی آ رہے ہیں۔ اکرام صاحب غالباً ایک ماہ کی رخصت پر ہندوستان جا رہے ہیں سرور صاحب ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ مزے میں ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ (۲۴ نومبر)

تمہاری اور تمہارے طلبہ کی مصروفیتوں کا حال پڑھا۔ نمائش کے متعلق بھی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ گورنر جنرل صاحب سے ضرور گزارش کروں گا۔ لیکن اتنے لمبے چکر کے بعد اب شاید کچھ مدت تک وہ کراچی سے باہر جانا پسند نہ کریں۔ بہرحال کوشش کروں گا۔ شاہ عراق کا سارا پروگرام تو بالکل سرکاری طور پر تجویز کیا جائے گا۔ اگر شاہ عراق سے براہ راست استدعا کی جائے اور وہ یہاں آتے ہی خواہش ظاہر کریں کہ میں نمائش کا افتتاح کروں گا تو پھر حکومت ان کے پروگرام میں یہ تقریب رکھ سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔
"سندھ کے رومان" کے متعلق میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اگر اس کا مسودہ سامنے ہو۔ تو قاضی محمد اکبر وزیر تعلیم سندھ کو اس کا دیباچہ لکھنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد حکومت سندھ ضرور اس کے نسخے خاصی تعداد میں خرید لے گی۔ یہی ایک طریقہ میری سمجھ میں آتا ہے۔
ڈان۔ ستارہ اور وطن (گجراتی) کے خلاف کارروائی ہوئی۔ الطاف حسین روز بروز ذلیل ہو رہا ہے۔ مشتاق گورمانی قوی ہیں۔ نون کی کامیابی نے انہیں اور بھی قوی کر دیا ہے۔ یہاں بھی کسی قابلِ ذکر حلقے سے ڈان کی حمایت نہیں ہوئی۔ لیکن چونکہ سب سے بڑا اخبار ہے۔ اس لیے بعض دوسرے تیسرے درجے کے لوگ حمایت کے لئے مل ہی جاتے ہیں۔ بہرحال اس شخص کے آخری ایام ہیں اور یہ اس کے پاگل پن کا نتیجہ ہے۔
یہاں پنجابی ملکیت کے پریس کو تقویت دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ سہروردی بہت اچھے ہیں اور بڑے جنگ جو ہیں۔ لیکن ان کے اخبار کی ملکیت میں پنجابیوں کا کوئی حصہ نہیں۔ امیر علی فینسی اور دوسرے بمبئی والے اس کے ڈائرکٹر ہیں۔ اب ایک تو عزیز بیگ نے ایک شام کا انگریزی روزنامہ نکالنے کے لئے کمپنی بنالی ہے۔ اور دوسرے ایک اردو روزنامہ جاری کرنے کی تجویز دولت مند پنجابیوں میں ہو رہی ہے جس

ے متعلق مجھ سے مشورے کئے جا رہے ہیں۔ "جنگ" کا مالک پنجابی ہے۔ اور اکثر ساتھ دے بھی دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی تجارتی معاملہ کو بہت زیادہ مد نظر رکھتا ہے۔ سو فی صد مدد نہیں دے سکتا۔

• پچھلے پچاس سال کی صحافت" کے متعلق کیا لکھوں۔ دو ماہ ہوئے "ماہِ نو" میں اُردو صحافت کے متعلق میرا ایک مضمون نکلا تھا۔ وہ لاہور میں مل جائے گا۔ اس میں میں نے گذشتہ صدی کی باتیں تو ایک دو کتابوں سے اخذ کی تھیں اور گذشتہ پچاس سال کی صحافت ے متعلق محض اپنے حافظہ کی بنا پر بعض امور لکھ دیئے تھے۔ وہ مضمون دیکھ لو اور پھر لکھو کہ اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے۔ سوالات کرو تاکہ میں ان کا جواب لکھ دوں۔ اور تم مضمون مرتب کر لو۔

موجودہ صدی کے پہلے عشرے میں جو اخبارات نکلتے تھے۔ وہ زیادہ تر ہفتہ وار یا سہ روزہ ہوتے تھے۔ لاہور سے پیسہ اخبار۔ اور وطن۔ امرتسر سے وکیل۔ دہلی سے کرزن گزٹ۔ لکھنؤ سے اودھ پنچ۔ اور اودھ اخبار۔ اس کے علاوہ پنجاب اور یوپی سے زیادہ تر اور دوسرے حصوں میں کم۔ مذہبی اخبارات نکلتے تھے۔ آریہ سماجیوں کے عیسائیوں کے۔ اہلِ حدیث۔ اہلِ فقہ۔ دو اخبار امرتسر ہی سے جاری تھے۔ اس زمانے میں اخبار رائے زنی کم کرتے تھے اور اپنے پڑھنے والوں کو معلومات زیادہ بہم پہنچاتے تھے۔ پیسہ اخبار۔ وطن۔ وکیل وغیرہ میں ترکوں اور دوسری مسلم قوموں کے متعلق معلوماتی مضامین۔ قرآن و حدیث کے مختلف مسائل کے متعلق۔ اس کے علاوہ انگریزی اخباروں سے سیاسی اور سائنسی دلچسپی کے مضامین کا ترجمہ۔ تاریخی مضامین۔ زیادہ تر اسلامی تاریخ۔

۱۹۱۱ء میں لاہور سے روزانہ زمیندار جاری ہوا۔ اس کے بعد دہلی سے ہمدرد۔ لکھنؤ سے مسلم گزٹ۔ ہفتہ وار اخبارات بیشمار تھے۔ روزانہ اخباروں میں کم اور ہفتہ واروں میں زیادہ مضامین معلوماتی ہوتے تھے۔ علمی معلومات۔ سائنسی معلومات۔ ادبی معلومات یعنی علمِ عروض فنِ شعر۔ فنِ انشا کے مباحث۔ تاریخ اسلام کے متعلق معلومات۔ ترکوں اور عربوں اور دوسری مسلمان قوموں کے متعلق معلومات۔ جاپان کی ترقیات کے متعلق مضامین۔ ملکوں کی سیاسی تاریخ اور تحریکات کے متعلق معلومات۔ ترکی، دوسرے اسلامی ممالک اور انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک کا سفر کرنے والوں کے مضامین مشتمل بر حالاتِ سفر و معلومات متعلقہ ممالکِ مذکورہ۔ سیر و شکار کے متعلق مضامین۔ مغل امرا اور سلاطینِ اودھ کے شوق۔ ان کا طریقِ معاشرت۔ شعرا و ادبا کی قدر دانیاں وغیرہ یعنی تازہ تاریخی معلومات۔ جنگِ عظیم اول کے سلسلے میں فنونِ جنگ اور ایجاداتِ جنگی کے متعلق معلومات۔

تیسرے عشرے سے یعنی ۱۹۱۹-۲۰ء میں سیاسی تحریکات کا ہنگامہ شروع ہوا۔ معلوماتی مضامین کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ گو ادب و شعر کی معلومات اور سیر و شکار وغیرہ کی چیزیں روز بروز غائب ہوتی گئیں۔ البتہ ملکوں کی سیاسی معلومات، آزادی کی تحریکوں اور ان کے لیڈروں کے حالات زیادہ وسیع علمی اکتشافات اور سائنسی ایجادات وغیرہ کے متعلق معلومات۔ انگریزی اخباروں سے طویل معلوماتی مضامین کے ترجمے۔ جنگِ عظیم دوم کے سلسلے میں بے شمار مضامین۔ نئی نئی ایجاداتِ جنگی کی معلومات۔ اور شاملِ جنگ ممالک اور اُن کے لیڈروں کی سوانح عمریاں اس کے بعد سب کچھ تمھارے پیشِ نظر ہی ہے۔ (۳۰ نومبر)

جرنلسٹس ایسوسی ایشن (پنجاب یونیورسٹی) کی خواہش کے مطابق میں جب لاہور آؤں گا۔ اُردو صحافت کے ارتقا پر لیکچر دے دوں گا۔

لیکن لاہور آنا ہی فی الحال مشکل معلوم ہوتا ہے۔ (۵ر دسمبر)

اس میں شک نہیں کہ بعض پنجابی اخبار نکالنے کے درپے ہیں لیکن ابھی ان کا کچھ ٹھیک پتہ نہیں بلکہ مسلم لیگ کا انگریزی اور اردو اخبار نکالنے کا ارادہ پھر زندہ ہو رہا ہے۔ بہرحال ”انقلاب“ کے نکلنے کا تو خواب و خیال بھی نہیں۔ سیٹری کے اخبار کے سرمائے میں پنجابیوں کا کوئی حصہ نہیں۔ امیر علی فینسی اور بندوق والا وغیرہ بمبئی کے سیٹھ اس کے مالک اور ڈائرکٹر ہیں۔ یہ تو ان کی خوبی ہے کہ انہوں نے سیٹری کو کامل آزادی دے رکھی ہے۔ جب سے مسلم لیگ کے اخباروں کی بات چلی ہے۔ سیٹری اور خلیل دونوں کچھ چپ اور محتاط سے ہیں۔ اس لئے کہ اگر مسلم لیگ نے اخبار نکالے تو وہ یقیناً موجودہ اخباروں کے بہت بڑے حریف ثابت ہوں گے۔ ”مارننگ نیوز“ کو کوئی نہیں پوچھتا۔ چند سو پرچے چھپتے ہیں۔ جب تک وہ کوئی خاص راہ اختیار نہ کرے اور لوگوں کی توجہ جذب نہ کرے۔ وہ ڈان اور ”ٹائمز آف کراچی“ کے مقابلے میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟

کراچی کے پریس آفیسر کو میں نے تاکید کر دی ہے کہ کراچی کے اخبار رسالے مہیا کرے۔ کیپٹن عبدالواحد سے کہا ہے کہ وہ افغانستان کے بلکہ قبائلی علاقے کے اخباروں کے نسخے بھی مہیا کرے۔ افغانستان، ترکی اور سعودی عرب کی سفارتوں کو یاد دہانی کرا دی گئی ہے۔ یمن کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ اعظمی سے بات کروں گا۔ گورنر جنرل نے اب تک مجھے یاد نہیں فرمایا۔ جونہی موقع ملتا ہے۔ میں بات کروں گا اور تمہیں اطلاع دوں گا۔ ان کا لاہور آنا مجھے تو آسان معلوم نہیں ہوتا۔ خیر بات کرنے میں حرج نہیں۔ پھر فیصلہ کریں گے کہ وہ نہ آئیں تو کس کو تکلیف دی جائے۔ پاکستان کی صحافت کے متعلق میں بھی ایک مضمون لکھنے کے لئے پر تول رہا ہوں۔ اس لئے کہ امریکہ سے فرمائش آئی ہے۔ آئندہ پندرہ بیس دنوں کے اندر وہ مضمون مکمل ہو جانا چاہیے۔

دہلی سے دعوت آئی ہے کہ ۹ر جنوری کو ایک مشاعرہ ہے۔ وہاں آئیے۔ اس خیال سے منظور کر لیا کہ دوستوں سے ملاقات ہو جائے گی اور پانچ سات سو روپیہ بھی مل جائے گا۔ کیا برا ہے۔ خوشتر بھی چند روز تک دہلی سے کراچی آنے والے ہیں۔ کچھ کاروباری سلسلے میں۔

کل کشمیر افیئرز منسٹری کے فضل صاحب آئے اور بہت سر ہوئے کہ دو تین ماہ کے لئے راولپنڈی آ کر پبلسٹی وغیرہ کے معاملات میں ہماری رہنمائی کیجیے اور کشمیر کے بعض ضدی لیڈروں اور ورکروں کو ہموار کرنے میں بھی مدد کیجیے۔ میں نے کہا۔ میاں۔ میں تو ملازم آدمی ہوں۔ وزارت سے بات کرو۔ جب شعیب صاحب مجھ سے پنڈی جانے کا ذکر کریں گے تو میں ان سے اپنی شرائط کے متعلق بات چیت کروں گا۔

اچھا۔ ایک اور قصہ یہ ہوا کہ سکھر ادبی کانفرنس کا خطبۂ صدارت چھپ کر میرے پاس پڑا ہے اور کانفرنس ملتوی ہو گئی۔ خیال تھا کہ دسمبر کے اواخر میں ہو جائے گی لیکن آج خط آیا ہے کہ نئی تاریخیں ۹۔۱۰ جنوری تجویز ہوئی ہیں۔ آج ان کو لکھا ہے کہ بھائی۔ میں دہلی جا رہا ہوں۔ دو چار دن پہلے کانفرنس کر دو۔ تو آتا ہوں۔ ورنہ دہلی جاؤں گا۔ سکھر نہیں آ سکوں گا۔ دیکھیں۔ وہاں سے کیا جواب آتا ہے اور کدھر جانا ٹھہرتا ہے۔

اوج صاحب کو خط نہ ملنے کا بہت ہی افسوس ہے۔ میں نے بڑی محنت سے پانچ چھ صفحے لکھ کر بھیجے تھے اور دفتر کے پتے سے ان کو خط لکھا تھا۔ خدا جانے کیونکر گم ہو گیا۔ (۱۱ر دسمبر)

یہ مجھے تم سے معلوم ہوا کہ الطاف حسین کی لڑکی کی شادی ہے کیونکہ یہاں ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کبھی کسی پارٹی میں سلام دعا ہوگئی تو ہوگئی۔ ورنہ ایک تو فرعون ہے۔ اس سے میں ملنے میں کبھی پہل نہیں کر سکتا۔ دوسرے بنگالی کے خلاف یہاں خاصی نفرت ہے۔ اور بنگالی و غیر بنگالی آپس میں بہت کم ملتے ہیں۔

(نوٹ: الطاف حسین صاحب نے لڑکی کی شادی پر مجھے دعوت نامہ بھیجا تھا۔ میں نے معذرت کر بھیجی لیکن ساتھ ہی لڑکی کے لئے ایک تحفہ بھیج دیا۔ کیونکہ الطاف حسین کے ساتھ میرا تھوڑا سا دوستانہ رابطہ تھا اور اس کا ذکر والد کے نام خط میں کر دیا تھا۔ برسبیلِ تذکرہ الطاف حسین کو میرے ابنِ سالک ہونے کا علم ۱۹۶۴ء میں ہوا جب ان سے ایک طویل ملاقات ہوئی۔ — خورشید)

سرور صاحب بخیریت ہیں۔ ہفتہ وار نکالنے کی خبر تو بے بنیاد ہے۔ البتہ وہ مضطرب ہیں کہ کوئی اپنی مرضی کا ہفتہ وار نکلے۔ تو فرائض منصبی کے سلسلے میں وہ اس میں کھل کر مضمون نویسی کریں۔ (۱۲ر دسمبر)

غلام محمد صاحب کو میں نے دوبارہ بھی خط لکھ کر توجہ دلائی تھی۔ غالباً اسی کا اثر ہے کہ انہوں نے سابقہ فیصلے پر نظرثانی فرمائی۔ اگر وہ افتتاح کر دیں تو بہت اچھا ہوگا۔ میں اب بالکل پا بہ رکاب بیٹھا ہوں۔ جونہی فیصلہ ہوا۔ میں لاہور آجاؤں گا۔ چاہتا تو ہوں کہ نمائش کے موقع پہ پہنچ جاؤں۔ لیکن یہ حالات پر منحصر ہے ــــ اخبار والوں سے میں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ صرف ایک ہی صورت میرے مجبور ہونے کی ہو سکتی ہے کہ گورنر جنرل سے کہلوایا جائے۔ اگر غلام محمد صاحب نے مجھے مجبور کیا تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔ کیوں کہ ایک تو وہ دوست ہیں۔ دوسرے ملک کے حکمران ہیں لیکن مجھے احساس یہ ہے کہ اخبار نکالنے والے کچھ زیادہ SERIOUS نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو وہ مجھے یہاں رکھنے کے لئے زمین آسمان ایک کر دیتے۔ بہرحال فیصلہ اب یہی ہے کہ جلد سے جلد لاہور پہنچ جاؤں۔ آج یہ کچھ گفتگو ہو رہی ہے کہ لاہور میں مجھ سے کام لیا جاتے اگر ایسا ہو گیا۔ تو گویا میرا پرانا مطالبہ منظور ہو جائے گا اور بے فکری ہو جائے گی۔ خوشتر صاحب غالباً دو چار روز میں یہاں پہنچیں گے اور دو چار روز میرے پاس رہیں گے۔ کیا وہ لاہور پہنچ گئے؟ کیا تم لوگوں سے ملے؟ (۱۹ر جنوری ۵۴ء)

کراچی سے مراجعت

۱۹۵۴ء کے آغاز میں والدِ مرحوم لاہور آ گئے اور جو کام کراچی میں بیٹھ کر کرتے تھے۔ یعنی تعمیری موضوعات پر مضمون نگاری۔ وہ لاہور میں بیٹھ کر کرنے لگے۔ اب خطوط کی تعداد کم ہو گئی۔ کیونکہ ہر سال تین مہینے کے لئے مری جانا تھا۔ تو خط و کتابت ہوتی تھی۔ اب اس خط و کتابت سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

احسن اور محسن آئے تھے۔ انہوں نے مجھے اور حسرت کو مجبور کیا ہے کہ ہم مڈل کی معلوماتِ عامہ کی کتابیں لکھیں۔ مکتبہ اردو والے بھی

آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم اُن کے لئے لکھو۔ لیکن پھر یاد آیا کہ تم تو پہلے ہی اُن کا فیصلہ بعض نوجوان طلبہ سے کرا چکے ہو۔ مکتبہ والے مجھ سے اور حسرت صاحب سے بھی لکھوانا چاہتے تھے۔ ہم نے کہا۔ جب تم ایک سیٹ لکھوا رہے ہو۔ تو اب دوسرے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم لکھیں گے۔ تو اپنے ہی پبلشر کے لئے لکھیں گے۔ ان حالات کی اطلاع اس لئے دی ہے کہ صورتِ حال تم پر واضح رہے۔ کیا کوئی اور ایسا پبلشر نہیں۔ جس کے لئے تم سیٹ لکھو دو۔ (۱۱ر جولائی ۵۴ء)

۲۹ ستمبر کو مدثر آئی۔ ۳۰ کی صبح کو میں اور تمہاری آپا سب سے پہلے چچا صاحب کے ہاں حاضر ہوئے اور اُن سے دعا و برکت حاصل کی۔ وہیں سے دارالفرقان نکل گئے۔ جہاں ایک سو روپیہ "صدقہ مدثر" دیا۔ چچا صاحب تمہارے حقے کے منتظر ہیں۔ کیونکہ ہم نے ان سے تمہارے ارادے کا ذکر کیا تھا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ بچوں کے ساتھ تم لوگ بھی کیوں نہیں آجاتے۔ آٹھ دن اور نہ ٹھہرے۔ تو کیا قیامت آجائے گی؟ ریحانہ کی پڑھائی کو ایک مہینے کا نقصان پہنچانا بھی بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر ہوٹل والے کو آٹھ دن کا کرایہ دینا بھی پڑ گیا۔ تو آخر اس میں کون سی زیر باری ہوگئی۔ آرام سے آکر اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ رہو۔ تم لوگ تو ایسی پابندی ملحوظِ خاطر رکھتے ہو۔ جیسے مری میں کوئی سرکاری نوکری ہے۔ جس سے تیس ستمبر سے پہلے رخصت نہیں مل سکتی۔ (۸ر ستمبر)

ملک تاج الدین اور سلہری خواہ مخواہ کش مکش کر رہے ہیں۔ میں ان کی صلح کرا دینے کا حامی ہوں۔ ملک صاحب آئیں تو ان سے قطعی بات کروں۔ (۲۲ر اگست)

چچا افضل صاحب کے تحفے کی فکر ضرور کی جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ میں بھی اس فن سے نابلد ہوں۔ کسی حقیقی دوست کا مشورہ لینا ہوگا۔

ـــــ نصابِ درسی میں" تاریخ کے حصے میں GAPS جان بوجھ کر رکھے گئے ہیں۔ فی الحقیقت باقاعدہ تاریخ کی تدریس مطلوب نہیں۔ بلکہ HIGH ROADS OF HISTORY کے انداز پر تاریخ کی مختلف جھلکیاں دکھانا مقصود ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ مسلسل تاریخ بالائی جماعتوں میں پڑھائی جانی چاہیے۔ بچوں کے ذہن کو ادوارِ تاریخی میں الجھانا درست نہیں۔

"پنجابی" کی بحث کے متعلق "چٹان" کو ایک مکتوب بھیجوں گا۔ یہ معمولی باتیں ہیں۔ تعلیم یافتہ پنجابیوں کے دماغوں کو صحیح راستے پر لانے کا کام بہت لمبا اور صبر آزما ہے۔ حفیظ جالندھری کا ایک مراسلہ "امروز" میں چھپا تھا۔ دیکھا ہوگا۔ جس میں میری شاگردی سے انکار کیا ہے۔ اسلم حیات نے اس کا جواب بھی لکھا۔ میں بھی کوئی ہلکی سی چیز لکھوں گا۔ (۱۳ر ستمبر)

نذری کے متعلق تم لوگوں کی رائے عجیب سے۔ وہ تو بڑا پیارا بچہ ہے۔ صرف کچھ انہماکِ ذہنی کی وجہ سے بے پروا اور سرد مہر معلوم ہوتا ہے اور اگر اس میں جذبات کم بھی ہوں تو اچھا ہی ہے۔ آج کل کے عہدِ ادراک میں جذبات کا وفور کوئی مفید شے نہیں ہے۔ وہ مزے

یں ہے اور امتحان اچھا ہو رہا ہے ۔ (۲۸ ستمبر)

آئندہ موسمِ خزاں میں پیرس جانے کا ارادہ مبارک ہو لیکن باقی تفصیلات معلوم نہ ہوئیں کہ مصارف کلی طور پہ وہی لوگ برداشت کریں گے؟ اور یونیورسٹی والوں کا رویہ کیا ہوگا — نذری اور رخسانہ انگریزی میں بات چیت ضرور کر سکتے ہوں گے ۔ نذری تو اب کالج میں ہے اور رخسانہ بھی انگریزی سکول میں پڑھتی ہے لیکن کبھی کبھی ان دونوں کے ساتھ گھر پر انگریزی بولنے کی مشق ہونی چاہیے تاکہ ان کی معلومات میں بھی کچھ اضافہ ہوتا رہے اور جھجک بھی جاتی رہے ۔ (۱۵ جولائی ۵۵ء)

نذری کے متعلق اصلاحِ حال کا قصہ سن کر خوشی ہوئی ۔ خدا کرے ۔ اب یہ حالت مستقل رہے ۔ تم اور نصرت انتہائی کوشش کرو کہ جہاں تک ہو سکے ۔ اُسے پھر آزردگی نہ ہو حتی الامکان اس کی باتیں مان لیا کرو ۔ وہ خود بخود معقولیت کی طرف آجائے گا ۔ شدت کرنے سے وہ اپنے رویے پر پختہ ہو جائے گا اور اصلاح مشکل ہو جائے گی ۔ (۲۳ جولائی)

[میں نے یونیورسٹی سے اجازت لے کر ایم اے (تاریخ) کا امتحان دے رکھا تھا ۔ "ہلالِ پاکستان" نے الزام لگایا کہ میں نے اجازت لیے بغیر امتحان دیا اور اس طرح قواعد کی خلاف ورزی کی ۔ میں نے اس کا تراشہ والد مرحوم کو بھیجا تاکہ وہ وائس چانسلر میاں افضل حسین سے گفتگو کریں چنانچہ جواب آیا کہ —] میاں افضل حسین صاحب سے بات ہوئی تھی ۔ وہ کہتے لگے ۔ یونہی کسی نے شرارت کی وجہ سے اخبار میں بکواس کی ہے ۔ اس کی پروا نہ کرنی چاہیے ۔ میرے پاس بھی اس کا کٹنگ پہنچ چکا ہے ۔ اس کا کیا خیال کرنا ۔

حاجی لق لق کو دنیائے اسلام کے اخباروں کی فہرست مطلوب ہے ۔ وہ کہتے تھے کہ خورشید سے کہیئے مجھے یہ فہرست مہیا کرے ۔ میں نے کہا کہ میں خط لکھ دوں گا ۔ وہ فہرست مہیا کرنے کا کوئی انتظام کر دیں گے ۔ (۱۰ اگست)

ریزلٹ آج "پاکستان ٹائمز" میں شائع ہوا ہے ۔ حالانکہ بے شمار مبارکبادیں ہم اس سے قبل ہی وصول کر چکے ہیں ۔ ہلالِ پاکستان کا ٹیلی فون بگڑا ہوا تھا ۔ اس لئے صالح صدیق سے کوئی بات نہیں ہو سکی ۔ بہرحال میاں افضل حسین سے بات ضروری تھی ۔ جو ہو گئی تھی ۔ آج "پاکستان ٹائمز" میں ایک چھوٹی سی چٹھی بھی تمہارے متعلق تھی ۔ مظہر علی خان کو فون کر کے بات کروں گا ۔ تم بھی "پاکستان ٹائمز" میں کمال حیدر یا کسی اور دوست کو لکھ دو کہ اس قسم کی چیزیں سوچے سمجھے بغیر درج نہ کر دیا کریں — پی ۔ ایچ ۔ ڈی کا فیصلہ تو اسی وقت کیا جا سکے گا ۔ جب کیمبرج والوں کا جواب آجائے گا ۔ اگر انہوں نے منظور کر لیا تو وہاں جا کر ورنہ پنجاب ہی میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کرنا ہوگا ۔ (۲۱ اگست)

بہت اچھا کیا کہ مظہر علی خان کو خط لکھ دیا ۔ میں نے تمہارے کہنے کے مطابق "ہلالِ پاکستان" والوں سے کوئی بات نہیں کی ۔ کبھی صالح صدیق ملے گا ۔ تو اُسے زبانی ڈانٹوں گا ۔ اس سے پہلے وہ میری پنجابی تحریک کی بھی پچھلے سال مخالفت کر چکا ہے ۔ (۲۴ اگست)

جو خطوط یورپ میں ملے

...... بخاری صاحب کا خط نیویارک سے آیا جس میں لکھا تھا کہ "شخصِ معلوم کے ساتھ میرے تعلقات کچھ اچھے نہیں۔ لیکن آپ نے جو حالات بیان کئے ہیں۔ ان کی بنا پر میں کوئی اور سبیل نکالوں گا۔ جس سے خورشید صاحب پر خاص توجہ رہے۔ وسط اپریل میں میں خود یورپ جا رہا ہوں۔ دو تین اصحابِ اقتدار سے کہہ دوں گا۔ آپ مطمئن رہیں"۔ اب ذرا اس کی خبر رکھنا کہ بخاری صاحب کب یورپ آتے ہیں۔ میرے خیال میں تو پہلے پیرس ہی آئیں گے۔ بہرحال میں نے ان کو تمہارا اتہ پتہ لکھ دیا ہے۔ (۵ر اپریل ۵۶)

(نوٹ: شخصِ معلوم سے مُراد مسٹر تور جسدل تھے۔ جو پیرس میں یونیسکو کے شعبۂ ابلاغِ عام کے ڈائرکٹر تھے۔ اس شعبے کے اہتمام میں اساتذۂ صحافت کی وہ بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں مَیں نے پاکستان کی نمائندگی کی)

کراچی سے طیارے کے روانہ ہونے میں جو تاخیر ہوئی۔ وہ خاصی پریشان کُن ہوئی۔ لیکن اس بہانے سے میٹرو پول کی زیارت ہو گئی۔ جس کا مقابلہ اب تم یورپی ہوٹلوں سے بآسانی کر سکو گے ..... میں نے پہلے خط میں تم کو اطلاع دی ہے کہ بخاری صاحب وسطِ اپریل میں یورپ پہنچ رہے ہیں۔ اُن سے ضرور ملنا۔ وہ بعض اربابِ اقتدار سے تعارف کرا دیں گے جو مستقبل میں مفید رہے گا۔ یہ خط میں بہت تنگ وقت میں لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے۔ یہ تم کو پیرس میں مل جائے۔ پیرس سے ہالینڈ روانہ ہوتے وقت مختصر سا کیبل ضرور بھیج دینا۔ اور جب ہالینڈ میں تھیسس منظور ہو جائے اور ڈاکٹریٹ کی سفارش کر دی جائے۔ جب بھی بذریعہ کیبل اطلاع دینا۔ کیونکہ یہ حقیقت میں اس سفر کی سب سے بڑی خبر ہوگی۔ (۹ر اپریل ۱۹۵۶ء)

شراب اور خنزیر اور بے طہارتی وغیرہ تو یورپ اور امریکہ کی خصوصیات ہیں۔ وہ دنیا ہی ہماری دنیا سے الگ ہے اس کے طور طریقے۔ اس کے ذوق اور اس کی مصروفیتیں ہی مختلف ہیں۔ بہرحال یہ ضروری تھا کہ تم اس اختلاف کو خود دیکھ لو۔ اللہ نے یہ اچھا بندوبست کر دیا۔ تجربہ و معلومات کے حصول کے لئے سفر نہایت ضروری چیز ہے —— کل ملک تاج الدین (اے پی پی) آئے۔ اور مجھے بتایا کہ چیف جسٹس ایس اے رحمٰن نے مجھے اپنی طرف سے اے پی پی کا ٹرسٹی نامزد کیا ہے۔ چونکہ میں چیف جسٹس کا نامزد کردہ ٹرسٹی ہوں۔ اس لئے الیکشن کا چیئرمین بھی ہوں۔ چنانچہ کل میں نے ٹرسٹی شپ کے اخباری نمائندوں کے کاغذاتِ نامزدگی کی تفتیش کی۔ محمد احمد زبیری اور ریاست علی آزاد کے کاغذاتِ نامزدگی کو مسترد کر دیا۔ سیٹھی، ماتری، محسن علی اور تفضل حسین بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ صرف ایک سیٹ کا انتخاب ہوگا۔ جس میں فیض اور نسیم حجازی کے درمیان مقابلہ ہے۔ آج ملک تاج الدین مجھ سے بیلٹ پیپروں پر دستخط کرائیں گے۔
(۱۳ر اپریل ۵۶ء)

کانفرنس کا گروپ چیئرمین ہونا مبارک ہو۔ میرے نزدیک خود بخود اس چیز کا پیدا ہونا لازماً کسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ خواہ وہ بخاری

صاحب کی طرف سے ہو یا پاکستان کے محکمۂ اطلاعات کی طرف سے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے صدارت کے فرائض اچھی طرح انجام دے دیئے ہوں گے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی توجہ قابلِ ممنونیت ہے۔ وہ ہمارے پُرانے دوست ہیں۔ امید ہے کہ امسٹرڈم والوں نے تھیسس چھپوا لیا ہوگا اور انٹرویو ہونے والا ہوگا۔ میرے نزدیک تو ڈاکٹریٹ کی منظوری میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ یاد رہ بات ہے کہ وہ لوگ تھیسس کو کسی انگریز مستشرق سے پاس کرانا چاہیں۔ کیونکہ ہالینڈ کے سکالروں کو اس موضوع پر زیادہ معلومات حاصل نہ ہوں گی اور وہ اس معاملے میں کسی زیادہ ذی علم آدمی کا تعاون چاہتے ہوں گے۔ باقی ہر طرح خیریت ہے۔ یہاں رمضان شریف تشریف رکھتے ہیں۔ یورپ میں تو اس کا احساس بھی نہ ہوتا ہوگا۔ (۱۷؍اپریل ۵۶ء)

استنبول اور پیرس کی مصروفیتوں کا حال معلوم ہوا۔ جن شخصیتوں سے اس سفر کے دوران میں ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ ان میں بعض سفرا تک بھی ہیں۔ ان سب کی ایک باقاعدہ فہرست اپنے پاس رکھنی چاہیئے اور کبھی کبھی خط لکھ کر تجدیدِ تعلقات کر لینی چاہیئے۔ بعض اوقات بیرونی ممالک میں واقفیت و شناسائی بے حد کام آتی ہے۔ "جھلاپتی کے جھمبل جھو سے" کا حال پڑھ کر لطف آیا۔ پیرس میں زندگی کا انداز یورپ کے دوسرے مرکزوں سے کسی قدر مختلف بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہالینڈ میں غالباً پیرس کی سی گرانی نہیں ہوگی اور انگلستان میں صورتِ حال یقیناً بہتر ہوگی۔

خیر، جامِ صحت کے دھوکے میں "جرعۂ مئے" کا پی لینا چنداں مضائقہ نہیں رکھتا۔ خدا اسے تمہارا جامِ صحت بنائے۔ میں شراب کا مخالف مُلّایانہ اعتبار سے نہیں ہوں۔ بلکہ اس چیز ہی کو بُری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے جسمانی اور اقتصادی نقصان روزِ اول ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے انسان کی طبیعت قابلِ اعتماد ہو یا نہ ہو۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اگر طبیعت قابلِ اعتماد ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ شخص تین ماہ تک پھر رُخ ہی نہ کرے اور اگر قابلِ اعتماد نہیں ہے تو ممکن ہے کہ وہ روز پیئے۔ اور بڑھاتا چلا جائے۔ اور بالآخر مجازاً و رند بن جائے۔ یہ خطرہ نہایت مہلک ہے۔ علاوہ بریں منطقۂ حارہ کے رہنے والوں کو مشروبات کے معاملے میں منطقۂ معتدلہ یا منطقۂ باردہ والوں کی تقلید ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ ان معاملات میں اپنا رویہ نہ مُلّایانہ ہونا چاہیے نہ رندانہ۔ البتہ ROBUST ہونا چاہیے اور جو طریقہ اختیار کر دیا ہو۔ اس پر خوش اسلوبی سے کاربند رہنا چاہیے۔ (۲۰؍اپریل ۵۶ء)

پروفیسر باش وِشر کے متعلق تم نے لکھا ہے کہ وہ یہودی ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ کھانے میں کوئی ایسی چیز نہیں کھلائی جائے گی۔ جو تمہارے مذہب کے خلاف ہو۔ یہ انہوں نے صحیح کہا۔ کیونکہ راسخ الاعتقاد یہودی خود بھی خنزیر نہیں کھاتے اور اُن کے ہاں اس معاملے میں ویسی ہی سختی ہے جیسے اسلام میں۔ بہت اچھا کیا کہ اوورکوٹ لے لیا۔ اوورکوٹ کے بغیر یورپ کا سفر بالکل بے معنی ہے۔ اب گویا تم ۱۷؍جون تک لازماً یورپ میں مقیم رہو گے۔ یہ معلوم کر کے کچھ رنج ہوا۔ اس لئے کہ مفارقت زیادہ طویل ہو گئی۔ لیکن اس کی خوشی ہے کہ اس وقت تک ڈاکٹریٹ کا مسئلہ طے ہو جائے گا۔ عزیزہ نصرت کبھی کبھی اُداس سی معلوم ہوتی ہے۔ میں اس کو بشاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ایک تو وہ کبھی الگ نہیں رہی۔ دوسرے تمہارا کام اس قسم کا ہے کہ سارا دن گھر پر ہوتے ہو۔ نصرت

اس کو خاص طور پر محسوس کرتی ہوگی۔ بچے تو خود بھی دن کا خاصا حصہ اپنے مدرسوں میں مصروف رہا کرتے ہیں لیکن نصرت اور تم تو بہرحال گھر پر اکٹھے ہوتے تھے۔ یورپ میں مزید قیام اُس کو طبعاً ناگوار ہوا ہوگا۔

کل شام پنڈت ہری چند اختر اور لالہ کرم چند پارس آئے اور دو گھنٹے میرے پاس رہے۔ تمھیں بہت یاد کرتے رہے لیکن تمھارے سفرِ یورپ پر خوش بھی بہت ہوئے۔ بلکہ کہہ رہے تھے کہ جب وہ اتنی دور کا سفر کر سکتے ہیں تو کبھی دہلی بھی آئیں۔ (۲۳ ر اپریل ۵۶ء)

کل عاشق بٹالوی کا ایک خط آیا تھا۔ اگر تم اب تک اُن سے نہیں ملے۔ تو ضرور ملنا — میرا خیال ہے کہ انگلستان میں تمھارا وقت خوب گزر رہا ہوگا۔ ہم لوگوں کے لئے انگلستان اتنا اجنبی نہیں جتنے یورپ کے دوسرے ممالک ہیں ایک تو انگریزی زبان کی وجہ سے بہت سہولت رہتی ہے۔ دوسرے انگلستان میں اپنے پاکستانی دوست مل جاتے ہیں اور اداسی نہیں ہوتی۔ مجھے خیال آیا تھا کہ پاکستانی اخباروں میں تمھارے یونیسکو وغیرہ جانے کے متعلق کچھ بھی نہیں چھپا۔ کیا تم اس کے متعلق کچھ تردد کر دئے یا واپس ہی آ کر اپنے سفر کے سلسلے میں کچھ لکھو گے؟ کیا بخاری صاحب کا کچھ پتہ چلا کہ وہ کہاں ہیں؟ اُن کا کوئی خط آیا یا نہیں۔ وہ انگلستان بھی آئیں گے یا نہیں اگر ان کا کوئی قطعی پتہ یورپ کا معلوم ہو تو تم ہی ان کو خط لکھ ڈالو۔ کیا محمد امین کی طرف سے خط پہنچ گیا تھا۔ جس میں پبلشر کو یقین دلایا گیا تھا کہ مقالے کی سو کاپیاں خریدی جائیں گی؟ (۲۹ ر اپریل ۵۶ء)

تم نے جتنے حالات ڈاکٹریٹ وغیرہ کے متعلق لکھے۔ وہ معلوم ہوئے۔ خدا کرے۔ امسٹرڈم والوں نے جتنی رعایت تمھارے ساتھ کی ہے۔ وہ سب کی سب تمھیں کو پہنچے اور کوئی پریشانی یا صرفِ زر کا قصہ پیش نہ آئے۔ یہاں کے حالات بدستور ہیں۔ تم تو یورپ گئے ہوئے ہو۔ اس لئے خط لکھنے میں تمھیں موضوعات کی کمی نہیں۔ یہاں وہی کھڑے پانی کی سی زندگی ہے۔ جو آج سے ایک ماہ پہلے حالات تھے۔ وہی ہیں۔ اس لئے ہم اپنے خطوں میں کوئی دلچسپ تفصیل لکھنے سے قاصر ہیں۔ (۳ ر مئی ۵۶ء)

یہ خیال اچھا ہے کہ کوئی پبلشر تم سے پاکستان کی فوک لور پر کتاب لکھوائے۔ اس سے باہر تمھارا تعارف بھی بخوبی ہو جائے گا اور شاید کچھ بافت کی صورت بھی ہو — مقبول الٰہی، حمید الدین اور دوسرے دوستوں سے خوب ملاقاتیں رہتی ہوں گی۔ کیا عاشق بٹالوی سے ملے؟ کیا خلیل (ایم۔ کے۔ میاں) سے بھی ملاقات ہوئی؟ کیا نمازِ عید پڑھنے کے لئے کسی مسجد میں گئے تھے؟ اب تو شاید کورس بھی ختم ہی ہونے والا ہوگا۔ اس کے بعد دو ہفتے محض سپاٹا رہے گا۔ یا کوئی اور مصروفیت بھی ہے؟ (۹ ر مئی ۵۶ء)

یونیسکو کے متعلق تم نے فیض کو جو مضمون بھیجا تھا۔ وہ اب تک اخبار میں تو نظر نہیں آیا اور فیض چین وغیرہ کے سفر کی مصروفیتوں میں ایسے الجھے رہے کہ میں اُن سے دریافت بھی نہیں کر سکا۔ اب چونکہ وزیرِ اعظم کا سفرِ چین پندرہ روز تک ملتوی ہو گیا ہے اس لئے اگر فیض اور ندیم واپس آ گئے۔ تو ندیم سے تمھارے حالاتِ سفر کے متعلق بات چیت کر دوں گا۔ (۱۴ ر مئی ۵۶ء)

فوک لور آف پاکستان کے متعلق میک ملن والوں سے کیا انتظام ہوا۔ خدا کرے۔ وہ کتاب چھاپ دیں اور اس سے معقول یافت کی صورت پیدا ہو جائے اور سفر کے اخراجات بار معلوم نہ ہوں۔

میں تمہارے خط نصرت کو سنا دیا کرتا ہوں اور نصرت بھی تمہارے خطوط کا خلاصہ مجھے بتا دیا کرتی ہیں۔ آئندہ سفر یورپ میں نصرت کو ضرور لے جانا۔ لیکن قِصّہ تو بچوں کا ہے۔ وہ مدت تک والدین سے الگ رہنا کسی حالت میں گوارا نہ کریں گے۔ بہرِحال یہ تو بعد میں سوچنے کی باتیں ہیں۔ (۱۹ر مئی ۵۶ء)

میں نے فیض اور ندیم کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس وقت ہانگ کانگ میں ہیں۔ وزیرِ اعظم کے جانے کی تاریخ ۱ر جون مقرر ہوئی تھی۔ لیکن آج اعلان ہو گیا کہ ناسازیٔ طبع کے باعث اُن کا جانا ملتوی ہو گیا ہے چنانچہ چند ہفتے بعد ہی جا سکیں گے۔ اور فیض و ندیم برابر وہاں ٹنگے ہوئے ہیں یعنی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک ماہ تک واپس آئیں گے یا دو ماہ تک۔

چودھری ظفر اللہ خان کی شادی کا یہاں بھی چرچا ہے۔ لیکن وہ اس شادی سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے چکے تھے۔ بہرحال تفاوتِ عمر کی وجہ سے یہ شادی ہم کو دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ مغرب میں تو اس قسم کی شادیاں ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہیں۔ (۳۱ر مئی ۵۶ء)

خدا کا شکر ہے کہ اب تمہاری واپسی کا دن قریب آ رہا ہے اور آج سے دس دن بعد ہم تم کو دیکھ کر آنکھیں روشن کر سکیں گے۔ تمام حالات تمہارے خط سے معلوم ہو گئے۔ میرے خیال میں تمہارا یہ سفر اپنی سیر و تفریح، نظارہ و تماشا اور علمی معلومات کے اعتبار سے اس قدر بھرپور رہا ہے کہ بعض لوگوں کے سال سال بھر کے دورے اتنے بھرپور اور نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ یہ محض خدا کا فضل و احسان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یونیسکو والوں کی امدادِ آمد و رفت کے علاوہ چار ہزار روپے سے زیادہ خرچ ہو گئے۔ لیکن یہ وہ خرچ ہے۔ جس کے متعلق اطمینان ہے کہ ٹھیک لگا۔ ڈاکٹریٹ بہت زیادہ بیش بہا چیز ہے۔ ایک سال کے اندر بی اے سے ڈاکٹر ہو جانا معمولی بات نہیں۔ اس سے تمہاری قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا۔ جو عمر بھر کے لئے ایک INVESTMENT ہے۔

(۱۸ر جون ۵۶ء)

یورپ سے واپسی

۲۶ر جون کو ڈاکٹریٹ ملی۔ ۲۸ر جون کو لاہور پہنچا۔ اور تین دن رہ کر حسبِ معمول بال بچوں کو لے کر مری روانہ ہو گیا۔ جہاں تین مہینے قیام رہا۔ ۱۹۵۷ء میں بھی یہی ہوا۔ لیکن اس سال کے آخر میں والد کو دمہ قلبی کا دَورہ ہوا۔ اس لئے ۵۸ء میں مری میں قیام کی روایت ترک کر دی اور ۵۹ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ ۵۶ء اور ۵۷ء میں جو خطوط آئے۔ وہ کاغذات میں کہیں گم ہیں۔ لیکن چند خط موجود ہیں۔ جن سے اقتباسات درج کرتا ہوں۔

میرا تو خیال ہے کہ مجید ملک کی امداد اس معاملے میں پہلے ہی طلب کرنی چاہیے تھی۔ مشیرِ تعلیم حکومتِ پاکستان سے ہمیں کیا خیر کی توقع ہوسکتی تھی۔ وہاں تو بس مقتدر آدمی کا دباؤ پڑ جاتا ہے۔ اس کا کام ہو جاتا ہے۔ اور ممکن ہے کسی بنگالی ہی کا زور پڑ گیا ہو۔ وزیرِ تعلیم بھی تو آجکل بنگالی ہی ہیں۔ بہرحال میں نے مجید ملک کو خط لکھ دیا ہے۔ بلکہ تمہارے خط کی نقل بھی بھیج دی ہے۔ تاکہ پہلے توجہ نہ کی ہو۔ تو اب کر دیں — ایس اے رحمٰن صاحب جو کاغذات یونیورسٹی سے چاہتے ہیں۔ وہ آج کل کون بھیجے گا؟ اس کا نام لکھ دیتے۔ تو اس کو بھی میں ٹیلی فون کر دیتا۔ (۱۵ اگست)

ایس اے رحمٰن صاحب ایسے آدمی ہیں کہ جو کام ان کے قبضے میں ہو اور اس میں کوئی جڈیشل پہلو نہ ہو۔ اس کے کرنے میں تامل نہیں کرتے اور طبعاً بھی بے حد شریف و شفیق انسان ہیں۔

قاضی سعید الدین احمد صاحب سے ضرور ملوں گا۔ میرا تعلق ان کے ساتھ اچھا ہے اور محمد امین کے تو بڑے دوست ہیں۔ میں اُن سے کہہ دوں گا . . . . قاضی صاحب میرے استاد حضرت رسا رامپوری کے عزیزوں میں سے ہیں۔ (۱۹ اگست)

میاں افضل حسین سے میں ملا تھا۔ شکایت کرتے تھے کہ سلام نے بہت سخت خط لکھا ہے۔ وہ سارے حالات مدِنظر نہیں رکھتے۔ موجودہ حالات میں دو ترقیوں سے زیادہ کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ آئندہ جب تک وہ ریڈر کے STATUS کے قریب پہنچیں انھیں کسی کالج میں ہسٹری کے لیکچرز کا معاملہ منظور کر لینا چاہیے۔ تاکہ کچھ پیسے ملتے رہیں۔ میں نے کہا۔ مجھے چونکہ تفصیلات معلوم نہیں۔ اس لئے میں آپ کے ارشادات سلام کو لکھ بھیجوں گا۔ وہ لاہور آ کر آپ سے مفصل بات کر لیں گے۔ (۲۵ اگست)

حرفِ آخر

ان دو سالوں میں دو مزید دَورے یورپ کے ہوئے اور ایک سیلون کا۔ لیکن یہ اتنے مختصر دَورے تھے کہ کسی خاص خط و کتابت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

طفیلیت

ڈاکٹر محمد حسن

چاہ کن را چاہ در پیش۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ جو دوسروں پر خاکے لکھے گا ایک دن اس پر بھی خاکہ لکھا جائے گا، محمد طفیل کے خاکوں میں دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں ایک محمد طفیل اور دوسرا ان کے طفیل میں ممدوح کا ایسا بانکا ترچھا روپ جو خود صاحب تصویر کی نظروں سے چھپا ہو۔ ان کے علاوہ کچھ اک" رنج گراں باری زنجیر" بھی ہوتا ہے جسے محمد طفیل کا گہر بار قلم اور تیکھا طرزِ تحریر پرنشاط میں تبدیل کر دیتا ہے۔

محمد طفیل کے بارے میں شاید سب سے انوکھی بات یہی ہے کہ وہ قطعی طفیلی نہیں ہیں بلکہ ان کے طفیل نقوش نے نئی زندگی پائی اور نقوش کے طفیل اردو کے بہت سے نئے ادیب ابھرے پرانے ادیب چمکے اور اردو ادب پر نیا نکھار آ گیا پھر انہی محمد طفیل کے طفیل بے رنگ خاکوں میں ایسے سجیلے رنگ بھرے گئے کہ بہار آ گئی بظاہر سیدھی سادی شخصیتوں کے ایسے ایسے خط و خال واضح ہوئے کہ آدمی بجائے خود ایک محشر خیال بن گیا۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی بادشاہ نے مصوروں کی دو ٹولیوں کا مقابلہ کرایا دونوں کو قصر شاہی کی دو متقابل دیواروں پر بے مثال نقش و نگار بنانے تھے دیکھنا یہ تھا کہ کون زیادہ بہتر تصویریں بناتا ہے ایک گروہ جی جان سے نقش و نگار بنانے میں لگ گیا دوسرے گروہ نے پردہ ڈال کر مقابل کی دیوار کو ایسا صیقل کر دیا کہ جب پردہ ہٹایا گیا تو سامنے کی دیوار کے نقش و نگار زیادہ نکھرے اور ستھرے انداز سے اس آئینہ ایسی دیوار میں جھلک رہے تھے۔ محمد نقوش کا فن بھی کچھ اسی ڈھب کا ہے۔ یہ اپنی شخصیت کو آئینہ ایسی صیقل سے آراستہ رکھتے ہیں اور جہاں کہیں کوئی دلچسپ شخصیت نظر آتی ہے اپنی شفاف شخصیت کو لا سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کے سبھی نقش و نگار ان کی اپنی شخصیت، ان کے اپنے طرز کے آئینے میں جھلکنے لگیں۔

محمد طفیل نے بڑی ریاضت سے اپنی شخصیت کو شفاف بنایا ہے کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ شخصیت آئینہ نہ ہو شیشہ ہو جس سے نگاہیں آسانی سے آر پار ہو جاتی ہیں گرد و کدورت سے پاک، ادیبوں ایسی کاٹ پیچ کرنے والی، ایک دوسرے سے برسرپیکار قوم کے درمیان رہ کر اور ان سے معاملہ کرتے ہوئے اپنے دامن کو کدورتوں سے سمیٹ لے جانا حیرت خیز کام ہے اتنا حیرت خیز کہ بیسویں صدی کے معجزوں میں اس کا شمار کرنا چاہیئے۔

سیدھے سادے طویل قامت، گداز جسم والے محمد طفیل کو باطنی زندگی گزارنے میں بڑا لطف آتا ہے ان کی شخصیت اس آرام دہ موٹر کار کی مانند ہے جو موسمی اثرات سے محفوظ کر لی گئی ہو دبیز پردوں اور آرام دہ سیٹوں سے آراستہ ہو چاروں طرف شفاف شیشے لگے ہوں جن سے باہر کی دنیا کا نظارہ صاف نظر آتا ہو محمد طفیل اپنی شخصیت کے اسی آرام دہ خول میں مزے سے سفر کرتے ہیں۔

یہاں کہیں جاتے ہیں بقول میراجی "میرے پیارے لوگو۔ میرے پاس آؤ" پر کاربند نہیں ہوتے بلکہ پبلسٹی سے گریزاں بلکہ شرمندہ اور حیران ہے نقوش پرستوں کے مجمع سے دامن کشاں۔ ادیبوں سے کچھ اس طرح ملتے جس کا بیان فارسی کے ایک شاعر نے اس طرح کیا ہے۔ دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" یہ ہیں محمد طفیل۔ جب کوئی ان سے بات کرتا ہے یہ گویا اپنے عمل کے لٹمس پیپر پر اس کی باتوں کے نقش اور رنگ ابھرتے دیکھتے رہتے ہیں کیسی شخصیت ابھر رہی ہے کیسے ڈگ کس قسم کے دائرے یا نقش بنا رہے ہیں۔ ممکن ہے باتیں کرنے والا ساری داستان امیر حمزہ ختم کر لے اور یہ ایک چونکا دینے والا جملہ سوچتے رہ جائیں یہ بھی اس لئے نہیں کہ چونکا دینا ان کا فن ہے یا انہیں سننے یا پڑھنے والوں کی واہ واہ عزیز ہے بلکہ محض اس لئے کہ اچھا جملہ ان کے نزدیک کارِ ثواب ہے بلکہ عین عبادت ہے جس کے ستھرے پن اور نفاست کے اس نظامِ اقدار میں اہم مقام حاصل ہے جسے محمد طفیل تہذیب جانتے ہیں۔ جی ہاں۔ محمد طفیل کو نفاست عزیز ہے اور ان کے نزدیک نفاست انسانیت کا دوسرا نام ہے نفاست ان کے ہاں امارت کے ہم معنی نہیں سلیقے سے عبارت ہے نقوش پڑھنے والوں کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر صفحے پر محمد طفیل کی فطری نفاست کی مہر ثبت ملے گی لیکن نقوش کے صفحوں سے باہر بھی نفاست محمد طفیل کی شخصیت کی کلید ہے ہر چیز قرینے سے ہر نکتہ مقام سے ہر لفظ طریق سے حتیٰ کہ خاموشیاں بھی اپنی جگہ پر! یہ ہیں محمد طفیل۔

اور نفاست کے اس معیار نے محمد طفیل کو ایک اور بڑا وصف بخش دیا وہ ہے بے تکی باتوں سے مرعوب نہ ہونے کا وصف ہر انسان، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ادیب، وزیر یا بقول تاباں "توپ" کیوں نہ ہو۔ آخر ہے انسان ہی اور جب انسان ہے تو پھر اس کے لوازم سے رعب کھانا چہ معنی دارد! میرا خیال ہے کہ جس ایک خصوصیت نے محمد طفیل کے لکھے ہوئے خاکوں میں جان ڈال دی ہے وہ یہی عدم مرعوبیت ہے! 'آپ' 'جناب' 'محترم' 'معظم' وغیرہ وغیرہ میں یہ خصوصیت لال دھاگے کی طرح صاف جھلکتی ہے مرعوبیت نہ ہو تو رشتہ موضوع اور مصنف کا نہیں رہتا شخصیت اور فن کا ہو جاتا ہے اور سوال سیدھا سادا یہ رہ جاتا ہے کہ زندگی کے سادہ ورق پر دیئے ہوئے وقت میں کون کس قسم کے نقش و نگار بنا سکا ہے اور کیسے؟ باقی تمام فضائل و مناقب فرضی، تمام تشبیب و گریز مہمل! اپٹے پٹائے لفظوں میں یوں کہئے کہ محمد طفیل "برہنہ حرف گفتن" کے قائل ہیں اور اس برہنگی میں وہ شائستگی اور ہنرمندی ہے جس پر ہزار رنگینیاں قربان ہیں (اب جبکہ تنقید کے نمونے دیکھنے ہوں تو مولانا کوثر نیازی اور منٹو کے خاکے پڑھ ڈالئے)

محمد طفیل کے نزدیک ہر شخص ایک اسٹائل ہے محض اسٹائل اور اس اسٹائل کی کھوج وہ اپنی رگوں میں دوڑتے پھرنے والی عکس ریز نگاہوں سے کرتے ہیں بعض اسٹائل معلق ہوتے ہیں لفظ آپس میں دست و گریباں معنی لفظوں سے برسر پیکار۔ محمد طفیل ان سب کو اپنی اپنی جگہ بٹھاتے ہیں ان کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کا ایک پیٹرن یا آہنگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں کچھ اسٹائل نظر فریب ہونے کی حد تک سادہ ہوتے ہیں لیکن اس فریب سے آگے قدم بڑھائیے کہ پیچیدگیاں دامن کش ہوتی ہیں وہ بھی ایسی جیسے کہتی ہوں کہ 'جا ایں جا است'، محمد طفیل ان پیچیدگیوں میں غلطاں پیچاں تو شب آفریدی چراغ آفریدم، گنگناتے گردش کرتے نظر آتے ہیں غرض محمد طفیل کے خاکوں کے موضوع گویا الگ الگ کائناتیں ہیں جو شخصیت کی سطح پر آباد ہیں اور محمد طفیل غالب کے لفظوں میں شطرنجی اور لوٹا لئے کبھی بغداد جا پہنچے کبھی ایران جا دھمکے۔ الفاظ غالب کے نہیں مفہوم غالب کے ایک خط کا ضرور ہے اسی طرح جیسے شخصیت دوسرے کی ہوتی ہے اور مفہوم محمد طفیل کا۔

محمد طفیل کا آرٹ برجستہ بلیغ مختصر جملوں کا آرٹ ہے! آزما کی بڑی خوبی یہی ہے کہ لفظ کم اور پھیلاؤ زیادہ اور پھیلاؤ ایسا کہ کہاں کہاں نہ گئی طبع بدگماں میری۔ طفیل نے اسے جس طرح برتا ہے اس کی مثالیں کم ہیں بہت کم ہیں ان کا حال یہ ہے کہ سیدھے چلتے چلتے اچانک ایسا موڑ کاٹتے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت انگیز انبساط کا شکار ہو جاتا ہے دو قدم بھی سیدھے چل لیں تو سمجھئے کہ نیکی کی جون میں ہیں ورنہ ایک قدم ایران ہے تو دوسرا توران اور اسی قسم کے تضاد سے طرز تحریر میں ایسا انوکھا پن جگا دیتے ہیں کہ بے محابا لبوں پہ مسکراہٹ کھیل جاتی ہے یا دل میں لطیف درد جاگ اٹھتا ہے یا ذہن میں کوئی نیا خیال کروٹ لینے لگتا ہے۔ شرارتیوں کی اصطلاح میں اسے چٹکی کاٹنا بھی کہا جا سکتا ہے مگر طفیل کو دراصل ردعمل سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی خود عمل سے۔ وہ نیکی کو کنوئیں میں ڈالنے کے قائل ہیں اس لئے نہ ممدوح کے چین جبیں سے غرض رکھتے ہیں نہ داد و تحسین سے انھوں نے تو گویا اپنی عکس ریز نظروں سے مریخ سے آگے کی سربستہ کائنات کو دریافت کر کے رکھ دیا۔ اب اپنی بلا سے، لوگ خوش ہوں یا ناخوش! خود وہ کائنات اپنی دریافت پر نوحہ کناں ہو یا شادماں!

ویسے محمد طفیل واہ واہی نہ ہوتے ہوئے بھی اچھے درد مند قسم کے آدمی ہیں اور یہ بات ان کے خاکوں سے اتنی ظاہر نہیں ہوتی جتنی خود ان کی شخصیت سے برتنے سے۔ وہ دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار ہیں مگر اس قدر خنکی نرمی اور شائستگی سے جیسے ہوا کا جھونکا آپ کا ہمدم ہو اور اپنے وجود کا احساس تک نہ ہونے دے۔ ان کا حال کچھ ان کلاسیکی قسم کے بزرگوں کا ہے جو سیدھے ہاتھ کی نیکی کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہونے دیتے تھے اور ایسی بہت سی نیکیاں ان کے نامۂ اعمال میں ہیں۔ اس معاملے میں ان کا شمار صوفیا میں کیا جا سکتا ہے گو صوف نہیں پہنتے بلکہ صوفیانہ رنگ کے لباس سے بھی احتراز کرتے ہیں مگر صفا سے ان کا تعلق البتہ مستحکم ہے۔

اردو نثر سے درازنفسی کا شکوہ عام ہے غزل میں جتنا ایجاز ہے نثر میں اتنا ہی غیر ضروری پھیلاؤ ہے محمد طفیل نے نثر میں غزل کے شعر کہنے کی روایت قائم کی اور ہر شعر برجستہ اور ہر مصرعہ سہل اور سڈول۔ یہ اپنے خاکوں میں بھی لکیروں سے نہیں نقطوں سے کام لیتے ہیں کسی نے کہا ہے عظیم ترین آرٹ وہی ہے جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اشارے فراہم کر سکے میں نہیں کہہ سکتا کہ محمد نقوش کا آرٹ کتنا عظیم ہے مگر اس میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نکات ابھار دینے کا ہنر تو ہے۔ مولانا محمد علی کا جملہ ہے کہ "مختصر لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔" محمد طفیل کو مختصر نگاری کے اس ریاض کے لئے کتنی ذہنی فرصت درکار ہوتی ہو گی اس کا اندازہ ان کے جملوں میں ارتکاز سے کیا جا سکتا ہے ہر جملہ کہتا ہے کہ صفحۂ قرطاس پر آنے سے قبل ایک عمر شراب کہنہ کے خم میں گزار آیا ہوں۔

مگر جوں جوں آپ۔ جناب۔ محترم۔ معظم کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے میرا جی دھڑکنے لگتا ہے کہ محمد طفیل کہیں اپنی قلم زوری کے بل پر غلط بخشی پر نہ اتر آئیں آخر شاندار قصیدے کے لئے ممدوح بھی ویسا ہی چاہئے غالب تو "وادریغا نیست معشوقے سزاوار غزل" کا ماتم کرتے رہے ممدوح نہ سہی موضوع کی مناسب عظمت کے بغیر تو خیال بندی سے مضمون گڑھ لینے کا فن تو ناسخ تک پہنچا دیتا ہے اور "رُیلے بود در سیستان" کو بھی فردوسی کا قلم رستم بنانے میں بے طرح لگ جاتا ہے جی یہی چاہتا ہے کہ طفیل اب جو تصویر اس نگار خانے کے لئے چنیں وہ ہلکی نہ ہو بلکہ پورے مرقعے کی جادوگری اور طلسم خیزی سے لگا کھاتی ہو۔

اور اس سے آگے اپنے زمانے کے ممتاز اور منفرد مختصر نویس کے بارے میں کچھ اور کہا تو طوالت کا الزام سر آئے گا اور کوئی وہ مصرعہ دہرائے گا

ع کہا جو کچھ تو ترا حسن ہو گیا محدود

آزادیٔ نسواں

بانو قدسیہ

اس سال کی ہیروئین عورت ہے۔ چاند کی تسخیر اور ویت نام کی جنگ کا مسئلہ حل ہو چکا، اس سال عورت کے متعلق کچھ شکوک رفع ہوں گے۔ کچھ نئے زاویوں سے اس کی سمجھ بوجھ پیدا ہوگی۔ پھر نئی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ بحسن اتفاق سے آج یہاں بہت سے دانشور موجود ہیں۔ میری آرزو ہے کہ یہ نشست مثبت ہو۔ اس میں ذہانت کی چمک کم اور نیک آرزوئیں زیادہ شامل ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ سب میری رہبری کریں گے اور ہم سب مل کر مسائل کو جنم نہیں دیں گے۔ بلکہ انھیں سلجھانے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ ابلاغِ عام میں یہ خرابی کبھی کبھی خود ہی پیدا ہو جاتی ہے کہ مسائل سلجھانے کی بجائے وہ انھیں انگیخت کرنے اور بڑھانے میں بھی مدد دیتا ہے اور مسائل کی نئی پنیری لگانے میں بھی غیر شعوری طور پر معاون ثابت ہوتا ہے۔

غالباً آپ سب مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عورت کا مسئلہ کچھ معاشرے کے دوسرے مسائل سے علیحدہ نہیں ہے۔ اور اس کو سمجھنے اور سلجھانے کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ انسان سوشل جسٹس پر بنیاد رکھ کر ہر قسم کے ظلم کو معاشرے سے نکالنا چاہتا ہے تاکہ آزادی، محبت اور یگانگت کی فضا میں ہر شخص اپنی شخصیت اور ذات کی تکمیل کر سکے۔

جس وقت بچے اسکول جاتے ہیں گھریلو کام سے فرصت ملتی ہے۔ گھر دوبارہ آباد ہونے سے پہر بھر پہلے یہ عورت کے لیے لمحۂ فکریہ ہوتا ہے اس وقت عورت کھری چارپائی پر بیٹھ کر پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدتے ہوئے سوچتی ہے۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے؟ ساڑھی اتار کر پیٹی کوٹ، بلاؤز میں فوم کے پلنگ پر اوندھی لیٹ کر جب تعلیم یافتہ ماڈرن عورت تیسرا سگریٹ سلگاتی ہے تو اپنے آپ سے پوچھتی ہے کیا بچے پیدا کرنا؟ انھیں انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا۔ جاہ طلب بنانا، یورپ کے سفر کرنا۔ شوہر کی زندگی SHARE کرنا، معراجِ نسوانیت ہے؟ کیا میری اصلی ذات کا یہی تقاضا ہے۔ کیا میں صرف یہی کچھ چاہتی ہوں۔

مرد جس وقت دفتر سے لوٹتا ہے چاہے وہ سائیکل پر ہو چاہے بریف کیس کو ساتھ والی سیٹ پر رکھے خود کار چلا رہا ہو جس وقت چوراہے کی بتی راستے روکتی ہے سردیوں کی دھوپ اندر باہر شام کر دیتی ہے اور چوراہے کے سامنے والے راستے پر کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے لوگ کسی جنازے کو آخری آرامگاہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہر مرد سوچتا ہے، زندگی کیا ہے؟ زندگی نوکری ہے کہ بزنس؟ زندگی کلب ہے کہ عورت کا عشق؟ —— کار سے آخری آرام گاہ تک یہ سارا فاصلہ کیسا ہے؟ اور کیوں ہے؟

عورت کا احساس بے مائیگی مرد کی بے نام سی بے چینی دراصل اصلی مسئلہ یہ ہے۔ سارے مسائل بالآخر اس

احساس اور بے چینی کی تنگ گلی کی طرف نکلتے ہیں اور COSMIC LOUCIVUSNESS میں جا کر ملتے ہیں۔ عورت کا مسئلہ مرد کے مسائل طے کیے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ مرد اپنی الجھنوں کو عورت کی اعانت کے بغیر سلجھا نہیں سکتا۔ کیونکہ روپے کے چاہیے دو رُخ ہوں روپیہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے یہ جب بھی DEVALUATE ہوتا ہے تو اس کے دونوں رخ ایک وقت میں بے حیثیت ہو جاتے ہیں۔

آج کی نشست چونکہ خصوصی طور پر عورت، اس کے مسائل، اس معاشرے میں مرد کی دنیا میں اس کی حیثیت پر مبنی ہیں۔ اس لیے مرد کے مسائل آج قیمتی رہیں گے۔ حالانکہ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر مرد کے مسائل طے ہو جائیں تو خود بخود عورت کے مسئلے طے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مرد مثل چارپائی کی چوکھاٹ کے ہے اور عورت ادوائین اور بان کے۔ اگر چوکھاٹ برساتوں کی وجہ سے خراب ہو جائے تو پھر صرف ادوائین اور بان کے ڈھیلا کرنے اور کسنے سے چاروں پاؤں ٹھیک طور سے فرش پر نہیں لگتے۔

مرد کو اپنی خود ساختہ مشینری ٹیکنالوجی، تعلیم اور ترقی کا غور سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اسے بار بار سوچنا پڑے گا کہ 'PAPER CURRENDY' زر کاغذ نے دنیا کو کتنا سکھ اور کتنی مہنگائی عطا کی ہے؟ اسے اپنی ایجادات کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان کی شکل پہچاننا پڑے گی۔ ورنہ دنیا میں آخر کو صرف ہتھیار اور H. BOMB رہ جائیں گے اُسے اپنے تعلیمی ادارے اپنی سیکولر سوچ کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھنا ہوگا۔ اپنے گھڑے ہوئے قانون کو سچی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ مرد کو کہ وہ عورت اور بچے کے تحفظ کے لیے پیدا کیا گیا تھا کیا اس کی تجویزوں نے عورت کی زندگی اور بچے کی زندگی میں سہولت پیدا کی ہے کہ ان دونوں کے لیے مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں جینا دشوار ہو گیا ہے؟ مرد کی اس پیچیدہ مشینری نے جس کا نام شہر ہے اور شہری معاشرہ ہے۔ آج کی عورت اس معاشرے میں کہاں کھڑی ہے؟ اس کی سائیکی کیا چاہتی ہے! کیا وہ فقط ناشکری ہے؟ کیا وہ صرف مظلوم ہے؟ کیا عورت اپنی حیاتیات ہسٹری، ANTHROPOLOGY سے پرے کچھ نہیں؟ کیا عورت اپنے CHROMOSOMIS اپنے GENES کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے؟ کیا عورت مرد کی ایجادات کے خلاف ایک مثبت سنگ میل ہے؟

سب سے پہلے ہم عورت کی ساخت .. . سے چلتے ہیں۔ عورت کی حیاتیات مرد سے مختلف ہے۔ اس قدر مختلف ہے کہ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ مرد اور عورت دو مختلف صنف انسانی SPECIES سے تعلق رکھنے والے نہ ہوں۔ ایک مرتبہ ایک قاز اور ایک مور جنگل میں جا رہے تھے۔ کسی نے دریافت کیا کہ بھائی بظاہر تم دونوں میں واضح اختلاف ہے ضرور کوئی قدر مشترک بھی ہوگی۔ جس کے باعث تم دونوں ہر وقت اکٹھے رہتے ہو۔ دونوں پشیمان ہو کر بولے بدقسمتی سے ہم دونوں لنگڑے ہیں۔ یہی ہماری قدر مشترک ہے اور اسی کے باعث ہم ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔

غالباً مرد اور عورت میں بھی اس قسم کی ایک قدرِ مشترک ہے کہ دونوں جنت سے ایک وقت میں نکالے گئے، اور زوج ہونے کی حیثیت سے جب بھی یہ دونوں باغ بہشت میں داخل ہوں گے اکٹھے ہوں گے۔ لاکھ یہ ایک دوسرے سے استاذی کریں

اس معاملے میں ایک دوسرے سے دغابازی نہیں کر سکتے۔

واضح فرق جو مرد اور عورت میں ہے۔ اس قدر ہے کہ ایک (منفی قطب) NEGATIVE POLE ہے اور دوسرا (مثبت قطب) POSITIVE POLE ہے۔ ان دونوں کے اتصال کے بغیر بجلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ روشنی نہیں ہوتی۔ نسل انسانی آگے نہیں بڑھتی۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں ایک دوسرے کی ہمدردی محبت، دشمنی یا مقابلے کے باوجود ایک سے نہیں ہو سکتے۔

اس بنیادی فرق کے باعث کچھ ذمہ داریاں دونوں پر الگ الگ صورتوں میں عائد ہو جاتی ہیں۔ کچھ سطحی، کچھ عمیق، کچھ اغراض واضح کچھ غیر واضح۔ کچھ وابستگی دائمی، کچھ ناپائیدار، کچھ حقیقتیں اصلی کچھ جعلی، کچھ مسائل حل طلب کچھ لاینحل ابھرتے رہتے ہیں۔ ان دونوں کی (حیاتیات) BIOLOGY گہری تبدیلی سے تعلق رکھتی ہے۔ بچپن، جوانی، درمیانی عمر اور بڑھاپا ہر مرحلے پر ان کے (خلیوں کا سلسلہ) TISSUE بدلتے رہتے ہیں۔ توڑ پھوڑ تعمیر کا عمل جاری رہتا ہے۔

عورت کا سب سے بڑا مسئلہ جو اس توڑ پھوڑ سے پیدا ہوتا ہے عمر کا مسئلہ ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے مرد موت سے ڈرتا ہے۔ موسموں کا بدلنا، سفروں پر جانا، دوستوں سے بچھڑنا ہر قدم پر وہ موت کے بھوت سے بھاگتا ہے۔ عورت کی جوں جوں عمر بڑھتی ہے وہ بدشکلی، بدہیئتی بڑھاپے سے خوفزدہ ہوتی ہے۔

مرد چونکہ زچگی کا بوجھ نہیں اٹھاتا بچے کی پرورش میں اس کا رول باربردار جانور کا سا نہیں ہے۔ اس لیے اس کی کاٹھی پر عمر کی ضربیں کافی دیر تک چھپی رہتی ہیں۔ ماڈرن تعلیم یافتہ مرد جو مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہو اور شہری زندگی بسر کرتا ہو وہ عمر سے خوفزدہ ہو کر اپنی ساری پوٹنسی POTENCY (قوتِ مردمی) کو بنک بیلنس، حیثیت، ساکھ عزت آبرو میں بدلنے لگتا ہے۔ لمبی سی کار سے اترنے والا جس کے دروازے کھولنے کو چپراسی اور بریف کیس اٹھانے کو پی اے ہو کار سے اترتے وقت اس کی پتلون کی کریس جوتی میں جھلکے، کولون، چیک بک اور پائپ کا دھواں اس کی تازگی میں اضافہ کر رہے ہوں۔ جس کے گھر میں شاور ہاٹ کولڈ باتھ ہائی فی اور رنگین ٹیلی ویژن ہو۔ جو آئے تو دوبئی کا شیخ لگے جائے تو اوناسس کا شبہ ہو۔ ایسے مرد کی سائیڈ برنس SIDE BURNS اگر سفید بھی ہوں تو اس کے گلیمر اس کی پوٹنسی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور کچھ نہیں تو اپنی سیکوریٹی، شان اور سٹیٹس کی خاطر لڑکیاں اُسے توجہ طلب سمجھیں گی اور زندگی کا راستہ ہنسی خوشی اس کے ساتھ گزارنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔

اس کے برعکس ایک پچاس سالہ عورت کو میک اپ سے ہر طرح مرمت کر کے دولت کی تمام نمائشی جھنڈیاں لگا کر گزار دیجیے تمام تر مشین از سرِ نو مرمت کر دیجیے۔ پھر بھی پرانے ماڈل کی کار خریدنے پر شاذ ہی کسی کو رضامند کیا جا سکے۔

جب عورت کے ٹخنے بھاری ہونے لگتے ہیں۔ وہ منہ اور ٹانگیں کھول کر سونے لگتی ہیں۔ گھر میں اس کی باتیں ملازمہ اور جمعدارنی کے علاوہ کوئی نہیں سنتا۔ جب گھر کے بچے اُسے ماں کہتے ہیں اور گلی کے چھوکرے اُسے دادی اماں بلانے لگتے ہیں۔ یہ عمر عورت کے لیے خوفناک عمر ہے۔ اس وقت اُس کے اندر سانسوں کا سائفن لگ جاتا ہے جو پچھلی کمائی ہوئی خوشیاں

باہر پھینکتا جاتا ہے اور اس کے بدلے جھریاں، بلڈ پریشر، بک بک جھک جھک کی عادت خالی دن خالی راتیں عطا کرتا جاتا ہے۔ اس عمر کا خوف اُسے جوانی میں ہی عطا ہو جاتا ہے۔ جب کبھی وہ اچانک کسی بوڑھی عورت کو دیکھ لیتی ہے تو سوچتی ہے کہ کیا کبھی میں بھی اس طرح ہو جاؤں گی؟

یہ مسئلہ عورت کی BIOLOGY کا ہے۔ بنیادی ہے اور اس کا غالباً کوئی حل نہیں ہاں اگر تمام مردوں میں وہ وسعتِ قلب پیدا ہو جائے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کے معاملے میں دکھائی تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے میک اپ، دولت سب وقتی علاج ہیں اور ان کا اثر کبھی دیرپا نہیں ہوتا۔

برٹرنڈرسل نے گو اپنی زندگی میں کسی مثال سے اس مسئلے کا حل نہیں کیا۔ لیکن کچھ نظریات ایسے پیش کئے ہیں جن سے اس مسئلہ کی کچھ وضاحت ہو سکتی ہے۔ برٹرنڈرسل کا کہنا ہے کہ عورتیں عموماً مرد کے کردار سے محبت کرتی ہیں اور مرد عورتوں سے ان کی ظاہری بناوٹ، جاذبیت اور جوانی کے باعث محبت کرتا ہے۔ چونکہ محبت ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس لیے ہر شخص پرستش کرنے والے کے سامنے مجبور ہے۔ وہ بندگی کرنے والے کے آئیڈیل میں ڈھلنا چاہتا ہے تاکہ محبت کرنے والے کا صدقہ جاریہ چلتا رہے۔ اور آئیڈیل سے گرنے کے جرم میں محبت کی بنیادی ضرورت تشنہ نہ رہ جائے۔ عورت کا آئیڈیل مرد کو شاعر، انجینئر، آئن سٹائین، دانشور، ادیب، ایکٹر، موسیقار بننے پہ مجبور کرتا ہے۔ مرد کی محبت عورت کو تھرڈ تل کیلنڈروں پہ چھپنے والی تصویر، ایکٹرس نما حسینہ فاحشہ PIN UP GIRL بننے پر اکساتی ہے۔ بڑے سے بڑے آدمی کی محبت نے وہ بالیدگی پیدا نہیں کی۔ جو معمولی سی معمولی عورت کی محبت نے مرد میں اُبھاری ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو مرد اور عورت ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ زندگی کے ہر دور میں ان کی نظر ایک دوسرے پر ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے توقعات وابستہ کئے رکھتے ہیں۔ انسانی ترقی تنزلی کے ساتھ ساتھ ہر عہد میں ہر ملک میں نئے آدرش پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ فیشن اس بات کا مظہر ہے کہ پچھلے آئیڈیلز کی شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے۔

پاکستان کے پاس ابھی سنہ ۱۹۶۰ء تک عورت کا جو آدرشی تصور تھا وہ آج کی تعلیم یافتہ ماڈرن لڑکی سے بہت مختلف تھا۔ سنہ ۱۹۶۰ء کی مس پاکستان کی اساس مذہب، تہذیب اپنی زبان، اپنے لباس، پرانے رسم و رواج اور اس ملک کی - ECOLOGY پر تھی۔ یہ تصور ایک پاکباز عصمت مآب عورت کا روپ تھا۔ جو بہر طور غم سہتی صبر کرتی اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے بغیر ہر رنگ موسم اور حال میں وفا کی دیوی تھی۔

پچھلے پندرہ سالوں میں مغرب سے ابلاغِ عام کے طفیل بہت سے آئیڈیلز بھی امپورٹ ہو گئے ہیں۔ اب ان گنت کتابیں، بے شمار فلمیں، کئی قسم کے GOD GETS نے مرد کی ضروریات اُس کی آرزوؤں کا دھارا آہستہ آہستہ موڑ دیا ہے۔ کاما سوترا سے کر KINSWY REPORT تک اور منی سکرٹ سے لے کر میکسی گاؤن تک ہر تبدیلی نے مشرق کے مرد کے آئیڈیل میں کئی قسم کے شگاف ڈال دیئے ہیں۔ آج کا مرد شدید تضاد کا شکار ہے۔ اب مغربی علوم ان کے نظریات ان کے کلچر اُن کی آزادی نے پچھلے بدن میں نئی روح پھونک دی ہے فرائڈ نے جب

سے جنس کی اہمیت جگائی ہے۔ ہمارے مرد بھی NYMPHOMANIAC لڑکیوں کے متعلق خوش تعلقی سے سوچنے لگتے ہیں۔ اب ہمارے معاشرے میں بھی AMBER LOLITA اور میڈیم بواری نظر آنے لگی ہیں۔

ظلم سہنے والی صبر کرنے والی وفا کی دیوی اب مڈل کلاس نظر آتی ہے اور رفتہ رفتہ آؤٹ آف ووگ ہو رہی ہے۔ آج کا نیا مرد مشرقی لڑکی کی جگہ جنسی کشش والی جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہو اس کا خواب دیکھتا ہے جس کا میک اپ اتنا ستھرا ہے جیسے قلم پر SOLUTION کی جھلی چڑھی ہو۔ ایسی لڑکی کو دیکھنے کے بعد چھچھوندر کی طرح دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے والی مشرقی لڑکی بے رنگ بے آب اور بے ذائقہ لگتی ہے۔

بھاگ بھاگ کر سسرال والوں کی خدمت کرنے والی ساس نندوں کے طعنے سہنے والی مرد کو مجازی خدا سمجھنے والی کے ساتھ آج ماڈرن مرد کا دل نہیں لگتا۔

مرد نے جب سے محبوبہ کا آئیڈیل تبدیل کیا ہے۔ مشرقی عورت کا سب سے پیچیدہ مسئلہ مرد کے آئیڈیل کو نہ سمجھ سکنے کا مسئلہ ہے۔

ہمارا مرد تیزی سے علم میں کلچر میں مادی ترقی میں مغرب کی تقلید کر رہا ہے۔ عورت چودہ سو سال پردے میں رہ ہے۔ اس نے اس صدی میں گھر کی دہلیز کو چھوڑا ہے۔ کچھ عورتیں مرد کے موجودہ آئیڈیل کو غیر شعوری طور پر محسوس کر کے معاشرے کی معین شدہ حدود سے بہت دور نکل گئی ہیں۔ کچھ تضاد کا شکار ہیں۔ اگر وہ اپنے مذہب کو معیار زندگی بنا تو ان کی مارکیٹ ویلیو کم ہو جاتی ہے۔ مغربی سانچے میں ڈھلیں تو پبلک اوپنین زیادہ تر خلاف رہتی ہے۔

مرد کا حصول چونکہ عورت کی فطرت میں چھپا ہے۔ اس لیے اس تضاد کا اثر ان کی ساری زندگی کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ مادی ترقی نے جس آئیڈیل عورت کی تشکیل کی ہے۔ وہ نئی کار، خوبصورت گھر، اونچے بیوروکریٹ کی زندگی میں فٹ آ والی لڑکی ہے۔

پاکستان کی ذہین تعلیم یافتہ لڑکی اپنے اوپر اعتماد کرنے والی اس آئیڈیل پر کلی ایمان نہیں رکھتی۔ وہ اپنی تعلیم کی وجہ سے معاشی آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ مرد کی خاطر SEXY SUSAN بھی بننا چاہتی ہے۔ لیکن چینی اور روسی نظریا پڑھ کر اسے محنتی زندگی کا بھی شوق ہوتا ہے۔ بڑے بوڑھوں سے پیار اس وقت تک ملتا ہے۔ جب سر پر اوڑھنی اور ہونٹوں پر جی حضوری ہو۔ ایک طرف عمر کا جن بڑھ رہا ہے وقت کم ہے سانچے زیادہ ہیں۔ ڈھلے تو کس میں ڈھلے؟ یہاں مس اور الجھ جاتا ہے۔

کیا عورت صرف ڈھلنا چاہتی ہے؟ کیا وہ پلاسٹر آف پیرس ہے؟ کیا اس کی اپنی کوئی خواہش MBITION نہیں۔؟

کیا وہ صرف مرد کے چوکھٹے میں فٹ ہونے والی تصویر ہے؟

مشکل یہ ہے کہ عورتوں کے متعلق جو بھی اعداد DATA اکٹھا کیا گیا ہے۔ اسے مرد نے اکٹھا کیا ہے۔ ا

اس میں ویسے ہی نقائص موجود ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے GAZETTERE میں تھے۔ مرد عورت کے متعلق ابھی خارجی رنگ میں نہیں سوچتا۔ وہ یا تو محبت میں سرشار ہو کر غزلیں لکھتا ہے نظمیں کہتا ہے۔ ادب تخلیق کرتا ہے یا محبت میں ناکام ہو کر دشمنی اور حسد پر مبنی ایسے مقالے لکھتا ہے جو چاہے شوپنہار کی قلم سے نکلیں چاہے نطشے سے سرزد ہوں۔ جن میں عورت کی برتری سے خوفزدہ ہو کر مرد اپنے زخموں کی زبان سے لکھتا ہے۔

یہ عورت جو مرد سے خوفزدہ ہے۔ جو مرد کے آئیڈیل سے سہمی ہوئی ہے۔ جسے اپنی تعلیم کے انعکاس کی صحیح صورت نظر نہیں آ رہی۔

یہ عورت کون ہے؟ کیا یہ عورت آزادی چاہتی ہے اور اگر یہ عورت جو مشرق اور مغرب کے درمیان فیصلہ نہیں کر سکتی آزادی چاہتی ہے تو وہ آزادی کیسی ہوگی؟ کیا اس کا نمونہ یورپ سے آئے گا کہ چین سے میں چین اور روس کی عورتوں سے ان کی جدوجہد سے اس جدوجہد کی ضمنی قباحتوں سے واقف نہیں ہوں۔

ان کے متعلق میرا علم کتابی ہے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ مغرب کی عورت نے سب سے پہلے تعلیم، ووٹ کا حق، جائیداد کی خرید و فروخت اور پیشے کے انتخاب کی آزادی چاہی۔ مرد کے تعصبات اور اس کے ساختہ قانون نے عورت کو عرصہ تک معاشرے میں پس ماندہ شہری کی حیثیت دی ہے لیکن وہ جائیداد کی شکل میں غلام تھی۔ کہیں معاشرے میں گلدان کی طرح نمائشی چیز تھی۔ کچھ نے انھیں جنسی لذت کا سمبل بنا رکھا تھا۔

بطور انسان عورت کی حیثیت ثانوی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں انگلستان کے سرمایہ دارانہ نظام میں عورتوں کو پہلی مرتبہ ووٹ کا حق ملا۔ ۱۸۸۷ء میں شادی شدہ عورتوں کو جائیداد رکھنے کے قابل سمجھا گیا۔ اب وہ جو کچھ فیکٹریوں میں کام کرنے کے بعد حاصل کرتی تھیں۔ اس پیسے کو اپنے پاس رکھنے کا قانونی حق انھیں مل گیا۔ ٹائپ رائٹر کی ایجاد نے کمرشل دنیا کے دروازے عورتوں پر کھولے۔ فیکٹریوں کے "نان سکلڈ" لیبر کے ساتھ ساتھ وہ دفتروں میں بھی جانے لگیں۔ ۱۸۶۷ء میں پہلی لیڈی ڈاکٹر ELIZABETH ANDERSON میڈیکل پروفیشن میں وارد ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں لبنان، شام، یونائیٹڈ عرب ری پبلک میں عورتوں کو ووٹ دینے کا بنیادی حق ملا۔ ۱۹۵۹ء میں ایران اور افغانستان میں عورتوں کو یہ اجازت دی گئی کہ نقاب کے بغیر زندگی کی جملہ سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں۔ پاکستان میں گو عورتوں کو ووٹ کا حق ۱۹۵۲ء میں ملا۔ لیکن ووٹ کی اہمیت اس کی بنیادی ضرورت سے ابھی مرد بھی اچھی طرح سے آگاہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر عورتوں کو اس حق کا حصول اور استعمال ابھی اچھی طرح سے معلوم نہیں تو زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

پیشے کے انتخاب میں عورت بچے کی وجہ سے ہمیشہ بڑی دبدھا میں رہی ہے۔ مرد کے لیے سدا سے ہزاروں پیشے کھلے رہے ہیں اور عورتوں کے لیے لے دے کے گھریلو کام کاج اور گھرداری کا پیشہ سرفہرست رہا ہے۔ عورت، چاہے بچہ پالنے کی اہل نہ ہو سینا پرونا نہ جانتی ہو۔ کھانے پکانے میں مشاق نہ ہو اس سے ایک ہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ گھریلو امور خوب جانتی ہو۔ مردوں کے لیے چونکہ پیشے ان گنت ہیں اس لیے وہ اپنی طبیعت کی اپج دیکھ کر کسی نہ کسی پیشے میں ----

SPECIALIZE کرکے دور نکل جاتا ہے۔ عورت زندگی کے مختلف مقامات پر مختلف رول ادا کرتی رہتی ہے اور کسی پیشے میں خصوصی ماہر نہیں بن سکتی۔ کبھی وہ ماں ہے۔ کبھی باورچن ہے۔ کبھی دھوبن ہے کبھی نرس۔ اُس میں چھپے ہوئے جواہر کو زندگی بکھیر دیتی ہے بیشتر اس کے انفرادیت کی ہوئی خاصیتوں کو پہچاننے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ جس وقت یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور شہری آبادی نے مشینوں کے باعث ترقی کرنا شروع کی۔ دیہات سے لوگ شہروں کی طرف آنے لگے۔ شہری مرد آبادی فیکٹریوں کا رجوع کرنے لگی لیکن سرمایہ دار استحصال کے معاملے میں ذہین ہوتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ عورت اور بچہ کم اجرت پر زیادہ گھنٹے کام کرنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ مرد مرد مل کر یونین بنا لیتے ہیں اور سرمایہ دار کو تنگ کرتے ہیں عورت اور بچہ ڈرایا دھمکایا بھی جا سکتا ہے۔ بہت جلد انگلستان میں عورتیں اور بچے دھڑا دھڑ فیکٹریوں میں کام کرنے لگے اور جب تک قانونی طور پر بچوں پر فیکٹریاں بند نہیں کی گئیں اور عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد شروع نہیں کی سرمایہ دار چوکنا نہیں ہوا۔ یہاں ایک ضمنی بات یہ بھی کھلتی ہے کہ دیہاتی عورت کا آزادیٔ نسواں سے کوئی تعلق نہیں ہے LIBARATION MOVEMENT دراصل صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والے مسئلوں میں سے ایک ہے۔

پہلے گاؤں سے آباد ہوئے قصبے بنے۔ قصبے بڑھے شہر بنے۔ شہر مل کر منجمد ہوئے۔ بڑے شہروں میں راتوں کو بجلیاں جلیں اور دن کے وقت مشینوں کا شور چمنیوں کا دھواں اُٹھا تو انسانی ذہن ماؤف ہونے لگا۔ نیچر کے قریب رہنے کی وجہ سے جس آزادی خوشی اور رواداری کا احساس ہر وقت رہتا تھا کم ہونے لگا۔ اب تنگ گھروں میں تنگ گلیوں میں بچے زیادہ اور رزق کم لگنے لگا۔ اب حقوق کی باتیں ہونے لگیں۔

ووٹ کا حق۔
پیشے کے انتخاب کا حق۔
پیشہ منتخب کرنے کے بعد مرد کے برابر محنتانہ پانے کا حق۔
پراپرٹی بیچنے اور رکھنے کا حق۔

یہ تمام بنیادی حقوق شہری آبادی کے پاس ہیں۔ جہاں تعلیم TECHNOLOGY جمہوریت، زرکاغذ PAPER CURRENCY عہدِ دوران کے چالو بہت ہیں۔

ہمارا ملک زرعی خوشحالی پر زندہ ہے۔ اس کی سوچ، سائیکی اور فلاح زراعت پر منحصر ہے۔ عورت جس طرح صدیوں سے مرد کے تعصبات کا شکار رہی ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں دیہات بڑے شہروں کے تعصبات کے ہاتھوں سسک رہے ہیں۔ بڑے شہری کی بولی، لباس، دولت کی نمائش، سوچ کا رنگ ڈھنگ قصباتی اور دیہاتی آبادی کو احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے۔ دیہات کی عورت کے لیے تعلیم کے مساوی حقوق، ووٹ کی حیثیت اور پیشے کا انتخاب اُتنا ہی بے معنی مسئلہ ہے۔ جتنا شہری مزدور یا دیہاتی کسان کے لیے۔ اس کے لیے برتھ کنٹرول اور CONTRACEPTIVES بھی بالکل عجیب لعنت ہیں اور ماڈرن تعلیم یافتہ عورت کی طرح وہ ان کا خیر مقدم نہیں کر سکتی کیونکہ زیادہ اولاد ان کے لیے تعظیم کا

باعث بنتی ہے اور کھیتی باڑی میں بہت جلد ان کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے۔ امیر شہری عورت طفیلی کیڑے کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اُسے پیشے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا شوہر حکومت، معاشرے اور دولت کی ایک اہم کڑی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ووٹ کی اہمیت کو بھی بے معنی سمجھتی ہے۔ پراپرٹی والے پر اس کا دبدبہ اسقدر چلتا ہے کہ ایک طاقتور آدمی پر حکمرانی کرنے کی وجہ سے جائیداد اُس کے گرد طواف کرتی ہے۔ وہ جائیداد کے گرد نہیں گھومتی۔

غریب عورت چاہے وہ شہری ہو یا دیہات کی بھوک کی سطح سے اوپر کچھ نہیں سوچتی، اس کے لیے ہر مسئلہ دو وقت کی روٹی ہے۔ سر چھپانے کو آسرا ہے تن ڈھانپنے کو کپڑا ہے۔ وہ اپنی قمیض پر کڑھائی کا نہیں سوچتی اس پر بٹن نہیں ٹانکتی اسے رنگتی نہیں صرف تن چھپانے کا وسیلہ بناتی ہے۔ غریب عورت اور مرد کبھی پیشے کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اُن کے پاس تعلیم اور اثاثہ دونوں نہیں ہوتے جن سے کوئی لائین چنی جا سکتی ہے۔ پراپرٹی ان کے پاس نہیں ہوتی کہ بانٹ سکیں۔ ووٹ کی حقیقت سے ان کی رُوح خوب واقف ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔

اس وقت متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ قدرے ترقی پسند عورت تحریک آزادی کی ناخدا ہے۔ تعلیم یافتہ مرد ہر قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ در پردہ شہری صنعتی میکانکی تقاضوں سے تنگ آ چکا ہے اور اب اکیلا معاشی گاڑی نہیں چلا سکتا۔ وہ چاہتا ہے کہ گھریلو اخراجات میں عورت اب خود کفیل ہو بچے زیادہ نہ ہوں تاکہ چھوٹے گھر میں بچوں کی وجہ سے کہرام نہ مچا رہے۔ اسی لیے اس نے -- COUNTERCEPTIVES ایجاد کر لیے ہیں۔ ماڈرن تعلیم یافتہ مرد کو اب بیوی نہیں چاہیے۔ اُسے ایک ڈیرہ دار بیوی درکار ہے۔ جو اپنا خرچ بھی ادا کرتی ہو کسی بچے کی وجہ سے گھر بھی نہ بندھی رہے، اور مرد کے ساتھ ساتھ گھومتی بھی پھرے۔ آج کے اشتہار T.V. ADDS رسالے سب غور سے دیکھئے۔ جن دُبلی پتلی لڑکیوں کو DOLIZE کیا جا رہا ہے۔ وہ آپ کو باورچی خانے میں اوپری نظر آئیں گی۔ بچے پیدا کرنے کے نااہل دکھائی دیں گی اور کپڑے دھوتے وقت عجیب سی محسوس ہوں گی۔

عورت مرد کی ایما سے حاصل کردہ اپنی نو یافتہ آزادی سے خوش ہے۔

میں عورت کی آزادی کے خلاف نہیں۔۔

میں مرد کی آزادی کے خلاف نہیں۔ آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ لیکن جس آزادی کے لیے کوشش کی جا رہی ہے، اس کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ مرد جسے پیشے کے انتخاب میں آزادی حاصل ہے۔ جو ووٹ دے سکتا ہے جائیداد رکھ سکتا ہے۔ جو جنسی، معاشی، معاشرتی کئی قسم کی مراعات حاصل کر چکا ہے۔ سکون کی کس منزل پر ہے؟ عورت کو یہ بھی جانچنا ہوگا کہ سرمایہ دار ملکوں میں جہاں بنیادی شہری حقوق مردوں اور عورتوں کے تقریباً برابر ہیں۔ وہاں کی معاشی زندگی کیا ہے۔ سویڈن کی عورت کیا پُرسکون زندگی بسر کر رہی ہے۔ نیویارک کی خواتین کیا پُرامن ہیں۔

پراپرٹی کے لالچ نے آج کے سرمایہ دارانہ نظام میں مرد کو اس قدر لالچی بنا دیا ہے کہ نہ وہ زمین کو خدا کی سمجھتا ہے نہ عورت کو خدا کی مخلوق۔ یہ دونوں اس کی جائیداد کی شکل میں ہوں تو بہتر ورنہ وہ ان کے لیے فساد پھیلاتا رہے گا۔ کچھ

عہد پہلے عورت مرد کو ان گناہوں سے بچانا اپنی زندگی کی معراج سمجھتی تھی۔ جو دولت کی غلط بانٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب عورت مرد کو جائیداد، دولت، ترقی سے پیدا ہونے والے مسائل سے بچانا نہیں چاہتی۔ بلکہ مرد کی طرح خود اپنے لیے یہ مسئلے پیدا کرنا چاہتی ہے۔ ان مسائل سے پیدا ہونے والی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ مرد وراثت اور جائیداد کا تصور ہی یک قلم چھوڑ دے بلکہ وہ اپنے لیے بھی ایسے تصورات کو ناگزیر سمجھتی ہے۔ اُسے یہ فکر نہیں کہ مرد آلودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بلکہ مقابلے کے طور پر وہ اپنے سگریٹ اپنی شراب اور اپنے گناہ اکٹھے کرنے میں مصروف ہے۔ شہری زندگی جہاں مقابلہ سخت ہے۔ غالباً عورت مرد کے ظلم و استبداد سے بچ بھی نہیں سکتی۔ ظلم سے بچنے کی غالباً واحد صورت یہی ہے کہ ظالم کا آدھا ظلم ہتھیا کر اس کی طاقت آدھی کر دی جائے۔ عورت کی تحریک آزادی ظلم آدھا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

ووٹ کی اہمیت پس ماندہ ملکوں میں جس قدر ہے۔ اس کی حقیقت کچھ آپ سے مخفی نہیں ہے ایک ووٹ سے کسی عام شہری کی زندگی کس قدر سنورتی ہے۔ یہ بات واضح ہے۔ لیکن یہ خصوصی حق مردوں میں ایک خاص قسم کی خصوصی برتری پیدا کرتا ہے۔ عورت کو ووٹ نہیں چاہیے۔ وہ اس کی اہمیت اس کی وقعت سے آگاہ بھی نہیں لیکن وہ یہ حق اس لیے نہیں مانگتی ہے کہ مرد کی یہ خصوصی برتری آدھی رہ جائے۔

تعلیم اب ابلاغ کی شکل اختیار کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس میں بلا امتیاز سن و سال بلا تخصیص ذہن رسا بغیر سوچے سمجھے کہ تھوک کے حساب سے ملنے والی تعلیم سے معاشرے میں نفع کی صورت کہاں تک پیدا ہو سکتی ہے۔ تعلیم اب کھلی دکانوں پر ملتی ہے۔ حالانکہ اس کے راشن ڈپو ہونے چاہئیں تھے۔ تعلیم کے اعتبار سے سرمایہ دار مغربی حکومتیں عروج پر ہیں۔ مرد اور عورتیں وہاں ایک دوسرے سے قطعی پیچھے نہیں۔ لیکن لمحہ بھر رک کر ان تعلیم یافتہ لوگوں کے معاشرے کو غور سے دیکھنا پڑے گا۔ ان کے ہاں منشیات کا استعمال اس قدر عروج پر کیوں ہے۔ شادی کی INSTITUTION آخری مرحلوں پر کیوں ہے؟ گروپ شادیاں MARRIAGES اور PERMISSIVE سوسائٹی کیوں بن رہی ہے۔

بوڑھے گھروں میں کیوں جذب نہیں ہو سکتے۔

حرامی بچوں کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے۔

طلاق کیوں وبائی شکل اختیار کر رہی ہے۔

ان امیر ملکوں میں تعلیم عروج پر ہے ترقی عروج پر ہے۔ جمہوریت عروج پر ہے۔ آزادی عروج پر ہے۔ پھر صوفی سنٹر وہاں کیوں کھل رہے ہیں۔ کس چیز کی کمی ہے کہ سڑکوں پر لوگ ہرے راما ہرے کرشنا پکارتے پھر رہے ہیں۔

ZEN کا مسلک کیوں پھیل رہا ہے۔

شاید سارا قصور خوابوں کا ہے۔ مرد اور عورت اب جب بھی بہتر زندگی کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس کی شکل مادی زندگی کی ہوتی ہے۔ اب وہ عقل کی مطابقت میں اپنی بہشت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بہشت جذب قلب اور اقدار سے

نہیں ملتی۔ مرد کو تو اصلی جنت کھوئے بڑی دیر ہو چکی ہے لیکن ہر عورت کے پاس زندگی میں بہشت کے چھوٹے چھوٹے ایلچی آتے رہتے ہیں۔ وہ عورت کی زبان میں بات نہیں کر سکتے لیکن عورت ان کی بولی خوب محسوس کرتی ہے۔ عورت کی ذمہ داری تھی کہ وہ بہشت کے چھوٹے ایلچی کی ترجمانی کر کے مرد تک پہنچاتی۔ لیکن اس کے اپنے خواب اب بہت حاوی ہو چکے ہیں۔ بچے اب بھی اپنے ساتھ بہشت کا تصور ضرور لاتے ہیں۔ لیکن وہ اب خود نہیں سمجھ سکتی تو مرد کو کیا سمجھائے کہ

——— بچوں کے پاس کوئی ووٹ نہیں ہوتے۔
——— ان کی جیبوں میں زر کاغذ PAPER CURRENCY نہیں ہوتا۔
——— ان کی کوئی جائیداد وراثت میں نہیں بدلتی۔
——— وہ کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔
——— وہ کسی شے پر قابض نہیں ہوتے۔
——— وہ نہ ماضی کی یاد میں مگن ہوتے ہیں نہ مستقبل سے ہراساں رہتے ہیں۔
——— وہ کالے ہوں گورے ہوں پیلے ہوں ان کے لیے ہر رنگ بے معنی ہوتا ہے۔

ہر نوزائیدہ بچہ اپنے وجود کے ساتھ اپنی مکمل بے بسی کے باوصف ہر عورت کو مکمل آزادی کا سبق خوشی کا تصور محبت کا آدرش عطا کرتا ہے یہ عورت کی اور عورت سے منسلک مرد کی بدنصیبی ہے کہ وہ بچے کی طرح معصوم ہونے کی بجائے رفتہ رفتہ بڑی دانشمندی ہوشیاری اور تجویزوں سے بچے کو اپنے جیسا بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ محبت کی زبان بھول کر صرف حقوق کا پہاڑہ پڑھنے لگتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ نہیں کہ حقوق کیوں مانگے جا رہے ہیں۔ کب ملیں گے؟ کیسے ملیں گے؟ لمحۂ فکریہ ہے کہ جب معاشی جدوجہد کے مثبت نتائج نکل آئے۔ شہری زندگی میں مرد اور عورت برابر ہو گئے تو کیا انسانی زندگی UTOPIA بن جائے گی کیا مرد مطمئن ہو جائے گا۔ عورت شانت نظر آئے گی۔ مسائل ختم ہو جائیں گے۔

اس وقت عورتوں کی LIBERATION موومنٹ میں ایک بڑی قباحت موجود ہے۔ جو اس تحریک کو بُری طرح متاثر کرتی ہے۔ مجموعی طور پر بھی اور فرداً فرداً بھی۔ کوئی کوئی عورت کسی خاص مرد سے بدلہ لینے کے لیے تحریک میں گرم جوشی دکھا رہی ہے۔ ان کا ردیہ نٹشے اور شوپنہار جیسا ہے۔ ان کی ضرورتیں نہیں زخم بولتے ہیں۔ کچھ عورتیں خوفزدہ ہیں کہ یہ تحریک کہیں ان خاص مردوں کو ان سے چھڑوا نہ دے۔ جن کے لیے وہ زندہ ہیں۔ کچھ عورتیں محض حیلہ گھونسی ہیں تحریک کو میٹنی شو کی طرح دیکھنے آتی ہیں۔ اور گھر جا کر مردوں سے مل جاتی ہیں۔ دراصل ہر انقلاب کی اساس نفرت ہوتی ہے۔ صرف تحریک آزادیٔ نسواں کی بنیاد نفرت نہیں محبت ہے۔ ہر جگہ ظلم برداشت کرنے والا ظالم کو ختم کرنا چاہتا ہے ظلم ختم ہی اس وقت ہوتا ہے۔ جب ظالم نہ رہے۔ مزدور سرمایہ دار کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے۔ مزدور کسی لمحے بھی کسی سرمایہ دار کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کا آدرش بنانا نہیں چاہتا۔ نیگرو سفید بالادست کو اپنی راہ کا روڑا سمجھنا

ہے۔ لیکن عورت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ وہ ظالم سے محبت بھی کرتی ہے اور اس سے انصاف بھی چاہتی ہے۔ مرد عورت سے محبت بھی کرتا ہے اور اُسے دبا کر بھی رکھنا چاہتا ہے۔ کوئی عورت کسی سوشلسٹ مزدور کی طرح یہ خواب دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی کہ جب وہ مکمل طور پر آزاد ہوگی تو مرد اس دنیا سے ختم ہو چکے ہوں گے۔ تحریک ہے تو فقط اتنی کہ دنیا میں اس کی معاشی بدحالی مکمل مفعولیت کے باعث کئی HANDICAPS ہیں جن کی وجہ سے مرد کے لیے اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس بات کا عورت کو شعوری اور غیر شعوری طور پر احساس ہے کہ مرد جب اس سے محبت نہیں کر رہا ہوتا، اس وقت اُسے کمتر، جاہل، احمق اور غیر ضروری سمجھتا ہے اور اس احساس کی وجہ سے وہ بھی اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگتی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ مادی دنیا میں مرد کی KNOW HOW زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ماڈرن زندگی کی تفریحات نے عورت کی اہمیت کو اور بھی کم کر دیا ہے۔ عورت نے اس مسئلے کا حل یہی دیکھا ہے کہ اب مرد کے پلے گراؤنڈ میں جا کر کچھ کارنامے کیے جائیں۔ تاکہ مرد کو احساس رہے کہ اگر اس نے عورت کا ساتھ نہ دیا تو وہ خود مقابلے پر دھڑلے کے ساتھ آجائے گی۔

ہر تحریک میں یہ آزادی موجود ہوتی ہے کہ ظالم سے نفرت کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس نفرت کے BANNER بنتے ہیں۔ نعرے جنم لیتے ہیں اور اس ہی نفرت سے انقلابیوں کا MORALE جنم لیتا ہے اور اسے اونچا کیا جاتا ہے۔ آزادیٔ نسواں میں بڑی قباحت یہ ہے کہ مایا مچھندر کی اس نگری میں کسی عورت کی روح مرد سے نفرت پر آمادہ نہیں ہوگی۔ نہ بالادست مرد عورتوں کی چیخ و پکار کے باوجود عورتوں سے نفرت کر سکیں گے۔

اس تحریکِ آزادی کی اصل روح اس مصرعے میں نہاں ہے کہ

ع وہی ذبح بھی کرائے ہے وہی لے ثواب اُلٹا۔

اس تحریک کے دوغلے پن کو سمجھ کر عورتوں کی مکمل آزادی کا تصور، ناممکن نہیں تو قریب قریب ناممکن ضرور ہو جاتا ہے اور اسی لیے یہ تحریک اسقدر پیچیدہ بھی ہوتی جا رہی ہے۔

سائمن ڈی BEAUVOIR نے گو آزادیٔ نسواں کے لیے سب سے بڑی شرط معاشی آزادی کی لگائی ہے۔ لیکن عورت کا مسئلہ مزدور کے مسئلے کی طرح سپاٹ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ بظاہر معاشی بحالی کا سہی لیکن درپردہ اس میں نیگرو کی SELF RESPECT بحال کرنے کا بھی مسئلہ ہے۔ عورت نہ اپنی عزت کرتی ہے نہ اپنی ہم جنسوں کی، نہ مرد کو اپنی عزت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ بطور فرد کے ابھی تک اس کا تشخص نہیں ہو سکا۔ مادریت کی تعظیم اور اہمیت کا بھی قصہ ہے۔ اور پھر اتنی حیثیتیں منوانے کے بعد اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ مرد کی توجہ کا مرکزِ ثقل رہے۔ اس طرح جس ظالم DOMINEERING مرد کے خلاف وہ جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کی توجہ محبت، احترام دوستی کے لیے بھی خون پسینہ ایک کر رہی ہے۔ یہی اس تحریک کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اس اعتبار سے یہ انقلاب دنیا کی EVOLUTION میں بالکل منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں معاشی آزادی کے

بس مرد کے محبت بھرے تحفظ سے آزادی حاصل کرنے کا مقصد نہیں۔ یہاں برابری کا دعویٰ کر کے مرد کی بے التفاتی مول نہیں لی جا سکتی۔

مقصد ہے تو فقط اتنا کہ اگر مجھے طعنہ دو گے کہ میری جنس میں GENIUS نہیں ہے تو میں گھروں کو ویران کر دوں گی، تمھارا GENIUS ہتھیا لوں گی اور تم پر یہ بھی ثابت کر دوں گی کہ ماں پن میں دنیا کا سب سے بڑا جینیس (GENIUS) چھپا ہے۔ مجھے پاؤں کی جوتی نہ سمجھو ورنہ جوتی تمھارے پاؤں سے اتر کر بے کار نہیں پڑی رہے گی۔ کسی اور کے پاؤں میں فٹ آ کر بھی دکھا دے گی۔ تم مجھے گھر میں محبوس رکھ کر بوجھ ہونے کا طعنہ نہ دو۔ ورنہ میں گھر سے نکل کر نہ صرف تمھارا گھر ہی بے رونق کر دوں گی۔ بلکہ تمھاری روزگار میں برابر کی شریک ہو کر تمھیں بھی بے روزگار کر دوں گی، پھر تمھیں چوراستوں میں اشتہار لگا کر صدا لگانی پڑے گی۔

WANTED A GOOD WIFE NEW OR USED

مشکل اس وقت یہ نہیں ہے کہ عورت آزاد کیوں ہو رہی ہے۔ آزادی بابرکت چیز ہے اور انسان کو سچ سے ہمکنار کرتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اگر مرد نے کسی طور عورت کو اس کی اہمیت کا احساس نہ دلایا تو عورت تین گروہوں میں بٹ جائے گی۔ اس وقت عورت کی جبلت میں وحدانیت ہے۔ پھر تثلیث پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح عورتوں کا ایک گروہ بچے پیدا کرنے پر مامور ہو گا۔ دوسرا گروہ مردوں کے مقابلے کے لیے سرگرم رہے گا تیسرا گروہ طفیلی کیڑوں کا ہو گا۔ جو صرف ڈیرے دارنیوں کی طرح زندہ رہے گا۔ جب تک چکنی چپڑی ملی خوب کھائی بعد ازاں کوڑے کے ڈھیر بن گئے۔

ادھر عورت مقابلے پر اتر آئی ہے۔ ادھر مرد صدیوں عورت کی مادریت سے جلتا رہا ہے۔ وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ اس کا رقیب آغوش میں پلتا ہے۔ ہمارے باپ دادا اسی لیے بچوں کو اس قدر مارتے پیٹتے تھے۔ ہماری عمر کے گروپ والے مرد زیادہ مہذب ہو کر SULK کرتے ہیں۔ لیکن ماڈرن آدمی بہت ذہین ہے۔ اس نے ایک ہی فیصلے سے عورت کو مات کر دینے کی ٹھانی ہے وہ جانتا ہے کہ باہر کی دنیا دوزخ ہے۔ وہ اب عورت کو اس کا ایندھن بننے سے نہیں روکتا، بلکہ مصر رہتا ہے کہ تھوڑی سی تو بھی تاپ کے دیکھ COUNTERCEPTIVES ایجاد کر کے وہ بانس سے بانسری کو علیحدہ کر دینا چاہتا ہے۔ جب دنیا میں عورت نکل آئی اور بچے ضمنی حیثیت کے ہو گئے تو پھر ہر جگہ گھر پر اور باہر مرد کو عورت کی رفاقت نصیب ہو گی۔ اور اس چیز کی مرد کو تلاش ہے۔

میرا سوشلزم کا مطالعہ کم ہے۔ چین جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جو چند کرم فرما گرما گرم سوشلسٹ ہیں اور دائمی ہیں۔ کہ چین کی عورت کو کوئی غم نہیں یہ دوست قابل اعتبار نہیں کیونکہ یہ سب قول کے غازی ہیں اور بڑی آرام دہ زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنا گھر، اپنی مراعات، اپنی دولت کسی اور کے ساتھ بانٹ کر استعمال نہیں کرتے۔ ان کے گھر آراستہ، کاریں لمبی اور بچے ہمیشہ یورپ میں تعلیم مکمل کرنے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چین میں عورت کے مسائل کم ہوں گے۔

لیکن یہاں مزدور کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں عورت کا مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ اس لیے چین میں بھی عورتوں کے مسائل ضرور ہوں گے۔ پچھلے دنوں مجھے WHITE HAIRED GIRL چینی اوپرا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تو خیال گزرا کہ جس وقت

یہ خوب صورت اوپیرا چین کے عوامی تھیٹر میں نمائش کے لیے آیا ہوگا۔ تو اس وقت ہال میں ایک ایسا مزدور بھی آیا ہوگا جس کی بیوی اس کے ساتھ ہوگی۔ دونوں کی معاشی حالت برابر ہوگی۔ اوپیرے کی ہیروئین کو گو محنتانہ مزدور عورت جتنا ملتا ہوگا، لیکن اس کی قدر شناسی، اعتراف شناخت سارے ہال میں تالیاں بن کر گونج رہی ہوگی۔ اوپیرے سے متاثر ہو کر مزدور شوہر نے گرین روم میں جانے کی آرزو کی ہوگی اور چونکہ چین میں مزدوروں سے ہیروئین آسانی سے مل جاتی ہے۔ اس لئے وہ گلدستہ لے کر اپنی بیوی کے ساتھ تحسین اور محبت کے جملوں کے ساتھ گرین روم میں پہنچا ہوگا۔

اس وقت مزدور عورت کے لیے چین جیسے ملک میں ایک مسئلہ ضرور پیدا ہوا ہوگا۔ قدر شناسی کا مسئلہ، قابل تسلیم ہونے کا مسئلہ، رائے عامہ میں اپنی شناخت کروانے کا مسئلہ۔

آج کی عورت اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ پبلک لائف میں اس کے حصے کی تعریف کہاں ہے؟ وہ ایسے کارنامے کیوں سرانجام دینے کی اہل نہیں۔ جس سے گھر پر شہر یا ملک میں اس کی جے جے کار بھی ہو۔ اس سے ہمیشہ گھریلو کام کاج کی توقع کی جاتی ہے جس کام کی نہ کوئی پائیدار مسرت ہے نہ اہمیت اور جو گھٹن پیدا کرتے، اوب دینے اور کولہو کے بیل کی طرح جُتتے رہنے کی زندگی ہے۔

معاشی آزادی کے بعد عورت RECOGNITION کے میدان آئے گی۔ اس کے بعد وہ جذباتی مساوات چاہے گی۔ اگر معاشی آزادی ہی نسوانی معراج ہوتی ہے تو تحریک آزادی کبھی مغرب سے نہ چلتی۔ امریکہ کی عورتیں سب سے زیادہ پُرسکون قانع اور مسرور نظر آتیں۔ امیر عورتوں کو کبھی سائیکوتھیریپی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ غربت کے جھنجھٹ سے نکلتے ہی سوچنے سمجھنے محسوس کرنے جائزہ لینے نتیجے اخذ کرنے کا وافر وقت ہوتا ہے۔ اسی وافر وقت میں سوچ بے اطمینانی کا بیج بوتا ہے۔ جب پہلی بار آزاد عورت کو ساحل ملتا ہے۔ تو اسے پتا چلتا ہے کہ طوفان میں موت کا ڈر تھا اور ساحل پر زندگی کا۔

دراصل تحریک آزادیٔ نسواں کچھ عورتوں کا انقلاب نہیں، مرد اور عورت کی سانجھی خوشی راحت اور آزادی کی کوشش ہے۔ پس ماندہ مرد سوشل جسٹس چاہتا ہے پس ماندہ عورت معاشی انصاف کے لئے جھگڑتی رہتی ہے دو بڑی قدریں برداشت کرنا کسی پس ماندہ طبقے کے لیے بھی مشکل ہوتا ہے۔ راحت خوشی اور آزادی کی جدوجہد شکل ایک زینے کی ہے۔ سب سے پہلی ایک سیڑھی سوشل جسٹس کی ہے۔ اس سیڑھی پر مسئلہ عورت اور مرد کا سانجھا ہے انسانی جسم کی راحت کے لئے چاہے ملیریا کے خلاف جہاد ہو چاہے طبقاتی نظام کے خلاف جدوجہد ہو وہ اکٹھے لڑتے ہیں۔

لیکن ذہنی سکون قلبی راحت کے وقت دونوں ایک دوسرے کے حلیف بن جاتے ہیں۔ مرد اپنی عزتِ نفس کو زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔ عورت کی شدید رغبت کے باعث جو مرد میں جبلّی طور پر موجود ہے۔ مرد اسی مجبوری سے جھنجھلاتا رہتا ہے۔ اُسے اپنے آقا کو جب بھی قید کرنے کا موقع ملتا ہے وہ گن گن کر بدلے لیتا ہے اور بے حد غصیل، جابر اور کمینہ ثابت ہوتا ہے۔ مرد کی سائیکی جانتی ہے کہ عورت اور بچہ مکمل یونٹ ہے۔ کھیتی کا دھرتی کے ساتھ گہرا رشتہ ہے ہوا میں اڑنے والا پولن اپنی مجبوری سے گو بظاہر آگاہ نہ ہو لیکن یہی وہ اُڑان ہے جس سے اپنے بنائے ہوئے معاشرے میں دوہری اقدار ایجاد کرتا ہے۔ عورت ان

دوہری اقدار کے باعث بڑی محجوب رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ پروانہ صورت جو ہفتے کی رات کو ملا تھا وہ کون تھا؟ اور پیر کی صبح کو شیو کرتے وقت منہ پھلانے والا بل ڈوگ کون ہے؟ محبت کے جوش میں غزلیں لکھنے والا کون تھا اور گھر میں تھانیدار کی طرح داخل ہونے والا کون ہے؟

آج کے تعلیم یافتہ شہری کے لیے یہ دوہری اقدار اور بھی ظالم صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ وہ آزادی سے پھرنے والی گستاخ لڑکی سے مرعوب ہوتا ہے۔ پھر اس منہ زور گھوڑے کی محبت میں سرشار ہو کر اسے سدھانے کے لیے شادی کرتا ہے جس سے اندر ہی اندر ہار جاتا ہے۔ اسی پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے شادی کی دوسری صبح وہ شدت سے DOUBLE STANDERD کا شکار ہو جاتا ہے۔ بال کٹی ماڈرن لڑکی سے اس کی توقع ہوتی ہے کہ وہ اطاعت گزار بھولی بھالی سلیقہ شعار بن جائے نہ اس کے منہ میں زبان ہو نہ سینے میں دل۔ عورت ہارتی ہے تو دل و جان سے مرد کی برتری قبول کر لیتی ہے۔ اس لیے کوئی لڑکی اپنے ماڈرن شوہر سے یہ امید نہیں رکھتی کہ شادی کی دوسری صبح وہ داڑھی رکھ کر فلیٹ فٹ پہن کر اس کے اباجی کی طرح فجر کی نماز پڑھنے مسجد چلا جائے گا۔ مرد اپنی مجبوری کو چھپانے کی خاطر توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا ہے۔ عورت کی شراب اس کے منہ کو ضرور لگ جاتی ہے۔ لیکن اس شراب کے ساتھ وہ کبھی ذہنی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے خود بخود اس میں اس ذہنی کیفیت کی وجہ سے دوہری اقدار پیدا ہونے لگتی ہیں۔ عورت نسل بڑھانے کی خدمت پر مامور ہے۔ اس لیے اس کی سمت ہمیشہ ایک رہتی ہے۔ اور اس میں جھلاہٹ اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب مرد کی دوہری اقدار کو سمجھتے ہوئے وہ مرد کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش کرتی ہے۔ مرد نے معافی کے اپنے لیے بہت سے راستے کھول رکھے ہیں۔ اپنی بقا کے لیے کئی قانون بنا رکھے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو کبھی بیالوجی کا سہارا دیا ہے کبھی --- ANTHROPOLOGY کا۔ عورت مرد کی ان دوہری اقدار سے اس قدر بوکھلا گئی ہے کہ نشائی لاک کی طرح اس ظلم کے خلاف بلبلا اٹھتی ہے۔

مارگریٹ میڈ کا خیال ہے کہ مغرب کے معاشرے میں عورت اپنے رول میں فٹ نہیں ہے۔ وہ سمویا کی عورت کی مثال دیتے ہوئے کہتی ہیں۔ کہ جب تک عورت اپنے عورت پن پر فخر نہ کرے گی اور مرد کی تقلید اس کی ہمسری یا اس سے تقابل کرنا نہ چھوڑے گی اس کے بیشتر مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

مشکل یہ ہے کہ شہری زندگی میں جنگل کا قانون نہیں چلتا۔ دیہات کا رواج بھی نہیں چلتا۔ سمویا کا رہن سہن بھی رائج نہیں کیا جا سکتا۔ تاوقتیکہ سارا معاشرہ ہی اتنی بڑی تبدیلی پر رضامند نہ ہو۔ شہری معاشرے کا تقریباً سب کچھ اَن نیچرل اور انسان ساختہ ہوتا ہے۔ یہاں بیٹی، ماں اور بہن کے روپ میں چونکہ عورت کا رشتہ نیچرل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا تحفظ بھی طبعی جذبات سے کیا جاتا ہے۔ ان (ROLES) کو چونکہ معاشرے نے نہیں لہو نے جنم دیا ہے۔ اس لیے ان میں تمام نمائشی، فرضی، اقناعی واجبات بھی نہیں ہوتے۔ محبوبہ کا روپ بھی قدرتی ہے۔ اس رول میں محبوبہ کسی قسم کی بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتی۔ کسی تحریک آزادی میں شامل نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس حالت میں اس کے صرف حقوق ہوتے ہیں وہ کسی قسم کے فرائض بجا نہیں لاتی۔

آفت زمینی و سماوی کی اصلی جڑ عورت کا وہ روپ ہے جب وہ بیوی بنتی ہے اور پھر بیوی بنی رہتی ہے۔ اس رول میں ہر سال کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق کم ہوتے جاتے ہیں اور فرائض دن بدن بڑھنے لگتے ہیں۔ قدرتی رشتوں جیسا طبعی تحفظ اسے نہیں ملتا۔ حقوق کی تکرار سے زندگی میں پابندی، بیزاری اور بے لطفی کا بڑھنا یقینی امر ہے۔ چاہے رعایا حکومت سے حقوق مانگے، ملازم افسر سے یا بیوی شوہر سے۔ مانگنے والا اپنا حق سمجھ کر اصرار کرتا ہے اور دینے والا بنک کے قرض کی طرح ایسے روز افزوں بڑھتا پاکر ناگواری کا اظہار کرتا ہے۔ ماں بیٹی و بہن کے روپ کا غور سے مطالعہ کیجیے۔ اس میں عورت لاکھ غریب خاندان کی ہو وہ جذباتی طور پر کبھی پس ماندہ نہیں ہوتی۔ مشرقی ممالک میں تو خاص طور پر مفلوک الحالی بسا اوقات ان رشتوں کے لیے رحمت کا باعث ہوتی ہے۔ عموماً غریب اولاد ہی ماں کے پاؤں تلے جنت تلاش کرتی ہے۔ امیر بھائی کبھی بہن کی آبرو بچانے کے لیے جان کی بازی نہیں لگاتے بیٹی کی خوشی کی خاطر سارا نباہ کرنے والے بھی عموماً بہت غریب ہوتے ہیں۔ یہاں رک کر لمحہ بھر کے لیے سوچنا پڑتا ہے کہ ان تین قدرتی رشتوں میں عورت اتنی مطمئن کیوں ہے۔ خاندان کے مسائل اس کے مسائل ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن گھر میں اسے کوئی غیر ترقی یافتہ ملک کی طرح بے مایہ بے حیثیت اور کمتر ہونے کا احساس نہیں دلاتا۔ محبوبہ کے روپ میں وہ ہمیشہ AID دینے کے قابل ہوتی ہے۔ صرف جس وقت حسن اور محبت کی تیلیوں سے شادی کا پنجرہ بنا کر اس پر شوہر کا پھاٹک اور بچوں کے تالے لگا کر معاشرہ عورت کو اس میں بند کرتا ہے۔ اس کے ذاتی انفرادی اور پیچ در پیچ مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہتی ہوں کہ مشرقی معاشرے میں ماں، بیٹی اور بہن کو مسائل سے چھٹی نہیں ہوتی انھیں مشکلات در پیش ہوتی ہیں اور رہتی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ان کی محبت ان کی شخصیت کو نہ کوئی چیلنج کرتا ہے نہ اس پر اعتراض کرتا ہے جس وقت عورت کی شادی ہوتی ہے شکایات بڑھتی ہیں۔ جوں جوں سننے والے کی بے حسی بڑھتی ہے عورت اپنا .AMPLEIER اونچا کرتی جاتی ہے رفتہ رفتہ شادی بیاہ پر بجنے والے سپیکرز کی طرح آواز تو آتی رہتی ہے۔ لیکن سننے والے موجود نہیں ہوتے۔

عورت کی زندگی کا مشکل ترین مسئلہ اس وقت پیش آتا ہے۔ جب جنس اور محبت کو قانونی بندھن میں بدل کر وسکی اور پانی ملا کر پینے کا حکم ملتا ہے۔ شادی اور جنس ہر فرد کی زندگی میں چوراہے کی بتی بن کر کھڑی ہیں۔ شادی لال بتی ہے جو ضبط و نظم پیدا کرتی ہے۔ حقوق و فرائض کی پابندی کراتی ہے۔ جو دوسروں کے پاؤں پر فل سپیڈ چلنے سے روکتی ہے۔ جنس کی ہری بتی کھلا راستہ ہے، ACCELERATOR پر پاؤں ہوتا ہے تیز رفتاری کی وجہ سے نہ حادثے کا خوف ہوتا ہے نہ پٹرول کی کمی کا ڈر۔

لیکن محبت اندھی ہے۔ نہ بتی دیکھتی ہے نہ راستہ۔ وہ ایک ایسی کار کا ہارن ہے۔ جس کی تاریں کہیں اندر ہی اندر مل جاتی ہیں۔ پھر دیوانہ وار جدھر بھی جائیں ہارن پر ہاتھ رکھیں نہ رکھیں دل کا ہارن بجتا رہتا ہے۔

اگر جنس فطری امر ہے اور محبت غیر اختیاری فعل ہے تو انسان کی جسارت دیکھئے کہ اس نے یہ دو بڑی بے بس کرنے والی طاقتوں پر شادی کا بڑا GRID باندھ کر سارے معاشرے میں چکا چوند پیدا کر دی ہے۔ انسان بڑا مشکل پسند اذیت

طلب اور مہم جو ہے۔

اس لیے اس نے شادی ایجاد کی ہے جو رابطوں کی مشکل ترین شکل بھی ہے اور معراج بھی۔

جمہوریت، سوشلزم، مذہب اور شادی کی کڑی شرط یہ ہے کہ اگر عقیدہ نہ ہو ایمان پختہ نہ ہو تو یہ سارے نظریے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صدی میں چونکہ چھان پھٹک زیادہ ہے اور عقیدہ ایمان اور یقین کلی ثانوی چیزیں ہیں۔ اس لیے شادی کے لیے یہ صدی بڑی خطرناک ہے۔ کیونکہ اس میں اوّل و آخر حُسن و محبت کا احتساب ہوتا ہے۔ غریب مرد عورت زیادہ وقت بھوک کے بھالو کو دروازے سے باہر دھکیلنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہاں مار پیٹ بہت ہوتی ہے، لیکن جنس اور محبت کو گھر سے باہر تلاش کرنے کے لیے عموماً نہ اثاثہ ہوتا ہے۔ نہ وقت اس لیے شادی کا سرکٹ بہت کم شارٹ ہوتا ہے۔

مڈل کلاس عورت اور مرد دونوں حب جاہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انھیں اوپر والے طبقے میں داخل ہونے کا فکر ہوتا ہے اس طبقے کی عورت کے پاس بہشتی زیور بھی ہوتا ہے۔ اور مغربی تعلیم بھی، میک اپ کا سامان بھی ہوتا اور ماؤ کی چھوٹی سی سُرخ کتاب بھی یہاں پہنچ کر بار بار شادی کے فیوز اُڑانے لگتے ہیں۔

امیر عورتیں اپنے ناشکرے مردوں کی طرح سب کچھ پا لینے کے بعد زندگی سے نو بہ نو اشتعال انگیز کھیل تماشوں کا تقاضا رکھتی ہیں۔ وہ شوہروں کی دولت پر شکم پروری کرنے کے بعد شوہروں کو سوڈا منٹ کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ ان کے لیے شادی کی بوریت کو ختم کرنے کے لیے تفریحات درکار ہوتی ہیں۔

بہت جلد تفریحات سے اپنی اہمیت اُجاگر ہونے کے بجائے بے وقعتی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ کار کی مشین کی طرح ہر چیز کی نقل مثل اصل ملتی ہے۔ ہر خوشی و راحت زائد پرزوں کی شکل میں دستیاب ہوتی ہے۔ شادی کے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا ہے شادی کے ساتھ بھی چلتی رہتی ہے۔

شادی میں ایمان سب سے بڑا جزو ہے۔

دیہاتی مرد کو کھیتوں کھلیانوں میں سچے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر پر اسے بچے پالنے والی درکار ہوتی ہے۔ جو اس کی زمین کے جائز وارثوں کو محبت سے پروان چڑھا سکے۔ کسان کو بچے درکار ہوتے ہیں، کیونکہ وہ شہری آبادی کی تنگ سی گلی کے تنگ سے مکان میں نہیں رہتا۔ چونکہ شادی یہاں سچی نیچرل آرزوؤں کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے۔ اس لیے عورت کے لیے یہاں مسائل کم پیدا ہوتے ہیں۔

شہروں میں خاص کر بڑے شہروں میں شادی اور مذہب پر سے لوگوں کا اعتقاد اٹھتا جا رہا ہے۔

یہاں شادی نظریات کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

تعلیم یافتہ نو مغرب زدہ طبقہ محبت کے ہُما کو زیرِ دام لانے کے لیے شادی کرتا ہے۔

حب جاہ کے متلاشی مرد عورتیں اپنا STATUS (اپنی حیثیت) بڑھانے کے لیے اس غیر فطری بندھن کی سختیاں قبول کرتے ہیں۔

کبھی کبھی شادی خاندانوں کو طاقتور بنانے کے لیے ظہور میں آتی ہے۔
کچھ شہری آبادی جو بوجوہ اپنے خاندانوں سے کٹ جاتی ہے۔ تنہائی کے ہاتھوں مجبور ہو کر شادی پر ایمان لے آتی ہے۔
ایسی شادیاں یورپ اور امریکہ میں کثرت سے ہوتی ہیں۔
کچھ شادیاں جنسی تجسس کی تسکین کے لیے ہوتی ہیں۔
کہیں ناک کٹ جانے اور کہیں شملہ اونچا کرنے کی سوچ ہوتی ہے۔

شہر کے افراد چونکہ انسان ساختہ چیزوں کے قریب ہوتے ہیں اور فطرت سے کٹے ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں اپنے نظریات بہت پیارے ہوتے ہیں۔ جوں جوں وہ اپنی IDIOLOGY میں راسخ ہوتے جاتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ میل جول میں مشکلات پیش آنے لگتی ہیں کیونکہ دوسرے شہریوں کو بھی اپنے نظریات عزیز ہوتے ہیں۔ اسی لیے شہری شادی میں ہمیشہ ٹائم بم چھپے ہوتے ہیں۔

ایک طرف بیرونی نظریات کا تصادم
دوسری طرف خود اپنے نظریات کا ارتقا۔

نظریاتی شادیوں کے نبھانے کا بوجھ زیادہ تر عورتوں کے کندھوں پر ہوتا ہے اسی لیے تصادم کی صورت میں متاثر بھی وہی زیادہ ہوتی ہیں۔ نظریے کچھ ابلاغ کی وجہ سے کچھ زیادہ میل جول کے باعث سوشل لائف کی وجہ سے جلدی جلدی باطل ہوتے جاتے ہیں۔ عورتیں جو ایک نیچرل فنکشن کے لیے بنی تھیں۔ زیادہ وقت ان نظریات کے الٹ پلٹ میں گزارتی ہیں۔

پہلے شادی سے فقط ایک اُمید رکھی جاتی تھی کہ بچے پیدا ہوں گے۔ نسل انسانی آگے بڑھے گی۔ چونکہ انسانی بچہ دیر تک دیکھ بھال چاہتا ہے اور سازگار ماحول میں بہتر پرورش پاتا ہے۔ اس لیے ضمنی اُمید یہ بھی رکھی جاتی تھی کہ ماں باپ یگانگت اور محبت سے بھی رہیں گے تاکہ بچہ زندگی سے مقابلہ کرنے کے لیے جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر زیادہ مضبوط ہو۔

اب شادی تنہائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔
جنسی آسودگی کا کم قیمت اور آسان طریقہ ہے۔
سوسائٹی میں اوپر چڑھنے کا زینہ ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ کئی صدیوں سے مرد اور عورت نے عقیدت کے طور پر جنس اور محبت کے تمام فطری حقوق کی قربانی دے کر بچے کی پرورش کو انسانی زندگی کی معراج سمجھا۔ یہ اس کا ایمان تھا کہ قبر سے ادھر گھر انسان کا محفوظ ترین مسکن ہے۔

لیکن ماڈرن زندگی میں بچہ ایسی زنجیر رکاوٹ اور بے معنی چیز ہے۔ جو زندگی کی گہما گہمی کو بے لطف کر دیتا ہے۔ عورت اس بورنگ کام کے لیے نہ نوکری چھوڑ سکتی ہے نہ ذات کو تقویت پہنچانے والی کوئی سرگرمی ختم کر سکتی ہے۔ لیکن جہاں قدرتی اہمیت ختم

معاشرے وہاں غیر فطری اہمیت بارہا پنکچر ہوتی رہتی ہے۔ ماڈرن تعلیم یافتہ شہری عورت کا مقصدِ حیات دھندلا چکا ہے۔ اس لیے کبھی وہ دفتر میں مرد کی رفاقت کرنا چاہتی ہے کبھی دوست بن کر اس کے غم بٹانا چاہتی ہے۔ کبھی حریف بن کر اُسے نیچا دکھانے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ ماڈرن تعلیم یافتہ مرد اس بکھری ہوئی کیفیت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ اسے اور بکھیرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب کبھی عورت مجتمع ہو جاتی ہے ہمیشہ مرد کی مکمل ہار کا باعث بنتی ہے۔

اب عورت کے لیے شادی کے بعد مسئلے ہی مسئلے ہیں۔ نوکری کرے یا چھوڑ دے۔ خاندان میں رہے کہ الگ ہو رہے۔ شوہر کے دوستوں کے ساتھ بنا کر رکھے کہ اپنی لائف کو تقویت دے۔ اب عورت نہ بچے کی پیدائش پر خود خوش ہوتی ہے۔ نہ فیملی پلاننگ والے اُسے خوش ہونے دیتے ہیں۔ مرد نے اپنی ایجادات سے اتنا تہلکہ مچایا کہ اب ہر نیا بچہ اہم خبر نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ دنیا کا ہر کالا گورا پہلا بچہ مرد کی انوکھی ترین ایجاد سے عجیب تر ہوتا ہے دنیا میں اب بھی کوئی پیغمبر نہیں آ سکتا۔ کیونکہ پیغمبروں کو جنم دینے والی مائیں اب صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔ اب عورت کا وہ ماڈل دستیاب ہوتا ہے جسے اپنے پیغمبر ہونے کی فکر درپیش ہے۔

ماڈرن عورت کے لیے شادی ذوقی چیز ہے۔ کیونکہ بچہ ماڈرن دنیا کے لیے بوجھ ہے۔ عورت کی اہمیت، حیثیت، اور ساکھ اسی وقت بہتر ہو گی جب سوسائٹی کے بچے درکار ہوں گے۔ کیونکہ بچہ مرد اور عورت کے درمیان پُل ہے۔ ایک پشت سے دوسری پشت کے درمیان جوڑنے والی کڑی ہے۔ بچہ زندگی کا سب سے بڑا ویلن بھی ہے اور ہیرو بھی۔ وہ مرد کا سب سے بڑا رقیب بھی ہے کیونکہ گود کا بچہ ویلن کی طرح بڑھک نہیں مارتا۔ ہیروئین کو اغوا نہیں کرتا، فریبی نہیں ہوتا۔

لیکن دیکھ بھال چاہتا ہے۔ گود کا بچہ فلم نہیں دیکھتا، پیسے نہیں مانگتا۔ آپ پھولوں کا دستہ لے کر جائیں بیکار رہے گا۔ اس سے ٹیلی ویژن کی باتیں نہیں کی جا سکتیں۔ تعریف کر کے دیکھ لیں وہ توجہ نہیں دیتا۔ محبت کے وہ تمام طریقے جو عام طور پر قول و فعل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بچے کو متاثر نہیں کرتے۔

وہ صرف دیکھ بھال پرورش چاہتا ہے۔
اس ایثار میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔
پھر یکدم خزاں آجاتی ہے۔ عورت آئینہ دیکھتی ہے تو سوچتی ہے:
'اس شادی سے مجھے کیا ملا؟
میں نے اپنی زندگی کی ساری تفریحات کہاں گنوائیں، جو میرے ساتھی کے لیے میسر تھیں۔
مرد کی وہ محبت کہاں گئی جو میرا حق تھا۔ وہ منفرد ترقی وہ اہمیت کہاں گئی وہ کالج میں مجھ سے دو قدم پر تھی۔

پھر وہ غصے طنز اور نفرت سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتی ہے۔ جس نے بچے کو اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بنایا اور دور نکل گیا۔

وہ اپنے ساتھی سے لڑتی ہے۔ جھگڑتی ہے اور اپنے احسانات گنتی ہے۔ قرض مانگتی ہے۔ مرد پریشان مجرم گناہ گار بوڑھا

ہو جاتا ہے اور دیوار سے لگتا جاتا ہے۔ AMPLIFIER اونچا ہوتا جاتا ہے۔ سننے والا کان باقی نہیں رہتا۔

حالانکہ شادی کا اصل ولین شوہر نہیں بچہ ہے۔ لیکن بچہ نہ احسان مانتا ہے نہ ماں کی آرزوؤں کو اہمیت دیتا ہے۔ مرد نہ کسی عورت کی آزادی چھین سکتا ہے نہ چھینتا ہے لیکن بچہ ایثار چاہتا ہے۔ پرورش کی بھٹی میں وقت بھی صرف ہوتا ہے اور خوشیاں بھی جلتی ہیں اور جوانی بھی راکھ ہو جاتی ہے۔

شادی کے بند پنجرے میں عورت شیرنی کی مانند رہتی ہے۔ جس کے سامنے مرد کا پھاٹک کبھی کھلتا ہے کبھی بند ملتا ہے۔ لیکن بچوں کی شکل میں اس پنجرے پر چھوٹے بڑے کئی تالے پڑتے ہوتے ہیں۔ اگر شیرنی بھاگ جانے کا عزم کرے تو پھاٹک کبھی نہ کبھی ضرور کھلا ملتا ہے۔ اس کی فرار میں مدد کرتا ہے۔ لیکن تالے چاہے سب کھل جائیں ٹوٹ جائیں وہ جہاں بھی جائے گی چھوٹے چھوٹے کھلے کنڈے اس کے دل میں پنجرے کی یاد تازہ رکھیں گے۔

شادی میں جھگڑا مرد اور عورت کا نہیں ہے۔ یہ دونوں سوختہ جان، مشیت کے ہاتھوں میں تختہ مشق بنے ہوتے ہیں یہ دونوں تو COMPLIMENTARY زاویوں کی طرح مل کر رہیں تو ہی زاویہ قائمہ بنتا ہے۔ ایک چھت ہے تو دوسرا ستون۔ بغیر چھت کے ستون بے کار ہے۔ بغیر ستون کے چھت نہیں پڑ سکتی۔ ہاں دونوں مل کر رہیں تو بارش اور آندھی سے بچنے کا آسرا ہو سکتا ہے۔

جہاں تک بچے کا مسئلہ ہے۔ مرد پر نیچر کی طرف سے اس کا بوجھ مقرر نہیں ہوا۔ دردِ زہ، بچے کی پرورش اور اس کی آگ میں جلنے کی سزا باغ بہشت میں ہی تجویز ہوئی ہوگی۔ اس لیے اس مسئلہ کا حل اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسانی تجویز مشیت الٰہی سے ٹکر نہ لے اور ایسے ٹیکے ایجاد نہ کرے جن کی مدد سے باپ بھی بچے نہ جننے لگیں۔ یا کچھ ایسے HARMONES مردوں کے سسٹم میں داخل نہ کئے جائیں۔ جن کی طفیل یک دم اُن میں ماں جیسی محبت نہ جاگ اٹھے۔ یا پھر مرد اور عورت کے ارتقاء سے ایک MONO SEX نہ پیدا ہو جائیں۔ جو کینچوے کی طرح خود ہی نر ہوں اور خود ہی مادہ، اور افزائش نسل کے لیے کوئی کسی بیرونی تحریک کا محتاج نہ ہو۔

بالفرض کسی طرح بچے کا مسئلہ طے بھی ہو جائے تو بھی عورت کے مسائل رہیں گے۔ کیونکہ یہ دروپدی کی ساڑھی کی طرح جس قدر کھلتے ہیں۔ اُسی قدر اور پیدا ہو جاتے ہیں۔

بالفرض اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو کر عورت اپنے اصلی مشن کو بھول کر دانشور، فلاسفر، سائنس دان، ایکٹر پیدا کرنے لگے۔

اُسے مرد کے برابر کا ہر وسیلہ مل جائے گا۔ مردوں جیسی قدر شناسی ملنے لگے گی تب بھی شائد آخری سطح پر پہنچ کر عورت کا مسئلہ رہے گا۔

کیونکہ مرد اور عورت کی سائیکی مختلف ہے۔

مرد کی سائیکی تلاش ہے ۔
عورت کی سائیکی قیام ہے ۔
مرد حضرت ابراہیم کی طرح چاند ستاروں کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور اس کا خدا اُسے راستہ نہ دکھائے تو وہ واقعی گمراہوں میں سے ہو جاتا ہے۔ عورت تخلیق کرنے والی ہے وہ گھاس کی طرح پھیلتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی جڑیں پاتال میں اترتی جاتی ہیں لیکن وہ کبھی گمراہ نہیں ہوتی ۔
عورت مرد کا آخری مسئلہ رُوح کی تنہائی کا ہے ۔ COSMIC CONCIOUSNESS
انسان کہاں سے آیا ہے؟
وہ کہاں چلا جاتا ہے ؟
اس ناپائیدار قیام میں اتنی تبدیلی اتنی جدوجہد اور اتنے مسائل کے باوجود سکون اور امن کو قیام کیوں نہیں ؟
مسئلے سلجھنے کے باوجود کیوں پھر سے پیدا ہو جاتے ہیں ؟ ہر تعمیر میں تخریب کیوں ہوتی ہے؟ ہر انقلاب میں نئے انقلاب کا بیج کیوں ہوتا ہے ۔

میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو زندگی کو مختلف مقامات پر منزلِ فنا سے پرے کی آواز آتی ہے ۔ یہ آواز اس قدر LOW سے FREQUENCY کی ہوتی ہے کہ اس کا زیروبم انسان کی روح کو بے چین تو کرتا ہے لیکن سنائی نہیں دیتا ۔ بچے کی رُوح اس آواز کی مطابقت میں رہتی ہے ۔ اس لیے COMIC CONCIOUSNESS کی یہ آواز اللہ کی یہ صدا اُسے بے چین نہیں کرتی ۔ جوں جوں وہ بالغ ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی اچانک کسی رات اس کی رُوح بے چین ہونے لگتی ہے ۔ مسائل سلجھتے جاتے ہیں بے چینی بڑھتی جاتی ہے ۔ وہ گھبرا کر اس آواز کے منبع کو تلاش کرتا ہے ترقی میں ۔ ایجادات میں ، دولت میں ، عورت میں ۔

عورت کی سائیکی چونکہ قیام ہے وہ اس نہ سنی جانے والی آواز کا تعاقب اُسی حد تک کر سکتی ہے جہاں تک اُس کی جڑیں ہوتی ہیں ۔ وہ کبھی مرد میں اس آواز کا منبع تلاش کرتی ہے کبھی بچوں سے لگ کر آواز سنتی ہے پھر پوتوں نواسوں کی صورتیں دیکھ کر آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہے ۔

لیکن آواز چھپتی ہے اوجھل ہو جاتی ہے پکڑی نہیں جاتی ۔

کئی صدیوں تک عورت نے ہر قسم کی تلاش مرد پر چھوڑ رکھی تھی ۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ضرور کسی روز مرد کے سینے میں پسلی بن کر پیوست ہو جائے گی اور جب مرد آوازِ حق کو پہچان لے گا تو اس کی سائیکی خود بخود مرد کے ساتھ COSMIC CONCIOUSNESS کا حصّہ بن جائے گی ۔ لیکن اب عورت مایوس ہو گئی ہے ۔ اس لیے وہ بہشت میں داخل ہونے کا اپنا شارٹ کٹ بنانا چاہتی ہے ۔ مرد بھی اب چوری چوری راتوں رات عورت سے نظر بچا کر اپنے رب کے حضور پہنچنا چاہتا ہے ۔

لیکن یوٹوپیا چاہے۔ دنیا کا ہو چاہے بہشت کا ——— معاشرہ چاہے بابا نوح کی کشتی کا ہو چاہے چلین کا، جب بھی مرد عورت داخل ہوں گے اکٹھے ہوں گے۔ کیونکہ نکالتے وقت اللہ نے ان کی رفاقت پر مہر لگا دی تھی۔ آدم اب کسی کو رشوت دے کے جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہاں چیکنگ سخت ہے اور کرپشن والوں کے داخلے بالکل ممنوع ہیں۔

اب چاہے فاز اور سور کی جبلت مختلف ہو جائے۔ حیاتیات چاہے ان کی سائیکی علیحدہ علیحدہ ہو ان کے گئے بیت وقت میں طے ہوں گے۔ معافی دونوں کو ایک وقت میں ملے گی۔ کیونکہ ان میں صرف گناہ گاری کی قدر مشترک ہے اور یہی انھیں ایک راستے پر چلنے کے لیے ہمیشہ مجبور کرتی ہے۔ اور یہی ساجھا کھاتہ برابر کرنے کے بعد وہ جنت میں ساتھ ساتھ پوری آزادی کے ساتھ داخل ہو سکیں گے جیسے وہ نکالے گئے تھے۔

نظام رامپوری پر شاد عارفی کی تحقیقات

شبیر علی خاں شکیب رامپوری

شاد عارفی مرحوم کے کلام اور نثری کاوشوں پر مشتمل ایک کتاب "نثر و غزل دستہ" کے نام سے ان کے لایق شاگرد مظفر حنفی نے ترتیب دے کر شایع کی ہے۔ اس میں ایک مضمون "نظام رام پوری" کے بارے میں بھی بغیر حوالہ نقوش شخصیات نمبر حصہ اول سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بعض باتیں ایسی نظر پڑیں جو درست نہیں۔ میں نے ضروری سمجھا کہ ان کی نشان دہی کر دی جائے تاکہ ہندو پاک میں نظام رامپوری پر جو لوگ تحقیقی کام کر رہے ہیں یا ان کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں، وہ شاد صاحب کی ادبی حیثیت سے متاثر ہو کر ان کی "تحقیقات" سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کا امکان اس وجہ سے بھی ہے کہ موصوف نے بڑے شد و مد سے دعویٰ کیا ہے کہ نظام کے سلسلے میں انہوں نے پندرہ سال کی مدت میں جو "تحقیق و تلاش" کی ہے اور قدرت نے جو ان کی مدد کی ہے وہ کسی دوسرے کو میسر نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں وہ نظام کے ہم وطن بھی تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاد صاحب بحیثیت شاعر برصغیر میں منفرد مقام رکھتے ہیں لیکن نہ وہ محقق تھے نہ تنقید نگار۔ بیشتر مضامین انہوں نے دورانِ علالت یا بغیر کسی تیاری اور مطالعے کے انتہائی عجلت میں سپردِ قلم کر دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حافظہ کہاں تک مدد کر سکتا ہے۔ اسی کتاب کے ایک دوسرے مضمون "زبر استاد" میں خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں،

> "ہر چند کہ نثر لکھنا میرے بس کا روگ نہیں (دوسرے کہتے ہیں کہ ہے) لیکن میں یہی سوچتا ہوں اس لیے نثر لکھنے سے کتراتا ہوں ..... میرا حافظہ کافی زود فہم (؟) اور دیرپا رہا ہے مگر جس طرح کسی الماری یا صندوق میں چیزیں ٹھونس ٹھونس کر بھری جائیں یا کسی کبڑیئے (کباڑیے) کی چھوٹی سی نخاسے کی دوکان میں کاٹ کباڑ کی بھرمار ہو تو چیزوں کے اندر کافی گڈمڈ، گڑبڑ اور گھپلا ہو جاتا ہے۔ وہی حال میرے حافظے کا ہے ... حافظے کی یہ بوکھلاہٹ آج ہی نہیں مجھے ہمیشہ کھلتی رہی ہے اور میں اکثر جھلا کر قلم کاغذ ٹیک کر اپنے بال نوچنے لگتا ہوں ....." (نثر و غزل دستہ / ۴۶۲ تا ۴۶۷)

شاد صاحب کے مزاج میں بلا کی شدت تھی۔ وہ اکثر سنی سنائی باتوں پر بآسانی یقین کر لیتے تھے۔ جیسا کہ ان کے مکاتیب سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کسی بدخواہ یا شریر شخص نے کسی دوست کے خلاف کوئی بے سر و پا بات کہہ دی تو وہ انتہائی سادہ لوحی سے اس پر یقین کر لیتے۔ اسلئے ناراض ہو جاتے کہ دعا سلام تک بند۔ اور جب وہ دوست اپنی صفائی پیش کرتا تو اتنی ہی آسانی سے صاف ہو جاتے اور پھر اس اتہام لگانے والے سے اسی شدت سے ناراض ہو جاتے۔ ان کے مزاج کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو گئے تھے۔

یہی صورت حال ان کے یہاں تحقیقی اور علمی امور میں بھی نظر آتی ہے وہ اگر کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں کسی شخص سے کوئی چٹکلا یا واقعہ سن لیتے اور اس میں انھیں کوئی اچھوتا پن یا طنز کا پہلو نظر آتا وہ بے تامل اسے استعمال کر لیتے اور پھر اس بات کو پورے وثوق کے ساتھ تحقیقی انداز میں بیان کرتے ہوئے ضبطِ تحریر میں بھی لے آتے۔

چنانچہ ان کا سب سے دلچسپ انکشاف مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ہے کہ وہ رام پوری تھے۔ یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی، لکھتے ہیں :

> "یہاں کا مدرسۃ العالیہ ایک مستند مدرسہ تھا۔ . . . ہمارے مولانا آزاد نے بھی یہیں تعلیم پائی، جس کو انہوں نے جامعہ ازہر سے استعارہ کر لیا تھا۔ بات کا رخ آ گیا کہ اب مجھے تفصیل میں جانا پڑے گا۔ مولانا آزاد کے والد اور دادا وغیرہ سب رامپور کے کھاتے پیتے 'دھنیے' تھے ——— 'روئی دھننے والے' مگر تجارت نے انھیں اس پیشے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ یہ لوگ اور ان کے خاندان کے افراد اب بھی تھانہ رزڑ رامپور میں موجود ہیں۔ یہ تھانہ رزڑ میری نانی کے دادا سے منسوب ہے اس لیے میرے کئی رشتہ دار آج بھی وہاں بستے ہیں اور مولانا آزاد کے تمام عزیزوں سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ مولانا آزاد کے والد جو مدرسۃ العالیہ کے تعلیم یافتہ مولوی تھے انہوں نے ایک بیوہ 'عرب عورت' سے یہیں رامپور میں شادی کر لی تھی اسی سے مولانا آزاد پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے۔ یہیں تعلیم پائی۔ چونکہ مولانا میں احساس کمتری کافی تھا، اس لیے انہوں نے ہمیشہ اس کمزور پہلو کو بچایا اور کہیں بھی صاف طور سے یہ نہیں کہا کہ وہ کہاں پیدا ہوئے تھے آپ اُن کی خودنوشت کوئی بھی سوانح عمری اٹھا کر دیکھیں تو اپنی والدہ کے بارے میں بڑے گول مول الفاظ استعمال کریں گے اور باپ کے بارے میں صاف اڑا جائیں گے کہ کون تھے؟ اور کیا تھے؟ اور کہاں تھے۔"
>
> (ایک تنہا شاعر/، ۵۵)

یہ تھا شاد صاحب کا مزاجِ تحقیق۔ لوگوں نے ان کی اس تحقیق کو ان کی ناراضگی یا مولانا آزاد سے کبیدہ خاطری پر محمول کیا اور مولانا کو نہ دھینا سمجھنے پر تیار ہوئے نہ رامپوری۔ اس لیے ان کی تحقیقات کو بڑی احتیاط سے پرکھنا ضروری ہے۔

اب میں شاد صاحب کے مضمون "نظام رامپوری" میں تحریر بعض ان باتوں کو جو درست نہیں پیش کرتا ہوں،

۱۔ شاد صاحب نے نظام کا سنہ پیدائش ۱۲۴۹ھ لکھا ہے۔ لیکن امیر مینائی نے تذکرۂ انتخاب یادگار صفحہ ۶۸۲ پر نظام کا انتقال ۲۶ شعبان ۱۲۸۹ھ کو بعمر ۶۰ سال ہونا لکھا ہے۔ اس حساب سے ۱۲۲۹ھ سالِ پیدائش ہوتا ہے جو مطابق ۱۸۱۴ء کے ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۹۰ھ یعنی نظام کے انتقال کے ایک سال بعد تکمیل کو پہنچا تھا۔ ایک ایسی ہی غلطی کلیاتِ نظام (مرتبہ کلب علی خاں فائق شایع کردہ مجلس ترقیِ ادب لاہور) میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی نظام کی پیدائش ۱۸۱۹ء میں دکھائی ہے جو ۱۲۳۵ھ کے مطابق ہوتی ہے۔ دونوں حضرات نے اس بارے میں کوئی حوالہ یا سند نہیں دی ہے اس لیے امیر مینائی جیسے واقف حال اور ہم عصر کے دیے ہوئے سن پیدائش کو ہی درست تسلیم کرنا پڑے گا۔

۲۔ نظام کی قبر کے بارے میں اس مضمون میں عجیب انکشاف ملتا ہے یعنی نظام" انتقال کے بعد علی نور صاحب کے تکیے میں دفن ہوئے۔" (نثر و غزل دستہ صفحہ ۵۷)۔ اسی رائے کا اظہار شاد صاحب نے اپنے ایک دوسرے مضمون " جوہر اہل رامپور" میں بھی کیا ہے :

"میری تحقیق میں وہ آج بھی علی نور صاحب کے تکیے میں کہیں دفن ہیں۔ مگر غاشیہ برداران ریاست انہیں شاہ احمد علی خاں کے مزار میں بتاتے ہیں مگر تعیینِ لحد میں تامل سے کام لے رہے ہیں" (ن ۔ غ دستہ/۹۲)

خدا جانے شاد صاحب نے علی نور صاحب کے تکیے میں دفن ہونے والی روایت کس سے سُن لی۔ ورنہ آج تک نظام کی قبر کے بارے میں کبھی کسی نے شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا وہ مسلّمہ طور پر اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی شاہ احمدؔ[1] (م ۱۲۸۲ھ) کے مزار کے پائنتی دفن ہیں۔ یہ مزار کوچہ بھاگ مل متصل مستن گنج رامپور میں واقع ہے۔ انتخاب یادگار صفحہ ۳۸۹ میں بھی یہی لکھا ہے۔

لیکن شاد صاحب نے اپنے اس خیال کی ایک دوسری جگہ خود ہی تردید بھی کر دی ہے۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب بنام خان امانت کمال مدیر روزنامہ ناظم (ایک تماشا شاعر/ص ۵۵) میں لکھتے ہیں :

(رام پور والوں نے)" میاں نظام شاہ کے مزار پر لوح تک نہیں لگائی۔ سرہانے تاریخ وفات کا پتہ نہیں۔ سنا ہے کہ اب تو وہ مزار جو میاں احمد علی شاہ صاحب کے مزار کے سائبان کے نیچے تھا۔ زمین دوز یا مسطح دوست (!) ہو چکا ہے"

یعنی انہوں نے نظام کے مزار کو میاں احمد علی شاہ صاحب کے مزار کے احاطے میں ہونا تسلیم کر لیا۔ جہاں تک لوحِ مزار کا سوال ہے۔ یہ شکایت بھی درست نہیں۔ نظام کی قبر پر صاف اور واضح الفاظ میں لوح پر افضل الشعراء حضرت محمود رامپوری (م ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء) شاگردِ داغؔ کا نتیجۂ فکر مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کندہ ہے :

کسی کی دوست نہیں ہے یہ دشمنِ جاں حیف — فضول ہے جو کوئی دل لگائے دنیا سے
یہ ذی کمال کو تو دیکھ ہی نہیں سکتی — خدا پناہ میں رکھے بلائے دنیا سے
غضب کی بات ہے افسوس دیکھ لے محمودؔ — میاں نظامؔ گئے ہائے ہائے دنیا سے
۹ ۸ ۵ ۲۰ ۱

---

[1] میاں احمد علی شاہ احمدؔ خلف مصری خاں خلیفہ و شاگرد امام الدین خاں انورؔ۔ علومِ عربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اردو فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے۔ دیوان یا مجموعۂ کلام کا تو پتہ نہیں چلتا البتہ ایک مثنوی فارسی "گل و صنوبر" (تصنیف ۱۲۶۴ھ) جس کا ایک مخطوطہ مخزونہ آزاد لائبریری علی گڑھ اور ایک تصنیف 'ناصر نامہ' کے نام سے مخزونہ سلیمانیہ پٹنہ یونیورسٹی کا پتہ چلا ہے۔ یہ نسخہ نظام نے نقل کیا ہے۔ احمد جعفر علی حسرت کے رنگ سے متاثر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے ہی نظام کو ادا بندی اور معاملہ نگاری کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ۲۹ شوال ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔
(انتخاب یادگار/۹۔ کاملان رامپور/۲۶۔ معاصر پٹنہ مئی، جون ۱۹۴۲ء)

چونکہ شاد صاحب یہ دکھانا چاہتے تھے کہ اہلِ رام پور تو مردہ پرست بھی نہیں، کجا زندہ شاعروں کے جشن منانے کا سوال ۔ لیکن ان کے اُن اشعار سے جو اُنھوں نے اپنے ایک دوسرے مضمون "نثرِ منظوم" (ن ۔ غ دستہ/۸۶) میں لکھے ہیں ۔ لوحِ مزار کا ہونا ثابت ہے ۔ لکھتے ہیں:

"آج گمنامی کے پردے میں ہیں وہ حضرت نظامؔ — جن کا خطبوں میں بصد عزت لیا جاتا ہے نام
لوحِ تربت پر لکھے الفاظ کالے پڑ گئے — گچ کو استرکاری مرقد کے لالے پڑ گئے
بکریاں ہر روز آتی ہیں طوافِ قبر کو — ڈالیاں چونچوں میں لے آتے ہیں کوّے نذر کو"

رہا بکریوں اور کووں کا "طواف و نذر" کو آنا ۔ یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس مزار کی باقاعدہ اُونچی چار دیواری اور مضبوط دروازہ ہے اور نظام کی قبر بھی سائبان کے نیچے نہایت عمدہ حالت میں ہے ۔ اس مزار کے متولی مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب امام جامع مسجد رامپور ہیں ۔

۳ ۔ نظام کی قبر کے عدم تعین کے ضمن میں شاد صاحب نے قایم چاند پُوری کی قبر کے بارے میں بھی اپنی مخصوص رائے کا اظہار کیا ہے ۔ لکھتے ہیں:

"قائم چاند پوری رامپور میں دفن ہیں . . . مگر یہ نہیں معلوم کہ اُن کی قبر کون سی ہے اور کس قبرستان میں ہے۔" (ن ۔ غ ۔ دستہ/ ۹۲)

قایم کی قبر بھی مسلمہ طور پر محلہ مدرسہ کہنہ رامپور میں اپنے شاگرد نواب محمد یار خاں امیرؔ (م ۱۱۸۸ھ) برادرِ اصغر نواب فیض اللہ خاں بہادر والی رامپور (۱۲۰۸ھ) کے مقبرے کے احاطے میں ہے جیسا کہ انتخاب یادگار میں یہی مذکور ہے (ترجمہ قائم انتخاب یادگار/ ۱۰۳) دوسرے تذکروں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے ۔

محلّے کے دو قدیمی اور معتقد خاندانوں کے دو نمایندہ افراد یعنی یوسف علی خاں مرحوم سابق حاکم مال اور حکیم دھومی خاں صاحب کے بھتیجے فضل احمد خاں عرف حاجی میاں نے ایک ہی قبر کو قایم کی قبر بتایا ۔ دونوں نے اس بات کو اپنے بزرگوں سے سُنا تھا ۔ میں نے اِس قبر کو دیکھا ہے یہ پرانی چھوٹی اینٹ کی بنی ہُوئی ہے اور احاطہ قبرستان کے جنوب مغربی گوشے میں مغربی دیوار کے قریب ہے ۔ اس کے مشرق میں ملّا حسن فرنگی محلی (م ۱۱۹۹ھ) کی قبر ہے ۔ قایم کی قبر کی اینٹیں اسی طرح کی ہیں جیسی نواب محمد یار خاں کے مقبرے میں استعمال ہُوئی ہیں ۔

۴ ۔ شاد صاحب نے نظام کی شاگردی کے بارے میں بڑے وثوق سے لکھا ہے:

"میں نے جس قدر وقت سیّد نظام شاہ کی زندگی پر لکھنے پر صرف کیا ہے اور جہاں جہاں قدرت نے خلافِ توقع وہ اسباب فراہم کر دیے جو سیّد نظام شاہ پر لکھنے وقت کسی کو نصیب نہ ہوں . . . . . یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ سیّد نظام حضرت بیمارؔ شاگردِ حضرت مومنؔ کے شاگرد تھے ۔ بعد میں صوفی علی احمد شاہ صاحب سے اصلاح لینے لگے ۔" (ن ۔ غ ۔ دستہ/ ۱۷)

بیمار کو مومن کا شاگرد لکھنا درست نہیں۔ بیمار (م ۱۲۱۷ھ) ابتداء میں مصحفی کے شاگرد ہُوئے تھے۔ جب نواب محمد سعید خاں ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں رام پور کے نواب ہُوتے تو وُہ بھی بلائے جانے پر یہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے اور استاد غفلت (م ۱۲۵۹ھ) شاگردِ قدرت اللہ شوق کے شاگرد ہُوتے۔ مومن کی شاگردی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالباً شاد صاحب نے تسکین دہلوی (م ۱۲۶۰ھ) کے دھوکے میں ایسا لکھ دیا۔ وہ مومن کے شاگردِ رشید تھے اور اسی زمانے میں نواب یوسف علی خاں ناظم کی دعوت پر رام پور آ گئے۔ تھے اور یہیں وفات پائی۔

شاد صاحب نے نظام کے صرف دو استادوں یعنی بیمار اور صوفی علی احمد شاہ کا ذکر کیا ہے۔ مؤخر الذکر کا صحیح نام میاں احمد علی شاہ تھا۔ وہ نظام کو نواب یوسف علی خاں ناظم کا شاگرد تسلیم نہیں کرتے اور اپنی رائے کی تائید میں عبدالشکور صاحب مولف 'انتخاب کلام نظام' کا سہارا لیتے ہُوئے لکھتے ہیں:

> "عبدالشکور صاحب ..... نے نظام رامپوری کے نام سے جو مجموعہ شایع کر دیا ہے اس میں موصوف نے یہ بات مان لی ہے کہ نظام رام پوری کا ناظم یعنی نواب یوسف علی خاں کا شاگرد ہونا محلِ نظر ہے۔"
>
> (ن ۔ غ ۔ دستہ/۷۴)

لیکن امیر مینائی انتخاب یادگار/ص ۲۸۶ پر نظام کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

> "نظام ...... نواب محمد یوسف علی خاں بہادر ناظم .... کے شاگردِ رشید ہیں۔ شیخ علی بخش بیمار اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی مرحوم احمد تخلص سے بھی مستفید ہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس بارے میں امیر مینائی سے زیادہ اور کون واقفِ حال ہو سکتا ہے۔ وہ نظام کے ہم عصر اور شاعرِ دربار تھے۔ نظام کے انتقال کے ایک سال بعد ہی انتخابِ یادگار کی تکمیل ہُوئی ہے۔ یہ تذکرہ نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کی ایما سے لکھا گیا تھا اور برابر اُن کے ملاحظے سے گزرتا رہا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے محض رئیسِ وقت کی خوشنودی قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتے۔ نظام کی موجودہ شہرت کے پیشِ نظر کلب علی خاں فائق اپنے مرتبہ کلیات نظام کے دیباچے (ص ۶۶) میں اپنے قیاسات محض کو واقعہ قرار دینے کے انداز میں تحریر فرماتے ہیں:

> "..... اِس لیے نظام بھی ولی عہد (ناظم) کے دربار میں پہنچے۔ نظام اور وُہ ہم طرحی غزلیں کہنے لگے۔ ولی عہد ریاست کے محکموں کے سربراہ تھے۔ اِس لیے ہر ایک کو ان کی ناز برداری ضروری تھی۔ وہ نظام کی غزل کے سلسلے میں جو رائے دیتے نظام بجا اور درست کہتے۔ اسی بنا پر امیر مینائی نے بہ ایمائے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور یہ لکھا کہ نظام ناظم کے شاگرد تھے۔"

آگے (صفحہ ۶۷ پر) مزید زور دیتے ہُوئے لکھتے ہیں:

> "نظام نے ناظم کی فرمائش پر غزلیں کہیں اور ان سے داد حاصل کی لیکن رئیس کی استادی کا شرف حاصل کرنے کی جرأت نہ تھی اس لیے شاگردی کو غنیمت سمجھا۔"

جہاں تک نظامؔ اور ناظمؔ کی استادی شاگردی کا سوال ہے بظاہر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن ایک لحاظ سے اس کو نظر انداز کر دینا بھی مستحسن فعل نہیں معلوم ہوتا۔ کسی امر واقعہ کو محض تسکین ذہنی کی خاطر توڑ مروڑ کے پیش کر دینا بد دیانتی کے مترادف ہے۔ شخصیت پرستی اور بغض للّٰہی دونوں افراط و تفریط کا باعث ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگ کسی سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ تناور درخت کبھی ایک معمولی پودا بھی تھا۔ اور وہ درخت جو آج اس سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں کبھی اس سے بڑے اور اس پر سایہ فگن تھے۔

چنانچہ اسی نکتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ہوگا کہ امیر مینائی کا بیان محض رئیسِ وقت کی خوشنودی کی بنا پر ہے یا کسی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ درست ہے کہ بالعموم سلاطین و نوابین تحصیلِ علم اور اکتسابِ فنون میں خاص محنت و ریاضت نہیں کرتے اور غاشیہ بردارانِ ریاست ان کی جا و بیجا مدح و ستائش کر کے علم و فضل کا سہرا بھی ان کے سر باندھ دیتے ہیں لیکن کیا نواب یوسف علی خاں بھی ان فرمانرواؤں کی صف میں آتے ہیں یا وہ اس سے باہر ہیں۔ اس کے لیے نواب یوسف علی خاں کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

نواب یوسف علی خاں کے دادا نواب غلام محمد خاں (م ۱۲۳۸ھ) خلفِ نواب فیض اللہ خاں (م ۱۲۰۸ھ) جو اپنے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں (م ۱۲۰۹ھ) کے قتل ہو جانے کے بعد رام پور کے نواب ہوئے تھے اودھ اور انگریزی افواج سے دوجوڑہ کی جنگ میں شکست پا کر ۱۲۰۹ھ ہی میں اپنے بھتیجے نواب احمد علی خاں رندؔ کے حق میں ریاست سے دستبردار ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے رام پور کو خیرباد کہہ گئے۔ ان کے خاندان کے افراد بھی لکھنؤ وغیرہ میں رہنے لگے۔ محمد سعید خاں غلام محمد خاں کے بڑے صاحبزادے اس وقت کم عمر تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت شاہزادوں کے برخلاف شریف زادوں کے انداز پر ہوئی۔ مرزا قتیل وغیرہ جیسے عالموں سے علوم حاصل کیے اور حکیم احمد علی صاحب سے طب پڑھی۔ چنانچہ وہ عالم اور اچھے طبیب تھے۔ حکومت کمپنی بہادر نے ان کی اہلیت سے متاثر ہو کر ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ عطا کیا۔ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں جب نواب احمد علی خاں کا انتقال ہو گیا اور اولادِ نرینہ نہ ہونے کی بنا پر انگریزوں نے محمد سعید خاں کو رام پور کا نواب تسلیم کیا تو وہ بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ محمد سعید خاں نے اپنے بڑے لڑکے یوسف علی خاں کی تعلیم و تربیت پر بھی کافی زور دیا تھا۔ ناظمؔ کا قیام دہلی میں تھا۔ انہوں نے مفتی صدر الدین آزردہؔ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے علوم عربیہ و حکمیہ حاصل کیے اور ملّا غیاث الدین (مولف غیاث اللغات) سے فارسی پڑھی۔ شاعری کا فطری ذوق رکھتے تھے اس پر دہلی کی ادبی سوسائٹی کا اثر، مومنؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ باپ بیٹے کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ گزرا ہوگا کہ قدرت ان کو اسی ریاست کا نواب بنانے والی ہے جس کا داخلہ ان پر ممنوع تھا۔

۱۸۴۰ء میں نواب محمد سعید خاں جب نواب ہو کر رامپور آئے تو انہوں نے یوسف علی خاں کو بحیثیت ولی عہد ریاست بلا لیا۔ اس وقت ناظمؔ کی عمر ۲۴ سال کی تھی۔ کلب علی خاں ان کے فرزند اکبر اس وقت چھ برس کے تھے۔ ناظمؔ نے ولی عہد ہو جانے کے بعد شاعری کے شوق کو ختم نہیں کیا بلکہ معاشی فراغت حاصل ہو جانے کی بنا پر زیادہ دلچسپی لی۔ چنانچہ بیمارؔ شاگرد مصحفیؔ، غفلتؔ، تسکینؔ دہلوی شاگرد مومنؔ اور ان کے صاحبزادے عبداللہ غمگینؔ شاگرد مومنؔ وغیرہ بھی ان کے بلانے پر رامپور آ گئے۔ آئے دن

طرحی مشاعرے ہوتے جس میں وہ خود غزلیں کہتے۔ مقامی اور بیرونی شعرا حصّہ لیتے۔ نظام کی عمر اس وقت ۱۰ سال ہوگی۔ اپنے والد سید احمد شاہ صاحب کے انتقال کے بعد حسب دستور ریاست وہ کم عمری ہی میں اپنے والد کی جگہ سواروں میں ملازم ہوگئے تھے نظام کو بھی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ناظم کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ ایسی صورت میں نظام نے اگر ناظم کی شاگردی اختیار کر لی تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ اس میں ولی عہد کی خوشنودی طبع کے خیال کے علاوہ ناظم کی اہلیت و صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اس وقت ناظم نظام سے ۸ برس عمر میں بڑے ہونے کے علاوہ مومن کی شاگردی اور دہلی کی ادبی محفلوں سے جلا پاکر نظام سے برتر شاعرانہ مرتبے پر تھے۔ انتخاب یادگار میں نظام کے علاوہ ان کے دو دیگر شاگردوں کا ذکر بھی ہے۔ ان میں ایک صاحبزادہ مہدی علی خاں نحیف[1] (م ۱۲۸۹ھ) خلف صاحبزادہ حفیظ اللہ خاں تھے جو ناظم کے چچا زاد بھائی بھی تھے دوسرے صاحب زادہ سعید اللہ خاں آلم[2] (م ۱۲۸۲ھ) صاحبزادہ امداد اللہ خاں تاب[3] نبیرۂ نواب نصر اللہ خاں سلطان[4] تھے۔ میری رائے میں ناظم کا کسی عام شہری نوجوان کو جو اس کے یہاں سواروں میں ملازم ہو اپنی شاگردی سے نوازنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی نظر میں مستقبل کا نظام تھا۔ مذکورہ بالا صاحبزادگان یعنی نحیف و آلم بھی اس وقت لڑکے تھے۔ لیکن ناظم کے قریبی عزیز تھے۔

اسی ضمن میں اگر نظام کے کلام پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ان کے یہاں تین رنگ کا کلام ملتا ہے۔ اوّل وہ حصّہ کلام جو رام پور میں قائم کے سلسلے کے شعرا کے رنگ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ نظام نے جب ہوش سنبھالا اور شاعری شروع کی تو اسی رنگ میں کہا ہوگا۔ یہ ان کی ابتدائی عمر کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی ناہمواری، متروکات کا بے تکلف استعمال، قدیم مضامین کا سپاٹ اظہار، مثلاً یہ غزلیات،

دلا خیال نہ کر اُس سے آشنائی کا
اُٹھا سکے گا نہ صدمہ شبِ جدائی کا

اگر خود نما وہ خود آرا نہ ہوتا
یہ نیرنگِ قدرت ہویدا نہ ہوتا

آپ ہی ہو سکتے ہیں خفا مجھ سے
میں خفا ہوں یہ حوصلہ ہی نہیں

رنج سہنے کو پھر ہے جی میں نظام
دل کسے دیویں دل رہا ہی نہیں

ملو ہو غیر سے پھر دل میں اپنے غور ہی کیجے
ہوا تھا ہم سے کیا کیا عہد و پیمان آپ کا پہلے

---

[1] انتخاب یادگار، ص ۳۰۴ [2] ایضاً/۳۱ [3] ایضاً/۸۴ [4] ایضاً/۱۰۴

چونکہ نظام اپنی [illegible]گی میں اپنا کلیات ترتیب نہ دے پائے تھے اس لیے انہیں نظرِ ثانی کا موقع نہ مل سکا۔ جیسا اور جو کچھ کلام اُن کے انتقال کے بعد دستیاب ہوا، جمع کر لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہر دور کا کلام اصل صورت میں مل جاتا ہے۔

دوسرے دور کے کلام میں بیّن فرق نظر آتا ہے۔ تراش خراش، ندرتِ بیان اور صفائی بیان کے ساتھ سوز و گداز اور بھرپور تغزل ملتا ہے۔ ؎

مجھے اُمیدِ وفا تم سے نہیں دشمن سے   یہ اگر خبط ہے تو مجھ سے زیادہ ہے تمہیں

ہم سے نہیں نبھی ہے تو دشمن سے نبھ چکی   صد شکر اُس کا عہد ہی ناپائیدار ہے

پھر باتیں تمہاری میں سنوں حضرتِ ناصح   یہ کہدو کہ تم نے اُسے دیکھا تو نہیں ہے

یُوں ہم کو نہ دل سے تم بھلاؤ   دیکھو کبھی یاد آئیں گے ہم

وُہ مجھ کو نظام کیوں مناتے   کیا جانیے یہ بھی کیا محل تھا

کیا پہلے تین اشعار میں مومن کے شاگرد ناظم کا رنگ صاف طور پر نہیں جھلک رہا ہے؟ رامپور کے شعری ماحول میں ۱۸۴۰ء کے بعد سے ناظم کی آمد کی وجہ سے زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ اب تک جو رنگِ سخن تھا وہ قائم اور شاگردانِ قائم کی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن ناظم اور دیگر شاگردانِ مومن مثلاً صاحبزادہ عنایت علی خاں عنایت، تسکین دہلوی، عبداللہ غمگین، صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب، صاحبزادہ عبدالوہاب خاں سرکش، حشمت علی خاں موحد نے آئے دن کے طرحی مشاعروں میں حصہ لے کر مومن کے رنگِ تغزل سے مقامی شعراء کو روشناس کیا اور وہ قدرتی طور پر اس سے متاثر ہوئے بالخصوص نوجوان شعراء جن میں نظام بھی شامل تھے انہیں کے ساتھ بیمار شاگرد مصحفی و غفلت اپنے مخصوص پُرسوز لہجے میں اس محفل میں نمودار ہوتے اور انہوں نے بھی لوگوں کو اپنے رنگ سے متاثر کیا۔ چنانچہ نظام ابتدا میں ناظم کے شاگرد ہوئے لیکن بعد میں جب ناظم کی مصروفیات بڑھ گئیں تو بیمار سے اصلاح لینے لگے۔

نظام کا تیسرا کلام ان غزلیات میں ملتا ہے جو مذکورہ بالا دو ادوار کے بعد انہوں نے کہی ہیں اور جسے وہ "حالیہ" شاعری کہتے ہیں۔ اس میں معاملہ بندی، ادا نگاری، زبان و بیان پر قدرت، مکالمہ کا انداز سبھی کچھ ہے اور یہ ان کا خاص رنگ ہے جس کے باعث وہ مشہور ہیں۔ نظام کو اس رنگ کی طرف ان کے تیسرے استاد اور پیر و مرشد میاں احمد علی شاہ احمد نے توجہ دلائی۔ دراصل یہ رنگ جرأت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ خود شاہ صاحب جعفر علی حسرت کے رنگ کو پسند فرماتے تھے۔ نظام کے چند شعر بطور نمونہ دیے جاتے ہیں، ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
دینا وہ اُس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ　　مُنہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ
اُس کا وہ نیچی نیچی نگاہوں سے دیکھنا　　اور یہ بھی دیکھنا یہ مجھے دیکھتا نہ ہو

معترضین کا یہ کہنا کہ امیر مینائیؔ نے خلاف واقعہ نواب کلب علی خاں کی خوشنودی کی خاطر نظامؔ کو ناظمؔ کا شاگرد رشید لکھ دیا۔ اس بنا پر بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ خود نواب کلب علی خاں کا ایک بھی شاگرد انتخاب یادگار میں نہیں ملتا۔

نظامؔ کے استادوں کے ذکر میں اس امر کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ متذکرہ بالا تین استادوں کے علاوہ ان کے چوتھے استاد مرزا غالبؔ بھی تھے حال ہی میں اس کا انکشاف جناب اکبر علی خاں صاحب عرشی زادہ نے رضا لائبریری رامپور میں نظامؔ کے مسودات پر بعض اصلاحات کو دیکھ کر کیا ہے۔ ان کی رائے میں ان اصلاحوں کی تحریر مرزا غالبؔ کے ہاتھ کی ہے۔ اس سلسلے میں عرشی زادہ کا ایک مضمون جلد شایع ہونے والا ہے۔

میری رائے میں ایسا ہونا بعید از امکان نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ جب خود نواب یوسف علی خاں نے غالبؔ سے متاثر ہوکر ان کی شاگردی کو باعثِ افتخار سمجھا تو رامپور کے متعدد شعراء نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ انتخابِ یادگار میں غالبؔ کے مندرجہ ذیل رامپوری شاگردوں کا ذکر ملتا ہے:

۱۔ ناظم
۲۔ صاحبزادہ عبدالوہاب خاں سروشؔ
۳۔ صاحبزادہ فدا علی خاں فداؔ
۴۔ حکیم مظہر حسن خاں احسنؔ
۵۔ فتحیاب خاں اخگرؔ
۶۔ **شہاب الدین خاں شہاب**
۷۔ میاں خورشید احمد خورشیدؔ
۸۔ سید افتخار الدین مغلوبؔ

۵۔ شادؔ صاحب لکھتے ہیں:

"سید قیصر شاہ میاں جو نظام شاہ کے ساتویں لڑکے تھے (ان سے پہلے چھ لڑکوں کا انتقال ان کے سامنے ہی ہو گیا تھا) اور اپنی والدہ کے ساتھ پیلا تالاب پر رہتے تھے۔" (ن۔ ث د سنہ/۴)

سید قیصر شاہ میاں ساتویں نہیں بلکہ نویں لڑکے تھے ان سے پہلے آٹھ لڑکے مر چکے تھے۔ جیسا کہ وہ اپنے قصیدے میں کہتے ہیں:

فرزند جو ہوا مرا دو تین سال کا　　ہاتھوں ہی ہاتھ لے لیا اس کو بڑھا کے ہاتھ
آٹھوں کے رنج ایسے سہے ہیں کہ کیا کہوں　　کوٹا ہے پہروں سینے کو کوبا بنا کے ہاتھ
اب ایک ہے کہ دودھ میسر نہیں اسے　　کہتا ہے کچھ اشاروں سے ہر دم اٹھا کے ہاتھ

(قصیدہ در مدح نواب کلب علی خاں)

یہی بات مجھے نظامؔ کے صاحبزادے سید قیصر شاہ میاں نے بھی بتائی تھی۔ جب میں نظامؔ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۴۴ء کے قریب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اسی موقع پر انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کے پیدا ہونے کے بعد ان کی والدہ نظامؔ کی مالی پریشانی کی بنا پر میکے چلی آئی تھیں۔ اور جب نظامؔ کا انتقال ہوا تو وہ تین برس کے تھے۔ اس حساب سے سید

قیصر شاہ میاں ۱۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

۶۔ نظامؔ کی ادا بندی اور معاملہ نگاری والی شاعری کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> "جوانی میں اپنے والد سید احمد شاہ کی جگہ سواروں میں نوکر ہوئے تھے مگر اپنے لاُابالی پن اور صوفیانہ روش اور شاعرانہ مزاج کی بنا پر یہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ تنگدستی کی وجہ سے بیوی عموماً پریشان رہتی تھی اور ایک لڑکے کی ماں بن چکی تھی اس لیے فاقے کرتے کرتے تنگ آکر اپنے گھر بیٹھ رہی اور سید نظام شاہ صوفی منش حضرات کی صحبت میں گزارتے رہے۔ بیوی کی جُدائی اور اُس کی یاد نے وہ تمام باتیں یا معاملے شعر میں ڈھالنے شروع کیے جو ان پر گزرے تھے۔ گویا یہ اشعار جو پر ادا بندی اور معاملہ سنجی کی مہریں ہیں سب ان کی گھر والی سے متعلق ہیں۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ وہ انتہائی پاکباز قسم کے صوفی تھے۔" (ن۔غ۔ دستنہ/۱،)

اس عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نظام نے سواروں کی ملازمت اپنے لاابالی پن اور صوفیانہ روش کی بنا پر جلد ہی چھوڑ دی تھی اور بیوی کی جدائی میں اس کی یادوں کو شعروں کے قالب میں ڈھالتے رہے نیز ساری ادا بندی اور معاملہ نگاری والی شاعری کا مواد "گھر والی" کی دین ہے کیونکہ اُن کی رائے میں نظامؔ انتہائی پاکباز قسم کے صوفی تھے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ نظامؔ کی بیوی ایک طویل عرصے تک جُدا رہیں۔

سب سے پہلے تو اس بات کا کوئی حوالہ کہیں نہیں ملتا کہ نظامؔ نے سواروں کی ملازمت چھوڑ دی تھی بلکہ نظامؔ کے کلام سے تو اس کے برعکس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نواب کلب علی خاں نے ان کو اسامیانِ اسپ منظور کی تھیں۔ اپنی منظوم عرضداشت بہ جناب مہاراج بسنت سنگھ میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کی دو اسامیاں اسپ سرکار میں ملازم ہیں۔ ریاست کے دستور کے مطابق یہ ایک طرح کی مالی امداد تھی جو بطور پرورش کی جاتی تھی۔ کلب علی خاں نے ایک اسامی کے بجائے دو عطا کر دی تھیں۔ ایک گھوڑا خریدنے کے لیے رقم کی درخواست کی ہے۔

"اسامیاں مری دو ہیں حضور میں نوکر
ایک اسپ اس میں ہوا راہی عدم ناگاہ"

اسی طرح کی ایک دوسری عرضداشت بہ جناب عثمان خاں مدارالمہام ریاست کی خدمت میں پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"دی جو سرکار نے اسامی اسپ
اسپ لینا پڑا بہ ہر عنواں"

جہاں تک بیوی کے میکے میں جا کے رہنے کا سوال ہے وہ نظامؔ کے بیٹے سید قیصر شاہ میاں کے مذکورہ بالا بیان کے بموجب ان کی پیدائش (۱۲۸۶ھ) کے بعد کا ہے۔ یعنی نظامؔ کی وفات سے دو تین سال پہلے ان کی بیوی نظامؔ کی عمر کے آخری دو تین سال میں ہی ان سے جدا رہیں۔ نو بچے نظامؔ کے مکان پر ہی پیدا ہوئے۔ پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ نظامؔ کی شاعری کا سارا قابلِ ذکر سرمایہ بیوی کی جدائی اور ہجر میں کہا گیا۔ شاد صاحب نے نظامؔ کو پاکباز صوفی قرار دیتے ہوئے ادا بندی اور معاملہ نگاری پر مبنی

اشعار کو "حسنِ رہگزر" کے بجائے "مشاہدہ درونِ خانہ" کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔ لیکن حسن پرستی سے پاکبازی ختم نہیں ہوتی۔ نظام شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ اگر مومن کی طرح جوانی میں "شاہد و شراب" سے واسطہ پڑ گیا ہو اور بعد میں توبہ کر لی ہو تو اس سے ان کی شاعرانہ عظمت یا بعد کی صوفیانہ زندگی میں کیا کمی آ جائے گی۔ جیسا کہ کلب علی خاں فائق نے کلیاتِ نظام میں بحوالہ مولوی وجیہ الدین احمد خاں صاحب امام جامع مسجد رام پور و موجودہ متولی مزار میاں احمد علی شاہ صاحب لکھا ہے کہ نظام نے ابتدائے جوانی میں شراب سے بھی شوق کیا لیکن پیر و مرشد کی ہدایت و توجہ سے توبہ کر لی اور پھر کبھی مُنھ نہ لگایا۔ اُنھیں سے یہ روایت بھی منسوب کی ہے کہ نظام کو کانٹھ ضلع مراد آباد کی ایک حسین طوائف سے والہانہ محبت ہو گئی تھی اور وُہ بھی ان کی اس قدر گرویدہ ہو گئی تھی کہ نظام اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن پیر و مرشد نے اس سے باز رکھا اور نظام نے اس سے ملنا ترک کر دیا۔ مولانا موصوف نے میرے دریافت کرنے پر اس کی تصدیق فرمائی اور بتایا کہ یہ باتیں انھیں اپنے پیر وزیر محمد خاں صاحب مرحوم سابق متولی و سجادہ نشین مزار مذکور سے معلوم ہوئی ہیں۔ غالباً یہ طوائف وہی چنتو تھی جو ستبا مغنیہ کی لڑکی تھی اور جس کا ذکر خان صاحب نے اپنی مشہور تصنیف مسدس بے نظیر میں کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب چنتو طوائف کو اس سلسلے میں ناکامی ہوئی تو اس نے کسی زمیندار سے نکاح کر لیا اور شریفانہ زندگی اختیار کر لی[1] کیا مندرجہ ذیل اشعار میں 'شاہد و شراب' کی جھلک حقیقی نہیں معلوم ہوتی:

نظام گو نہیں واں آتے جاتے برسوں سے　　پر آج تک نہیں اُس کا وہی خیال تو ہے
وہ بُت جواب سلے بھی تو ہم کیا ملیں نظام　　اب لو لگی ہوئی ہے ہماری خدا کے ساتھ
یاں کسے غم ہے جو گریے نے اثر چھوڑ دیا　　ہم نے وُہ شغل ہی اے دیدۂ تر چھوڑ دیا[2]
میکشی چھوڑے تو برسیں ہوئیں پر اب تو نظام　　دل بھر آئے جو مرے سامنے بوتل آئے

۷۔ نظام کی معاشی حالت کے بارے میں شاد صاحب نے لکھا ہے:

"تین صاحبزادگانِ وقت کا سودا سلف خریدنے پر وقتی ملازم تھے ان سے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ اس پر قناعت کر لیتے تھے۔" (ن۔ غ۔ دستہ/ ۷۳)

وقتی ملازمت اور سودا سلف خریدنے پھرنے کا ذکر کر کے شاد صاحب نے اہلِ رام پور اور نواب رام پور کی ناقدردانی پہ طنز کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ نظام کی مالی پریشانی کا اظہار ان کی منظوم عرضداشتوں اور قصائد میں ملتا ہے۔ لیکن سواروں کی ملازمت کے علاوہ اہلِ خاندان ان کا احترام کرتے تھے اور کچھ سلوک بھی کرتے تھے۔ اس بات کی تائید خاندان کی ایک معمر خاتون اختر زمانی بیگم اہلیہ صاحبزادہ محب حسن خاں خورشید کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ان کا انتقال ۱۹۵۰ء میں بعمر ۸۸ سال ہوا۔ یعنی نظام کے انتقال کے

---

[1] کلیاتِ نظام از فائق/ ۷۶ تا ۷۹　　[2] مطبوعہ نسخہ میں یہ مصرعہ یوں ہے:

ع　ہم نے تو شغل بھی اے دیدۂ تر چھوڑ دیا

لیکن میں نے اپنے خاندانی نسخے میں جس طرح پڑھا تھا اسے بہتر سمجھ کے لکھ دیا ہے۔

وقت ان کی عمر تقریباً دس سال کی تھی۔ وہ ان کا ذکر انتہائی عزت و احترام کے ساتھ کرتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ میاں نظام شاہ ان کے دادا اور دادا کے بھائیوں کا ماہانہ وثیقہ جو ریاست سے مقرر تھا، وصول کرنے کے لیے مختار خاص مقرر تھے۔ ان " صاحبزادگان وقت " کے نام (۱) صاحبزادہ اشرف علی خاں اشرف شاگرد غفلت و کرم (۲) صاحبزادہ شجاعت علی خاں شجاعت شاگرد طالب شبراتی اور (۳) صاحبزادہ کرامت علی خاں کرامت شاگرد کرم تھے۔ ان سب کا ذکر انتخاب یادگار میں ہے۔ تینوں نواب قاسم علی خاں خلف اصغر نواب فیض اللہ خاں بہادر والی رام پور کے لڑکے تھے۔ ان کے مکانات قلعہ کے قریب ہی تھے۔ حسب قاعدہ اس مختاری کا نظام کو معاوضہ ملتا تھا۔ وہ یہ بھی بتاتی تھیں کہ آخر عمر میں نظام ان کے دادا کے مردانہ حصے میں ایک کوٹھڑی میں رہنے لگے تھے۔ کھانا بھی دادا وغیرہ کے ساتھ کھاتے تھے۔

۸۔ نظام کے اس مشہور مطلع سے:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

کے سلسلے میں اپنی پندرہ سالہ " تحقیق و تلاش " کے اعتماد پر شاد صاحب نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ،

" پہلا مصرعہ نواب کلب علی خاں بہادر نے محلسرا کے کسی منظر سے متاثر ہو کر نظم کیا اور باہر آکر شعرائے دربار سے اس مصرعہ پر گرہ کی فرمائش کی۔ اپنے اپنے رنگ میں سبھی نے زور مارا مگر مصرعہ کا واقعاتی رخ کسی کی گرہ برداشت نہ کرسکا۔ چونکہ یہ مصرع نظام کے ڈھب کا تھا۔ انہوں نے کہا، ؎

دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

مصرع دست و گریباں ہو گیا تھا اس لیے نواب صاحب نے اظہارِ خوشنودی کے طور پر اپنا مصرعہ یہ کہہ کر نظام رام پوری کو عطا کر دیا کہ یہ مصرعہ بھی تم لے لو اور حضرت نظام نے بھی کوئی کمی نہیں کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اس مطلع پر پوری غزل کہہ دی۔" (ن۔ غ دستہ/ ۶۷)

دراصل فارسی اور اردو کے متعدد عمدہ اشعار سے متعلق کچھ اسی قسم کے افسانے مشہور ہیں اور اپنے چٹخارے اور دلچسپی کی بنا پر لوگوں میں مقبول ہو گئے ہیں۔ ان کی صداقت کے بارے میں کسی دستاویزی یا معتبر روایت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ شاد صاحب نے اس قصے کے راوی کا نام حافظ پھندو عرف پنڈت ساکن محلہ کٹ کوٹیا رام پور لکھا ہے جنہوں نے خود کو نظام کا دوست اور معتقد ثابت کیا تھا۔ بقول شاد صاحب حافظ پھندو ہی وہ شخص تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس راز کو لوگوں پر فاش کیا تھا۔ گویا اس قصے کے مصنف یہ حافظ پھندو ہی تھے۔ شاد صاحب نے بغیر اس بات پر غور کیے کہ نظام کا کوئی دوست واقعہ کے بیان کرتے وقت زندہ بھی ہو سکتا ہے یا نہیں انتہائی سادگی سے اسے صحیح تسلیم کر لیا۔ شاد صاحب کا مذکورہ بالا مضمون اولاً (نظام رام پوری) رسالہ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر (۱۹۵۵) میں شائع ہوا ہے اور اسی کے لیے لکھا گیا تھا۔ شاد صاحب کی ملاقات حافظ پھندو سے خود ان کے بیان کے بموجب اس مضمون کے لکھنے کے عین قبل ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے ۱۹۵۵ء میں نظام کے انتقال (۱۸۷۲ء) کو

۸۳ برس ہو چکے تھے۔ اگر اس مدت میں حافظ پھندو کی وہ عمر بھی جوڑی جائے جو نظام کے دوست کی حیثیت سے ۱۸۰۲ء میں ہونا چاہیے جو ۳۰/۴۰ سال سے کیا کم ہوگی تو مجموعہ ۱۱۳ تا ۱۲۳ سال ہوتا ہے غرضیکہ یہ حافظ پھندو داستان گو تو ہو سکتا ہے معتبر و چشم دید راوی نہیں ہو سکتا۔

اور جب شاد صاحب کو یہ یقین ہو گیا کہ مصرعۂ اولیٰ نظام کا نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں نواب کا ہے تو فوراً ان کی رگِ طنز پھڑک اٹھی اور انھوں نے اسے "ملوک الکلام" قرار دے دیا۔ اور جوانی میں جس مطلع کو سن کر بے حد متاثر ہوئے تھے اب اس کے مصرعۂ اولیٰ کے 'ردیف و قافیہ' زوائد نظر آنے لگے۔ وہ لکھتے ہیں:

"(انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے) ——— مضمون ادا ہو چکا۔ (اٹھا کے ہاتھ) ——— چھلانگ لگا کر دور جا کھڑا ہوا۔" (ن۔ غ۔ دستہ/ ۶۸)

اسی کو اعتراض برائے اعتراض کہتے ہیں۔

میری ناچیز رائے میں یہ دونوں مصرعے نظام ہی کے ہیں اور مصرعۂ اولیٰ میں کوئی سقم نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "انگڑائی" کے فعل کو سمجھ لیا جائے۔ انگڑائی لیتے وقت ہاتھ نیچے سے اٹھا کر سر کے اوپر لائے جاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے اعصابی زور سے گرفت کو سخت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انگڑائی مکمل ہوتی ہے اور اس سے وہ سستی دور ہوتی ہے جس کا تقاضہ انگڑائی ہوتی ہے۔ محض سر کے اوپر ہاتھ اٹھانے کو انگڑائی نہیں کہتے۔ نظام نے محبوب کو ایک ایسے عالم میں دکھایا ہے کہ انگڑائی لینے کی غرض سے ابھی اس نے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر عاشق پر پڑی اور اس نے بغیر انگڑائی لیے ہوئے ہاتھوں کو نیچے چھوڑ دیا۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ نظام کے یہاں محبوب مرد نہیں بلکہ عورت ہے ظاہر ہے کہ انگڑائی کے وقت جو نسوانی ابھار پیدا ہوتا ہے اس کی نمائش کسی مرد کے سامنے جائز نہیں۔ یہی سبب ہے کہ محبوب نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیے، لیکن یونہی نہیں چھوڑے "مسکرا کے" چھوڑے۔ اس مسکرانے کے لفظ میں شاعر نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ نظام اسی ادا بندی کے لیے مشہور ہیں۔ اس لحاظ سے "اٹھا کے ہاتھ" غیر ضروری نہیں بلکہ "وضاحتی" طور پر ہے۔

شاد صاحب نے حافظ پھندو کی روایت کو تسلیم کرنے سے پیشتر اس امر پر بھی غور نہیں کیا کہ نواب کلب علی خاں بڑے رکھ رکھاؤ اور رعب اور دبدبے کے فرمانروا تھے وہ کسی طرح محل سرائے کی کسی کیفیت کو دیکھ کر کہا ہوا اپنا مصرعہ یوں بے تکلفی کے ساتھ بر سر عام شعرائے دربار کے سامنے گرہ لگانے کے لیے ہرگز پیش نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایسا کوئی مصرعہ ہو گیا تھا اور مناسب مصرعہ نہ مل سکا تھا تو قاعدے کے بموجب اپنے استاد امیر مینائی سے تنہائی میں رجوع کرتے، نہ کہ بر سر عام تمام شعرائے دربار کا امتحان لینے اور شعرائے دربار بھی کون؟ جن میں ان کے استاد امیر مینائی کے استاد اسیر لکھنوی، جلال، برق، بحر، قلق، منیر، داغ وغیرہ جیسے اساتذہ لکھنو و دہلی شامل تھے۔ لطف یہ ہے کہ یہ سب عاجز رہتے ہیں یا ان کے مصرعوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے اور نظام بازی جیت لیتے ہیں۔ اتنے عظیم کارنامے پر داد و دہش کرنے والا نواب کوئی انعام نہیں دیتا بلکہ اپنا کہا ہوا مصرعہ عطا کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔

نظام کی یہ غزل اسی زمین میں کہے گئے ایک قصیدے کی تشبیب ہے جو نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہے۔ لیکن اسے غزل کے طور پر غزلیات میں شامل کر دیا گیا۔ اور بقیہ قصیدہ الگ رکھا گیا ہے۔ کلیاتِ نظام (مطبوعہ شمس المطابع مراد آباد) میں ص ۱۵۸ پر اس قصیدہ کا آغاز اسی غزل کے مطلع سے ہوتا ہے۔[1]

۹۔ شاد صاحب نے اسی مضمون میں ایک دوسری عجیب روایت نظام کے انتقال کے بعد ان کے کلام کی چوری کے بارے میں بیان کی ہے اور اس جرم کے مرتکب امیر مینائی بتائے گئے ہیں۔ ایک صاحب امتیاز کھنڈارا ڈرائنگ ماسٹر جو مشہور ماہر موسیقی استاد وزیر خاں مرحوم کے بھائی فدا علی صاحب کے لڑکے ہیں۔ شاد صاحب کا فوٹو لینے آئے تاکہ ان کا اسکیچ تیار ہو سکے۔ اسی ملاقات میں انھوں نے اپنے مرحوم والد کے حوالے سے یہ روایت بیان کی۔ شاد صاحب نے ان سے خوش ہو کر اس محتاجِ ثبوت اور محیر العقول روایت کو اپنے مضمون میں نمایاں طور پر بیان کر دیا۔ لکھتے ہیں:

> "ہاں تو کھنڈارا کے والد (فدا علی صاحب مرحوم) کا بیان ہے کہ جب میاں نظام کا انتقال ہوا تو امیر احمد صاحب مینائی نے آکر نظام صاحب کے مسکونہ مکان میں حکومت کی طرف سے ایک اور قفل ڈال دیا۔ اور سوم کے بعد امیر مینائی نے ہی یہ مکان کھولا۔ غزلیات کے مسودے اور کچھ اشعار جو مکان کی دیواروں پر کوئلے سے لکھے تھے نوٹ کیے اور ان کو مٹا کر چلے گئے۔ پلنگ پیڑھی ان کی بیوی کو بھجوا دی ...... موصوف (کھنڈارا) نے یہاں ایک عجیب و غریب بات کہی یعنی ماسٹر کھنڈارا صاحب کے والد کا خیال تھا کہ وہ اشعار جو امیر مینائی کے کلام میں نہیں چھپے۔ یہ وہی اشعار ہیں جو وہ نظام شاہ کے مکان سے اپنے ہمراہ لے گئے۔"

(ن۔ غ۔ دسمبر ۷۴ تا ۵۶)

اگرچہ شاد صاحب نے اسی مضمون میں آگے چل کر اس بدگمانی کو درست نہیں مانا ہے۔ لیکن طاہرہ اختر کے ایک مضمون "شاد عارفی" سے جو نقوش لاہور کے شخصیات نمبر حصہ دوم (۱۹۵۶ء) میں شائع ہوا ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاد صاحب اپنے ۱۹۵۵ء میں لکھے ہوئے مضمون کے برخلاف بعد کو خود بھی امیر مینائی کو سارقِ کلامِ نظام سمجھتے تھے۔ طاہرہ اختر اپنے مضمون ("شاد عارفی" ص ۱۱۳۵) میں لکھتی ہیں:

> "کچھ دن ہوئے لڈن ماموں (شاد عارفی) سے امیر مینائی کے ایک شعر کا مطلب پوچھ رہی تھیں۔ مطلب بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ شعر امیر مینائی کا نہیں بلکہ نظام رام پوری کا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایسی دلیلیں پیش کیں جن سے ان کی بات کو تقویت پہنچتی تھی۔ ایک دن کہنے لگے نظام کے کلام کا سرقہ ہوا ہے۔ پرانے لوگوں سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں۔ پھر ثابت کروں گا کہ نظام کا بہت سا کلام امیر مینائی کے کلام میں شامل ہو گیا ہے۔"

---

[1] کلیاتِ نظام از فائق / حاشیہ ص ۴۷۸

غالباً ان کا یہ موعودہ مضمون نہیں لکھا جا سکا۔ اگر لکھا گیا ہوتا تو کافی ہنگامہ خیز ثابت ہوتا کیونکہ امیر مینائی جیسے استادِ وقت جیّد عالم، مفتیِ عدالت پر اس قسم کا الزام دینا دنیائے ادب میں کوئی معمولی واقعہ نہ ہوتا۔ اب ماسٹر کھنڈارا صاحب کے والد کی چشم دید روایت کو بھی پرکھ لیا جائے۔ کیونکہ یہی بنیاد ہے اس تمام مسئلے کی، اپنے والد فدا علی صاحب کے بارے میں کھنڈارا صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ وُہ گھیر سیّحی میں رہتے تھے جہاں نظاؔم کا آبائی مسکونہ مکان بھی تھا۔ اسی میں نظاؔم کا انتقال ہوا۔ پہلے تو یہی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ نظاؔم کا آبائی مکان انتقال کے وقت ان کی ملکیت میں تھا کیونکہ نظاؔم خود اپنے ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں:

ایسے پڑے ہیں صرف تولد سے موت کے
رہنے کا بھی مکان بِکا میرزا کے ہاتھ

یعنی یہ مکان انتقال سے کئی سال پیشتر بک چکا تھا۔ بیوی میکے میں چلی گئی تھیں۔ اور جیسا کہ اُوپر بیان کر چکا ہُوں نظام صاحبزادگان مردانے حصّے میں رہنے لگے تھے۔ ایسی صورت میں آبائی مکان میں انتقال ہونے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ اس مکان میں "پلنگ پیڑھی" منھی جوان کی بیوی کو بھیجی جاتی۔ اس کے علاوہ امیر مینائی جب سرکار کی طرف سے آتے تو فدا علی صاحب کے علاوہ اس وقت مکان میں نظاؔم کے عزیز اور محلے کے دیگر افراد بھی حسبِ قاعدہ موجود ہوں گے۔ ایسی صورت میں امیر مینائی نے اگر دیواروں سے کچھ اشعار نقل کیے بھی ہوں تو انھیں دوسرے لوگوں نے بھی پڑھا ہوگا۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ ان اشعار کو انھوں نے اپنے کلام میں شامل کر لیا جبکہ یہ بھی خطرہ تھا کہ نظاؔم ان اشعار کو لوگوں کو پہلے سنا چکے ہوں اور وُہ انھوں نے لکھ لیے ہوں یا ان کے حافظے میں محفوظ ہوں چنانچہ ایسا کلام جو ان کے مسودات میں نہ تھا بعد کو لوگوں سے ملا بھی۔ رہی امیر مینائی کے کلام میں ایسے اشعار کی موجودگی جو ان کے عام رنگ سے میل نہیں کھاتے۔ اس کا سبب سرقہ کے بجائے ان کا رام پور کے شعراء سے متاثر ہونا بھی تو ہو سکتا ہے۔ جس طرح داغؔ کے رنگ میں رام پور آ کر تبدیلی پیدا ہُوئی اسی طرح امیر مینائی اور جلال لکھنوی نے یہاں کا اثر قبول کیا اور ان کے کلام میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی میں نے اس موضوع پر اپنی زیرِ تصنیف ادبی تاریخ "رامپور کا دبستانِ شاعری" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

اس مضمون کے خاتمے پر ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آیا کہ اگر شآد صاحب اِس وقت زندہ ہوتے اور میں ان سے مل کر ان امور کی طرف توجہ دلاتا تو بہت ممکن ہے کہ وُہ خود صفائی سے اعتراف کر لیتے اور اس قسم کا مضمون میرے بجائے ان کی طرف سے شایع ہوتا۔ یہی ان کا مزاج تھا اور ایک جگہ انھوں نے کس جرأت سے خود اپنے بارے میں لکھا ہے:

> "سب سے پہلے مجھے اپنی کوتاہ قلمی کا اقرار لازمی ہے جس کے ذیل میں کئی تفصیلی باتیں اجمال کی نذر ہو گئی ہیں کئی اچھے شعروں پر رواروی کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ نثر پر تو کافی عدمِ توجہی کا گمان گزرتا ہے اور یہ گمان یقین کی حد تک درست ہے کیونکہ میں نے جن حالات میں یہ مطالعے لکھے ہیں یا لکھ رہا ہوں ان کے اندر اس درجہ مدوجزر اور اُتار چڑھاؤ ہیں کہ کسی بھی مجھ ایسے علیل آدمی کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ اطمینان اور فرصت، جو مطالعے کے لیے نہایت اہم ہیں ان کا فقدان ادبی توازن باقی نہیں رہنے دیتا۔" (مطالعے جملہ اپنے پہ بھی.... نثر و غزل دستہ/۱۸۷)

تخلیق کار، تخلیق اور جنون

سلیم اختر

> "اہل علم کا جنون بھی عام مجنونوں سے مختلف ہوتا ہے مولانا آزاد دہلوی نے اپنی اخیر عمر کا ایک طویل حصہ اسی عالم میں گزارا ہے اس حالت میں وہ اکثر اوقات اپنے مجذوبانہ خیالات کو قلم بند فرمایا کرتے تھے ان تمام تحریروں کو جمع کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں آزاد کے شاگرد رشید مولوی سید ممتاز علی صاحب نے "پاک و نماک" کے نام سے ایک مختصر کتاب کی صورت میں ان خیالات کو شائع بھی کیا ہے جسے دیکھ کر ایک انگریز مصنف نے کہا تھا کہ "یورپ میں مشہور مصنفوں کی عالم جنون کی تحریریں بڑی وقعت سے دیکھی جاتی ہیں۔ آزاد جیسی شخصیت کا مصنف اگر یورپ میں مبتلائے جنون ہوتا تو اس کی مجذوبانہ تحریریں بڑی مقبولیت حاصل کرتیں"۔ شیخ عبد القادر نے بتایا کہ "ایک مرتبہ عالم جنون میں آزاد نے کسی کتاب کی تعریف کی۔ مولانا مرحوم نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ میری کوئی تصنیف نہیں ہے یہ کتابیں جو آزاد کے نام سے شائع ہو رہی ہیں یہ در اصل میری نہیں ہیں بلکہ میرے "ستایو" کی ہیں۔ استفسار پر مولانا نے بتایا "ستایو" جاپانی میں ہمزاد کو کہتے ہیں۔" واقعی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

یہ اقتباس تاجور نجیب آبادی کے مضمون "جذبات آزاد" (مطبوعہ: ہمایوں، جنوری ۴ ۱۹۲۲ء) سے لیا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد[1] صاحب بصیرت ادیب تھے سو دیوانگی میں بھی فرزانگی کا اظہار کرتے ہوئے تخلیق اور لاشعور کا رشتہ اُجاگر کر گئے۔ آزاد کی تخلیقی زندگی کو تو جنون زنگ بن کر کھا گیا، جبکہ میر تقی میرؔ اس کے برعکس جنون کی آگ سے کندن بن کر نکلا تو یہ دعویٰ کیا: ؎

خوش ہیں دیوانگیِ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

اپنی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر" میں میرؔ نے اپنے عالمِ جنون کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں "کیس ہسٹری" ایسی وضاحت پائی جاتی ہے اور اسی لیے اس کی نفسیاتی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ لکھا ہے یوں میرؔ نے "..... اور میں پاگل ہو گیا مزاج میں وحشت پیدا ہو گئی جس کوٹھڑی میں رہتا تھا اس کا دروازہ بند کر لیتا اور اس ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا چاند نکلتا تو میرے لیے

---

[1] ہمایوں دسمبر ۱۹۲۵ء میں آزاد کی عالم جنون کی ایک تحریر بھی شائع کی گئی ہے جو بالکل بے ربط ہے مزید دلچسپی کے لیے ڈاکٹر محمد صادق کا مضمون بعنوان "آزاد عالم دیوانگی میں"۔ (مطبوعہ، ماہِ نو، اکتوبر ۱۹۵۵ء) ملاحظہ ہو۔

قیامت ہوتی تھی اگرچہ میں اس وقت سے چاند کو دیکھتا آیا تھا جب منہ دھلانے وقت دایہ "چاند چاند" کہتی اور میں آسمان کی سمت دیکھتا تھا لیکن وہ اس طرح کہ دیوانگی تک نوبت پہنچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ مجھ سے دور بھاگنے لگیں (نقل عجیب) چاندنی رات میں ایک حسین پیکر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا جدھر بھی آنکھ اٹھتی اسی رشکِ پری پہ پڑتی جس طرف دیکھتا اسی غیرتِ حور کا تماشہ کرتا میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورقِ تصویر ہو گئے تھے یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا (چہرہ) نظر آتا کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے، کبھی سیرگاہ دل میں محوِ خرام، اگر گل مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اسی پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اسی کی جدائی میں وحشت، جب سفیدۂ سحر نمودار ہوتا دل سے ٹھنڈی آہیں نکلنے لگتیں یعنی دل مچلتا اور چاند کی طرف لپکتا۔ تمام دن یہی جنون سوار رہتا اور دل اس (شکل مہتابی) کی یاد میں خون ہوتا۔ میں دیوانہ مست کی مانند منہ میں کف بھرا ہوا ہاتھ میں پتھر لیے گرتا پڑتا اور لوگ مجھے دیکھ کر بھاگتے۔ چار مہینے تک وہ گل شب افروز نت نئے انداز دکھاتا اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا ناگاہ موسم بہار آیا تو جنون کے داغ اور بھی ہرے ہو گئے۔ میں ایسا ہو گیا جیسے کوئی آسیب زدہ ہو اور مطلق کسی کام کاج کا نہ رہا۔ اور خیالی صورت ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اسی کی مشکیں زلفوں کا دھیان سر میں، لوگ مجھ سے بھاگنے لگے اور مجھے بند کر دیا گیا۔[1]

میر یا آزاد کے جنون کی مثالیں استثنائی ہیں بلکہ اور بھی ایسے تخلیق کار مل جاتے ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں جنون گزیدہ تھے۔ بعض کے جنون کی شہرت ہوئی اور بعض کی نہیں۔ مثلاً امراؤ جان ادا کے خالق مرزا رسوا کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ایک "فرنگن" کے عشق میں مجنون ہو گئے تھے۔[2]

ادب و فن کے نفسیاتی مطالعات میں تخلیقی عمل اور تخلیقات پر لاشعوری محرکات کی وضاحت میں بیشتر توضیحات نامورانِ ادب کی ذاتی زندگی سے ابنارمل سے لے کر جنون پر منتج ہونے والی کیفیات کو مدِنظر رکھ کر مرتب کی گئی ہیں جن سے تخلیقات پر لاشعوری محرکات کی شدید اثر اندازی عیاں ہوتی ہے اور یہ امر بھی کہ خود تخلیق بھی لاشعور کے زخموں کا مرہم ثابت ہوتی ہے لیکن یہ سب ایک خاص حد تک ہی ہوتا ہے۔ اس نوع کی مثالوں سے نہ تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر جنونی اظہار کے لیے لازماً فن کارانہ وسائل بروئے کار لاتا ہے اور نہ ہی یہ کہ جنون کے تمام مدارج میں تخلیق باعثِ افادہ یا ذریعۂ آسودگی بن سکتی ہے البتہ ذہنی شفاخانوں میں ذہنی مریضوں کے مشاہدات سے ماہرینِ نفسیات نے فن کارانہ کاوشوں پر لاشعوری محرکات کی اثر پذیری کے ضمن میں نکتہ طرازیاں کی ہیں ——

ارنسٹ کرس نے ایک پاگل کا بیان نقل کیا ہے جو لکڑی سے چیزیں بناتا تھا:

---

[1] "میر کی آپ بیتی" ترجمہ نثار احمد فاروقی، ص ۹۴-۹۵ - "ذکرِ میر" کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو "ذکرِ میر" از مولوی عبدالحق (مطبوعہ "اردو"، اورنگ آباد، ۱۹۲۶ء)

[2] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہوں یہ مقالات: "جنونِ انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا" از غلام عباس، مطبوعہ ماہِ نو، اکتوبر ۱۹۵۵ء۔ "مرزا رسوا کی ایک گم شدہ مثنوی" از مشیر احمد علوی، مطبوعہ نگار، دسمبر ۱۹۳۶ء۔ "اختتامیہ امراؤ جان ادا" از تمکین کاظمی، مطبوعہ نیا ادارہ، لاہور۔

"جب میرے سامنے لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے تو یہ مجھے تنویم کی مانند مسحور کر لیتا ہے۔ اگر میں اس کا حکم مانوں تو یہ کوئی چیز بن جاتا ہے۔ نہ مانوں تو تکلیف اٹھاتا ہوں۔"[1]

اس بات سے عظیم مجسمہ ساز مائیکل انجلو کا یہ قول بھی ذہن میں آتا ہے کہ شبیہہ تو پتھر میں موجود ہوتی ہے میں تو صرف تراش کر اُجاگر کرتا ہوں۔

جس طرح فرائڈ نے اعصابی خلل کی علامات سے ذہنی صحت کے اصول اخذ کیے اسی طرح ارنسٹ کرس کے بموجب بھی "فن کارانہ کاوشیں —— بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ پاگل فن کاروں کی فنی کاوشیں —— فن کی نفسیات پر نئے زاویہ سے روشنی ڈالتی ہیں:[2] اس ضمن میں اے اے بِرِل نے بھی تخلیقِ فن کے لاشعوری محرکات سے بحث کرتے ہوئے اور ہر فن کار کو "PYGMALION" قرار دیتے ہوئے اس امر پہ زور دیا کہ "خواب اور ان کی علامات کی مانند فن کارانہ تخلیقات بھی ناکام آرزوؤں کی تکمیل کا ایک لاشعوری انداز ہیں[3]" اس کی صراحت میں اس نے پاگلوں کی مثال دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ ایسے افراد کی کمی نہیں جن میں نارمل حالت میں کسی طرح کی بھی فن کارانہ صلاحیتیں نہ تھیں لیکن پاگل ہو جانے کے بعد اچانک انہوں نے فن کارانہ کاوشوں کا آغاز کر دیا اس سلسلہ میں وہ مزید رقم طراز ہے: "میرے پاس ایسی فن کارانہ تخلیقات کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ان میں تصویریں، مجسمے اور ادبیات سب کچھ موجود ہے۔ یہ سب ان افراد کی فن کارانہ کاوشیں ہیں جنہوں نے میری معلومات کے مطابق نہ تو کبھی فن کے بارے میں خصوصی شغف یا رجحان کا اظہار کیا اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی فن کارانہ صلاحیتیں موجود تھیں مثلاً ایک کریانہ فروش نے پاگل پن کے دوران شہوانی شاعری شروع کر دی جو اچھی شاعری کے جملہ اوصاف سے متصف تھی۔ اسی طرح ایک باورچی نے ایمبرائڈری میں ایسی ہنرمندی کا ثبوت دیا کہ اچھے اچھے فن کاروں نے اسے بازنطینی دور کی اعلیٰ ہنرمندی کا لاجواب نمونہ قرار دیا۔"[4]

گو نفسیات کی کتابیں ایسی نفسی سرگزشتوں سے بھری پڑی ہیں لیکن انہیں غیرضروری اہمیت نہ دینی چاہیے اس لیے کہ ایک سچا فن کار اپنے تخیل اور تصورات میں دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ اسی لیے وہ ابلاغ پر ایمان رکھتے ہوئے ہمیشہ خود کو اپنے ان دیکھے قارئین اور ناقدین کے سامنے محسوس کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس پاگل فن کار اپنی محدود ترین دنیا سے باہر نہیں نکل سکتا۔ عام فن کار جس تخلیقی عمل یا لاشعور کی امداد سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس سے تخلیق کی صورت میں وہ اپنی محدود دنیا سے بلند تر ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن پاگل فن کار کا معاملہ برعکس ہے کہ وہ سب سے بے نیاز ہے! مزید برآں ہر پاگل کی فنکارانہ

---

[1] "PYSCHOANALYTIC EXPLORATION IN ART" P.114

[2] ایضاً، ص ۳۳۶

[3] "BASIC PRINCIPLES OF PYSCHOANAYSIS" P.261

[4] ایضاً، ص ۲۶۲

کاوشیں تخلیق نہیں قرار دی جا سکتیں کیونکہ بالعموم ان کی مصوری معمہ اور تحریر چیستاں سے کم نہیں ہوتی۔ گو نفسی معالج اس میں بہت کچھ دیکھ سکتا ہے لیکن عام قاری کے لیے وہ محض پاگل کی بڑ ہے۔ پاگل پن کے ابتدائی مدارج میں تو شاید ایسی کاوشوں کی کچھ تخلیقی اہمیت ہو بھی سکتی ہے لیکن جنون کی شدت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ان فن پاروں میں تنوع اور جدت کا فقدان ہوتا جاتا ہے اور تکرار و اعادہ میں اضافہ۔ لہٰذا پاگل فن کاروں کی ایسی کاوشوں کی معالجاتی اہمیت سے قطع نظر بیشتر صورتوں میں ان کی فن کارانہ حیثیت اور انتقادی اہمیت صفر ہوتی ہے۔ اس لیے انھیں ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیے۔

دراصل پاگل فن کاروں یا فن کاروں کے پاگل پن کا مسئلہ ایک بہت اہم، بے حد نزاعی مگر بہت دلچسپ بحث کا ضمنی حصہ ہے۔ کیا فن کار ابنارمل ہوتا ہے؟

ماہرینِ نفسیات میں گو اختلافِ رائے ملتا ہے لیکن بیشتر کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فن کار مریضانہ شخصیت کی پیداوار ہوتا ہے۔ ویسے یہ بحث بھی آج کی نہیں کیونکہ افلاطون سے ہی تخلیقی فن کاروں کو کسی نہ کسی حد تک دیوانہ، جنونی، پاگل یا کم از کم غیر معمولی تو ضرور ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ افلاطون نے "دیوانگی" کو استعارۃً استعمال کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ تخلیق کے لیے دیوانگی لازم ہے کیونکہ اس کے منطقی نتیجہ میں ہر دیوانہ ہی تخلیقی فن کار کہلائے گا اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں! ایک بات البتہ ہے کہ لوگ دیوانہ سمجھیں یا نہ سمجھیں تخلیق کاروں کو وہ شک و شبہ کی نگاہ سے یقیناً دیکھتے ہیں شاید اس میں خود تخلیق کاروں کے طرزِ عمل کا بھی ہاتھ ہو۔ نفسیاتی معالجہ کی کتب اور ان کے زیرِ اثر بعض نفسیاتی ناقدین نے بھی تخلیق کار کی ابنارملٹی کو بہت زیادہ —— بلکہ ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے چنانچہ عوام کی مانند بعض ناقدین —— جن میں سرِ فہرست ایڈمنڈ ولسن ہے —— کا یہ خیال ہے کہ ہر تخلیق کار کے لیے اول تو ابنارمل ہونا لازم ہے اور اگر ایسا نہ بھی تسلیم کریں تو ان کے بموجب کم از کم تخلیق کا اعصابی خلل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ اندازِ نظر کلی سچائی پر مبنی نہ سہی لیکن اس میں جزوی صداقت یقیناً ملتی ہے۔ اس ضمن میں ان لاتعداد تخلیق کاروں کی زندگیاں بطورِ مثال پیش کی جا سکتی ہیں جنہوں نے تمام عمر ذہنی بوالعجبیوں میں بسر کی (میراجی) جو افیونی (کولرج، ڈی کوئنسی، یا الکوحلسٹ تھے۔ (منٹو) — اعصابی خلل کے مریض تھے (شیلے، بادلیر) نامرد تھے (رسکن، سوفٹ) جو مجرم رہے (روبنز، اقدامِ قتل کے مجرم تھے (نارمن میلر) بول و براز سے جنسی دلچسپی رکھتے تھے (ژاں ژینے) جنسی امراض میں مبتلا ہوئے (موپساں) جنسی کج روی کے شوقین (دوستوفسکی) جنسی کارکردگی سے کبھی دل نہ بھرا (بائرن) ہم جنس پرست تھے (آسکر وائلڈ) اگر بالکل اخلاق باختہ نہ تھے (ورلین) تو ذہنی امراض میں مبتلا رہے (ورجینا ولف، قاضی نذرالاسلام) پاگل خانے میں مرے (دی ساد) اور بالآخر خودکشی کی (ارنسٹ ہیمنگوے) —— اب اسے افلاطون کی "فرزانہ دیوانگی" سمجھیں یا فن کارانہ لاابالی پن، بہرحال اتنا تو یقینی ہے کہ تخلیق کاروں میں انھیں دوسروں سے ممتاز کرنے والی ایک خاص نفسی ترنگ ضرور ملتی ہے اور نابغہ بھی "Q.I" کی آخری سیڑھی پر کھڑا نظر آتا ہے اس لیے بعض اسے بھی ابنارمل سمجھتے ہیں حتیٰ کہ سائنس ایسے غیر جذباتی اور حقایق و کوائف کی صداقت پر پرکھنے والے علم کے ماننے والوں کو بھی اس ابنارملٹی میں شامل کر لیا گیا ہے چنانچہ

جاسوسی کہانیوں، سائنسی فسانوں اور تھرلرز نے جنونی سائنس دان کا ایک عجیب و غریب تصور لوگوں کے ذہن میں بٹھا رکھا ہے۔ بہر حال اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے دنیائے ادب کو دیکھیں تو پھر شمس الرحمان فاروقی کی یہ رائے قابلِ غور ہے:

> "شاعری اور خاص کر اردو شاعری میں جنون کو تو بڑا اہم مرتبہ حاصل رہا ہے... تمام بڑے شاعر اور خاص کر تمام بڑے رومانی شاعر کسی نہ کسی حد تک عقل کے اس غیر توازن کے آئینہ دار ہیں جو اپنی ابتدائی شکل میں عقلی طرزِ افہام کی نفی کرتا اور تخیلی یا وجدانی طرزِ افہام پر اصرار کرتا ہے نیز اپنی آخری شکل میں عقلی بیوہار سے مکمل انکار کر کے باقاعدہ جنون میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔ جنون اور عقل دراصل اشیاء کے افہام کے دو طریقے ہیں اور شاعری اور مابعد الطبیعات میں جنون کو عقل پر فوقیت حاصل ہے۔"[1]

افراط و تفریط سے بچ کر اس مسئلہ کا جائزہ لینے پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ابنارملٹی کو فارمولے کی طرح تسلیم نہ کرنے پر بھی یہ یقینی ہے کہ بعض —— لیکن سب ہی نہیں، اعصابی دباؤ یا انتشار کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اس میں جذباتی تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ غیر جذباتی سائنس دانوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ یہ عمومی حالت ہے جبکہ... مخصوص صورتوں یا استثنائی مثالوں میں اس اعصابیت کے ڈانڈے نیوراتیت یا اعصابی فعل سے بھی جا ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفسیاتی الجھنوں اور مرگی کے دوروں کی وجہ سے دوستونسکی کی شخصیت میں جو سحر انگیزی پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے فرائڈ اور ایڈلر ایسے نفسیات دانوں سے اس پر مقالات قلم بند کرائے۔

اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ ہر تخلیق کار بلکہ نفسیاتی لحاظ سے تو ہر فرد ایک مخصوص نفسی جہان رکھتا ہے اور اپنی سائیکی کی سحر کاریوں اور اپنے لاشعور کی طلسم کاریوں کے لحاظ سے منفرد ہوتا ہے اس لیے چند مخصوص اور استثنائی مثالوں سے عمومی نتائج کا اخذ کرنا تو گمراہ ہونا ہی ہے لیکن ایسے نتائج کو فارمولوں کی صورت میں مزید استثنائی مثالوں پر منطبق کرنا اور بھی زیادہ گمراہی کا موجب بن سکتا ہے۔ اس لیے زیادہ محفوظ اور قطعی طریقہ تو یہی ہے کہ اس نقطۂ نظر سے ہر تخلیق کار کی تحلیلِ نفسی ہو اور اس کے نتائج کی روشنی میں اس کی شخصیت کی نفسی اساس اور اس کا اس کی تخلیقات سے رابطہ متعین کیا جائے جیسے کہ ایملی زولا نے کیا۔ اس نے خود کو پندرہ ماہرینِ نفسیات کے حوالہ کر دیا جنھوں نے اس کی نفسی چھان پھٹک سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی تخلیقات اس کی اعصابیت کا ثمر ہیں۔ ایملی زولا نے اس فیصلہ کو درست تسلیم کر لیا تھا[2] ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی بعض نظموں کا محرک "دماغ میں انتشار" اور اعصابی کمزوری (NEURASTHENIA) قرار دیا تھا[3] مسعود اشعر نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" میں یہ اعتراف کیا کہ بعض افسانے لکھ کر اس نے اپنا کیتھارسس کیا ہے۔ خود

---

[1] "غالب کی مشکل پسندی" مطبوعہ "صحیفہ" غالب نمبر (۲) اپریل ۱۹۶۹ء

[2] "LIBERAL IMAGINATION" P. 163

[3] "غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ" ص ۱۷۱

فرائڈ نے بھی ایک موقع پر جرمن شاعر ہائنے (HEINE) کے یہ اشعار نقل کیے ہیں جن سے تخلیق اور مرض کے کرب میں جام و مینا ایسا تعلق نظر آتا ہے:

"DISEASE AT BOTTOM BROUGHT ABOUT
CREATIVE URGENCE — FOR, CREATING
I SOON COULD FEEL THE PAIN ABAITING
CREATING, I COULD WORK IT OUT."[1]

مرض اور تخلیق کے تعلق کا مشاہدہ لاتعداد فن کاروں کی زندگی سے کیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں بودلیئر کی مثال بڑی نمایاں ہے۔ بودلیئر نے اپنے روزنامچہ میں ان کیفیات کا ذکر ایک انوکھی شدت اور دل ہلا دینے والی بے چینی کے ساتھ کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

"میں نے اپنے ہسٹریا کو رونگٹے کھڑے کر دینے والے خوف اور اہتزاز کے ساتھ پالا ہے۔ اب مجھے مسلسل دوران سر کی شکایت رہتی ہے۔ آج ۲۳ جنوری ۱۸۶۲ء کو مجھے ایک انوکھی طرح کا احساس ہوا میں نے جنون کے بال و پر کو اپنے سر سے گزرتے محسوس کیا۔"[2]

جہاں تک تخلیق کار کی اعصابیت یا ادب سے وابستہ دیگر اہم نفسیاتی مباحث کا تعلق ہے تو امریکہ میں ۱۹۱۰ء سے ان پہ بحث کا آغاز ہو چکا تھا۔ کلاڈیا مورلین کے بموجب ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان فرائڈ کے نظریات کی ادب و فن پر تطبیق کی سرگرم بحثوں کا دور تھا۔ اس دوران میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن اچھے اور قابل قدر مقالات کے ساتھ ساتھ ایسے مقالات بھی لکھے گئے جن سے الجھنوں میں مزید اضافہ ہی نہ ہوا بلکہ بعض تو سرے سے بالکل بے معنی تھے۔"[3] کلاڈیا نے اس دور کے جن مقالات کا خصوصی تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہیں: الفریڈ بوتھ کٹنر کا مقالہ "THE ARTIST" (مطبوعہ ۱۹۱۷ء)۔ کٹنر کے بموجب تخلیق کار پاگل اور نیوراتی کے بین بین ہوتا ہے اس لیے بعض اوقات اس میں نیوراتی رجحانات بھی نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک تخلیقی تحریک کا تعلق ہے تو اس کے اثرات ہمیشہ صحت بخش ہوتے ہیں بلکہ اس کی وجہ سے تخلیق کار اعصابی خلل سے محفوظ رہتا ہے۔ تخلیقی تحریک کا اظہار فن کارانہ تکنیک میں ہوتا ہے اور اس سے وہ لاشعور کو لگام ڈالنے میں کامیاب ہوتا ہے اس سے کٹنر نے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"فن درحقیقت اصولِ حقیقت اور اصولِ حسرت میں مفاہمت کا ایک انداز ہے اور یہ دونوں کو نہایت منفرد انداز میں ہم آہنگ کرتا ہے۔"

یہ مقالہ "THE SEVEN ARTS" میں طبع ہوا تو اس کے مدیر جیمز اوپن ہیم نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اداریہ قلم بند کیا

---

[1] "COLLECTED PAPERS" (VOL. IV) P. 43
[2] بحوالہ صحیفہ غالب نمبر ۲
[3] "FREUD AND THE CRITIC" P. 44

جس کے جواب میں گلٹر نے مزید وضاحت کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ تخلیق کار نہ تو نارمل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ نارمل ہو سکتا ہے بلکہ اسے نارمل ہونا بھی نہیں چاہیے اس کے بموجب تحلیلِ نفسی کے ذریعہ سے تخلیق کار کو نارمل بنانا ممکن نہیں کیونکہ وہ خود بھی نارمل بننے کا خواہاں نہیں ہوتا۔

ولہلم سٹیکل نے "POETRY AND NEUROSIS" کے موضوع پر سلسلہ وار پانچ مقالات قلم بند کیے جو ۲۴-۱۹۲۳ء میں طبع ہوئے۔ سٹیکل پیشہ ور نفسی معالج تھا اس لیے اس مسئلہ کے بارے میں اس کا رویہ ادبی ناقد کے برعکس معالجاتی ہے۔ سٹیکل کی دانست میں تخلیق کار بنیادی طور سے نیوراتی ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"فن کار اور نیوراتی میں کسی طرح کا بھی فرق نہیں۔ گو ہر نیوراتی فن کار نہیں ہوتا لیکن ہر فن کار یقیناً نیوراتی ہے۔"

سٹیکل کے خیال میں نیوراتیت عالمگیر رجحانات میں سے ہے۔ یہ جبلت اور کلچر کی کشمکش کے نتیجہ میں جنم لیتی ہے اس نے نورڈو اور لمبروسو کے اس نظریہ کی کہ تخلیق کار یقیناً پاگل اور اخلاق باختہ ہوتا ہے تردید کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ اپنے فن اور فن کارانہ اظہار کی بنا پر تخلیق کار عام نیوراتی افراد کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ صحت مند ہوتا ہے اس کے بقول:

"تخلیقی سرگرمیاں بھی ایک طرح کی خود تحلیلِ نفسی ہے اس لیے ان کے اثرات ہمیشہ صحت بخش ہوتے ہیں۔"

جہاں تک تخلیق کار کی شخصیت کی نفسی اساس کا تعلق ہے تو سٹیکل اسے قطعی طور پر نیوراتی تصور کرتا تھا۔ اس مسئلہ میں اس نے نیوراتی بنانے والے ان مریضانہ کرداری محرکات پر خصوصی زور دیا۔ "ہسٹریا کی علامات، وباؤ، تزویجِ محرمات (Incest) پر مبنی فینٹسی، تشویشی حالت، کجروی (بالخصوص ہم جنس پرستی)، کراہت پر مبنی محسوسات، کذب و افترا سے خصوصی رغبت۔ فینٹسی کے تار و پود بننا اور مذہب بطور پناہ گاہ۔ ان تمام مریضانہ رجحانات کے تفصیلی مطالعہ کے بعد اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا:

> "تمام تخلیقی فن کار نیوراتی ہیں۔ ان کا اعصابی خلل ان کے ہسٹریا سے جنم لیتا ہے۔ وہی قدیم اور پریشان کن مرض جس کے بغیر نسل انسانی تہذیب اور کلچر کی ارفع سطح سے یکسر محروم رہتی۔ آج ہمیں یہ شکل فطری معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً تمام عجائبات عالم میں سے عظیم ہے۔"

۱۹۱۳ء میں آرتھر سی جیکب سن نے ایوا سی ریڈ کے ایک مقالہ بعنوان "MANIFESTATIONS OF MANIC - DEPRESSIVE INSANITY IN LITERARY GENIUS." کے جواب میں ایک مقالہ قلم بند کیا جس کا عنوان یہ تھا:

"LITERARY GENIUS AND MANIC - DEPRESSIVE INSANITY, WITH SPECIAL REFERENCE TO THE ALLEGED CASE OF DEAN SWIFT."

ایوا ریڈ نے اپنے مقالہ میں اس امر پر زور دیا تھا کہ تخلیق کاروں کا جنون بلحاظِ نوعیت MANIC DEPRESSIVE ہوتا ہے اور ان کی تخلیقات ان کے "غیر معمولی احساسات اور شدید جذبات سے چٹکارے کا ایک انداز ہوتی ہیں"۔ اپنے استدلال کی شہادت میں اس نے ڈین سوفٹ کی زندگی کے مختلف واقعات پیش کیے۔ جیکب سن نے اس اندازِ نظر کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ ادبی جی نیئس اور جنون واقعی لازم و ملزوم ہیں تو پھر سکیزوفرینیا (SCHIZOPHERENIA) مریضوں اور فنکاروں

میں کوئی فرق نہ رہا" اور اگر فن اور جنون میں اتنا ہی گہرا رابطہ ہے تو پھر پاگل خانوں سے تخلیقات کیوں نہیں بر آمد ہوتیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عظیم ادبی شخصیت کے لیے عظیم ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی اپنی تخلیقات کی چھان پھٹک کے لیے اعلیٰ تر تنقیدی صلاحیتوں کا حامل بھی ہونا چاہیے۔ ان صلاحیتوں کے فقدان کے نتیجہ میں کوئی بھی عظیم ادبی شاہکار جنم نہیں لے سکتا۔" اس مقالہ کے بنیادی تھیسس کو جیکب سن کے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

> "ادبی جینئس بالعموم — لیکن ہمیشہ نہیں — جنونی طبیعت کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کی بہترین تخلیقی صلاحیتیں بحیثیت انسان اس کے بہترین لمحات کی عکاس ہوتی ہیں اور یہ لمحات، لمحاتِ دانش ہوتے ہیں۔ یہ تعلیم کہ بعض اوقات بعض نفسی مریضانہ کیفیات بھی اس کی تخلیقی کاوشوں میں رنگ آمیزی کی موجب بنتی ہیں لیکن وہ محض ان نفسی مریضانہ کیفیات کے باعث ہی جینئس نہیں بنتے۔ جینئس مرض نہیں۔"

یہ مقالات ابتدائی دور کے ہیں لیکن آج ان کی اہمیت اس بنا پر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ایک تو اس نزاعی بحث میں زاویۂ نگاہ کے "قطبینی بُعد" (POLARITY) کی اساس استوار ہوتی نظر آتی ہے اور دوسرے اس لیے کہ ان میں جن مباحث کو چھیڑا گیا وہ آج بھی زندہ ہیں۔

تخلیق کار کی ابنارملٹی اور تخلیقات کا رشتہ اعصابی خلل سے جوڑنے والوں میں دو نام بہت ہیں ان میں ایک ادبی نقاد ہے اور دوسرا پیشہ ور نفسی معالج۔ ایڈمنڈ ولسن کی معروف تالیف "THE WOUND AND THE BOW" ۱۹۲۹ء میں طبع ہوئی تھی اس میں شامل اس کا مقالہ "PHILOCTETES: THE WOUND AND THE BOW" ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا تھا اور اب اس موضوع پر حوالہ کی چیز بن چکا ہے۔ دوسری کتاب ڈاکٹر ایڈمنڈ برگلر کی ۱۹۵۰ء میں مطبوعہ "THE WRITER AND PSYCHOANALYSIS" ہے۔ یہ اچھی خاصی متنازعہ فیہ کتاب ہے۔

ایڈمنڈ ولسن نے ٹرائے کی جنگ میں فلوطیطس کی طلسمی کمان اور پھوڑے کے تعفن کو استعارہ بنا کر فن کار کی ابنارملٹی کا نظریہ پیش کیا۔ ٹرائے جاتے وقت فلوطیطس کو ایک ایسا متعفن پھوڑا نکلا کہ اس کی ناقابلِ برداشت بُو کی وجہ سے اس کے ساتھی اسے ایک غیر آباد جزیرہ پر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن دس سالہ جنگ میں ایک ایسا موقع آگیا کہ جنگ کا پانسہ پلٹنے کے لیے فوج کو فلوطیطس کی طلسمی قوتوں کی حامل کمان کی ضرورت پڑی اب تمام سردار واپس آئے اور اپنے طرزِ عمل کی معافی مانگی، گو یوں چھوڑے جانے پر فلوطیطس سخت طیش میں تھا لیکن بالآخر ان کے ساتھ جاتا ہے اور اپنی کمان سے ان کی جنگ جیتتا ہے اور اب ایک اور معجزہ رونما ہوتا ہے یعنی کمان چلانے کے عمل نے اسے اس متعفن پھوڑے سے نجات دلا دی اور یوں وہ مکمل طور سے صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اس لیجنڈ کی استعاراتی حیثیت واضح ہے۔ متعفن پھوڑا تخلیق کار کی ابنارملٹی ہے اور طلسمی کمان اس کی تخلیقی صلاحیتیں۔ معاشرہ اس طلسمی کمان (تخلیقات) کی خاطر پھوڑے کا تعفن (ابنارملٹی) گوارا کرتا ہے۔ جبکہ تخلیق کار تخلیقی عمل سے شفا پاتا ہے۔

گو اس نظریہ پر لاینل ٹرلنگ اور بعض دیگر ناقدین نے اعتراضات بھی کیے ہیں لیکن اس نظریہ کی اہمیت اور نہیں تو کم از کم اس بنا پر تو یقیناً ہو جاتی ہے کہ تخلیق کار اور اس کے معاشرہ میں جو رابطہ ملتا ہے۔ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ جس وجہ سے وہ ایک دوسرے کو

گوارا کرتے ہیں اس پر بطورِ خاص زور دیا گیا ہے تخلیق کار اپنی ابنارملٹی کے تعفن سے پر تنہا جزیرہ میں رہ سکتا ہے لیکن اپنی مخصوص ضروریات کے تحت معاشرہ اسے پھوڑے کی بوسمیت قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ادھر تخلیق کار بھی ہم جنسوں سے کٹ کر تنہا جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کا خواہش نہیں۔ بالفاظِ دیگر تخلیق کار کو بھی معاشرہ کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ خود معاشرہ کو اس کی۔ جبکہ رابطہ کی اساس تخلیق بنتی ہے۔

لاینل ٹرلنگ نے اپنے ایک مشہور مقالہ " ART and NEUROSIS " میں اس مسئلہ کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے نسبتاً معتدل روش اختیار کرتے ہوئے اسے زمانی حدود میں بھی تقسیم کرنے کی سعی کی۔ سو اس کے بقول "رومانی تحریک کے آغاز سے لے کر اب تک فن کار کی ذہنی صحت کا مسئلہ ہماری تہذیب میں موضوعِ بحث بنا رہا ہے جبکہ اس سے قبل بالعموم شاعر کو "پاگل" سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ محض بات کہنے کا ایک انداز تھا، مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ شاعر کا ذہن اور لوگوں مثلاً فلاسفر کی مانند کام نہیں کرتا[1]" اس کے خیال میں فن کار کی اعصابیت کا تصور اس لیے مقبول ہو گیا کہ ایک تو بالعموم یہ باور کیا جاتا ہے کہ جسم کی ایک خامی کی تلافی دیگر حسیات کی شدت کی صورت میں ہو جاتی ہے۔ جیسے کور چشم میں لمس اور سماعت کی حس غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ جسمانی یا ذہنی اذیت کے نتیجہ میں فن کار خاص نوع کی پُر اسرار نفسی قوت کا حامل ہو جاتا ہے لیکن لاینل ٹرلنگ نے ان دونوں کو درست تسلیم کر لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بموجب:

> "ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ فن کار کے پیشے کا یہ تقاضا ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں فینٹسی سے رابطہ رکھتا ہے۔ اپنے کام کی نوعیت کے لحاظ سے وہ اپنے لاشعور کے اظہار پر مجبور ہے۔ وہ اسے مختلف لبادوں میں مستور تو کر سکتا ہے لیکن واضح رہے کہ لبادے پہنانا چھپانا تو نہیں! بلکہ اس ضمن میں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ادیب اپنی نجی اور داخلی کیفیات کو جتنا چھپانے کی کوشش کرے گا اتنا ہی زیادہ ——— کم ہرگز نہیں ——— وہ اپنے حقیقی لاشعور کو عیاں کرتا جائے گا۔ اور یہ وہ نہیں ہو گا جسے بالعموم لاشعور سمجھا جاتا ہے۔"[2]

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فن کار دیگر افراد کے مقابلہ میں اپنے حالات و کوائف، حقیقی او رمفروضہ بیماریوں اور تکالیف وغیرہ کے بیان میں کہیں زیادہ بہتر اور کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں لا تعداد خود نوشت سوانحات، تذاکیر، خطوط اور ڈائریوں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جبکہ روسو اور ستاں دال وغیرہ کے اعترافات تو اب تحلیل نفسی میں کلاسیکی مثالوں ایسی حیثیت اختیار کر چکے ہیں دیگر افراد بھی نفسی حوادث اور داخلی خلفشار سے دوچار ہو سکتے ہیں لیکن وہ ان کے فن کارانہ اظہار پر قادر نہیں ہوتے اس لیے ان کی اعصابیت کا یوں چرچا نہیں ہوتا۔ لاینل ٹرلنگ کہتا ہے "یہ تحلیل نفسی کے اساسی تصورات میں سے ہے کہ ہر شخص کا کردار لاشعوری قوتوں کے تابع ہوتا ہے اس لیے سائنسدان، بینکر، قانون دان اور سرجن وغیرہ اپنے اپنے پیشہ کے تقاضوں کی بنا پر اپنی زندگیوں

---

[1] "LIBERAL IMAGINATION". P. 160

[2] ایضاً، ۱۶۹

میں مفاہمت اور اخفا سے کام لینے پر مجبور ہیں لیکن اگر تحلیل نفسی کے اصولوں کی روشنی میں ان کا بھی جائزہ لیا جائے تو جس دباؤ اور غیر متوازن کیفیات کا مشاہدہ ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے اس سے انھیں یکسر آزاد پانے کی کوئی وجہ نہیں۔"[1] "واضح رہے کہ اعصابی خلل کا ذہنی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ان میں ناکامی اور محدود ہونے کے ساتھ ساتھ عامیانہ پن کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے اس لیے تمام معاشرہ کو ہی اعصابی خلل میں مبتلا دیکھا جا سکتا ہے۔ اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں! کیونکہ میں یہ باور کرتا ہوں کہ واقعی معاشرہ کا معتدبہ حصہ اعصابی خلل میں مبتلا ہے اس لیے جب اعصابی خلل سے اتنی بہت سی وضاحتیں ہو سکتی ہیں تو پھر اسے صرف ایک شخص کی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ قرار دینا درست نہیں۔[2]" البتہ فن کار ایک لحاظ سے یکتا و ممتاز ہے اور وہ ہے اپنے اعصابی خلل سے مخصوص تعلق کی بنا پر، فن کار جو کچھ بھی ہے وہ اس لیے ہے کہ اسے اپنے اعصابی خلل کو کامیابی سے صورتِ معنی عطا کرنے کی قدرت حاصل ہے اس پر مستزاد یہ کہ صورت پذیری سے وہ اسے دوسروں کے سامنے یوں پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے کہ وہ کشاکش میں مبتلا انا کے لیے اثر پذیری کی صلاحیت کے حامل بھی ثابت ہوتے ہیں لہٰذا فن کارانہ جی نیئس کی تشریح اس کے ادراک و احساسات اور مواد کو صورت معنی دینے کی صلاحیتوں پر مبنی ہونی چاہیے کیا ہم اس کی رفتار و گفتار اور جنسی قوتوں کی اعصابی خلل کی روشنی میں تشریح کر سکتے ہیں؟ ہاں! ان سے وہ کیا کام لیتا ہے اور کس طرح سے کام لیتا ہے صرف ان امور کا اس کے مخصوص اعصابی خلل کی روشنی میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔"[2] ..... "یہ تعلیم کہ ہم سب ہی مریض ہیں لیکن عالمی سطح پر مریض ہونے میں بھی صحت کا ایک تصور نہاں ہے۔ جہاں تک فن کار کے اعصابی خلل کا تعلق ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے ساتھ اس کے اعصابی خلل کا خواہ کتنا ہی اشتراک کیوں نہ ہو اس کا ایک حصہ یقیناً صحت مندی پر مبنی ہے اور یہ وہ حصہ ہے جس کی توانائی کی بنا پر وہ ایک تصور یا خیال کی منصوبہ بندی کے بعد اسے فنکارانہ حسن سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے اس لیے اگر ہم سب واقعی مریض ہیں تو یہ ایک عالمی حادثہ ہے، عالمی احتیاج نہیں، یہ اپنی توانائی کے خرچ میں کفایت کے باعث ہو سکتا ہے، توانائی کی نوعیت کی بنا پر نہیں۔"[3]

لاینل ٹرلنگ کے برعکس خیال کا اظہار ایڈمنڈ برگلر نے کیا اس نے کتاب کا آغاز جن سطور سے کیا وہ اس کے تصورات کی بنیاد مہیا کرتی ہیں "عام تجرباتی نتائج کے برعکس میرا یہ عقیدہ نہیں کہ تخلیق کی صورت میں ادیب محض اپنی لاشعوری خواہشات کا اظہار کرتا ہے بلکہ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ وہ ان خواہشات کے خلاف اپنی تحریر کی صورت میں صرف "ثانوی دفاع" پیش کرتا ہے۔ اگر کسی تحریر میں ہمیں اس کی خواہش "ب" کا اظہار ملتا ہے تو لاشعوری طور پر یہ خواہش "ب" کا اظہار نہ ہوگا بلکہ زیادہ گہرائی میں جانے پر یہ کسی اور دبائی ہوئی خواہش "الف" کی تسکین ہوگی۔ ادیب کی شخصیت نے خواہشات کے خلاف جو دفاعی حصار قایم کر رکھا ہے اس میں خواہشات کے اخفا، اور روپ بدلنے کا یہ عمل اہم مدارج میں سے ہے۔ واضح رہے کہ تخلیق میں اظہار پانے والی اس متبادل خواہش "ب" کا انتخاب یوں ہی اٹکل پچو نہیں ہوتا بلکہ یہ ادیب کے لاشعوری رجحانات سے ہم آہنگ ہوتی ہے البتہ اس وقت بلحاظ شدت یہ اتنی قوی نہیں ہوتی اسی لیے اسے

---

[1] "LIBERAL IMAGINATION" 171

[2] ایضاً: ص ۱۷۳

[3] ایضاً: ص ۱۷۹

شخصیت دفاعی عمل میں کامیابی سے برت سکتی ہے۔"[1]

یہ اندازِ نظر اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ایک تو اس میں تخلیق کار اور لاشعور سے اس کے رابطہ کو نئے تناظر میں سمجھنے کی کاوش ملتی ہے اور اس لیے بھی کہ اسی نکتہ یعنی "لاشعوری خواہشات کے ثانوی دفاع" کی اساس پر تخلیق کار کے اعصابی خلل کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ "ہر ادیب کی ایک بنیادی "الجھن" ہوتی ہے جو عہدِ طفولیت میں ماں سے تعلقات کے نتیجہ میں جنم لیتی ہے اور یہ ہے "UNDIGESTED MASOCHISTIC PASSIVITY"۔ سیدھے سادے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر ادیب اپنے داخلی جبری اذیت کے سامنے بصورتِ تخلیق ایک طرح سے "داخلی دفاع" پیش کرتا ہے اور یہ بذاتِ خود خواہشات کے سامنے شخصیت کے سامنے دفاعی طریقِ کار کا ایک انداز ہوتا ہے۔"[2]

ایڈمنڈ برگلر نے اپنے نظریہ کی اساس ایڈی پس الجھاؤ (بچہ کی ماں سے جنسی دلچسپی اور اس کے نتیجہ میں باپ سے لاشعوری حسد اور مسابقت کا احساس) اور منفی ایڈی پس (نسوانی تطبیق کے نتیجہ میں باپ سے لاشعوری جنسی دلچسپی۔ لڑکیوں میں یہ عمل برعکس صورت میں ملتا ہے) پر استوار کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گو عام حالات میں یہ الجھنیں لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں اور بلوغت میں بالعموم ان کا شعور نہیں رہتا لیکن بعض اوقات یہ الجھاؤ بے حد شدید صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور یوں نتیجۃً تخلیق کار (اور عام لوگ بھی) ایک خاص طرح کی اعصابیت کے شکار ہو جاتے ہیں اس سے جس داخلی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے وہ شدید حساسیت کی بناء پر تخلیق کار کو کچھ زیادہ ہی بے کل کر دیتی ہے یوں وہ لاشعور کے منصفین کے سامنے مجرم کی مانند اپنا دفاع پیش کرتا ہے۔ ایڈمنڈ برگلر نے اس تمام بحث کو کمرۂ عدالت کے انداز میں پیش کیا ہے اس کے بقول تخلیق کار اپنی تخلیق کے ذریعہ سے مندرجہ ذیل (لاشعوری) الزامات کا جواب دیتا ہے:

ا۔ میں اذیت کوشی پر مبنی سزا کے چسکے کا مجرم نہیں ہوں۔
ب۔ اگر میں مجرم ہوں بھی تو میں اس (مندرجہ بالا جرم) جرم کا نہیں بلکہ کسی اور جرم کا مرتکب ہوں۔
ج۔ میں نے کسی طرح کا جرم نہیں کیا کیونکہ کل عالم شریکِ جرم ہے۔
د۔ مجھے جنسی تاک جھانک (PEEPING TOM) کی عادت نہیں۔

جہاں تک تخلیق کار کی نفسی ساخت کا تعلق ہے تو برگلر کی دانست میں بیشتر کی زندگی میں مے نوشی اور ہم جنسیت اہم ترین کردار ادا کرتی ہے[3] تحلیلِ نفسی کی اصطلاح میں طرزِ عمل کے یہ دونوں طریقے اس اعصابی خلل کی علامات ہیں جسے ذہنی مراجعت (ORAL REGRESSION) کہتے ہیں۔ گو بیشتر تخلیق کاروں کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے لیکن وہ اسے ہر ایک کے لیے لازم تصور نہیں کرتا تاہم وہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ "لکھنا، شراب پینا اور ہم جنسیت۔ یہ تینوں ہی اس الجھن سے چھٹکارا پانے کے لیے مختلف انداز ہیں اس لیے ان تینوں کا ایک شخص میں اجتماع سے تعجب خیز نہ ہونا چاہیے"[4] جیسا کہ خود ایڈمنڈ برگلر نے بھی تسلیم کیا ہے اس میں

---

[1] "THE WRITER AND PSYCHOANALYSIS". P. 77
[2] ایضاً، ص ۸۱
[3] ایضاً، ص ۹۱
[4] ایضاً، ص ۱۰۵

جزوی صداقت سہی لیکن مثالوں کے لیے ہمیں مغرب کی جانب دیکھنے کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ ہمارے ہاں بھی معروف مثالوں کی کمی نہیں۔ کلاسیکی غزل گو کے عشق حقیقی کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو نتیجہ کچھ اور ہی نکلے گا۔ میر تقی میر کے اشعار میں ہم جنسیت کے بارے میں جس والہانہ پن کا اظہار ملتا ہے اسے ملحوظ رکھ کر کلیات کا مطالعہ کرنے پر میر کی اور ہی تصویر بنتی ہے۔ پھر غالب ہے جس نے کھلے بندوں پی اور یہ بھی کہا :
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو، اور ریاض خیرآبادی جس نے کبھی نہ پی لیکن عمر شراب پر خوب صورت اشعار لکھنے میں گزار دی۔

لیکن انداز نظر میں تنوع یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مختلف اوقات میں مختلف ماہرین نفسیات (اور ادبی ناقدین بھی) اپنے اپنے خیالات سے اس نزاعی بحث کی دلچسپی میں اضافہ کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں معروف امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر کلیرنس پی اوبرنڈورف (CLFARENCE P. OBERENDORF) کا مقالہ بعنوان "PSYCHOANALYSIS IN LITERATURE AND ITS THERAPEUTIC VALUE" خصوصی تذکرہ چاہتا ہے گو وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ "بعض اوقات ادیب لاشعوری طور پر اپنی نیوراتی الجھنوں سے چھٹکارے کے لیے تحریر کا سہارا لیتا ہے[1]" لیکن وہ تحریر کی شفائی تاثیر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اس کے بموجب "بیشتر صورتوں میں ادیب کا تحریر کے ذریعہ سے اپنے اعصابی خلل سے چھٹکارا پانا سعی ناکام ثابت ہوتا ہے یوں لکھنے کے بعد ادیب جو وقتاً فوقتاً یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے تحریر سے اخراج کر لیا ہے تو وہ اس لاشعوری احساس کا مرہون منت ہو سکتا ہے کہ لکھنے کے عمل سے نیوراتی الجھن سے چھٹکارے کی یہ سعی ناکام رہی ہے اس لیے مزید سعی بھی لاحاصل ہوگی۔ ویسے لکھنے کے اس عمل سے آسودگی کو پادری کے سامنے اعتراف گناہ یا نفسی معالجہ میں مرض کی علامات بیان کرنے کے تزکیہ سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اصولی طور سے اس طرح کی "خود عریانی" ادیب کی بنیادی الجھنوں کا دائمی حل نہیں، بالکل اسی طرح جیسے مسلسل بولنے سے اعصابی خلل کے مریض کا پریشان ذہن سکون نہیں پا سکتا… بہت سے عظیم مگر ناسودہ اور پریشان حال ادیبوں نے اپنی تحریروں سے کسی طرح کا بھی دائمی سکون حاصل نہ کیا۔ انھیں عارضی نوعیت کی آسودگی کا احساس ہوا ہو تو اور بات ہے کیونکہ حقیقت تو یہی ہے کہ وہ آخری دم تک ان مشکلات میں گھرے رہے تھے…. چنانچہ ڈی کوئنسی، کولرج، ایڈگر ایلن پو اور بادلیر کی نمایاں مثالوں سے یہ امر بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تخلیقات انھیں طویل اور جسمانی طور پر تباہ کرنے والے جذباتی کرب اور اذیت سے نجات دلانے میں ناکام ثابت ہوئی تھیں[2]" اس انداز نظر کی تائید میں اس نے مشہور امریکی ناول نگار ہاتھورن کی نجی زندگی اور نفسیاتی الجھنوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے "اعترافی تحریر کی عمومی نامناسبت" ثابت کی[3]

برطانوی ماہر نفسیات ایڈورڈ گلوور نے اپنی مشہور کتاب ——— "FREUD UR JUNG" میں اس بحث پہ نئے انداز سے روشنی ڈالتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ ادبی تخلیق اعصابی خلل کے باعث جنم نہیں لیتی بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب صورت حال کا نتیجہ ہوتی ہے یعنی فن کارانہ تخلیق ایک نئی طرح کی "ابنارملٹی" کے ذریعہ اعصابی خلل سے چھٹکارا پانے کی کاوش

1- THE WRITER AND PSYCHONALYSIS. P. 108

2- GEZA ROHEIM (ED) "PSYCHOANALYSIS AND THE SOCIAL SCIENCES" P. 301-2

3- 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 P. 310

ہوتی ہے لیکن بلحاظِ نوعیت یہ مریضانہ نہیں ہوتی اس کے بقول ،

" اعصابی خلل اور خالص ادبی تخلیق میں یہ بنیادی فرق ہے کہ اعصابی خلل لبیڈو کی مراجعت کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے باعث پہلے سے ہی دباؤ کا ناقص نظام اور بھی زیادہ ناکارہ ہو جاتا ہے ، اسی کے باعث دباؤ کی قوتوں اور دباؤ کے زیرِ اثر شخصیت میں اعصابی خلل کی صورت میں مفاہمت کا ایک انداز طے پا جاتا ہے ۔ خود تعزیری کا یہ طریقہ لاشعوری ہوتا ہے اس کے برعکس فن پارے کا لاشعوری محرک خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ لبیڈو کے آگے بڑھ کر موجودات کی دنیا میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کی سعی ہوتی ہے اس لیے اس صورت میں جبلّی مفاہمت دباؤ کے نظام کی مریضانہ شکست کی بنا پر نہیں ہوتی اور صحیح معنوں میں یہی ارتفاع ہے کہ اس صورت میں خود تعزیری کی بھی ضرورت نہیں رہتی ۔ "[1] (ص : ۱۸۵)

متوازن رویہ پر مبنی ایڈورڈ گلوور کے اس طرزِ استدلال کو تخلیق کار اور اعصابی خلل کی بحث میں نئی جہت قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ اس بنیادی سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے کہ کیوں ایک کا لبیڈو مراجعت کرتا ہے اور دوسرے (یعنی فن کار) کا آگے بڑھ کر موجودات کی دنیا میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کی سعی کرتا ہے ؟ اس سوال کا درست جواب حاصل کرنے کے لیے عمومی اصول نہیں بنائے جا سکتے اور انفرادی تخلیق کاروں کی تحلیل نفسی کے بغیر بات نہیں بن سکتی ۔

اس ضمن میں سر ہربرٹ ریڈ نے بہت خیال افروز بات کی ہے اس کے خیال میں ادب پارے کا ایسا نفسیاتی مطالعہ ہونا چاہیے جس سے ہم خود فن میں " نیوراتی " اور " غیر نیوراتی " کی تمیز کر سکیں ۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر ایسا نفسیاتی مطالعہ بھی بے کار ہے ۔ ہربرٹ ریڈ کے بموجب تحریر کی علامات میں شعوری طور سے پیدا کیے گئے کھرے پن کو معیار بنا کر " نیوراتی آرٹ " اور " غیر نیوراتی آرٹ " میں امتیاز کیا جا سکتا ہے ۔

ایلکس کمفرٹ نے اپنی ایک دلچسپ کتاب " DARWIN AND THE NAKED LADY " میں ہربرٹ ریڈ کے اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی کہ " اعصابی خلل ایک ایسی ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں انسان مبتلا ہوتے ہیں کتابیں اور کینوس نہیں ، یہ مسئلہ ہمیں ذہن کے " نارمل " ہونے کی تمام اصطلاحات سے معمور پیچیدہ بحث میں الجھا دیتا ہے ۔ ہاں ! یہ ممکن ہے کہ بہت ہی زیادہ نیوراتی افراد اور نسبتاً نارمل لوگوں کے فن میں امتیاز ممکن ہو سکتا ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں تو اس کے لیے کسی مخصوص علم کی بھی ضرورت نہ ہوگی ۔ " (ص ۱۰۵) اس ضمن میں اس نے شیلے کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا " شیلے کی مثال سے فن کار پر اس کے فن کے صحت بخش اثرات کی افادیت کے مشکوک ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے شیلے ان منفرد لوگوں میں سے تھا جو اپنے فن سے اتنی بصیرت حاصل کرتے ہیں کہ ایک طرح سے وہ خود ہی اپنا جزوی تجزیہ کر لیتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کے لیے اثرات افادہ بخش کم اور مضرت رساں ثابت ہو سکتے ہیں .... کم از کم اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ شیلے کا فن آغاز سے

1- "COLLECTE ESSAYS IN LITERARY CRITICISM" P. 140

لحاظ سے تو یقیناً نیوراتی ہی تھا۔ (ص ۹۰) اس نقطہ نظر سے فلوبیر، ولیم بلیک اور ایڈون موئر کی شخصیات کی تحلیلِ نفسی اور فن کے تجزیاتی مطالعات کے بعد وہ جس نتیجہ پہ پہنچا اس پر یہ بحث ختم کی جا سکتی ہے:

> "بے شمار فن کار نفسیاتی "کیس" ہیں اور وہ اپنے اعصابی خلل سے اذیت بھی اٹھاتے رہتے ہیں یہی نہیں بلکہ ان کا فن بھی اس سے متاثر ہوتا ہے جہاں تک ہمارے کلچر میں فن اور اعصابی خلل کی باہمی مسابقت کا تعلق ہے تو اس ضمن میں لاینل ٹرلنگ کا یہ قول بہت معنی خیز ہے کہ ادب اور تحلیل نفسی دونوں "حقیقت" اور "حصول مسرت کے اصول" میں کشمکش سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور میری دانست میں تو ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جہاں ان دونوں اصولوں کا ٹکراؤ ہو جاتا ہے اور اسی مرحلہ پر فن جنم لیتا ہے یا لے سکتا ہے!" (ص ۹۶)

عام لوگ اس "ٹکراؤ" میں پس جاتے ہیں جبکہ تخلیق کار ٹکراؤ کی قوت کو پُراسرار تخلیقی عمل کے ذریعہ تخلیق کے پیکر میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جس بجلی سے دوسروں نے ۴۴۰ وولٹ کا جھٹکا حاصل کیا اُسی سے روشنی حاصل کرتا ہے۔

جابر علی جابر

بڑے عروضی میں ان ماہرینِ عروض کو کہتا ہوں جنھوں نے علمِ عروض میں ایجاد یا قابلِ ذکر تصرف سے کام لے کر معنی خیز اہم فیصلے صادر کئے ہیں اور غلطیاں ان اسقام یا تسامحات کو سمجھتا ہوں جو نہ صرف فنی یا منطقی نوعیت کی ہیں بلکہ وہ فروگذاشتیں بھی ہیں جو اپنے عہد کے علوم و فنون سے شعوری یا غیر شعوری طور پر قطعِ نظر کر کے اس خشک مگر اہم علم میں وسعت اور معنویت پیدا کرنے کی عدمِ صلاحیت پر مبنی ہیں۔ مختلف ادوارِ عروض میں مختلف ماہرینِ عروض نے اپنی اپنی دانست کے مطابق اس علم کو وسیع یا آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں یہاں عروضیوں کی غلطیوں کو سلسلہ وار اور تاریخی تناظر میں بیان کروں گا۔

خلیل بن احمد فراہیدی بصری (آٹھویں صدی عیسوی)

۱۔ خلیل نے اصولِ سہ گانہ کی تعداد بڑھانے کے لئے فاصلہ کی اصطلاح ایجاد کی جو اصل میں ایک سببِ ثقیل اور ایک سببِ خفیف کا مجموعہ ہے۔ مثلاً مَدَنِیْ خلیلی عروض میں فاصلہ صغریٰ ہے جس میں بقولِ خلیل تین متحرک اور ایک ساکن حرف ہے لیکن اصل میں مَدَ + نِیْ کا مجموعہ ہے یعنی مَدَ سببِ ثقیل ہے اور نِیْ سببِ خفیف ہے۔ یہ غلطی ایجاد کی غلطی ہے۔ اور اس کی نشاندہی سب سے پہلے اخفش ثانی نے کی۔ اخفش متوفیٰ ۲۲۱ھ۔

۲۔ صرف ایک بحر متقارب پر مبنی دائرہ وضع کیا جو منطقی طور پر غلط ہے۔ اس دائرے کا نام خلیل نے منفردہ رکھا یعنی ایک بحر والا دائرہ۔ یہ دائرے کے مقصد اور تقاضے کو پورا ہی نہیں کرتا چنانچہ اخفش ثانی نے رکن فاعلن پر مبنی بحر متدارک کا استخراج کیا اور دونوں سے متشکل ہونے والا دائرہ بنایا جس کا نام متفقہ رکھا۔ متقارب کا رکنِ اساسی فعولن اور متدارک کا فاعلن ہے یہ ایک دوسرے کا عکس ہیں فعولن = وتد + سبب اور فاعلن = سبب + وتد۔ اگر فعولن کو فعو سے شروع کریں اور لن پر ختم تو بحر متقارب ہے اور اگر لن سے شروع کریں اور فعو پر ختم تو لن فعو فاعلن کے وزن پر آجاتا ہے۔

۳۔ خلیلی نظامِ عروض کا سب سے بڑا سقم اس کا غیر جمالیاتی ہونا ہے۔ اگرچہ خلیل موسیقی سے واقف تھا اور ایک مستقل تصنیف کتاب النغم بھی اس کی ہے اس کے باوجود اس نے اپنا نظام علمِ صرف کی مدد سے مدون کیا اور نثر، موسیقی، رقص وغیرہ سے اس کا تقابلی مطالعہ پیش نہ کر سکا نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ عروض ایک خشک بے رنگ اور بھول جانے والا علم ہو کر رہ گیا اس میں کوئی فن کارانہ وسعت اور دلکشی نہ پیدا ہو سکی۔ عروض کا جدید ترین رجحان آہنگ شناسی یا عالمی شعری آہنگ کا مطالعہ ہے جس میں ایک طرف تو موسیقی، رقص حتیٰ کہ مصوری سے تقابل کیا جاتا ہے دوسرے دنیا کی زبانوں میں جس قدر شعری آہنگ کے نمونے

ان میں مقاماتِ اشتراک و اختلاف کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔ خلیل نے بعض بحور کا نام بعض نغموں کے نام پر تجویز کیا رمل، ہزج، وغیرہ۔ بحر رجز کا نام اراجیز یعنی مختصر رزمیہ گیتوں سے اخذ کیا۔ رجز اولیں عربی بحر ہے اور اراجیز میں آہنگ کا زیر و بم نا محسوس ہوتا تھا اس کے باوجود خلیل کو تو موسیقی اور رقص سے تقابلی مطالعہ کا خیال تک نہ آیا جہاں صوتیات اور صرف میں عروض زیادہ ہوں وہاں واضح سے جمالیت کی امید کیسے کی جا سکتی ہے؟ عروض اور موسیقی کا تقابلی مطالعہ اردو میں سب سے پہلے عبدالرحمان بجنوری نے کرنے کی کوشش کی اور غالب کے اوزان و بحور کے مطالعے اور تجربیے کے سلسلے میں یہ اقدام کیا جو جزوی ت اور خیال انگیز ثابت ہوا۔ عظمت اللہ خاں نے بجنوری سے متاثر ہو کر ۱۹۲۳ء میں اپنا عروضی نظام مرتب کیا لیکن ہیگل نے ان کے نظام کو بے تکا بنا دیا۔ عربی عروض میں موسیقی یا مغربی عروض کے زیر و بم کی تلاش سب سے پہلے ایک یہودی جرمن کی ا مقالہ 'عروض' انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پہ مقالہ قیاساً بیسویں صدی کے اوائل میں لکھا گیا۔ فارسی میں یہ رجحان سب پہلے پروفیسر ڈاکٹر پرویز ناتل نے ظاہر کیا ان کا تحقیقی مقالہ تتبعاتِ عروض فارسی ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر موصوف آج کل ان یونیورسٹی میں استادِ ادبیات فارسی ہیں۔

کو ایجاد کے کریڈٹ سے محروم کرنے کی کوشش حمزہ اصفہانی مؤلف کتاب التنبیہ نے کی ہے۔ حمزہ کہتا ہے کہ خلیل نے کوئی نہیں کیا بلکہ تصحیف کی ہے یعنی علم النغمہ VOCAL MUSIC اور علم الموسیقی (LNSTRUEMENTAL MUSIC) ول علیحدہ کر کے ان پہ ایک فن تیار کھڑا کر دیا کیونکہ یہ دونوں علم آپس میں قریب ہیں اور خلیل ان دونوں سے واقف تھا۔ کے بعد حمزہ اصفہانی کو اپنی حسد سامانی کا احساس ہوا اور اس نے یہ اعتراف کیا کہ خلیل سے پہلے یہ علم کسی نے مدون نہیں کیا تھا حمزہ کا یہ الزام سراسر غلط ہے۔ خلیلی عروض خالصتاً نیا علم تھا جو صوتیات اور صرف کی مدد سے یعنی ایمن تصرف اور ان سے استمداد سے مدون کیا گیا۔ (حمزہ اصفہانی کا زمانہ بارھویں صدی عیسوی ہے)

۵۔ فارسی عروض کا قابلِ ذکر ماہر خواجہ نصیر الدین طوسی ہے جس نے معیار الاشعار میں جو تیرھویں صدی عیسوی کے اواسط میں لکھی گئی، عربی اور فارسی عروض کا مطالعہ لونی کی صوتیات کی بنیادوں پر کیا۔ معیار الاشعار میں بعض نہایت قیمتی تنبیہات درج ہیں مثلاً "تسکین الاوسط" کے ضمن یا عربی عروض کے اندھا دھند استعمال کے سلسلے میں طوسی نے بڑی مفید باتیں کہی ہیں لیکن طوسی کا زحاف تسبیغ و ازالہ پہ یہ اعتراض کہ اس کے استعمال سے بحور اپنے متعلقہ دوائر سے خارج ہو جاتی ہیں شدید غلط فہمی ہے۔ دوائر کی تشکیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ مختلف بحور کی خاندانی زمرہ بندی کر دی جائے اور ان کے باہمی روابط کو آشکار کر دیا جائے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ متعلقہ بحور اپنے اساسی ارکان کے ساتھ دوائر میں درج کی جائیں۔

جب زحافات کی بحث آتی ہے اور ان کے استعمال کا حوالہ آتا ہے اور بعض بدآہنگیاں محسوس ہوتی ہیں تو اس کا الزام صرف شعرا پہ عاید ہونا چاہیے۔ جنہوں نے بعض مجبوریوں کے تحت سالم ارکان میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان کو زحافات کہا گیا۔ مثلاً جب رجز میں مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن کی بجائے آخری مستفعلن کو مستفعلان بنا لیا جاتا ہے یا مفاعیلن کو مفاعیلان اور فاعلن کو فاعلان تو ان کے دائروں سے نکل جانے پر اعتراض بے معنی ہے کیونکہ مزاحف بحور کا دائروں سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ طوسی کا اعتراض اصل میں

مزاحف بحور کی ہم آہنگی پر ہونا چاہیے تھا لیکن طوسی نے اس کی بجائے اعتراض یہ وارد کیا کہ زحافات تسبیغ وازالہ کے استعمال سے بحور دائروں سے خارج ہو جاتی ہیں ۔

۶ ۔ عربی عروض کا سرچشمہ یونانی عروض کو قرار دینے کی اولیں کوشش صلاح الدین صفدی شامی متوفی ۱۳۶۳ء نے کی ۔ صفدی نے غیث المنسجم (جسے کیفی دہلوی غلطی سے غیثِ منسجم لکھتے ہیں) میں اس بات کا دعویٰ کیا کہ خلیل یونانی زبان اور اس کے عروضی نظام سے واقف تھا اور اس نے ارکان و زحافات کے نام یونانی عروض کے ایدی اور ارجل (ارجل = FEET یا PODY) سے اخذ کیے ۔ نیز زحافات کے نام گھوڑے کی بیماریوں سے لیے ۔ صفدی کا خیال خام بالکل واضح ہے اس لئے کہ خلیل کا یونانی زبان سے واقف ہونا کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا ۔ نہ یونانی عروض عربی عروض سے کوئی مماثلت رکھتا ہے ۔ یونانی عروض میں زحاف کو CATALE-KTIKOS کہتے ہیں ۔ عربی عروض میں زحافات اور علل گھوڑوں کی بیماریوں (علل) سے اگر کچھ مماثلت رکھتے ہیں ۔ تو صرف اس قدر کہ علل جو زحاف کی ایک نوع ہے کے لفظی معنی بیماریاں ہے لیکن پھر زحافات کی وجوہ تسمیہ بقولِ طوسی ابدانِ چارپایاں سے تعلق رکھتی ہیں نہ کہ گھوڑوں کی بیماریوں یا امراض سے ۔ صفدی نے اندھیرے میں تیر مارا اور طوسی کے بیان کو اچھال کر کیفی دہلوی نے فیصلہ صادر کر دیا کہ عروض یونانی الاصل ہے ۔ اس طرح بیچارے خلیل کی ساری عمر کی محنت غارت کر دی ۔ یونانی عروض کی بنیاد خفی اور بلند ہجاؤں پر ہے جبکہ ہمارا عروض متحرک اور ساکن حروف کی ترکیب و ترتیب سے متشکل ہوا ہے ۔ دونوں کی فطرت ہی جداگانہ ہے ۔ پھر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو صفدی کا دعویٰ باطل ہے یونانی علوم مامون الرشید کے عہدِ خلافت میں پہلی دفعہ سریانی زبان کی وساطت سے عربی میں داخل ہونا شروع ہوئے ارسطو کی منطق اور نفسیات اور مابعد الطبیعات وغیرہ ۔ شعریاتِ ارسطو POETICS اور علمِ بلاغت RHETORIC کو عربوں نے بالکل ہاتھ نہیں لگایا ۔ اور کئی صدیوں کے بعد اول الذکر کا ترجمہ عربی میں کیا گیا ۔ خلیل کا زمانہ ۱۰۰ھ سے ۱۷۰ھ ہے جو بنو امیہ کا عہدِ خلافت ہے اس عہد میں یونانی علوم عربی زبان میں ابھی داخل نہیں ہو سکے تھے ۔ خلیل پر حمزہ اصفہانی کا حملہ اور اس کے بعد صفدی کی ترکتاز دونوں احساسِ کہتری کا کرشمہ ہیں ۔ جو بعض لکھنے والوں کے لاشعور میں چھپا رہتا ہے اور موقع پا کر ابھر آتا ہے ۔ کیفی دہلوی کے حملہ کی تاریخ ۱۹۵۰ء کے آس پاس ہے جب کیفیہ شائع ہوئی (کیفیہ شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی)

۷ ۔ عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں اکرام احمد ضیغم کی جو ان کے استاد تھے ۔ عروض میں مہارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سے زیادہ ماہرِ عروض میں نے نہیں دیکھا ۔ ضیغم نے ایک غزل بیس پچیس بحروں میں لکھی ہے ۔ ایک غزل بیک وقت بیس پچیس بحروں میں لکھی جائے اس سے زیادہ ناممکن بات عروض کی دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتی بلکہ محض مضحکہ اور لاف بے معنی ہے ۔ نساخ نے اس غزل کو تذکرے میں درج نہیں کیا کم از کم تذکرۂ مذکورہ کے تذکرے میں مقیت الحسن صاحب نے یہ غزل درج نہیں کی ۔ ایسا دعویٰ اور بے دلیل! شدید حماقت کے سوا کیا ہو سکتی ہے ۔ ایک غزل زیادہ سے زیادہ چار بحروں میں لکھی جا سکتی ہے تین میں اس سے آسان تر ہے اور اردو میں عام ہے ۔ علمائے بلاغت نے اس خوبی کو صفتِ متلون کا نام دیا ہے ۔ اس شعر کو بیک وقت تین بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے ۔

لبِ تو حالِ لولو، خطِ تو مرکزِ لالہ
شبِ تو حاصلِ کوکب، مہِ تو با خطِ ہالہ

۱ ۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن (ہزج مثمن سالم)
۲ ۔ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن (مجتث مثمن)
۳ ۔ فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن (رمل مثمن مخبون)

ایک ہی مصرع کو ایک سے زیادہ بحروں میں پڑھے جانے کا راز اس میں حرکاتِ ثلاثہ اور حروفِ علت کے اشباع یا تخفیف ہونے میں مضمر ہے ۔ اس شعر میں بھی لب ، حال ، خط ، مرکز ، شب ، حاصل ، مہ اور خط کے کسرۂ اضافت کے اشباع یا عدمِ اشباع سے مختلف بحریں صورت پذیر ہو رہی ہیں ۔ ڈاکٹر صدر الحق صاحب نے نسآخ کے تذکرے کا ہی مقالے میں نساخ کے محولہ بالا بیان کا ذکر نہیں کیا ۔ (مقالہ مطبوعہ سہ ماہی اردو شمارہ ۲ ۱۹۷۵ء) ۔ میں یہاں چار بحری اشعار سے زیادہ مقتبس نہیں کر سکتا البتہ ان بحور کے نام حاضر ہیں اور ایک شعر بھی حاضر ہے ۔

خفیف	۱ ۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔	۳ ۔ فاعلاتن فعلاتن فعلن	رمل
رمل	۲ ۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ۔	۴ ۔ مفتعلن مفتعلن فاعلن	سریع

علی بخش خاں شرر بدایونی ؎

ضعف سے پاؤں پہ سر آتا ہے آہ
ہو گئے نالوں سے ہم اپنے تباہ

تقطیع در بحرِ اوّل

ضعف سے پا	ؤپے سرا	تا ہے اٰاہ
فاعلاتن	مفاعلن	فاعلات
ہو گئے نا	لو سے ہمپ	نے تباہ

تقطیع در بحرِ دوم

ضعف سے پا	ؤ پہ سرآ	تا ہے آہ
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلات
ہو گئے نا	لو سے ہم اپ	نے تباہ

تقطیع در بحرِ سوم

ضعف سے پا	ؤپ سرا ا	تَ ہر ااہ
فاعلاتن	فعلاتن	فعلات

تقطیع دربحرِ چہارم
صنعف سِہ پا | ؤ پ سرا | تا ہر ااہ
مفتعلن | مفتعلن | فاعلات
ہو گئے نا | وہ ہر ہمپ | نے تباہ

صنعت متلون کی ایک صورت صنعتِ منقوص ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اگر ہر مصرع سے حرف آخر دور کر دیا جائے تو دوسرا وزن پیدا ہو جاتے۔ جیسے دریائے لطافت میں مندرج یہ رباعی:

بے رحم جلا نہ جی کو میرے چپ رہ
معلوم ہیں مجھ کو مکر تیرے چپ رہ
کس واسطے اس قدر تو ہے بس بس
تو آوے گا ہائے میرے ٹیرے چپ رہ

پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں سے 'چپ رہ' اور تیسرے مصرع میں سے 'بس بس' کو دور کر دیا جائے تو مصرع کا وزن یہ رہ جائیگا۔

مفعولُ مفاعلن فعولن

متلون کی ایک اور صورت صنعتِ محذوف بھی ہے اس طرح کہ اگر ہر مصرع کے ابتدا سے کوئی لفظ دور کر دیا جائے تو دوسرا وزن پیدا ہو جائے مثال:

مجھ کو رسوا نہ کر اے آفت جاں بہرِ خدا　　بندہ تیرا ہوں میں کر رحم میاں بہرِ خدا
اس میں کیا فائدہ گر تو نے کیا مجھ کو قتل　　کچھ بھی انصاف کر اے سروِ رواں بہرِ خدا

مجھ کو، بندہ، اس میں اور کچھ بھی حذف کرنے سے رباعی کا وزن باقی رہ جاتا ہے۔

۸ - نظم طباطبائی کا عروض نظام

دیوان غالب (اردو) کے معروف شارح نظم طباطبائی نے وہ مختلف جگہوں پر ہمارے کلاسیکی عروضی نظام کے خلاف اعتراضی رویہ اختیار کیا ہے جو عظمت اللہ خاں، مسعود حسین خاں اور سید محیب الرحمان کے خیالات کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

یہ نظریہ مقامی عروض نظام یا پنگل کے حق میں رائے ہموار کرتا ہے اور عربی عروض کو غیر مقامی اور اجنبی قرار دیتا ہے اس نظریے کا پس منظر غالب کی ایک رباعی کا ایک غیر موزوں مصرع ہے جس کے بارے میں میں ایک سے زیادہ دفعہ مختلف مضامین اور مکاتیب بنام مدیران جرائد میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔ طباطبائی لکھتے ہیں:

" اب خیال کرو غالب سا موزوں طبع شخص اور ناموزوں کہہ جائے بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ جو عروض کہ فارسی و اردو کہنے والوں نے عربی کو ماخذِ علوم سمجھ کر اختیار کیا ہے یہ عروض عربی ہی زبان کے واسطے خاص ہے اردو کہنے والوں کو پنگل کے اوزان میں کہنا چاہیے جو زبانِ ہندی کے اوزان طبعی ہیں۔ جانتا ہوں کہ میرے اس مشورے پر شعرائے ریختہ گو ہنسیں گے اور نفرت کریں گے مگر

اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ہندی زبان عربی کے اوزان میں ٹھونس کر شعر کہا کرتے ہیں اور ہندی کے جو اوزان طبعی ہیں انھیں چھوڑ دیتے ہیں یہ ویسا ہی ہے جیسا کوئی انگریزی قصیدہ بحرِ طویل میں کہے کہ کوئی انگریز اسے موزوں نہ کہے گا اسی طرح انگریزی عیسائیوں نے انگریزی اوزان اور اردو زبان میں نماز کی کتابیں اور مناقبِ مسیح کہے ہیں ہم اسے دیکھ کر ہرگز موزوں نہ کہیں گے ناموزوں کلام پہ بے اختیار ہنسی آتی ہے اس سبب سے جو کوئی ان مناقب کو دیکھتا ہے ضرور ہنستا ہے اس کے برخلاف پنگل کے سب اوزان ہم کو بھی موزوں معلوم ہوتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ سب اوزان ہمارے اوزانِ طبعی ہیں اور جن اوزان کو ہم نے اختیار کر لیا ہے ان وزنوں میں ہم بہ تکلف شعر کہتے ہیں اور ہماری شاعری میں اس سے بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے جس کی ہمیں خبر نہیں میں نے انگریزی کا ایک فقرہ دیکھا جو ہزج میں موزوں معلوم ہوا

LET US STAND STILL ON YONDER BANK

لیکن جو لوگ اہلِ زبان ہیں ان کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ اس طرح موزوں نہیں ہے بعض لوگوں نے عربی کو فارسی والوں کے لئے اوزان میں نظم کیا ہے۔

یا صاحب الجمالِ و یا سیّد البشر

لیکن جو لوگ عربی اشعار سے مزہ اٹھانے والے ہیں ان سے پوچھو ان کے نزدیک یہ مصرع ناموزوں ہے یا یہ سمجھو کہ وزن سے جو مزہ پیدا ہوتا ہے وہ اس میں نہیں پیدا ہوا ہے وجہ یہ کہ اوزانِ مطبوع میں شعر ہو تو اہلِ زبان اس شعر کو شعر سمجھیں اور اوزانِ مصنوعی کی کوئی انتہا نہیں یہی حال پنگل والوں کی نظر میں اردو شاعری اور اردو زبان والوں کا ہے کہ وزن سے جو مزہ آتا ہے وہ مزہ ان کو ہمارے اشعار سے نہیں ملتا اور مختلف زبانوں کے مختلف اوزان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان کا خاص لہجہ ہوتا ہے اس کے اسماء و افعال کے خاص اوزان ہوتے ہیں وزنِ شعر بھی لا محالہ جدا ہوگا مثلاً انگریزی میں عروض کا دارومدار لہجہ کی شدت و رخا پر ہے اعدادِ حروف و مطابقتِ حرکات و سکنات کو کچھ دخل نہیں اس کے برخلاف عربی کا عروض ہے کہ اس میں محض مطابقتِ حرکات و سکنات و شمارِ حروف پر عروض کی بنیاد ہے۔ شدت و رخائے لہجہ سے وزن پر کچھ اثر نہیں پڑتا ہندی میں اکثر الفاظ کے آخر میں حروفِ علت ہوا کرتے ہیں۔ انھیں حرفوں کے مدّ و قصر و حذف و وقف پر پنگل کی بنیاد ہے قواعدِ پنگل میں زبان کے لئے البتہ ایک دشواری ہے کہ ان لوگوں کے لہجے میں بعض حروف مثل لام و را وغیرہ کے ایسے خفیف اور مخلوط سے ہیں کہ ان حرفوں کا شمار حروفِ صحیح میں نہیں بلکہ ایک قسم کا اعراب سمجھتے ہیں برخلاف اردو کے لہجے کے کہ لام یا رے کو مثلاً تقطیعِ شعر میں شمار نہ کریں تو وزن ہی باقی نہیں رہتا اتنا اثر عربی و فارسی کا اردو کے لہجے میں رہ گیا ہے۔ میرے زعم پر ایک دلیل یہ ہے کہ تفحص و استقرا کے بعد الفاظِ اردو کے اجزا چار طرح کے پائے جاتے ہیں اور خود الفاظ پندرہ قسم کے :

۱۔ پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن جیسے چل۔ سن۔ لے عروض کی اصطلاح میں اسے سببِ خفیف کہتے ہیں۔
۲۔ پہلا حرف متحرک اور اس کے بعد دو ساکن جیسے بات۔ زور۔ شور۔ ایک۔ نیک وغیرہ اس کو اصطلاح میں سببِ متوسط کہتے ہیں۔
۳۔ پہلے دو حرف متحرک اس کے بعد ایک حرف ساکن جیسے کہا۔ سنا۔ لیا۔ وغیرہ عروض سے وتدِ مجموع کہتے ہیں۔

۴۔ پہلے دو حرف متحرک اس کے بعد دو حرف ساکن جیسے نشان۔ مکان۔ امیر۔ وزیر۔ حصول۔ وصول وغیرہ شعرا اسے وتد کثرت کہتے ہیں اردو میں جتنے کلمات جس جس زبان کے پائے جاتے ہیں اور محاورہ میں داخل ہیں۔ یا تو وہ ان چاروں جزوں میں سے کسی کسی جزو کے وزن پر ہیں جیسے تم یاد کر و مثال اور یا انھیں چاروں جزوں سے مرکب ہوتے ہیں مثلاً

۵۔ کسی کلمے میں دو سببِ خفیف ہیں جیسے ماتھا۔
۶۔ کسی میں تین سببِ خفیف ہیں جیسے پیشانی۔
۷۔ کسی میں پہلا جزو سببِ خفیف ہے اور دوسرا متوسّط جیسے رخسار۔
۸۔ کسی میں عکس اس کا جیسے کالبد۔
۹۔ کسی میں دونوں سبب متوسط ہیں جیسے خاکسار۔
۱۰۔ کسی میں پہلا جزو وتدِ مجموع اور دوسرا سببِ خفیف ہے جیسے مسّرت۔
۱۱۔ کسی میں عکس اس کا جیسے تہنیت۔
۱۲۔ کسی میں پہلا وتدِ مجموع اور دوسرا سببِ متوسّط جیسے خریدار۔
۱۳۔ کسی میں دونوں جزو وتدِ مجموع ہیں جیسے موافقت
۱۴۔ کسی میں پہلا جزو وتدِ کثرت ہے اور دوسرا سببِ خفیف جیسے نیاریا۔
۱۵۔ کسی میں عکس اس کا جیسے اعتبار

بس کلماتِ اردو کے یہی پندرہ وزن ہیں۔ تم کہو گے غلبہ اور درجہ بھی تو ایک وزن ہے اور حیوان وجولان بھی تو وزن ہے نہیں ایسے الفاظ میں دوسرے متحرک کو ساکن کر کے بولتے ہیں یعنی وزن ان کا نامانوس و ثقیل سمجھ کر مہنّد کر ڈالتے ہیں اور جب دوسرا حرف ساکن ہو گیا تو غلبہ و درجہ پانچویں قسم کے وزن میں اور حیوان وجولان ساتویں قسم کے وزن میں داخل ہو گئے اس وجہ سے کہ اردو توالیٔ حرکات کی متحمل نہیں ہے اور اسی وجہ سے سببِ ثقیل اور وتدِ مفروق اور فاصلہ اردو کے الفاظ میں نہیں پایا جاتا یہ تینوں جزو الفاظِ عربی کے لئے مخصوص ہیں جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ الفاظِ اردو کے اجزا چار ہی طرح کے ہیں اور سببِ ثقیل اور وتدِ مفروق اور فاصلہ کبھی اردو میں جزوِ کلمہ نہیں ہوتا اور یہ بھی تم سمجھ گئے کہ تمام زبان بھر میں الفاظ پندرہ ہی وزن میں ہیں جن میں کہیں توالیٔ حرکات نہیں پائی جاتی تو اب اوزانِ عروض پر لحاظ کرو مثلاً ایک وزن ہے۔

فَعِلَن فَعِلُن فَعِلَن فَعِلَن

کہ یہ سارا وزن محض توا اصل سے مرکب ہے اور ایک وزن ہے۔

متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن

کہ اس کے ہر رکن میں توالیٔ حرکات موجود ہے۔ اسی طرح یہ ایک وزن ہے۔

فَعِلاتُن فَعِلاتُن فَعِلاتُن فَعِلاتُن ۔

اس کے ہر ہر رکن میں توالی حرکات موجود ہے۔ اب خیال کرو کہ ایسے اوزان میں جب ہم اردو کے الفاظ باندھیں گے تو ان الفاظ کی کیا گت ہوگی؟ واللہ کن کن تکلفات سے ان میں توالی حرکات پیدا کرنی پڑے گی یہی وجہ ہے کہ ان اوزان میں فی البدیہہ کہنے کی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ بخلاف عرب کے کہ ان کو یہ اوزان طبعی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کا فی البدیہہ کہنا مشہور و معروف ہے غرض کہ غالب سے شاعر خود نے عمر بھر مشق کر کے بھی ان اوزان پر قابو نہ پایا اور وزن غیر طبعی ہونے کے سبب سے دھوکا کھایا اس رباعی کی شرح میں سے جو کچھ میں لکھ گیا ہوں وہ کتاب کے مختصات و سوانح و اوقاف و متفنمات میں سے ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے مصنف کے بنگل پسند ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ طباطبائی نے ان خیالات کا اظہار اپنی تصنیف تسہیل العروض والقافیہ میں بھی کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ طباطبائی اور کیفی اور عظمت اللہ خاں اور مسعود حسین خاں اس میں مقامی رنگ کا ایک بالکل غلط مفہوم لے رہے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اُردو شاعروں کو کچھ ہندی کے اوزان بھی اختیار کرنے چاہئیں تھے لیکن تہذیب، ادب، زبان اور تحقیق ادب کی تاریخ تو مرتب کی جا سکتی ہے اس کا مستقبل نہیں متعین کیا جا سکتا۔ عربی تہذیب اپنے ساتھ ایک وسیع اور کم و بیش خالص زبان لے کر ایران، شام، عراق، مصر، ترکستان، ہندو پاک، ہسپانیہ، انڈونیشیا، بنگالہ اور ملایا چین روس میں گئی اس زبان میں بڑی اشتقاقی اور اصطلاحاتی قوت تھی چنانچہ دو تین صدی ہی میں اس میں تفسیر، فلسفہ، تاریخ، منطق، نحو، عروض، لغت، طبیعیات کیمیا علوم طبعی و غیر طبعی نقطۂ معراج تک پہنچ گئے۔ ایک رواں تہذیب جس میں مراد خواندگی اور شعوری نمایاں تھی جہاں بھی گئی اپنے ساتھ اپنے علوم لے گئی اور مقامی زبانوں کو سیراب کر دیا خصوصاً فارسی، ترکی اور کھڑی بولی کو جس میں تیرھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے امیر خسرو جیسے جینئس پیدا ہوئے جنھوں نے نظم و نثر میں تمام عربی علوم علوم بلاغت کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ لغت، نحو، عروض اور بلاغت یکے بعد دیگرے مدون ہوئے تھے اور اسی ترتیب سے درسِ علوم و فنون میں شامل ہوئے۔ عروض کی تدوین تخمیناً ۱۴۰ھ میں ہوئی۔ فارسی زبان کا ساسانیوں کے عہد میں تخلیق شدہ سرمایۂ شعری اب ہمارے پاس نہیں ہے اس کی گمشدگی اور وجود دونوں پردۂ خفا میں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ عربی عروض ایک دو صدی کے اندر اندر فارسی شاعری میں شامل ہو گیا فارسی زبان سوائے چند مستثنیٰ صورتوں سے عربی زبان سے الفاظ اور لہجوں سے ملتی جلتی تھی صرف سببِ ثقیل اور وتدِ مفروق اس میں نہ تھا۔ طباطبائی کا یہ کہنا درست نہیں کہ فاصلہ فارسی زبان میں نہیں۔ مگر ان۔ جمنی وغیرہ فاصلے ہی ہیں جو عربی الفاظ مَدَنِی، حَسَنِی کے ہم وزن ہیں فارسی میں ایسے الفاظ بھی تھے جن کے درمیان ساکن حرف آتا تھا۔ جیسے آسمان، آشکار وغیرہ انھیں عربی عروض کے تابع کرنے کے لئے ان ساکن حروف کو متحرک کر لیا گیا چنانچہ یہ فاعلات کے وزن پر آ گئے۔ درد کا لفظ وتدِ مفروق جب معرضِ تخلیق وجود میں آ جاتا ہے تو عربی عروض کے مطابق ہو جاتا ہے یعنی اس کا دوسرا دال متحرک ہو کر وتدِ مفروق بن جاتا ہے۔ یہ تصرفات ناگزیر تھے یہ غنیمت تھا کہ فارسی برخلاف اپنی یورپی یونانی انگریزی کے اور بلند ہاؤں کی زبان نہ تھی اور اس اعتبار سے عربی سے مماثل تھی اس لئے اس نے چند تصرفات بآسانی قبول کر لئے۔ طباطبائی جانتے ہیں کہ اردو زبان کی تمام علمی اصطلاحات صرف و نحو، لغت بلاغت عربی ہی سے لی گئی ہیں۔ ہندی اور سنسکرت سے لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا مسلمان اپنے علوم کی اصطلاحات کو کیوں سنسکرت جیسی مردہ اور مشکل زبان سے لیتے جبکہ ان کے پاس ڈھلے ڈھلائے

طبعی اور غیر طبعی علوم تھے اور ان کی پوری اصطلاحات تھیں۔ اگر ہم پنگل کو اختیار کر لیں تو پھر سنسکرت لغت، صرف و نحو اور بلاغتی نظام بھی اپنانا ہوگا اور یہ مسلمانوں کی تہذیب سے متصادم ہے۔ مقامی تہذیبی پیٹرنز PATTERNS میں سے صرف کلاسیکی موسیقی ہی تھی جسے مسلمانوں نے اپنایا اور اس میں وسعت اور بوقلمونی پیدا کی۔ ہندی میں بھی شاعری کی اور کامیاب رہے۔ اس میں شک نہیں عربی عروض دقیق اور خشک ہے لیکن کیا کلاسیکی موسیقی آسان اور عام فہم ہے؟ عربی عروض کو زحافات نے دقیق بنایا ہے اور اساتذہ نے اوزان کو EXHAUST کرنے کے لئے زحافی اوزانِ نامطبوع میں اشعار کہے جس سے وحشت ہوتی ہے ورنہ پچیس تیس سے زیادہ اوزان اردو شعرا نے استعمال نہیں کئے۔ ان میں سے بھی پندرہ بیس ہی مقبول اور دلکش ہیں۔ مقتضب، منسرح، مضارع، سریع، کامل وافر نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہیں۔ دائرہ کا مطالعہ دلچسپ ہے کیونکہ ان سے بحور کا باہمی اصولی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ یونانی انگریزی عروض میں بھی دائرے قائم کر دینے چاہئیں۔ مثلاً LAMBIE اور TVOCHEE ایک دوسرے کا عکس ہیں اس لئے ایک دائرے میں آئیں گی۔ اس طرح DACTYL اور ANAPAEST ایک دائرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میر اور سودا کے زمانے میں سویا، سرسی چھند وغیرہ مستعمل تھیں لیکن سرسی سرسبز نہ ہو سکا۔ میر نے سویا چھند میں غزلیں کہیں لیکن ان کا سویا میں ہونا اب تنازعہ مسئلہ ہو گیا ہے دیکھئے (سلیم جعفر کا مقالہ "کیا میر نے سویا چھند میں شاعری کی ہے" زمانہ کانپور۔) عربی اوزان کو اردو والوں کے لئے غیر طبعی کہنا ایسا ہی ہے جیسے انگریزی شاعری کے لئے یونانی عروض کی بحروں کو غیر طبعی اور بیرونی قرار دینا اگر ان یونانی بحروں میں لکھی ہوئی شاعری کو غیر طبعی قرار دے کر خارج کر دیا جائے تو انگریزی شعرا اور ساتھ ہی رومن شعرا کی شاعری کا سرمایہ کہاں جائے گا؟ کیا انھیں کوئی زبردست شاعر مقامی آہنگوں میں منتقل کرنے بیٹھ جائے۔ یاد رہے کہ کوئی قوم صرف اسی وقت کی دوسری قوم کے علوم و فنون سے متاثر ہوتی ہے جب خود اس کا سرمایۂ علمی غیر وقیع اور ناکافی ہو۔ اینگلو سیکسن شاعری کا یہی حال تھا۔ اور رومانوی زبانوں کی بھی یہی کیفیت تھی جب بالترتیب یونانی علوم شعری ان قوموں کی زبانوں میں دخیل ہوئے۔ طباطبائی صاحب کے خیال میں غیر طبعی اوزانِ عربی میں جو فارسی اردو میں دخیل ہیں فی البدیہہ شعر کہنا مشکل ہے۔ کیا فارسی اور اردو کے شعرا نے حسبِ استطاعت فی البدیہہ شاعری نہیں کی؟

فارسی میں عنصری، نظامی عروضی، فیضی نے فی البدیہہ اشعار کہہ کر گرانقدر انعام پائے ہیں ——— انشا اور غالب نے بھی فی البدیہہ اشعار کہے ہیں لیکن فی البدیہہ شاعری کا شاعری کی دنیا میں کیا مقام ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

ہماری بحروں میں سے کچھ ایسی ہیں جو ہندی کی بعض بحور سے ہم آہنگ ہیں۔ اس کی تفصیل غزلانِ الہند مصنفہ آزاد بلگرامی میں دیکھنی چاہئے۔ ہندی بحور کے نام بڑے دلکش ہیں ان میں شعر کہے جا سکتے ہیں اور کہے جانے چاہئیں۔ ایک زمانے میں کہے بھی گئے لیکن وقت سب سے بڑا قاضی ہے جو نظام فکر و علمی اس امتحان میں پورا اترے وہ ابدی جمال کا مالک ہے طباطبائی نے خود ہندی پنگل میں شعر نہیں کہے اردو بحور ہی میں غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں اور کامیاب ہیں۔ ان کا منظوم ترجمہ گورِ غریباں بہترین منظوم اردو ترجمہ کسی انگریزی شاہکار نظم کا۔ یہ بھی عربی بحر ہی میں ہے۔ وہی ہزج جس کا آہنگ انہوں نے ایک انگریزی فقرے میں تلاش کر لیا تھا ان کی تقطیع حسب ذیل ہوگی۔

LĒT Ŭ S (S) STĀND STĪLL N YŌN DĔR BĀNK

لیٹس اسٹ | اسٹل اِ | نَ یانڈر بنک
مفاعیلن | مفاعیلن | مفاعیلان

بحر مضرع مسدس مسبغ

نظم طباطبائی نے جو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی ہے اس کی تعمیر کمیں ہے اور معمار کی اپج، جدت اور قوتِ اختراع کا پتہ دیتی ہے لیکن چونکہ اسے کسی شاعر یا عروض نے قابلِ قبول نہیں سمجھا اس لئے اس کی حیثیت محض تاریخی ہے اور اردو عروض کے ارتقا کی ایک قابلِ ذکر کڑی ہے۔

۹ - چونکہ کلاسیکی عروض میں وزن کی اصطلاحات ہی آہنگ کا بدل تھی اس لئے بعض بحروں کی وجہِ تسمیہ سے آہنگ کی خاص صورتوں کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ متقارب، سریع دونوں تیز ٹیمپو کا رجحان رکھتی ہیں ہزج اور رمل بھی نغموں کے نام ہونے کی بنا پر غنائیت کا اشارہ کرتی ہیں۔ اس کے باوجود آہنگ کے مخصوص PATTERNS کا احساس کلاسیکی عروض میں مفقود ہے اردو میں اولیں بار بجنوری نے غالب کی استعمال کردہ بحروں کو آہنگ کے مخصوص رجحان کی بنا پر تین اقلیدسی رجحانوں میں منقسم کرکے دکھایا۔

۱- مستقیم : سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

۲- منحنی : آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیداد انتظار نہیں ہے

۳- مدور : یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

مدور بحور سے وہ بحور مراد ہیں جن کے عین درمیان وقفہ یا بسرام (CAESURA) واقع ہوتا ہے۔ بسرام ہندی اور انگریزی عروض میں بہت عام رجحان ہے عظمت اللہ خاں نے اسے بہت اہمیت دی ہے۔ انگریزی شاعری میں بسرام غیر قطعی سا ہے یعنی وہ اکثر مصرع LINE کے عین درمیان واقع نہیں ہوتا کیونکہ جہاں متعدد حروفِ صحیح رکھنے والا لفظ آ گیا بسرام سست رفتار اور ڈھیلا ہو جاتا ہے فارسی شاعری میں حافظ شیرازی اور گاہے گاہے اقبال کی غزلوں میں بسرام کا وقفہ کھپا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

حافظ بخود نپوشید // ایں خرقۂ می آلود
اے شیخِ پاک دامن // معذور دار ما را

دیکھا ہے میں نے پیرِ حرم کو
گفتار بے سوز // کردار واہی

پنوشید اور بے سوز زحافِ تسبیغ کے باعث نامطبوع طوالت یا اشباع کا شکار ہو گئے ہیں جس سے مصرع کی روانی بھی متاثر ہو رہی ہے غالب اور حالی اس زحاف کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے مصرعوں کی تدویر یا تناوب قطعی ہوتا ہے۔

غالب : تری نازکی سے جانا // کہ بندھا تھا عہد پورا کبھی تو نہ توڑ سکتا // اگر استوار ہوتا

حالی : اے عشق تو نے اکثر // قوموں کو کھا کے چھوڑا   جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

کلاسیکی اوزان میں آٹھ دس اوزان متناوب ہیں اور ان کے پڑھنے سے ایک مخصوص لطف محسوس ہوتا ہے ۔ جب بسرام سے فوراً قبل ترصیع کا التزام بھی ہو تو لطف دوچند ہو جاتا ہے اس صورت کو مسمط چہار خانہ سے موسوم کرتے ہیں غالب اور اقبال کے ان اشعار میں :

غالب   جب وہ جمالِ دلفروز // صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز // پردے میں رخ چھپائے کیوں

اقبال   دیکھ چکا المنی // شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں // نقشِ کہن کے نشان

'عروض وقفہ یا بسرام' کے عنوان سے راقم مضمون کا ایک مستقل مقالہ کہیں زیرِ اشاعت ہے ۔ بسرامی بحور مقابلتاً مشکل واقع ہوئی ہیں اس لئے ہماری شاعری میں بہت کم مستقل نظر آتی ہیں ۔

۱۰ ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پنگل کا تعارف اردو شعراء اور اہلِ عروض سے غزلانِ الہند میں غلام علی آزاد بلگرامی نے کرایا ۔ اس کے بعد قدر بلگرامی نے اپنی ضخیم تالیف قواعد العروض (۱۲۸۵ھ) میں عروض کے بعد پنگل (سنسکرت نام ۔ چھند سوترا) کا حصہ شامل کیا لیکن شرح و بسط کے باوجود مؤلف عروض اور ہندی پنگل کا بالتفصیل موازنہ پیش نہ کر سکے ۔ غزلان الہند میں عربی اور ہندی کی بعض مشترک الاوزان بحور کا ذکر تھا قواعد العروض میں یہ بھی نہ تھا ۔ البتہ طالب علم خود کوشش کر کے ایک تقابل نامہ مرتب کر سکتے تھے ۔

نمبر ۸ میں میں ان تین مشترک بحور کا ذکر کر آیا ہوں ۔ ۱۹۲۳ء میں 'شاعری' کے نام سے سہ ماہی اردو اورنگ آباد میں عظمت اللہ خاں نے ایک مبسوط مقالہ لکھا جس میں 'ایمجزم' غزل سے بیزاری گیت پسندی اور عروض کے بجائے پنگل اختیار کرنے کی تلقین کی گئی تھی ۔ ساتھ ہی تقطیع کے لئے انگریزی عروض کے علامتوں استعمال کرنے کا مشورہ بھی تھا ۔ عظمت اللہ خاں ضرورت سے زیادہ عروض پڑھ گئے تھے جنھیں وہ ہضم نہ کر سکے ۔ منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن کے مصداق انہوں نے اپنے بہترین گیت 'لیرکیں LYRICS' عربی بحور میں موزوں کیں جو مقبول ہوئیں (مرے حسن کے لئے کیوں مرے ۔ پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی دام میں یاں نہ آئیے دل نہ یہاں لگائیے' عربی بحور کی طرح مربع الارکان ہیں لیکن رجعی مصرع کی تکرار کی بنا پر نغماتی آہنگ اور تاثر پیدا کرتی ہیں ۔ جو نئے اوزان عظمت نے تخلیق کئے ان میں موزوں گیت کوئی نہیں پڑھتا ۔ یہ بے ڈھنگے اور نثری آہنگ کے قریب ہیں ۔ لیکن نثر کا آہنگ بہتر ہوتا ہے ۔

سرتی کا تصور شاعری میں سادہ دلی کا ثبوت ہے ۔ اس قسم کا ایک شاعر اور نقاد انگریزی میں ہمبرٹ ولف ہوا ہے ۔ (۱۸۸۰ ـ ۱۹۴۰ء) اس لئے اس کی نظمیں پسند نہیں کی گئیں ۔ سرتی خالص موسیقی کی چیز ہے شاعری میں اس کا کوئی معنی خیز حصہ نہیں ہو سکتا ۔ سلیم جعفر ایسے متوازن نرم طبع عروضی نے عظمتی عروض کو آدھا تیتر آدھا بٹیر کہا ہے ۔ انہوں نے پنگل پرستی کے سلسلے میں نیاز فتحپوری کا نام بھی لیا ہے ۔

(دیکھئے دوہا اور اس کا فن نگار پاکستان اصنافِ سخن نمبر ۱۹۶۶ء)

۱۱ ۔ عبدالرحمان بجنوری کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ انہوں نے محاسنِ کلامِ غالب میں غالب کے مختلف اوزان و بحور کا اقلیدسی مطالعہ کیا ہے

بجنوری کے خیال میں عروضی اوزان موسیقی سے ماخوذ ہیں ۔ یہ غلط فہمی ہے عروضی اوزان میں موسیقی کا ایک حصہ اور تاثر ہے لیکن اوزانِ عروضی اور موسیقی کے راگوں اور سروں میں کوئی مناسبت نہیں ۔ موسیقی آوازوں (ساز اور انسانی صوت) کے تموجات سے متشکل ہوتی ہے اور اوزانِ عروض میں متحرک اور ساکن حروف کی ترکیب اور تنوعات قبیل ہیں ۔ کسی ایک وزن کو ہم کسی ایک مخصوص راگ یا سر میں تعبیر نہیں کر سکتے مثلاً مفاعیلن مفاعیلن فعولن [ہزج مسدس محذوف] ایک بحر ہے اس میں موزوں غالب کا یہ شعر ہے ۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اس شعر کو تحت اللفظ اور ترنم سے پڑھ سکتے ہیں جو موسیقی کے بڑھتے ہوئے مراحل ہیں ۔ ترنم سے آگے بڑھیں تو سر اور تال اور سم کا مرحلہ آتا ہے ۔ جب تک اس شعر کو کسی مخصوص راگ میں نہ پیش کیا جائے اس وقت تک یہ موسیقی کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا تحت اللفظ سے نیچے روزمرہ کی کاروباری گفتگو ہے جو تحت اللفظ سے کم غنائی ہے ۔ اس طرح الفاظ معنی دار کی چار منزلیں متعین ہوتی ہیں یعنی

۱ ۔ روزمرہ کی گفتگو ۔
۲ ۔ تحت اللفظ جس میں صحتِ تلفظ اور ٹھہراؤ (ترتیل) ملحوظ ہے ۔
۳ ۔ ترنم جس میں خوش آہنگی اور سر کا ایک ابتدائی مرحلہ ہے ۔
۴ ۔ سر میں غنائیت کا مرحلہ

بہادر شاہ ظفر کی معروف غزل ؎

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

اکثر مغنیوں نے راگ ایمن کلیان میں گائی ہے لیکن ظاہر ہے کہ جب تک شعر کے الفاظ کو پورے اہتمام اور غنائی رفاقت (سازوں کی معیت) کے ساتھ ادا نہیں کر لیا جاتا ۔ کوئی موزوں مصرع یا شعر موسیقی کی حدود میں داخل ہونے سے قاصر ہے ۔ موسیقی میں صوتی تنوعات اَن گنت ہیں جبکہ اوزان عروضی محدود ہیں ۔ اس سے شاعری کے مرتبہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ۔ موسیقی میں سر ہی معتبر ہے جبکہ شاعری میں بنیادی چیز تخیل اور حسیت ہے اگر اسے متناسب متحرک اور ساکن الفاظ کی خصوصی ترتیب میں جمع کر دیا جائے تو تاثر زیادہ قوی اور دیرپا ہوگا ۔ شاعری اور موسیقی کا موازنہ کرنا کسی حد تک غیر متجانس اشیاء کا تقابل پیش کرنا ہے ۔ موسیقی کو الفاظِ معنی دار کی ضرورت ہی نہیں ۔ جبکہ شاعری معنویت کا اظہار ہے اور معنویت بھی حیات و کائنات کی جس سے ادراکِ زندگی عبارت ہے ۔

بجنوری لکھتے ہیں ” غالب کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے ۔ یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرع تارِ رباب نظر آتا ہے ۔ اوزانِ رمل میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ایک نہایت مستعمل بحر ہے ۔ الفاظ نہایت آسانی سے اس کا جامہ قبول کر لیتے ہیں شعرائے اردو اکثر اسے کام میں لاتے ہیں ۔ لیکن عیب اس میں یہ ہے کہ مصرعوں میں صوتی رقص کم پیدا ہوتا ہے مثلاً یہ فارسی شعر ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو   گیر و دار و حاجب و درباں دریں دربار نیست

جو اصل و ترکیب کی بیش بہا مثال ہے باوجود استاد کی کاوش و کاہش کے معیار رسا نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے میں یہ ترانہ ریز شعر ملاحظہ ہو۔

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست   واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

غالب کے شعر کی موسیقی کی خوبی بلا امداد ساز و ترنم کے ترتیل سے دریافت ہو سکتی ہے۔

مجنوں نے اس بیان میں یہ بات درست ہے کہ غالب کا شعر غنائی مرتبے سے میں فارسی شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن غالب کے شعر کی غنائی خوبی اس کی فصاحتِ الفاظ ہے اور فارسی شعر کی خرابی اس کے الفاظ کی ترتیب کی بد آہنگی اور بد سلیقگی۔ اس شعر کے پہلے مصرعے میں حرف ک کے بعد ک اور پھر گ کے واقع ہونے سے تنافر کا عیب پیدا ہو گیا ہے جس سے مصرع کا آہنگ بگڑ گیا ہے۔ غالب کے شعر میں مترنم آوازیں م اور ن کی آئی ہیں جو بنفسہ مترنم واقع ہوئی ہیں۔ دوسرے مصرع میں بھی میم اور نون کا جمالیاتی آہنگ ہے۔ گویا اصوات غیر شعوری طور پر شاعر کے شعر میں آئی ہیں لیکن شعر کی رومانی حسن اور فنکاری کے ساتھ مل کر ان سے شعر کی فضا انتہائی دلکش اور نغماتی ہو گئی ہے۔ گویا بحرِ رمل کے ایک مخصوص وزن نے بذاتِ خود کوئی سحر کرامی نہیں دکھائی بلکہ شعر میں انتخابِ الفاظ اور ان کے دروبست سے یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح شعر کی جمالیت کا تعلق عروض کی بجائے فصاحت سے استوار ہو جاتا ہے۔

۲۱۔ جب مغربی شعری آہنگ کا تصادم ہمارے عروض سے ہوا۔ تو مستشرقین نے اپنی اور اپنے ہم وطن طالب علموں کے لئے عروض کے عناصر، مسائل اور دوسرے متعلقات کی تعبیر اپنے ہاں مروجہ نظام کی صورت میں کی۔ میں نے اوپر ڈاکٹر جی۔ ویل کے مقالے کا حوالہ دیا ہے اس کے علاوہ کو آیا ڈنے بھی ارکانِ عروض کو مغربی آہنگ کے نظام کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ویل نے متحرک اور ساکن حروف کی علامات ا اور ٥ بالترتیب قائم کیں جسے محمود شیرانی نے اختیار کیا اس سے صرف ایک فائدہ مقصود تھا وہ یہ کہ ہمارے بنیادی عناصرِ عروضی زیادہ سے زیادہ انگریزی دانوں کی سمجھ میں آ سکیں۔ ویل کی علامات میں دائرہ ٥ قرآن حکیم سے ماخوذ تھا جہاں دائرہ فل سٹاپ کو ظاہر کرتا ہے لیکن یہ سکون کی علامت نہیں ہے اس لئے درست نہیں ہے کھڑی لکیر یعنی ا پنچایتی طریقے پر مقرر کیا گیا اس تعبیر میں ایک کمی تھی کہ در، بر اور سر کے علاوہ دار، بار اور سار کے لیے بھی بلند یا طویل ہجا یعنی LONG SYLLABLE کی علامت مقرر کر دی گئی تھی حالانکہ در، بر وغیرہ سببِ خفیف میں اور دار، بار اور سار تقطیع میں آ کر وتدِ مفروق کا حکم رکھتے ہیں۔ میں یہاں ویل اور سٹائن گاس، براؤن وغیرہ کی علامات درج کرتا ہوں۔

	رکن کا نام	ویل شیرانی علامت	سٹائن گاس کا نظام
۱۔	فَعُولُن	0 1 0 1 1 ن ل و ع ف	˘ — — فُ عو لن
۲	متفاعلن	0 11 0 111	˘ ˘ — ˘ — م ت فا ع لن
۳	فاعلن	0 11 01	— ˘ — فا عِ لن
۴	فاعلات	00 11 01	— ˘ — فا عِ لات

ڈاکٹر پرویز ناتل نے اپنے تحقیقی مقالے میں جس کا ذکر اوپر آیا، انگریزی کے عروضی نظامِ تقطیع کو ہی اختیار کیا ہے جو ہمارے مروجہ ورقیطن اور قابلِ فہم، منفرد نظام کے مقابلے میں ناقص بھی ہے اور غیر متجانس بھی یہ بھی ظاہر ہے کہ ویل کی مجوزہ علامات دوسرے مستشرقین کے مقابلے میں طویل تر ہیں مثلاً رکن فاعلات کو اول الذکر میں چھ علامتیں مطلوب ہیں لیکن ثانی الذکر میں صرف تین کافی نظر آتی ہیں۔ ویل کے مجوزہ نظام کی رو سے ہمارا وتدِ مجموع نظر، سحر، خبر، یہاں، وہاں وغیرہ ایک خفی۔ ایک طویل ہجا سے مرکب ہے۔ اس سے استفادہ کرتے ہوئے عظمت اللہ خان نے شیکسپیئر اور دوسرے منظوم ڈراما نگاروں کی استعمال کردہ بحرِ آئمبی IAMBIE کا مترادف وتدِ مجموع کے تسلسل کو قرار دیا ہے اور AMID SUMMER NIGHTS D EAM میں تھیسیس آف ایتھنز کی تقریر کا منظوم آزاد ترجمہ فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن میں کیا ہے ظاہر ہے کہ انگریزی کے AFOOT، BEGIN وغیرہ کے مترادف آہنگ ہمارے نظر، سحر ہیں لیکن لُن کے آنے سے آہنگ متغیر ہو جاتا ہے اس لئے منظوم اردو ڈرامے کے لئے فعولن فعولن " " کا استعمال گو اپنے طور پر قابلِ اعتراض نہیں پھر بھی یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ آئمبی کا ہم آہنگ بحرِ متقارب کا اساسی رکن فعولن ہے۔ عظمت اللہ خاں نے اپنی تجویز کو کبھی جامۂ عمل نہیں پہنایا اور جو منظوم ترجمہ تھیسیس کی تقریر کا کیا ہے اور جس کا موضوع شاعری کا تخلیقی عمل ہے خالصتاً عربی عروض پر مبنی ہے۔ عظمت کا یہ ترجمہ اردو زبان میں پہلی آزاد نظم کا نمونہ ہے اور اولیت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ عظمت نے بنگالی ساحلی گیت پھول پھٹارے پھول پھٹارے دریا کو بھی اوزانِ رباعی میں شامل کرنے کا مشورہ دیا ہے جو ناقابلِ تسلیم ہے اس بنا پر کہ یہ بحرِ متقارب میں ہے جو رباعی کی مخصوص بحر نہیں ہے۔ پنگل میں ماتراؤں کی گنتی وزن کا بنیادی پتھر ہے اور ایک حرفِ مطلق ایک ماترا کے برابر ہے اس طرح تیس تیس تبیس تبیس ماترائیں گننے کا عمل ضربِ ال کی مثال پیش کرتا ہے۔ اس سے بہتر علاماتِ تقطیع م برائے متحرک اور س برائے ساکن ہے چنانچہ

۱۔ فعولن = م م س م س

۲۔ فاعلاتن = م س م س م س

۳۔ متفاعلن = م م م س م م س

۱۴۔ کلاسیکی عروض میں تقطیع اور تعیینِ بحر کی غلطیاں قابلِ توجہ ہیں۔ خانِ آرزو نے تنبیہ الغافلین میں شیخ علی حزیں کی ایک غزل کی بحر مقتضب کو بحرِ ہزج مثمن اشتر پر محمول کر کے اس کے خارج الوزن ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ حزیں کی غزل کا ایک شعر ہے۔

شب کہ با ہزار فغاں در فراقِ یوسفِ خویش
داشتم بہ سینہ دلے رشکِ پیرِ کنعانی

آرزو نے لکھا کہ شعر فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن کے وزن پر ہے اس لئے یوسفِ کا کسرہ زائد ہے اسی طرح سینہ کی ہائے مختفی کا نقر نیز بھی زائد ہے۔ صہبائی نے 'قولِ فیصل' میں آرزو کی غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اصل میں حزیں کی غزل بحرِ مقتضب مطوی مقبوض مسبّغ میں ہے۔ جس کا وزن فاعلاتُ مفعولن پاتا ہے فاعلاتُ مفتعلن آتا ہے چنانچہ دونوں مصرعوں کی تقطیع اس نہج پر ہو گی :-

شبِ کب باھَ	زا رِ نخ غا	و فراقِ و	یوسفِ خویش
فاعلاتُ	مفعولن	فاعلاتُ	مفتعلان
دا شتم بَ	سفیدے	رشکِ پیر	کنعانی
فاعلاتُ	مفتعلن	فاعلاتُ	مفعولن

صاحب بحر الفصاحت عظیم عروضی ہیں لیکن انہوں نے غالب کی اس غزل کا وزن اور بحر

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن (مجتث مثمن مخبون) کی بجائے بحر ہزج مثمن۔ مقبوض بروزن مفاعلن مفاعیلن مفاعلن مفاعیلن بتایا ہے جس سے غزل کا سارا آہنگ ہی بدل جاتا ہے اور یہ آہنگ عربی فارسی اردو شاعری میں کہیں بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ صاحب بحر الفصاحت کی تقطیع حسب ذیل ہے۔

عجب نشا	طسے جل لا	د کے چلے	ہہ ہم اا گے
مفاعلن	مفاعیلن	مفاعلن	مفاعیلن
کہ اپنے سا	ءِ سے سر پا	ؤ سے ہے دو	قدم آگے

اسی غزل کے اس شعر کو پڑھنا بھی مختلف تلفظ سے ہوگا یعنی اس کی املا یہ ہوگی۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قدم آگے

حالانکہ صحیح صورت میں لکھّا کی بجائے لکھا واقع ہونا چاہیئے۔ غالب نے اس بحر کو ایک نئی بحر قرار دیا ہے حالانکہ فارسی میں مستعمل رہی ہے۔ اردو میں بہت کمیاب ہے۔ نجم الغنی نے مندرجہ بالا تقطیع کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس غزل کو مجتث (یعنی اصلی بحر) میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔

۱۴۔ عروضی نظام میں اہم یا غیر اہم تبدیلیاں لانے کے سلسلے میں محمود شیرانی کا خاص حصہ ہے۔ ان کا ذکر اوپر آچکا ہے یہاں ان کے بعض تصرفات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ شیرانی نے بعض متعارف اور متداول بحور کا نام بدل دیا ہے اور ساتھ ہی ان کے ارکان کے نام بھی مثلاً:

	متعارف رکن	بحر کا نام	شیرانی عروضی نام
(۱)	فعلن فعلن فعلن فعلن " " " "	متدارک مخبون سولہ رکنی	بحر بیدل رکن کا نام = متفاعلتن
(۲)	فعلن فعلن فعلن فعلن " " " "	متدارک مخبون مسکن سولہ رکنی	بحر نظیر (اکبرآبادی) رکن = مستفعلتن

(۳) فعولن فاعلن فعولن فاعلن   کلاسیکی عروض میں موجود نہیں   بحر شیرانی

مثال مصرع : بادل آئے ہر سو چھا گئے

نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں بحور کے ناموں پر اعتراض نہیں صرف رکن اساسی کے ناموں پر اعتراض ہے۔ یہ اتنے طویل اور عسیر الاملا ہیں کہ لکھنا تو کیا ان کا پڑھنا بھی متوسط صلاحیت کے طالب علم کے لئے دشوار ہے جبکہ ان کے متعارف نام اور تلفظ آسان ہیں۔ اور عروض تو آسان مگر جامع بنانا ہی عروض کی اصلاح اور طرح نو کا ضامن ہو سکتا ہے نہ کہ اسے اور بھی مشکل اور کیفی کے الفاظ میں جناتی بنا دینا۔ نمبر ۳ بحر انتہائی بدآہنگ واقع ہوئی ہے اور اس میں سوائے اس کے موجد کے کسی شاعر نے طبع آزمائی نہیں کی۔ بدآہنگ بحور میں معانی اور تصویریں دھندلی ہو جاتی ہیں اور فصاحت کا لازمی جمالیاتی پہلو غائب ہو جاتا ہے۔

۵۔ "اردو کا نیا عروض" کے مؤلف حبیب اللہ غضنفر نے اپنے قابلِ قدر رسالہ میں متعدد نئے عناصر داخل کئے ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

ا۔ متحرک اور ساکن حروف کی بجائے مغربی عروضی نظام اختیار کیا ہے لیکن تقطیع میں اسے شامل نہیں کیا۔ چنانچہ مختلف ارکان خفی اور بلند ہجاؤں میں منقسم کئے گئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ فعولن (خفی + بلند + بلند)

۲۔ فاعلاتن (بلند + خفی + بلند)

۳۔ مستفعلن (بلند + بلند + خفی + بلند)

ب۔ مزاحف ارکان کو مستقل ارکان تسلیم کر کے ان کی تعداد بڑھا دی ہے چنانچہ حسب ذیل ارکان کا اضافہ منظور ہے۔

نع۔ فاع۔ فَعَل۔ مفعولن۔ فعلن۔ فعِلن

لیکن حیرت خیز بات ہے کہ بحر کامل کا رکن اساسی متفاعلن ان ارکان میں شامل نہیں ہے راقم مقالہ نے غضنفر مرحوم (ان کا انتقال فروری ۱۹۷۴ء میں ہوا) کو ایک مکتوب میں اس طرف متوجہ کیا تو مرحوم نے جواباً تحریر فرمایا کہ واقعی یہ رکن درج ہونے سے رہ گیا ہے کیونکہ کامل اردو شعراء نے بہت کم استعمال کی ہے "آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے گی"۔ اردو کا نیا عروض ۱۹۵۱ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی اس کا اولین ایڈیشن ختم ہو چکا ہے لیکن دوسرا ایڈیشن ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔

ج۔ بعض مزاحف اوزان کو مستقل بحور تسلیم کر لیا ہے۔ مثلاً

مزاحف بحر اور وزن	غضنفری نام
۱۔ مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن	بحر نغمہ
۲۔ مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن	بحر ہزدج
۳۔ مفعول و فاع لاتن مفعول و فاع لاتن	بحر ارمولہ
۴۔ مفعول و مفاعلن مفاعیلن فع	بحر ترانہ (رباعی کا ایک معروف وزن)

ہ ۔ (فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع)   بحرِ جامہ

د ۔ دوائر اور زحافات کو موقوف کر دیا ہے جس سے بظاہر بڑی آسانی ہو گئی ہے اور رسالہ کم مدت میں سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے ۔ رسالے کی ضخامت ۲۰ صفحات ہے ۔

س ۔ اصولِ سرمانہ نے ہندی پنگل مترادفات بھی درج کئے ہیں ۔ جس سے مرحوم کی پنگل آشنائی کا پتہ چلتا ہے ۔

س ۔ مشقیہ اشعار برائے تقطیع و تعیینِ وزن و بحر دیئے گئے ہیں جو کسی اور رسالۂ عروض میں نہیں ملتے ۔

ص ۔ رباعی کے اوزان کے سلسلے میں غضنفر نے اس کی مخصوص بحر (ہزج) کا نام بدل کر بحرِ ترانہ تجویز کیا ہے اور اولیں وزن مفعولُ مفاعلن فعولن فعلن رکھا ہے (مرزا غالب نے بھی ایک شاگرد کو یہی تجویز کیا تھا) اور اس کے تحت واقع ہونے والے مزاحف اوزان کی تفصیل بندی بھی کی ہے ۔

مثلاً   مفعول مفاعلن فعولن فعلان
،،   ،،   ،، فعلان
،،   ،،   فعولات و فعل
،،   ،،   فعولاتُ فعولُ

و دیگر

۱۵ ۔ راقم مقالہ نے بعض عظیم ماہرینِ عروض کے تسامحات کی تفصیل پیش کی ہے بعض رسائلِ عروض سرقے کی بدترین مثالیں ہیں مثلاً فارسی عروض کی ایک درسی کتاب العروض والقوافی مؤلفہ اصغر علی روحی لفظ بلفظ رسالہ معراج العروض مرتبہ ملا غیاث الدین رام پوری و شاملِ غیاث اللغات کی نقل ہے اسی طرح بحر العروض مؤلفہ کنہیا لال دہلوی شاملِ نصاب امتحان ادیب پنجاب یونیورسٹی ۱۹۲۶ء صہبائی کے ترجمہ حدائق البلاغت کا سرقہ ہے مؤلف بحر العروض نے بعض مقامات پر اصل کتاب کے الفاظ بدل دیئے ہیں ۔ مثلاً رباعی کے ضمن میں لفظ مخترع کی بجائے اختراع وغیرہ لیکن دونوں رسالوں کو ساتھ ساتھ پڑھنے سے سرقہ کھل جاتا ہے ۔ بحر العروض پر نظرِ ثانی و حواشی شاداں بلگرامی نے لکھے ہیں اور حواشی میں مؤلف کے بعض تسامحات کا ذکر بھی کیا ہے ۔ جسے مؤلف نے جو شاداں بلگرامی کے شاگرد تھے ضمناً درج کر دیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظرِ ثانی کے بعد بعض اوزان اور امثلہ ایزاد ہوئے ہیں کیونکہ ان کے تسامح کی طرف شاداں نے اشارہ نہیں کیا ۔ چنانچہ اس شعر کی تقطیع و تعیینِ بحر و وزن ۔

اتنا نہ بے ادب ہوں کہوں تو ادھر کو دیکھ
میں تجھ کو دیکھتا ہوں تو جا ہے جدھر کو دیکھ

اس بحر کو بحرِ طویل قرار دیا ہے جبکہ اصل میں اس کا تعلق بحرِ مضارع سے ہے اور صحیح وزن مفعول و فاعلات و مفاعیل فاعلات ہے ۔ دیگر بحرِ وافر کی مثال میں یہ شعر درج ہے ۔

تجھے وحشت ہے سودا ہے مگر دلدار کی زلفِ پریشاں کا   کہ ہے حالِ پریشاں سر بسر تیرے دلِ غمگین و نالاں کا

جو اصل میں مفاعیلن معشر (دس بار مفاعیلن) کے وزن پر ہے۔ مؤلف کی تقطیع اس طرح ہے:

تجھے وحشت ہے = مفاعلتن ، سودا ہے گر = مفاعلتن ، دلدار کی زل = مفاعلتن فِ پریشاں کا = مفاعلتن

اس تقطیع کے بعد ایک نوٹ درج ہے جس پر شاداں کے دستخط نہیں ہیں نوٹ یہ ہے:

اس شعر کی بھی یہ تقطیع مذکور نہیں۔

ظاہر ہے کہ نوٹ شاداں بلگرامی ہی کا ہے اور صحیح ہے لیکن اس طرح کی کتاب کا جس کی غلطیاں بھی اسی میں ایک مصحح نے بتائی ہوں پنجاب یونیورسٹی کی ایک نصابی کتاب کی صورت میں منطبع ہونا حیرت انگیز بات ہے اب یہ کتاب غالباً شامل نصاب نہیں ہے۔

نقوش خطوط نمبر میں شاداں بلگرامی کا ایک مکتوب بنام پروفیسر اشہر لکھنوی شامل ہے جس میں مؤخر الذکر صاحب کے ایک عروضی تسامح کی اصلاح درج ہے (دیکھئے مجلۂ مذکور) اسی مکتوب میں یہ بھی مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ

" میر شمس الدین فقیر مؤلف حدائق البلاغت سے بہت تسامحات سرزد ہوئے ہیں "

یہاں ان تسامحات کی تفصیل نہیں پیش کی اگر ایسا ہوتا تو فقیر دہلوی کی عروضی مہارت کا صحیح اندازہ ممکن تھا لیکن نجم الغنی بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں کہ میر شمس الدین فقیر کو علم عروض میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اب حضرت شاداں بلگرامی اور نجم الغنی رامپوری دونوں صاحب علم عروض میں ید طولیٰ رکھتے ہیں لیکن دونوں کی رائے فقیر دہلوی کے بارے میں کس قدر مختلف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عروض ایک نہایت دقیق اور متنازعہ فیہ مسائل سے بھرا ہوا علم ہے۔ نجم الغنی سختی کے ساتھ خطائے بزرگاں گرفتن خطاست کے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ جہاں کہیں دوسرے مصنفین سے اختلاف رائے کیا ہے انتہائی نرمی اور احتیاط سے کیا ہے مثلاً غالب کے وزنِ رباعی کی اصلاح کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" اور تعجب ہے کہ مرزا غالب ایسے شاعرِ نغز گو نے تباینِ ارکان سے رباعی کے اوزان کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ (تباین ارکان = ارکان کو بدل دینا۔ راقم مقالہ) اسی طرح شاری کے اس اختلاف رائے کو کہ تشبیہ و استعارہ وغیرہ کو علم بیان کی بجائے علم بدیع میں شامل ہونا چاہیئے اس طرح رد کرتے ہیں کہ " اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شاری پر اپنی طرف سے خواہ مخواہ عیب چپکا دیں بلکہ جو حق بات ہے وہی کہیں گے۔ جبکہ تمام علمائے بلاغت نے تشبیہ و استعارہ کو علم بیان میں شامل کیا ہے تو یہ صحیح ہے "۔ ممکن ہے کہ مؤلف بحر الفصاحت کے ذہن میں شمس الدین فقیر کے بعض تسامحات ہوں اور انہوں نے اس سے چشم پوشی کی ہو۔ راقم مقالہ کی دسترس میں مذکورہ کتاب نہیں ہے اور نہ اس کے اردو ترجمہ میں صہبائی نے بعض مقامات پر موعودہ اور مزعومہ اضافے نہیں درج کئے۔ مثلاً بحر متقارب کے ضمن میں متعدد اوزان کا ذکر کر کے ان کو درج نہیں کیا (دیکھئے کتاب مذکورہ شائع کردہ نولکشور پریس لکھنؤ)

راقم مقالہ کا اندازہ ہے کہ چند سال کے بعد ہمارا عروض پاکستانی اور بھارتی عروض میں بٹ جائے گا۔ بھارت میں پنگل رائج ہوتا ہی چلتا ہے اور وہاں عظمت اللہ خاں، مسعود حسین خاں، نظم طباطبائی، تاجور نجیب آبادی اور سید مجیب الرحمان کا محبوب پنگل عربی فارسی عروض کی جگہ لے گا۔ چند سال ہوئے غالباً (سنہ ۱۹۷۰ء) ہفتہ وار اردو زبان علی گڑھ یونیورسٹی میں مجیب الرحمان کا ایک مقالہ سلسلہ وار بہ عنوان " ہندوستانی زبان کے لئے تقطیع کا مشترکہ نظام " شائع ہوا تھا جس میں اردو اشعار کی تقطیع لگھ اور گرو کی مدد سے کی گئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کا عروضی نظام عربی الاصل ہی رہے گا کیونکہ یہ مستحکم اور دلچسپ ہے تاہم عروض سے واقفیت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کا نیا عروض حبیب اللہ غضنفر

امروہوی اس سلسلے میں بہترین اور آسان ترین کتاب ہے جو عروض سمجھنے اور سمجھانے میں طالب علموں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کاظم فرید آبادی کا مجوزہ نظام بھی کافی آسان اور جامع ہے یعنی گل، صبا اور چمن کی مدد سے ہر شعر کی تقطیع کر دی گئی ہے۔ یہ رسالہ گلزارِ عروض، کاظم بریلوی نے غالباً ۱۹۱۱ء کے آس پاس لکھا تھا اور اسے کتاب خانہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ لیکن انجمن ترقی اردو پاکستان کے ذخیرۂ عروض میں یہ موجود نہیں ممکن ہے کہ راقمِ مقالہ کو اس سلسلے میں تسامح ہوا ہو تاہم اس رسالہ کی تلاش اور اشاعت بہت ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔

(ضمیمہ)

نیاز فتحپوری اور علمِ عروض

آلِ احمد سرور نے نیاز فتح پوری کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ عروض کے زبردست ماہر تھے"۔ عروض ایک پیچیدہ اور دقیق علم عروض اور اشعار کی سائنسی تعبیر کا نام ہے اس لیے اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ بڑے بڑے عروضیوں سے تسامحات سرزد ہو گئے ہیں جن کا جائزہ میں ایک مضمون میں لے چکا ہوں۔ اس مضمون میں نیاز فتحپوری کی عروض دانی کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ نگار کے وہ شمارے دستیاب نہ ہو سکے تھے جن میں عروضی بحثیں آئی ہیں۔ حسنِ اتفاق سے "نگار" کا شمارہ نمبر ستمبر ۵۹ء دستیاب ہو گیا ہے۔ جس میں جناب سید لطف اللہ قادری صاحب نے غالب کے بعض فارسی اشعار کا وزن دریافت کیا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے جوابات میں ان اشعار کو صحیح طور پر پڑھ کر ان کی تقطیع بھی کی ہے اور بحر و وزن بھی بتا دیا ہے۔ قادری صاحب کا پوچھا ہوا پہلا شعر یہ ہے ؎

ہم ز آغاز بجوفِ خطر ستم غالب
طالع از خوف و شمار از سرطانم دادند

وہ پوچھتے ہیں کہ سرطان بروزنِ مفعولن آیا ہے حالانکہ بحر کے لحاظ سے فعلاتن آنا چاہیئے"۔ نیاز صاحب کا جواب یہ ہے "یہ شعر بحرِ رمل مخبون کا ہے اور مفعولن اس بحر میں نہیں آسکتا لیکن آپ نے غلطی سے سرطان کو بہ سکونِ را پڑھا ہے حالانکہ اس کا صحیح تلفظ سَرَطان (بہ فتحِ را) ہے۔ اس طرح سَرَطانم بروزنِ فعلاتن پڑھا جائے گا"۔ نیاز صاحب کی اصلاح اور تعیینِ بحر و وزن درست ہے لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ رمل مخبون میں مفعولن نہیں آسکتا۔ رمل مخبون میں فعلاتن مسکن ہو کر مفعولن ہو جاتا ہے اور فارسی شاعری میں یہ زحاف جسے تسکینِ اوسط کہتے ہیں بہت دفعہ استعمال ہوا ہے۔ بلکہ جہاں کہیں بھی فعلاتن یا مفاعلتن یا متفاعلن آتا ہے تینوں پر تسکینِ اوسط کا عمل وارد ہوتا ہے اور بالترتیب مفعولن، مفاعیلن اور مستفعلن میں بدل جاتے ہیں۔ سعدی

زر بدہ مردِ سپاہی را تا سر بدہد — وگرش زر ندہی سر بنہد در عالم
منیر لکھنوی — خلد روح افزا مضمونِ چمن پیرا نظم — گل فشاں ہو گئے یوں عیسوی و ہجری سال

پہلے شعر میں زر بدہ مر = فاعلاتن، دِ سپا = فعلاتن، ہی تا سر = مفعولن، بدہد = فعِلن
دوسرے شعر میں خلد روح ف = فاعلاتن، زا مضمو = مفعولن، نِ چمن پے = فعلاتن، را نظم = فعلان

امانت کے اس شعر پر

اس پہ راضی ہو تو قرآں اٹھالاؤں میں
رکھ تو لے مصحف رو ہاتھ قسم کھاؤں میں

ایک صاحب نے اپنے رسالے میں اعتراض اٹھایا تھا کہ مصحفِ رو میں اضافت زائد ہے۔ لیکن بقول نجم الغنی اضافت کے بغیر ہی وزن ست ہے کیونکہ

تقطیع: رکھ تو لے مص = فاعلاتن، حف رو ہا = مفعولن = تھ قسم کھا = فعلاتن، ؤں مے = فعلن۔ صاحب مذکور نے دوسرے مصرع کا وزن یہ سمجھا تھا فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن حالانکہ دوسرا رکن مفعولن تھا اس مفعولن کو زحاف کے سبب سے مسکن کہیں گے نانچہ بحر کا نام حسب ذیل ہوگا۔

بحر رمل مثمن مخبون مسکن محذوف مسکن (دوسرا مسکن فعلن ہے۔

۲۔ استفسار: "ایک اور شعر:- گرسنہ بہ کہ بہ آید ز خانہ جانش دلرزد
ازاں کہ دارسد از راہ مہمانش دلرزد

یہ شعر کس بحر کا ہے اور اس کی تقطیع کیا ہوگی مصرعِ اول میں پہلا رکن گرسنہ بروزن فاعلن ہے اور دوسرے مصرع میں رکن اول ازانکہ مفاعلن کے وزن پر ہے۔"

(نگار) یہ شعر بحرِ مجتث مخبون کا ہے اس کا وزن ہے: مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلاتن گرسنہ کو فارسی میں گرِسنہ (بفتح را بھی لکھتے ہیں) اس لئے پہلے مصرع کے رکنِ اول (گرِسنہ بہ) کی تقطیع بھی بروزنِ مفاعلن ہوگی۔ فارسی میں گسنہ بھی مستعمل ہے۔"

نیاز کی یہ تقطیع بالکل درست ہے برسبیل تذکرہ ہم یاد دلاتے ہیں کہ جب غالب سے مذکورہ بحر میں ایک غزل لکھی تو ایک مکتوب میں مکتوب الیہ کو لکھا کہ "ایک غزل نئی بحر میں لکھتا ہوں" حالانکہ یہ بحر فارسی میں کافی مستعمل ہے لیکن اردو میں کبھی استعمال نہیں ہوئی تھی لیکن بہرحال یہ نئی بحر نہیں تھی کیونکہ فارسی میں اس کا استعمال عام تھا۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مقالہ غالب بحیثیت محقق، میں اس کی طرف اشارہ کیا تو شوکت سبزواری صاحب نے لکھا کہ "چونکہ یہ بحر غالب نے پہلی دفعہ استعمال کی تھی اس لئے نئی بحر کہا۔" گر یہ توجیہہ کافی نہیں ہے غالب کا شعر ہے۔

رنگیں چمنے ز شعلہ آرائے   ابراہیمے ز آذر آور

دوسرا مصرع ناموزوں معلوم ہوتا ہے ابراہیمے بروزن مفعولان نظم ہوا ہے۔

(نگار) یہ شعر بحرِ ہزج کا ہے۔ پہلے مصرع کی تقطیع ہے:

رنگیں چ (مفعول) منے ز شع (مفاعلن) ل آرائے (فعولان یا مفاعیل) اخرب مقبوض مقصور

دوسرے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی۔ ابراہی (مفعولن) مے ز آ (فاعلن) زر آور = فعولن (اخرم اشتر محذوف) میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے مصرع میں ابراہیمے نہیں ہے بلکہ ابراہیئے (ابراہیمی اسے بمعنی ابراہیمیت اس طرح دوسرے مصرع کی تقطیع یوں ہو جائے گی۔ ابراہ (مفعول) مے ز آ (مفاعلن) زر آور فعولن (اخرب مقبوض)" اس تقطیع میں مندرجہ ذیل اغلاط ہیں۔

۱۔ پہلے مصرع کا رکن اول رنگیں چ کو مفعول کے وزن پر لکھا ہے۔ مفعول کوئی رکن عروضی نہیں ہے بلکہ مفعولُ بضم لام رکن ہے

جسے اخریب کہتے ہیں۔ عروض میں حرکات ہی اساسی اصول و معاییرِ وزن ہیں اگر ان کو شاملِ تقطیع نہ کیا جائے تو الفاظ کے وزن متغیر ہو جاتے ہیں اور الفاظ اور ارکان میں صحیح مطابقت ختم ہو جاتی ہے جو اصل عروض و تقطیع ہے۔ صحیح اندراج = رَنگیِجَ = مفعولُ

۲۔ ل آ را اسے کو فعولن یا مفاعیلن کے وزن پر بتایا ہے۔ جبکہ صحیح وزن یہاں مفاعیلن ہے فعولان اگرچہ مفاعیل کے ہم آہنگ ہے لیکن یہ اصل میں بحرِ متقارب سے تعلق رکھتا ہے اور فعولن کی مسبّغ صورت ہے (زحاف کا نام تسبیغ ہے۔ اقبال کے اس شعر میں

دیکھا ہے میں نے پیرِ حرم کو
گفتار بے سوز کردار واہی

دوسرے مصرع میں دوسرا رکن ربے سوز بروزن فعولان آیا ہے۔ اور یہ مسبّغ ہے۔

۳۔ ل آرا کو تقطیع میں ل اا را درج کرنا ضروری ہے کیونکہ الفِ ممدودہ بمنزلہ دو الف کے ہے اور دو الف یعنی اا کی صورت میں اس کا اندراج لازمی ہے تاکہ عروض کے طالب علم اچھی طرح حروفِ مکتوبی و ملفوظی کا فرق سمجھ جائیں۔

۴۔ اسی طرح رنگیں کو رنگی درج کرنا چاہیے کیونکہ نون غنہ مکتوبی حرف ہے ملفوظی نہیں اگرچہ تلفظ کا حصہ ضرور ہے لیکن یہ تلفظ میں یائے معروف میں مدغم ہے۔

۵۔ ابراہیمے بروزنِ مفعولن فع ہے اسے ابراہیمئے پڑھنا معنی میں فرق پیدا کر دیتا ہے

یعنی ابراہیم پیدا کر کی بجائے ابراہیمی یا ابراہیمیت پیدا کر مفہوم ہوگا۔ جبکہ صاف طور پر یہ مفہوم کہ آذر سے ایک ابراہیم پیدا کر کافی مضمون ہے اور واضح بھی ہے۔ معنی میں تغیر پیدا کرنے کے لئے نیاز نے لفظ کے تلفظ کو بدل دیا ہے اس طرح وزن بھی متغیر ہو گیا حالانکہ شعر اچھا اور واضح ہے۔ میں نے اوپر نیاز کی ایک شعر میں پانچ غلطیاں دکھائی ہیں۔ اگر پانچویں کو عروض کی غلطی نہ بھی تصور کیا جائے تو بھی ایک شعر میں چار غلطیاں کرنا ماہرِ عروض سے متوقع نہیں۔ نیاز صاحب یقیناً کافی عروض جانتے تھے اور ایک شعر کی صحیح تقطیع بھی کر سکتے تھے لیکن پوری مہارت انہیں حاصل نہ تھی۔ خصوصاً رکن مفعولُ کو مفعول لکھنا فاش تسامح ہے۔ میں نے اوپر واضح کر دیا ہے کہ مفعولُ کے ہم وزن الفاظ (رنگیِ جَ) ہیں۔ یعنی جَ پہ فتحہ ضرور آنا چاہیے جو مفعولُ کے لُ کے برابر واقع ہوا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ نگار کے کسی گذشتہ شمارے میں نیاز اور آثر لکھنوی کے مابین کوئی عروضی مناقشہ ہوا تھا اور اس میں نیاز صاحب کی بات درست تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں حضرات عروض سے واقف تھے لیکن ایک سے غلطی سرزد ہوئی اور دوسرے نے اس کی اصلاح کی۔ تنبیہ الغافلین میں خانِ آرزو نے حزیں کی ایک فارسی غزل کو بحرِ ہزج مثمن اشتر میں تصور کر کے اسے خارج الوزن قرار دے دیا تھا حالانکہ یہ اصل میں بحرِ مقتضب میں تھی اور مزاحف۔ 'قولِ فیصل' میں امام بخش صہبائی نے آرزو کی تغلیط کی تغلیط کی اور حزیں کی غزل کو بقیدِ وزن ثابت کر دیا۔ اس کی تفصیل بحر الفصاحت نجم الغنی میں دیکھی جا سکتی ہے (بحرِ مقتضب کا بیان) یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ عروض میں ہر عروضی سے کہیں نہ کہیں تسامح ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی کو کامل کہنے سے پہلے اس کی تحریروں کا بغائر نظر مطالعہ کر لینا چاہیے۔

انجمن پنجاب کے مشاعرے

(غیر مطبوعہ کلام کی روشنی میں)

ڈاکٹر بیگم صفیہ تمنائی

انجمن پنجاب کے عنوانی مشاعروں کی بنیاد ۸؍ مئی ۱۸۷۴ء کو رکھی گئی۔ شام کے چھ بجے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام سلشا سبھا کے مکان میں اس مشاعرے کا پہلا جلسہ جسے "افتتاحیہ" کہنا زیادہ مناسب ہے منعقد ہوا جس میں کرنل ہالرائیڈ، جسٹس بلنو، جج چیف کورٹ مسٹر تھارنٹن، سکریٹری پنجاب گورنمنٹ کرنل میکلیگس، مسٹر ٹیک کمشنر اور مسٹر فنسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور، نواب عبدالمجید خاں، فقیر سید قمرالدین وغیرہ تھے۔ جلسے کے صدر جسٹس بولنو تھے۔

سب سے پہلے مولانا آزاد نے اُردو شاعری میں انقلاب برپا کرنے کی تجویز پیش کی اور اپنی نظم[1] "شام کی آمد اور رات کی کیفیت" سنائی۔ اور آئندہ مشاعرے کے لئے عنوان "برکھا رت" تجویز ہوا۔

پہلا مشاعرہ تیس مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے کے متعلق صرف دو شعرا کے نام ملتے ہیں۔ آزاد اور حالی۔ دوسرے مشاعرے کے لیے عنوان "زمستان" دے دیا گیا۔ پنڈت کیفی نے اپنے مضمون "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" میں اس مشاعرے کا تفصیلی حال لکھا ہے[2] ان کے بقول اس مشاعرے میں نو شعرا شریک تھے۔

"شاہ انور حسین ہما، مولوی مرزا اشرف بیگ خان اشرف، منشی الٰہی بخش رفیق، مولانا آزاد، مولوی محمد منعم علی رئیس جگراؤں، مولوی عمو جان ولی، مولوی قادر بخش، مولوی عطاء اللہ اور مولوی علاء الدین محمد کاشمیری۔"

۳۔ تیسرا مشاعرہ منعقدہ ۳؍ اگست ۱۸۷۴ء مطبوعہ ضمیمہ نمبر ۲، ماہ جولائی، بعنوان "امید"۔

اس مشاعرے میں نو شعرائے کرام نے حصہ لیا:

"مولوی عمو جان ولی، مولوی الطاف حسین حالی، محمد مرزا بیگ، میرزا محمد عبداللہ بیگ۔ مرزا محمود بیگ راحت۔ مولوی محمد حسین آزاد مرزا اشرف بیگ۔ شاہ انور حسین ہما۔ مولوی عطاء اللہ خان عطا اور شیخ الٰہی بخش رفیق۔"

۴۔ چوتھا مشاعرہ یکم ستمبر ۱۸۷۴ء مطبوعہ ضمیمہ ماہ اگست نمبر ۳، "حب وطن" کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں ۱۲ شعرائے کرام نے حصہ لیا:۔

"مولوی عمو جان ولی، پنڈت کرشن لال طالب، ملا گل محمد عالی، مفتی امام بخش (رئیس بٹالہ، فارسی) انور حسین ہما۔ شیخ الٰہی بخش رفیق، بصر رام داس قابل (فارسی) مولوی عطاء اللہ خان عطا، منشی علاء الدین صافی، لالہ گنڈا مل، سید اصغر علی حقیر لکھنوی، مولوی محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی۔

---

[1] نظم آزاد میں اس مثنوی کا نام "مثنوی موسوم بہ شب قدر" لکھا ہے۔

[2] شائع شدہ منشورات۔

۵۔ پانچواں مشاعرہ ۹ ر اکتوبر ۱۸۷۴ء میں منعقد ہوا جس کی روئداد ضمیمہ ماہ ستمبر ۷۴ء میں شائع ہوئی ۔ اس کا عنوان "امن" تھا ۔ اس مشاعرے میں حصہ لینے والے شعرا مندرجہ ذیل ہیں :

"منشی لچھمن داس برہم ، مولوی گل محمد عالی ، مولوی شاہ محمد صادق الحسین شریف (مہتمم اخبار "طلسم حیرت" ، مدراس) مفتی امام بخش ، مصر رام داس قابل ، (فارسی) ، مولوی محمد حسین آزاد ، سید اصغر علی حقیر اور مولوی سلطان علاء الدین صافی ، مولوی عطا اللہ خاں عطا ، اور مولوی نتھو جان ولی ۔"

۶۔ چھٹا مشاعرہ ۱۴ ر نومبر ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا جس کا عنوان "انصاف" تھا اور جس کی کارروائی ضمیمہ ماہ اکتوبر نمبر ۵ میں شائع ہوئی ۔ اس مشاعرے میں مندرجہ ذیل شعرا شریک تھے :۔

"مولوی فصیح الدین رنج ، مولوی محمد شریف (مہتمم اخبار "طلسم حیرت" مدراس) ، مصر رام داس قابل ، (فارسی) منشی لچھمن داس برہم ، میر انور حسین ہما ، منشی اصغر علی حقیر ، ملا گل محمد عالی ، منشی شیخ الٰہی بخش رفیق ، مفتی امام بخش (رئیس بٹالہ ، فارسی) مولوی عطا اللہ خاں عطا ، خواجہ الطاف حسین حالی ، مولوی محمد حسین آزاد اور پنڈت کرشن لال ۔"

۷۔ ساتواں مشاعرہ منعقدہ ۱۹ ر دسمبر ۱۸۷۴ء ضمیمہ ماہ نومبر و دسمبر ، ۷۴ء ، بعنوان "مروت" ۔ اس مشاعرے میں حصہ لینے والے شعرا مندرجہ ذیل ہیں :

"ملا گل محمد عالی ، مولوی سلطان علاء الدین ، مولوی محمد شریف ، منشی لچھمن داس برہم ، مصر رام داس قابل (فارسی) مولوی عطا اللہ خاں عطا ، شیخ الٰہی بخش (رئیس بٹالہ) سید اصغر علی حقیر ، مولوی نتھو جان ولی ، پنڈت کرشن لال طالب ، مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد سعید ۔"

۸۔ آٹھواں مشاعرہ منعقدہ ۳۰ ر جنوری ۱۸۷۵ء ضمیمہ ماہ جنوری نمبر ۷ ، بعنوان "قناعت" اس مشاعرے میں یہ شعرا شریک ہوئے :

"ڈاکٹر لچھمن داس برہم ، ملا گل محمد عالی ، مولوی سلطان علاء الدین صافی ، لالہ تارا چند (حلوائی) ، لالہ دین دیال عاجز (طالب علم) شیخ مولا بخش بلند ، جوالا سہائے کائستھ خورم (طالب علم جماعت ہشتم) ، مصر رام داس قابل (فارسی) میاں محمد حیات فیض ، میر انور حسین ہما ، مولوی عطا اللہ خاں عطا ، شیخ الٰہی بخش رفیق ، سید اصغر علی حقیر ، مفتی امام بخش ، مولوی محمد سعید ، مولوی محمد حسین آزاد اور پنڈت جواہر لال ۔"

۹۔ نواں مشاعرہ "تہذیب" کے عنوان سے منعقد ہوا ۔ ۱۲ ر مارچ ، ۱۸۷۵ء اس مشاعرے کی تفصیلات فراہم نہ ہو سکیں ۔

۱۰۔ دسواں مشاعرہ "اخلاق" کے عنوان سے تھا لیکن اس کے کوائف نہ مل سکے ۔ شعرا میں صرف دو نام ہیں فیض اور آزاد ۔

بہر حال ان مشاعروں کو کسی نہ کسی طور ختم ہونا ہی تھا ۔ ان کی ابتدا حکومت وقت کے اشارے سے ہوئی تھی ۔ خود حاکمین وقت کو ان مشاعروں کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا ۔ گورنر جنرل نے برصغیر میں اور خاص طور پر انجمن پنجاب کی سرپرستی کی ۔ انجمن کی کوششوں سے اورینٹیل کالج قائم ہونے کی زبردست جدوجہد ہو رہی تھی ۔ جس میں ڈاکٹر لائٹنر پیش پیش تھے ۔ اس کالج کو یونیورسٹی کا مرتبہ دینے کی جو تجویزیں اور سفارشات ہوئیں ان پر گورنر جنرل نے ڈاکٹر لائٹنر کو تہدیدی خط لکھا ۔ دوسری وجہ یہ کہ خود

وہ شعرا جو مشاعروں میں شریک ہوتے تھے انھیں مالی امداد کی توقع تھی۔ اگر مشاعروں کے قصیدوں اور بعض نظموں پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ شعرا کسی نہ کسی خاص توجہ کے متمنی تھے لیکن شعرا کو پندرہ و بیس روپے فی نظم مل جاتے تھے۔ داد و دہش کا انداز ان شعرا کے لیے بالکل نیا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ جس طرح زمانۂ قدیم میں شعرا کو جاگیروں اور خلعتوں سے نوازا جاتا تھا اس طرح یہ حکومت بھی اسی داد و دہش اور بخشش کا مظاہرہ کرے گی۔ تیسرے یہ کہ آخری مشاعرے میں اور اس کے علاوہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو نظم میں طالب علموں نے بھی دلچسپی لینا شروع کر دی تھی جو کالج میں پڑھ رہے تھے اور زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ پر ان کی نظر تھی۔ غالب کے شاگردوں اور لکھنؤی شعرا کو یہ بات ناگوار گزری اگرچہ وہ اردو نظم کے طرحی مشاعروں میں شریک تھے لیکن اس کے اس حسن انجام کا ان کو اندازہ نہ تھا۔ جس کا اندازہ طلبا مشاعرے میں کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت وقت سے مطابقت کے خیال سے اہلِ ذوق جیسے کہ تارا چند حلوائی تھے ان کا اور ان جیسے شعرا کی ان مشاعروں میں شرکت لکھنوی اور دہلوی شعرا جنھوں نے اپنے استادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں برداشت نہ کر سکے اور ان کے برابر بیٹھ کر اپنا کلام سنانا ہتک سمجھا۔ اس کے علاوہ ان مشاعروں میں حکومت وقت کے خلاف بھی اشعار پڑھے گئے۔ غدر کے قصے دہرائے گئے۔ رمز و کنایہ میں امن، حب وطن، قناعت کی سرپرستی کرنے والے انگریزوں پر یہ شعرا ایک طرف تو بھروسہ نہ کر سکے دوسرے ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید نے ذریعہ تعلیم اردو کی مخالفت کی۔ تہذیب الاخلاق اپنا کام کر رہا تھا۔ اردو دانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا اس کے علاوہ حالی جیسے بزرگ بھی سرسید کے ساتھ ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ دوسری طرف ذاتی پرخاش کی بنا پر اکثر شعرا مولانا آزاد سے معاندانہ رویہ اختیار کرنے لگے اور مولانا آزاد تھے کہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اردو شاعری کو نئی شاہراہ پر ڈال دیا جائے لہٰذا تنہا ہی مقابلہ کرتے رہے۔ ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے کہ ڈیوک آف ونڈسر کے آنے کی خبر تھی ان کی پیشوائی اور دلی دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لئے لوگ دہلی کی طرف دوڑ پڑے۔ اور پھر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ڈاکٹر لائٹنر کو مستشرق ہوتے اور قدیم و جدید علوم کے احیا کی سزا میں خطابات یا خاص تمغہ سے سرفراز نہیں کیا گیا جس کی شکایت اخباروں میں کی گئی۔ غریب اور رئیس عزت دار شاعروں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ کنارہ کش ہو جائیں۔ اور اس طرح ان مشاعروں کا خاتمہ ہو گیا۔

ورنہ نہ تو حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان ایسے تھے کہ وہ زندگی بھر آزاد سے پرخاش رکھتے اور نہ ہی آزاد باوجود اپنی تنک مزاجی کے ایسے کم ظرف تھے کہ ایسے عظیم مقصد سے منہ موڑ لیتے۔ ڈاکٹر لائٹنر کی بیماری، ان سے سنین اسلام کے سلسلے میں پرخاش، عالم بیٹی کا انتقال اور جاسوسی کا راز اپنے سینے میں دفن کئے آخر وہ شاعری جیسے نازک صنف سے علیحدہ ہو گئے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار نثر پر صرف کر دیا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے: "کہ انجمن پنجاب کو ان مشاعروں سے بنس نہیں تھا" حالاں کہ انجمن پنجاب کے ارکین ہی نے ان مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ پہلے سکشا سبھا اور پھر انجمن کے ہال میں یہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ ان مشاعروں کے علاوہ اخبار انجمن پنجاب مشاعروں کے زمانے میں علیحدہ ضمیمہ شائع کر رہا تھا جو گلدستہ کے نام سے مشہور ہیں اور دوسری ادبی نشستوں کی روئداد جو ہر ہفتہ منعقد ہوتی تھیں انجمن قصور کے رسالے میں شائع ہوتی تھی۔ لہٰذا انجمن پنجاب

سے اور مشاعروں کو علیحدہ تصور نہیں کیا جاسکتا ۔

مشاعروں کی روئداد

انجمن پنجاب کے عنوانی مشاعروں نے جدید اُردو شاعری کے لیے ایک ماحول پیدا کیا ۔ یہ محض چند ذہنوں کی اختراع نہیں تھی بلکہ سیاسی اور سماجی بدلتے ہوئے حالات کے احساس وشعور نے اسے پیدا کیا تھا ۔ یہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ایک کوشش تھی ۔ جس کو زندگی میں پیدا ہونے والے حالات نے وقت کی آواز بنادیا تھا ۔ آزاد کے ساتھ حالی بھی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پیش پیش تھے ۔ انہوں نے لکھا ہے :

> "۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق تھا اور لاہور میں مقیم تھا ۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے "انجمن پنجاب" نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا ۔ . . . . اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی مشاعروں کا دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہوسکے وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے . . . . جدت پسند طبقوں پر جس قدر مغربی انشا پردازی کی لے اب تک کھلی تھی وہی ان کو لے اڑی ۔ بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہنہ مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے ۔ اگرچہ یہ صحبت مدت تک جمی رہی ۔ راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بسبب ناموافق آب وہوا کے لاہور سے تبدیل ہوکر دہلی چلا آیا ۔ مجھے مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت تک کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے ۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں جیسی کہ اُردو ہے ہو بھی نہیں سکتا ۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو اور زیادہ مستحکم کردیا ۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جاسکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عائد ہو . . . .[1]"

حالی کے یہ خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ انھیں "انجمن پنجاب" کے مشاعروں سے نسبت تھی وہ خود اس تحریک میں شریک تھے لیکن وہ مغربی شاعری کے تتبع کے قائل نہیں تھے ۔ انہیں اپنی شعری روایات عزیز تھیں ۔ اس لئے انھوں نے نئے اثرات قبول کرنے اور نئی تحریک میں شامل ہونے کے باوجود اپنی روایات سے چشم پوشی نہیں کی ۔ یہ صورتِ حال ان کے صحیح فن کارانہ اور صحت مند تنقیدی شعور پر دلالت کرتی ہے ۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ "انجمن پنجاب" کے ہاتھوں جس جدید شاعری کا آغاز ہُوا اس میں انتہاپسندی شامل نہ ہوسکی ۔ توازن اور اعتدال کا دامن اس نے اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ وہ ہمیشہ اپنے حدود ہی میں

---

[1] عبادت بریلوی، ڈاکٹر ۔ "جدید اُردو شاعری" ۔ "اُردو دُنیا"، کراچی ص ۱۴۱ ۔

رہی۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری کو جدت سے ہمکنار کرنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔

"انجمن پنجاب" کے مشاعروں میں آزاد اور حالی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانے میں آزاد اور حالی نے بعض اہم نظمیں لکھیں۔ حالی کی اس زمانے کی اپنی نظمیں اردو شاعری کے اس نئے موڑ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ان کے موضوعات نئے ہیں۔ ان میں ایک نیا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ ایک نئے شعور کی ترجمانی ہیں۔ ان میں نئے حالات کی عکاسی بھی ملتی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں ایک نیا انداز نمایاں ہے۔ یہ ایک نئے اسلوب کی حامل ہیں۔ ان کی ہئیت اور صورت بھی نئی ہے۔ ایسی نظمیں اس سے قبل اردو میں نہیں لکھی گئیں۔ اسی لئے جدید شاعری میں آج بھی انھیں سنگ میل کا مرتبہ حاصل ہے۔

انجمن کے ان مشاعروں نے اس بات کا احساس دلا دیا کہ اب ہمیں شاعری کو نئے راستوں پر ڈالنا ہوگا افادیت اور علمیت کا جوش اس میں پیدا کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے غزل کافی نہیں۔ چنانچہ نئے اصناف کی طرف بھی انہوں نے توجہ دلائی۔ مغربی اثرات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے تحریک کی شکل عطا کی۔ ان میں مبالغہ، انفعالیت، حزن و یاس اور قنوطیت کے بجائے حقیقت واقفیت۔ زندگی اور جولانی، رجائیت اور مسرت کو پیش کیا جانے لگا اور لوگوں کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ شاعری اب محض تفنن طبع کے لئے نہیں بلکہ اسے عظیم مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی ان مشاعروں کی بڑی اہمیت ہے، برصغیر کے سیاسی اور سماجی حالات پچھلے[1] صفحات میں درج کئے گئے ہیں اس کی تفصیل کی اس وقت ضرورت نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل ہند کے سامنے از سر نو زندگی شروع کرنے کے لئے صرف دو صورتیں باقی تھیں۔ یا تو وہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے انگریزوں سے نبرد آزما ہوتے یا پھر نئے حالات سے مطابقت پیدا کر لیتے۔ اہل ہند مطابقت کے لئے کمربستہ ہو چکے تھے۔ "انجمن پنجاب" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس نے نظم و نثر کے ذریعہ عوام کے اذہان کو اس مطابقت کے لیے آمادہ کر دیا۔

دوسری طرف انگریز خود تعلیم کو عام کرنے کے لئے نئے نصاب تیار کرنے کی فکر میں تھے۔ اس کا مقصد چاہے کچھ ہو لیکن انہوں نے انجمن کی سرپرستی میں ان مشاعروں کے ذریعہ حصۂ نظم کو استوار کر کے نئے نئے ذہنوں کو نئی راہوں پر ڈال دیا۔ دوسری طرف سرسید خود بھی اردو کے زبردست حامیوں میں سے تھے انہوں نے بھی اپنے خطوط کے ذریعہ انجمن کے مشاعروں اور انجمن کی کارروائیوں کو سراہا۔

سرسید کی علمی تحریک اگرچہ شروع ہو چکی تھی لیکن اس نے قوت اسی وقت حاصل کی جب انجمن کی کارکردگی نے یہ ماحول تیار کیا۔ آزاد کے علاوہ عناصر خمسہ نے جو کچھ تبدیلیاں اردو ادب میں پیدا کیں اگر غور کیا جائے تو ان کے ذہن یقیناً انجمن کے ان مشاعروں سے اور زیادہ ہموار ہو گئے۔ اور ادب کو افادیت کے تصور سے آشنا کرنے والے یہی لوگ تھے۔ ان میں حالی کا نام سب سے سرفہرست ہے جو مشاعروں کی افادیت سے مکمل طور پر آشنا ہوئے۔ اگرچہ وہ خود پہلے سے مبالغہ آرائی اور گل و بلبل کے افسانوں سے بیزار تھے۔ لیکن مشاعروں نے ان کے خیالات میں ایسا نکھار پیدا کیا کہ مدوجزر اسلام جیسی معرکتہ الآرا مسدس معرض وجود میں آئی۔

---

[1] یہ مضمون، طویل مقالے کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے یہاں پر پچھلے صفحات کا ذکر آیا ہے۔ (ادارہ)

لاہور کے قیام کے زمانے ہی سے حالی ترجموں کے ذریعہ انگریزی خیالات اور اُردو میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس کر چکے تھے لہٰذا مقدمہ شعر و شاعری میں یورپی ناقدین کا ذکر انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ سر سید کے ساتھ ان کی تحریک میں شامل ہو کر انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ جن کی مثال اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔ ان کی تحریر میں یہ دلائل اور افادیت انجمن کا رہین منت ہے۔

اسی طرح شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد سر سید کی سرکردگی میں اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کر گئے۔ اگر ان کڑیوں کو ملایا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انجمن کے ان مقصدی مشاعروں نے ان کے ذہنوں کو براہ راست متاثر کیا اور اردو ادب میں انھوں نے اپنے لیے ان نئی راہوں کا تعین کیا جن کے ذریعہ برصغیر میں اور خاص طور پر مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو گئی۔ انہوں نے سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کر کے زندگی کے لیے اصول مرتب کئے۔

انگریزوں نے اس موقعہ پر پوری پوری مفاہمت کی انجمن پنجاب "بن کر نہ رہ گئی" ڈاکٹر ولنر اور ڈاکٹر لائٹنر جیسے مستشرقین نے قدیم اور جدید ادب کو ہم آہنگ کرنے میں ادبا کا پورا پورا ساتھ دیا۔ خاص طور پر ڈاکٹر لائٹنر نے اس کے لیے حکومت وقت سے اتنی جد و جہد کی کہ ان کو تہدیدی خط لکھے گئے۔

انجمن کے ان مشاعروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں وہ انگریز شریک تھے جن کا تعلق شعبۂ تعلیم سے تھا۔ لہٰذا تعلیم اور نصابی کتب کے سلسلے میں ان لوگوں نے انجمن کی پوری پوری حمایت کی۔ یہ مشاعرے نصابی کتب کے حصۂ نظم کو مرتب کرنے کے سلسلے میں منعقد کئے گئے تھے لیکن اس کے اثرات بڑے دور رس نکلے۔ پورے برصغیر میں مقصدی نظم گوئی رواج پا گئی۔ جس میں ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

شبلی اگرچہ حالی کے مرتبہ کے شاعر نہیں لیکن انہوں نے بھی مختلف سیاسی، سماجی اور فنی اور تہذیبی موضوعات پر قلم اٹھایا ان کی تمام نظمیں ایک مخصوص مقصد سے افادیت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں جن میں اجتماعی شعور ملتا ہے۔

(۲)

انجمن پنجاب کے زیر اہتمام، کُل مشاعرے دس ہوئے۔ ذکر سات مشاعروں کا ملتا ہے۔ روئیداد اور تفصیل اُن مشاعروں کی بھی نایاب ہے۔ پاک و ہند کی تمام لائبریریاں چھان ڈالیں۔ انڈیا آفس لائبریری تک رسائی حاصل کی۔ مگر کہیں خاطر خواہ مواد نہ ملا۔ آٹھویں، نویں اور دسویں مشاعرے کا تو کہیں ذکر تک نہیں ملتا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے قلمی مسودات سے مجھے دیگر مشاعروں کے علاوہ آٹھویں، نویں اور دسویں مشاعرے کی روئیداد بھی ملی، جو پہلی بار پیش کی جا رہی ہے۔

"قناعت" آٹھواں مشاعرہ[1]

سب سے پہلے ڈاکٹر لچھمن داس برہم نے ۲۶ (چھبیس) اشعار کی نظم پڑھی اس نظم کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں (حمد)

---

[1] "ضمیمہ اخبار پنجاب" یعنی انجمن پنجاب کے مشاعرے لاہور: انجمن پنجاب پریس، بابت ماہ جنوری ۱۸۷۵ء، نمبر ۷۔

۱۴ اشعار ہیں اور دوسرے حصے میں بارہ۔ اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص چاہے وہ عالم ہو یا جاہل یہ جانتا ہے کہ ”قناعت“ کے بے شمار فائدے ہیں۔ اس دنیا میں جس نے قناعت کی وہ آسودہ حال رہا۔ اگر قناعت ہے تو عزت و آبرو بھی ہے جو قانع ہوتا ہے وہ دل کا غنی ہوتا ہے۔ اگر تیرا مقصد پورا نہ ہو تو قناعت اختیار کر دنیا کے دانشوروں کا یہی دستور رہا ہے۔ تو حتی المقدور کوشش کرتا رہ اور اس کا نتیجہ خدا پر چھوڑ، تو یقیناً کامیاب ہوگا۔

خدا نے تجھے جو مرتبہ جتنی عزت و دولت دی ہے اس پر قناعت کر جو شخص قناعت کرتا ہے تو اس کے دل میں حرص پیدا نہیں ہوتی۔ اگر تو دولت مند ہے اور قانع نہیں ہے تو پھر تجھ میں اور مفلس میں کوئی فرق نہیں۔

شاعر نے قناعت کی اہمیت، اس کی ضرورت اور اس کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ اکثر و بیشتر اشعار وزن میں نہیں۔ بہر حال آسان الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔

نمونہ کلام :-

قانع ہو دل اگر تو تیری آبرو رہے
ورنہ ہو بے قدر تو یہاں خوار در بدر
محتاج وہ نہیں جو قناعت شعار ہے
پر دل کا وہ غنی ہے نہ ہوے جو سیم و زر
مساعی ہو کوششوں سے یہاں رات دن کوئی
اور نخل آرزو کا رہے، پھر بھی بے ثمر
ہو جاوے آخرش کو وہ محروم ہر طرح
جز یاس اس کو آئے نہ کچھ چار سو نظر
تب دل سے وہ کرے جو ”قناعت“ کو گر قبول
فضل خدا سے جلد وہ ہو جاوے بہرہ ور

منعم اگر تجھے بھی یہی حرص و طمع ہو
مفلس مدام تو ہے ”قناعت“ اگر نہیں
اس کے چمن کو دیکھ سدا ہی بہار ہے
واقف نہیں خزاں سے کوئی شاخ اور شجر

ملا گل محمد عالی نے آٹھ اشعار پہلے قناعت کی تعریف میں سنائے اس کے بعد دو حکایتیں چوالیس[۴۴] اور بتیس[۳۲] اشعار کی سنائیں ابتدائی اشعار کا مطلب کچھ یوں ہے کہ جو شخص قناعت کرتا ہے وہ بے نیاز ہو جاتا ہے اور دارین میں سعادت حاصل ہوتی ہے۔ خدا قناعت کرنے والے سے خوش رہتا ہے۔ جسے قناعت کی مسرت میسر ہے وہ مفلسی کے غم سے دور رہتا ہے۔

اس کے بعد حاتم کی ایک کہانی نظم کی ہے۔ یہ کہانی کیا ہے دراصل حاتم اور ایک حریص کا طویل مکالمہ ہے۔ جس میں قناعت اور حرص کی تعریف اور خرابیاں بیان کی ہیں۔ آخر میں حاتم حریص کو قائل کر دیتا ہے کہ جتنا رزق، رزاق دیتا ہے اس پر اکتفا کرنا چاہیے وہ ہر شخص کو روزی بہم پہنچاتا ہے یہاں تک کہ ماں کے پیٹ میں بچے کا پیٹ بھی بھرتا ہے۔

دوسری حکایت بھی حاتم کی ہے کہ ایک شخص نے حاتم کو اپنے گھر مدعو کیا۔ حاتم نے تین شرائط پر اس کی دعوت قبول کی کہ جہاں میں چاہوں گا وہیں بیٹھوں گا اور اپنی مرضی سے کھانا کھاؤں گا اور تیسری شرط اس وقت بتاؤں گا جب تیرے گھر آؤں گا۔ اس نوجوان شخص نے حاتم کے علاوہ اور لوگوں کو بھی مدعو کیا۔ جب حاتم نوجوان کے گھر پہنچا تو دسترخوان کی صف میں سب سے آخر میں بیٹھا۔

میزبان نے احتجاج کیا تو حاتم نے اس کو شرط یاد دلائی وہ خاموش ہوگیا۔ جب کھانا شروع ہوا تو حاتم نے اپنی آستین سے جو کی روٹی نکالی اور خدا کا شکر کر کے اسے بڑی رغبت سے کھانے لگا۔ نوجوان نے پھر شکوہ کیا لیکن وہ دوسری شرط یاد کر کے اور حاتم کے قائل کرنے سے خاموش ہوگیا۔ کھانے کے بعد حاتم نے تین گرم تپتے ہوئے آگ پر سرخ کئے ہوئے توے منگوائے۔ انھیں برابر رکھوایا اور اطمینان سے ان پہ قدم رکھتا ہوا گزر گیا اور کہا کہ جو لوگ قناعت کرتے ہیں انھیں کبھی کسی قسم کا گزند نہیں پہنچتا۔

دونوں کہانیاں فرسودہ ہیں لیکن حتی الامکان آسان زبان میں کہانیاں نظم کی ہیں۔ پہلی کہانی کی ابتدا فارسی کے شعر سے کی ہے۔ اشعار کا کوئی معیار نہیں لیکن قناعت کی تعریف استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعہ کی ہے۔ اشعار میں توازن برقرار رکھنے کے لئے بیکار الفاظ بھی استعمال کئے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ کوشش قابل قدر ہے۔

نمونۂ کلام :-

قناعت کا جاں سے تو خواہاں ہو　　ترا دل نہ یارا پریشاں ہو
قناعت کی عشرت سے جو شاد ہو　　وہ زندان عسرت سے آزاد ہو
کہا اُس نے حاتم سے دے تو نشاں　　ترا رزق آتا ہے از آسماں
کہا اس نے روزی تو سن لے فتا　　فلک سے زمیں پہ بھیجتا خدا
سما سے سبھی کو ہے رزق عطا　　کہ آیا ہے قرآں میں فی السماء
یہ سن کر وہ تائب پشیماں ہوا　　نصیحت کا حاتم سے خواہاں ہوا
کہا اس کو حاتم نے اے ارجمند　　طمع کو نہ ہرگز کبھی کر پسند
قناعت دل و جاں سے کر اختیار　　قناعت کا طالب ہو لیل و نہار

اب مولوی علاء الدین صافی نے اکیس[۲۱] اشعار کی ایک نظم سنائی۔ "قناعت" کی تعریف میں کہتے ہیں کہ جو لوگ قناعت کرتے ہیں انھیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ حج کرنے کے لئے جو احرام باندھا جاتا ہے درحقیقت وہ جامۂ قناعت ہے۔ اسلام میں قانع کی بڑی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔

اس نظم کے بیشتر اشعار وزن میں نہیں عجیب و غریب تشبیہات ہیں لیکن یہ کوشش کہ آسان تر زبان میں نظم لکھی جائے پوری کی ہے۔ یہ نظم اس لیے قابل قدر ہے کہ موزوں طبع نہ ہوتے کے باوجود انہوں نے مشاعرے کے لیے نظم لکھی۔

نمونۂ کلام :

مانند کباب آگ پہ کیوں کر نہ جلیں وے　　جو سوز دلی سے کریں آرام "قناعت"
اس کاسہ فلک میں نہ رہے نام کو ذرا آب
گر کھینچے اگر تشنہ لب جام "قناعت"
یہ چشم گرو رکھ کے اگر کفر لیا مول　　منکر نہ ہوئے جو کو دیدۂ اسلام "قناعت"

یہ ملک قناعت کہ ہے توشۂ فقیراں   شاہاں بھی پسند کرتے ہیں ہم نامِ قناعت"

لالہ تارا چند تخلص بہ تارا حلوائی ہیں۔ حلوہ سوہن بناتے ہیں لیکن موزوں طبیعت رکھتے ہیں انہوں نے پچیس ۲۵ اشعار پر مبنی "قناعت" پر نظم سنائی۔ پچھلے مشاعروں میں یہ شریک نہیں تھے۔ شعر کہنے کی خداداد صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ "قناعت" کی تعریف میٹھے دل کش پیرائے میں کی ہے نہ کوئی داستان نہ مبالغہ۔ انہوں نے اپنی سادہ طبیعت کا بڑا سادگی سے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ان مشاعروں کی دلچسپی اور کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت خود تارا چند حلوائی ہیں۔ اردو شاعری کے اس جدید موڑ کے پیش نظر اس نظم میں غضب کی روانی ہے۔

نمونۂ کلام:۔

مۓ عشق میں کیوں نہ سرشار ہوں میں   ہے گل رنگ روئے نگارِ "قناعت"
نہ کیوں نیند آئے مجھے میٹھی میٹھی   ہے آرام کی جا کنارِ "قناعت"
قناعت خوش آئی ہمارے نبی کو   وہ بالا نہ کیوں ہو وقارِ "قناعت"
صبا خاک میری نہ برباد کرنا   جہاں میں میں ہوں خاکسارِ "قناعت"
جلو میں ہے عز و حشم جاہ و نصرت   چلے آتے ہیں شہسوارِ "قناعت"
فزوں کیوں نہ ہو اشک کی آبرو پھر   ہے اس چشم میں جوئے بارِ "قناعت"
"قناعت" کا دیکھا نہیں روئے زیبا   مگر ہوں میں امیدوارِ "قناعت"
سب اہلِ قناعت بہم ایک جا ہیں   نظر آ گئی لو قطارِ "قناعت"
رہا طوطیا ہو کے چشمِ فلک میں   اڑا جب زمیں سے غبارِ "قناعت"
پھنسا ہوں میں حلوہ سوہن بیچنے میں   دگر نہ دکھاؤں بہارِ "قناعت"
میں داخل ہوا آج اس انجمن میں   کھنچی میرے دل پہ حصارِ "قناعت"

لالہ دین دیال عاجز۔ طالب علم ہیں گورنمنٹ کالج لاہور کے، انہوں نے سینتیس (۳۷) اشعار پر مبنی ایک مثنوی پڑھی جس کا مطلب کچھ اس طرح ہے:

"کل رات جیسے ہی میری آنکھ لگی خواب میں دولت بیدار آئی۔ اس کے ساتھ بہت سے مونس و غم خوار تھے۔ میں نے اس کے سامنے سر جھکایا تو اس نے بڑی محبت سے کہا کہ آؤ تمہیں طلسماتِ جہاں کی سیر کرائیں۔ میں حیران تھا کہ شکل و شباہت سے تو یہ پری نظر آ رہی ہے مگر یہ ہے کون؟ میں نے بڑی جرأت سے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ "قناعت" کی پری ہے۔ سب لوگ شہزادی کے ساتھ ایک باغ میں پہنچے جہاں ایک حوض پانی سے بھرا تھا۔ اور اس کے کنارے ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ اس تخت پر وہ شہزادی جلوہ افروز ہوئی شہزادی نے مجھ سے پوچھا کہ تم کچھ سمجھے بھی؟ میں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا تو اس نے بتایا کہ یہ باغ "قناعت" ہے جہاں ہمیشہ بہار رہتی ہے۔ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو رضائے حق پر راضی ہیں جو لوگ حریص ہیں یہاں

ان کا نام و نشان بھی نہ پاؤ گے اور پھر میری آنکھ کھل گئی ۔"

یہ مثنوی ایک طالب علم کی ہے اس لئے قابلِ قدر ہے ۔ اگرچہ وہی قدیم انداز میں طویل استعارے میں "قناعت" کی تعریف کی ہے لیکن بڑی سادہ اور سہل زبان میں قصہ نظم کیا ہے ۔ بڑے خلوص اور سادگی سے "قناعت" کی تعریف کی ہے ۔ ان اشعار میں ثقیل الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے ۔ زبان کی صفائی اور سادگی نے نظم کو دل کش بنا دیا ہے ۔ چند اشعار وزن میں نہیں لیکن مشاعروں کے مقصد سے باخبر ہیں ۔

نمونہ کلام

خواب میں دولت بیدار سرہانے آئی   بخت خفتہ کو میرے گویا جگانے آئی
نظر لطف سے اس نے مجھے ممتاز کیا   اور بصد لطف زبان سے یہ وہیں فرمایا
آؤ عاجز تجھیں ہم سیر جہاں کی کروائیں   جو طلسمات اس جگہ وہ سارے دکھلائیں
میں کہ گردش سے زمانے کی بہ تنگ آیا تھا   اور نہ کچھ غم کے سوا آج تلک پایا تھا
اے ناداں قناعت کی یہ شہزادی ہے   اور دنیا کے لیے باعث آزادی ہے
یہ نہ ہوے تو جہاں حرص کے پھندے میں پھنسے
اور قیامت تلک اس قید میں ہر ناک گھسے
گل و غنچہ تو وہاں گو کہ بہت دیکھے تھے
مثل گل پر وہ ہتھیلی پہ نہ زر رکھتے تھے
سرو اس باغ میں جتنے تھے وہ آزاد تو تھے
سربلندی کی ہوا دل میں نہ وہ رکھتے تھے
میں کہ حیران تھا اور بھید نہ کچھ جانتا تھا
ہاتھ باندھے ہوئے تھا تخت کی اک سمت کھڑا
شاہزادی کی نظر اتنے میں جو مجھ پہ پڑی
نظر لطف سے اس طرح سے گویا وہ ہوئی
یہ وہ گلشن ہے کہ رہتی ہے سدا جس میں بہار
اور گلچیں کا خطر جس میں نہیں ہے زنہار

شیخ مولابخش متخلص بہ بلند نے پچیس ۲۵ اشعار کی نظم پڑھی ۔ "قناعت" کے لیے بتایا کہ اس کا مرتبہ عرش سے بھی بلند ہے ۔ اگر مجھے "قناعت" کا مقام نظر آجائے تو وہیں جا کر رہ جاؤں ۔ اس میں جنت کی خوشبو ہے ۔ میں نے جام قناعت پیا ہے لہذا اب میرے سامنے جام جم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی ۔ اولیا کو "قناعت" پسند تھی ۔ اگر لوگ "قناعت" کی شان سے واقف ہو جائیں تو مروت اور انصاف کو آبرو مل جائے ۔

اس نظم میں شاعر نے "قناعت" کی تعریف میں قدیم تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں بعض جگہ عجیب و غریب اصطلاحیں نظم کی ہیں جن کی وجہ سے اصل مقصد سے دور جا پڑے ہیں۔ لیکن سابق کے مقابلے میں آسان گوئی کی کوشش ضرور کی ہے۔

نمونہ کلام :-

اڑے ہوش پریوں کے بھی قاف میں پھر   جو اک بار دیکھا خرام "قناعت"
سماں کیوں نہ روزوں رمضان کو ہو   کہ رکھتے ہیں ہم اب صیام "قناعت"
ازل سے ہے مرغوب مجھ کو "قناعت"   نہ کیوں کر ہوں میں نیک نام "قناعت"
کبھی دل میں رکھتا ہے گہ آسماں پر   نہیں ایک جا پر قیام "قناعت"
شتر غمزے بھولے ہوئے نام قانع   پڑی ناک میں جب زمام "قناعت"

جوالا سہائے کائستھ خویم آٹھویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ انہوں نے پہلے چھبے اشعار "قناعت" کی تعریف میں پڑھے پھر سولہ اشعار میں ایک چھوٹی سی کہانی نظم کی ہے۔ آخر میں طالب علموں کے لئے دعا مانگی ہے۔

ابتدائی چھے اشعار میں خدا سے دعا کی ہے کہ مجھے قناعت سے بہرہ ور کر۔ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ دو بادشاہ تھے۔ ایک بادشاہ "قناعت" پسند تھا اور رعایا اس کی دعا دار تھی۔ دوسرا بادشاہ حریص تھا اور رعیت اس کے لالچ کے سبب سے بہت پریشان تھی آخر ایک دن دونوں کی فوجوں میں جنگ ہوئی اور حریص بادشاہ کی فوج نے فیصلہ کیا کہ قناعت پسند بادشاہ کو ہم اپنا بادشاہ بنائیں گے۔

اس نونہال طالب علم کی کہانی بچوں کی طرح معصوم ہے۔ لیکن ان کے خیالات قابلِ قدر ہیں کہ عوام خود قناعت پسند تھے اور انھوں نے حریص بادشاہ کو معزول کیا۔ ان کے لہجے میں بچوں کی سی سادگی اور بے تکلفی ہے طبیعت موزوں ہے بعض اشعار اچھے ہیں۔

نمونہ کلام :

خدایا مجھے کر "قناعت" گزیں   بدرگاہ تو شکر اے لایزال
الٰہا تو کر مجھ کو رطب اللساں   "قناعت" کی بابت کروں کچھ بیاں
جو مردم "قناعت" ہیں بہرہ ور   وہ ہیں صاحب جاہ علم و ہنر
کوئی تھا تونگر کسی شہر میں   "قناعت" سے مشہور تھا دہر میں
وہ اس شہر کے لوگوں کی جان تھا   "قناعت" کی اس شہر میں کان تھا
کسی جا پہ تھا دوسرا اک امیر   کہ تھا حرص کی قید میں وہ اسیر
جو لشکر تھا اس کا وہ بے حال تھا   رعیت کا اس کی تباہ حال تھا
جو دنیا میں ہیں بی اے یا ایم اے   "قناعت" کی دولت تو ان کو بھی دے

مصر رام داس نے حسبِ عادت فارسی میں پہلے چونتیس (۳۴) اشعار کے مستزاد میں قناعت کی تعریف کی ہے پھر تینتالیس(۴۳) اشعار میں ایک مثنوی سنائی۔

ابتدا میں کہتے ہیں کہ قناعت کرنے والے بے نیاز ہوتے ہیں انھیں کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ اگر حریص بن کر دولت حاصل بھی کرلی تو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے قناعت کرنے والوں میں جو خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور حریص جن تکلیفوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انھیں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثنوی میں سکندر کی کہانی نظم کی ہے کہ جب سکندر دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلا تو ممالک فتح کرتے ہوئے چین کی سرحد تک جا پہنچا۔ جب فوجوں نے ڈیرہ ڈالا تو دیوار چین کا دروازہ کھلا اور خاقان چین کے سفیر چار تحفے لے کر سکندر کے پاس آئے۔ عمدہ کھانے، عمدہ لباس، غلام اور کنیزیں۔ سکندر نے جب ان تحائف کا مقصد پوچھا تو خاقان کے سفیر نے کہا کہ مردوں کو ان ہی چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ میں نے پیش کر دی ہیں۔ تو ان ہی چیزوں پر "قناعت" کر۔

افسوس کہ مصر رام داس نے اردو کو قابل اعتنا نہ سمجھا ورنہ ان میں زبردست شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ انھوں نے فارسی کی نظم میں انگریزی اور عربی الفاظ استعمال کئے ہیں حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ان کے مترادف الفاظ لکھ سکتے تھے اور نئے مرکبات بنا سکتے تھے۔ انہوں نے عدالت کی مروجہ اصطلاحات مثلاً مختار، وکیل کچہری کے ساتھ ڈسمس کرنا، ڈگری چالان جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

نمونہ کلام:۔

خواہندہ فقیر ست بچشم ہمہ مردم   ہر چند امیر ست
فرسند گدا را ہمہ جا ہست مدارا   با عزت و جاہے
در حرص و ہوا ود ر جوانی بسر آمد   دز شرم گناہان

با موئے سفید ست شدن روز جزا را   با روئے سیاہی

یہاں محمد حیات فیض نے چوبیس ۲۴ اشعار کی نظم پڑھی۔ قناعت کی تعریف ہر طرح کی ہے۔ فیض کی یہ نظم پچھلی نظموں سے بہتر ہے۔ تشبیہات اور محاورات برمحل استعمال کئے ہیں۔ اگرچہ بعض اشعار بچگانہ معلوم ہوتے ہیں لیکن اکثر جگہ خیالات مربوط اور نظم میں روانی ہے۔ غالب سے متاثر ہیں۔ روشن نفساں، آئینہ داران محبت جیسے مرکبات اچھی طرح نباہے ہیں۔

نمونہ کلام:۔

شاید کہ کوئی آ کے سخی دان کرے گا   بیٹھے ہیں بچھائے ہوئے دامانِ قناعت"
کیوں کر وہ بھلا آیت والصبر کو بھولیں   جو لوگ پڑھا کرتے ہیں قرآن" قناعت"
حیران نہیں ہوتے کسی وجہ سے ہرگز   اے اہل ہوس آئینہ داران" قناعت"

میر انور حسین ہما نے ۲۷ اشعار کی نظم سنائی۔ حسب روایت "قناعت" کی تعریف طرح طرح کی تشبیہیں دے دے کر کی ہے اور اہلِ قناعت کے اوصاف بیان کئے ہیں اور ہوس کی خرابیاں بیان کی ہیں۔ مشکل الفاظ، استعاروں سے پرہیز کیا ہے۔ نظم سطحی ہے لیکن آسان زبان میں مقصد بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض اشعار وزن میں نہیں صرف چند اشعار میں فارسی مرکبات لاتے ہیں چند اشعار بے معنی ہیں۔

نمونہ کلام:۔

جز اہل "قناعت" ملا ہے کسی کو   سراغ "قناعت" نشان "قناعت"

شکیب و توکل میں ہے سود لیکن   ہرا و ہوس ہے زبانِ "قناعت"
درِ صبر و لعل توکل سے خالی   نہ بحرِ غنا ہے نہ کانِ "قناعت"
حریمِ ہوس سے ملا کچھ نہ بس اب   سر اپنا ہے اور آستانِ "قناعت"
غم و اندوہ ہوتا ہے روشن نفس کب   جو درپیش ہو دودمانِ "قناعت"
بجز صبرِ اہلِ دل پہ سویدا   نہیں ہوتا رازِ نہانِ "قناعت"

مولوی عطا اللہ صاحب عطاؔ نے چونتیس اشعار کی نظم سنائی ۔ اس میں نصیحت بھی ہے ۔ اہلِ قناعت کو توقیر، اہلِ ہوس کی مذمت، ہم عصر شاعروں پر چشمک، حاکموں پر طعن اور ان سے ہمدردی کی التجا سب کچھ ہے ۔ عطاؔ صاحب میں شاعرانہ صلاحیتیں تھیں ۔ زبان اگرچہ مشکل ہے عربی و فارسی الفاظ کی بہتات ہے ۔ کہیں کہیں اشعار میں سکتہ پڑتا ہے ۔ بعض اشعار وزن میں نہیں لیکن بعض اشعار بہت رواں اور موزوں ہیں جن میں شاعرانہ حسن موجود ہے ۔ اگر اس نظم میں بعض سقم نہ ہوتے تو اچھی نظموں میں اس کا شمار ہوتا ۔ ان کی طبیعت مشکل پسندی پر مائل ہے لیکن آسان طرزِ بیان کی کوشش ضرور ہے ۔

نمونۂ کلام :

اے اہلِ ثروت ہے زیبِ زینت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
اے اہلِ دولت ہے شان و شوکت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
حاجت نہیں ہے ڈبل روٹی کی ہم کو ملی ہے نانِ "قناعت"
کافی ہے بالکل یہ نانِ نعمت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
کارِ سخاوت کس کی ہے طاقت فعلِ قناعت ہے کس کی قدرت
اس عہد میں بھی ہے یہ غنیمت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
منعم نے پائی حاتم کی خصلت ممسک پھنسا ہے در رنج و عسرت
روزِ ازل سے ٹھیری یہ قسمت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
قانع کو ہر جا ہوتی ہے عزت طالع ہمیشہ پاتا ہے ذلت
عالم کو جاہل سے رہتی ہے نفرت دانا کی صحبت سے ہے دل کو راحت
گھر گھر خزینہ ہر جا دفینہ سینہ میں کینہ قاروں کی خصلت
ہاں ہے تو یہ ہے حاتم کی سیرت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"
یہ چرخ غدار ہے سفلہ پرور اشراف کا ہے حال اس سے ابتر
عالم کو کرتا ہے بے قدر یکسر جاہل کو بخشے ہم سیم و ہم زر
کھاتا ہے غم کو پیتا لہو کو آب و خورش ہے دانا کی اکثر
الحمد للہ ہے یہ طراوت تم کو سخاوت ہم کو "قناعت"

شیخ الٰہی بخش رفیق نے ایک سو ستائیس اشعار کی مثنوی اور سترہ اشعار کی ایک غزل سنائی۔ ابتدا منظر نگاری سے کی ہے۔ رات کا سماں اور صبح کی صباحت کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے اس کے بعد طویل استعارے میں قناعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے سحر دیکھا تھا کہ نور کا ایک دریا بہتا ہوا نظر آیا۔ جس کے کنارے دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص اس دریا میں ہاتھ دھو رہا تھا اور دوسرا شخص بے حد پیاسا تھا جو سیکڑوں جام بھر بھر کر پی رہا تھا لیکن اس کی تشنگی رفع نہیں ہوتی تھی۔ پہلا شخص جو ہاتھ دھو رہا تھا وہ دراصل زمانے سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس کا لقب قناعت تھا۔ ریاضت اور فقر کی شان اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بظاہر غم گیں تھا لیکن دل میں نور تھا۔ دوسرے شخص کو لوگ حرص کا پتلا کہتے تھے۔ قناعت نے جو اسے دیکھا کہ اس کا دل بس میں نہیں اور یہ دریائے ہوس میں غرق ہو رہا ہے تو اس سے کہا کہ بس کر کہیں دانۂ گندم کی طرح تیرا پیٹ نہ پھٹ جائے۔ تو فلک کی طرح ظالم ہے جس کا پیٹ ستاروں سے بھرا ہے اور وہ گردش کرتا رہتا ہے قیامت تک اس کا پیٹ نہ بھرے گا۔ حرص کے پتلے نے کہا کہ خدا نے ہاتھ کمانے اور کھانے کے لیے دیئے ہیں۔ تم سوکھ کر گور کے قریب پہنچ گئے ہو۔ یہ فاقہ کشی تمہاری جان لے لے گی۔ ہمت تمہارے سامنے کھڑی روتی ہے۔ تب قناعت نے کہا حق کے لیے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میرا دوست اخلاق ہے جس نے پیار و محبت سے ہر ایک کو اپنا لیا ہے وہ کسی کو رنجیدہ نہیں ہونے دیتا۔ وہ کدورت سے دلوں کو صاف کرتا ہے اور صبر پہ مائل کرتا ہے۔ لوگ سکھ چین کی نیند سوتے ہیں لیکن زر کے بندے پیسے کے لالچ میں نیند خراب کرتے ہیں اور قسمت سے زیادہ طلب کرتے ہیں۔ حرص کو بہت غصہ آیا اس نے کہا کوشش کو خدا نے بڑی اہمیت دی ہے وہ حیلے سے رزق دیتا ہے اور بہانے سے موت۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ دفعتاً دریا جوش میں آیا اور ایک صدف اوپر آیا اس نے کہا کہ میں پورے سال ابر نیساں کا منتظر رہتا تھا اور خدا سے امیدوار تھا پیاس سے بے چین کہ اتنے میں گھٹا جھوم کے آئی اور صرف ایک قطرہ مجھے ملا لہٰذا دیکھ اس بوند سے دُرِ شہوار ملا ہے۔ مکڑی اپنے جالے میں منتظر رہتی ہے رزاق اس کو رزق پہنچاتا ہے۔

رفیق صاحب نے قناعت اور ہوس کا مکالمہ نظم بند کیا ہے۔ قناعت کی دلیلیں بڑی جاندار ہیں لیکن ہوس میں کوشش کو شامل کر کے انصاف سے کام نہیں لیا۔ اشعار سطحی تو نہیں لیکن فکر کا عنصر کم ہے نظم میں روانی ہے منظر نگاری بڑی دلآویز ہے۔ بعض اشعار بہت اچھے ہیں۔ استعارہ در استعارہ موجود ہے تشبیہیں بھی ہیں لیکن طبیعت الجھتی نہیں۔ چند اشعار وزن میں نہیں کہیں کہیں سکتہ بھی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ مثنوی اچھی ہے۔ اصل مقصد واضح کیا ہے۔ زبان و بیان میں روانی اور برجستگی موجود ہے۔ شاعران مشاعروں کی جدت سے باخبر ہیں۔ اس مشاعرے میں پہلی مرتبہ متروک لفظ "آئیاں" استعمال ہوا ہے۔

نمونۂ کلام:

شبنم نے جو دھویا رُخِ پرنورِ سحر نے   دامن کو بھرا موتیوں سے سبزۂ تر نے
جھولے میں صبا گل کو جھلاتی ہوئی آئی   اطفال کے غنچوں کو کھلاتی ہوئی آئی
مستی میں وہ یکبارگی سب آئیاں شاخیں   اور باغ میں لینے لگیں انگڑائیاں شاخیں
اے حرص کے پتلے یہ تری تشنہ دھانی   بس کرتا نہیں اور پئے جاتا ہے پانی
میں دیکھتا ہوں تیری ہوس کم نہیں ہوتی   اور طبع کو سیری ترے اک دم نہیں ہوتی

منہ بند کر اس جانِ ہوسناک کا ظالم کیا ڈھنگ اڑایا ہے یہ افلاک کا ظالم
کچکول شکم دانۂ انجم سے بھرا ہے اس پر بھی سدا پھرتا بشکل فقرا ہے
لے لے وے گی اک روز یہی حرص دم اس کا اور تا بقیامت نہ بھرے گا شکم اس کا

سید اصغر علی فقیر نے بیس بندوں پر مشتمل مسدس پڑھا۔ جس میں "قناعت" اور قانع کی تعریف کی ہے اور خود قانع ہونے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ ٹیپ کا شعر فارسی کا ہے۔ "قناعت" کی تعریف استعاروں اور تشبیہوں سے کی ہے۔ اہل قناعت کو جو تحفے عطا ہوتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے پہلے دو شعر جو اردو میں ہیں ان میں روانی ہے طبیعت آسان گوئی پر اکساتی ہے۔ مشاعروں کا مقصد بھی جانتے ہیں تاہم فارسی کے شعر سے نظم میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہیں قاری کا ذہن رکتا ہے۔ بعض اشعار وزن میں نہیں ہیں۔

نمونۂ کلام:-

یہ ہے وہ باغ کہ جس کو نہیں خوف خزاں یہ وہ ہے سرو کہ عاشق ہے ہر اک سرو رواں
یہ وہ غنچہ ہے کہ صدقہ ہے ہر اک غنچہ وہاں دیکھ کر اس کو کلی کہتے ہیں سب خورد و کلاں
اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و داند دل من
یہ قناعت ہی عجب چیز ہے اک ذائقہ دار کہ لیا جس نے اٹھا سر پہ "قناعت" کا یہ بار
اسے آسائش و آرام ہے یہی لیل و نہار اور جو وہ جائے کہیں تو وہاں بس یہ پکار
اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و داند دل من

مفتی امام بخش رئیس بٹالہ نے شیخ سعدی کے قول کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ پھر ایک قطعہ اور ایک رباعی فارسی میں "قناعت" کی شان میں سنائی۔

نمونۂ کلام:

اے "قناعت" تو نگرم گردان کہ ورائے تو ہیچ نعمت نیست
کنج صبر اختیار لقمان ست ہر کرا صبر نیست حکمت نیست
بعد ازاں از زبانم سخن ست این رباعی بہ پیش انجمن ست

مولوی محمد سعید سعید نے اکثر اشعار کی ایک مثنوی سنائی جس کا مقصد یہ ہے کہ کل شام کو جب میں بستر پہ لیٹا تو اپنے علم و ہنر پر غرور پیدا ہوا اور اپنے مقاصد پورے کرنے کی بہت سی ترکیبیں ذہن میں آنے لگیں اور میں سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت حسین عورت جس کے اعضا سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے سادہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ چہرے پر نور برس رہا تھا۔ میں اسے پری سمجھا۔ میں نے اس سے نام پوچھا تو بولی کہ لوگ مجھے "بی قناعت" کہتے ہیں خدا کی بندی ہوں، مگر تم اپنی سناؤ۔ میں تو ہر دل کی محبوبہ، ہر نبی کی مرغوب ہوں۔ میں

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی پھر عیسیٰ کی انیس تھی، احمد (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ یحییٰ علیہ السلام کی ہمدم و ہمراز داؤدؑ کی سہاگن، لقمان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ حضرت یونسؑ، یعقوبؑ، ایوبؑ، یوسفؑ سب مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میں اکیلی نہیں میرے اور بھی رشتہ دار ہیں۔ صبر میرا بھائی ہے جو حضرت ایوبؑ کا غلام تھا، ایک بھائی توکل ہے۔ تسلیم و رضا دونوں میری سگی بہنیں ہیں۔ لیکن دنیا میں میری ایک سوکن ہے۔ بڑی رنگیلی اور سونے بیل بیلی لیکن وہ سراپا مکر و فریب ہے۔ حرص و طمع اس کا نام ہے۔ اپنا آنچل دکھا کر فریفتہ کر لیتی ہے۔ ناز و انداز سے دلوں کو لبھاتی ہے لیکن وہ لوگوں کو دھوکے دیتی ہے۔ دیس دیس کی خاک چھنواتی ہے اور آخر بدنام و خوار کر کے ناکام کر دیتی ہے۔ اپنی تعریف کچھ بھلی نہیں لگتی لیکن میں سرمایۂ دل نوازی ہوں۔ کلید شادمانی، متاع کامرانی میں خود ہی ایک دولت ہوں۔ آدمی کو ہر حال میں خوش رکھتی ہوں۔ گداگر کو شہنشاہ بناتی ہوں، محتاج کے سر پر تاج رکھتی ہوں۔ گناہ سے بچاتی ہوں، عاقبت میں خدا سے ملاتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ اے یار تم خوابوں میں مدت سے تمہارا منتظر تھا۔ اس نے کہا تو پھر میں تمہاری ہوں۔ لیکن تم مجھ سے کبھی جدا نہ ہونا اور میری سوکن سے کبھی نہ ملنا۔

یہ بڑی دلچسپ نظم ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ "قناعت" کو انسان سے اس طرح قریب کر کے دکھایا ہے کہ "قناعت" مجسم معلوم ہوتی ہے اور اپنی ذات کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ حرص کو قناعت کی سوکن کہہ کر عجیب قسم کا طنز و مزاح پیدا کر دیا ہے جسے پڑھ کر بے اختیار دل ہی دل میں ہنسی آتی ہے۔

نظم میں روانی، دل کشی اور برجستگی ہے۔ اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے نام غیر مرتب ہیں۔ لیکن زبان بہت سہل اور رواں ہے۔

نمونۂ کلام :-

مدت سے تمہارے ہم تھے مشتاق　　اور ہجر تمہارا تھا ہم کو شاق
تھے ایسے کہاں نصیب اپنے　　دکھلائی جو صورت اپنی تم نے
بتلاؤ ہمیں یہ ایک بات اب　　حصہ میں ہمارے آؤ گی کب
سن کر یہ بات آگئے آئی　　شرمندہ سی ہو کے مسکرائی
بولی لو آج ہی سے حضرت　　چھوڑوں گی نہ آپ کی رفاقت
واقع میں سعید ہو اگر تم　　سن لو اسے کان کھول کر تم
اک دم میرے پاس سے نہ ہلنا　　سوکن سے میری کبھی نہ ملنا
ہر بات میں میرے رائے لینا　　ہر کام میں میرا ساتھ دینا

اب مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی نظم سنائی جو ایک سو بیس(۱۲) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم کا مقصد یہ ہے کہ خواجہ قناعت کو یہ اطلاع ملی کہ دنیا والے حرص و ہوس میں پڑ کر اس کی تعلیم بھلا بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر اسے بہت صدمہ ہوا اور انتہائی غصے میں آیا۔ اس ملک القدس کے دربار میں یہ عرضی لکھ کر بھیجی کہ میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتا اور اس عرضی میں اہل دنیا کے حالات جو بگڑ چکے تھے تمام لکھے اور التجا کی کہ مجھے واپس بلا لیا جائے۔ ملک القدس نے عرضی پڑھ کر حکم دیا کہ ساری خلقت کو طلب کیا جائے اور اسے آئینہ اسرار کے

سامنے سے گزارا جائے تاکہ سب کی حقیقت عیاں ہو جائے۔ چنانچہ ساری مخلوق جمع ہوئی۔ پہلا گروہ سامنے سے گزرا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں شانِ استغنا موجود ہے اہلِ علم و فضل ہیں لیکن دنیا ان کی قدر نہیں کرتی۔ ان لوگوں کی ملک القدس نے اعزازِ دوامی کا تاج عطا کیا۔ اب دوسرا گروہ سامنے آیا۔ یہ اہلِ ہوس تھے اور ان کے پیٹ جسم کے پورے اعضا پر حاوی تھے۔ دو گروہ اور سامنے سے گزرے وہ بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے جو حریص تھے۔ شاعر نے بڑے ادب سے سوال کیا:

جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے
آئینہ حالات و خیالات جہاں تھے

اس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو
حیران ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو

آخر میں شاعر نے انکشاف کیا کہ وہ خانۂ دل خود ہر انسان کے پہلو میں موجود ہے۔ شاعر نے حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان کا دل ہی وہ آئینہ ہے جس میں اہلِ عالم کے صحیح قد و خال نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

قناعت جو اس نظم کا اصل موضوع ہے اس پہ آزاد نے صحیح طور پر روشنی نہیں ڈالی قناعت کے مختلف پہلو بیان کرنے کے بدلے دوسری غیر ضروری باتیں اس قدر طوالت سے بیان کی ہیں کہ آزاد کی اس مثنوی کا تاثر ختم کر دیتی ہیں۔ یہ مثنوی اس مرتبے کی نہیں جس مرتبے کی دوسری مثنویاں ہیں۔ استعارہ در استعارہ طبیعت کو الجھا دیتا ہے اور اصل مقصد ذہن سے نکل جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں بڑے حکیمانہ نکات بیان کئے ہیں۔ لیکن اس نظم میں وہ روانی نہیں جس کی توقع آزاد سے تھی۔

پنڈت جواہر لال نے گیارہ اشعار کی نظم سنائی۔ انہوں نے "قناعت" کی اور "قانع" کی تعریف کی ہے۔ ان کی طبیعت مشکل پسند ہے۔ مرکبات، استعارے اور تشبیہیں فارسی کی خوب استعمال کی ہیں۔ اگرچہ مشاعروں کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے فارسی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ کلام رواں ہے۔ صاحب ذوق ہیں۔

نمونۂ کلام

مشتاق ہے دل بسکہ بہ آہنگ "قناعت"   اک گام میں طے کرتا ہوں فرسنگ "قناعت"
دل سیر سدا جوہر معنی سے ہیں ان کے   باندھے ہوئے جو ہیں بشکم سنگ "قناعت"
ہوں حادثۂ دہر اگر سد رہ اس کے   جوں مرغ ہے اڑتا فرس سنگ "قناعت"
سر پہ جو دھرے تاج ہیں تسلیم و رضا کے   رکھتے ہیں وہ زیر قدم اورنگ "قناعت"

"تہذیب" نواں مشاعرہ ؎ (۱)

نواں مشاعرہ جس کا عنوان "تہذیب" تھا اس کا حال زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صادق نے اپنے مقالے میں آزاد معاصرین

---

[۱] "ضمیمہ اخبار پنجاب، یعنی انجمن پنجاب کے مشاعرے"۔ لاہور: انجمن پنجاب پریس مارچ ۱۸۷۵ء نمبر ۸ ۔

کی نظر میں" ۱۵ / اپریل ۱۸۷۵ء کے ایک رسالے "خیر خواہ عالم" ایس۔ زیڈ۔ اے[1] ۔ لاہور کے حوالے سے لکھا ہے:

"۔۔۔۔۔ لیکن اب کے جلسہ اتنا بے رونق تھا کہ سابق میں نہ ہوا تھا۔ نہ کوئی عمدہ مشاعرہ تھا اور نہ اعلیٰ درجے کے شائقین تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید دہلی کے دربار کے باعث اکثر لوگ دہلی کو چلے گئے ہیں جلسہ بے رونق تھا۔ رفیق نے اب کی مرتبہ جو "تہذیب" کے مضمون کی مثنوی سنائی تو اس میں اخبار والوں کو بھی کچھ سنایا۔ جس پر رفیق صاحب کو طیش آگیا اور سب کو ضعف پھر اکر برابر اس کو پڑھا۔ اور اس کے مضمون سے پایا جاتا تھا کہ وہ اخبار پنجابی کو آوازہ کس رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ اب اس مشاعرے میں آج کل کے لونڈے ایں شاعر اکثر آتے ہیں، کوئی کنجڑا ہے اور کوئی حلوائی وغیرہ جن میں آزاد صاحب عمدہ شاعر تصور ہو سکتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم پہلے لکھتے کہ انجمن کے مشاعرے میں شاعر منتخب کئے جاویں تو بہتر ہے لیکن اب تو انتخاب کی کچھ ضرورت بھی نہیں رہی کیوں کہ اچھے شاعروں نے اس طرف توجہ اور شریک ہونا ہی چھوڑ دیا ہے۔"[2]

بہرحال ہمیں اس مشاعرے کی تفصیل معلوم نہیں صرف نظم آزاد میں "مصدرِ تہذیب" کے عنوان سے ایک مثنوی موجود ہے جو ایک سو پینتالیس ۱۴۵ اشعار پر مبنی ہے۔ ابتداً آغاز آفرینش کے پرسکون ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔

بائیس اشعار میں ازل کی ابتدا پرسکون ماحول دنیا کی بہار کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ تمہید کافی طویل ہے۔ اس میں آزاد نے شاعرانہ حسن پیدا کرنے کے لیے روز ازل کا دبدبہ سکون اور دنیا کی منظر کشی کی ہے اور دل چسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ مختصر یہ کہ ملک القدس نے خسروِ اخلاق کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ دنیا والوں کو حسن خلق کی تعلیم دے۔ لوگ اس کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے غلام بن گئے لیکن ہزل اور تمسخر نے اس کی تمام کوششوں کو پامال کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر خسرو اخلاق نے ملک القدس کو ان کا حال لکھ کر بھیج دیا۔ ملک القدس نے قہر کو دنیا میں بھیجا اس نے چن چن کر غلط کاروں کو سزا دی۔ اس کے بعد بزم قدس میں "تہذیب" کو حکم ملا کہ وہ دنیا میں جا کر اصلاح کا کام سرانجام دے۔ "تہذیب" نے دنیا میں آکر سب سے پہلے جشن عام کیا اور یہ حکم دیا کہ مدرسوں کے طالب علموں کے لیے صرف زبان سے سبق یاد کر لینا کافی نہیں انھیں چاہیئے کہ وہ علوم کے معنوں پہ غور کریں اور انجمن پنجاب کے جلسوں کی روئداد اور رسالوں میں شائع کی جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مشہور ہو اور اس کا فیض مقاصد عالم میں عام ہو جائے۔

نمونۂ کلام:

زمیں پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی — اور آفرینش عالم کی تھی سحر پہلی
مزاج جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا — اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا
وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی — اور ابتدا تھی زمانے کے کارخانے کی

---

[1] "یہ فرضی نام" سیف الحق "ادیب" کا ہے، جس کے لئے آزاد کا خیال تھا کہ یہ حالی کے شاگرد تھے اور آزاد کی مخالفت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھی ورنہ دیگر شعرا کے کلام میں آزاد سے کہیں زیادہ اسقام تھے۔ سیف الحق ادیب "اخبار پنجابی" میں آزاد کے خلاف مستقل کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ (مرتب) "مکاتیب آزاد"، لاہور: ص ۲۴۷)۔ [2] صادق، ڈاکٹر۔

زمیں سبزۂ قدرت سے لہلہاتی تھی صبا جو اس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی
تمام دشت چمن در چمن بڑھے ہوئے تھے پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے ہوئے تھے
وہ شاہ لطف سے اتنا کہ رہا جہاں پہ نظر کبھی عیاں پہ نظر تھی کبھی نہاں پہ نظر
خدا کے بندوں پہ الفت ز بس تھی عام اس کی فروغ عام تھی مشعل بہ اہتمام اس کی
تو خاص و عام وہاں آکے باریاب ہوئے سبھوں کو واں سے عطا خلعت و خطاب ہوئے
انہی میں ہزل و تمسخر کے بھانڈ بھی آئے ظرافتوں نے بہت باغ سبز دکھلائے
ہر ایک بات میں چالاکیاں وہ لگے کرنے حضور شاہ میں بیباکیاں لگے کرنے
یہ حکم آج سے ہو جائے عام عالم میں اور انتظام ہو اس کا تمام عالم میں
کہ لفظ جیسے زبانوں پہ ہیں رواں ہوتے یہ ان کو منہ سے ہی بک بک کے نیم جاں کرتے
ہوا یہ اتنے میں اک حکم دوسرا جاری کہ جلسے انجمنوں کے ہیں جا بجا جاری
نہ ان کی باتیں زبانوں پہ منحصر ہوویں وہ سب رسالوں میں چھپ چھپ کے مشتہر ہوویں

مولانا حالی لاہور چھوڑ چکے تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر آزاد سے ناراض ہو چکے تھے؛ حالاں کہ وہ ایران و افغانستان وغیرہ کا پُراسرار[1] سفر کر چکے تھے لیکن ان پر سے ڈاکٹر لائٹنر کا اعتماد اُٹھ چکا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کی تصنیف "سنین اسلام" کے سلسلے میں آزاد سے ان کی اَن بن ہو چکی تھی جیسا کہ ان کے نجی اور دفتری خطوط سے ظاہر ہے جو انہوں نے ڈاکٹر لائٹنر کو لکھے۔ اخبار "پنجابی" اور وطن کے اکثر علماؑ اور شعراؑ اس جدید اردو شاعری پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے تھے لیکن آزاد ان نازک حالات میں بھی اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔

انہوں نے ایک طرف تو عنوانی مشاعروں سے اپنا دامن وابستہ رکھا کیوں کہ وہی اس کے بانی تھے اور دوسری طرف اشاروں اور کنایوں میں ان اعتراضات کی نشاندہی بھی کی۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں جب کہ وہ کھل کر حکومت کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اور نہ عوام[2] پر راز افشا کر سکتے تھے اس ابتدائی معیار کو قائم رکھنا بہت مشکل تھا اگر وہ اس معیار تک اس مثنوی کو نہ پہنچا سکے تو کوئی تعجب نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حادثات نے مولانا آزاد سے شاعرانہ صلاحیتیں چھین لیں اور پھر خود انھیں بھی اس کا احساس ہو گیا تھا اسی لئے انہوں نے اپنی پوری توجہ نثر کی طرف منعطف کر دی۔

---

[1] اسلم فرخی، ڈاکٹر محمد، "محمد حسین آزاد — حیات اور تصانیف"، کراچی: انجمن ترقی اردو (پاکستان)، ... حصہ اول ص ۱۶۵
[2] مرتبہ "مکتوبات آزاد" ص ۱۰۷-۸

"تہذیب" نواں مشاعرہ[1] (۲)

۱۳ مارچ، ۱۸۷۵ء کے نویں مشاعرے کی اس غیر مطبوعہ مثنوی میں ایک سو چار اشعار ہیں۔ یہ مثنوی سید اصغر علی حقیر لکھنوی کی ہے تمہید میں صبح کا منظر پیش کیا ہے جو بڑا دلفریب ہے۔ اس کے بعد طویل استعارہ شروع ہوتا ہے کہ میں صبح کے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ناگہاں ایک غنچہ دہن نے مجھے پکارا اور مبارک باد دی کہ آخر تم اس چمن میں آ پہنچے یہاں کا ہر غنچہ اور ہر کلی تمہاری منتظر تھی آج غنچۂ اُمید کھلا ہے۔ اس تقریر کو سن کر میں نے اس کا حسب و نسب پوچھا تو ایک سپاہی مجھے نظر آیا اس نے آکر بتایا کہ یہ شہزادی "تہذیب" کا گھر ہے۔ میں نے اس غنچۂ دہن سے زمانے کی شکایت کی اور اپنا دکھ درد بیان کیا تو اُس نے بڑی تسلی دی اور کہا کہ میرے ساتھ چلے آؤ میں تمھیں شہزادی تہذیب کے دربار میں لے جاؤں گی۔

شہزادی "تہذیب" کا ذکر سن کر میں نے اس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ غنچہ دہن مروت ہے۔ اس کا کام یہی ہے کہ جو کوئی شہزادی "تہذیب" سے ملاقات کا طالب ہو یہ اُسے اس کے دربار میں لے جاتی ہے۔ دربار میں جانے سے پہلے میں نے "تہذیب" کی شان میں قصیدہ لکھا۔ اس قصیدے میں دس اشعار ابتدائی ہیں اور تہذیب کی تعریف میں اٹھارہ اشعار ہیں ؎

اے رخشِ قلم نظم کا میدان دکھا دے   اے ذہنِ رسا اپنی رسائی کا پتا دے
شہزادیِ تہذیب کا اب لکھ کے سراپا   اے دل تو اسے بزمِ سخنوراں میں سنا دے

شہزادی تہذیب کا سراپا شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے جیسے قدیم محبوب کا سراپا لکھا کرتے تھے لیکن اس سراپا میں عریانی نہیں بلکہ ہر عضو کو صفاتِ پاکیزہ سے تشبیہ دی ہے ؎

نرگس کو یہ تہذیب اگر آنکھ دکھا دے   اک لطف ہو بیمار کو بیمار شفا دے
چشموں پہ کریں غور ذرا مردمِ دیدہ   وہ چشم ہے جو چشمۂ الفت کا پتا دے

---

[1] آغا محمد باقر مرحوم نے انجمن پنجاب سے متعلق جتنی دستاویزات اور رسالے تھے وہ سب میرے ہاتھوں کھلوائے۔ ان میں زرد کاغذ پر خط نستعلیق میں چھ نظمیں درج تھیں جن کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے گارسیں دتاسی نے محض "اخبار پنجابی" کے حوالے سے آٹھویں مشاعرے کی نشان دہی کی ہے اور پنجابی نے مشاعروں میں حلوائی تارا چند اور طالب علموں کی شرکت پر اعتراض کیا ہے اور صرف شیخ الٰہی بخش رفیق کی مثنوی "مصدرِ تہذیب" کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس مشاعرے کی دو مثنویاں مجھے مل گئیں۔ پہلی مثنوی سید اصغر علی حقیر کی ہے اور دوسری رفیق کی ہے۔

اس کے بعد اس دستاویز پر ایک نظم کا ایک حصہ بھی موجود ہے جو نویں مشاعرے کا ثبوت ہے۔ اگرچہ پوری مثنوی نہیں لیکن یہ دستاویز صفحہ ۲۵ سے شروع ہوتی ہے اور اس پر "اخلاق" سے متعلق سات اشعار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ نظم آزاد میں "شرافت حقیقی" کے عنوان سے مولانا آزاد کی مثنوی موجود ہے جو اخلاق سے متعلق ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مشاعرہ نمبر دس کا عنوان "اخلاق" تھا۔ یہ مسودہ بیگم آغا باقر مرحوم نبیرہ آزاد کے پاس موجود ہے

(مقالہ نگار)

بینی کا ہے اس واسطے مابین پس پردہ　　تا آنکھ کو یہ آنکھ نہ نظروں سے گرا دے
رخسار ہیں یا ترجمہ سورۂ مصحف　　نقطے کا نہ کسی طرح سے یہ خال بتا دے
امکان ہے گر کان کا ہو وصف کسی سے　　"تہذیب" اسے کان جواہر کا صلہ دے
وہ چاہ زنخدان ہے کہ جو چاہ میں اپنے　　پائے تو دل یوسف کنعاں کو گرا دے
دیکھے جو کوئی گردن پر نور کا جلوہ　　وہ نور ہے جو طور کی قندیل بجھا دے
یہ سینہ بھی ہے خلق و مروت کا خزینہ　　"تہذیب" کی توصیف نہ کیوں سب کو سکھا دے

۴۳ اشعار میں شہزادی کا ذکر ہے کہ جب میں اس مہ لقا کے ساتھ چلا تو ایک شخص ملا جس کا نام خلق تھا۔ اس نے بتایا کہ جب سے شہزادی نے سنا ہے کہ ایک شاعر یہاں آیا ہے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ مروت نے چپکے سے اس کے کان میں کہا کہ یہ وہی شاعر ہے جو ہند سے آیا ہے۔ خلق نے مروت سے کہا کہ انھیں شہزادی کے دربار میں پیش کرو۔ یہ قصیدہ بھی سنائیں گے اور باغ میں آنے کا سبب بھی۔ آخر شہزادی کے دربار میں باریاب ہوتے اپنا قصیدہ پیش کیا۔ شہزادی قصیدہ سن کر بہت خوش ہوئی اور خلق و مروت بطور انعام بخشے۔

اس مثنوی میں کہانی کا عنصر زیادہ ہے۔ شاعر اصل مقصد سے دور ہو گئے ہیں لیکن اس نظم میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ "باتہذیب" ہونے کے لیے خلق اور مروت کا ہونا لازمی ہے۔

اس مثنوی کو پڑھ کر بے اختیار ذہن مولانا آزاد کی مثنویوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں منظر نگاری، سراپا اور مکالموں کو بھی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ منظر نگاری میں میر انیس سے متاثر ہیں۔

اس مثنوی میں ان کا انداز بدلا ہوا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں اصل عنوان پر زور دینے کے بجائے کہانی پر قوت تخیل زیادہ صرف کی ہے۔ فارسی الفاظ کے باوجود زبان سہل اور رواں ہے۔ کہیں کہیں اشعار میں سکتہ پڑتا ہے۔ شاعرانہ تعلی اور زمانے کا شکوہ بھی ہے۔

مصدر تہذیب کی یہ مثنوی بھی غیر مطبوعہ ہے۔ لیکن گارسین دتاسی کے علاوہ اور دوسرے تنقید نگاروں نے بھی اپنی تنقیدوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی شیخ الٰہی بخش رفیق صاحب کی ہے۔ اس مثنوی نے جلسے میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ رفیق صاحب نے اخبار پنجابی کو بے نقط سنائیں اس کے علاوہ دیگر عہدیداروں، حکام، شعرا اور خاص طور پر آزاد تک نہ بچ سکے۔ اگرچہ نام نہیں لیا لیکن قرائن سے آزاد ہدف بنے کیوں کہ رفیق کے علاوہ بھی شعرا کا کلام اس لائق نہیں ہوتا تھا وہ محروم رہتے اور آزاد کے خلاف زہر اگلتے۔ آزاد نے اپنے ایک خط میں اس کی نشان دہی[1] کی ہے۔

اس مثنوی میں ۱۵۴ اشعار ہیں۔ ۲۹ اشعار کے بعد ۳۶ اشعار پر × نشان بنا ہوا ہے۔ اس مثنوی کا مطلب یہ ہے کہ جب رات ہوئی تو نا امیدی اور غم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کوئی غم خوار اور دوست نہیں سوائے رنج و الم کے۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کہ رات کٹ جائے اس کیفیت کا اظہار گیارہ اشعار میں کیا ہے۔ اس کے بعد زمانے کا شکوہ ہے۔

---

[1] مکاتیب آزاد، محولہ بالا، ص ۷۴۔

اہلِ دنیا کی باتیں ہی الٹ گئی ہیں۔ چال چلن بگڑ چکے ہیں۔ جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے جاہلوں پر جہالت فدا ہوتی ہے اور تہذیب سرہانے کھڑی روتی ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو صرف اپنا ہی بھلا چاہتے ہیں۔ اور مغرور ہیں۔ غفلت کی چربی آنکھوں پر ہے یہ خود بین و خود نما آرام طلب، بد اندیش، بے مہر، حریص اور موت سے بے خبر ہیں یہ نہیں جانتے کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار پر × نشان لگا ہے :

اور کچھ لوگ کہ ہیں علم کے مشتاق ان میں — مولوی بن کے ہوئے شہرۂ آفاق ان میں
آئی چہرے پہ موٹاپے سے بحالی ان کے — پیٹ مشکوں کی طرح رہ گئے خالی ان کے
سر پہ دستارِ فضیلت کی دھرے پھرتے ہیں — اور تکبر کی ہوا سر میں بھری پھرتے ہیں
خود پسندی نے انھیں کر دیا مغرور اتنا — فخر رازی سے بھی ہیں کھینچتے کچھ دور اپنا
کہتے کہ اک سے حکایت ہیں یہ دن رات — سخن شیخ کجا اور کجا اپنی بات
گر لیاقت پہ نظر کیجئے تو خاک نہیں — بے وقوف ایسا بھی کوئی تہِ افلاک نہیں
کیست امروز بعالم بشرے صاحب علم — ہم چو ما نیست بہ دنیا دگری صاحب علم
پوچھیں گر لفظ کے معنی تو خفا وہ ہو جائے — اور طبیعت ابھی اک لحظہ میں برہم ہو جائے
یا وہ گویوں میں تو نام ان کا رقم ہوتا ہے — پر ذرا علم کا دعویٰ نہیں کم ہوتا ہے
چاہتے فضیلت و کمالات تب کامل ہو جائیں[1] — کر کے محنت علماؤں میں یہ کٹر شامل ہو جائیں
اور جنھیں حاکموں نے صاحبِ فرمان کیا — اس رعیت کے تھا اکرام کا سامان کیا
سو اب ان کے بھی ہیں بگڑے ہوئے تیور بہت — اس حکومت نے انھیں کر دیا مغرور بہت
تھا یہ سامان کبھی مظلوم کی دل داری کا — اب حکومت نہیں پیشہ ہے ستم گاری کا
خنجرِ کبر کا ہرمیاں بنایا دل کو — اور دریائے تکبر میں ڈبایا دل کو
زنگ سے ایک کا آئینۂ دل صاف نہیں — رحم دل میں نہیں اور سینہ میں انصاف نہیں
دیتے اوروں کو سزائیں ہیں بد افعالی پر — دل میں شرماتے نہیں اپنی بد اعمالی پر
خوبیاں اتنی مگر ہیں انھیں درکار ضرور — آج کرنا ہوا جن کا مجھے اظہار ضرور
نیک طینت ہو خدا ترس ہو اور صاف بھی ہو — خلق ہو رحم و دیانت بھی ہو انصاف بھی ہو
جس میں یہ وصف ہوں حاکم بھی ہے سردار بھی ہے — کشورِ دل کا زمانے کے وہ مختار بھی ہے
اور وہ شاعر کہ بہت معدوم یہاں ہے جن کی — غیب کے قفل کی کنجی یہ زباں ہے جن کی
بات کو عقل کے میزان میں نہیں تولتے ہیں — قفلِ مضمون مطالب کا نہیں کھولتے ہیں

---

[1] کتابت کی غلطی۔

بات اصل کا زباں تک نہیں لانا آتا ایک چھپن چھپن ہی کا زیور ہے بتانا آتا
اور اگر شاہد مضمون کو کبھو پاتے ہیں ایسا خوش رنگ لفافہ اسے پہناتے ہیں
کہ جو سنتا ہے وہ کہتا ہے سبحان اللہ اصل مطلب کو جو ڈھونڈو تو نگہبان اللہ
جان مضمون پہ نہیں رحم ہیں کرتے ظالم خون معنی میں عبث ہاتھ ہیں بھرتے ظالم
اصل مطلب کی طرف چاہیے لائیں دل کو اور کبھو گو رضا میں نہ بنائیں دل کو
یہ یہ فرقہ جو زمانے میں ہے اخبار نویس ملک معنی کا حقیقت میں ہے اسرار نویس
ہے جو اخبار تو اک فیض کا گنجینہ ہے اور اسرار حقیقت کا یہ آئینہ ہے
کبھی اصلاح خلائق کا وسیلہ ہے یہ کبھی فی الجملہ کمائی کا بھی حیلہ ہے یہ
عیب و خوبی کے جو معنی ہیں وہ کھل جاتے ہیں حق و باطل جو ہیں آنکھوں میں وہ تل جاتے ہیں
پر اب ان کے بھی طریقے ہیں بگڑتے جاتے گل حق شاخ عبارت سے ہیں جھڑتے جاتے
رہے ان میں بھی نہ کچھ لوگ بدستور اب تو بوے انصاف جو تھی ہو گئی کافور اب تو
اے رفیق اب جو میں انصاف کا دم بھرتا ہوں اور اخبار نویسوں پہ نظر کرتا ہوں
کو دیا بغض و حسد بھی عجب حال ان کا تھا جو اخبار ہوا نامۂ اعمال ان کا
صاف جس صفحہ پہ تحریر نظر آتے ہیں منہ چڑاتی ہوئی تصویر نظر آتے ہیں!
پر ان اخبار نویسوں کا ہوں مشکور بہت گو میں نزدیک ہوں بیٹھا ہوا یا دور بہت
چاہیے ان کو خوشامد کو تو چھوڑیں بالکل راہ سیدھی جو ہے منہ ان سے نہ موڑیں بالکل
بیچ میں جو جھوٹ ملا کر نہیں اک تل لکھتے حق کو حق لکھتے ہیں باطل کو ہیں باطل لکھتے

اس کے بعد تجارت پیشہ لوگوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو دنیا کے سفر سے تجربہ اور تجارت کا منافع حاصل ہوتا تھا اب ان کے طور بھی بدل گئے۔ عقل نے فکر کی شطرنج بچھائی ہے اور محض ہیر پھیر سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور گھر بیٹھے خلقِ خدا کو لوٹتے ہیں۔ اب انھیں چاہیے کہ ہمت مردانہ کام میں لائیں۔ زاہدوں کا زہد اب دھوکا بن چکا ہے۔ ان کی تسبیح مکر کی زنجیر ہے یہ مسجد کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ یہ گربہ مسکین بنے ہوتے ہیں۔ بظاہر دنیا سے منہ موڑ لیا ہے لیکن حرص کا دامن پھیلا ہوا ہے۔ جو لوگ کہ شجاعت کا دم بھرتے ہیں وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگے ہیں۔ اگر انھیں میدان جنگ میں بھیجا جائے تو منہ چھپاتے پھریں۔

جب شجاعت ہے کہ دل ان کا پس و پیش نہ ہو اور قومی ملک پہ اعدائے بد اندیش نہ ہو
اپنے حاکم سے جو رکھتا کوئی کینہ ہوئے تیغ ہو ان کی اور اس شخص کا سینہ ہوئے
چاہیے ہم وطنوں کے لیے پر ہو جاویں زیر دستوں کی حفاظت کو سپر ہو جاویں
ورنہ سچ کہہ گئے ہیں اگلے زمانے والے کم بہت رہتے ہیں دنیا میں بتانے والے

اور جو لوگ توکل کا دم بھرتے ہیں وہ مکر کا جال پھیلائے ہوئے ہیں اگر کسی کو کچھ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔

ان اعتراضات کے بعد شاعر نے ان صفات کا ذکر کیا ہے جو انسان کو آدمی بناتی ہیں۔

رحم، انصاف، وفا، خوف خدا، صبر، توکل، حلم، خوش اخلاقی، مروّت اور ہمدردی۔ جس انسان کا دل علم و ادب کا غنی ہو جس شخص میں یہ صفات موجود ہوں ہم اس کو بشر کہتے ہیں۔

پھر نصیحت کی ہے کہ تہمت، غیبت، عداوت، بادہ خواری، رشوت، بے دینی کے علاوہ بے محل بولنا زیب نہیں دیتا۔ دل بول اٹھا کہ میں معدنِ تہذیب ہوں۔ عقل نے کہا میں ترغیب دوں گی۔ فکر نے کہا میں عقل کا سرمایہ ہوں۔ تدبیر نے کہا کہ یہ بے چارے میری وجہ سے ہنرمند بنے ہیں آنکھوں نے کہا ہم جہاں دیدہ ہیں۔ علم نے کہا یہ دیوانے ہیں عدالت نے کہا یہ جو سیکھتے ہیں وہ افسانے ہیں، آخر تقدیر نے یہ کہہ کر سب کا منہ بند کر دیا کہ میں نہ ہوتی تو آپ بھی نہ ہوتے۔

پھر شاعر نے صبح کی منظر کشی کرتے ہوئے مثنوی ختم کی ہے۔

اس مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا کی آپس کی چشمک آخر مشاعروں کو لے ڈوبی۔ سیاسی اعتبار سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا کو حکام پر سے اور ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ گیا اور جو مقصد ان مشاعروں کا تھا وہ پس پشت جا پڑا۔ ویسے یہ مثنوی اس روایت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مشاعرے اکھاڑا بن جاتے تھے۔ کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے بعض اشعار وزن میں نہیں رہے۔ زبان میں روانی ہے اس مثنوی کو پڑھ کر تضحیک رنگ اور انشا و مصحفی کا دور یاد آ جاتا ہے۔

"اخلاق" دسواں مشاعرہ[1]

دسویں مشاعرے کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن غیر مطبوعہ مسودہ پر فیض کی نظم اخلاق پر ہے جس کے صرف سات اشعار تھے۔ اور یہ اشعار نویں مشاعرے کے غیر مطبوعہ مسودے پر درج تھے۔ اس مشاعرے میں یقیناً دوسرے شعرا بھی شریک ہوں گے لیکن سوائے مولانا آزاد کی مثنوی "شرافت حقیقی" جو معنوی اعتبار سے اخلاق سے منسلک ہے اور کسی شاعر کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ فیض کے اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

دکھا دے گر ہمیں وہ خلق کی اے رہبراں بیشک — خدائے لم یزل کا لطف ہے اور عین احساں ہے
نگاہ غور سے اس پردۂ اخلاق کو دیکھو — کہ نور ہر ذات خالق مطلق درخشاں ہے
بجز اخلاق و شفقت کے اگر سب چھوڑ دے اے دل — مناسب واسطے تیرے ہے وہ اور یہ بھی شایاں ہے
سوائے شیر دل اخلاق کا ہوتا ہے کب خواہاں — کہ ہر روباہ وش اس دشت سے داغ گریزاں ہے

---

[1] مقبوضہ بیگم آغا باقر نبیرہ آزاد

گلستان جہاں میں صاحب اخلاق و بے شفقت   برنگ غنچہ خنداں ہے بسان ابر گریاں ہے
کروں میں کیا بیاں بے شفقتی اخلاق کا تم سے   بصورت شکل شیطاں ہے بشریت میں مژاں ہے
قدم رکھا ہے ... خلق میں اے فیض گر تو نے   ہرا ساں ہو نہ ہرگز تیرا حامی شاہ مرداں ہے

شرافت حقیقی" مولانا آزاد کی مثنوی ہے۔ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد نے جس ترتیب سے اسے "نظم آزاد" میں شائع کیا ہے اور جو خود ان کا خیال تھا اس عتبار سے یہ مثنوی اس دسویں مشاعرے میں پڑھی گئی جس کا عنوان اخلاق تھا۔ معنوی اعتبار سے بھی شرافت حقیقی اخلاق سے منسلک ہے۔ ناقدین نے بھی اسی ترتیب سے "نظم آزاد" پہ تنقید کی ہے اس کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ مثنوی دسویں مشاعرے میں پڑھی گئی اور شاعری اب اس مقام تک پہنچ چکی تھی جہاں سے جدید اردو شاعری میں مقصدیت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نصاب تیار کرنے کے لئے لکھی گئی۔ زبان نہایت رواں ہے مقصدیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ صفائی، سادگی اور زور بیان نمایاں ہیں۔ زبان شوکت الفاظ سے پاک اور نہایت پاکیزہ ہے :-

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا   نہ یہ کہ بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادے سے مطلب نہ خانماں سے غرض
یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشاں سے غرض
تمہارے کام اگر اچھے تو نام اچھے ہیں   گھرانے اچھے، گھر اچھے، تمام اچھے ہیں

دوسرے بند میں دولت و حشمت کے مقابلے میں ہمت کو بڑی دولت کہا ہے۔ تیسرے بند میں با اصول ہونے پر اصرار کیا ہے۔ چوتھے بند میں مروت اور ہمت عالی کی تعریف ہے۔ پانچویں میں "متاع حسن؟ یا نت" اور وفا کا ذکر ہے چھٹے بند میں کہتے ہیں کہ عقل شعور اور تجربہ بھی ضروری ہے :

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں   جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں
کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظ برزباں تو کیا   اور ان میں پاس ہوئے دے کے امتحاں تو کیا
تمہارے خلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں   زباں سے کہنے کی دل تک صدا گئی کہ نہیں
فقط جو عالم ذی شان ہو گئے تو کیا   میرے حسابوں وہ شیطاں ہو گئے تو کیا

پھر کہتے ہیں کہ جو کچھ پڑھو اس کا اثر دل پر ہو اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچاؤ :

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم کہ کچھ بھی نہیں   مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہو کے رہو
میاں جلسہ جو آزاد پوچھے آ کے کبھی   کہو کسی میں لیاقت ہو اگر یہ کہنے کی
کہ با صفا ہو سبک روح و پاک جان ہم ہیں   تو تم جواب میں جھٹ بول اٹھو کہ ہاں ہم ہیں

رسولؐ نمبر

ایک ناقابلِ تسخیر کارنامہ

(تین جلدوں میں)

اقبالؒ نمبر

ایک ناقابلِ فراموش ادبی دستاویز

(دو جلدوں میں)

نقوش کے یہ دونوں شمارے جلد آپ تک پہنچ رہے ہیں

ایک درخت کا قتل

اختر اورینوی

ایک کوارٹر کے پہلو میں ایک بہت ہی اونچا، مضبوط، گھنیرا اور خوب صورت درخت تھا۔ شہر کے ایک مشہور باغ کو بڑی بدسلیقگی سے کاٹ کاٹ کر بے ربط اور بد وضع کوارٹر کھڑے کر دیے گئے تھے۔ بے ہنگم۔ نہ ناک درست، نہ نقشہ۔ صرف ایک کوارٹر اسی چھتنار اور بلند و بالا درخت کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا۔ ہرا بھرا، سایہ دار۔ ماحول کے بے کیفیت سپاٹ پن اور بد آہنگی کو دور کرنے والا۔ گہری جڑیں، سڈول بھاری بھرکم، اونچا تنا۔ پھیلی ہوئی، صحت مند شاخیں، سرسبز کونپلیں، سندر ہرے ڈولتے ہوئے پتے۔ اس پیڑ کی سربلندی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ دل میں بڑا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ جس مٹی سے ایسا وشال درخت اُگے وہ مقدس محسوس ہوتی تھی۔

اس پرانے باغ کے نہ جانے کتنے خوب صورت اور پھل دار درخت کاٹ کر پھینک دیے گئے ہوں گے۔ آم، لیچی، جامن، امرود اور شریفے کے پیڑ۔ افتادہ زمینوں اور بنجر قطعوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن نہ جانے کس جبلّت کی تسکین کے لیے یہی حسین باغ قتل گاہ بنایا گیا۔

اس برباد باغ کی ایک تاریخ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاہی وقت کا باغ تھا۔ ایک فراخ دل نواب نے اپنے جگری دوست ایک مہاراجہ کو تحفتاً یہ باغ پیش کیا تھا۔ اُنھیں دنوں ایک کامل فقیر باغ کے ایک گوشے میں دھونی رما بیٹھا۔ مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اسے نیک شگون سمجھا اور پہلو میں ایک قطعہ اراضی بھی شاہ صاحب کو دے دی۔ آج بھی اُس احاطے میں قبریں موجود ہیں۔ خدا رسیدہ فقیر کا سالانہ عرس ہندو مسلمان سب مل کر دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ جس عظیم الشان درخت کا ذکر ہے شاہ صاحب کی قبر پر سایہ کیے ہوئے تھا، جیسے چھتر لگانے کی سعادت حاصل کر رہا ہو۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متبرک ہے اور اس خطے کی خاک پاک ہے۔

جب انگریزوں کا راج ہوا تو لفٹنٹ گورنر بہار نے سخت دباؤ ڈال کر یہ باغ مہاراجہ سے اونے پونے خرید لیا۔ یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی۔ مگر باغ کا بڑا حصہ قایم رہا اور وقت پر پھل دیتا رہا۔ قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہو گئیں اور ان کے نشانات بھی مٹتے گئے، لیکن پیر صاحب کی قبر جیسی تھی ویسی رہی۔

۱۸۵۷ء کے ناکام ہندوستانی انقلاب کے بعد اسی باغ میں کئی مجاہدوں کو سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔ انگریزی راج محل خون اور گوشت کے گارے سے تعمیر ہوا۔ اس وشال پیڑ نے یہ خونیں ڈراما دیکھا تھا۔

خلقت کہتی ہے کہ اس عجیب درخت کی خونِ شہدا سے آبیاری ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر درخت کے پتے یا شاخیں کوئی توڑتا تو اُن سے سرخ خون ٹپکنے لگتا تھا۔ اسی وجہ سے جب نئے کوارٹر باغ کے درختوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے لگے

تو کسی بڑھئی کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس متبرک زندہ جاوید درخت پر آرا چلائے۔

یہ درخت عجوبۂ روزگار تھا۔ اس کا نام کوئی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ۔ نہ پھول، نہ پھل۔ مگر ہریالی و شادابی نین سکھ اور سکون دل و جان۔ یہ بھی مشہور تھا کہ انقلاب سن ۵۷ء سے پہلے پھول کھلتے تھے۔ پھل لگتے تھے۔ اس بات کی شہرت بھی تھی فرنگیوں کی حکومت کے بعد تین چار بڑے خوشبودار پھول کھلے اور لال لال پھل آئے اور فرنگیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ اِدھر برسوں سے کسی نے پھول دیکھے نہ پھل پائے۔ شہر بھر میں ایسا اور کوئی پیڑ نہ تھا۔ ریاست اور ملک بھر میں لاثانی اور فرد ہو تو عجب نہیں۔ مجھے اس درخت کے وقار سے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آندھیوں طوفانوں کو آڑے لے گا۔ وہ ہمارا سپر تھا، سہارا تھا، مربی تھا، ہم سایہ تھا، ساتھی تھا، دوست اور غم گسار تھا۔ وہ قطب نما تھا۔ ایک عظیم و رفیع علامت تھا۔ پورے احاطے کی انفرادیت اُس سے قایم تھی۔ میں پہروں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ ہر موسم میں اُس کی الگ بہار تھی۔ صبح، دوپہر، شام جب دیکھیے وہ دلکش تھا۔ چاندنی راتوں میں اس کا حسن دیدنی تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ ایک بلند و بالا اور قوی جاگتا ہوا سنتری دکھائی دیتا تھا اور اس کی حفاظت میں ہم لوگ سُکھ کی نیند سوتے تھے۔ اُس کی خاموش ہم کلامی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی تو میں یہ محسوس کرتا کہ اس درخت کا بیج میرے دل میں ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ آنکرائے گا اور ایک عظیم و سرفراز شجر بن جائے گا۔

اس شاداب درخت کو کاٹ کر گرانے کی برسوں سے کوششیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کی تقدیس جاننے والے بڑھئی اور مزدور اسے کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ درخت کی رگوں میں لال لہو تیرتا ہے اور اس کا سایہ پیر صاحب کی خدمت گزاری کرتا ہے۔ وہ قبر کے کنارے جیتے جاگتے پاسبان کی طرح چوکس کھڑا تھا۔ کبھی کوئی ٹھیکہ دار دور کے شہروں سے مزدور لاکر اس پاک پیڑ کو کاٹ کے اور اُس کی لکڑیاں بیچ کر نفع کمانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ درخت کے کسی تنے یا شاخ پر تبر چلاتے ہی سُرخ عرق ٹپکنے لگتا اور کارندوں پہ دہشت طاری ہو جاتی اور کام رُک جاتا۔ ایک بار کوئی کلھاڑا چلانے والا درخت کی کسی اُونچی شاخ سے گر کر مر گیا۔ کبھی کوئی مزدور خطرناک طور پر بیمار پڑ جاتا۔

غرض یہ کہ حیات و رحمت کا علم بردار درخت فضا کی رفعتوں پہ لہلہاتا رہا اور اُس کا ماحول امن کا گہوارہ بنا رہا۔ اُسے دیکھ کر شکتی اور شانتی کا احساس ہوتا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں نہ جانے کہاں سے ایک سخت دل اور بیباک ٹھیکہ دار کو انجان اور ڈھیٹ کارندے مل گئے۔ اور ایک نئی ترکیب سے اس شاندار پیڑ کا قتل شروع ہُوا۔ بڑے بڑے لانبے اور موٹے رسّوں سے اُسی درخت پر پھانسیاں بنائی گئیں۔ بالائی پتلی پتلی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر پھانسی چڑھایا جانے لگا۔ پھر بڑے تنوں کی باری آئی اور انھیں آرے سے کاٹ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ کئی مزدور کٹے ہُوئے تنوں کو آہستہ آہستہ جُھلاتے ہُوئے زمین پر لے آتے۔ یہ اہتمام اس لیے تھا کہ گوارڑوں کو نقصان نہ پہنچے۔ یہ پیڑ جڑ کے پاس سے کاٹ کر گرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا وقار و جلال لرزہ پیدا کر دیتا تھا۔ اُس میں زمین کا یہاں بخش رس تھا، بلند آسمان کی کرنوں کی روشنی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی شادابی تھی۔

پندرہ دنوں تک اس درخت کو پھانسی دی جاتی رہی، عضو بہ عضو۔ لال لال عرق بہتا رہا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد

خون کے چکتوں کی طرح جم جاتا۔ اس کے عرق کا رنگ ببول کے گوند کی طرح پیلا نہ تھا۔ کوارٹروں کی نالیوں میں لال لوتھڑے کیچڑ کے ساتھ مل کر بہہ رہے تھے۔

اچانک کئی مزدور بیمار پڑ گئے اور کئی موٹے موٹے رسّے پارہ پارہ ہو گئے۔ پندرہ دنوں کے لیے کام رُک گیا۔ لانبے لانبے بالوں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے ٹھیکہ دار کو بڑی تشویش ہُوئی۔ محلّے کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں اور پیر صاحب کی کرامات کے چرچے ہونے لگے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اونچا جھاٹ درخت کٹے تو وہ اپنے کوارٹروں کے چھوٹے چھوٹے احاطوں میں مولی، گوبھی، آلو اور چقندر اُگا کر کچھ پیسے حاصل کر لیں۔ اس عظیم درخت کی قلمرو میں مولی اور چقندر کہاں اُگ سکتے تھے۔ ہاں امن، سکون، طمانیت، راحت اور حُسن کی نشوونما ہوتی رہتی تھی اور چین کی برکھا برستی تھی۔

کام پھر شروع ہو گیا۔ درخت کے بڑے بڑے موٹے موٹے تنے کٹنے لگے۔ کئی تنوں سے جہازی رسّے کئی سمتوں میں باندھے جاتے تھے اور اُن کے سرے درجنوں مزدور زمین پر کھڑے تن کر پکڑے رہتے تھے۔ درخت کے تنوں پر کُلہاڑے اور آرے سے زبردست مزدور اُس کے جوڑ بند کاٹتے جاتے تھے اور مضبوط رسّوں سے باندھ کر اُنھیں آہستہ آہستہ جُھلا جُھلا کر زمین پر کوارٹروں سے بچا بچا کر گرایا جاتا تھا۔ دور سے ایسا لگتا کہ قد آور گٹھیلے بدن کے پہلوانوں کو پھانسی دی جا رہی ہے اور اُن کی جسیم لاشیں زمین پر پڑی ہیں۔ روزانہ دو یا تین تنے ہی کاٹے جا سکتے تھے اور اُنھیں نیچے لانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ رسّے کئی پہلوؤں سے باندھے جاتے اور کئی سمتوں سے کھینچے جاتے تھے اور مرکزی رسّے کو دھیرے دھیرے ڈھیل دے کر اس حساب سے دیو قامت تنوں کے ٹکڑوں کو کوارٹروں کی چھتوں اور دیواروں سے بچا بچا کر زمین پر گرایا جاتا تھا کہ ان پر ضرب نہ پڑے۔ پھر بھی زور کا دھماکہ ہوتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔

چند دنوں میں جیتے جاگتے، شاداب و مسرّت بار درخت کا عضو عضو کاٹ ڈالا گیا جیسے یہودی لوگوں کو صلیب پر چڑھانے کے بعد ان کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ میرا ذہن مہینے بھر تک سُولی پر چڑھتا رہتا اور میرے دل کو صلیب دی جاتی رہی۔

اب ایک مہیب رُعب دار جڑیلا تنا اور اسی سے نکلے ہوئے دو ثانوی تنوں کے ٹکڑے بے برگ و بار بے دم ہو کر رہ گئے۔ اوپر کے دونوں تنوں سے بندھے رسّے جھول رہے تھے۔ ایک صبح میں اپنے احاطے میں ٹہل رہا تھا۔ میری نظر اُس ٹُھنٹھ درخت پر پڑی۔ زمین پر تنوں کی لاشیں بے سُدھ بکھری ہُوئی تھیں۔ بہت سے تنے اور شاخیں ٹھیکیدار بیل گاڑیوں پر لے جا چکا تھا۔ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ سامنے ایک دیو قامت غُلیل ہے، اُس کا عظیم دوشاخہ آسمان تک بلند ہونا چاہتا ہے اور مہیب دستہ دھرتی کے ہاتھ میں ہے اور اب سسکتی ستائی دھرتی کٹے ہُوئے تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹُونوں کو چوٹی پر جما کر شست باندھے گی اور قاتلوں پر بھرپور نشانہ لگائے گی۔

ایک روز دوشاخہ بھی کاٹ دیا گیا۔ مگر گرتے گرتے دوشاخہ کے ایک بازو نے ایک کوارٹر کی دیوار سے ٹکرا کر اسے شق کر دیا اور دوسرے بازو نے دوسرے کوارٹر کے گیراج کی چھت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

نہ جانے کیوں مہینوں قتل و غارت کا کام پھر ٹھیکیدار نے روک دیا اور وسطی جڑیلا تنا دیوار سے لٹکی ہُوئی لاش کی طرح

کھڑا رہا۔

ہفتوں یہ دردناک تنا مقتول امن و شادابی کی علامت بن کر میرے دل میں تیرِ نیم کش کی طرح پیوست رہا۔ اور دو شاخے کے دونوں بازو کسی عظیم ٹوٹی ہُوئی بیساکھی کے بالائی حصوں کی مانند اُس سروِ تن بریدہ درخت کی لاش کے سامنے زمین پر پڑے رہے۔

بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے ختم ہو گئے اور اساڑھ آ گیا۔ وقفے وقفے سے بادل کے ٹکڑے آتے اور کچھ چھڑکاؤ ہوتا رہا۔ ایک صبح رُوح پرور معجزہ رونما ہُوا۔ اُسے دیکھ کر ہم سب خوشی سے لہلہا اُٹھے۔ چند ہی دنوں بعد ٹھیکیدار پھر نمودار ہُوا اور درخت کے وسطی تنے پر مزدوروں کو آرا چلانے پر آمادہ کیا۔ پہلے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ ہم لوگ چوکنا ہو گئے اور بھاگتے ہُوئے مقتول درخت کی طرف آئے۔ دیکھا کہ درخت کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔

ہم لوگوں نے ٹھیکیدار اور عملہ سے پُر زور احتجاج کیا اور اُنھیں صاف صاف کہہ دیا کہ جڑ والا تنا ہرگز نہیں کٹنے گا۔ جو زمین پر گرے ہوئے تنوں کے ٹکڑے ہیں اُنھیں چاہو تو اٹھا کر لے جاؤ، جڑ میں اب ہرگز ہاتھ لگانے نہیں دیا جائے گا۔ تند و تیز مجادلے کے بعد ٹھیکیدار اور اس کی ذرّیت دفع ہُوئی اور دوسرے دن وُہ لوگ تنوں کے افتادہ ٹکڑے لاد کر لے گئے۔

مجروح جڑیلا تنا صبر، استقلال، اطمینان اور اُمید کے ساتھ کھڑا ہُوا تھا۔ اس کے بالائی پہلوؤں میں سرسبز نئی کونپلیں پھُوٹ رہی تھیں اور کوارٹروں کی چھتوں سے اُونچی چند نئی ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

وُہ رحمت نشاں درخت مر کر پھر جی اُٹھا تھا کیونکہ اُس درخت نے ابھی اور بہت کچھ دیکھنا تھا۔

روغنی پتلے

ممتاز مفتی

شہر کا ایسٹ شاپنگ سنٹر ——— جس کی دیواریں شلف الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں، جس کا بنا سجا فیکیڈ جلتے بجھتے رنگ دار سائینز مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹرز مختلف رنگوں کے گلو کلرز پینٹس کی دھاریوں سے سجے ہوئے ہیں اور شلف دیدہ زیب سامان سے لدے ہیں ن کے کاؤنٹروں پہ سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں استادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں۔ جو ان کے اردگرد یہاں وہاں سارے جگہ جگہ رنگا رنگ ملبوس پہنے کھڑے ہیں ——— ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انھیں کچھ نہ خریدنا ہو لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت بنا دیتا ہے۔ کچھ پاش چہروں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیٹسٹ فیشن کی بات کر کے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں۔ نوجوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ سے میل کرنے سے اٹا سٹا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی نمائش کے لئے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھاگ بیگمات گرین پتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں رومان آرکیڈ بھی ہے۔ کیوں نہ ہو آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زربفت سے گاڑھے تک۔ موسٹ ماڈرن گیجٹس سے سوئی سلائی تک۔ سی ہمردے رنگین مالاؤں تک سب کچھ وہاں موجود ہے لوگ گھوم گھوم کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالا لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈگنیٹریز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انھیں خاص انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کا لباس پہنے کھڑے ہیں۔ چہروں پر جوانی کی سرخی جھلملا رہی ہے۔ آنکھوں میں رت بھری چمک ہے ہونٹوں پہ رضامندی بھرا تبسم کھدا ہے۔ جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمٹتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لیے بے تاب ہوں۔

اگرچہ یہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناع نے انھیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی الیوژن لہریں لے رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں۔

سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی " ہے مجھے سنبھالو میں گری جا رہی ہوں " اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا " ہولڈ آن ڈارلنگ ۔ میری گود میں گرنا ۔"

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں ۔ منی سکرٹ والی ۔ ساڑھی والی ۔ بیدنگ کاسٹیوم والی ۔ میکسی والی ۔ سی تھرو لباس والی ۔ لٹکتے بالوں والی ۔ پتلون والی ۔ ننگے پاؤں والی ہپی ۔ ٹوکرا بالوں والی ۔ انگلی سے لگے بچے والی ۔

ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں ۔ شکاری جیکٹ والا دانشور ۔ موٹر سائیکل والا بلیک سوٹ ۔ اچکن ۔ ہپی ۔ کرتے پاجامے والا سٹوڈنٹ ۔ ڈینڈی ۔ مصور ۔

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چلی گئی ہے جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے پرانی میزیں کرسیاں شلف اور پتلے جن کا رنگ روغن اڑ چکا ہے ۔

رات کا وقت ہے آرکیڈ بند ہو چکا ہے ہال میں سات آٹھ بتیاں روشن ہیں ۔ شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے ۔

گھڑی نے دو بجائے ـــــ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ پتلوں نے آنکھیں کھول دیں ۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں

سی تھرو نے انگڑائی لی ۔

منی سکرٹ نے اپنی ٹانگ اٹھائی ۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانکا عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا ۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چمکائی ۔ لٹکتے بالوں والی سے چھینٹے اڑنے لگے ۔

" مائی گاڈ " سی تھرو چلائی " یہ دیکھو اس نے اپنی ٹانگ لہرائی میری ٹانگ پر نیلی رگیں ابھر آئی ہیں کھڑے کھڑے ۔

کیوں نہ ہو بلیو بلڈ ہے " بلیک سوٹ مسکرایا ۔

دور سے ایک آواز آئی " ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں " ۔ سب کوک بکس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے ۔

" تیرے ہاتھ تو خالی ہیں ۔ کہاں ہے ساغر " کرتے پاجامے والے نے پوچھا ۔

" اندھے وہ تو خود ساغر ہے ۔ دکھتا نہیں تجھے " جین والا ہنسا

" میں تو بور ہو گئی " منی سکرٹ نے آنکھیں گھما کر کہا ۔

" کیوں مذاق کرتی ہو " موٹر سائیکل نے گلیڈ آئی چمکائی ۔

" تم تو سراپا حرکت ہو تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے تم کیسے بور ہو سکتی ہو "

" کیوں بناتے ہو اسے اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں تھرکے گی کہاں سے " ۔ دور کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا ۔

" ہاں " پہلوان نما کرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا " وہ تو مٹیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی ۔ اب تو کاٹھ ہی

کاٹھ رہ گیا ہے۔“

”شٹ اپ“۔ تیکھی جبین والے نے آنکھیں دکھائیں ”اپنے دقیانوسی رجعت پسندانہ خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا متعفن نہ کرو۔“

”اے مسٹر اچکن“ اسٹوڈنٹ چلایا۔ ”ذرا آئینہ دیکھو یوں لگتے ہو۔ جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو۔“

”یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے۔“

”اینٹیکس میوزیم میں۔“ جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

”بالکل۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔“

”یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں۔“

”ہپوکریٹس“ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”اگنورومم ہٹاؤ۔ کوئی اور بات کرو۔“ سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی۔

”ہاؤ کین وی اگنور ہم۔ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔“

”نانسنس ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگریس موومنٹ۔“ جیکٹ والا چلا کر بولا۔

”ہیر ہیر“۔ تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

”ہا ہا ہا ہا ہا۔“ اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کھرج تھی انداز والہانہ تھا۔

تالیاں رک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں ابھریں۔

”کون ہے یہ۔“

”کون ہنس رہا ہے۔“

”پتا نہیں اوپر سے آواز آ رہی ہے۔“

”ہے میں تو ڈر گئی کتنی ہورس آواز ہے۔“

قہقہہ رک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی ٹھک ٹھک ٹھک۔

”کون چل رہا ہے اوپر۔“

”ہے میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔“

”پتا نہیں کون ہے۔“ منی سکرٹ بولی۔

”ڈونٹ فیئر ڈارلنگ۔ آئی ام ہیر بائی یور سائیڈ۔“

”وہ دیکھو وہ۔“ ٹوکرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

”اوپر۔ گیلری سے جنگلے پر۔“ ساڑھی والی ڈر کر بولی۔

سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اُٹھ گئیں۔

گیلری کی ریلنگ سے ایک بڑا سا بھیانک چہرا جھانک رہا تھا۔

"توبہ ہے" "اُف" "ہائے" تیلیوں نے شور مچا دیا۔

"کون ہے تو" موٹر سائیکل والا اپنا سائیلنسر نکال کر غرّایا۔

"میں وہ ہوں جو ایک روز مشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا جہاں آج تو کھڑا ہے۔"

"اس کی آواز اتنی بھاری کیوں ہے" سی نقرہ نے سینہ سنبھالا۔

"کہاں سے بول رہا ہے یہ" پتلون والی نے پوچھا۔

"میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم پھینکی جانے والی ہو" لنگی والا کہنے لگا۔

تیلیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چیخیں سی نکلیں "نو نو۔ نو نو" "نیور" "مائی گاڈ" "ہے اللہ" وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"ڈونٹ مائنڈ ہم ڈارلنگ" جین والا بولا "یہ تو پٹا ہوا مہرہ ہے۔ پٹے ہوئے مہرے سے کیا ڈرنا"
دیٹّس دیٹس اٹ دے بلانگ ٹو دی پاسٹ۔"

"یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں" جیکٹ والا حقارت سے بولا۔

"بڑے میاں سلام" جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا "ماضی پرستی کا دَور ختم ہُوا۔ حضرت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔"

گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اُٹھ بیٹھا "احمق ہیں یہ جدیدیت کے دیوانے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے نہ جدید جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔"

"یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے" مشہدی لنگی نے قہقہہ لگایا "کہ دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے کل نیچے چلا جائے گا جو آج نیچے ہے کل اوپر آ جائے گا۔"

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی "ان کباڑ خانے والوں کی باتیں نہ سنو یہ بیچارے کیا جانیں جدیدیت کو۔"

"جدیدیت کے دیوانے آج تیری پتلون کے پائنچے کھلے ہیں کل تنگ ہو جائیں گے پرسوں پھر کھل جائیں گے یہی ہے تیری جدیدیت۔" رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔

"ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو" لنگی والا بولا "نیلی پتلون پر سرخ ٹکی لگی ہوئی ہے ہا ہا۔ ہا ہا" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے

"احمق یہ ٹکی نہیں۔ پیچ ہے پیچ۔ پیچ فیشن ہے۔ پیچ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دگنی ہوتی ہے تجھے کچھ
بھی ہو۔"

"یہ پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوڑھی ہو۔ آج تم اس پیو

کی نمائش پہ فخر محسوس کر رہے ہو۔" مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ "تم عجیب تماشہ ہو۔"

"رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔ "دورِ جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو۔ پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔"

"سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔" ہپن نے سر اٹھا کر کہا۔

"ہائیں یہ کیا کہہ رہی ہے۔" پتلون والی نے پوچھا۔

"لو، سی مترو۔ زیرِ لب گنگنائی۔ "چھینی بھی بولی۔"

"ہاں۔" ہپی نے سینے پہ ہاتھ مارا۔ "سارا کریڈٹ ہمیں جاتا ہے۔"

"کس بات کا کریڈٹ۔"

"تعفن کا کریڈٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کونسا۔" بیدنگ کاسٹیوم بولی۔

ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہپی نے قہقہہ لگایا۔ جدیدیت کے ذہنی تعفن کو دور کرنے کا کریڈٹ۔ جدیدیت کے بُت توڑنے کا کریڈٹ چھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لئے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا۔

سپورٹس گرل نے بیڈمنٹن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

"ڈینٹل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو میڈم۔" ہپی ہنسا۔ ہم نے دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے چھوٹے رکھ رکھاؤ کا بُت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سمال کمفرٹس کی نفی کر دی ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔"

"یہ بیچارے کیا جانیں۔" ہپن بولی۔ "ظاہریت کے متوالے۔ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اُسے مسمار کرنے کے لئے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ہم وہ مجاہد ہیں۔"

"تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔" رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

"بالکل درست۔" لنگی والا چلایا۔ "یہ ٹرانزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لئے جمعدار آ جاتے ہیں۔ یہ دور جمعداروں کا دور ہے۔"

"سِلّی فول" سی تھرو ہنسی۔ "یہ تو رومانس کا دور ہے۔"

"رومانس۔" گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر ریلنگ پہ آ کھڑا ہوا۔ "تم کیا جانو رومان کیا ہوتا ہے ——— تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو غنڈا بنا کر رکھ دیا۔ محبوب سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی۔"

"بالڈرڈیش۔"

"نانسنس۔"

رومی ٹوپی نے ایک لمبی آہ بھری۔ "دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔"

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا عینک اتاری۔ "ہم جنس کے متوالے نہیں ہم جنس کی لذت کی دلدل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دورِ حاضرہ میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالاتِ حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔"

"حالاتِ حاضرہ۔" رومی ٹوپی نے قہقہہ لگایا۔ "تمہارے نزدیک حالاتِ حاضرہ روٹی کپڑا اور مکان ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ انا کا ہے۔ SELF کا۔ "میں" کا۔"

"روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو۔" ہپن چلّائی۔ "جو ملتا ہے کھا لیتے ہیں جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے جو میسر آتا ہے پہن لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ مسئلے جنھیں تم اہرامِ مصر بنائے بیٹھے ہو۔"

"اونہوں انھیں کچھ نہ کہو۔ یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں انھیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" رومی ٹوپی والا بولا۔

"کل جب روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا بتاؤ۔" ہپن بولی۔

"یہ تو حرکت کے متوالے ہیں منزل کے نہیں۔ انھیں صرف چلنے کا شوق ہے پہنچنے کا نہیں۔" مشہدی لنگی نے منہ بنایا۔

"بکو نہیں۔ ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔"

ہپی قہقہہ مار کر ہنسا۔ "سو واٹ۔ ہم ہپیوں پہ رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ بے شک لگاؤ۔ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اڑایا ہے ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔"

"صرف یہی کہ طریقِ کار مختلف ہے۔" ہپن نے لقمہ دیا۔

ہال پہ سناٹا چھا گیا۔

سی تھرو اپنے جسم کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی اپنا پلو سنبھال رہی تھی سٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چقندر بنا ہوا تھا۔ جیکٹ والا سر کھجلاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ "کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گزری۔"

مجنوں ملنگ نے قہقہہ لگایا۔ "خرد کو زندگی کے متوالے گردانتے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے بغیر چل نہیں سکتے۔ زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مسٹر زندگی حال ہے کسی صاحبِ حال سے پوچھو۔"

"جو قیل و قال کے دیوانے ہیں انھیں حال کا کیا پتا۔" لنگی والا بولا۔ "انھیں اتنا نہیں پتا کہ حال پہ قیل و قال نہیں ہو سکتا۔

حال کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔"

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دور سے ایک سرگوشی ابھری ——"میں کہاں آ پھنسی ہوں میں کہاں آ پھنسی ہوں۔" بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی۔ "یہ دور ماں کا دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔"

"عورت کا نہیں بی بی۔" پہلوان کرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ تو لڑکی کا دور ہے۔ انھیں کیا پتا کہ عورت کے کتنے ہی بال سفید ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔"

"خاموش" آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی۔ "سنو سنو یہ کیسی آواز ہے۔"

"کونسی آواز۔"

"کدھر ہے آواز۔"

"چپ"۔ ٹوکرا بالوں والی نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ لی۔

سب کان لگا کر سننے لگے۔

"ارے"۔ موٹر سائیکل چلایا۔ "یہ تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔"

"یہ آواز تو باہر سے آ رہی ہے۔" منی سکرٹ نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

"ہائے اللہ"۔ سی تھرو بولی۔ "یہ آواز تو ایمرجنسی فون بوتھ سے آ رہی ہے۔ وہ جو باہر پورٹیکو میں ہے۔"

"خاموش"۔ شکاری ڈانٹ کر بولا۔ "سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ ——وہ آ رہا ہے۔"

"کون آ رہا ہے۔" سی تھرو نے زیرِ لب پوچھا۔

"چوکیدار۔"

"چوکیدار"۔ تتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔

سامنے ایک اونچا لمبا جہلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سونٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

"بالکل اجڈ نظر آتا ہے۔" پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

"دھکائی۔ رُوڈ۔ ان کوتھ۔" ٹوکرا بالوں والی دانت بھینچ کر بولی۔

"میرے بدن پر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔" سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سونٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسبِ معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

"ضرور کوئی ایمرجنسی ہے۔" شکاری نے چلاتے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا۔ "ایمرجنسی — یہ دور تو بذاتِ خود ایک سٹیٹ آف ایمرجنسی ہے۔"

"ایک اُبال ہے۔ بے مقصد ابال۔" لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ نے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اُوپر دیکھا۔

"اگنور ہم مائی ڈیر۔" موٹر سائیکل نے سائیلنسر فِٹ کر کے کہا۔

"میں کہتا ہوں ضرور یہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے ضرور کوئی آنے والا ہے۔" سٹوڈنٹ زیرلب بولا۔

"چوکیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے۔" سی تھرو نے ہونٹوں پہ زبان پھیری

لنگی والے نے مسکرا کر پوچھا۔ "بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے ہوتی تو تُو سی تھرو نہ ہوتی۔"

"کتنی ڈراؤنی شکل ہے چوکیدار کی۔" پتلون والی، لنگی والے کے سوال کو دبانے کے لئے بولی۔

رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا۔ "کتنی عجیب بات ہے اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم جاتی ہیں۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔"

"شٹ اپ۔" پتلون والی ڈانٹ کر بولی۔ "یو۔ ان کلچرڈ۔ ان کوتھ۔ سیویج۔"

"ول سیڈ۔" بلیک سوٹ نے کہا۔ "ہیر ہیر — جنٹلمن چیرز۔"

سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ "ہمارے دور میں ان سویلائیزڈ۔ اَن ایجوکیٹڈ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔" جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

"تمہارا دور۔" مجنوں نما ہنسا۔ "نقالوں کا دور۔ چربہ دور۔ یہ دور مغربی تہذیب کی کاپی ہے کاپی۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کرو۔ ان کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے لگتوں سے نفرت کرو یہی نام۔"

"مغربی تہذیب مغرب میں خودکشی کر چکی ہے۔ چاند غروب ہو چکا ہے۔ اس کی آخری شعاعیں یہاں سرابی رنگ دکھا رہی ہیں۔" ہپی مسکرایا۔ "اور —"

"میں کہتی ہوں۔" ہپّن نے اس کی بات کاٹی۔ "اگر نقالی ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے زندگی ہے۔ چربہ بنا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا بنو جو ابھر رہی ہے۔ کیوں ڈوبتے سورج کو پوج رہے ہو۔"

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آ کر بولا۔ "کون نہیں جانتا کہ کونسی قومیں ابھر رہی ہیں۔"

شہدی لنگی قہقہہ مار کر ہنسا۔ "ذرا اس فیشن آرکیڈ پہ نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ اُن قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو۔"

"کیا یہ منی سکرٹ۔ یہ سی تھرو بی بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعویدار ہو کیا تمہارا دور جس پہ تم اتنے نازاں ہو تمہارے مقاصد کی نشان دہی کرتا ہے۔" رومی ٹوپی والا جوش میں بولا۔

"ابھی ہم جدوجہد کے عالم میں ہیں۔" سٹوڈنٹ نے اپنے ٹوکرا بالوں کو جھٹک کر سنوارتے ہوئے کہا۔

مجنوں نما ہنسا۔ "ذرا آئینہ دیکھو میاں کیا جدوجہد کرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تمہاری ہیں کیا ان کی قلمیں سارنگی نما ہوتی ہیں۔ کیا ان کے سروں پر بالوں کے ٹوکرے دھرے ہوتے ہیں کیا اُن کی آنکھوں میں سرمے کی دھار ہوتی ہے کیا وہ ایسے بنے ٹھنے ہوتے ہیں جیسے تم ہو۔ تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا۔ ایمان سے

ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔

سب چپ ہو گئے رومی ٹوپی ہنسنے لگا۔

کسی نے رومی ٹوپی کو جواب نہ دیا۔

"وہ دن کب آئے گا۔" دور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔

"کون سا دن؟" بی بی کرتے پاجامے نے پوچھا۔

"جب مجھے ماتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہو گی۔" بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں بولی۔ "جب اس آرکیڈ میں میں سر اٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔"

"سچ کہتی ہو بی بی آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔" رومی ٹوپی نے کہا۔

"وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں" کرتے پاجامے والا بولا۔ "بچوں سے کہتی ہیں۔ مجھے باجی کہہ کر بلاؤ۔"

"آج کی عورت عورت بن کر جینا چاہتی ہے، ماں بن کر نہیں۔" لنگی والا بولا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ ہم نے اُسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے۔" بلیک سوٹ نے کہا۔

"تمہیں کچھ پتا بھی ہو"۔ رومی ٹوپی ہنس کر بولا۔ "وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں۔ جنہوں نے ماتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔"

پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے جیکٹ والے نے عینک اتار کے صاف کی۔ اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔"

"بالکل بالکل" بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"بچے کم خوشحال گھرانا۔" موٹر سائیکل گنگنانے لگا۔

"سبحان اللہ۔" مشہدی لُنگی بولا۔ "سوشل ازم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔"

"بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہو گی بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کر دی گئی تو تخلیق کا عمل مدھم پڑ جائے گا شاید ختم ہو جائے۔" رومی ٹوپی نے کہا

"مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔" مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

پتلیاں ایک دوسری سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ؟"

"گاڈ نوز۔"

"ہے۔ چلڈرن آر اے نوئے سنس۔"

"سیانوں نے کہا تھا۔" کرتا پاجامہ کہنے لگا کہ ——

"کون سیانے؟" جیکٹ والے نے پوچھا۔

"ہمارے اگلے لوگ۔" کرتا پاجامہ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"تم اپنے اگلوں کی کیا بات کر رہے ہو۔" لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ "انھیں سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان کے اگلے تو مغرب میں رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی تہذیب کے دیوانے ہیں۔"

"وہ دن دور نہیں۔" اچکن والے نے کہا۔ "جب انھیں اپنے گھٹنوں کو اپنانا پڑے گا۔"

"بھول جاؤ وہ دن۔" جیکٹ والا جلال میں بولا۔ "وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔"

"ہم ترقی کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔"

موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا۔ "کیوں ڈارلنگ؟"

"فارگٹ دیٹ ڈے۔ اٹ ول نیور کم۔" لٹکے بالوں والی نے بال جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اٹھ بیٹھا اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا سر پہ کلاہ تھا۔ "کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا تمھیں نظر نہیں آ رہا کہ دنیا کا نظام بدل رہا ہے۔"

"اچھا بدل رہا ہے کیا۔" شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتلے ہنسنے لگے۔

"دنیا کے سارے مذہب سارے نجومی۔ سارے سیرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔" چغے والا چلّایا۔

"عیسائی مسلمان یہودی ہندو سبھی مانتے ہیں۔ اسٹرالوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں۔" رومی ٹوپی نے کہا۔

"وہ گولڈن ایج۔" چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پہ مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن ہوگا۔ اطمینان کا دور دورہ ہوگا۔"

موٹر سائیکل نے طنز بھرا قہقہہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا۔ "ضعیف الاعتقادی نہیں خوش فہمی ہے یہ۔"

"اچھا۔" ماں بولی۔ "کیسا گولڈن ایج ہوگا وہ۔"

"نشاۃ ثانیہ" ۔ چیخنے والا چلا کر بولا ۔

"نشاۃ ثانیہ" ہال کی دیواریں گونجنے لگیں ۔

"دنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے ۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا" چیخنے والا بولا ۔

"اس کے اثرات سنہ ۱۹۸۰ء تک یا اس کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے "

ٹوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی " سچ ۔"

ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا ۔

سی تھرو کا رنگ اڑ گیا ۔

سارے پتلے سہم سے گئے ۔

خاموش لٹکے بالوں والی چلائی " وہ دیکھو وہ " اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا ۔

سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے ۔

"کیا ہوا " دوسرے پولکا کیس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا ۔

" کیا بات ہے ۔"

" پتا نہیں ۔"

"کون ہے "

دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگیں ۔

موٹر سائیکل نے اپنا سائیلنسر فٹ کر کے کہا " وہ آ رہے ہیں ۔ خاموش " اس نے دور کھڑے پتلوں کو خبردار کیا ۔

"وہ آ رہے ہیں ۔ ادھر آ رہے ہیں "

" ہاں ہاں " لٹکے بالوں والی بولی " انتظامیہ کے لوگ آ رہے ہیں "

" بالکل " ساڑھی والی نے کہا " وہ ضرور اندر آئیں گے "

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی ۔ اسے پھر سے لگایا اور بڑے تحکمانہ لہجے میں بولا " سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ یقیناً کوئی ایمرجنسی ہے ۔ موٹر سائیکل والا بولا " ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا ۔۔ "

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لیے دوڑے ۔

گیلری میں کھڑے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا ۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا ۔ ناظم اندر داخل ہوا اس کے پیچھے نائب تھا ۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے ۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے ۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ "دیکھو۔ اس وقت تین بجے ہیں" ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہیئے۔ سمجھے" ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یس سر" نائب نے جواب دیا۔ "اٹ شیل بی ڈن"

"ہوں" ناظم نے کہا۔ "ہمارے پرائم منسٹر صاحب کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہو گا اور پاکستانی زندگی، دستکاری اور فن کا مظہر ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے"

"آپ فکر نہ کریں۔ سر" نائب نے کہا۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو بھی اتنے تھوڑے وقت میں۔ اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسی سامان کو رنگ روغن کر کے گزارا کرنا ہو گا"

"جی صاحب" کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا۔

ساڑھی والی نگاہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سی تھرو چھینٹ کا گھگھرا پہنے سر پہ پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پہ جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔

سہرا

خدیجہ مستور

کل ساجد میاں کا نکاح تھا مگر خوشی کے بجائے ان کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے بار بار کہہ رہے تھے — "اے بڑی بجیا آپ اچھی طرح سن لیں میرا بستر ہمیشہ کی طرح اماں بی کے کمرے میں بچھا رہے گا۔ اسے کوئی نہیں ہٹائے گا اور آپ بھی سن لیں چھوٹی بجیا۔ اب آپ میرا بستر اٹھوانے کی بات نہیں کریں گی، کیا سمجھیں آپ؟"

"تو کیا تم اب بھی دودھ کی بوتل نہیں بھولے؟" چھوٹی بجیا کی کترنی جیسی زبان چلتی اور وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگتیں۔ اور ساجد میاں دانت پیس کر رہ جاتے۔ گھر میں ایسی دھما چوکڑی مچی تھی کہ کوئی کسی کی بات نہ سمجھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔ رشتے ناطے کی بھاوجوں اور خاندان کی ڈھیروں لڑکیوں کا جمگھٹ ڈھول پیٹ پیٹ کر گائے چلے جا رہا تھا — "پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا —"

اپنا سہرا سن کر بھی ساجد میاں کی آنکھوں کی وحشت کم نہ ہوئی۔ ایسا لگتا کہ سہرا گلاب کے پھولوں کے بجائے کانٹوں سے گوندھا گیا ہے اور وہ کانٹے ان کی آنکھوں میں چبھ رہے ہیں۔ موٹی موٹی بادامی پتلیوں والی بے چین آنکھیں گھوم پھر کر اپنی اماں بی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی، نڈھال، لٹا لٹا سا چہرہ۔ پیروں پر لحاف ڈالے اپنے بستر پہ بیٹھی تھیں مگر جب لڑکیاں ہیک کر گاتیں — "دوڑ کر سہرے کی، اماں نے بلائیں لے لیں" ارے اماں نے بلائیں لے لیں — تو ان کے بچے کچھے ہلتے ہوئے دانت سہرے کی لڑی کی طرح ہونٹوں پر بکھر جاتے۔

"میں کتنی بار کہوں کہ اب آپ تھک گئی ہیں ذرا دیر کو سو جائیے۔ میں بھی لیٹا جاتا ہوں۔" ساجد میاں اپنے بستر پہ بیٹھ کر جوتوں کی ڈوریاں کھولنے لگے۔

"لو بھلا، میں کیسے سو جاؤں، ابھی تو بہت سے کام پڑے ہیں چھوہاروں کے تھال پوشوں پر گوٹا ٹانکنا ہے۔ سہرے اور پھولوں کے زیور کا آرڈر دلوانا ہے۔ سہرا گھٹنوں سے نیچا نہ ہو، لڑکیاں تو بس گانے بجانے میں جٹی ہوئی ہیں۔"

اب بھلا اماں بی سے کون کہتا کہ جس طرح تمام کام ان کی دونوں بیٹیوں نے اپنی مرضی سے کر لئے تھے اسی طرح رات کو گانے بجانے تھال پوشوں پر سنہری گوٹے کے بجائے روپہلی گوٹا ٹانک دیا تھا۔ سنہرے کا آرڈر بھی دیا جا چکا تھا۔ ایسا سہرا جو قدموں کو چھوئے۔ اماں بی کی اس بات کو کون مانتا تھا کہ پھول پیروں تلے آئیں تو پھولوں کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

"سب کام ہو جائیں گے اماں بی۔ آپ پہلے ہی حکم دے چکی ہیں۔ دن کے دو بج رہے ہیں اب آپ ذرا دیر آرام کر لیجئے، اے بڑی بجیا"۔ انہوں نے زور سے آواز دی "اے بڑی بجیا۔ کوئی نہیں سنتا۔ اے چھوٹی بجیا۔ خدا کے

واسطے تھوڑی دیر کے لئے ڈھول اٹھا دیجیے۔ اماں بی کو سوجانے دیجئے۔"

"کوئی نہیں سوئے گا، ڈھول نہیں اٹھے گی۔" چھوٹی بجیا نے چیخ کر جواب دیا اب ساری آوازوں میں ان کی آواز سب سے اونچی تھی ——" دوڑ کر اماں نے سہرے کی بلائیں لے لیں۔ ارے بہنوں نے بلائیں لے لیں۔ پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا ——"

"مت روکو بیٹے — گانے دو۔ یہ میری آخری خوشی ہے نیند کا کیا ہے جب فرصت ملے گی سوجاؤں گی۔" اماں بی نے بڑی محبت سے ساجد کو دیکھا اور پھر بستر پہ لیٹ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ ساجد میاں جھپٹ کر اٹھے اور کمرے کے سب دروازے بند کر دیئے۔ اب آوازیں جیسے کہیں دور سے آرہی تھیں۔

"بس اب آپ سوجائیں۔" ساجد نے اماں بی کی طرف سے کروٹ لے لی۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اماں بی اگر دوپہر کو نہ سوئیں تو ان کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ڈسپنسری سے ایک ڈیڑھ بجے ضرور گھر آجاتے۔ انھیں یہ بھی پتا تھا کہ جب تک وہ خود بھی اپنے بستر پہ نہیں لیٹیں گے اماں بی کو نیند نہیں آئے گی۔

جنریشن گیپ کے اس شدت پسند زمانے میں بہت سے لوگ ساجد میاں کو حیرت سے دیکھتے۔ شاید انھیں مہذب ملکوں کے وہ بوڑھے یاد آجاتے ہوں گے جو چھترے سفید بالوں والے سروں پہ پرانی وضع کے ہیٹ رکھے راہوں میں پڑی ہوئی بنچوں پر پہروں بیٹھے رہتے ہیں۔ ترستی ہوئی نگاہوں سے دنیا کی ہماہمی کو دیکھتے ہیں۔ پھر جانے ان کے جی میں کیا خیال آتا ہے کہ ہیٹ آنکھوں پہ کھینچ کر اونگھنے لگتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ تم اتنی دیر سے یہاں کیوں بیٹھے ہو اور اب تم اپنے ہیٹوں کی دنیا میں چھپ کر کون سے خواب دیکھ رہے ہو۔

"ساجد" —— اماں نے ہولے سے پکارا۔

"جی اماں بی"۔ ساجد میاں نے اماں بی کی طرف کروٹ بدل لی۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہارا پلنگ یہاں سے اٹھوا کر اسٹور میں رکھوا دوں؟ اب اس کی یہاں کیا ضرورت رہ گئی ہے۔"

اماں بی اپنی بھرائی ہوئی آواز پہ قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"چھوٹی بجیا نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ بڑی بجیا نے بھی یہی فرمایا تھا اور میں نے ان دونوں سے کہا تھا کہ یہ پلنگ یہی بچھا رہے گا۔ آپ بھی سن لیں اس پلنگ کو یہاں سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔" ان کی آواز میں بے حد دکھ تھا۔

"ارے پگلے یہ بستر تو تیری ذات سے سجا ہوا تھا، تیری وجہ سے میں اکیلی نہیں تھی۔ رات سوتے سوتے کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو ——" ان کی آواز بھرا گئی۔

یہ بستر اسی طرح سجا رہے گا اماں، میں کہاں جا رہا ہوں بھلا؟ آپ ایسی باتیں مت سوچئے۔

ساجد میاں نے اماں بی کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ گردن تک لحاف اوڑھا اور پھر تکئے کے نیچے رکھے ہوئے ململ کے

سفید جھاگ جیسے دوپٹے کو چہرے پہ ڈال لیا۔ یہ ان کے سونے کا اعلان تھا۔

ساجد جب چھوٹے سے تھے تو برسات کے موسم میں مکھیوں کے گچھے ان کے منھ پہ آ آکر بیٹھتے تو اماں بی پریشان ہو کر اپنے سر سے ململ کا دوپٹہ اتار کر ان کا چہرہ ڈھانک دیا کرتیں۔ مگر اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی ان کی یہ عادت نہ چھوٹی۔ اماں کا دوپٹہ آنکھوں پہ ڈالے بغیر انھیں نیند نہ آتی۔

منھ چھپا کر وہ تو اپنے حساب سوتے بن گئے۔ مگر انھیں کیا پتہ تھا کہ اماں بی مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑے انھیں کس طرح دیکھ رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کمرے کی ہر چیز گھوم رہی تھی۔ دل پہ عجیب سا ہول طاری تھا۔ انہوں نے اٹھ کر ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تو دروازے تک پہنچنے کا راستہ نہ مل رہا تھا۔ جیسے بھول بھلیاں میں پھنس گئی ہوں۔ اتنی بڑی بات سننے کے لئے بھی تو ہمت چاہئے۔ وہ ہڑبڑا کر ساجد میاں کے پلنگ سے ٹکرائیں۔

کیا ہے اماں بی؟ وہ جیسے کود کر کھڑے ہو گئے اور ڈولتی ہوئی اماں بی کو اپنے بازوؤں میں تھام کر بستر پہ بٹھا دیا۔

" یہ آپ کدھر جا رہی تھیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ سو جائیے "

" نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا لڑکیوں کے پاس جا بیٹھوں مگر بیٹے تم تو میرا سایہ بن گئے ہو "

" بس اب آپ نہیں اٹھیں گی " ساجد میاں نے اماں کو لٹا کر لحاف اڑھا دیا اور انھوں نے بھی ساجد کو دکھانے کے لئے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیں مگر نیند خاک آتی۔ وہ ایک سال سوچے جا رہی تھیں۔ تو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کا بستر پہلے کی طرح کیسے سجا رہ سکتا ہے اتنی بڑی بات اس نے کہی کیسے اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے تو پھر — سب گھنے گھنے طعنے دیں گے۔ اماں سے اتنی ہی محبت ہے تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

طعنوں کے خیال ہی سے اماں بی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اتنی سردی میں پسینے چھوٹ گئے۔ اماں بی تکئے میں منھ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگیں — " میرے بچے، میرے لعل۔ ماں صدقے۔ ماں تیری محبت پہ سے واری " ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اماں بی کے شوہر عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

اماں بی نے محلے کی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھا پڑھا کر بچوں کو پالا۔ دونوں لڑکوں کو پڑھایا — دونوں لڑکیوں کا جہیز جوڑا۔ جیسے تیسے لڑکیوں کی شریف گھرانوں میں شادیاں کیں۔ اماں بی جیسی نیک اور سمجھدار بی بی کی سارے خاندان میں دھوم مچی تھی۔ ماں اگر مصیبتوں سے ذرا بھی گھبرا جائے تو یتیم بچے بہک جاتے ہیں مگر اماں بی نے تو بچوں کو کبھی یتیمی کا احساس ہونے ہی نہ دیا۔ دونوں لڑکوں کی تعلیم پر اتنی توجہ دی کہ وہ کتاب کا کیڑا بن گئے۔ ماجد میاں بڑے تھے۔ چھٹی کلاس سے وظیفہ لینا شروع کیا تو ساجد میاں بھی مقابلے پر اتر آئے۔ ماجد میاں نے ایف ایس سی نان میڈیکل کا امتحان دیا تو پھر وظیفے کے مستحق قرار پائے ساجد نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن پائی خاندان والے مبارک سلامت کا شور بھی مچاتے اور جی ہی جی میں کڑھتے بھی۔ وہ اپنے مشٹنڈے بیٹوں کو گلے گلے تک نعمتیں ٹھنساتے مگر کوئی بھی امتحان میں سیکنڈ ڈویژن سے آگے نہ جاتا۔ یہاں یہ حال کہ دال روٹی اور کبھی کبھار گائے

کا گوشت کھانے والے ہوا پر اڑے جا رہے تھے۔

ماجد انجینئرنگ کالج میں تیسرے سال کا امتحان دے رہے تھے کہ ساجد نے ایف ایس سی میڈیکل میں ٹاپ کیا اور آرام سے میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔ اس دن اماں بی نے خدا کے حضور میں سارا دن عبادت میں گزارا۔

وقت جب امیدوں اور آرزوؤں سے بھرپور ہو تو گزرتے دیر نہیں لگتی ماجد نے انجینئرنگ کالج سے آخری سال کا امتحان دیا اور اول آ کر سب کو حیران کر دیا۔ انھیں انگلینڈ جانے کے لئے سرکاری وظیفہ بھی مل گیا۔ سارا خاندان اماں بی کی اس خوش نصیبی پر ٹوٹ پڑا۔ جو کبھی ان بے بسوں کی مدد کے روادار نہ تھے۔ مٹھائیوں کے ڈبے اٹھائے چلے آ رہے تھے مگر اماں بی کی عجیب حالت تھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں "میں نہیں جانے دوں گی۔ بیٹیاں پرائی ہو گئیں۔ یہی دونوں لڑکے میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میرے بڑھاپے کی لکڑی ہیں۔ میں کسے تھام کر چلوں گی۔"

سب حیران تھے کہ گھر آئی دولت کو کوئی اس طرح بھی ٹھکراتا ہے۔ سب کو ان کی دانائی پر شبہ ہونے لگا۔ سب انھیں خود غرض سمجھنے لگے۔ بیٹیوں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ آپ ماجد بھائی کے روشن مستقبل کو لات مار رہی ہیں۔ ماجد اماں بی کو لپٹائے بڑی مظلومیت سے بیٹھے تھے۔ وہ اماں بی کے انکار پر خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ اماں نے روتے روتے ایک بار غور سے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور آنسو پونچھ لئے۔ "جائے گا، میرا بیٹا ضرور جائے گا۔" انھوں نے سب کے سامنے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا "میں تو یوں ہی رو رہی تھی، بس یوں ہی۔"

ماجد میاں جب جانے لگے تو سب نے محسوس کیا کہ ساجد اپنے بھائی کو رخصت کرنے ہوائی اڈے پر بھی نہیں گئے۔ وہ گھر میں بیٹھے اماں بی کو لپٹائے ان کے آنسو پونچھتے رہے اس کے بعد تو وہ جیسے ماں بی کا سایہ بن گئے۔ اپنا بستر اماں کے بستر کے قریب بچھا لیا۔ کالج اور پھر گھر۔ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ اماں بی کے خراٹے انھیں ذرا بھی پریشان نہ کرتے کبھی کبھی سوتے میں وہ روتیں۔ ماجد کو آوازیں دیتیں تب وہ کتابیں چھوڑ کر اٹھتے اماں بی کے سینے پر سر رکھ کر انھیں جگاتے۔ ان کے آنسو پونچھتے اور اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے انھیں نیند کی ایک اور گولی کھلا دیتے۔

کبھی کبھی اماں بی پوچھتیں۔ جب تم یہاں کی پڑھائی ختم کر لو گے تو کیا پتا تم کو بھی سرکار وظیفہ دے دے۔ تم پڑھائی میں ہمیشہ اچھے رہے ہو، تم نے ہمیشہ وظیفہ لیا ہے۔

'ساجد میاں ہنس پڑتے۔ اماں بی میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں ایسے وظیفوں پر تھوکتا بھی نہیں۔"

پھر بھی شک کی سل اماں بی کے سینے کو کچلتی رہتی۔

بہنوں نے ساجد کو جب اس طرح اماں کی پٹی سے لگا دیکھا تو سلگ اٹھیں "کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ مہینوں ساجد بھائی کی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ اماں بی آپ نے انھیں لونڈیا بنا کر گھر بٹھا لیا ہے۔ اللہ حافظ ہے جو امتحانوں میں بھی پاس ہوں۔"

اماں بی ساری باتیں خاموشی سے سہ جاتیں اور ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیتیں۔ بیٹیوں کو یہ بھی نہ دکھائی دیتا کہ ان کی اماں کتنی لٹ گئی ہیں۔ ماجد کی جدائی نے انھیں ایک دم سے بوڑھا کر دیا ہے۔ جب ماجد کے خط آتے تو پہروں انھیں آنکھوں سے

لگائے بیٹھی رہتیں ۔

دو سال بعد ماجد وطن واپس آئے تو تحفوں سے لدے پھندے تھے ۔ دونوں بہنیں بھائی سے مرعوب ہو ہو کر جیسے بچھی جا رہی تھیں ۔ اترا اترا کر خاندان والوں کو تحائف دکھا رہی تھیں اور اماں بی کو ماجد اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ جی چاہتا اٹھا کر پلکوں پہ بٹھا لیں ۔

اتنی اعلیٰ تعلیم کے بعد ماجد کو ملازمت تو مل گئی مگر ماجد میاں بجھ سے گئے ۔ آٹھ نو سو روپے ان کے بھاویں تلے نہ آتے پھر بھی کسی سے کچھ نہیں کہا ۔ سارا دن جانے کن چکروں میں پھرا کرتے اور شام کو گھر آتے تو اماں بی کی گود میں سر رکھ کر اپنے شاندار مستقبل کی باتیں کرتے رہتے ۔ اماں ان باتوں کو سن کر نہال ہوتی رہتیں وہ بڑے چاؤ سے ساجد کو بھی ان باتوں میں شامل کرنا چاہتیں مگر وہ سر جھکائے پڑھنے میں مصروف رہتے ۔

ماجد کبھی کبھی ساجد پر اعتراض کرتے "یار یہ تم لونڈیوں کی طرح سر جھکائے بس پڑھتے ہی رہتے ہو کسی وقت باہر بھی نکلا کرو ۔ دنیا کو دیکھو اور سمجھو ۔"

" باہر گھومے تو پڑھے خاک ۔ پتا ہے کتنی مشکل پڑھائی ہے ۔ ڈاکٹر بننا کوئی آسان کام تو نہیں ۔ تم کو کیا معلوم ، تمہاری جدائی نے مجھے کتنا کمزور کر دیا ہے ۔ جب میرا بیٹا ڈاکٹر بن جائے گا تو پھر میرا علاج کرے گا ۔" اماں بی چاؤ سے کہتیں ۔

ایک سال ملازمت کرنے کے بعد ساجد نے بڑے آرام سے اماں کو بتایا کہ وہ واپس انگلینڈ جا رہے ہیں ۔ یہاں ان کے علم کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ اس سے کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو سکتے ، چند لمحوں تک اماں بی پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی مگر جب ماجد نے ان کی گود میں سر رکھ کر ان کی اجازت چاہی تو وہ بڑی مشکل سے ہاتھ اٹھا کر ان کے سر پہ رکھ سکیں ، انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جسم و جاں کا ایک ایک چپہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہے ۔

ماجد نے بڑے لاڈ سے اماں بی کے گلے میں جھول جھول کر انھیں سمجھایا "امّاں بی صرف چند برسوں کی بات ہے ۔ وہاں سے میں آپ کو اتنا کچھ کما کر بھیجوں گا کہ آپ ماضی کے سارے دکھ بھول جائیں گی ۔ یہ تین کمروں کا پرانا مکان کوٹھی میں بدل جائے گا ۔ بس آپ ایک اچھی سی بہو ڈھونڈھ رکھئے گا اور" ——— وہ اور جانے کیا کچھ کہتے رہے مگر اماں بی نے کچھ بھی نہ سنا ۔ ان کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں ۔

پھر چند دن بعد ماجد چلے گئے ۔ دونوں بہنوں اور بہنوئیوں نے ڈھیر ساری فرمائشوں اور خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ انھیں رخصت کیا ۔ اس وقت کسی نے بھی پلٹ کر یہ نہ دیکھا کہ اماں بی آنگن کی پرانی کائی لگی دیوار سے ٹیک لگائے کیوں چپ چاپ کھڑی تھیں ۔ کسی کو یہ نظر نہ آیا کہ وہ اس دکھیا کی طرح سر سے پاؤں تک جل رہی ہیں جو نہ تو کوئلہ ہوئی تھی نہ راکھ ۔

جب ساجد بھائی کو رخصت کر کے لوٹے تو انہوں نے اماں بی کو لپٹا لیا "اماں بی ، میں جو ہوں آپ کے پاس ۔" محبت کے ٹھنڈے چھینٹوں نے ان میں اتنی جان ڈال دی کہ وہ آ کر اپنے بستر پہ لیٹ گئیں اور ساجد کا سر اپنے سینے سے لگا کر ماجد کو دعائیں دینے لگیں "خدا کرے میرا بیٹا وہاں خوش رہے ۔ اس کا مستقبل چاند اور تاروں کی طرح روشن رہے ۔ اور تم

میرے بیٹے مجھ سے کبھی جدا نہ ہونا۔"

پندرہ بیس دن بعد ماجد کا خط آیا تو اماں کھلکھلا کر ہنس پڑیں "ارے کتنا بے وقوف ہے، مجھے یاد کرکے روتا ہے۔ کوئی ہمیشہ تو وہاں نہیں رہے گا۔ ایک دو سال بعد آجائے گا۔"

سارا دن وہ خط کو چومتی اور بار بار پڑھتی رہیں۔

ایک سال کے اندر اندر ماجد نے اماں بی کو اتنا کچھ بھیجا کہ انہوں نے پانچ کمروں کی چھوٹی سی کوٹھی بنوائی، پھر کمروں کی تقسیم بھی کردی۔ سب سے بڑا کمرہ ماجد کا۔ اس سے چھوٹا ساجد کا اس سے چھوٹا ان کا اپنا۔ کوٹھی بنانے کے بعد وہ چپکے چپکے ماجد کی دلہن کی بری کا سامان خریدنے لگیں۔ اب ان کی خواہش تھی کہ ماجد جلد واپس آجائے وہ ہر ایک سے کہتی رہتیں "ماتھا کوٹھیوں میں رہے یا محلوں میں۔ بچے جدا ہوں تو سب کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔"

سارا خاندان ان کی یہ باتیں سن کر بڑبڑاتا "توبہ کیسی ناشکری ماں ہے۔ ماجد یہاں رہتا تو کون سے سونے کے انڈے دیتا۔ کیا رکھا ہے یہاں۔"

کبھی کبھی ساجد جواب دے بیٹھتے "کیا نہیں ہے یہاں درختوں کو پالو پوسو اور جب وہ پھل دیں تو دوسرے ملکوں میں کھانے کو بھیج دو۔ واہ کیا بات ہے۔"

بہنوں نے یہ باتیں سنیں تو پنجے جھاڑ کر ساجد کے پیچھے پڑ گئیں "اب دیکھیں گے تم ڈاکٹر بن کر کیا کروگے۔ آج کل ایم بی بی ایس کو کون پوچھتا ہے۔ کسی سڑی سی گلی میں ڈسپنسری کھولو گے اور سارا دن بیٹھے مکھیاں مارا کروگے پیسے والے تو بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے، اس گلی کی مکھیاں تو مر جائیں گی۔" ساجد ہنستے تو بات ٹل جاتی۔

ایک سال تک ماجد کا خط نہ آیا۔ اماں بی کی آنکھوں میں انتظار کی آندھیاں آتیں مگر کوئی خط اڑ کر نہ آتا۔ وہ ساجد سے کچھ نہ کہتیں۔ وہ اسے پریشان نہ کرنا چاہتی تھیں۔ آخری امتحان میں ایک دو مہینے رہ گئے تھے۔

آخر آندھی تھمی۔ ماجد کا خط آگیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے وہاں شادی کرلی ہے۔ وہیں کی شہریت اختیار کرلی ہے۔ شادی کے وقت اسے اماں بی بہت یاد آئیں۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر ایلس نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تسلی دی تو قرار آگیا۔ آخر میں لکھا تھا کہ آپ کی بہو آپ سے ملنے کو بے چین ہے۔

اماں بی خط پڑھنے کے بعد دیر تک اکیلی بیٹھی کانپ کانپ کر روتی رہیں۔ انھیں ایلس کی ذات سے نفرت ہوگئی۔

شام کو دونوں بیٹیاں اماں بی کے پاس آئیں۔ دونوں رنجیدہ تھیں۔ دونوں ایلس کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ اماں بی نے پہلی بار بیٹیوں پر طنز کیا۔

"اس کا مستقبل بن گیا۔ اب تم لوگ خوش ہو تمھاری خواہشیں پوری ہوگئیں۔"

بڑی بیٹی تو اس وقت چپ ہوگئی مگر چھوٹی بیٹی کس طرح چپ رہتی۔ "کوئی ہم نے سکھا کر بھیجا تھا کہ وہاں پھیکے شلجم سے

شادی کر لینا، وہیں کے ہو رہنا آخر تو دنیا علم سیکھنے جاتی ہے۔ لوگ اسی طرح ترقی کرتے ہیں۔ آپ کو تو بس الزام رکھنا آتا ہے۔

اس دن پہلی بار ساجد نے اپنی چھوٹی بجیا کو ڈانٹا ”کسی وقت تو آپ اپنی زبان کو قابو میں بھی رکھا کریں۔“

”کیوں قابو میں رکھوں؟ ماجد یہاں ہوتے تو شادی نہ کرتے۔ کون سا اماں کے پہلو سے لگے بیٹھے رہتے۔ اب تم نہ کرنا شادی وہاں ——“

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اماں بی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ”جب ساجد شادی کرے گا تو — تو —— ؟“

رات کو جب اماں بی کی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو اماں بی چپکے سے بکس روم میں گئیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑے بکس کا تالا کھولا اور ماجد کی دلہن کے لئے جو بری بنائی تھی اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر بکس کو بند کر کے جب وہ تالا لگانے لگیں تو جیسے سارے جسم کی طاقت ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ”اب یہ تالا کبھی نہیں کھلے گا۔“ وہ زیر لب بڑبڑائیں اور پھر بڑے سکون سے آ کر اپنے بستر پہ بیٹھ گئیں۔

جس دن ساجد نے ایم۔ بی۔ بی ایس کے آخری سال کا امتحان دیا تو اس دن اماں بی سارا دن خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہیں کہ ان کا بیٹا اچھے نمبروں سے پاس نہ ہو۔ اسے اب کوئی وظیفہ نہ ملے۔

مگر چند ماہ بعد نتیجہ نکلا تو ان کی دعاؤں کے برعکس تھا۔ سارا خاندان مبارک بادوں سے جھولیاں بھرے سارے گھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔

”میں تو کہتی ہوں اماں بی ساجد کو سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ماجد کے پاس بھیج دیجئے۔ اب تو وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ ایسی بری بھی نہیں۔ اگر بری ہوتی تو ماجد بہنوں کو کس طرح پوچھ سکتا تھا۔ ابھی اس نے بچوں کو روپے اور کپڑے بھجوائے تھے۔“ بڑی بیٹی نے نظریں جھکائے جھکائے اماں بی کو مشورہ دیا۔ اس وقت کلرک شوہروں کی بیویوں کی ازلی مظلومیت ان کے چہرے پہ برس رہی تھی۔ اگر ساجد بھی چلا جاتا تو دونوں بہنوں کے حق میں بہت اچھا ہوتا اور پھر انھیں یہ بھی پتا تھا کہ ماجد کے مقابلے میں ساجد بہنوں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

”اماں بی اگر مائیں اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر نہ کریں گی تو پھر کون کرے گا؟“ چھوٹی بیٹی نے ماں کو گم سم دیکھ کر بڑی بہن کا ساتھ دیا —— اماں بی سامنے بیٹھے ہوئے ساجد کی آنکھوں میں عجیب طرح سے جھانک رہی تھیں۔

”چھوٹی بجیا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں کسی گلی میں ڈسپنسری کھولوں گا۔ میں یہاں رہ کر آپ بہنوں کی زیادہ خدمت کروں گا۔“ ساجد نے اس طرح کہا کہ اس کے لہجے کا طنز نمایاں تھا۔

دونوں بہنیں اس طرح بپھر گئیں جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو۔

”مت جاؤ، ہمیں کیا، جب تمہاری ڈسپنسری پر مکھیاں بھنکیں گی، تو پھر پوچھوں گی۔“ بڑی بجیا کھسیانی ہو رہی تھیں۔

”تم آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ تیئیس۲۳ چوبیس۲۴ سال کے پورے آدمی ہو اور ننھے بچوں کی طرح اماں کی پٹی سے لپٹ کر سوتے ہو مگر بات اس طرح کرتے ہو جیسے اپنی بہنوں کے ان داتا ہو۔ ارے بھیا تم ترقی کرو گے تو ہم خوش ہوں گے اور بس۔“ چھوٹی بجیا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

ساجد کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی دونوں بہنیں ناراض ہو کر چلی گئیں۔ اماں بی خاموش بیٹھی سب کا منہ تکتی رہ گئیں ویسے بھی اب ان میں اتنی طاقت کہاں رہ گئی تھی کہ جلدی سے اٹھ کر روٹھی ہوئی بیٹیوں کو منا لیتیں۔ ماجد کی جدائی، ڈائن بن کر انھیں چاٹ گئی تھی، اس پر یہ فکر کہ اگر ساجد کی ڈسپنسری نہ چلی تو —؟

ساجد میاں کی ڈسپنسری اور ان کے ہاتھ کی شفا ایسی مشہور ہوئی کہ جو عزیز دار چھوٹے ڈاکٹروں کے پاس بھی نہ جاتے وہ بھی مفت علاج کرانے دوڑ پڑے۔ اور اماں بی کے سینے پر دھری ہوئی شک کی سل بھی آخر کو سرک گئی۔ پھر بھی رات سوتے سوتے ایک بار ہاتھ بڑھا کر ساجد کے سر کو چھوتیں اور پھر اس احساس کے ساتھ سو جاتیں کہ وہ ان کے پاس ہے۔

خواب آور دوائیں کھانے کے باوجود کبھی کبھی انھیں رات دیر سے نیند آتی۔ وہ سوچتیں کہ اب ساجد کی شادی کر دیں مگر اس خیال ہی سے وہ الجھ کر رہ جاتیں کہ تنہائی اور بڑھاپا ان سے کیا سلوک کرے گا۔ ساجد بھی ماجد کی طرح بدل نہیں جائے گا۔ خاندان والے طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ بیٹیاں ان کے منہ پر کہہ گئی تھیں کہ اماں بی ساجد کی شادی نہیں کریں گی۔ اسے کولہو سے لگائے لگائے بوڑھا کر دیں گی۔ انہوں نے بڑی صفائی سے کہا تھا کہ جب ساجد اپنے ہم عمروں کو چار چار بچوں کا باپ دیکھتا ہوگا تو کیا سوچتا ہوگا۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی وہ جیسے بہری بن جاتیں۔

بہت مدتوں بعد ماجد اور ایلس کا خط آیا تھا۔ ایلس کا خط پا کر انھیں بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس نے بڑی صاف اردو میں پہلی بار اپنی ساس کو خط لکھا تھا۔ ساجد کے خط میں خاص بات یہی ایک تھی کہ وہ اپنی اماں بی کو بہت یاد کرتا ہے۔ وہ بہت مصروف تھا اس لیے خط نہ لکھ سکا۔ اور ایلس نے لکھا تھا۔

اماں بی۔ کل جب ماجد کو کاموں سے فرصت ملی تو وہ آپ کو یاد کر کے بہت رویا۔ وہ ضد کر رہا تھا کہ وہ فوراً اپنی اماں بی سے ملنے جائے گا۔ وہ اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ بہت جلد پھر باپ بننے والا ہے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ وہ لوگ جن کا حال ان کی دسترس سے باہر ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور وہ لوگ جن کا مستقبل انتظار کر رہا ہے۔ آخر انھیں ایک دوسرے کی جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور ——

اماں بی نے خط کو لفافے میں بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ سارا خط پڑھنے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ دیر تک تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہیں اور چہرے کی جھریوں کی تہوں میں لکھی ہوئی مستقبل کو جنم دینے والی ماضی کی داستان آنسوؤں سے دھلتی رہی۔

رات جب ساجد یہاں اماں بی کے ململ کے سفید جھاگ جیسے دوپٹے کو آنکھوں پر لپیٹے سونے کی کوشش کر رہے تھے تو اماں بی نے ان کو آہستہ سے پکارا۔

"ساجد بیٹے؟"

"ارے آپ ابھی تک سوئیں نہیں اماں بی؟"

"بیٹے میں سوچ رہی تھی کہ اب تمہاری شادی کر دوں۔"

"شادی؟" ساجد میاں حیرت کدہ بن گئے۔ وہ بیٹھ کر اماں بی کا منہ تکنے لگے۔ وہ تو شادی کا خیال ہی دل سے نکال چکے تھے۔

شادی کے خوب صورت تصور میں انہوں نے کتنی راتیں گزاری تھیں۔ کتنے خوابوں میں ایک سے ایک خوب صورت دلہن نتھ اور ٹیکا چمکاتی، ان کے سینے کو روندتی ہوئی غائب ہو گئی تھیں۔

"تم حیران کیوں ہو رہے ہو بیٹے؟" اماں بی تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

اماں، میں شادی نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی محبت میں کوئی اور حصے دار بنے۔ انہوں نے بہت صاف آواز میں جواب دیا۔

بیٹے، وہ لوگ جن کا دل ان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو ان کے مقابلے میں وہ لوگ جن کا مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہو، انھیں آخر ایک دن ایک دوسرے کی جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میرا کیا آج ہوں، کل نہیں ہوں۔

"اماں بی۔ یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" ساجد میاں کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔

"سو جا پگلے، مجھے اب نیند آ رہی ہے۔" لیٹ کر اماں بی نے لحاف سر تک کھینچ لیا اور پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ لیمپ کا سوئچ آف کرنے کے بعد ساجد کب تک ایک ہی طرح سے بیٹھے رہے۔

چھوٹی بجیا بند دروازوں کو پیٹ رہی تھیں۔ ساجد نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

لڑکیاں زور زور سے گا رہی تھیں۔

"بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی۔

بنی میں ڈھونڈتا چلا آیا۔

"بھئی حد ہے۔ شام ہونے والی ہے اور ماں بیٹے مزے سے سو رہے ہیں۔ ابھی تو دلہن کا کمرہ سجانا ہے۔ اماں بی ماجد کا کمرہ سجا دوں۔ سب سے بڑا اور شاندار ہے۔" چھوٹی بجیا کمرہ سجانے کے خیال سے ہی سرخ پڑی ہوئی تھیں۔

"نہیں بیٹی۔ ماجد والا کمرہ سجاؤ۔ جب کبھی وہ تم لوگوں سے ملنے آئے گا تو اپنے کمرے میں ٹھہرے گا۔"

"ان کا کیا پتا اماں بی۔ اگر بھابی کے ساتھ آئے تو آٹھ دس دن کو آئیں گے۔ اکیلے آئے تو آپ کے کمرے میں رہیں گے۔ چھوٹی بجیا رنجیدہ ہو گئیں۔ اللہ قسم وہ کمرہ سب سے زیادہ شاندار ہے۔ ایسا سجے گا ایسا ——

"ٹھیک ہے مگر اس کا کمرہ مت سجانا۔ وہ ماجد کا کمرہ ہے۔ کسی کی چیز نہیں چھینتے بیٹی۔ گناہ ہوتا ہے۔" اماں بی کی آواز بھرا گئی۔

کیا فضول باتیں ہیں چھوٹی بجیا۔ جو کچھ اماں بی کہیں وہی کیجیے۔ اماں بی آپ خیال نہ کیا کیجئے چھوٹی بجیا تو ہمیشہ کی سندی ہیں۔ آج تم کچھ بھی کہہ لو میں سب سن لوں گی۔ وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

میں اب ڈسپنسری جا رہا ہوں اماں بی۔ آپ آرام سے بیٹھیے گا۔ کام کرنے نہ اٹھ جائیے گا۔ جوتوں کی ڈوریاں باندھ کر وہ جلدی سے چلے گئے۔

اماں بی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ذرا دیر پہلے کی ہوئی بات انہوں نے پھر نہیں دہرائی۔ پھر بھی وہ ساجد کے وحشت زدہ چہرے اور

کڑے تیوروں سے ڈری ہوئی تھیں۔

ڈھول پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں چائے پینے کے بعد اب چلتے پھرتے گانے گا رہی تھیں۔

" لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا
آجا سامنے، بہ جا سامنے، کوں تے رُس کے نہ لنگ ماہیا

جب اماں بی دلہن کو رخصت کرا کے لائیں تو وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں۔ مگر آرسی مصحف اور منہ دکھائی کی رسم کے بعد جب دلہن کو اس کے کمرے میں لے گئے تو ان کے دل پر ایک دم سناٹے نے جیسے یلغار کر دی۔" اب ساجد بھی چلا جائے گا۔ آج انہوں نے اسے کھو دیا۔" کوئی جذبہ ان کا دل نوچے لے رہا تھا۔ ادھر سارے دن کی تھکن انہیں آنکھیں نہ کھولنے دے رہی تھی۔

ساجد کی نظریں مسلسل اماں بی کا پیچھا کر رہی تھیں وہ اپنے بستر پہ پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور جب رشتے کی بھاوجیں انہیں لینے آئیں تو وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ "میں ابھی نہیں جاؤں گا۔ اماں بی بہت تھک گئی ہیں۔" انہوں نے اماں بی کو سہارا دے کر آرام سے لٹا دیا۔ پھر الماری سے نیند کی دوا نکال کر دو گولیاں کھلائیں۔ پھر ان کے پائنتی بیٹھ کر سوچتے ہوئے پیروں کو آہستہ آہستہ ملنے لگے۔

" بڑی بجیا آج یہاں اماں کے پاس میرے بستر پہ آپ لیٹ جاتے۔" انہوں نے بڑی امید سے بڑی بجیا کو دیکھا۔

" میں یہاں آرام سے چپر کھٹ پہ لیٹ جاؤں تو میری سہیلیاں بُرا نہیں مانیں گی۔ وہ سب بیچاریاں قالینوں پر لڑھکتی رہیں۔" بڑی بجیا نے سمجھانے کے انداز سے کہا۔

" تو پھر آپ چھوٹی بجیا" وہ گھگھیا رہے تھے۔

اللہ، ساجد تم نے تو میری اماں بی کو دودھ پیتا بچہ بنا دیا ہے۔ اماں بی تو آج اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر آرام سے سوئیں گی۔

ساری بھاوجوں نے قہقہے لگاتے ہوئے ساجد کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا اور وہ تھے کہ اماں بی کو بے بسی سے دیکھے جا رہے تھے۔

ارے جاتے کیوں نہیں بیٹے۔ میں تو سو رہی ہوں میری تو تھکن سے آنکھ بھی نہیں کھل رہی۔

" ابھی نہیں جاؤں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔" انہوں نے بھاوجوں سے خود کو چھڑا کر پھر اماں کے پاؤں پکڑے اور آہستہ آہستہ دبانے لگے۔

بھاوجیں کچھ ناراض سی ہو کر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ اماں بی سچ مچ ذرا دیر میں خراٹے لینے لگیں۔

رات کو دو ڈھائی بجے کے قریب وہ کچھ سوتی کچھ جاگی سی تھیں کہ انہوں نے عادت کے مطابق ہاتھ بڑھا کر ساجد کے اوپر رکھ دیا۔ پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گئیں پاؤں دباتے دباتے یہ پگلا یہیں سو گیا۔ انہوں نے جلدی سے ٹٹول کر لیمپ کا

سر تک آن گیا۔

"کیا کہیں گے سب یہاں سو گیا۔" انھوں نے سارے کا سارا لحاف کھینچ لیا۔ گاؤ تکئے پر اسی طرح لحاف پڑا تھا کہ اماں بی کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ "اس نے سوچا ہو گا کہ اماں بی رات کو ایک بار اس پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ وہ ہاتھ رکھیں گی اور پھر سو جائیں گی۔ رات جانے کس وقت آ کر یہ کارروائی کر گیا ہے۔"

سوچتے سوچتے وہ برابر مسکرا رہی تھیں۔ انھوں نے سرہانے سے گلاس اٹھا کر پانی پیا پھر گاؤ تکیے کو چوم کر اسی طرح رکھ کر لحاف ڈال دیا۔ لیمپ بجھایا اور پھر لیٹ گئیں۔ ماجد تو اپنے مستقبل کی خوشی میں ماضی کے سرہانے تکیہ رکھنا بھی بھول گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنھیں جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیا اور کروٹ لے کر بڑے پیار سے گاؤ تکیہ پر ہاتھ رکھ کر چند منٹ اسے ٹٹولتی رہیں اور پھر آرام سے سو گئیں۔

پھیلتا ہُوا کاجل

آغا بابر

"اُس وقت کا خیال کر جب عورت کا بال سفید ہو جاتا ہے۔ جب عورت کے پھل پک کر سڑ جاتے ہیں اور معاشرے کی خود کار مشین اُس کو اگلی قطار سے پٹک کر پچھلی قطار میں پھینک دیتی ہے۔ اتنی دیر میں اگلی قطاروں میں نئی لڑکیاں آ جاتی ہیں۔"

"آ جاتی ہوں گی" سلیمہ بغیر کسی ردِ عمل کے بولی۔ چہرہ کورے کا کورا۔ جوار نہ بھاٹا۔ جیسے جامد پانی میں کنکر تک نہ گرے۔

یہ بات نصرت ہی نے نہیں کہی تھی۔ ایسی باتیں کئی لڑکے اور مرد کہہ چکے تھے۔ جب کوئی لڑکا سلیمہ سے ملتا وہ میٹھی گولیاں چوسنے کو دیتی۔ لڑکا چوستا رہتا۔ میٹھی چاشنی میں لپٹی ہوئی مہین مہین باتیں ربط بے ربط۔ عورت کی صحبت کو ترستے ہوئے لڑکے بالے کیا، پکے پکائے مرد بیٹھ کر ٹھرک پورا کرتے رہتے۔ اِدھر خود پرستی اور نرگسیت کو غذا ملتی رہتی۔ غضب یہ ڈھاتی کہ لڑکے کو گھر بُلا لیتی۔ اُس بے چارے کی فانٹسی اور رومانس ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ ملنے کو سو جگہیں اور ہیں۔ اِس میں کیا تُک کہ گھر میں بُلا کر ماں سے ملو، بہن سے ملو، بھائی سے ملو۔ یہ تو ستمکاری ہے۔ محبوب کا ستمگر ہونا تو جائز ہے مگر ستمکار نہیں۔ کئی لڑکے دُم دبا کر بھاگ جاتے۔ پانی کے جوہڑ میں کوئی کنکر نہ گرتا۔ ہر سال آبادی بڑھ رہی ہے۔ لڑکے جوان ہو رہے ہیں۔ کوئی اور آ جاتا۔ لڑکیوں کا جھرمٹ لگ جاتا۔ گھر بُلا لیتی۔ پکھو سے لگی بیٹھی ہیں۔ چائے بنتی، تردد ہوتا، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چہل قدمی ہوتی۔ "دیدی دیدی" کہہ کر ان کا مُنہ سُوکھتا۔ ماں بہن خوشی سے نہال کہ سلیمہ پاپولر اور سوشل ہو رہی ہے۔

ہمجولیاں تو الگ، پُرانی شاگردیں گھر بار والی ہو گئیں۔ کوئی لیبیا، کوئی کویت، کوئی سعودی عرب موٹریں دوڑاتی پھر رہیں۔ خاوند ملا۔ بچے ہُوئے۔ بھول بھال گئیں کوئی ہوتی تھی دیدی جو اُن کو چندا کہا کرتی تھی۔ چاند ڈوب جاتے تو نئے کو نکلنے میں کتنے دن لگتے ہیں۔ سلیمہ کو پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی فرصت کب تھی۔ اس کی چاہنے والیاں ہر روز، ہر ہفتے، ہر مہینے پیدا ہو جاتیں۔ میٹھے میٹھے خطاب اُس کی زبان سے کھسکے تھوڑی تھے۔ زبان پر سے مٹھاس کے اُترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی گزارنے کی ہر ایک کی اپنی طرز ہوتی ہے۔ رنگ پُختہ چڑھ جائے تو شخصیت کا جزو بن جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اور طریقے اب خود رنگ ہو چکے تھے۔ جب طبیعت مدافعت کا مورچہ بن جائے اور یہ ٹھن جائے کہ شادی کا نوٹس ہی نہیں لینا۔ کوئی جتنا کہے اتنا علمی اور عقلی دونوں طرح سے مقابلہ تو پھر۔ اپنی پُوجا کرنے والی لڑکی دُوسرے کا بُت تو نہیں پُوجتی۔ شیریں جب قصرِ شیریں سے جھانکے ہی نہ تو فرہاد تیشہ لیے کوہکنی کے لیے کیوں حاضر ہو؟ پتھر کچھ دیر پڑا رہے تو بھاری ہو کر جم جاتا ہے۔ انسان اُوپر سے ہو کر گزر جاتا ہے۔ ڈھور ڈنگر ٹھوکر مارتے ہیں۔ کُتا زیادہ سمجھداری دکھاتا ہے مُوت کر گزر جاتا ہے۔ اپنے اُوپر شباب میں کون عاشق نہیں ہوتا۔ لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ اِس عاشقی میں کسی اور کو بھی شامل کر لیں۔ عاشق بنیں معشوق۔ جل کر یا جلا کر ایک طرح سے لُطف آنے لگتا ہے۔ مگر یہ کھیل لمبا نہ بنے تو

اچھا ہے۔ ایک ماں نے جب یہ دیکھا کہ آٹھویں جماعت کا لڑکا اپنی کاپی میں لڑکیوں کی تصویریں کاٹ کاٹ کر لگاتا رہتا ہے تو بڑی گھبرائی۔ ایک روز کاپی لے کر نفسیاتی معالج کے پاس پہنچی اور اُس سے اپنی گھبراہٹ کا ذکر کیا۔ کاپی دیکھ کر نفسیاتی معالج بولا، "محترمہ! گھبرانے کی بات نہیں، یہ تو صحت مند نشانی ہے۔ اگر لڑکا لڑکیوں کی بجائے لڑکوں کی تصویریں کاپی میں لگاتا تو پریشانی ہو سکتی تھی۔"

دراصل انسان کو بنتے اور بگڑتے ہُوئے کون دیکھتا ہے۔ اُس کی شخصیت کی بھٹی میں کیا کیا کچرا آکر گرتا ہے اور پگھل کر جذب ہو جاتا ہے یہ کس کو دیکھنے کا حوصلہ ہے۔ مرد عورتوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں، عورتیں مردوں سے۔ دونوں کے فیوز کیوں اس طرح اُڑ جاتے ہیں کہ تار جوڑنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ بختیار نے کتنا چاہا کہ سلیمہ سے شادی ہو جاتے۔ تنگ آکر وُہ اسے گھر لے گئی کہ اب کم بخت بھاگے گا مگر سلیمہ کی چال کامیاب نہ ہُوئی۔ وُہ چمٹا رہا۔ آخر سلیمہ نے انکار کرنے کی گردان شروع کر دی۔

کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ عمر کس کے لیے بتا رہی ہے۔ شکل کی پری ہوتی تو بات سمجھنے میں آسانی تھی کہ کسی خوب صورت شہزادے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

کئیوں کا خیال تھا سلیمہ کا مزاج بگڑ گیا ہے۔ بڑوں بڑوں کی بیٹیاں اس کے ساتھ رہیں جو اپنے منصب کے مطابق ٹھنا ٹھن بیاہی گئیں۔ معمولی شکل کی یہ بگڑی مزاج بھی اب اُن جیسا ٹھنا ٹھن رشتہ چاہتی ہے۔

بعض لڑکیوں پر تو عاشق ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ بعض کے ہاتھ صرف خط بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔ سلیمہ کو بھی خط لے جانے والی کنواریوں ہی میں شامل کر لیجیے۔ اُسے کنواری کہلانے میں بڑا لطف آتا جیسے خلا سے نکل کر وُہ چاند پر اتر جائے اور قدموں کے نیچے چندا کی دُھول اڑنے لگے۔

"عورت کی شخصیت تو شادی کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔" یہ بھی اُس کی ایک دلیل تھی جو اُس نے عورتوں کے رسالے سے اخذ کر رکھی تھی۔ اگر کوئی کہے کہ عورت کی اہمیت تو شادی کے بعد بڑھتی ہے تو وُہ نین مٹکا کر ہونٹوں پر زبان کی تری پھیرتی اور کہتی "میں نہیں مانتی۔"

بوتیق شاپ کا علی بھائی کہتا "ام بولتا ہے اِس چھوکری کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔ ڈھیلے کا کام نہیں کرتی۔ واؤچر کاٹنا بھی نہیں آتا۔ سیلز گرلز کو کام نہیں کرنے دیتی۔ بار بار اپنے پاس بٹھا لیتی ہے۔ ام سیٹھ کو بولتا ہے وہ سُنتا ہی نہیں۔"

سیٹھ کیا سُنے گا۔ سیٹھ کے ساتھ جس نے مل کر بوتیق شروع کی اُس کی سفارشی لڑکی تھی۔ معمولی نوکری کے بعد بوتیق شاپ کا ستھرا ستھرا ماحول ملا جہاں بیگمات سے ملاقات ہونے لگی۔ اُن کے سامنے بچھتی جاتی۔ چائے پُوچھتی۔ وقت بے وقت چوکیدار کو ٹپ کرتی۔ کیشئیر کے بیوی بچوں کا حال احوال پُوچھتی۔ سیلز گرلز کو گرم گرم پکوڑے اور سموسے کھلاتی۔ اِس فضا میں سلیمہ نے اپنے بھائی کی شادی کے دعوتی کارڈ بانٹے۔ سیلز گرلز، چوکیدار، کیشئیر تو پہنچے۔ علی بھائی بھی شریک ہونے کو چلے گئے۔

"بھئی یہ چھوکری جب دعوتی کارڈ لے آئی اس طرح منت خوشامد کرنے لگی کہ ہم کیا بولتا۔ آنا پڑا۔"

"یہ بچی میٹھی چھوکری ہے۔"

"ارے بھائی لوگ اِدھر چھوکری بولتا ہے۔"

عورتوں میں بھاری کام کے دوپٹے، غرارے، ساڑھیاں، بیل باٹم، ٹیونک، میکی، ٹراؤزر سوٹ، لباس کی نوع بہ نوع دھکم پیل۔ اس دعوت میں سلیمہ کی عروج سے ملاقات ہُوئی۔ چھوٹے کمرے میں سلیمہ اپنی ملنے والیوں میں میٹھی میٹھی گولیاں بانٹ رہی تھی۔ سلیمہ کے ہیئر پیس کی ایک زلف اس کے کان کے پاس لہرا رہی تھی۔ جب وُہ اُٹھنے لگی تو عروج نے ہاتھ بڑھا کر وہ زلف ٹھیک کر دی اور کان میں کہا "آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" دونوں آنکھوں میں مٹھاس بھر گئی۔ اس کے بعد سلیمہ جہاں جاتی عروج وہاں پہنچ جاتی۔ سلیمہ شیشے کے سامنے کھڑی اپنی ساڑھی ٹھیک کرنے لگی۔ عروج آ پہنچی۔

"میں بھی ٹھیک کر لوں؟"

"کیوں نہیں۔ ضرور۔"

"آپ کی بلاؤز بہت عمدہ سلی ہے۔"

"کیسے؟"

"میں بتاتی ہوں۔ دیکھیے نا۔" عروج نے بلاؤز کی گوٹ کو چھُوا۔ پھر جیسے انجانے میں سلیمہ کے ننگے پیٹ پر انگلیاں کچھ پھسلیں کچھ رینگ گئیں۔ "نہ بہت اُونچی ہے نہ بہت نیچی ہے، بالکل جہاں ہونی چاہیے۔" پھر عروج بولی "میری بلاؤز دیکھیے۔ ذرا اُونچی سلی ہے نا؟" بلاؤز کو اپنی ننگی ناف سے کافی اُوپر کھینچتے ہُوئے وُہ بولی "دراصل یہاں ہونی چاہیے تھی، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"میرا خیال ہے آپ کا پیٹ بہت خوب صورت ہے۔" عروج نے ہنس کر سلیمہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

مہمان رخصت ہونے کا وقت آیا تو عروج سلیمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی "میری خوش قسمتی ہے کہ اس تقریب میں آپ سے دوستی ہو گئی۔ میں رُخصت پر آئی ہُوئی تھی۔ میں ٹیچنگ لائن میں ہوں، آپ بوتیق میں ہیں۔ اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیجئے۔ جانے سے پہلے آپ سے مل کر جاؤں گی۔"

"ضرور مل کر جائیے۔"

"ہائے آپ تو اتنی اچھی ہیں۔ میں ملے بغیر کیسے جا سکتی ہوں۔"

سلیمہ کی خود پرستی کے خشک پرزوں میں ٹھنڈی پیپرمنٹ ٹپک گئی۔

علی بھائی بوتیق شاپ میں کہہ رہا تھا "یہ رونگ ہے اپنی چھوکریوں پر ایک دم سختی کرنا ہے۔ بھائی، ام صرف کام مانگتا ہے۔ اپنی بھوؤں کے سارے بال نوچنے سے چھوکری کو تکلیف نہیں ہوئیں گا۔ کام کرنے سے تکلیف ہوئیں گا۔ تم عجیب مشخری کی بات کرتا ہے۔"

"ہیلو بوتیق شاپ۔ کون بولتا ہے۔ ہولڈ آن کریں۔ ابھی بلائیں گا۔"

اُس نے چپڑاسی سے کہا "سلیمہ کو بولو، اُس کا فون ہے۔"

سلیمہ فون پر باتیں کر کے چلی گئی تو علی بھائی نے کہا "دیکھو اس چھوکری نے اُس کو بولا ہے۔ آ جاؤ۔ اب کام ایک دم بند۔ ایک گھنٹہ باتیں ہوئیں گا۔"

اندازہ صحیح تھا۔ پہلے چپڑاسی چائے اور سموسے لایا۔ پھر پان آئے۔ پھر سگرٹ آئے۔ ایک گھنٹے بعد عروج کمرے سے

باہر نکل سلیمہ ٹیکسی میں بٹھانے کے لیے سڑک تک گئی۔

"آپ کی مدارات نے میرا دل موہ لیا ہے۔ میں آپ کو خط لکھوں تو جواب کی توقع رکھوں؟"

"آپ خط لکھیں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

چند خط آئے۔ پھر نہ آئے کوئی پون سال بعد ایک پرچہ آیا۔ "آپ کو شاید یہ جان کر خوشی ہو کہ میری تبدیلی آپ کے شہر میں ہوگئی ہے بس اب لمبی غٹرغوں ہوگی۔"

سلیمہ کے پاس کوئی نہ کوئی مرد بیٹھا ہوا ہوتا۔ عروج سوچتی یہ ابھی دفان ہوگا، تو اور آجاتا، پھر کوئی اور آجاتا۔ عروج نے فون پر کہا "میں محبت کی ماری تمہاری بوتیق شاپ پر خاک آؤں وہاں تو تمہارے ایڈمائیرر بیٹھے ہوتے ہیں جن سے مجھے شرم آتی ہے دراصل مجھے اُن سے جیلسی ہوگئی ہے۔"

سلیمہ خوش ہوکر بولی "تم گھر آؤ نا، سب تمہیں یاد کرتے ہیں۔ میرے بھائی میرے ماموں میرے والد میری والدہ وہ سب تم سے اتنا پیار کرتے ہیں۔" سلیمہ محض عروج کو خوش کرنے کے لیے سفید جھوٹ بول رہی تھی۔ ہاتے کتنے اچھے ہیں اِس کے بھائی، اِس کے ماموں، اِس کے والد، اِس کی والدہ سب مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ کچھ دیر میٹھی گولیاں چوستی رہے گی اور سلیمہ کے پیار محبت کا سلوپائزن رگ رگ میں سرایت کرتا رہے گا۔ کیا وارداتِ دل میں طریقِ واردات کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جرم میں جب طریقِ واردات محقق تو کیا جرمِ محبت میں کوئی طریقِ واردات نہیں؟ زبان کا یہ چرب طریقِ واردات ہی تھا۔ سب مجھے مانیں۔ میں سب کی چہیتی ہوں۔

گھر کے سب فرد عروج کے سامنے بچھتے چلے جارہے تھے محض اس لیے کہ وہ سلیمہ کی دوست تھی۔ نوکری پیشہ کماؤ تو وہ بھی تھی مگر اُس کے گھر والے اُس کی ملنے والیوں کے سامنے اس طرح تو فرشِ راہ نہ ہوئے تھے۔ اُسے شک پڑا شاید کوئی مرد اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ گھر کے مردوں کی نگاہ میں جھانکا، وہ کرن جو محبت کرنے والے کی نگاہ میں ہوتی ہے وہ کسی کی آنکھ میں نہ تھی، فقط بجھی بجھی سوئی سوئی آنکھیں۔

ایک دن سلیمہ نے محسوس کیا۔ عروج کا کسا کسا پیٹ توند بن کر جرسی میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ عروج نے دیکھا سلیمہ کا پچھواڑہ بھاری ہوچلا تھا جس کی وجہ سے اُس کی رفتار پر اثر پڑ رہا تھا۔

"میں سگرٹ پینا چاہتی ہوں۔ اب تمہارے کمرے میں کوئی آئے گا تو نہیں؟"

"بے تکلفی سے پیو۔"

عروج نے سگرٹ کی ڈبیا نکالی۔ دیاسلائی جلائی اور سگرٹ پینے لگی۔

"تم جس طرح نفاست سے سگرٹ پیتی ہو، بہت کم کو میں نے اس نفاست سے سگرٹ پیتے دیکھا ہے۔"

عروج مسکرائی۔ پھر ٹھنڈی سانس لی۔ "میں نے اپنے اِن لاز سے سگرٹ پینا ہی تو سیکھا۔"

"میں تو تمہیں کنواری سمجھتی تھی۔"

"ایک سال بعد کہانی ختم ہوگئی تھی۔ میں کنواریوں سے کم تو نہیں۔ کسی روز میرے یہاں آؤ تو ساری داستان سناؤں۔"

سلیمہ باہر چھوڑنے گئی۔ جسم کپکپایا۔ چند چھینکیں آئیں۔ عروج کی طرف جس روز جاتا تھا اُس روز بخار سے پھنک رہی تھی۔ عروج تھرمامیٹر لگاتی۔ دوا پلاتی۔ گرم دودھ کے چمچے حلق میں اتارتی۔ سر دکھتا سر دباتی۔ کمر دکھتی کمر دباتی۔ ٹانگوں میں درد اُٹھتا ٹانگیں دباتی۔ پورے آٹھویں دن بخار ٹوٹا تو سلیمہ کی والدہ نے کہا "رات کو جاتی ہو صبح آجاتی ہو۔ ایسی ہمدرد لڑکی تو کوئی ہوتی ہو گی۔" سلیمہ کے گھر والوں کے دل میں گھر کر گئی۔

بلی کھڑکی کی جالی کے ساتھ مُنھ لگائے بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ سامنے کوارٹر تعمیر ہو رہے تھے۔ ایک گراج پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی اُس میں دُھنیا بیٹھا رُوئی دُھن رہا تھا۔ عروج اور سلیمہ گاؤ تکیے کا سہارا لیے بیٹھی تھیں۔ عروج کی آواز کسی اندرونی غم سے بوجھل تھی۔ وہ اپنی ناکام شادی کا قصہ لپیٹ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آتے اور سُوکھ جاتے۔ ڈھلک آتے تو سلیمہ ہمدردی سے اپنے دوپٹے کے پلو سے پُونچھ دیتی۔ عروج نے سلیمہ کا ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لیا "میرا دل کس طرح دھڑک رہا ہے۔ میرا ہاتھ کس طرح کانپ رہا ہے۔"

سلیمہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے لگی۔

"میں نے اپنی رام کہانی سُنا کر تمہیں پریشان کیا؟"

"قطعاً نہیں —— ایسی دولخت زندگیاں گھر گھر موجود ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ میں جسے اماں جی کہتی ہوں جو باہر بیٹھی چائے بنا رہی ہے۔ میری دُور کی رشتہ دار ہے۔ ساری عمر شوہر نے آباد نہیں کیا۔ ایک دفعہ جب چائے خراب بن جائے تو دوسری دفعہ پیاز والا ہاتھ لگ جاتا ہے۔ تیسری دفعہ دھوانکی جاتی ہے۔ شروع میں درزی سے کپڑا خراب ہو جائے تو پھر لاکھ جتن کرے ٹھیک نہیں ہوتا۔ شادی ٹھیک ہو جائے تو ہو جائے، کسر رہ گئی تو رہ گئی۔ بس اس طرح مجھے مرد سے نفرت ہو گئی۔ اپنی بلّی کی طرح جو کھڑکی کی جالی سے لگ کر بیٹھی ہے۔ اِس کو نربلّوں سے نفرت ہے۔ میں دھکے دے کر نکالتی ہوں یہ اُلٹا میری گود میں خرخر کرنے لگتی ہے۔"

عروج اپنا ہاتھ بلی پر پھیرنے لگی جو کمر اکڑا اکڑا کر پیار لیتی۔ ہاتھ جب کمر سے دُم پر جاتا تو وہ گردن جھکا کر پچھلے دھڑ کو اٹھا لیتی جیسے اُس کا سارا وجود سپردگی کی آگ میں جل جانا چاہتا ہو۔ پھر وُہ بلّی کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ بلی خرخر کرنے لگی اور کپڑوں میں آئی ہُوئی قمیص کے گوڈر کو اگلے پنجوں سے لتاڑنے اور دانتوں سے چکچپانے لگی۔

"جب یہ ننھے ننھے پنجوں کی سُوئیاں چبھوتی ہے تو میرے سارے بدن میں چنچیاں پھُوٹنے لگتی ہیں۔ ہٹ مانو بلی! وہ دیکھو اماں جی چائے لے آئیں۔" عروج نے بلّی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کھڑکی میں بٹھا دیا اور چائے کی طرف متوجہ ہُوئی۔

سلیمہ نے کندھے پر آئے ہُوئے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا "کیک منگانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"چندا تم غسلِ صحت کر کے آؤ اور میں کیک بھی نہ منگاؤں۔ مجھے تو موتی چُور کے لڈّو منگانے چاہئیں تھے مگر موتی چور تو تم آپ ہو۔" اپنی تعریف سُن کر سلیمہ کی آنکھوں میں مٹھاس بھر گئی اُس نے گردن کو جھٹکا تو بال ماتھے سے ہٹ گئے۔

"تمہارا یہ جھٹکنا مجھے پٹک دے گا۔"

عروج نے بیک کاٹ ڈالا "سلیمہ! اگر تم سر کو دائیں بائیں جھٹکتے وقت ساتھ آنکھ بھی مار دو تو مرد تباہ و برباد ہو جائیں۔"

"عروج تمہاری شربتی آنکھیں، اُن کے گرد ہلکی ہلکی سیاہی، اُن میں آنکھ کا دمکتا موتی، نیچے چیک بونز (CHEEK BONES) یہ بھرے بھرے بازو، اپنی کشش کا پتا نہیں تمہیں؟"

عروج نے بازوؤں کی طرف نظریں گزاریں اور پھر بیچ والے حقے کی طرف دیکھ کر بولی "بس صرف بازو بھرے بھرے؟"

"نہیں چھاتیاں بھی رسارس۔"

"ہانے میں سینما کیا پہن کر جاؤں۔ ساڑھی یا ٹراؤزر سوٹ؟"

"ساڑھی"۔

"ٹھیک ہے۔"

عروج چائے پینے کے بعد کمرے میں ساڑھی باندھنے چلی گئی اور سلیمہ کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے بلی پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ پھر بلی کو اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ بلی پھوں میں سر دے دے کر منہ سے خرخر کرنے اور پنجوں سے لتاڑنے لگی۔

عروج نے آواز دی "سلیمہ! ذرا اندر آنا۔"

وہ شیشے کے سامنے صرف پیٹی کوٹ پہنے دو کبوتروں کو اٹھائے کھڑی تھی۔ سلیمہ بولی "اوئی بیوٹی فل!" عروج نے کسمسا کر منہ موڑا اور کبوتروں کو غلاف میں ڈال دیا۔ جب اُس نے اپنی بھری بھری باہوں کو اٹھا کر بازو کٹی بلاؤز پہنی تو بلیڈ سے بار بار مُنڈھی بغل کی کھال دکھائی دی جس کی رنگت پر امن فاختہ کے سلیٹی پروں کی سی ہو چکی تھی۔ سلیمہ نے سر کو جھٹک جھٹک کر بالوں میں کنگھی پھیری اپنے پرس سے لپ سٹک نکال کر ہونٹوں پر تہہ جمانے لگی۔ عروج نے ساڑھی باندھ کر اپنے آپ کو آگے پیچھے سے دیکھ کر ننگے پیٹ سے کچھ ساڑھی کھسکا دی۔ "دنیا میں بدن کی شرم سب سے زیادہ ہوتی ہے مگر اپنے آپ کو ظاہر کرنا آجکل سب سے بڑا فیشن ہے۔"

ٹیکسی والے نے ایک جھٹکا دے کر اپنی گاڑی سینما کے سامنے روک دی۔ عروج نے احتجاج کیا "ڈرائیور صاحب! آپ اس طرح گاڑی روکتے ہیں؟ اس جھٹکے سے تو بچہ ضائع ہو سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے ہم دونوں پیٹ سے ہیں۔"

"معافی چاہتا ہوں بی بی۔"

"توبہ توبہ" سلیمہ نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت بولی "روح جی! تم آج بہت فارم میں ہو۔" عروج اور کھل اُٹھی۔ "تفریح ہو جانی چاہیے کبھی کبھی۔ اِس طرح ہنس بول لینے سے غموں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

فلم دیکھنے کے بعد دونوں اداس ہو گئیں۔ سلیمہ ٹیکسی سے اترتے وقت بولی "تمہارے ساتھ آج اچھی گپ شپ رہی۔"

"جو رہی سو رہی اب گھر جا کر تو بستر پر پڑ رہوں گی۔ میری تنہائی کا بھی خیال کرو۔"

"یعنی کوئی رشتہ ———؟"

"ڈھونڈو نا پھر۔"

"علی بھائی کیسا ہے۔ تمہارا پوچھتا رہتا ہے۔"

"مجھے کب انکار ہے۔"

رات بھر باہر والے کواڑ کے ساتھ لگ کر نر بلا زور زور سے روتا رہا اور بلی عروج کی گود میں خرخر کرتی رہی۔ صبح ناشتا دیتے وقت اماں جی نے کہا: "تم فلم دیکھنے چلی گئی تو یہ بلا آ کر اسی طرح روتا رہا۔ میں نے اس بلی کو دو دفعہ باہر پھینکا مگر دونوں بار یہ مردار اندر بھاگ آئی۔"

چند روز بعد سلیمہ کی ماں نے کہا: "پڑوسیوں کے شادی ہے۔ دو دن کے لیے دو کمرے مانگ رہے ہیں، ایک تیرے والا سلیمہ اور دوسرا ساتھ والا۔"

عروج انکساری اور ہمدردی کا پیکر بن کر بولی "تو سلیمہ میری کٹیا میں دو دن رہ لے گی۔"

سلیمہ کی ماں نے جواب دیا: "اتنے اچھے کمروں کو تم کٹیا کہتی ہو۔"

"تو ٹھیک ہے امی، میں اپنی چیزیں الماری میں رکھ کر تالہ لگا دوں گی۔"

شادی والے گھر ڈھولک بجنے لگی۔ مہمان اترنے لگے۔ مکان پر بتیوں کی جھالریں لٹکنے لگیں۔ مہندی کی رسم پوری ہو چکی تو چاند سورج کی جوڑی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک کار میں سوار ہو کر عروج کے گھر جا اتری۔ عروج نے کہا: "سلیمہ! تو غرارے میں سب سے اچھی لگ رہی تھی۔ تمہارے پچھواڑوں نے غرارے کو اس طرح بھر دیا ہے جیسے اس میں انڈیلے گئے ہوں۔" اس نے سلیمہ کے پچھواڑے پر زور سے چٹکی بھری۔ وہ "اوئی" کر کے اٹھلائی اور بولی "مجھے یہاں نہ چھیڑو۔"

پھر اماں جی کو حنا بندی کی باتیں سنا کر وہ اندر چلی گئیں اور پلنگ پر بیٹھ کر شادی والے گھر مہمان اترنے والی عورتوں پر راتے زنی کرنے لگیں۔ عروج سگرٹ سلگا کر نیم دراز ہو گئی۔ ایکا ایکی اس کا چہرہ اداس ہوتا گیا۔ سلیمہ سر کو جھٹک کر بولی "روح جی! اداس کیوں ہو گئی ہو؟ کیا اپنی بیاہ والی رات یاد آ رہی ہے؟"

عروج چپ رہی۔ سلیمہ نے پھر کہا: "گورو مہاراج کو کیا ہو گیا ہے؟"

عروج نہایت رنجیدہ لہجہ میں ہونٹ بھینچ بھینچ کر بولی "چندا! تم نے مجھے اس طرح جھڑک دیا ہے کہ میرا دل مغموم ہو گیا ہے۔"

"میں نے کب جھڑکا؟"

"مجھے یہاں نہ چھیڑو، تم نے اتنی سختی سے کہا ہے کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔"

"مجھے بتاؤ، تمہارا دل کہاں ہے؟ — یہاں؟" سلیمہ نے اپنے ہاتھ کا کٹورہ اس کے دل پر رکھ کر دبایا "یہ تو ثابت ہے، کہاں ہے ٹکڑے ٹکڑے!"

عروج کچھ من کر کچھ بن کر بولی: "اس گھلاوٹ سے دیکھتی ہو کہ تمہارے سامنے کپڑے اتار دینے کو جی چاہتا ہے۔"

سلیمہ نے کھانس کر منہ دوسری طرف کر لیا اور بولی: "وٹ اے نے کامپلی منٹ!"

"اور نہیں تو کیا۔" عروج نے ختم ہوتے سگرٹ کا آخری کش لے کر مسل ڈالا۔ سلیمہ اٹھ کر اپنی اٹیچی میں سے شلوار نکال کر اس میں ازار بند ڈالنے لگی۔

"شلوار پہنو گی؟"

"ہاں۔"

"مجھ سے نائٹی لے لو۔"

آبادی میں گھومنے والے چوکیدار کی آواز آئی "جاگتے رہنا۔" یہ سُن کر عروج پلنگ سے اُٹھ بیٹھی اور بولی "کیا اتنی رات ہو گئی؟" پھر بستر کی سلوٹوں کو ہاتھ سے درست کر کے بولی "دیکھو اماں جی نے تمہارے لیے فالتو تکیہ اور چادر بھی رکھ دی ہے۔" پھر وہ ساتھ والے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ باتوں کا تبادلہ بھی کرتی رہی۔

"تمہاری بوتیق میں NIGHTIES بڑی EXCITING ہونی چاہئیں۔"

اپنا غرارہ اتارتے ہوئے سلیمہ نے کہا "ایک سے ایک اچھی ہیں۔ پرائسز بھی زیادہ نہیں۔"

اندر سے عروج نے مشورہ دیا "اگر مجھے ماڈل گرل رکھ لو تو کیا برائی ہے؟"

غرارہ تہہ کرتے ہوئے سلیمہ نے جواب دیا: "یہ تو اچھائی ہے۔"

عروج آئینہ میں اپنا سراپا دیکھ کر بولی "ہائے میں تو بڑی اچھی لگ رہی ہوں۔"

سلیمہ نے پلنگ پر بیٹھنے سے پہلے کہا "کون کہتا ہے تم اچھی نہیں ہو!"

نائٹی کو عروج اپنے اُوپر فِٹ کر کے بولی: "سچ کہتی ہو؟"

سلیمہ جو اتنی دیر میں پلنگ پر بیٹھ چکی تھی، بولی: "جبھی تو وہ لڑکا تمہیں بار بار دیکھتا ہے، میں نے تمہیں کہنی بھی ماری تھی۔"

"وہ IDIOT شیخ چلی کا بیٹا لگتا تھا۔"

جب نائٹی پہن کر عروج آئی، سلیمہ پلنگ پر بیٹھی اُوپر لینے کے لیے چادر کھول رہی تھی۔ بولی: "شیخ چلی کا بیٹا کیوں؟"

"سوچتا ہوگا یہ مجھ پر مر مٹے گی۔ میں اس کو بوتل کی طرح اپنی ہپ پاکٹ میں ڈال لُوں گا۔ جب چاہا چکھ لیا۔ مرد کی ذات اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔" یہ کہتے کہتے پلنگ پر چڑھ کر سلیمہ کی چادر میں گھُس گئی۔ "سلیمہ مرد کی ذات سے تمہارا ابھی واسطہ پڑتا ہے تم تو بہتر جانتی ہو کہ انھیں اگر نچایا جائے تو بندر سے اچھا ناچ سکتے ہیں۔"

سلیمہ بولی، "رُوح جی! تم نے خوب کہا۔"

"چندا جب تم عروج کو روح جی کہتی ہو تو تمہارا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔" عروج نے یہ کہہ کر سلیمہ کے رخسار چٹاخ پٹاخ چوم ڈالے۔ سلیمہ نے اپنے آپ کو کم پڑتا محسوس کیا۔ اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہی کہہ سکی "ہائے! کیا تم مجھے اتنا چاہتی ہو؟"

عروج نے اپنے ساتھ لپٹا کر کہا: "اس سے بھی زیادہ۔"

شکریہ کے طور پر سلیمہ نے عروج کی ٹھوڑی پر بوسہ دے کر کہا "گڈ نائٹ۔"

عروج نے سلیمہ کے ہونٹوں کو زور سے چوما اور مٹھار کر بولی: "ہیپی ڈریمز۔" سلیمہ نے اپنے اوپر چادر کھینچ کر کروٹ لے لی۔

عروج نے تکیہ کو مروڑ کر اپنے سر کے نیچے رکھا۔ دوسری طرف کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ پاؤں کے ساتھ لگی بلی کی خرخر عروج کو اچھی نہ لگی۔ اُس نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی اور بلی کو باہر پھینک دیا۔

غسل خانہ میں جلنے والے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی آتی رہی اور پھر کبھی دور نزدیک سے چوکیدار کی آواز "جاگتے رہنا" سنائی دیتی رہی۔ عروج کے جسم و ذہن پر جو خیال حاوی تھا اُسے وُہ عمل میں بدلنا چاہتی تھی۔ مگر اِس خوف کے مارے کہ سلیمہ سے کہیں بگاڑ نہ ہو جائے۔ وُہ اِس خیال کو دُور پھینک دیتی تھی۔ پھر اُسی خیال کا ریلا آ کر اُس کے ارادے کی قوت پر ٹھونگیں مارنے لگتا۔ بہت دیر اسی طرح کی سوتے جاگتے کی کیفیت میں رہنے کے بعد اُس نے سلیمہ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ سلیمہ بخت سو رہی ہے تو اس نے اُس کے رخساروں کو چوما۔ ٹھوڑی پر بوسہ دیا۔ لبوں پہ زبان کی نوک رکھی تو سلیمہ نیند میں بڑبڑائی۔ عروج کو لگا جیسے چاند پر اترنے والی ستی کر پھر خلاء میں گھومنے لگی۔ وُہ احتیاط سے برساتی کینچوے کی طرح ملائم سے ملائم نشیب و فراز پر رینگ گئی۔ کوئی مدافعت نہ ہوئی تو اُس کا ہاتھ یقین کی طرح سخت ہوتا چلا گیا مگر اُسے جیسے کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سلیمہ کے حساس حصوں کو ٹٹولنے لگی۔ جب اُس کی اُنگلیاں کمر کے اُتار سے نیچے فانوس سے چھوئیں تو سلیمہ ایک دھماکے سے تڑپ اٹھی۔ وہ اب بھی کہ سلیمہ نے کیوں کہا تھا۔ مجھے یہاں نہ چھیڑنا۔ اُسے سب راہیں منہ زبانی یاد تھیں۔ وہ خوش ہو کر نشیب کی طرف اُتر گئی۔ سلیمہ نے ٹانگوں کو پھیلا کر سکیڑ لیا جیسے تڑ تڑ بخیے ادھڑنے لگے ہوں۔ پھر پنڈے کی نسیں سنسناہٹوں سے گرم ہو ہو کر ایک دوسرے کو اس طرح جکڑنے پکڑنے لگیں کہ سلیمہ ٹانگوں کی قینچی بنا کر عروج کی کمر پر اپنی ایڑیاں مارنے لگی اور مُنہ سے "روح جی روح جی" کی تکرار کا رس ٹپکانے لگی۔

سِنکی ہُوئی روئی کتنی دیر میں ٹھنڈی ہوتی ہے روح جی جانتی تھی۔ وہ سلیمہ کے سر کو اپنے سینے پر رکھ کر شہتیر کی طرح پلنگ پر لیٹ گئی اور سلیمہ کے بالوں میں بڑے پیار سے دِھیرے دِھیرے اُنگلیاں پھیرنے لگی۔ پھر اُس کے پنجے کو اپنی چھاتی پر رکھ کر بولی "اب تُو عروج بن۔"

اُس کا اندازہ صحیح نہیں نکلا۔ جس چھل بل کے ساتھ سلیمہ اچھل کر کام میں لگ گئی اس کے پیچھے کافی انڈر ورلڈ معلوم ہوتی تھی۔

ڈاک میں سلیمہ کا صرف ایک خط تھا جسے پڑھ کر اس نے پرس میں رکھ لیا۔ پھر اخبار میں آدھی اور پُوری ننگی لڑکیوں کے فلمی اشتہار دیکھ کر اٹھی اور جا کر غسل خانہ کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ کھڑکی میں سے اُس نے دیکھا باہر بوندا باندی ہو رہی تھی اور عروج چھتری لگائے ٹراؤزر سوٹ پہنے اُس کے دفتر کی طرف آ رہی تھی۔

"کیوں؟ کیسے؟"

"دل نہیں لگا۔ چُھٹی لے آئی ہوں۔ چلو کسی ہوٹل میں چل کر چائے پئیں۔ تم بھی چھٹی لے لو۔"

"دفتر کی حجت تو پُوری کر لوں، تھوڑی دیر بیٹھو۔"

تھوڑی دیر بعد وُہ بھی چھٹی لے آئی اور بولی "چلو۔"

دونوں ریسٹوران کے کیبن میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ عروج نے کہا "میں تو پہلے دن ہی تم پر ریجھ گئی تھی۔"

سلیمہ نے پوچھا "اتنی دیر کیوں لگائی؟"

"کوئی موقع ملتا تو اظہارِ محبت کرتی ویسے دل میں ڈرتی بھی تھی۔"

"اب تو میں سو راستے نکال کر تم سے ملوں گی۔" سلیمہ نے آنکھوں میں مٹھاس بھر کر عروج کی طرف دیکھا تو عروج نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا لیا "تمہارے پاس اتنی ساری ہیں کوئی ایسی نکالو جس پر میں اور تم ایک ساتھ ورک کر سکیں۔"

"ذرا سوچ لینے دو، میرے خیال میں شمی ٹھیک ہے چلو اس کی طرف چلیں۔"

عروج نے خوش ہو کر زور سے اس کا گال چوم لیا اور پھر اپنی ہی لپ سٹک کا نشان اس کے گال سے پونچھنے لگی۔ سلیمہ نے آئینہ دیکھنے کے لیے پرس کھولا تو لفافہ نظر پڑا۔ اُس نے عروج کے ہاتھ میں دے دیا اور خود اپنے گال پر لگا نشان آئینہ میں دیکھ دیکھ کر مٹانے لگی۔ عروج خط پڑھنے لگی۔

سلیمہ ڈیر! پتا نہیں تم اِس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ ہماری اِس وقت بریک ہُوئی ہے۔ سنیک بار میں لنچ کھا چکا ہوں اور تمہیں خط لکھ رہا ہُوں۔ اگر بُرا نہ مانو تو اپنی ایک تصویر بھیج دو۔ میں اُسے اپنے کمرے کے آتشدان پر سجاؤں گا۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ یہاں میری تنخواہ پاکستانی سکّے کے مطابق تین ہزار روپے ہے۔ ہم ریگستان میں جو حدِ نگاہ تک پھیلا ہُوا ہے نو نو دس دس گھنٹے کام کرتے ہیں۔ تمہاری یاد تھکنے نہیں دیتی۔ میں پُوچھتا ہوں تم کس وقت کا انتظار کر رہی ہو۔ کیا اس وقت کا جب تمہارا کوئی بال سفید ہو جائے گا۔ بتاؤ۔ کیا تم اِس وقت تک کسی کی ہو چکی ہو؟

تمہارا، انیس

خط پڑھ کر عروج نے سلیمہ کو اپنے ساتھ لگا لیا اور مٹھار کر بولی "اس احمق کو لکھ دو کہ تم میری ہو چکی ہو۔"

سلیمہ نے کہا "اِس کو کون کافر جواب دیتا ہے۔" پھر سلیمہ کے دو آنسو ٹپ ٹپ نیچے گرے "ہیں۔ یہ کیا؟"

عین اُسی وقت بیرا بِل لیے اندر داخل ہوا جب سلیمہ کو اپنی بغل میں لیے عروج اپنے رومال سے اس کی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ عروج ایک بغل میں دوسرِی نظریں کے مردانہ جذبات سے سرشار تھی۔ اُس نے بالکل مردوں کی طرح حکم دیا "بیرا! ایک ٹیکسی پکڑ دو ہمیں اِسی وقت شمی کی طرف جانا ہے۔"

نہ آئیں تم کو محبتیں کرنیں

آغا بابر

دیوان مظہرالدین نے سوچا اب چائے دم ہو چکی ہو گی۔ اُس نے کتاب نیچے رکھ کر پیالی میں شکر ڈالی۔ پھر چائے دانی پر سے ٹی کوزی اتاری کہ اُس کے سر پر پہنچ کر کسی نے کہا "گڈ ایوننگ دیوان صاحب!"

دیوان اُٹھ کر اُس سے بغلگیر ہو گیا۔ آدم گلریز کے مُنہ سے جب شراب کی بُو آئی تو دیوان نے سوچا، آرٹسٹ کے مُنہ سے بُو نہ آئے گی تو کیا شیخ کے منہ سے آئے گی۔

اُس نے پیالی میں چائے ڈال کر گلریز سے کہا: "شکر اور دودھ خود ڈال لو۔"

آدم گلریز نے جب آدھا چمچہ شکر کا ڈالا تو دیوان مظہرالدین نے پُوچھا: "صرف آدھا چمچہ؟"

"میرے دانت میٹھا قبول نہیں کرتے۔"

مظہرالدین نے مذاق سے کہا: "تلخی تو قبول کرتے ہیں۔"

گل ریز کے مسکرانے پر اُس کے ہونٹ پھیلے تو اُس کی چند برس پہلے کی صورت مظہرالدین کو یاد آ گئی، جب گلریز کا جسم بھرا بھرا ہوتا تھا۔ سُوکھے سڑے مصوّروں میں وُہ خاصا تندرست اور خوش باش آرٹسٹ تھا۔ اپنی لچھے دار گفتگو سے مخاطب کی ساری توجہ اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا تھا۔ گفتگو کا کوئی بھی موضوع ہو وہ اس ٹھسّے سے بولتا جیسے یہی موضوع اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اخبار کے لیے ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر مضمون لکھ دینا اُس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ ملک میں کتنے آرٹسٹوں کو یہ مہارت ارزاں ہوئی تھی؟ پھر وہ اپنی ان مہارتوں کو جب بالکل ارزاں کرنے پر آتا اللہ غنی پرزے اڑا دیتا۔ یورپ کے بیشتر ملکوں میں اُس کی تصویروں کی نمائش ہو چکی تھی۔ کسی کو خاطر میں لانا اُس کے لیے جوکھوں کا کام تھا۔ نرگسیت اُس پر ختم تھی۔ اپنی پُوجا کرتا۔ رنگوں کو استر پر اس طرح بکھیرتا اور مدغم کرتا کہ لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر اُس کی تجریدیت خرید لیتے جس میں اُس کے اپنے مزاج کی تجریدیت کی پیچیدگیاں مضمر ہوتیں۔

وہ کلے جو کبھی بھرے تھے اب ادھڑ گئے تھے۔ آنکھوں میں اب بھی شرارت کی چھُوٹ تھی مگر نوکیلی اور آتشیں نہ تھی۔ وُہ گندھی ہُوئی طبیعت تو تھی مگر جیسے اُس میں دراڑیں پڑ گئی ہوں جیسے عمل اور ارادے کی کبھی بن نہ آئی ہو اور انسان اپنی عظمت کی سوغات کو جھولی میں ڈال کر سرِ بازار نیلام کرنے نکل آئے۔ انا کو ایک شعلے کی طرح اُونچا لے جانا اور پھر اِس تپتے ہوئے شعلے میں آپ ہی بھسم ہو جانا بعضوں کے لیے روز کا معمول ہوتا ہے۔ دھرتی کے سینے پر طمطراق سے جھُومنا، آئینہ کے سامنے سنورنا، حسن کو دیکھنا اور پھر بک جانا۔

ملک کا بہت بڑا مصور مظہر الدین کے سامنے بیٹھا ہوا کراچی کے مصوروں کو سو سو سنا رہا تھا۔ "وہ سب یاسیت نواز ہیں۔ میں نے وہاں پریس اور پلیٹ فارم پر اُن کے خلاف مہم شروع کر دی تھی۔ پھر ہم چند آرٹسٹوں نے "حیاتِ ابدی" کا نام دے کر ایک نمائش کا اہتمام کیا۔ اتنی کامیاب نمائش کراچی والوں کو ہمیشہ یاد رہے گی۔ مہینوں ان یاسیت نواز آرٹسٹوں کا چولھا سرد پڑا رہا۔ پھر ان ریاکاروں نے میرا ایک ایک ساتھی مجھ سے چھڑایا اور مجھے تنہا کر کے میرے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ دیوان بھائی ان حالات میں میرا وہاں رہنا ممکن نہ رہا۔ اب میں اپنے وطن آ گیا ہوں۔ اِسی مٹی سے میرا خمیر اٹھا تھا۔ یہیں میرے رشتے دار، عزیز ہیں۔ یہ شہر میرے لیے کوئی نیا نہیں۔ میں اِن گلیوں میں پلا بڑھا ہوں۔ انگلستان اور فرانس میں بارہ برس، جاپان میں پانچ برس گزارے۔ پھر اُس لڑکی کو لے کر کراچی آ گیا۔ میں نے مزدوروں کی طرح کمایا اور بادشاہوں کی طرح لٹایا۔ میری طرح کوئی محبت کرے تو۔ دیوان بھائی آج گل ریز کے پاس ایک دھیلا نہیں۔ وہ اپنے وطن میں ریلوے سٹیشن کے قریب ہمدرد ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کو شراب پینے کے لیے پیسے چاہئیں۔ اُس کو دو وقت کے لیے روٹی چاہیے۔ اُس کو رہنے کے لیے چھت چاہیے۔ بتایئے آپ کے معاشرے نے اُس کے لیے کیا کیا ہے؟

بلمپت لے میں شروع ہو کر ماترے کا وقفہ لگائے بغیر ایک دم دُرت میں آ گیا۔ بے سُرا ہو کر دوبارہ نیچے گرا۔ "مظہر بھائی! میری چائے تو ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ آپ نے چائے کی پیالی کہاں پھینکی ہے؟"

"جس طرح کوئی گھٹیا شرابی شراب پیتا ہے میں اُس طرح چائے پیتا ہوں۔ پیالی اٹھاؤں تو نیچے اُس وقت رکھتا ہوں جب ختم ہو جائے۔"

"دیوان بھائی! کیا آپ نے ابھی تک شروع نہیں کی۔ آپ پٹیالہ جیسی جگہ کے رہنے والے ہوں اور شراب کو ہاتھ نہ لگائیں۔"

ایک موٹر کار برآمدے کے سامنے پورچ میں آ کر رکی۔ دیوان مظہر الدین نے بڑھ کر آنے والوں سے ہاتھ ملایا اور آدم گلریز سے متعارف کراتے ہوئے کہا "ہمارے ملک کا بہت بڑا آرٹسٹ آدم گلریز۔"

ہاتھ ملاتے وقت آدم اخلاق اور مروّت کا مجسمہ بن کر جھک گیا۔ آدم نے کہا: "دیوان بھائی! اب اجازت دیجیے۔ پھر کسی روز آؤں گا۔"

دیوان مظہر الدین اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ بیرے نے آ کر کہا کہ وہی صاحب پھر آئے ہیں جو ابھی آپ کے ساتھ برآمدے میں چائے پی رہے تھے۔

"معاف کیجیے گا۔ میری جیب میں ایک پائی نہیں، میں اُس وقت مہمانوں کے آ جانے کے سبب آپ سے کچھ کہہ نہ سکا۔ مجھ پر بہت برا وقت ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ٹل جائے گا۔" دیوان نے جیب سے پچیس روپے نکال کر دے دیے۔

ہر آرٹسٹ نے کوئی ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ اگر نہیں تھا تو آدم کا۔ جیسے اس کو نظر لگ گئی ہو۔ دیوان نے سوچا اگر

وُہ اِس شہر میں رچ بس جاتے تو ایک طرح سے کھوئی ہُوئی جنّت اسے پھر مل جائے۔

جب بہت دنوں اُسے آدم گل ریز کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو اُس نے سوچا۔ سیلانی مزاج پھر کراچی چلا گیا۔ مگر ایک دن جب دیوان اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا تو آدم گل ریز نے دروازے پر دستک دی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ۔ اس نے ڈبہ میز پر رکھ کر کہا "یہ کیک آپ کے لیے لایا ہوں۔ میں نے سٹوڈیو کرایہ پہ لے لیا ہے۔ اب آپ کو کام کر کے دکھاؤں گا۔"

دیوان مظہرالدین نے اٹھ کر پیٹھ ٹھونکی اور پوچھا "کس جگہ؟"

"یہاں سے دس منٹ کا راستہ ہوگا۔ بیکری اور آئس کریم کی دکان کے ساتھ جو اندر گلی جاتی ہے، چلیے۔ اُٹھیے۔ میں دکھاؤں۔"

دیوان نے کیک کا ڈبہ اٹھاتے ہُوئے کہا "یہ وہیں کھائیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ ہزار شکر ادا کرتا ہُوں کہ مجھے ہمدرد ہوٹل سے نجات ملی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہمارے یہاں کے لوگ غسل خانہ میں جا کر جب دانت صاف کرتے ہیں تو حلق سے اتنی آوازیں کیوں نکالتے ہیں اور اتنی بلغم کیوں پھینکتے ہیں۔ کیا یہ تمباکو پینے کی وجہ سے ہے؟ تمباکو تو انگریز بھی بہت پیتا ہے مگر مجال ہے جو بلغم پھینکے۔ میرا خیال ہے ہم گھی بہت کھاتے ہیں، شاید یہ وجہ ہو۔ وہ سامنے دو آدمی شلوار قمیص پہنے کھڑے ہیں۔ دیکھیے ان کا ہاتھ کہاں ہے۔ ان کو جسم کے کس حصے پر کھجلی ہو رہی ہے۔ جسم کا یہ حصہ جتنا پاکستان میں کھجلایا جاتا ہے کسی اسلامی ملک میں نہیں کھجلایا جاتا۔ مغرب میں تو کسی کے سامنے کھجلانا ہی ناممکن ہے۔ آپ کوٹ پتلون پہنیں تو کبھی کھجلی نہیں ہوتی جونہی آپ کرتہ شلوار پہن لیں کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔ کیا جگہ بے جگہ کھجلانا بھی ہمیں نوآبادیاتی انگریز سکھا گیا تھا؟ اپنی ہر پیداکردہ بُرائی کو نوآبادیاتی دور کے سر مڑھنا بھی ایک فیشن ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے اِس موضوع پر ایک مضمون لکھ ڈالوں مگر ڈرتا ہوں خواہ مخواہ کا فضیحتہ کھڑا ہو جائے گا۔"

گلی کی طرف مڑے تو دیوان نے کہا "آدم یہ تو بڑی رومانٹک جگہ ہے۔ درختوں کے سائے۔ نیم اندھیرا تنگ راستے۔"

"ذرا آگے چلیے گا تو دیکھیے گا۔" آدم گل ریز جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولنے لگا تو دیوان نے سبز پتوں سے ڈھکے راستے اور ساتھ بہنے والے برساتی نالے کی طرف دیکھ کر کہا "یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔"

"دیوان بھائی! یہ جگہ شام کو بڑی متوالی ہو جاتی ہے۔ یہ میرا اسٹوڈیو ہوگا۔ یہ بیڈ روم ہے۔ یہ ڈرائنگ روم بن سکتا ہے۔ دونوں کمروں کے ساتھ یہ باتھ ہے۔ یہاں جافری لگا لوں تو سَن روم بن سکتا ہے۔ دھوپ اِدھر سے آتی ہے۔ کیسا رہے گا؟"

تمام کمرے خالی پڑے تھے۔ بیڈ روم میں چارپائی پر مختصر سا بے ترتیب بستر بچھا تھا۔ جس کمرے کو سٹوڈیو کہا جا رہا تھا اُس میں گیس کا سٹوو پڑا تھا۔ فرش پر چائے کی دو تین پیالیاں اور شیشے کے گلاس بکھرے پڑے تھے۔ آدم نے کیتلی سٹوو پر چڑھا دی۔ دونوں ڈرائنگ رُوم میں آ بیٹھے جہاں بید کی چار کرسیاں اور تپائی پڑی تھی۔ ایک چوکی پر ڈھیر سارے کاغذ دھرے تھے۔ لکڑی کے کھوکھے پہ رنگوں کی شیشیاں اور برش رکھے تھے۔

"دیوان بھائی میں نے کین کا یہ سیٹ چار سو روپے میں خریدا ہے۔ آہستہ آہستہ سب کمرے آراستہ ہو جائیں گے۔ مَیں نے مالک مکان کو دو مہینے کا کرایہ پیشگی دے دیا ہے۔ ساڑھے تین سو روپیہ میں ایسا مکان کہاں ملے گا!"

پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے آدم گلریز بولا "دیوان صاحب آپ کے سب کھانچے بھرے ہوئے ہیں ایک کھانچا خالی ہے۔ آپ میں بڑی خرابی یہ ہے کہ آپ شراب نہیں پیتے۔ ورنہ اِس وقت میں اور آپ واڈکا پیتے۔"

دیوان نے کہا "کیک بہت لذیذ ہے۔"

"باہر والی بیکری سے خریدا ہے۔ سب لوگوں سے شناسائی ہوگئی ہے۔ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میرے آنے سے پہلے اِس مکان میں عورتوں کا اڈہ تھا۔ گلی میں کچھ عیسائی رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہمیں تو معلوم نہیں کون آیا کون گیا۔ کوئی اپنے گھر کے اندر کچھ کرے اِس سے کسی کو کیا سروکار۔ مگر جو مسلمان رہتے تھے انہوں نے کہا: "اسلام خطرے میں ہے۔"

"تم اِس گلی میں ہوتے۔ تم سے پوچھا جاتا تو کیا کہتے؟"

میں کہتا "یہ قوم کی بیٹیاں ہیں اِن کے ساتھ بھی پیٹ ہے۔ معاشرہ اِن کے کھانے پینے کا انتظام کر دے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ تو ریفارمر کی زبان ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔"

"میں پولیس سے کہتا یہ میری بیوی ہے۔ صرف ہمسایوں سے ملنے گئی تھی، چونکہ وہاں موجود تھی، پولیس نے چھاپے میں دھر لیا۔ ضمانت اپنی پڑتی تو دے دیتا، اُسے لے آتا، کہتا اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو رہ۔ نہیں تو وہ کمرے تجھے SUB LET کیے دیتا ہوں، مجھے کرایہ دے اور عیش کر۔"

دیوان مظہر الدین نے مسکرا کر پوچھا "کھانے کا کیا انتظام ہے۔"

"خود پکاتا ہوں، صبح دودھ والا آکر جگاتا ہے۔ ناشتا بناتا ہوں پھر کام میں لگ جاتا ہوں۔ ارادہ ہے ایک نمائش کر ڈالوں۔ کل سے کام کر رہا ہوں۔"

اِس کے بعد آدم گلریز پندرہ بیس روز غائب۔ دیوان گیا تو تالہ لگا تھا۔ اپنا نام لکھ کر چھوڑ آیا۔ اگلے روز گلریز آنکھوں میں وہی چمک اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ لیے آن پہنچا "میں اتنے دن نہ آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ مجبور تھا۔"

"کیا مجبوری ہوگئی؟"

"محبتیں ہو رہی ہیں دیوان بھائی۔ زندگی جاگ اٹھی ہے۔"

"اور نمائش سو گئی؟"

"نہیں۔ دونوں کام جاگ رہے ہیں۔ دس تصویریں تیار ہیں۔ آپ ابھی چل کر دیکھیں اور محبت کے بارے میں بھی فوراً مشورہ دیں۔"

اُس نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں لے کر زور سے دبایا اور بولا "کہتی ہے تُو تو اتنے سال ملک سے باہر رہا۔ صرف ہمارا بچپن ہی ایک ساتھ گزرا تھا۔ جب تو آنکھ مچولی میں میرے ساتھ چھپا کرتا تھا۔ سخت سیلانی نکلا۔ چھوڑ کر مجھے چلا گیا اور اتنے سالوں بعد اپنے گھر واپس آیا ہے۔"

اُس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔

”کون کہتی ہے؟“

”پروفیسر توشی ایم۔ اے، ڈاکٹر آف لٹریچر۔ زنانہ کالج کی وائس پرنسپل۔ میری پھوپھی کی بیٹی۔ میری کزن ہے، کوئی غیر نہیں۔ اگر ہم شادی کر لیں تو کیا بُرا ہے۔ میں ہی ہرجائی تھا جو انگلستان، فرانس، جاپان گھومتا رہا۔ گھر کی محبت سب محبتوں پر بھاری ہوتی ہے۔ توشی اپنے ہوسٹل کی سپرنٹنڈنٹ ہے۔ وہیں میری شامیں بسر ہوتی ہیں۔ میری پھوپھی اپنے بیٹوں کے ساتھ رہتی ہے۔ کوئی ہماری شادی کے لیے راضی نہیں ہے مگر توشی کہتی ہے میں سب کو مناؤں گی۔ توشی خود مختار ہے۔ وہ کسی کی محتاج نہیں۔“

”پھر مخالفت کیوں؟“

”گھر کی سیاست دیوان بھائی! میری پھوپھی کی بھائیوں سے کبھی نہ بنی تھی۔ پھر اُس کو دُوسرے خاندان میں بیاہ دیا گیا۔ جنہوں نے اُس کی مزید برین واشنگ کر دی۔ وہ بھائیوں کی اولاد کے خلاف ہے۔ چھوڑیئے، مَن جائے گی۔ محبت کی طاقت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ توشی شام کو بن ٹھن کر جوڑے میں پھول لگا کر میرا انتظار کرتی ہے۔“

”میں کسی روز رات کے کھانے پر تمہیں باہر لے جانا چاہتا تھا۔“

”توشی سے اجازت لے لُوں گا اُس روز۔ ہوسٹل کی سینئر لڑکیاں کبھی کبھی ہمارے پاس شام کو آ بیٹھتی ہیں۔ میرے ساتھ آرٹ کے متعلق گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ میں پرسوں پکاسو کے آرٹ کے متعلق ان کے کالج میں تقریر کر رہا ہوں۔ واللہ بڑے اطمینان بھرے دل کے ساتھ تصویریں تیار کر رہا ہُوں۔ کیا رنگ لگے ہیں آپ چل کر دیکھیں تو۔“

تصویریں کچھ دیوار پر ٹنگی تھیں، کچھ آتشدان پر دھری تھیں۔ ایک پر ابھی کام ہو رہا تھا جس کے قریب برش اور پلیٹ پڑا تھا۔ طاق میں گلاس اور ٹھرّا دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ آدم ابھی یہیں سے پیتا ہوا گیا تھا۔

”تصویریں آپ کو پسند آئیں؟“

”ہُوں۔“

”میری رفتار اب بڑھتی جا رہی ہے۔ وسکی ختم ہو گئی تھی۔ میں بریک نہیں لگانا چاہتا۔ چنانچہ یہ دو تصویریں میں نے کل چرّی پی کر مکمل کی تھیں۔ ان کے رنگ دیکھے ہیں آپ نے۔“

”چرّی پیو گے تو مر جاؤ گے۔“

”وِسکی نہ ملے تو کیا کروں۔ جب نشہ ٹوٹتا ہے تو اُس بحران کو آپ کیا جانیں۔“

”مجھے اعتراض ہے۔“

”آپ کو مجھ پر اعتراض ہے مگر شراب پی کر کلامِ الٰہی لکھنے والے پر اعتراض نہیں۔“

”ذاتیات میں مت جاؤ۔“

دیوان کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایک اینگلو پاکستانی قسم کا لڑکا ایک لفافے میں ٹماٹر آلو مکھن کی ٹکیہ نان اور چائے کا پیکٹ لایا۔

انگریزی میں آدم سے کہنے لگا کہ وہ فی الحال یہ تین چار چیزیں بازار سے لایا ہے۔ کیروسین آئل شام کو لائے گا کیونکہ اب وہ اپنے دفتر جا رہا ہے۔

"تھینک یو سو مچ گلبرٹ" آدم نے بڑے میٹھے لہجہ میں کہا۔ پھر ساتھ ہی تحکمانہ لہجہ میں انگریزی میں بولا "میرے بہت عزیز دوست سے مل کر جاؤ جو آرٹ کا بہت بڑا نقاد ہے۔"

گلبرٹ نے بہت مرعوب ہو کر دیوان سے مصافحہ کیا اور پھر اجازت لے کر چلا گیا۔

آدم گلریز نے بتایا گلبرٹ کو اس نے ایک کمرہ دے رکھا ہے۔ وہ چھوٹا موٹا کام کر دیتا ہے۔ بازار سے سودا سلف لا دیتا ہے اس طرح آدم کی یکسوئی میں خلل نہیں پڑتا۔

کھوکھے کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ میز پوش توشی کا تحفہ ہے۔ میں نے اس سے کہا میں اِس پر کلر اور برش رکھوں گا تاکہ تمہارا میز پوش مجھے INSPIRE کرتا رہے۔ وہ سامنے کارنس پر گلدان دیکھ رہے ہیں، وہ بھی توشی کا تحفہ ہے۔"

"اور تمہارا تحفہ؟"

"میرے تابڑ توڑ بوسے۔" اس نے ڈبیا میں سے آخری سگرٹ نکال کر تیلے کے ساتھ جلایا اور بولا "آپ نے میرے مکان کا پچھواڑہ، جدھر نالہ بہتا ہے، نہیں دیکھا۔ آئیے میں دکھاؤں۔ وہاں سے سگرٹ بھی لیتا آؤں گا"

اُس نے دروازے کو تالہ لگایا اور دیوان کو لے کر پھسلن والی ناہموار جگہ پر سے ہوتا ہوا جہاں سبزہ اگا ہوا تھا، گلی کے پچھواڑے میں جا نکلا جہاں نیچے کو ڈھلوان تھی جس پر املتاس کے درخت اُگے ہوئے تھے اور بلندی پر ملے جلے درختوں کے جھنڈ تھے سفیدے کے درختوں میں چھپی ہوئی ٹیلے پر واقع قدیم عمارت کو دیکھ کر دیوان رک گیا۔

"کیوں مظہر بھائی! ہے نا جیسے اٹلی کا کوئی گاؤں ہو؟"

"ہاں اچھی جگہ ہے۔"

پھر آدم گلریز ایک کچی پرانی بارک نما عمارت کی طرف مڑا جو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں تقسیم ہو گئی تھی جن میں بریٹھے بسے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا آدمی چھجے کے نیچے بیٹھا تھا جس کے سامنے کھوکھا دھرا تھا جس میں سگرٹ، مونگ پھلی، اور چیونگ گم پڑی تھی۔ آدم نے سگرٹ کے پچھلے دو پیکٹوں کے پیسے ادا کیے اور چار پیکٹ مانگے ایک چنک مٹک سی عورت چار پیکٹ ہاتھ میں پکڑے کوٹھڑی سے نکل کر برآمدے میں آئی۔ آدم نے اُس سے پیکٹ لے کر قیمت ادا کر دی۔

"یہ میرے ساتھ ادھار بھی کر لیتے ہیں۔ بازار سے سگرٹ غائب ہو جائیں مگر ان سے مل جاتے ہیں۔"

"یہ عورت کون تھی جس نے تمہیں اندر سے سگرٹ لا کر دیے تھے؟"

"بوڑھے کی بہو تھی۔ مان گیا آپ کی نگاہ کو۔ بڑی جلوہ باز عورت ہے۔ بیکری والے کا بیان ہے کہ جب میرے مکان میں اڈہ تھا تو یہ بھی آیا کرتی تھی۔"

دیوان اور آدم آ کر بید کی کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ ناٹے قد اور مضبوط ڈیل ڈول کا ایک شخص مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ آدم نے تعارف کرایا کہ یہ میرے دوست دو چار روز کے لیے کوئٹہ سے آئے تھے مگر ان کی ہمت ہے کہ انہوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔"

اُس شخص نے رسمی گفتگو کے بعد شراب کے دو پوّے اپنی ہپ پاکٹوں سے نکال کر میز پر رکھے اور ساتھ والے کمرے سے گلاس اٹھا لایا۔ آدم گلریز کے چہرے پر شریر مسکراہٹ کی چھوٹ طلوع ہونے لگی۔

پھر کئی دن کا غوطہ۔ سر نکالا تو پھر اُسی شریر مسکراہٹ کے ساتھ۔ سُوٹ میں بہت باا ثر شخصیت دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ فروغِ مے ہے یا خوشیاں پھوٹ رہی ہیں؟"

"میری نمائش کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے پھر یہ کہ میری پھوپھی شادی کے لیے راضی ہو گئی ہے۔ شادی کی تیاریاں شروع ہیں۔

"منظر بھائی! اِس نمائش میں میری چار ہزار کی تصویریں بکنی چاہئیں۔"

دیوان نے کہا "کم از کم۔"

"میں نے گیلری سے آٹھ سو پہلے قرض لے لیا ہے۔ کل شام سسرال میں بیٹھ کر میں نے کہا "مجھے جو کنگال کہے زبان نہ کھینچ لوں اس کی۔ میری آمدن سیکریٹریوں اور پرنسپل سے زیادہ ہے۔ میں بیٹھ کر کام کروں تو دولت میرے پاؤں چُومے۔ میں توشی کو اپنی آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ اس کی پُوجا کروں گا۔ جو کہتے ہیں میں توشی کو کھاؤں گا وہ ذلیل اور گھٹیا ہیں۔ اُن کا ذہنی اُفق بس اتنا ہی ہے۔ وہ اِس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے۔"

"کون کہتا ہے؟"

"کچھ لوگ ایسے ہیں دیوان بھائی! جو اس معاملہ میں کھنڈت ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"ایسے لوگ ہر شہر ہر محلے میں ہوتے ہیں۔ نمائش کی سناؤ۔"

"نمائش بیس تاریخ کو ہے۔ میں نے آلو کھا کھا کر یہ نمائش تیار کی ہے۔ بس ایک نعمت کدہ خرید لایا ہوں۔ اس میں ڈبل روٹی اور جام رکھتا ہوں۔ اب پھوپھی میرا گھر دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں بھی خرید لی ہیں۔" پھر قہقہہ مار کر ہنسا " اور تراور گلبرٹ میری نمائش کے لیے مجسم انتظار ہے۔ نئی قمیص خرید کر لایا ہے جو نمائش کے روز پہنے گا۔ اس نے گلی میں میری بڑی ہوا باندھ دی ہے۔ میں ہر ایک سے ہیلو ہیلو کر کے گزرتا ہوں۔"

نمائش میں ساڑھے چار ہزار کی تصویریں بک جانا نمائش کی کامیابی کی دلیل تھی۔ آدم گلریز نمائش پر اپنی منگیتر کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ ڈاکٹر توشی نے دیکھا لوگ کس نیاز مندی سے آرٹسٹ سے مل رہے تھے۔ ٹیلی ویژن والوں نے آدم گلریز سے انٹرویو کیا نمائش سے متعلق چیدہ چیدہ لوگوں کی ناقدانہ رائے دریافت کی اخبار نے کالم چھاپے۔

نمائش سے تیسرے روز ملنے آیا تو بڑا خوش تھا" آپ نے نمائش پر توشی کو دیکھا۔ کیسی لگ رہی تھی؟"

"تمہاری نمائش بھی اچھی اور توشی بھی بہت اچھی ....."

"آپ نے توشی کی آنکھیں دیکھیں۔ مے کے کٹورے ہیں۔ کیا خیال ہے ملاحت کچھ زیادہ تو نہیں؟"

"اِسے ہی تو حُسنِ ملیح کہتے ہیں۔"

آدم قہقہہ مار کر ہنسا" میں نے کل اپنی پھوپھی کے سامنے توشی کو اپنے ساتھ لپٹا کر کہا "پھوپھی ہائے اتنی خوبصورت لڑکی تو نے

میرے لیے پیاسی تھی ۔ میں تیرا کس منہ سے شکریہ ادا کروں ۔ دیوان بھائی ! آپ خوش ہوں گے ۔ کل میں اور توشی ایک قالین خرید کر لائے ہیں ۔ نمائش سے پہلے ہی ہم نے وہ قالین پسند کر لیا تھا اور کہہ آئے تھے چند روز بعد آ کر لے جائیں گے ۔ فوم کشن والی دو کرسیاں بھی خریدی ہیں ۔"

اگلے روز گیارہ بجے آدم مے پٹے آن پہنچا ۔ کلف لگی قمیص اور خوب صورت سویٹر میں اچھا لگ رہا تھا ۔ دیوان نے اپنے ایک دوست کے ساتھ تعارف کرانے کے بعد کہا " آدم ! آج تم مجھے اپنے عام قد سے لمبے معلوم ہو رہے ہو ۔"

آدم گلریز بولا " میں اب بالغ ہو گیا ہوں نا ، مظہر بھائی !

پھر گلریز نے اُوپر تلے انگریزی میں کچھ زیادہ خوبصورت جملے بولے اور کہنے لگا " میں آپ کو کافی پلانے کے لیے اپنے سٹوڈیو لے جانا چاہتا ہوں ۔ آپ کے دوست بھی میرے ساتھ چلیں تو میری عزت افزائی ہو گی ۔"

دیوان نے کہا : " چلیے ہم وہاں پانچ دس منٹ بیٹھ کر آگے چلے جائیں گے کیونکہ بارہ بجے ہمیں ایک جگہ پہنچنا ہے ۔"

آدم گلریز نے اپنے کمروں کی کایا پلٹ دی تھی ۔ ڈرائنگ روم خوشنما لگ رہا تھا ۔ سن روم کی جا فری مکمل ہو چکی تھی ۔ کھڑکیوں پر پردے لٹک رہے تھے ۔ انگنائی میں رکھے گملوں پر گیرو ارنگ پھیر دیا گیا تھا ۔ لوکاٹ کے بوٹے کے گرد گلاب کی قلمیں لگی ہوئی تھیں ۔ گیس والا چولہا نصب ہو چکا تھا ۔

دیوان اور اس کے دوست نے تعریف کی تو ترنگ میں آتے ہوئے آدم نے کہا " یہ سب کام میں خود کرتا ہوں اپنا کام آپ کرنا میں نے مغرب سے سیکھا ہے ۔"

" آدم کیا قالین کا یہ چھوٹا ٹکڑا ابھی تم نے خریدا ہے ؟ یہ کچھ پرانا سا لگتا ہے ۔"

" جی یہ میری منگیتر نے دیا ہے ، ایک دن آئی تھی ۔ میں اُسے گود میں لے کر اس پیڑھی پر بیٹھ گیا ۔ بولی " اس پیڑھی کے آگے ایک چھوٹا سا قالین کا پیس ہونا چاہیے ۔ شام کو اخبار میں لپیٹ کر مجھے یہ پیس دے دیا ۔"

آدم نے یہ کہہ کر دیوان کے دوست کی طرف شرارت سے دیکھا اور انگریزی میں بولا " عورت کی عقل کچھ ایسی ہی ہوتی ہے ۔ اُس وقت تو میں بغل میں داب کر لے آیا لیکن اسی قالین پر لٹا کر اسے چوٹیں لگاؤں گا ۔"

" آپ کی یہ پہلی شادی ہے ؟"

" میری تیسری ہے ۔ اُس کی پہلی ہے ۔"

" یہ پُرانا پاپی ہے ۔" یہ کہتا ہُوا دیوان باہر نکل آیا ۔

" دیوان بھائی ! میں نے آپ کا دو سو روپیہ دینا ہے نا ۔ بیس روپے کے آپ نے مختلف وقتوں پر سگرٹ بھجوائے تھے ۔ دو سو بیس روپے ہُوئے ۔ میری تین تصویروں کی قیمت ابھی وصول نہیں ہُوئی ۔ اب پھر ٹوٹ آ گئی ہے ۔ مجھے نوّے یا سو روپیہ اور دے دیں تو ممنون ہوں گا ۔"

دیوان نے دل میں کہا اے عظیم انسان اپنی عظمت کو آنا نہ گرنے دے ۔ روز بازار میں بھاؤ نہ بن ۔ مگر اُس نے شرما کر

جھٹ پٹ جیب سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

یاد پر والی ملاقات سے بارہ پندرہ دن بعد کی بات ہے جب آدم دیوان مظہرالدین کے دفتر میں نمودار ہوا اور شادی کی تیاری کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگا "ڈاکٹر توشی اپنی عروسی کا جوڑا سلوا رہی ہے۔ اس کی بہن نے اُس کے لیے ڈنر سیٹ خریدا ہے۔ پانچ سو کا بنک ڈرافٹ میرا کوئٹہ والا دوست بھیج رہا ہے۔ پیکر کمپنی کے جرمن چیف منیجر کو میں نے شادی کا لکھا تھا۔ آج صبح اس کا سٹی منیجر آیا کہ ہمیں ہیڈ آفس سے تار آیا ہے کہ آپ کے گھر ایک COOKING RANGE تحفہ کے طور پر پہنچا دیا جائے۔ ہم صرف جگہ دیکھنے آئے تھے، کل پہنچا دیں گے:"

"تمہارا گھر آباد ہو رہا ہے۔ دوستوں کو خوشی ہے۔ اجازت دو تو ایک کاروباری سی بات کروں جو جذبات سے تو کوری ہوگی مگر عمل سے نہیں۔ وہ یہ کہ تمہاری نمائش بکی تو رقم ہاتھ آئی جو ختم بھی ہو چکی۔ یہ چار ہزار یا پانچ ہزار ہر مہینے تو نہیں آیا کرے گا۔ جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو صبح توشی تمہیں ناشتا دے دے گی جو اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وُہ خود بنائے گی حالانکہ وُہ اپنے ہوسٹل میں پکا پکایا کھاتی ہے۔ بہرحال اِس بات کو بھی جانے دو۔ وہ ناشتا دینے کے بعد چاہے گی کہ تم اب کہیں دفع ہو جاؤ۔ مگر تم اُس کے سر پر سوار رہو گے۔"

"مگر میں اپنے اسٹوڈیو میں کام کروں گا۔"

"سٹوڈیو بھی تو وہیں ہوگا۔ چلو اِس کو بھی جانے دو۔ وُہ کہے گی بازار جا، گھی، روٹی، سبزی، گوشت، انڈہ لا تاکہ دو وقت کا کھانا پکے۔ تم نے تو آلو ابال ابال کر کھا لیے اور چار ہزار کی نمائش تیار کر لی مگر تمہاری بیوی تو اُبلے ہوئے آلو کھانے کے لیے شادی نہیں کر رہی۔ تم محض آرٹسٹ اپنے لیے ہو گے، اُس کے لیے تم صرف خاوند ہو گے ذمہ داریوں کو پُورا کرنے والے۔"

"دیوان بھائی! ماں باپ اپنے اوپر سختیاں جھیل جھیل کر جس لڑکی کی پرورش کرتے ہیں جسے پالتے پوستے ہیں وہ جوان ہو کر فون پر کہتی ہے میں رات ہوٹ واٹر بوتل کمر کے نیچے رکھ کر سوئی ہوں۔ میری کمر دُکھتی رہی ہے۔ لڑکا فون پر پُوچھتا ہے "میں اب کب آؤں؟" وہ کہتی ہے جس روز میرے ماں باپ دفان ہوں گے بس جھٹ تمہیں فون پہ بتا دوں گی۔ زور کس پہ ہوا۔ دفان پر۔ اور دُوسرا زور کس پہ ہوا۔ جھٹ تمہیں فون پر۔ دیوان بھائی عورت نے جس نر کے بچے جنے، جس کا کھایا پیا، جس کے سر پر عیش کیا، جب وُہ جنگی قیدی بنا تو ہر ویک اینڈ پر ساڑھی کا پلو اڑاتی بدن میں قیامتیں چھپائے مری پہنچ گئی۔ آپ عورت کو نہیں سمجھتے۔ وہ صرف محبت چاہتی ہے اور جنس کی تسکین۔ شادی کے بعد تو عورت کی رُوح DEFUNCT ہو جاتی ہے صرف بدن رہ جاتا ہے۔"

دیوان نے آدم کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا "اگر صرف محبت اور جنس کی تسکین ہی اس فارمولے کا حل ہے تو تمہارے لیے میں نے ایک تحفہ رکھا ہُوا ہے۔ یہ لو۔ ہر روز صبح دودھ کے ساتھ دو گولیاں کھا لیا کرنا، تم نے جو فاقے کیے ہیں، خالی پیٹ شراب پی ہے اور اُبلے ہُوئے آلو کھائے ہیں اُن کا ازالہ ہو جائے گا۔"

شادی کے استقبالیہ پر کلک کلک تصویریں اُتریں۔ کونے میں کھڑے گلبرٹ کے پاس جاکر دیوان مظہرالدین نے خیریت پُوچھی "کیا ابھی تک تم وہیں رہتے ہو؟"

گلبرٹ نے انگریزی میں کہا "نہیں دیوان صاحب! میں وہاں سے شفٹ کر گیا ہُوں۔ مگر اتنے بڑے آرٹسٹ کی شادی

میں شریک ہونا میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔"

دیوان نے آرٹسٹ کی طرف دیکھا جو بٹن ہول میں گلاب کا پھول لگائے گلے میں سنہرا ہار ڈالے بڑا اچھا دکھائی دے رہا تھا توشی کے چہرے پہ مرد کو غلام بنانے اور اُس کا غلام بننے کی تمام آرزوؤں کا پرتو تھا۔ اُس کی آنکھیں جیسے آدم گلریز سے کے کٹورست کتا تھا کسی پرسکون جھیل کی طرح تھیں۔ دیوان نے سوچا کشتی کن کی گہرے پانیوں میں تھپیڑے نہیں کھاتی۔ کبھی تو اسے جزیرہ مل جاتا ہے، کبھی تو کنارے پر آن لگتی ہے۔ اس نے جیب سے سگار نکالا اور خوشبودار دھواں اڑانے لگا۔

کوئی پندرہ روز بعد وہ دفتر میں بڑی عمدہ موڈ میں بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی "آدم گلریز عرض کر رہا ہوں۔ کیا میں اور توشی آپ کو سلام کرنے کے لیے آ سکتے ہیں۔ آپ کام میں مصروف تو نہیں۔"

"بالکل خالی بیٹھا ہوں، سگار پی رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ آدم سے ملے کافی دن ہو گئے ہیں۔"

"آدم اور حوّا دونوں آ گئے ہیں۔ با ادب با ملاحظہ۔"

"ہاؤ سویٹ یو آر دیوان بھائی۔" دروازہ کھلتے ہی آدم کی آواز آئی۔ توشی کا سانولا چہرہ کھلا کھلا تھا۔ ہپ سٹر سٹائل ساڑھی اور آنکھوں میں نشیلے ڈورے، یوں لگتا تھا جیسے میخانہ میں ساقی گری کرنے والی لڑکی فراغت کے چند لمحے چرا کر ادھر آ نکلی ہو۔ آدم قمیص کے کھلے گریبان میں ریشم کا رنگین مفلر لگائے مردِ رعنا دکھائی دے رہا تھا۔

"مجھے آپ دونوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔" دیوان نے کہا

"آپ بڑے فارمل ہو رہے ہیں مظہر بھائی۔"

"ایسے موقعوں پر ضرور ہونا چاہیے۔"

دیوان مظہر الدین نے چپڑاسی سے چائے کو کہا تو آدم بولا: "ہمارا خیال تھا آپ ہماری طرف آئیں گے۔ اتنے دن انتظار کرتے رہے۔ آخر توشی نے کہا چلو مل آئیں اور آپ سے کہیں کہ کسی روز آپ اور بھابی ہمارے یہاں آ کر چائے پئیں۔"

اس پر توشی نے شادی کے تحفے کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ساڑھی اسے بہت پسند آئی۔ دیوان بولا "میری بیوی کی پسند تھی مجھے خوشی ہے کہ آپ کو بھی پسند آئی۔"

آدم کو جیسے یہ رسمی سی گفتگو اچھی نہ لگی اُس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹیں نمودار ہونے لگیں۔

"دیوان بھائی! آپ نے جو گولیاں دی تھیں۔ ویسی پڑی ہیں۔ اُن کو کیا کروں۔"

دیوان نے دل میں کہا ات تیرے خبیث کی۔ مگر چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہ ہونے دیا۔ اُس نے شکر کیا کہ توشی نہیں مسکرائی بلکہ اُس نے بڑے پروقار طریقے سے بغیر کسی ردِ عمل کے یہ بات اس طرح سنی جیسے ان سنی ہو۔

کسی بعد کی ملاقات میں دیوان مظہر الدین نے پوچھا "اس روز تم نے چائے پر بہت تکلف کیا۔ پہلے ہمیں آئس کریم کھلائی۔ پھر توشی ٹرالی پر اتنی چیزیں کھانے کے لیے لے آئی۔ میری بیوی تمہارا رہن سہن دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے۔ اُسے حیرت ہے کہ تم اتنے غیر ذمہ دار شوہر تو نہیں لگ رہے تھے جتنا تمہیں ہونا چاہیے۔ اور پھر زیادہ تعجب ہم دونوں کو جس بات پہ ہوا وہ

یہ تھی جب تمہارے سگرٹ ختم ہو گئے تو تم نے بڑے مودبانہ طور پر کہا توشی جی میں ذرا سگرٹ لے آؤں۔"

"مظہر بھائی اب میں دنیا دار ہو گیا ہوں۔ قرآن اور انجیل میں آیا ہے "Be faith full to your wives." میں نے توشی کو اپنی دونوں شادیوں کے واقعات بتا دیئے ہیں۔ میں نے اپنی دوسری محبتوں کے قصے بھی سنا دیئے۔ میں ایماندار آدمی ہوں۔"

دیوان نے دل میں کہا ہت تیرے دیانت دار کی۔ احمق کہیں کا۔"

وہ اس کے چہرے پر خراشوں کے نشان دیکھ کر بولا "کسی سے اُلجھ پڑے ہو؟"

"ٹیکسی والے سے۔ سخت بدتمیز تھا۔ کراچی میں بھی ایک دفعہ میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں اپنی شکایت لے کر ٹیکسی یونین کے دفتر جا پہنچا تھا۔ میں نے اب سٹوڈیو باقاعدہ شروع کر دیا ہے۔ آپ کسی روز آئیں آپ کو نئی تصویریں دکھاؤں۔"

مگر دیوان مظہر الدین نہ جا سکا۔ مہینہ بھر دورے پر رہا۔ واپسی پر آئے گئے ملاقاتیوں کے متعلق پوچھا تو سکرٹری نے بتایا "آدم صاحب! آئے تو نہیں تھے البتہ دو مرتبہ فون پر آپ کا پوچھا تھا۔"

دیوان نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی "کون ہے؟ آجایئے۔"

آدم گلریز ڈرائنگ روم میں اپنے سر کے نیچے سفید غلاف والے دو تکیے مروڑے قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ دیوان کو دیکھتے ہی خوشی سے اُٹھ بیٹھا۔

جب کافی دیر تک توشی نہ آئی تو دیوان نے پوچھا "گھر میں تم اکیلے ہو؟ توشی کہاں ہے؟"

"میکے گئی ہے دودھ کی گڑوی لینے۔" آدم گلریز نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"یاد نہیں آپ کو۔ شادی کے بعد ہندو لڑکیاں نہا دھو کر صبح کے وقت میکے چلی جایا کرتی تھیں۔ شام کو پتی کے لیے دودھ کی گڑوی لے کر آجایا کرتی تھیں جو پتی رات کو پیتا تھا۔ کہتے ہیں اس دودھ پر پڑھ کر کچھ پھونکا ہوتا تھا تاکہ پتی پتنی کا غلام بنا رہے۔ میں دنیا دار بن کر بھی غلام نہیں بن سکتا۔ آپ کیا ٹوٹی ہوئی تصویریں دیکھ رہے ہیں۔"

"مگر یہ توڑیں کس نے؟"

"توشی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ میں نے غصے میں ان پر مکے مار کے توڑ دیا۔ چار دن میری کلائی میں درد رہا۔"

"احمق۔"

"احمق کیوں۔ میری کلائی کو توشی کئی دن سہلاتی رہی تھی۔ دیوان بھائی! توشی کو مجھ سے محبت ہے؟"

"میں کون ہوں جواب دینے والا۔"

"اسے بخار ہو گیا تھا۔ پھوپھی آ کر لے گئی تھی۔ میں سارا دن وہاں رہتا ہوں۔ شام کو آ جاتا ہوں۔"

دیوان کو یوں لگا جیسے گلریز جھوٹ بول رہا تھا "اب کیسی ہے توشی، بخار اُترا کہ نہیں؟"

"بخار تو اُتر گیا ہے مگر مجھے یُوں لگتا ہے کہ سسرال میں بخار پھیل گیا ہے شاید وہ توشی کو نہ آنے دیں۔"

"کون نہ آنے دیں؟"

"پھوپھی اور میرے سالے۔"

"کنجڑے قصائیوں کی طرح لڑکی کو شادی کے بعد گھر بٹھا لینا۔ یہ بھی کوئی بات ہُوئی۔ یہ تو گھٹیا گھرانوں میں ہوتا ہے۔"

"توشی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا ڈارلنگ! تم رنجیدہ نہ ہونا، میں ایک ہفتہ تک آ جاؤں گی۔ آج پندرہ دن ہو گئے ہیں دیوان بھائی۔ یہ گھر اب مجھے کھانے کو دوڑتا ہے۔ میرے پاس شراب کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔"

"توشی اپنے گھر کیوں نہیں آ جاتی۔ وُہ تو پڑھی لکھی لڑکی ہے۔"

"پڑھی لکھی کو مارییے گولی۔ اس کی ماں بڑی ظالم ہے۔ اُس کا برین واشں کر رہی ہے۔ اگر وہ مجھے اپنے گھر سے نکال دیں اور توشی کو میرے ساتھ نہ آنے دیں تو؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

دیوان مظہر الدین نے سوچا یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ اُس نے آدم گلریز کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر اداسی اور افسردگی کی گہری پرچھائیاں پڑ رہی تھیں وُہ جلدی جلدی سگرٹ پی رہا تھا "پرسوں میری   نے مجھے کہا ہمارے مکان پر مت آؤ۔ اس وقت میرے دونوں سالے اور ان کی بیویاں بھی موجود تھیں۔ دیوان بھائی! بابا آدم کتنا خوش نصیب تھا کہ اُس کی کوئی ساس نہ تھی۔"

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"توشی کے کالج کی ایک پروفیسر کے ذریعہ توشی کو خط بھیجوں گا۔ وُہ مجھے معاف کر دے گی۔ اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ کہتی تھی میں تمہیں اتنی محبت کروں گی کہ تم اپنی محبتوں کی ناکامیابی بھول جاؤ گے۔"

دیوان مظہر الدین نے دل میں کہا پرنس آف ڈنمارک بودا ہیملٹ کن چکروں میں پڑا ہے۔ آج آتا ہے کل آتا ہے کوئی خبر لاتا ہے۔ اِس طرح کئی دن گزر گئے۔ آخر دیوان نے ایک شام دروازہ جا کھٹکھٹایا جو اندر سے بند تھا۔ شیشے سے دکھائی دے رہا تھا کہ آدم گلریز سر کے نیچے تکیے رکھے قالین پر لیٹا ہُوا ہے جب دیوان نے اپنا نام بتایا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، شیو بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہُوئے تھے۔ چہرے کی رونق آدھی ہو چکی تھی۔

"پھر تم نے کوئی خبر ہی نہیں دی۔ کیا توشی آ گئی یا نہیں؟"

آدم نے نفی میں سر ہلایا۔ منہ سے نہیں بولا۔

"تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟ خاموش کیوں ہو؟"

آدم نے رازدارانہ طور پر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دیوار کے پاس جا کر کھڑا

ہو گیا سیلن سے ابھری ہوئی دیوار پر ایک جگہ نیلے چاک سے گول چکر بنایا ہوا تھا۔ اسی طرح ایک اور کونے میں گول چکر تھا۔ دیوان نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

آدم نے اپنے مچے مچے ہونٹوں کو کھول جنبش دی اور بغیر آواز نکالے بولا "بگ"۔

"یہاں پر؟"

آدم نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"کس نے لگائے؟"

آدم نے منہ سے خاموش ادائیگی کرتے ہوئے کہا "گورنمنٹ" اور باہر چلنے کو اشارہ کیا۔ دونوں باہر آ گئے۔ آدم باہر سے تالا لگا کر بولا "میں اندر نہیں بول سکتا میری آواز ریکارڈ ہو رہی ہے باہر سڑک پر چلیں۔"

گلی سنسان پڑی تھی۔ آدم نے پتلون قمیص اور گرم جرسی پہن رکھی تھی مگر چہرہ اس طرح اترا ہوا تھا کہ وہ دیوان کو آدم کا بھوت دکھائی دے رہا تھا۔ "میں جدھر جاتا تھا خفیہ پولیس میرا پیچھا کرتی تھی۔ ٹیکسی والے کو ہاتھ دیتا تھا تو وہ رکتا نہیں تھا، مسکرا کر میرے پاس سے گزر جاتا تھا۔ باری باری تمام ٹیکسی والے میرے سامنے سے گزارے گئے۔ ٹیکسی والوں سے کہا گیا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے کراچی میں تمہاری مخالفت کی تھی اور اخبار میں تمہارے خلاف کالم لکھے تھے۔ ٹیکسی والے میرے ساتھ بدلہ لینے پر تل گئے تھے۔ میں وین میں بیٹھتا تھا تو وین والا میری طرف دیکھ کر مسکراتا تھا۔ میرے ساتھ انٹیلی جنس کا آدمی بیٹھ جاتا تھا۔

"مگر تمہارے مکان میں بگ کیوں لگا دیے گئے؟"

"میری بیوی حکومت سے جا ملی ہے۔ اس نے کہا بگ لگا کر سنو وہ تمہیں کیا کہتا ہے۔ تمہارے خلاف کس کس طرح کا زہر اگلتا ہے۔ حکومت نے میرے مکان کے ساتھ والے مکانوں کو خالی کرا دیا ہے۔ دیکھتے نہیں گلی جو زندگی سے کتنی بھرپور تھی اب کتنی سنسان ہے۔"

"مگر یہ کیوں ہوا ہے؟"

"یہ اس لیے ہوا کہ توشی کو حکومت نے خرید لیا ہے۔ وہ مخبر بن گئی ہے۔ آپ سمجھتے نہیں میرے خلاف بہت اونچے لیول پر محاذ بنایا جا رہا ہے۔ میں سخت غیر محفوظ ہوں۔ دیوان بھائی آپ میری امداد کیجیے۔"

"کیا کروں امداد؟"

"میں ہاؤس ارسٹ ہوں۔ میرے پیچھے سے انٹیلی جنس ہٹا دیجیے۔"

"تم کیا باتیں کر رہے ہو؟"

"آپ ذرا خاموش ہو جائیں، میں سگرٹ خرید لوں۔"

اس نے چوک میں ایک سگرٹ فروش سے سگرٹ کے دو پیکٹ خریدے۔ جیب سے نکال کر پورے پیسے دیے۔ وہ دونوں

پھر سڑک پر چلنے لگے۔ آدم گلریز نے پھر بولنا شروع کر دیا "کسی نے آکر میرا حال نہیں پوچھا۔ کسی نے یہ نہیں کہا تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اب حکومت کا کوئی آدمی آکر گرم گرم چائنیز فوڈ میری میز پر رکھ جاتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ میری بھوک مر گئی ہے۔ پڑی پڑی ٹھنڈی برف ہو جاتی ہے۔ سوتے وقت دو نوالے کھا لیتا ہوں۔"

"ہوش کی بات کرو آدم گلریز۔ کیا انٹ سنٹ کہے جا رہے ہو۔ حکومت کا آدمی میز پر چائنیز فوڈ رکھ جاتا ہے۔ حکومت نے تمہارے کمروں میں بگ لگا دیے ہیں۔ یہ سب جھوٹ اور بکواس ہے۔ بند کر دو یہ جھوٹ کا پٹارہ۔"

"دیوان مظہر الدین صاحب! اگر آپ نے یہ کہا کہ یہ سب جھوٹ اور بکواس ہے تو بجلی کے اِس کھمبے سے سر پھوڑ کر مر جاؤں گا"

وہ دیوان کو دیوان بھائی یا مظہر بھائی کہتا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ اس نے بڑی دھونس اور اکڑ سے دیوان مظہر الدین صاحب کہا تھا۔ دیوان نے کھمبے کی طرف دیکھا جو سڑک کے کنارے کھڑا کہہ رہا تھا مارو مجھ سے ٹکر، پھوڑو اپنا سر، میرا کیا جائے گا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ سرد ہوا تیز ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا اگر آدم واقعی اس کھمبے سے ٹکریں مارنے لگے اور لہولہان ہو کر بیہوش ہو جائے تو وہ امداد کے لیے کسے پکارے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ کہے آدم تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اِس میں کوئی جھوٹ اور افترا نہیں۔ تم سچے ہو میں جھوٹا۔ اب اٹھ بیٹھو مگر اُس وقت تو اس کا سر پھٹ چکا ہوگا۔

دیوان نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔ تم سچ کہتے ہو۔ میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ حکومت سب کچھ کر سکتی ہے حکومت کی اتنی بڑی مشینری کے سامنے ایک فردِ واحد کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے۔"

"اب آپ نے صحیح کہا اور صحیح سمجھا۔"

"تم اب جاؤ۔ آرام کرو۔ خدا حافظ۔" دیوان نے آدم کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

بارش آنے سے پہلے قدرت چیونٹیوں کے پر نکال دیتی ہے کہ وہ زمین سے اڑ جائیں اور سیلاب سے بچ جائیں۔ مگر وہ چیونٹیاں روشنی کے گرد اڑ اڑ کر اپنے پر کھو دیتی ہیں اور نڈھال ہو کر نیچے گر پڑتی ہیں۔ قدرت نے توشی کی صورت میں آدم کے پر نکال دیے کہ لے آدم اب اِن پروں سے اڑ اور زندگی کے جھمیلوں سے بچ کر نکل جا مگر اس نے وہ پر کھو دیے اور نڈھال ہو کر نیچے گرا اور گرا بھی ایسا کہ دماغی توازن کھو بیٹھا۔

دیوان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ توشی کی ماں سے ملے تو کس حیثیت سے۔ یہ اختیار کس نے تفویض کیا۔ اُسے یہی معلوم نہ تھا کہ توشی کی ماں رہتی کہاں ہے؟ توشی کے بھائی کام کہاں کرتے ہیں۔ اس کا واسطہ صرف آدم سے تھا۔ گلبرٹ کو ڈھونڈا جاسکے مگر گلبرٹ کے متعلق بھی علم نہ تھا کہ وہ کہاں رہتا تھا، کہاں کام کرتا تھا۔ اگلے روز بڑی سوچ بچار کے بعد دیوان جھجکتا جھجکتا آدم کے مکان کے پچھواڑے میں اُس سگرٹ بیچنے والے بوڑھے کے پاس جا پہنچا جہاں سے آدم سگرٹ خریدا کرتا تھا دیوان نے بلا ضرورت سگرٹ کی چار ڈبیاں خرید لیں اور آدم کا ذکر کیا۔ بڑے میاں نے کہا "وہ بہت دنوں سے نہیں آیا۔ میری بہو کہتی تھی کہ اُس کی بہن آئی ہوئی ہے۔"

اتنے میں بوڑھے کی بہو آگئی۔ بوڑھے نے کہا "کچھ تمہیں علم ہوگا؟"

"کس کا؟"

"تصویر بنانے والے صاحب لوک کا پوچھتے ہیں۔"

بہو ایک مونڈھے کو کپڑے سے جھاڑ کر بولی "اندر آ جائیں۔"

دیوان نے کوٹھڑی میں جا کر پوچھا، "بڑے میاں کہہ رہے ہیں اُس کی بہن آئی ہوئی تھی؟"

بہو کے چہرے پر بڑی اپنائیت کا پرتو ظاہر ہوا "بھائی سے زیادہ بہن سگرٹ پیتی ہے۔ ہمارے کنے سگریٹ لینے آئی تھی پھر میرے ساتھ دوستی ہوگئی مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں نے اور اس نے کمروں کی صفائی کی۔ اُس کا بھائی کچھ بیمار ہے۔ سارا دن لیٹا رہتا ہے۔ میں یہاں آپ کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کر سکتی، کہیں باہر ملیں۔"

"میں اپنے دفتر کا پتا تمہیں دیتا ہوں۔"

وہ کندھے اُچکا کر بڑے نخرے سے بولی "چار بجے تار گھر میں ملیے۔"

دیوان دس روپے کے نوٹ کو مروڑ کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا "ٹیکسی کا کرایہ۔"

دیوان اور وہ پردے والے کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے چائے کے برتن سامنے میز پر بکھرے پڑے تھے۔ دیوان اسے ریسٹورانٹ میں لانے کے لیے تیار نہ تھا مگر وہ مُصر تھی کہ مجھے کسی جگہ لے جا کر چائے پلاؤ۔ دیوان اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے جیسے ایک نہیں کئی بیٹھے بیٹھے جلوے تھے۔ وہ سگرٹ پی رہی تھی اور بری نہیں لگ رہی تھی۔ دیوان نے پوچھا "یہ اُس دن کی بات ہے جب اُس کا گورا چٹا سا دوست کوئٹہ سے آیا ہوا تھا۔ انہوں نے تو پی ہوئی تھی تم نے بھی پی؟"

"بہت کہتے رہے، میں نے نہیں پی۔"

"تم دونوں کے ساتھ؟"

"ہوں"

"پیسے کس نے دیے تھے؟"

"کوئٹہ والے مہمان نے۔"

"پھر تمہارا آنا جانا ہوگیا۔"

"جی"

"مگر میں نے تمہیں وہاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"[illegible] تھی [illegible] بڑا اچھا تھا [illegible] نہیں رہتا تھا۔ [illegible] آتا تھا۔

[illegible] بتا رہا ہے [illegible]

[illegible] اس نے [illegible]

"اچھا خیر۔ اب اس کی بہن اس سے [illegible] ہے؟"

"جی۔ صبح ڈاکٹر کی طرف سے کر یہی وہی جاتی ہے۔ کہتے ہیں دماغ فیل ہوگیا ہے۔"

"دیوان کو ایک روز گلبرٹ مل گیا جس سے معلوم ہُوا کہ وہ آدم کی طرف سے پیغام لے کر توشی کے پاس جا تا رہا ہے۔ مگر سمجھوتہ ہوتا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ کہتی ہے اُس کنگلے فاقہ کش کے ساتھ اس نے بڑے کرب کے دن گزارے ہیں۔

ایک صبح آدم گلریز مرجھائے ہُوئے چہرے پر مجبوری کی مسکراہٹ پھیلاتے دفتر میں آن نازل ہُوا۔ دیوان نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "بسم اللہ۔"

آدم گل ریز کی آنکھوں میں وحشت جھلک رہی تھی۔ ایک گال پر پپڑیاں جمی ہُوئی تھیں۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا جیسے اُس کے لب خشک ہو ہو کر نمی کو ترستے ہوں۔ بیٹھتے ہی اُس نے کہا "دیوان بھائی! بڑی گرم دوائیں کھلائی ہیں ڈاکٹر نے۔"

"تمہارے چہرے سے معلوم ہو رہا ہے۔"

"مجھے ٹھنڈا پانی پلوائیے گا۔"

ٹھنڈا پانی پی کر بھی اس نے انہی باتوں کو دُہرایا میرے سامنے سے ڈاکٹر نے شہر کے تمام ٹیکسی والوں کو گزار دیا۔ ایک ٹیکسی والا میرے ساتھ بڑی آنکھیں لڑاتا تھا۔ ایک دن مریضوں میں ڈاکٹر نے میرے پھوپھا کی رُوح کو لا بٹھایا جس نے میری پھوپھی کو بڑی گالیاں دیں۔ بہت بُرا بھلا کہا۔ میرا دل بڑا خوش ہُوا۔ شکر ہے میری بہن میری بیماری کا سن کر آ گئی اور ڈاکٹر کی طرف لے گئی۔ میں نے گنگنک ریچ بیچ کر اُس کا جتنا خرچ ہُوا تھا ادا کر دیا۔ دیوان بھائی! محلہ میں میری بڑی بدنامی ہُوئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ پروا نہ کرو۔"

"آپ کو معلوم ہے توشی کا سارا سامان واپس چلا گیا ہے۔ فیصلہ ہوگیا۔"

دیوان نے سوچا اگر تعجب کا اظہار کیا تو عمل اور ارادے کے مارے ہُوئے پرنس آف ڈنمارک کو اور دُکھ ہوگا۔ اس نے کہا "ہاں مجھے معلوم ہے۔"

آپ نے اُس روز میرے چہرے پر خراشوں کے نشان دیکھ کر پوچھا تھا۔ میں کس سے الجھ پڑا تھا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور سے۔ دراصل وہ توشی کے ناخنوں کے نشان تھے۔ اُس کے ساتھ لڑائی ہوگئی تھی۔ پتا ہے اپنا سامان واپس لے کر چلی گئی ہے۔ کہتی ہے گلریز نے میرے سامان کی بڑی اچھی رکھوالی کی ہے۔ خدا اس کا نگہبان ہو۔"

"چلو اُس نے کوئی کلمۂ خیر تو کہا۔"

"دیوان بھائی! اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ واپس کراچی چلا جاؤں گا۔ کراچی بڑا پردہ پوش شہر ہے۔ میں نے اپنا قالین بیچ دیا ہے۔ بید کا فرنیچر آپ خرید لیں۔"

"جیسے تم کہو، خرید لیا۔"

وں جا رہا ہوں۔ آپ کل شام آ کر اٹھوا لیں۔"

الی میز کرسیاں، صوفہ، ربڑ فوم کی کرسی، کپ بورڈ، قالین سب غائب۔ خالی کمرہ بھائیں بھائیں [illegible]

ایک کونے میں بید کی وہی چار کرسیاں اور تپائی پڑی تھی جس پر دیوان مظہر الدین اور آدم گلریز بیٹھ کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دیوان مظہر الدین کی گفتگو میں نرمی، ملائمت اور ہمدردی کی مٹھاس تھی جو آدم کے رگ و پے میں مسکن دوا کی طرح اتر رہی تھی۔ آدم کے لہجہ میں پچھتاوا، شرمساری اور شکستگی کا عنصر تھا۔ دیوان مظہر الدین کے لہجہ کی ملائمت اور مٹھاس اتنی بڑھتی چلی گئی کہ وہ قطعاً یہ نہ کہہ پایا کہ اب کراچی جا کر چرس کے سگرٹ کو منہ نہ لگانا۔ شراب میں افیون نہ گھولنا۔ اِن حرکتوں کی قیمت کافی ادا ہو چکی۔ شکر کر تجھے معالج اچھا مل گیا۔

دیوان خوش تھا کہ وہ یہ نہیں کہہ پایا۔ کئی باتیں جتائی جا ہی نہیں سکتیں۔ اپنی کمزوریاں ماننے والے اور ہوں تو ہوں آدم گلریز جیسا خود پرست نہیں ہو سکتا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میرا جی گھبرا رہا ہے۔ باہر چلیں۔ اپنے غریب پڑوسیوں سے خدا حافظ کر آؤں۔"

دونوں نالے کو پھلانگ کر سبز جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے پتھروں پر قدم رکھتے پچھواڑے میں جا پہنچے۔ دیوان ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ آدم گلریز نے دھوبی سے ہاتھ ملا کر پوچھا "دھوبی میاں! تمہارے کوئی پیسے تو میری طرف نہیں نکلتے؟"

"جی نہیں۔"

"اچھا کہا سنا معاف کرنا ہم جا رہے ہیں۔"

پھر گوالے کی ماں سے پوچھنے لگا "تمہارے کوئی پیسے تو نہیں میری طرف۔"

اس نے کہا "حساب بالکل ٹھیک ہے۔"

یہ دیکھنے کو کہ کون جا رہا ہے۔ عورتیں اور بچے بارک نما کمروں سے باہر نکل آئے۔ اُس وقت آدم بھینس چرانے والے سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ پھر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور سگرٹ والے بوڑھے کے پاس جا پہنچا "بابا جی! ہم جا رہے ہیں، کہا سنا معاف کرنا۔"

بڑے میاں نے آواز دی "بھورانی! مجھے ذرا اٹھانا۔"

بالوں میں کنگھی کرتی بہو نکل آئی۔ اُس نے بڑے میاں کو سہارا دے کر اُٹھایا۔ بڑے میاں نے کھڑے ہو کر آدم سے ہاتھ ملایا۔ پھر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "جہاں رہو خوش رہو۔"

بہو نے کہا "ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔"

آدم بولا "کمال ہے۔ دیکھو جی یہ آپ کی بھورانی کیا کہہ رہی ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ تو اتنا اچھا وقت گزرا، خدا حافظ۔"

دیوان مظہر الدین سوچ رہا تھا۔ سورج کس طرح نکلا، کس طرح چمکا، کس طرح غروب ہوا۔ آدم پبلک لیڈر کی طرح ہاتھ ہلا کر سب کو سلام کرتا دیوان کے پاس آ کر بولا "ہم کتنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر زندہ رہتے ہیں۔ "ٹالسٹائی سچا تھا جو دنیا کو چھوڑ کر مچھیروں سے جا ملا۔ گوگاں نامعلوم جزیروں میں جا بسا۔ میں کدھر جا نکلوں۔"

"اِس پردہ پوش شہر میں جس کا نام کراچی ہے۔ مجھے بتاؤ تمہاری روح DEFUNCT تو نہیں ہوئی؟"

بولا "ابھی تک محبت کو ترس رہی ہے۔"

ڈرائیور کار چلا رہا تھا جو ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ آدم اور دیوان مظہر الدین دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ دیوان مظہر الدین نے کہا "کیا سوچ رہے ہو پرنسپل ہیملٹ ؟"

"مظہر بھائی! ایک کالی مرغی آئی تھی جو میری قربانی دے کر خود چلی گئی۔"

کے ساتھ مل کر ڈیڈی کی تعریف کے تلگو گیت گاتی تھی۔ وہ گیت سن کر ڈیڈی خوب ہنستے تھے۔ لیکن ممی کو یادی کی ماں پہ بہت غصہ آتا تھا۔ تب ڈیڈی سمجھاتے کہ وہ بڑی محنت سے کام کرتی ہے۔ جبھی تو اتنی تگڑی ہے۔ یادی کی ماں کا ذکر ہو رہا ہو تو مجھے شبہ ہوتا جیسے ڈیڈی پیپرمنٹ کی گولی منہ میں رکھے ہوتے ہیں۔

"کچھ کام نہیں کرتی وہ۔ بے شرم بے حیا کہیں کی۔ جب دیکھو مردوں کے ساتھ کھی کھی کر رہی ہے۔" ممی جل کر کہتیں۔

"یادی کی ماں اور سب اور عورتیں سچ مچ بڑی بے شرم تھیں۔ کیونکہ ان کی پوری قوم کی عورتیں ساری کے ساتھ بلاؤز نہیں پہنتی تھیں۔ بالکل ننگی رہتی ہیں۔ جانے کیوں! اور مزدوری کرتی ہیں۔ پتھر پھوڑتی ہیں۔ اینٹیں اٹھاتی ہیں۔ سیڑھیوں پہ چڑھتی ہیں۔ ذرا بھی نہیں سوچتیں کہ وہ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو ننگی نظر آ رہی ہوں گی۔

ڈیڈی آفس سے آنے کے بعد مکان بنتے ہوئے دیکھتے تھے تو ممی وہاں کھڑے ہو کر بڑی نفرت سے کہتی تھیں۔

"چھی، جانے کیوں ان بے شرم عورتوں کو مزدوری کے لئے بلاتے ہیں! اور پھر وہ برانڈے میں جاکر ڈیڈی کو بلاتی تھیں۔

"بس بہت ہو چکی تفریح اندر آئیے ڈارلنگ آپ کو ایک بہت اچھی چیز دکھاؤں گی۔"

مگر ڈیڈی جیسے جانتے ہوں کہ ممی کوئی بہت اچھی چیز نہیں دکھا سکتیں۔

پھر شام کو جب یادی کی ماں دُرگا پیشگی مزدوری کے لئے ڈیڈی کی خوشامد کرتی تھی تو ڈیڈی اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر ایک اَدھ روپیہ دے دیتے تھے۔ یادی ماں کے پیچھے کھڑی بڑی اُمید بھری نظروں سے یہ تماشہ دیکھتی تھی۔ جیسے ہی ڈیڈی جیب میں سے پرس نکالتے وہ جھونپڑی کی طرف بھاگتی۔ اپنے باپ کو یہ خوشخبری سنانے کہ پیسے آ رہے ہیں۔

ایک رات بڑے زور کی بارش ہوئی۔ میدان والی تمام جھونپڑیوں میں پانی بھر گیا۔ یادی اور اس کے ماں باپ پھٹے ہوئے کپڑے اور سوپ سروں پہ ڈالے ہمارا پھاٹک پیٹنے لگے۔ ممی سمجھ گئیں کہ وہ سب اندر آنا چاہتے ہیں۔ رات بھر پورچ کو گندہ کریں گے صبح سارا فرش دھلوانا پڑے گا۔ اس لئے ممی نے ڈیڈی سے کہا کہ ان لوگوں کو چلّانے دو۔ کوئی جواب مت دو۔ بارش تیز ہوگی تو خود ہی اور کہیں بھاگ جائیں گے مگر مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ پھاٹک توڑ کر اندر نہ آ جائیں۔ یادی کہتی ہے نا کہ یہ گھر ہمارا ہے۔

جس دن مہترانی ناغہ کرتی ہے تو ممی یادی کو بلا لیتی ہیں۔ صحن میں جھاڑو لگانے پودوں کو پانی دینے اور فرش صاف کرنے کے لیے۔ یادی کے ساتھ اس کے دونوں چھوٹے بھائی بھی آ جاتے ہیں۔ بے حد گندے۔ ننگے اور ندیدے۔ وہ دونوں اپنی ٹوٹی رکابی لئے پھاٹک کے پاس بیٹھے رہتے تھے کہ کب یادی کا کام ختم ہو اور ممی اسے رات کے بچے ہوئے باسی دال چاول دیں۔

ایک دن ممی نے یادی کو جو کھانا دیا اس میں بریڈ کے وہ ٹکڑے بھی شامل تھے جو صبح میں نے دانتوں سے کاٹ کر ممی کے ڈر سے پلیٹ کے نیچے چھپا دیئے تھے۔

"ممی یہ تو میری جھوٹی بریڈ ہے یادی کو مت دیجئے۔"

"چُپ ـــ" ممی نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے چپ کرایا۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ممی جھوٹی بریڈ یادی کو کیوں دے رہی ہیں ۔

ممی سے کھانا لے کر جب یادی اور اس کے بہن بھائی گیٹ کے پاس بیٹھ کر کھانے لگے تو میں نے یادی سے کہا ۔

" یادی — تو یہ بریڈ مت کھا — یہ جھوٹی ہے ۔"

" جھوٹی ہوے تو کیا بات جی —؟ یادی کھانے میں جٹی ہوئی تھی ۔

آج کی بریڈ اتنی مزیدار تو نہیں تھی ۔ پھر یادی اسے اتنے مزے لے لے کر کیوں کھا رہی تھی ۔ صبح تو مجھ سے یہ کسی طرح نہیں کھائی گئی ۔ ممی نے سینڈوچ بنا کر دیا تو میں نے منہ میں رکھا اور پھر پلیٹ کے نیچے چھپا دیا ۔

میں ورانڈے کی ریلنگ پر چڑھا انھیں کھانا کھاتے دیکھنے لگا ۔ اچانک مجھے بھی خوب زور کی بھوک لگی جی چاہ رہا تھا کہ اپنی پلیٹ لے کر میں بھی ان کے ساتھ کھانے بیٹھ جاؤں ۔ پھر جھوٹی بریڈ یاد آئی تو مجھے ابکائی آگئی ۔ ممی کتنی خراب ہیں انھوں نے یادی کو جھوٹا کھانا کیوں دیا ۔ کیا بھگوان اس کی سزا ممی کو دیں گے ! یہ بات میں اسکول جاتے وقت بھی سوچ رہا تھا ۔

پھر ہماری ہندی ٹیچر نے گاندھی جی کے بارے میں بتلاتے ہوئے کہا کہ وہ غریبوں کے سیوک تھے تو میں نے ٹیچر سے پوچھا " میڈم کوئی آدمی غریبوں کو جھوٹی بریڈ کھلا دے تو کیا ہوگا !"

" پاپ ہے یہ تو ۔ کیا پتا کسی دن غریب آدمی امیر بن کر اسے بھی دکھ پہنچا سکتا ہے ۔" ٹیچر نے سمجھایا ۔

مگر یادی بیچاری تو کبھی امیر نہیں بن سکتی ۔

شام کو ممی نے فریج میں سے نکال کر مجھے سیب دیا ۔

" ممی کو، آپ نے یادی کو جھوٹی بریڈ کیوں دی !"

" ہائے رام ۔ میرا بیٹا کتنا (SENSITIVE) ہے ۔" ممی نے ہنس کر ڈیڈی سے کہا ۔" کل سے اسے یہی فکر ہے ۔ بیٹے یہ نادار لوگ جھوٹا کھانے کے عادی ہیں ۔ یادی کی دادی پوری کالونی سے بھیک مانگ کر لاتی ہے ۔ وہ بھی تو ہماری جھوٹن ہی ہوتی ہے نا ؟"

پھر ممی نے سیب کے چھلکے بالکنی سے نیچے پھینک کر کہا ۔

" اب تم تماشہ دیکھو ۔ یادی اور اس کے بھائی وہ سب چھلکے زمین سے اٹھا کر کھا لیں گے ۔ یہ کمینے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹے ۔"

میری ممی بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتی ہیں ۔ بڑے میٹھے انداز میں ۔ اس لئے میں ان کی ہر بات مان لیتا ہوں ۔

دوسرے دن میں اسکول سے آیا تو ممی گھر میں نہیں تھیں ۔ ڈیڈی نے بتایا کہ ممی کے ڈیڈی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے ۔ ٹرنک کال آیا تھا ۔ اس لئے ممی دوپہر کے پلین سے بمبئی چلی گئی ہیں ۔

ممی آج تک مجھے چھوڑ کر اتنی دور کبھی نہیں گئی تھیں ۔ اس لیے میں خوب رویا ۔ روتے روتے سو گیا ۔

آدھی رات کو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ یادی کی ماں درگا ممی کے بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے اور اپنے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر جھوٹا سیب ڈیڈی کے منہ میں رکھ رہی ہے ۔

زندگی نام ہے مَر مَر کے جئے جانے کا

صالحہ عابد حسین

موٹر کے وِھیل پر سر رکھے وہ دور سے آتی راضیہ کو دیکھ رہی تھی۔ سوتی کم قیمت کی ساڑھی، پیر میں دو ڈھائی روپے کے ربڑ کے چپل اور ہاتھ میں پلاسٹک کا سستا سا پرس۔ پھر بھی کتنی دلکش، کتنی مسرور اور وہ خود؟ یہ موٹر، یہ قیمتی ساڑھی، یہ ہیرے کی انگوٹھی، یہ قیمتی قلم، سب کچھ ہے مگر جب زندگی ویران اور سنسان ہو، جب دل کو سکون نہ ہو تو سب بے کار ہے اور راضیہ کی زندگی کتنی خوش و خرم، کتنی بھرپور ہے، چاہنے والا میاں، پیارے پیارے بچّے، اتنا بڑا خاندان، اور سب کو اس کی ضرورت ہے۔ اور میری ضرورت کسی کو بھی نہیں!

"اے عائشہ بہن! موٹر میں کیوں بیٹھی ہو؟" راضیہ نے دروازے کے پاس آکر جیسے اسے سوتے سے جگا دیا۔

"آج تم دیر سے کیوں آئی ہو راضیہ؟ تم تو صبح سات بجے ہی آجاتی ہو۔"

"میں نے آدھے دن کی چھُٹی لی تھی آج۔ اُن کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر کے یہاں سے ان کی دوا لانی تھی۔"

"اب کیسے ہیں اجمل بھائی؟"

"بخار ہے مگر زیادہ نہیں! وہ تو آنے ہی نہیں دے رہے تھے مگر تم جانو نوکری تو نوکری ہی ہے۔"

"تم تو ہر وقت کام کو مسلط رکھتی ہو اپنے پر۔ آخر میں بھی تو نوکری کرتی ہوں۔"

راضیہ مسکرائی۔ "راضیہ! ماشاء اللہ تم افسر ہو، پرنسپل ہو، میں تو ایک معمولی پرائمری ٹیچر ہوں، جس نے ہیڈ مسٹریس کی ڈانٹ کھانی ہوتی ہے۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"مگر میری بہن! تم مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو، تمہارا گھر ہے، بچّے ہیں، چاہنے والا شوہر ہے، کام کی لگن ہے، زندگی سے پیار ہے تمہیں۔ کام کا لافانی عیش تمہیں حاصل ہے۔" عائشہ حسبِ عادت خود رحمی کے جذبے سے پگھلی جا رہی تھی۔

راضیہ مُسکرائی۔

"کام کا لافانی عیش تو سب ہی کو ہو سکتا ہے بہن۔ تم بھی کیوں نہیں جی سے کام کرتی ہو؟"

"کس کے لیے کروں؟ میرا کون ہے؟ یہ زندگی ایک بوجھ ہے، ایک کرب ہے۔ آہ! یہ ویرانی۔ کاش کہ جلدی اس زندگی سے چھٹکارا مل جائے۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

راضیہ نے دلسوزی سے کہا، "عائشہ! یہ نا اُمیدی کی باتیں چھوڑو، تمہارے عزیز ہیں، دوست ہیں، تمہارا ملک، تمہاری قوم، سب کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"یہ سب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنا گھر، اپنا خاندان، اپنا کوئی جب تک نہ ہو، کچھ بھی اپنا نہیں لگتا، کسی چیز سے تسلی نہیں ہوتی۔"

جب سے عائشہ کا شوہر اس کے اکلوتے بچے کو چھین کر لے گیا تھا اور پردیس چلا گیا تھا، اس کی زندگی ویران ہو گئی تھی، وہ صرف یہ باتیں کہتی ہی نہ تھی۔ سچ مچ اس نے ہر چیز سے دل اٹھا لیا تھا، جس گھر کو اس نے بڑے چاؤ سے بنایا سجایا تھا اب اس کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیتی تھی، جس موٹر کو اس نے بڑے شوق سے خریدا تھا اب مجبوری کو اس میں بیٹھتی تھی، جو کپڑے اور زیور اور چیزیں اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھیں اب بوجھ بن گئی تھیں۔ یوں گھر میں خالہ تھیں، ان کے بچے تھے، دو نوکر تھے اور دور قریب کے کچھ اور عزیز بھی تھے۔ مگر اسے کسی سے دلچسپی نہ تھی، کسی کی فکر نہ تھی۔ جب اپنی زندگی کھوکھلی ہو چکی ہو تو دنیا سے اسے کیا مطلب؛

ان دونوں کے اسکول قریب قریب تھے اور روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ پہلے عایشہ کو اپنے اسکول کی کتنی فکر تھی، شہر کے بہترین اسکولوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ دیتی، اسٹاف کا خیال رکھتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ جیسے تیسے تھوڑا بہت کام کرتی اور چلی جاتی، نہ اسکول کے بچوں کی فکر، نہ اسٹاف کا خیال، نہ پروگراموں سے دلچسپی۔ راضیہ کو اس سے بہت ہمدردی تھی۔ وہ اس کی دلداری اور دلجوئی کرتی رہتی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ وہ پھر نارمل طریقے سے اپنے گھر، اپنے اسکول، اپنے کاموں میں دلچسپی لے تو اس کا جی بھی بہلے گا اور زندگی کا بوجھ بھی کم ہو گا۔ مگر کچھ دن سے وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ عایشہ کو خود رحمی کی بیماری ہو گئی ہے، غم کو پالنے میں لذّت آنے لگی ہے۔

"عایشہ بہن! اب وہ سب باتیں بھول جاؤ۔"

"کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے۔ جس پر مجھ سے دُکھ اور غم پڑیں وہی جان سکتا ہے زندگی کا کرب کیا چیز ہے! تم کیا سمجھو گی بہن، میں گھر جاتی ہوں تو وہ مجھے کاٹنے دوڑتا ہے، سنّاٹا مجھے نِگلتا ہے، ویرانی مجھے گھیر لیتی ہے۔ تم خوش قسمت ہو، تمہارے اتنے چاہنے والے ہیں، خدمت کرنے والے ہیں، خیال کرنے والے ہیں، انھیں تمہاری ضرورت ہے، تمھیں اُن کی۔"

"بہن! تم بھی زندگی کو گوارا بنا سکتی ہو۔ خوش رہنے کی کوشش کرو گی تو خوشی خود تمہارے پاس آ جائے گی۔" راضیہ نے ہمدردی سے کہا۔

"آہ راضیہ! یہ سب دل بہلاوے کی باتیں ہیں، جس کی زندگی میری طرح ویران ہو چکی ہو، وُہ زندہ نہیں، بیکار زندگی کی تہمت ہے۔"

"مگر تم نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتی ہو۔ زیادہ وسیع، زیادہ بامقصد، زیادہ بھرپور زندگی، تمہارے ارد گرد کتنے بچے ہیں جن کو تم پیار دے سکتی ہو، کتنی عورتیں ہیں جن کی تم مدد کر سکتی ہو، کتنے بھوکے ننگے ہیں جن کی بھوک مٹا سکتی ہو، تن ڈھانپ سکتی ہو۔ پھر تم دیکھو گی کہ تمہیں کتنی محبت، کتنا خلوص ملتا ہے۔ پھر تنہائی تمہیں ڈسے گی نہیں۔ ذرا کنبے کے معنی وسیع کر دو، اپنائیت کو عام کر دو میری بہن۔"

مدت سے راضیہ یہ سب کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہمیشہ مروت آڑے آجاتی مگر اس وقت وہ اپنے کو نہ روک سکی۔

"آہ تم بھی میرا دکھ میرا غم نہیں سمجھتی ہو، نصیحت کے نشتر چلاتی ہو!"

"دکھ! تم جانتی بھی ہو کہ دکھ کیا ہوتا ہے؟" تلخی سے راضیہ نے کہا

"میں ——— میں نہیں جانتی کہ دُکھ کیا ہوتا ہے؟ جس کی ساری زندگی دُکھ کے ساگر میں ڈوبی ہے۔ ہاں بھئی! تمہیں دنیا کی ہر دولت ہر سکھ حاصل ہے نا، تم یہ نہ کہو گی تو کون کہے گا؟" راضیہ نے گہری گہری نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں "سکھ، راحت، دولت! سچ کہتی تھیں بڑی بوڑھیاں اپنا حُسن اور دُوسروں کی دولت زیادہ نظر آتی ہے۔ آج کے زمانے میں لوگوں کو اپنا دُکھ، دوسروں کی راحت زیادہ نظر آتی ہے۔ تم فراغت اور آرام کی زندگی بسر کرنے والے فرضی دُکھوں کو سینے سے لگائے کرب، کٹھنائی، مصیبت کا رونا رونے والے، تم کیا جانو دُکھ کس چڑیا کا نام ہے۔ کبھی پیٹ کی جلتی آگ کو رُوکھی روٹی اور چٹنی سے بجھایا ہے؟ کبھی شوہر کے پرانے کپڑوں میں پیوند لگاتے آنسو بہائے ہیں؟ کبھی بچوں کو اسکول کے یُونیفارم، کتابوں اور اچھی چیزوں کے لیے ضد کرتا دیکھ کر دل خون کیا ہے؟ کبھی بیمار بچوں کو اچھے ڈاکٹر کو نہ دکھا سکنے کا کرب سہا ہے؟ کبھی صبح چار بجے سے اٹھ کر رات کے گیارہ بجے تک کولھو کے بیل کی طرح کام میں جُتی رہی ہو؟ اور اس پر بھی شوہر کی ناراضگی، ساس کی جھڑکیاں اور گھر والوں کے طعنے سُنے ہیں؟ کبھی تم نے سات گھنٹے اسکول میں دماغ کھپانے کے بعد رات گئے تک ٹیوشن کیے ہیں؟ کبھی بسوں کے دھکے کھائے ہیں؟ ہیڈ مسٹریس کی بد دماغیاں سہی ہیں؟ بدرنگ ساڑھیوں کا رنگ بدل کر پہنا ہے؟ ساری تنخواہ قرضخواہوں کی بھینٹ چڑھا کر ہر مہینے یہ آرزو حسرت بنی ہے کہ ایک اچھی ساڑھی خریدی جائے؟ کبھی یہ تجربہ ہوا ہے کہ چھ مہینے سے تمہاری پسندیدہ پکچر شہر میں چل رہی ہو اور تم دو روپے چالیس پیسے کا ٹکٹ خرید کر اسے نہ دیکھ سکو؟ آئیں بڑی زندگی کی محرومیوں کا دکھڑا رونے۔ تم کیا جانو زندگی کے دُکھوں کو۔"

جو لاوا برسوں سے اندر ہی اندر پک رہا تھا وُہ اچانک ہی پھٹ پڑا اور عائشہ منہ کھولے حیرانی سے اس شیریں بیان، ہنس مکھ، ہر حال میں مگن رہنے والی راضیہ کا مُنہ دیکھتی رہی جسے وُہ بڑی مطمئن، بڑی مسرور سمجھا کرتی تھی۔

آج اتوار تھا۔ عائشہ گیارہ بجے تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ بستر کے برابر لگی چائے پالا ہو چکی تھی۔ خالہ بی ناشتا سامنے رکھے اُونگھ رہی تھی اُسے پھر رات بھر نیند نہ آئی تھی مگر آج رات وُہ اپنے نہیں راضیہ اور اس کے دُکھوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ راضیہ کی باتیں اُس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کا چہرہ آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ ہم کتنا غلط سمجھتے ہیں لوگوں کو۔ ہم ——— ہمارا طبقہ ——— کتنا بے خبر ——— کتنا بے حس ہے ——— نہیں، وہ آج راضیہ کو پکڑ لے جائے گی۔ اس کے لیے ایک اچھی سی ساڑھی خریدے گی ——— اس کے بچوں کے لیے کھلونے اور کپڑے۔

بارہ بجے کے قریب وہ تیار ہو کر موٹر میں بیٹھی۔ بازار سے چیزیں خریدیں اور بہت دن بعد راضیہ کے گھر کی طرف چلی۔ دو بجنے والے تھے۔ باہر بہت سے میلے کچیلے بچے کھیل رہے تھے۔ ٹاٹ کے پردے پڑے دروازوں میں سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔ سستی آئس کریم بیچنے والا ایک آدمی بچوں کے ہاتھ آئس کریم بیچ رہا تھا۔

اس نے اندر قدم رکھا۔ راضیہ نل کے پاس بیٹھی میلے کپڑے دھو رہی تھی جن کو اس کی بارہ تیرہ سالہ بچی نچوڑ کر آنگن پر ڈالتی جا رہی تھی۔ آنگن کے ایک کونے میں دونوں چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ باورچی خانے سے دھواں نکل رہا تھا اور اندر کے چھوٹے کمرے سے کسی بوڑھی کھانسی کی آواز رہ رہ کر ابھر رہی تھی۔ غسل خانے میں کوئی نہا رہا تھا اور سو سو کر کے گاتا بھی جاتا تھا۔ وہ کئی منٹ تک اس مختصر گھر کی یہ بھرپور زندگی رشک کے جذبے کے ساتھ دیکھتی رہی۔ "ٹھیک ہے غربت ہے، محرومیاں ہیں، کٹھنائیاں ہیں، مگر اس میں محبت کی گرمی ہے ــــ جدوجہد کا "سیٹس فیکشن" ہے، اپنائیت کا احساس، خلوص کا رنگ ہے۔"

"ارے عایشہ بہن! ــــ آؤ ــــ آؤ نا ــــ وہاں کیوں کھڑی ہو؟" دوڑ کر راضیہ اس کے پاس آئی اور اپنے پھٹے دوپٹے سے گیلے ہاتھ پونچھ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

دونوں برآمدے کے ایک پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ راضیہ کا شوہر جمیل غسل خانے سے تولیہ باندھے ہوئے گاتا نکلا اور پھر ایک دم گھبرا کر پھر واپس غسل خانہ میں گھس گیا "رانی بیٹی! میرے کپڑے" اس کی کھسیانی سی آواز سنائی دی۔ "بہو ــــ اے بہو! ــــ ذرا پانی تو پلا جا ــــ" بوڑھی ساس اندر سے چلائیں۔ راضیہ نے تیزی سے اٹھ کر ان کو پانی پلایا اور پھر عایشہ کے پاس آ بیٹھی۔ اجمل بھی کونے میں رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور عایشہ کے آنے پر اظہارِ مسرت و ممنونیت کرنے لگا۔

"امی جی! کھانا لگاؤں؟" رانی نے شرما کر پوچھا

"ہاں بیٹی! لگاؤ ــــ آج تمہاری آنٹی بھی ہمارے ساتھ دال دلیہ کھائیں گی ــــ کیوں عایشہ کھاؤ گی نا؟"

"ضرور ــــ ضرور کھاؤں گی۔"

کھانے میں دال بھری وہ روٹیاں تھیں، ٹماٹر اور پیاز کی چٹنی تھی، چنے کی دال کا بھرتہ تھا ــــ اور آخر میں گڑ کی ڈلیوں سے منہ میٹھا کیا گیا تھا۔ اتنا مزے دار کھانا تو عایشہ نے جانے کب سے نہیں کھایا تھا اور اتنی بھوک! اتنی خواہش سے!!

"اب میں ہر اتوار کو تمہارے ہاں کھانا کھانے آیا کروں گی۔"

"ضرور ــــ ضرور ــــ تمہارا ہی گھر تو ہے۔"

عایشہ سوچ رہی تھی موٹر میں سے بچوں کے کھلونے، کپڑے اور راضیہ کی ساڑھی نکال کر لاتے ــــ کتنی خوش ہو گی وہ لے کر ــــ مگر وہ ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ایک بوڑھی عورت میلا برقعہ سر پر ڈالے اندر داخل ہوئی، آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، جھریوں سے بھرا چہرہ اداس تھا۔

"بوا کیسا ہے بچہ؟" گھبرا کر عایشہ نے پوچھا۔ بوا نے خاموشی سے ایک نسخہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا "ڈاکٹر نے یہ سوئیاں لکھی ہیں، کہا ہے نمونیہ ہو گیا ہے۔" اس کی آواز گھٹ گئی۔ راضیہ کے چہرے پر فکر کے بادل چھا گئے۔ پھر وہ اٹھی، کمرے میں گئی، پیچھے پیچھے بوڑھی بوا بھی تھیں ــــ ذرا دیر بعد وہ باہر آئیں تو مٹھی میں کچھ دبا ہوا تھا، مگر آنسو خشک ہو چکے تھے۔ "بوا! شام کو میں بچے کو دیکھنے آؤں گی۔" بوا چلی گئیں، عایشہ عجیب حیرانی سے راضیہ کو دیکھ رہی تھی، جس کے چہرے پر طمانیت کا ایک دلکش رنگ نکھر آیا تھا ــــ

عایشہ نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا "راضیہ! ــــ راضیہ! تم نے [illegible]

وسیع کرنا چاہیے، جبھی دل کو سکون و راحت مل سکتی ہے۔"

"تم سچ مچ سکھی ہو بہن۔" پھر اس نے پرس سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا "یہ ——— یہ روپے بوڑھی بُوا کے بچے کیلئے۔" اس سے قبل کہ آنکھوں سے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئیں وُہ تیزی سے باہر نکلی اور موٹر میں بیٹھ کر اُسے اسٹارٹ کر دیا۔ "میں ——— میں راضیہ کو کیا دے سکتی ہُوں بھلا ——— تہی دست، تہی مایہ۔" اس نے مڑ کر ان تھیلوں کی طرف دیکھا جو پچھلی سیٹ پر پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے ——— راضیہ ——— راضیہ ان سے بہت بلند ہے۔

موٹر کے ننھے سے شیشے میں اس کو اپنا چہرہ نظر پڑا۔ آج اس کا رنگ راکھ کا سا نہ تھا، اس پر ایک نکھار تھا، مسرت کی سُرخی تھی ——— ایک نیا حُسن تھا۔

گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی ——— جیسے وہ جلد سے جلد اپنی منزل تک پہنچنا چاہتی ہو۔

درد کا ایک نیا موڑ

رام لعل

گھگھر ندی کے پار شہزادپور نام کا جو قصبہ تھا اُس کی آبادی بمشکل تمام چار یا پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ لیکن ہمارا چھوٹا سا اسپتال ارد گرد کے کئی اور دیہات کے لیے بھی سودمند تھا۔ زیادہ تر ڈلیوری کے ہی کیس آتے تھے۔ وہاں کی انچارج بھی ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ ڈاکٹر کملا کھربندا۔ اس کے اسٹاف میں ایک کلرک کم اسٹور کیپر، دو نرسیں، ایک آیا، ایک چپڑاسی اور دو خاک روب شامل تھے۔ کلرک اور اسٹور کیپر کے فرائض میں ہی سر انجام دیتا تھا۔ پنجور سے ہٹائے جانے کے بعد مجھ سے ایکس رے اسسٹنٹ کا کام چھڑا لیا گیا تھا۔ جن دنوں میں پنجور ہاسپٹل میں کام کر رہا تھا۔ پورے صوبے کے ریڈیولوجسٹس کی ایک ایسوسی ایشن بھی بن چکی تھی۔ جس نے اپنا الحاق ریاستی امپلائز یونین کے ساتھ کر رکھا تھا۔ اسی یونین کی کوششوں سے ہمارے نئے گریڈوں پر حکومت غور کر رہی تھی۔ میری سینیارٹی پہلے تو تعلیمی محکمے کے کلرکوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ لیکن جب مجھے میڈیکل برانچ میں ٹرانسفر کر دیا گیا تو وہاں میری ترقی کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے تھے۔ اس بات کا دھیان ان بااقتدار لوگوں کے ذہن میں پہلے نہیں آیا تھا۔ جب انھوں نے مجھے سزا دینے کے لیے ہی تعلیم کے شعبے سے نکال کر میڈیکل میں ڈال دیا تھا۔ لیکن وہاں میں ایکس رے اسسٹنٹ بنا دیئے جانے کے باوجود اپنی ملازمت کی لمبی مدت کی بدولت ہی اپنے بیشتر ساتھیوں پر سبقت لے جا سکتا تھا۔ اس بات کو میرے ساتھیوں نے بھی پسند نہ کیا۔ یہ واقعی ان کی حق تلفی تھی۔ کیونکہ وہ اس شعبے میں میرے آنے سے کئی سال پہلے سے کام کر رہے تھے اسی لیے انھوں نے مل کر میرے خلاف ایک اپیل بھجوا دی۔ مجھے اس شعبے سے ہی نکال دینے کے لیے۔ اس کام میں بھی اُن کے صلاح کار بھٹ صاحب بن گئے تھے۔ دفتری معاملات کی ساری پیچیدگیوں میں وہ خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ خاص طور پر تخریبی کارروائیوں میں تو اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ انہی کی سازش سے مجھے میڈیکل سے بھی ہٹنا پڑ گیا تھا۔ اب میں پھر ایک کلرک بنا دیا گیا تھا۔ اس طرح میں اپنی سابقہ سینیارٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ موجودہ پوسٹ پر تو کوئی ہائی اسکول پاس بھی کام کر سکتا تھا۔ جب کہ میں بی۔ ایس سی تھا۔ ریڈیولوجی کا بھی تجربہ رکھتا تھا۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں بھی اپیل کر کے پھر سے ایکسرے اسسٹنٹ بن جانے کی کوشش کروں اور ملنے والے اُس نئے گریڈ کا بھی حقدار بن جاؤں جو نئے پے کمیشن کے زیر غور تھا یا پھر سے اُسی تعلیمی محکمے میں واپس جانے کے لیے جدوجہد کروں یہاں رہ کر میں دس پندرہ سال کے بعد سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ مشورہ مجھے جس ہیر سنگھ بھاٹیہ نے دیا تھا۔ وہ ایک دن اچانک مجھے شہزادپور میں ہی مل گیا تھا۔ انجینئرنگ پاس کر لینے اور پی ڈبلیو، ڈی میں ملازمت حاصل کر لینے کے بعد وہ ایک خاص قسم کے سروے کے سلسلے میں وہاں آیا تھا۔ پہلے تو اس نے مجھے یونین کے تئیں ناہمدردی کا رویہ اختیار کئے رہنے کے لیے بہت سخت الفاظ میں کوسا پھر اپنی کھوئی ہوئی ترقی کے سارے

مواقع دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کچھ قیمتی مشورے دیئے تو میں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ یونین میں ہر طرح کے لوگ گھس آتے ہیں نکمے اور کارآمد، موقع پرست اور ایماندار۔ مجھے غلط قسم کے لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے بیزار ہو جانے کی بجائے اچھے لوگوں کے ساتھ رابطہ ضرور رکھنا چاہیے۔ وقت پڑنے پر وہی میری مدد کر سکتے ہیں۔

بھاٹیہ میرا پرانا دوست تھا۔ چندی گڑھ میں ہم ایک ہی فلیٹ کے آدھے آدھے حصّے میں رہ چکے تھے۔ اب تو وہ بھٹ صاحب کی بیٹی اُوشا کے ساتھ شادی بھی کر چکا تھا۔ ہرشا کی چھوٹی بہن کے ساتھ۔ وہ اس سے اُسی فلیٹ میں چھپ چھپ کر ملنے آ جایا کرتی تھی جس زمانہ میں وہاں رہتا تھا ایک دن اچانک ہی مجھے یہ راز معلوم ہوگیا تھا، ہرشا ہی کے ذریعے۔ ہرشا ہی تو چھپ چھپ کر مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی! لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوگیا کہ اُسی فلیٹ کے دوسرے حصّے میں اُس کی چھوٹی بہن بھی آتی رہتی ہے۔ تو اُسے بے حد ندامت ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ اس مکان میں مجھ سے ملنے نہیں آئی تھی۔

بھاٹیہ نے بتایا: "ہماری مکان مالکن بڑی خرانٹ تھی۔ وہ ہم پر بڑی کڑی نظر رکھتی تھی۔ ایک دن وہ میرے فلیٹ میں پہنچ گئی۔ اُوشا بھی موجود تھی جو اُسے دیکھتے ہی رونے بیٹھ گئی۔ مسز بجاج کے ہاتھ پیر بھی جوڑنے لگی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ میں پھر یہاں نہیں آؤں گی۔ میں نے بھی معافی مانگ لی تو وہ نرم پڑ گئی۔ ہمیں فوراً شادی کر لینے کی ہدایت کی۔ میں فوراً ایک پنڈت کو بلا کر لے آیا۔ مسز بجاج کی موجودگی میں اس نے ہمارا وواہ پڑھا دیا۔ یہ بہت ہی عجیب تجربہ تھا۔ پہلے تو سب کچھ بے حد بناوٹی ہی لگا۔ لیکن اُس کے بعد جب مفید ترین نتائج برآمد ہوئے۔ تو مسز بجاج کی دور اندیشی کا میں قائل ہوگیا۔ ہماری شادی کرا دینے کے بعد وہ ہمیں بھٹ صاحب کے گھر لے گئی۔ اوشا کے ڈیڈی اور ممی دونوں سے آشیرواد دلانے کے لیے۔ بھٹ صاحب نے کوئی اعتراض نہ کیا، بلکہ وہ بہت خوش ہو اٹھے۔ ان کی ایک لڑکی تو ٹھکانے لگی! انھوں نے اس شادی کو فوراً تسلیم کرلیا اور ایک شاندار ایٹ ہوم دینے کا پروگرام بنانے لگے۔ مگر ان کی مسز نے بڑا واویلا مچایا۔ مجھ سے پہلے کیوں نہیں پوچھا گیا؟ میری بیٹی ایک سکھ کے ساتھ کیونکر شادی کر سکتی ہے! سکھ لوگ تو بڑے وحشی ہوتے ہیں، ہر روز گوشت کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں اور بھدی بھدی گالیاں بھی بکتے ہیں۔ میں اپنے داماد کو لوگوں کے ساتھ کیسے متعارف کراؤں گی! اسی قسم کی بے سر پیر کی ہزار باتیں! ہائی بلڈ پریشر کی وہ مریضہ تو ہے ہی۔ اسی وجہ سے وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہوگیا۔ وہ متوازن ہوگئی تو اس نے بھی ہمیں اپنا آشیرواد دے دیا۔"

اس واقعے پر ہم دونوں نے خوب قہقہے لگائے۔ اُس کے بعد بھاٹیہ واپس چلا گیا تو میں نے ایک اپیل لکھی۔ افسرانِ اعلیٰ کو اپنی پریشانیوں کی تفصیل بتائی۔ جو میری غیر اصولی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھیں۔ اب تو آئندہ کی بھی امکانی تبدیلیوں کے تصور سے گھبرا اٹھا تھا۔ بھٹ صاحب واقعی ایک طاقتور افسر ثابت ہو رہے تھے۔ جو چاہتے بڑی آسانی سے کرا لیتے تھے۔ [illegible] کسی بھی ماتحت افسر کو محض اشارہ کر دینا ہی کافی ہو جاتا تھا۔ لیکن مجھے پوری اُمید تھی میں سعیدہ چوہان [illegible] کو بروئے کار لاکر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ سعیدہ چوہان نے گذشتہ ملاقات میں [illegible] ہی محکمے میں ڈپٹی منسٹر تھے۔ اس اپیل کے بارے میں سعیدہ چوہان سے مشورہ کر لینا

بہت ضروری تھا۔ انبالہ بہت دُور نہیں تھا۔ میں اسپتال سے چھٹی لے کر بس اسٹاپ پر چلا گیا۔ بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ بس آتی دکھائی نہ دی تو میں نے سائیکل سے ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انبالہ وہاں سے اٹھارہ ہی میل دُور تھا۔ کتنے لوگ سائیکلوں سے ہی آتے جاتے تھے۔ ایک دکان سے کرائے کی سائیکل لے کر چل پڑا۔

راستے میں گھگھر ندی پڑتی تھی۔ اکثر سوکھی ہی پڑی رہتی۔ اُس روز بھی اس میں پانی نہیں تھا۔ کئی روز سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ پہاڑوں پر بارش ہو جانے سے ندی میں آناً فاناً پانی آجاتا تھا۔ اس وقت تو اسے پار کرنا ناممکن ہو جاتا۔ پانی اگرچہ کمر کمر تک ہی ہوتا لیکن اس کا بہاؤ اس قدر تیز اور تُند ہوتا کہ وہ ٹرک اور بسیں تک کبھی کبھی اُلٹ دیتا تھا۔

میں جنگل کے بیچوں بیچ مزے مزے سے سائیکل چلاتا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ جب شہزادپور سے روانہ ہوا تھا تو بے حد افسردہ تھا۔ لیکن اب پتا نہیں کیوں یکایک خوش بھی ہو اُٹھا ہوں۔ جی چاہتا ہے زور زور سے گاؤں۔ آس پاس تو کیا دُور دُور تک کوئی نہیں ہے۔ میں تو گلا پھاڑ پھاڑ کر بھی گا سکتا ہوں۔ کبھی کبھی آدمی اچانک اسطرح بھی مسرور ہو اٹھتا ہے جس کے بظاہر کوئی سبب بھی نہیں ہوتا۔ اس کی پریشانیاں اس کے ذہن میں اسی طرح موجود رہتی ہیں۔ پھر بھی خوش نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی مصیبتیں اسے بیتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں یا ان کا احساس کم ہونے لگتا ہے۔ ان لمحوں میں مجھے واقعی حیرت بھی ہوئی، میں اس قدر خوش کیوں ہوں؟ کیوں بھول گیا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے تک میں یہ سوچ سوچ کر اداس ہوا جا رہا تھا کہ میری زندگی تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اسکی ساری گرمی اور جوش و خروش کسی نامعلوم زخم کے راستے سے رس رس کر بہتا جا رہا ہے۔ شاید اسی احساس سے نجات پانے کے لیے میں انبالہ کی طرف چل پڑا ہوں۔ میری افسردگی کو دور کرنے میں سعیدہ چوہان میری معاون بن سکے گی۔ وہ ہرشا سے کہیں زیادہ ہمدرد اور ذہین ہے۔ اس کے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی ذہنی سطح بھی مجھ سے اونچی ہے۔ اُس نے مجھے پڑھنے کے لیے جو کتابیں دی تھیں انھوں نے میرے علم اور ویژن میں یقیناً کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ اگرچہ میں اس بات کے لیے ہلکا ہلکا سا صدمہ بھی محسوس کیا کرتا ہوں کہ وہ بعض معاملات میں مجھ سے زیادہ سمجھدار کیوں ہے۔ میں اس کی ذہنی رفعت کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا جس طرح میں ہرشا کے خیالات پر اکثر حاوی ہو جاتا ہوں۔ لیکن میرے دل میں سعیدہ چوہان کے لیے عزت و احترام کی جگہ بن چکی ہے شاید اسی کی وجہ سے میں اپنے اس صدمے پر بڑی آسانی سے قابو پا لیا کروں گا۔ میں اب واقعی سب کچھ بھول کر گانے بھی لگا ہوں۔ لیکن میری آواز بالکل اچھی نہیں ہے۔ لیکن میں اس حقیقت سے محظوظ ہو سکتا ہوں کہ میری آواز کتنی بھدّی ہے۔ پھر بھی میں زور زور سے گا رہا ہوں۔

سوکھی ندی کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ پورا پاٹ ایک چوڑا میدان ہی معلوم ہوتا تھا۔ گھنے جنگلوں کے درمیان ایک چوڑی سنسان سڑک کی طرح لیٹا ہوا جس میں بے شمار چھوٹے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ چکنے اور گول گول پتھر جنہیں بارش کا پانی اوپر پہاڑوں پر سے بہا بہا کر لے آتا رہتا تھا۔ بہتے ہوئے پانی کے ساتھ ساتھ یہ پتھر بھی بہتے بہتے چلے آتے ہیں۔ پانی کم ہو جاتا ہے تو یہ وہیں پڑے رہ جاتے ہیں۔ پانی پھر بہنے لگے گا۔ انہیں [illegible] ہوتا ہے۔ پھر آگے بڑھ جائیں گے۔ کچھ دُور تک۔ جہاں تک بھی جا سکیں گے!

پتھروں کے اوپر سائیکل چلاتے جانا مشکل ہونے لگا تو میں اتر پڑا۔ پیدل ہی روانہ ہو گیا۔ سوکھی ندی کے درمیان پہنچ کر کچھ لمحوں کے لیے یونہی کھڑا سا رہ گیا۔ دونوں طرف نگاہ جما کر دیکھا جدھر سے یہ ندی آتی تھی اور جدھر کو یہ چلی جاتی تھی۔ اوپر پہاڑ پر بھی گھنا جنگل تھا۔ اس سوکھی ندی کا سوتا اسی جنگل میں کہیں سے پھوٹتا ہے۔ یہ سوکھی ندی بھی ایک سیال مادہ ہے۔ جسے میں آدھا عبور کر چکا ہوں۔

مغربی ڈھلان کی طرف بہت دور ایک ریل کا پل ہے۔ اونچے اونچے پانچ میناروں پر رکھا ہوا ایک تختہ سا! ندی میں پانی بھر جاتا ہے تو لوگ بسیں چھوڑ کر اسی پل سے پیدل پار جاتے ہیں۔ ادھر سے بھی جو بسیں آتی ہیں۔ ان کے مسافر ادھر چلے آتے ہیں۔ بسیں مسافروں کی اس ادلا بدلی کو قبول کر لیتی ہیں۔ اور اپنے اپنے کنارے سے واپس چلی جاتی ہیں۔

سوکھی ندی کو عبور کر کے میں پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ گھنٹہ بھر اور سائیکل چلائی اور پھر اس سڑک پہ پہنچ گیا۔ جہاں سے سعیدہ چوہان کی کوٹھی نظر آنے لگی۔ کوٹھی کے احاطے میں اس کی کار کے علاوہ کسی اور کی کار بھی موجود تھی۔ میں سفر کی تکان اور گرمی سے تھک چکا تھا۔ لیکن اچانک ٹھنڈی ہوا چل پڑی تو میں نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پٹیالہ کی طرف سے بہت سارے گہرے بادل امڈے چلے آ رہے تھے۔ ان کی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دی۔ میں سائیکل ایک طرف ٹکا کر برآمدے میں ہی رک گیا۔ سعیدہ چوہان کی کتابیں جو میں اسے واپس کرنے کے لیے ساتھ لے آیا تھا۔ ایک بنچ پر رکھ دیں اور پسینہ پونچھنے لگا۔ وہاں پہنچ کر میں نے خود کو اچانک کم تر محسوس کیا۔ یہ وہی احساس ہے۔ جس میں میں سعیدہ چوہان کے سامنے آتے ہی مبتلا ہو جاتا ہوں۔ ابھی کچھ لمحوں کے بعد اس کے سامنے ہوں گا۔ لیکن اس کی شخصیت کی برتری مجھ پر ابھی سے طاری ہو گئی ہے۔ میں بنچ پر بیٹھ کر سامنے پڑے ہوئے اخبار اور میگزین دیکھنے لگا۔ کسی ملازم کے باہر آنے کا انتظار بھی کرنے لگا۔ لیکن میرے کان اندر سے آنے والی آوازوں کی طرف بھی متوجہ تھے۔ کوئی شخص زور زور سے ہنس رہا تھا لیکن اس کی آواز بہت پتلی تھی۔ نسوانی آوازوں سے بس ذرا مختلف!

اچانک بارش شروع ہو گئی۔ سامنے نظر آنے والی ہر چیز تیزی سے بھیگنے لگی۔ کوٹھی کی پستہ قد دیوار کے پار نظر آنے والا لیونارڈ ریفریجریٹرز کا سائن بورڈ، مرکری ربڑ ملز، کرامپٹن بیٹریز، کیلیکو کیمیکلز اینڈ پلاسٹکس کے سائن بورڈ بھی۔ گہرے نیلے لال، پیلے اور ہرے ہرے حروف دھل دھل کر اور بھی نکھرنے لگے۔ پیڑ، پتے، پھول دیواروں پر چڑھی ہوئی بیلیں، آگے پیچھے کھڑی ہوئی دونوں کاریں اور دیوار کے سہارے ٹکی ہوئی میری کرائے کی سائیکل، ہر چیز بارش میں دھل رہی تھی۔ بارش میں بھیگتا ہوا جنگلی کبوتروں کا ایک غول کا غول اچانک اڑتا ہوا آیا۔ جس نے آنگن کے اوپر کئی چکر لگائے اور پھر وہ بہت اونچائی پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے کھلے ہوئے پھاٹک کے سامنے سڑک پر بہتے ہوئے پانی میں کچھ بچے بھی چھینٹے اڑاتے اور شور مچاتے ہوئے دکھائی دیئے جو پھر آگے بڑھ گئے۔ میں نہ جانے کتنے لمحوں تک ان نظاروں کو دیکھنے میں محو رہا کہ اچانک مجھے سعیدہ چوہان کی حیرت میں ڈوبی ہوئی سریلی آواز سنائی دی۔ ارے آپ! آپ یہاں کب سے بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر میری طرف مسکراتی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ فوراً باہر بھی آ گئی۔ "ایسا بھی کیا تکلف سدھیر صاحب! اندر کیوں نہ آ گئے؟"

میں نے اپنی جھجک پر قابو پاتے ہوئے بڑی آسانی سے جھوٹ بولا ۔ میرے یہاں پہنچتے ہی بارش شروع ہو گئی۔ میں اُسی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ بھول گیا میں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔"

اچھا!" وہ ہنس پڑی ۔ ایک نظر پانی سے بھرے ہوئے آنگن پر بھی ڈالی اور کہا "لیکن آپ بھیگے تو نہیں!"

"جی نہیں"

"اچھا تو آیئے" اندر آجایئے ۔ احمد فراز صاحب آئے ہوئے ہیں"

اس نے مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں ساتھ لے جا کر پینتالیس چھیالیس برس کے ایک شخص کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا جس کے سر کے بال سفید ہو چلے تھے ۔ اس کا میرے ساتھ تعارف کراتے ہوئے کہا "آپ نیشنل بورڈ آف ایجوکیشن کے ریسرچ سنٹر میں آفیسر ہیں"

اس بعد اس نے سرفراز صاحب کو میرے بارے میں بھی بتا دیا۔ اُس نے مجھے اس کی کتابیں میز پر رکھتے ہوئے دیکھا تو کہا "انھیں پڑھ لیا؟ کیسی لگیں؟"

ایک کتاب کے بارے میں تو میں کہوں گا کہ ۔"

"لیکن ہم احمد فراز کے سامنے ان کتابوں پر گفتگو نہ کریں تو اچھا ہو گا کیونکہ یہ ہمارے نقطۂ نظر کی یقیناً مخالفت کریں گے دراصل انھیں کمیونزم سے خدا واسطے کا بیر ہے"، یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی ۔

سرفراز صاحب بھی ہنستے ہوئے بولے ۔ "تم نے خدا واسطے کہا تو مجھے ایک کمیونسٹ انٹلیکچوئل کا یہ جملہ یاد آگیا۔ جس نے کبھی بڑی بے ساختگی سے کہہ دیا تھا 'خدا کی قسم میں تو دہریا ہوں'"

اس پر ہم تینوں زور زور سے ہنسنے لگے ۔ سرفراز صاحب صوفے پر پہلو بدل کر بولے "کیمونزم بذاتِ خود ایک بہت بڑا فلسفہ ہے ۔ لیکن ہمارے ملک کے حالات اس کے لیے کبھی سازگار نہیں ہو سکیں گے ۔ کیونکہ یہاں کئی مذہب ہیں، کئی اعتقاد ہیں ۔ ان کی جڑیں عام آدمی کے طرزِ زندگی میں اتنی گہری اتر چکی ہیں ۔ جن سے لوگ کبھی الگ نہیں ہو سکیں گے۔"

سعیدہ چوہان میری واپس کی ہوئی کتابوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے بولیں "ہر انقلاب سے پہلے بورژوا ذہنیت والے لوگ کیمونزم کے خلاف اسی قسم کی دلیلیں پیش کرتے آئے ہیں ۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے"

پھر وہ اچانک ایک کتاب کے اندر رکھی ہوئی میری اپیل کو دیکھ کر بولی،

"سدھیر صاحب، یہ آپ ہی کا کوئی کاغذ ہے شاید!"

میں نے بتایا "یہ آپ ہی کو دکھانے کے لیے آیا ہوں آپ نے کہا تھا ۔ کسی ڈپٹی منسٹر سے میری سفارش کر دیں گی!"

اوہ ہاں ۔ آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئے ۔ سرفراز انہی کے پاس جا رہے ہیں ۔"

یہ کہہ کر میری درخواست جلدی جلدی پڑھ ڈالی اور پھر اِسے سرفراز صاحب کی طرف بڑھا کر کہا: "ذرا دیکھ لو تم بھی سرفراز! ہریانہ کی ایجوکیشن منسٹری کا کوئی افسران کے پیچھے پڑ گیا ہے ۔ یہ معاملہ اوپر سے ہی ٹھیک کرانا ہو گا ۔ سلامت صاحب

سے کہنا میں اس کیس میں خاص دلچسپی رکھتی ہوں“

احمد سرفراز نے بھی میری درخواست کو بڑے غور سے پڑھا اور کہا: ”یہ اچھا ہوا کہ آپ کو کبھی عارضی طور پر ایک لفٹ دے دی گئی تھی۔ اب وہی لفٹ بحال کرائی جائے گی۔ اُس کے بعد اُسی کی بدولت آپ کو ایک اور ترقی دلانے کا امکان روشن ہو جائے گا۔“

میں نے بڑے اختصار سے یونین کی کوششوں کا بھی ذکر کیا تو وہ بولے: ”وہ سب بھی ہوتا رہے اپنی جگہ پر۔ کوئی حرج نہیں اس میں، کیونکہ اس طرح کوئی آپ کے خلاف اپیل نہیں کرے گا۔ لیکن آپ کا کام تو دراصل ایک اور ہی سطح سے کرایا جائے گا جس کے لیے سعیدہ آپ کی سفارش کر رہی ہیں۔ بلکہ میں تو چاہوں گا آپ اب ڈیپوٹیشن پر دلی آ جائیے۔ ہمارے یہاں ریسرچ کونسل میں جگہیں نکلتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے ذرا زمین ہموار کرنی ہوگی۔ لیکن یہ بعد کی بات ہوگی۔“

اتنی جلدی ترقی کے زینے پر چڑھنے کے تصور سے ہی مجھے پسینہ سا آگیا۔ یقین نہیں آیا یہ سب میں نے اپنے کانوں سے ہی سنا ہے۔ لیکن سعیدہ چوہان نے اس سے بڑے اختیار سے کہا: ”ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے تم دلی میں بیٹھ کر ان کے لیے جتنا کچھ بھی کر سکتے ہو کر دینا۔“

سرفراز نے میری درخواست اپنی ڈائری میں رکھ لی اور چائے پینے لگے۔ سعیدہ چوہان نے ایک پیالہ مجھے بھی بنا کر دیا اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا: ”شاید بارش رک گئی ہے۔“

بارش واقعی بند ہو چکی تھی۔ کھڑکی میں سے جس قدر آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ دھوپ بھی نکل آئی تھی۔ سرفراز صاحب نے چائے ختم کر کے کھڑکی کے پاس جا کر باہر کا جائزہ لیا اور کہا: ”سعیدہ، اب میں چلوں گا۔“

سعیدہ اور میں انھیں کار تک چھوڑ آنے کے لیے ساتھ ساتھ گئے۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے انھوں نے میرے ساتھ بھی بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا: ”سعید صاحب! آپ چنتا مت کیجیے گا۔ آپ کا کام انشاءاللہ اسی ہفتے ہو جائے گا۔“

وہ کار نکال کر چلے گئے۔ تب بھی ہم پھاٹک پر کتنی دیر کھڑے رہے۔ پھر سعیدہ چوہان مجھے بھیگے ہوئے لان پر لے گئی۔ سارا پانی اِدھر اُدھر بہہ گیا تھا یا اُسے زمین نے جذب کر لیا تھا۔ اس نے بیٹھنے کیلئے وہیں گارڈن چیئرز منگا لیں اور کہا: ”مجھے یاد پڑتا ہے آپ پہلی مرتبہ ہمارے یہاں جس انجینئر کے ساتھ آئے تھے وہ انہی بھٹ صاحب کی ہی تو بیٹی تھی۔ جو آپ کو پریشان کر رہے ہیں!“

میں نے انھیں بھٹ صاحب کے ارادوں اور ہرشا کے ساتھ اپنے تعلقات کا سارا قصہ سنایا تو وہ حیران ہوئی۔ بولی: ”لیکن آپ نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کیوں نہ کر لی؟ تب تو بھٹ صاحب یہ سارا جھنجھٹ ہی نہ کرتے۔“

میں نے بتایا: ”میری مشکل یہ ہے کہ میں مجبوری کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کر پاتا۔ محض اپنی مالی حالت سدھارنے کے لیے ایک ایسی لڑکی کو اپنی بیوی کیونکر بنا لیتا۔ جس کے ساتھ میری ذہنی رفاقت کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ان حالات میں کیا آپ اس قسم کا سمجھوتہ کر لیں گی؟“

یہ سن کر وہ خاصی سنجیدہ نظر آئی۔ کچھ منٹوں تک بڑی خاموشی سے بے شمار چہکتی ہوئی چڑیوں کو ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ

تک اڑتا ہوا دیکھتی رہی جو بارش ہو جانے پر مست ہو اٹھی تھیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بولی۔ یہ آپ نے اچھا ہی کیا کہ ایک تکلیف دہ سمجھوتہ نہیں کیا۔ مجبوری میں اٹھائے ہوئے قدم اکثر و بیشتر ناکام ہی ثابت ہوتے ہیں۔ آپ کو میں اپنا واقعہ بتاؤں۔ بات سے بات نکل آئی ہے۔ ورنہ شاید میں کبھی نہ بتاتی۔ لیکن اپنے تک ہی رکھیے گا۔ یہ سرفراز ہے نا، دراصل میرا سابق شوہر ہے۔ ہماری شادی پندرہ سال پہلے ہوئی تھی۔"

میں تو سمجھتا تھا آپ کی ابھی شادی ہوئی ہی نہیں ہے!"

شادی ہو جائے اور معلوم نہ ہو۔ یہ بھی ایک ٹریجڈی ہی ہے۔ کئی نے اکثر مجھ سے پوچھا، میں آخر شادی کیوں نہیں کرتی!، خیر۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرا اور سرفراز کا رشتہ میری والدہ نے طے کیا تھا، اپنے میکے لکھنؤ میں۔ مجھ سے یا میرے والد سے پوچھے بغیر ہی انھوں نے ایسا کر لیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں ایسا کرنے کا انھیں پورا اختیار حاصل ہے کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ لیکن سب سے بڑا اعتراض تو مجھ ہی کو تھا۔ ابا بھی میرے ہمنوا بن گئے تھے۔ لیکن پھر مجھ سے میری اماں کے آنسو نہ دیکھے گئے۔ انھوں نے اسے اپنے وقار کا سوال بنا لیا تھا۔ یوں سرفراز صاحب میں کوئی کمی نہیں تھی۔ آپ نے دیکھا ہی ہے انھیں، شکل و صورت کے اعتبار سے بھی خاصے ہیں پھر بھی میرے اندر ایک ٹیس رہ ہی گئی۔ اس بات کا اختیار مجھے کیوں نہ دیا گیا؟"

میرے دل میں اچانک ایک تجسس نے سر اٹھایا اور میں نے اس سے پوچھ لینے میں کوئی عار نہ سمجھی۔ کیا آپ کسی سے ''

"جی نہیں" وہ زور سے ہنس پڑی "میں عشق جیسی کسی بیماری میں مبتلا نہیں تھی۔ میرے اندر بس انٹلکچوئل قسم کی لڑکیوں کا صرف ایک ہی غرور تھا۔ بلکہ یہ خواہش بھی جنم لے چکی تھی کہ کوئی ایسا پارٹنر مل جائے۔ جو میری طرح سوچتا ہو یا کم سے کم بحث مباحثے کا رسیا ہو۔ جس طرح یونیورسٹی کے زمانے میں میں خود واقع ہوئی تھی۔ میرے عشق کی حقیقت بس اتنی ہی تھی۔ یہ عشق تو میں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ بھی کر سکتی تھی۔ اگر وہ میرے معیار پر پورا اترتا! لیکن ابھی تو میں سرفراز کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ اچانک میں بیمار پڑ گئی۔ میرے پیٹ میں ایک خطرناک پھوڑا بن گیا۔ اس کے لیے اپریشن کرانا پڑا جو بہت ہی پیچیدہ تھا اپریشن کے بعد مجھے بتایا گیا میں نہ صرف ماں بننے کے قابل نہیں رہ گئی ہوں بلکہ اپنے مرد کے لیے بھی کسی کام کی نہیں رہی۔ عورت بھلے ہی ماں نہ بن سکے لیکن اگر وہ عورت ہی نہ رہ جائے تو اس کی بدقسمتی کا کیا ٹھکانا! اس کے اندر کا سارا غرور اور فخر یہاں پہنچ کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں کسی کو منہ تک دکھانے کے لائق نہیں رہ گئی تھی۔ اسپتال سے ڈسچارج ہو جانے کے بعد اپنے میکے ہی چلی آئی۔ اس کے بعد پھر کبھی واپس سسرال نہ گئی!"

میں اس کی طرف حیرت سے تکے جا رہا تھا۔ اتنی تعلیم یافتہ، ذہین اور دلکش خاتون اپنے اندر کتنی بڑی محرومی چھپائے پھرتی ہے۔ اس کی خوش مزاجی کے پیچھے اس کا اندرونی کرب بالکل دب جاتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ لیکن سرفراز صاحب کے ساتھ تو آپ کے تعلقات بہت خوشگوار نظر آتے ہیں!"

وہ ایک دوسری کہانی ہے، سدھیر صاحب! اس نے میرا آپریشن ہو جانے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ اس سے اس کے دو بچے بھی ہو گئے۔ لیکن پھر ایک اور بدقسمتی نے سرفراز کو گھیر لیا۔ اس کی دوسری بیوی بھی چل بسی، ایک حادثے میں۔

اب اُس کے بچوں کی پرورش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے چاہا میں اس کی زندگی میں واپس آجاؤں۔ کم سے کم اس کے بچوں کی نگہداشت تو کر ہی سکوں گی۔ میں بھی راضی ہوگئی تھی۔ لیکن اماں تیار نہیں ہوئیں۔ انھیں اب سرفراز سے ایک چڑ سی ہوگئی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں سرفراز اسی بہانے سے ہماری جائیداد پر قابض ہو جانا چاہتا ہے۔ جس کی میں ہی تنہا وارث ہوں۔ لیکن یہاں میں نے کچھ اپنے اختیارات سے کام لیا۔ سرفراز کے بچوں کی سرپرستی کرنا قبول کر لیا۔ وہ اب شملہ میں زیرِ تعلیم ہیں۔ چھٹیوں میں میرے ہاں پاس آکر رہتے ہیں۔ اُن کی ذمہ داری سے آزاد ہو کر سرفراز نے تیسری شادی کر لی۔ اب وہ اسی بیوی کے ساتھ خوش ہے۔ ہمارے گذشتہ تعلقات کی وجہ سے وہ کبھی کبھی ہمارے پاس آجاتا ہے۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں۔ نظریات میں اختلاف کی بنا پر ہمارے درمیان کبھی کبھی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ جس کا ہماری دوستی پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو بھی چمکنے لگے۔ لیکن وہ مسکرا کر اُنھیں چھپانے میں کامیاب ہوگئی۔ کسی اذیت پہنچانے کے لیے زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ بس ذرا سا انکار ہی کافی ہو جاتا ہے۔ زبان سے دو چار جملے ہی ادا کر لینا کافی کسی کو حقیقی سکھ اور اطمینان پہنچانے کے لیے پوری زندگی اسی طرح مسکراتے رہ جانا پڑتا ہے۔

شام کا اندھیرا اترتے دیکھ کر میں واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ سعیدہ چوہان کی لائبریری سے ایک اور کتاب اُٹھائی۔ وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر گھگھر ندی کے کنارے تک چھوڑنے کے لیے آئی۔ چند گھنٹے پہلے جو بارش ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ سے ندی بھر گئی تھی۔ پہاڑوں پر سے آتا ہوا پانی بڑے زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ اب اُس میں سے پیدل نکل کر جانا ناممکن تھا۔ سعیدہ نے تو چاہا میں واپس ہو لوں۔ رات انھی کے یہاں رہ جاؤں۔ لیکن میرا جانا بہت ضروری تھا۔ میں غلطی سے اسٹور کی چابی ساتھ لے کر چلا آیا تھا۔ کیا معلوم، کب کون سی دوا کی ضرورت پڑ جائے جو ڈسپنسری میں ختم ہو چکی ہو۔ ڈِکی میں سے سائیکل نکال کر میں ریلوے پُل کی طرف ہو لیا۔ پُل پر پہنچ کر سائیکل کو سر سے اوپر اُٹھانا پڑ گیا۔ پل بہت ہی خطرناک تھا۔ سلیپروں کے اوپر ٹین کی چادریں نہیں لگائی گئی تھیں۔ سلیپروں کی درمیان جو خالی جگہیں تھیں۔ اُن میں سے تیس چالیس فٹ نیچے میناروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر نکلتا ہوا پانی صاف دکھائی دیتا تھا۔ لیکن نیچے دیکھتے ہوئے دل ڈوبتا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی سے پاؤں پھسل سکتا تھا۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا اس پار پہنچ گیا۔ پھر اُسی احتیاط سے ڈھلان سے بھی اترا اور اسی راستے پر پہنچ گیا۔ جدھر سے شہزادپور سے آیا تھا۔ سر گھما کر ندی کے پار دیکھا تو سعیدہ چوہان کو اس کی کار کے پاس کھڑا ہوا پایا۔ ابھی تک اپنی اور ہی دیکھتے ہوئے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس نے ہاتھ لہرا دیا۔ میں بھی ہاتھ لہرانے لگا۔ پھر وہ کار میں بیٹھ گئی اسے گھما کر واپس لے گئی تو میں بھی سائیکل پر سوار ہو کر اپنے راستے پر ہو لیا۔

(۲)

ایک ہفتے بعد مجھے اچانک سعیدہ چوہان کا تار ملا۔ وہ میری ٹرانسفر دلی کرا دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جس طرح

اس نے اور احمد سرفراز صاحب نے منصوبہ بنایا تھا۔ اُسی روز شام کی ڈاک سے مجھے جسبیر سنگھ بھاٹیہ کا بھی خط ملا۔ اس نے بھی مجھے مبارک باد کے ساتھ یہی اطلاع دی کہ مجھے ڈیپوٹیشن پر دلّی بھیجا جا رہا ہے۔ اب میں بھٹ صاحب کے چنگل سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو چکا ہوں۔ اپنے اسپتال کی انچارج ڈاکٹر کھربندا کو میں نے اس کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ مجھ سے اُسی وقت چارج لے کر مجھے ریلیو کر دیا۔ وہ میری ترقی کے راستے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے مجھے ایک چھوٹا سا فیرویل بھی دیا۔ اس چھوٹے سے ماحول میں میرے لیے یہ بہت بڑی عزت تھی الوداعی دعوت میں اس کے علاوہ اسپتال کے ہی چار پانچ کارندے شریک ہوئے۔ دو تین مریضہ عورتیں بھی۔ پھر وہ سب لوگ مجھے بس اسٹاپ تک سی آف کرنے کے لیے آئے۔ گاؤں کے بھی کچھ لوگ ساتھ ہو لیے تھے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں ہر شخص کی طرف بڑی شکر گزار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جس بس سے مجھے جانا تھا۔ اُسی سے اچانک ہرشا بھی اُترتی نظر آگئی۔ وہ چنڈی گڑھ سے چلی آرہی تھی۔ اُسے بھی میری ٹرانسفر کا پتا چل گیا تھا۔ وہ تو آفس آرڈر کی ایک نقل بھی لے آئی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ خوش نہیں نظر آرہی تھی۔ میرے ساتھ ہی اُسی بس سے واپس ہوئی۔ اس نے راستے میں مجھ سے پوچھا۔ "تمھاری ٹرانسفر کس نے کرائی ہے؟"

"کسی نے بھی کرائی ہو تمھیں تو خوش ہی ہونا چاہیے"۔ میں نے اس کے گرد بازو پھیلا کر کہا۔

"پھر بھی بتاؤ تو!" اس نے میرا بازو ہٹا دیا۔

"کیا بتاؤں؟" اسے اس طرح چھیڑتے ہوئے مجھے خاصا لطف مل رہا تھا۔

"وہی جو میں جاننا چاہتی ہوں"

"اسے جان کر تم کرو گی بھی کیا! بے کار میں حسد سے جلنے لگو گی"

اس کی آنکھوں میں اور بھی بے چینی بھر گئی۔ میری طرف کئی لمحوں تک سُلگتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ لگتا تھا ابھی اُس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ اگر ہم بس کے اندر نہ ہوتے۔ اپنے کوارٹر میں ہوتے تو میں اُسے گدگدا گدگدا کر ہنسا بھی لیتا۔ بھلے ہی وہ رو پڑتی۔ میں چاہتا تھا وہ اب بھی کسی طرح ہنس پڑے۔

"کہیں اُسی چڑیل کا ہاتھ تو نہیں ہے۔ اس کارروائی کے پیچھے؟"

"کونسی چڑیل؟"

"وہ مُسلٹی سیدہ اور کون!"

"لیکن وہ نہ تو مُسلٹی ہے اور نہ ہی چڑیل۔"

"تو پھر کیا ہے وہ؟" اُس نے اور بھی جل کر پوچھا۔

"وہ تو ایک بہت ہی گریشیس عورت ہے۔ اس کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکوں گا"

یہ سن کر ہرشا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ لیکن میں اُسے بتاتا رہا۔ "آدمی

جب مصیبت میں ہوتا ہے تو کبھی کبھی بالکل اچانک کہیں غیب سے کوئی ایسا ہمدرد نمودار ہو جاتا ہے۔ جو اس کی ساری پریشانی آناً فاناً ہر لیتا ہے۔ یہ بات بڑے اچنبھے کی ہے۔ یقین ہی نہیں ہوتا لیکن میرے معاملے میں یہ کتنی بڑی حقیقت ہے۔ اس بات کو مانتی ہو نا؟ میں چنڈی گڑھ سے ٹرانسفر لیٹر لینے کے بعد پہلے اُسی کے پاس جاؤں گا، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ کیا اچھا ہو تم بھی میرے ساتھ چلو"

میں نے اس کا خوب صورت بالوں والا سر اپنے طرف گھمانے کی کوشش کی لیکن وہ میرا ہاتھ جھٹک کر بولی، "ہٹو" تم بڑے سیڈسٹ ہو! مجھے دکھ دے کر بڑے خوش ہوتے ہو!"

"پر تم اس کے ذکر پر اس طرح دکھی کیوں ہوئی ہو، ہرشا! میں تو تمھارا بھی احسان مند ہوں۔ تم ہی نے تو مجھے اس سے ملایا تھا۔ اسی لیے کہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ انبالہ چلو"

"میں تو اس کی اب شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی!"

"آخر کیوں؟ کیا اچھے لوگوں کے قریب ہونے کے لیے تمھارے اندر کبھی خواہش نہیں پیدا ہوتی؟"

"مجھے ملا ہی کیا ہے اب تک اچھے لوگوں کے قریب جا کر! تمھیں بھی تو میں ایک اچھا ہی آدمی سمجھ کر ملتی رہی ہوں۔"

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ میں تو ہرگز اچھا آدمی ثابت نہیں ہوا کیونکہ تم مجھ سے جو اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے ہو، میں انھیں پورا نہیں کر سکا! لیکن میں دوسروں کی اچھائی کی بات کر رہا تھا۔ اچھائی ہمیشہ وہی بڑی ہوتی ہے جو کسی سے پوچھے بنا ہی کر دی جائے۔ اس کے لیے بھیک نہ مانگنی پڑے، گڑگڑانے کی نوبت نہ آئے۔ سعیدہ چوہان نے خود ہی میرے بھلے کے لیے سوچا اور مجھے کبھی احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ ایسا کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہی ہے!"

"اب اس کا ذکر ختم بھی کرو گے! پلیز، چپ ہو جاؤ۔"

اُس نے آنسوؤں سے بھری ہوئی، لال لال آنکھوں سے مجھے گھورا۔

میں خاموش ہو گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بس انبالہ سے سواریاں لے کر چنڈی گڑھ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ہرشا بھی باہر دیکھ رہی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے اُس کا سوجا ہوا چہرہ دیکھا۔ سمجھ گیا اب وہ کافی دیر تک میرے ساتھ بات نہیں کرے گی۔ جب تک اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا۔ اگرچہ میں اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کا گُر جان چکا تھا۔ ابھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دوں، اور دو چار سخت کلمے مسلمانوں کے خلاف بک دوں تو وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں آ گرے گی۔ لیکن اب میں یہ سب کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پہلے اگرچہ ایسا کر کے دیکھ چکا تھا تو اُسے دراصل دھوکا ہی دیا تھا۔ صرف اُس کے جسم کی قربت ہی حاصل کرنے کے لیے۔ عورت اپنا جسم اتنے سستے داموں بھی بیچ سکتی ہے۔ صرف نظریاتی ہم آہنگی ظاہر کر دینے پر! میں بھی جھوٹ موٹ اپنے منہ کا ذائقہ کیوں خراب کروں؟

میں ہاتھ میں لی ہوئی کتاب دیکھنے لگا۔ وہی جو انبالے سے لے کر چلا تھا۔ ابھی تک اسے دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ اب

الیتان سے گھنٹہ بھر تک پڑھ سکتا ہوں۔ آزادی کی جدوجہد میں کس کس نے جانیں قربان کیں تھیں۔ اُن سارے جانبازوں کے مختصر حالات زندگی کی تاریخ کا یہ پہلا حصہ ہے۔ جسے منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ یوتھ سروسز نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں پہلے انتیس نام عبدل یا عبداللہ سے شروع ہوتے ہیں۔

عبدالاحمد : پیدائش پشاور، انتقال ۱۹۳۰ء سول نافرمانی کرنے پر گولی کھا کر۔

عبدالعلی دین محمد، پیدائش ۱۹۲۹ء، انتقال ۲۳/جنوری ۱۹۴۶ء جہازیوں کی بغاوت میں ناگپاڑہ بمبئی میں گولی کھا کر۔

عبدالعزیز، پیدائش دھونی دھوریا ضلع گجرات، مغربی پنجاب۔ انڈین آرمی میں حوالدار، انتقال امپھال میں جنگ کے میدان میں

عبدالعزیز : پیدائش ۱۹۱۶ء انتقال ۲۲/فروری ۱۹۴۶ء کرافورڈ مارکیٹ بمبئی کے قریب جہازیوں کی بغاوت میں گولی کھا کر۔

عبدالغفور محمد : پیدائش ۱۸۹۶ء، مالیگاں ضلع ناسک، خلافت تحریک کا مجاہد، ۱۸/جنوری ۱۹۲۳ء کو پھانسی۔

عبدالغنی : پیدائش دہلی میں ۱۸۹۴ء رولٹ ایکٹ کے خلاف جلوس میں شرکت کرتے ہوئے، ۳۰/مارچ ۱۹۱۹ کو دہلی ٹاؤن ہال کے قریب گولی لگنے سے ہلاک۔

عبدالغفار خاں ولد قاسم خاں : انتقال ۱۹۳۰ء پشاور میں سول نافرمانی کرنے کے دوران گولی کے زخم سے۔

عبدالکریم ولد پیر بخش (دھوبی) پیدائش ۱۹۰۱ امرتسر انتقال جلیانوالہ باغ میں ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو انگریزی افواج کی مشین گن سے گولی کھا کر۔

عبدالکریم ولد لال محمد (طالب علم) پیدائش ۱۹۰۲ء امرتسر ـــ ـــ ـ ـ ـ ایضاً

عبدالخالق ولد رحیم خاں (کاریگر قالین فیکٹری) پیدائش ۱۸۵۹ء امرتسر انتقال ـ ـ ـــ ایضاً

عبدالماجد ولد بدھو کمہار (پشاور) انتقال ـــ ـ ـــ ـــ ـــ ـــ ایضاً

عبدالماجد (طالب علم) : پیدائش اندازاً ۱۹۲۴ء الہ آباد انتقال ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں گولی کھا کر۔

عبدالرحیم ڈسراؤں بہار میں پولیس اسٹیشن کو آگ لگانے کے جرم میں گولی۔

عبدالرحیم میرا ضلع جہلم حوالدار انڈین نیشنل آرمی گوریلا جنگ کے دوران انتقال۔

عبدالشکور، عبدالستار، محمد عمر، عبداللہ، عبداللہ، عبداللہ، عبدالقادر، عبداللہ خلیفہ، عبداللہ صفی، تحریک سول نافرمانی پشاور، جلیان والا باغ، جہازیوں کی بغاوت وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بی کی پٹی نکال لی ـــــــ بابا کاشی ناتھ، بابا سکھا رام، بابو رام، بابو خاں، بابو لال، بچن سنگھ، بچن سنگھ بابی، بگا سنگھ، باغ سنگھ، بختاور، بالمکند، بینرجی، بادو دولوئی، برمن، بریٹو، بشیر احمد، بشیر احمد، باسو، بانسر مبوئل، بھگت سنگھ

وغیرہ بے شمار نام؛ بے شمار جیلیں! گولیاں! پھانسیاں! بھوک ہڑتالیں!

میں نے جلدی جلدی صفحے الٹے ۔ خدا بخش، خدا بخش بیارسے، لالہ لاجپت رائے، لال خاں، محمد عباس، محمد ابوبکر محمد افضل، محمد علی، محمد انور، محمد اشرف، محمد عزیز، محمد بنارسی، محمد حسین، محمد شبّن بھکاری، محمد شیخ، محمد دین، محمد اسماعیل، محمد رمضان اور درجنوں اور محمد اکبر وڑ ضلع راولپنڈی، پشاور، رامن ضلع راولپنڈی، نور پور ضلع جہلم، بسالی ضلع راولپنڈی، مالیگاؤں، امرتسر، دہلی، کالا کلاں ضلع سیالکوٹ، ڈبگیری ضلع پشاور، پٹی ضلع لاہور، موہوال ضلع جالندھر، کیمبر ضلع ہزارہ ——— جانے کہاں کہاں کی خاک پروانوں کی شکل اختیار کر کر کے شمع آزادی پر جل جل کر مرتے رہے اور پھر خاک بن جاتے رہے ۔ کوئی ایک مذہب نہ تھا۔ کوئی ایک فرقہ نہ تھا ۔ الگ الگ اعتقادات کے باوجود نظریہ ان کا ایک تھا، دھن ان کی ایک تھی ۔ ان کی قربانیاں اُن کے قصّے اب کتابوں کے ہی اندر قید ہو گئے ہیں ۔ ببلیوگرافیوں میں، حوالوں کی ضخیم ضخیم کتابوں کے اندر، حروف تہجی کے اعتبار سے!

میں نے آنکھیں بند کر لیں اگرچہ انگلیاں صفحات الٹتی رہیں ۔ انگلیاں ہی ان کھوئے نشانوں کو چھوتی اور محسوس کرتی رہیں ۔ ہر نشان ایک سنگِ میل تھا ۔ اتنے سارے میل پتھر اگر ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گاڑ دیئے جائیں تب بھی یہ ختم نہیں ہوں گے ۔ کتنے ناموں کو ریکارڈ نہیں کیا جا سکا ہوگا! کتنے لوگ بے نام ونشان مر گئے ہوں گے! اُن نون سولجرز! دو چار شہروں میں انجان شہیدوں کے نام پر اونچے اونچے مینار تعمیر کر کے چھٹی پا لی گئی ۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں! یا خدا مغفرت فرما!

اچانک بس شہر میں داخل ہو گئی ۔ سنٹرل بس اسٹینڈ کے اندر ہی ۔ میں نے چونک کر کتاب بند کر لی ۔ چونک کر ہرشا سے پوچھا ۔ "ہم چنڈی گڈھ پہنچ گئے!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا ۔ میں بھول گیا تھا ۔ اُسے تو میں نے ناراض کر دیا تھا ۔ وہ ابھی تک منہ پھُلائے ہوئے تھی مجھ سے پہلے ہی اپنا اٹیچی اُٹھا کر نیچے جا کر کھڑی ہو گئی ۔ میں بھی اپنا اٹیچی لے کر اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ۔ ٹیکسی والوں نے ہمیں گھیر لیا ۔ بار بار پوچھنے لگے ۔ "کہاں جانا ہے صاحب بہادر! میم صاحب بتا دیجئے! کون سے سیکٹر میں لے چلوں ۔"

ہم کوئی فیصلہ نہ کر سکے ۔ دونوں چپ چپ سے کھڑے رہے ۔ اگر وہ تجویز کرتی تو میں اُسے کسی ہوٹل میں بھی لے جا سکتا تھا ۔ لیکن اس کا ابھی تک بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر میں اُس سے کچھ نہ کہہ سکا ۔ پھر اچانک وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئی مجھ سے کچھ کہے بغیر ۔ جاتی بار میری طرف دیکھا تک نہیں ۔ مجھے افسوس ہوا ۔ اُسے اس طرح روٹھ کر نہیں جانا چاہیے تھا ۔ آج میں کتنا مسرور ہوں ۔ اُسے میرے خوشی کے بہترین لمحات میں میرا ساتھ دینا چاہیے تھا ۔ اس نے تو مجھے میری ترقی کے لیے مبارک باد بھی نہیں دی ۔ یہ بے رُخی کیسی ہے! سعیدہ چوہان کی وجہ سے ہی اُس کے اندر ایسا حسد پیدا ہو گیا ہے ۔ لیکن یہ رویّہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے ۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا کھڑا سوچتا رہا ۔ کہیں وہ اس وجہ سے تو ناخوش نہیں ہے کہ مجھے آخر یہ لفٹ ملی ہی کیوں ہے؟ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں ۔ جو خود کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتے ۔ لیکن وہ یہ بھی برداشت نہیں کر

سکتے، کوئی دوسرا اس کی مدد کر دے۔ اسی وجہ سے ان کے دل میں حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خود ایسا کر سکتے تو یقیناً خوش ہوتے! ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انھیں حسد کرنے سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے!

آخر میں نے جس بیر سنگھ کے ہی گھر جانے کا فیصلہ کر لیا، رات کو اُسی کے پاس رہوں گا۔ ایک اسکوٹر رکشا رکوا کر میں پندرہ نمبر کی طرف روانہ ہو گیا

بھاٹیہ اور اُوشا دونوں گھر پر ہی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ بھاٹیہ نے تو مجھے سینے سے لپٹا کر کہا۔ "میں جانتا تھا تم میرا خط پاتے ہی چل دو گے۔ تمھارا انتظار کر رہا تھا میں"

پھر اس نے پلٹ کر اُوشا سے کہا "میرے یار کو پروموشن ملی ہے نا! تو ہو جائے ایک گرینڈ دعوت!"

اوشا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا "ہو جائے! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

"بولو یار، کیا پیو گے؟ چلڈ بیئر بھی موجود ہے اور وسکی بھی"

"جو پلا دو گے، پی لوں گا" یہ کہہ کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اچھا تو پھر بیئر سے شروع کرتے ہیں اور وسکی پر ختم کریں گے ٹھیک!"

وہ جسم پر صرف بنیان اور کچھا ہی پہنے ہوئے تھا۔ جوڑے میں پھنسا ہوا کنگھا نکال کر گردن کے پیچھے نکلے ہوئے بال سمیٹنے لگا۔ اوشا فرج میں سے بیئر کی دو بوتلیں نکال لائی۔ پھر دو گلاس بھی اُس نے لا کر رکھ دیئے۔ بھاٹیہ نے اپنے مضبوط دانتوں سے بوتل کھولتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ "تمھارا گلاس کہاں ہے؟ تو نہیں پیئے گی؟"

اُوشا نے اُسے گھور کر دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔ بولا "سالی تم سے شرما رہی ہے"

میں نے اس سے کہا "اوشا! اگر پیتی ہو تو مجھ سے مت شرماؤ۔ میں تمھارا لگتا ہی کون ہوں!"

"واہ، تم اس کے ہونے والے جیجا جی نہیں ہو؟ سچی بات کہتے ہوئے تم بھی شرما گئے، یار!"

اب کے میں ہنسنے میں بھاٹیہ کا ساتھ نہ دے سکا۔ بولا "آج تو ہرشا نے میرے ساتھ بہت سخت لڑائی کی۔ پھر روٹھ کر گھر چلی گئی"

"تو اُسے میں منا دوں گا۔ اوشا بھی یہ خدمت انجام دے سکتی ہے۔ ایسا مشکل کام تھوڑا ہی ہے۔ ایسا کرتے ہیں اُسے بھی یہیں بلوا لیتے ہیں۔ آج کی دعوت میں اُسے بھی شامل ہو جانا چاہیے کیوں اُوشا! تم اُسے جلد بلا کر لے آؤ گی نا!"

اوشا کوئی جواب نہ دے سکی۔ خاموش کھڑی اپنے آدمی کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی بیچ میں بھاٹیہ نے اپنا گلاس اٹھا لیا! "چیئرز! فار یور گرینڈ سکسیس!"

ایک لمبا گھونٹ لے کر پھر اُس نے گلاس اُوشا کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے ہونٹوں کے ساتھ زبردستی لگا دیا۔ پھر وہ اس کی کمر میں اپنا بازو ڈال کر بولا "یاد ہے، ہم اسی کمرے میں کبھی چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے! لیکن سدھیر کو سب معلوم تھا۔ کیونکہ وہ بھی اُدھر اپنے کمرے میں تمھاری بڑی بہن کو بلا لیتا تھا۔"

وہ ہنستا رہا لیکن اوشا بگڑ کر بولی "کچھ تو شرم لحاظ بھی کر لیا کرو۔ کوئی حد بھی ہے تمہاری بے شرمی کی!"

بھاٹیہ اس کے احتجاج کو نظر انداز کر کے ایک اور بوتل نکال کر لے آیا۔ میرے پاس صوفے میں گھس کر بولا "ہاں یار، اوشا ابھی تک تو تمہاری پروویژنل سالی ہی ہے نا! کسی روز اس رشتے کو پکا ہی کر ڈالو اب! دیر کس بات کی ہے؟"

میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اوشا کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ خود ہی گلاس ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ زیرِ لب مسکرا بھی رہی تھی۔ وہ ہرشا کی نسبت زیادہ گوری تھی۔ زیادہ طرحدار بھی۔ جس پر میں ان لمحوں شاید اسی کے حسن سے مسحور ہو اٹھا اور گنگنانے لگا۔ گورے رنگ نے جٹاں دی مت ماری نی، گورے رنگ نے!

پھر اس نے میز پر پڑی ہوئی اسکوٹر کی چابی اٹھا کر اس کی گود میں پھینک دی "گلاس ختم کر کے ذرا جلدی سے ہرشا کو بلا کر لے آ۔"

اوشا نے اپنے کانوں پر ہاتھ دھر لئے، "نا بابا، یہ کام مجھ سے نہیں ہو گا۔ مجھے تو اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

بھاٹیہ اسے پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولا "پھر بے عقلوں کی سی بات کی ہے نا تو نے! اب تو ماں باپ تک اپنی بیٹیوں کو ان کے بوائے فرینڈز کے پاس بھیجنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے! ہرشا پھر بھی تیری بڑی بہن ہے۔ اس کے ساتھ تیرا رشتہ تو دوستوں کا سا ہونا چاہیے۔ جا جا، اب دیر نہ کر۔ تب تک ہم چکن بھونتے ہیں۔"

اوشا پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ بھاٹیہ نے بالکونی میں جا کر اسے اسکوٹر اسٹارٹ کر کے روانہ ہو جاتے ہوئے دیکھ لیا تو پلٹ کر وہسکی کی بھی ایک بوتل نکال لایا۔ دو پڑے بنا کر بولا "آج کل بھٹ صاحب کا گھر بالکل میدانِ جنگ بنا ہوا ہے ہر وقت میاں بیوی میں بخ بخ ہوتی رہتی ہے۔ مسز بھٹ ابھی تک مجھے معاف نہیں کر سکیں۔ مجھ سے کبھی سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔ اوشا سے چھوٹی شاردا ہے نا! وہ پچھلے مہینے کوالٹی والے ٹھکرال کے ساتھ شملہ بھاگ گئی تھی۔ میں ہی دونوں کو سمجھا بجھا کر واپس لے آیا۔ اس وعدے پر کہ بہت جلدی دونوں کی شادی کرا دوں گا۔ اب اس واقعے کے لیے بیوی شوہر کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے اور شوہر اسے کوستا رہتا ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا۔ اس کے لیے دونوں ہی ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنے یہاں کچھ اس قسم کا گل گھوٹو ماحول بنا رکھا ہے کہ وہاں رہتے ہوئے لڑکیوں کو اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے وہاں کسی بھی حساس لڑکی کا سانس تک لینا مشکل ہو گیا ہے۔ دیکھ لینا، وہ لوگ اگر خود کو نہیں بدلیں گے۔ تو ایک بھی لڑکی وہاں نہیں رہ پائے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک ہی سانس میں اپنا گلاس خالی کر دیا اور الٹے ہاتھ سے اپنی مونچھیں پونچھتے ہوئے کہا "بھٹ صاحب کے مزاج سے تم بھی اچھی طرح واقف ہو۔ اس کا کوئی بھی رویہ کبھی نارمل نہیں رہا ہے۔ خوب دھڑلے سے رشوت کھاتے ہیں اور سختی برتنے سے بھی باز نہیں آتے۔ گھر کے اندر اور باہر دونوں جگہ وہ ایک سے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ دفتر میں ہوتے ہیں تو اپنے اوپر کے افسروں و منسٹروں کا غصہ اپنے غریب اسٹاف پر نکالتے ہیں۔ گھر پر ہوتے ہیں تو اپنی جھکی بیوی کا بدلہ اپنی بے زبان لڑکیوں سے لے لیتے ہیں اور جیسے جیسے ان کے ریٹائر ہونے کا وقت قریب آتا جاتا ہے۔ ان کے اندر قوت برداشت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔

ان کا شور آس پاس کی کوٹھیوں تک والے سُنتے ہیں اور وہ لوگ طرح طرح کی باتیں بھی بناتے ہیں۔"

یہ سُن کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ہرشا اندر سے اس قدر دکھی رہتی ہے۔ ایسے ہی ذہنی تناؤ کی کیفیت میں وہ کبھی کبھی میرے پاس چلی آتی تھی۔ آج تو میں نے اس کا جی ناحق دُکھایا۔ میرے دو چار محبت بھرے جملے ہی اُسے متوازن بنا دینے میں مددگار ثابت ہو جاتے۔ ابھی آئے گی تو میں اُس سے معافی مانگ لوں گا۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو، یار!" بھاٹیہ نے زور سے میری ران پر ہاتھ مارا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جواب دیا "کسی بھی سوچ میں نہیں،،

"سمجھ گیا۔ تم ہرشا کے ہی خیالوں میں ڈوبے ہوئے ہو۔ وہ اب آتی ہی ہوگی۔ اُوشا اُسے ساتھ لے کر ہی آئے گی۔ میں جانتا ہوں۔ اچھا اُٹھو اب! کچن میں جا کر مرغا بھونیں۔ اٹھاؤ اپنا گلاس۔ وہیں پئیں گے،،

وہ فرج میں سے ایک چکن نکال کر رسوئی میں لے گیا۔ پہلے مصالحہ بنا کر اُس کے اوپر لگایا۔ پھر گیس آن کر کے گھما گھما کر بھوننے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں چربی جلنے کی آواز آنے لگی۔ جس سے بھوک کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔

کبھی یہی رسوئی میرے پاس تھی۔ تب کتنی خراب حالت میں رہتی تھی۔ کبھی کبھار ہرشا آ کر اس کی حالت سدھار دیا کرتی تھی۔ اب تو ہر چیز بڑے قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ اس کے اندر ضرورت کا ہر ایک سامان بھی موجود ہے۔ گیس کا چولہا، پریشر ککر، اوون، الیکٹرک ٹوسٹر، ہاٹ پلیٹ، ڈش اسٹینڈ، کراکری کی ایک شاندار الماری۔

میں نے اس کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے اوشا نے آ کر تمہاری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے"

"ہاں یار، یہ تو صحیح ہے۔ بالکل صحیح!" اُس نے اپنا منہ میری طرف بڑھا دیا اور میں نے اُس کا گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔"

پہلے مجھے اُوشا کی ایسی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ میں تو دراصل اُس کے ساتھ ٹمپریری قسم کی ہی دوستی رکھے ہوئے تھا۔ بھلا ہو مسز بسیاج کا جس نے زبردستی ہماری شادی کرا دی۔ اوشا واقعی ایک شاندار بیوی ثابت ہوئی ہے۔ ایسی ہی بیوی کے میں سپنے دیکھا کرتا تھا۔ اس نے میرے گھر کو جنت کی طرح خوب صورت اور آرام دہ بنا رکھا ہے۔ یار وہ مجھ سے پیار بھی بہت کرتی ہے۔ تم نے دیکھ لیا نا۔ اس کے علاوہ وہ میری زندگی میں کتنی ترقی اور خوشحالی لے آئی ہے! بھٹ صاحب نے بھی اِسی اُوشا کی ہی وجہ سے میرا بہت خیال رکھا ہے یار! مجھے ہر جائز ناجائز طریقے سے ترقی دلائی ہے۔ کہو دوست، میرا پانسہ سیدھا ہی پڑا نا!،،

پھر وہ میرا گلاس خالی دیکھ کر بولا "اسے خود ہی بھر لو نا یار۔ لاؤ میرا گلاس۔ میں بھی اسے خالی کر دوں۔"

میں نے دونوں گلاسوں کو پھر سے بناتے ہوئے کہا "تم نے ابھی اپنے پانسے کی بات کی تھی نا۔ مارک ٹوئن نے ایک بار کہا تھا۔ انسان کی زندگی میں ایسے دو ہی موقعے آتے ہیں۔ جب اُسے جُوا بالکل نہیں کھیلنا چاہیے۔ ایک موقعہ وہ جب اُس میں داؤ لگانے کی طاقت نہ ہو، اور دوسرا تب جب وہ واقعی ایسا کر سکتا ہو!"

یہ سن کر بھاٹیہ نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا جس سے ڈر کر سامنے بجلی کے تاروں پر بیٹھی ہوئی ساری چڑیاں پھر سے

اڑ گئیں۔ اس نے کہا: "اپنا داؤ لگاتے وقت میں نے ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ بہت زیادہ سوچ بچار بھی نہیں کیا تھا یار! کیونکہ یہ ہلکی سی امید تو اپنے دل میں موجود تھی ہی کہ اگر بھٹ صاحب نے مجھے اپنی فرزندی میں لینا قبول کر لیا تو پھر میرے وارے نیارے ضرور ہو جائیں گے۔ لیکن یار تم تو ایسا داؤ لگاتے ہوئے گھبرا گئے۔ لیکن خیر! انہیں لگایا تب بھی بڑے فائدے میں رہے"۔

تیز آگ کی لپٹوں پہ بار بار جھکتا ہوا چکن اب گہرے سرخ رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بھورا بھی ہونے لگا تھا۔ اس کی خوشبو اب بے طرح نتھنوں میں گھسی چلی آ رہی تھی۔ لیکن اوشا ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں ہرشا نے اسے کیوں روک رکھا ہے!

ہم پھر ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ ایک ایک ٹانگ ہاتھ میں لے کر دھیرے دھیرے نوچنے لگے۔ اسی وقت اچانک کال بیل سنائی دے گئی۔ ایک آدمی بھاٹیہ کے نام کا پرچہ لے کر آ گیا۔ اسے بھاٹیہ نے پڑھا تو وہ کچھ چپ چپ سا ہو گیا۔ اس آدمی کو واپس بھیج کر میرے پاس آیا اور بولا "پتا نہیں، وہاں اب کونسی نئی بپتا آ پڑی ہے! اوشا نے مجھے فوراً بلا بھیجا ہے۔"

اس نے جلدی جلدی کپڑے پہن لیے۔ فرج کے اوپر بندھی رکھی ہوئی پگڑی بھی سر کے اوپر جمالی اور پھر یہ کہتا ہوا چل بھی دیا: "آئی۔ ایم ساری یار! ناؤ یو انجوائے یور سیلف!"

اس کے چلے جانے کے بعد میرا سارا موڈ ہی آف ہو گیا۔ کھانے پینے کے لوازمات میں نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔ پتا نہیں، ہاں کس قسم کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا ہے! دس بج جانے پر بھی وہاں سے کوئی واپس نہ آیا! بند کو ٹالنے کے لیے میں برآمدے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ مکان کے عقبی حصے میں۔ گلی کے اس پار بھی مکانوں کے عقبی ہی حصے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے آنگن تھے پیڑوں، بیلوں، پودوں سے بھرے ہوئے۔ کہیں بیلیں نیچے سے شروع ہو کر اوپر کے فلیٹوں کی دیواروں تک پہنچ چکی تھیں۔ کہیں اوپر سے اپنا سفر شروع کر کے نچلے فلیٹوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کسی کسی گھر میں روشنی بھی تھی۔ میں جنگلے پر بے مقصد ہی جھکا ہوا کھڑا رہا۔ وہاں رہنے والوں میں سے کئی ایک کو جانتا تھا۔ کسی کسی کو ذاتی طور پر، کسی کسی کو بس شکل سے ہی، اس لیے کہ یہاں کئی سال تک رہ چکا تھا۔ کالکا پاور ہاؤس کا فورمین چاولہ ابھی ابھی موٹر سائیکل سے ڈیوٹی سے لوٹا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ چکے ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں بیاہی جا چکی ہیں۔ ایک بیٹی اپنے بچوں سمیت میکے آئی ہوئی ہے۔ پہلے یہاں بڑی رونق رہتی تھی۔ شوخ اور خوب صورت لڑکیاں ہر دم قلانچیں ہی بھرتی دکھائی دیا کرتی تھیں۔

لینگوئج ڈیپارٹمنٹ میں گورمکھی ہندی کی ڈکشنری پر کام کرنے والا کلیان سنگھ آمر دیوان پہ لیٹا اخبار پڑھ رہا ہے۔ اس کی بیوی بشرٹیں اور پتلونیں دھو دھو کر باہر تار پر لٹکاتی پھرتی ہے۔ ہائی کورٹ کا کنفیڈنشل کلرک سکھ دیو شرما اور اس کی بیوی کھانا کھا لینے کے بعد اب واک کرنے کے لیے گھر سے نکل رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا بچہ بھی ایک پریمبولیٹر میں ہے۔ بلرام پٹنی کی بیوی سونے سے پہلے اپنے لمبے بالوں میں برش کر رہی ہے۔ اس کا شوہر پہلے ہی مچھردانی میں گھس کر لیٹ چکا ہے۔ اچانک وہ بھی اپنا دوپٹہ تار پر پھینک کر اور لائٹ آف کر کے اسی مچھردانی میں گھس گئی ہے۔ دور کونے کے فلیٹ کی بالکونی پر کوئی عورت کتنی دیر سے جھک کر نیچے دیکھ رہی ہے۔ شاید اس کا پتی ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ اندر کے کمرے سے

آتی ہوئی نیون لائٹ کی تیز روشنی میں اُس کے جوڑے میں اٹکا ہوا گلاب کا پھول صاف دکھائی دے رہا ہے۔

میں کھڑا کھڑا تھک گیا۔ گھڑی دیکھی۔ اب تو بارہ بج رہے ہیں۔ وہ لوگ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ اب میرے لیے نیند پر قابو پائے رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اندر چلا گیا۔ صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

صبح چھ بجے تک میں بے خبر سوتا رہا۔ بھاٹیہ کے لوٹ آنے پر ہی میری آنکھ کھلی۔ وہ مجھے بہت ہی پریشان نظر آیا۔ جیسے رات بھر جاگنا پڑ گیا ہو اُسے۔

"کیا ہوا؟ جس بیر، رات لوٹے نہیں تم! اوشا کہاں ہے؟

دروازے کے پاس پڑا ہوا صبح کا اخبار اٹھا کر اُس نے میری طرف بڑھا دیا اور کچن کی طرف جاتے جاتے کہا "پہلے چائے بنا کر لے آؤں پھر سب کچھ بتاتا ہوں؟

میں بڑی بے دلی سے اخبار دیکھنے لگا۔ یہاں وہاں چھپی ہوئی کئی خبروں پر میری نگاہیں پھسلتی رہیں۔ کچھ خبریں بڑی بڑی چھاپی گئی تھیں۔ کچھ کو چھوٹا کر کے لگا دیا گیا تھا۔ مقامی خبروں کے کالم میں ایک خبر نے میری توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیا۔ سیکریٹریٹ کے افسرِ اعلیٰ کی بجلی کا جھٹکا لگنے سے اچانک موت! نیچے چند سطروں میں اُس حادثے کی تفصیل تھی، اور مرنے والے کا نام سیٹھ راج بھٹ لکھا ہوا تھا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ زور سے پکار کر پوچھا۔

"جس بیر، بھٹ صاحب چل بسے!"

اس خبر سے میں اس قدر مشتعل ہو اُٹھا تھا کہ یہ خیال ہی نہ آیا، بھاٹیہ اُسی وجہ سے رات بھر وہیں رہا ہوگا! پھر جیسے ساری صورتِ حال اپنے آپ ہی میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ چائے کے دو مگ لیے ہوئے واپس آیا تو میں نے دھیرے سے پوچھا "کل رات کو وہ آدمی اُوشا کا جو پرچہ لے کر آیا تھا اُس میں تمھیں بھی اطلاع دی گئی تھی؟"

"ہاں،" وہ تھکی تھکی آواز میں بولا "بات یہ ہوئی جب اُوشا نے وہاں پہنچ کر ہرشا کو تمھارا پیغام دیا تو اُس نے غصّے میں بھر کر اُسے چانٹا دے مارا۔ اُوشا بھی یہ انسلٹ برداشت نہیں کر سکی۔ غصّے میں وہ بھی سب کچھ بک گئی۔ تم چھپ چھپ کر سدھیر سے مل سکتی ہو تو میرے سامنے اس طرح کیوں بنتی ہو۔ پھر کچھ ہرشا نے بھی کہا ہوگا! دونوں بہنوں کی تو تکار بڑھی تو دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے بھٹ صاحب کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے پورے قصّے کو سمجھ کر دونوں بیٹیوں کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ جیسی ان کی عادت ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے، میری بیٹیاں اب کتنی بڑی بڑی ہو چکی ہیں، تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ ان کے ساتھ گنواروں کا سا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ وہ تو یہاں بھی آنے کے لیے تیار تھے تمھارے ساتھ لڑنے کے لیے۔ پر ہرشا ہی ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دیا "اگر آپ وہاں گئے تو میں ساتھ چلوں گی اور پھر گھر واپس نہیں آؤں گی! باپ بیٹی کے اس جھگڑے میں اب مسز بھٹ بھی کود پڑیں۔ لیکن اس نے اپنے پتی ہی کو قصور وار ٹھہرایا اس پر بھٹ صاحب اپنا سارا توازن ہی کھو بیٹھے۔ اچانک۔ جیسے پاگل ہو اُٹھے۔ بجلی کا مین سوئچ کھول کر انھوں نے ننگا تار پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں وہ ختم بھی ہو گئے۔

میں کئی لمحوں تک اُس کی طرف چپ چپ سا دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے پگڑی اتار کر گود میں رکھ لی۔ بالوں کا جوڑا کھول کر اُسے پھر سے مضبوطی سے باندھا اور کہا: "ایک غیر متوازن، تیز مزاج شخص کی موت بھی آخر اُس کے اپنے غصّے کے ہی کارن ہوئی۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اُس نے اپنا خاتمہ بھی کر لیا۔ مجھے رات بھر اُن کے گھر اور پولیس اسٹیشن کے درمیان بھاگے بھاگے پھرتے رہنا پڑ گیا۔ پولیس والوں کو کافی کچھ دینا بھی پڑا۔ نہیں تو وہ اسے خودکشی کا کیس بنا کر کئی اور دشواریاں کھڑی کر دیتے۔ اب تو انھوں نے اسے ایک اتفاقیہ حادثہ کے طور پر ہی درج کیا ہے۔

"اُف، یہ کس قدر افسوسناک ہے! میں بھٹ صاحب سے ہمیشہ نفرت کرتا رہا۔ اس سے انکار نہیں کروں گا۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ ان کا اس قدر دردناک انجام ہو۔ ہرشا تو مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی!"

"ہاں، وہ کبھی بھول نہیں پائے گی کہ اس کے باپ کی موت کا ایک سبب تم بھی بن گئے۔ اب تو اُن کی موت کے ساتھ تمھارا نام بدقسمتی سے وابستہ ہو ہی گیا سمجھو، اگرچہ تم ہرگز ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ وہ تو اصل میں تم ہی کو کچل دینا چاہتے تھے اُن کا ہر ایک سرکاری آرڈر اسی مقصد سے جاری ہوتا رہا۔"

بھائیہ کے لہجے میں میرے لیے گہری ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ اُسی کی وجہ سے مجھے ایک اطمینان سا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا: "مجھے ہرشا کے پاس جانا چاہیے؟ کم سے کم افسوس کا ہی اظہار کر آؤں۔"

"لیکن وہاں اب کوئی بھی تمھاری شکل دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔ اُن سب کی نظروں میں تم ہی اِس حادثے کے لیے ذمہ دار ہو! بہتر ہوگا اس خیال کو دل سے نکال دو۔ یہاں سے سیدھے دفتر ہی جاؤ۔ وہاں سے فوراً اپنا ٹرانسفر آرڈر لے کر دِلّی روانہ ہو جاؤ۔ یہ کام بارہ بجے سے پہلے پہلے ہی کر لینا ورنہ دفتر کے بیشتر لوگ بھٹ صاحب کی ارتھی کے ساتھ چلے جائیں گے۔ انھیں بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ تم ہی اُن کی موت کے لیے ذمہ دار ہو۔ پڑوسیوں کو تو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ لوگوں کی ہمدردی عام طور پر مرنے والے کے ہی ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس کی برائیاں بھلا دی جاتی ہیں۔ خوبیوں کے ہی افسانے گڑھ لیے جاتے ہیں۔ تم دیکھنا، شاید آج آفس میں چھٹی بھی کر دی جائے اور بھٹ صاحب کے لیے ایک بہت بڑی شوک سبھا بھی بلائی جائے! جو لوگ اُن کی زندگی میں کٹر مخالف بنے رہے تھے۔ وہی اب انھیں شردھانجلی پیش کرنے میں بھی پیش پیش نظر آئیں گے۔ وہ خود نمائی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں نکلنے دیتے۔ انسانی فطرت کی یہ بھی ایک ٹریجڈی ہے۔ لیکن تم اتنے مایوس کیوں ہو یار! فکر مت کرو۔ چیئر اَپ! ایک پیگ لگا لو جلدی سے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی سالے کی پروا مت کرو۔ اُٹھو اب۔ جلدی سے تیار بھی ہو جاؤ۔ مجھے بھی وہاں پھر جانا ہوگا۔ کہو تو تمھیں دفتر تک چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں گا۔"

اس نے ایک ڈبل پیگ بنا کر زبردستی میرے ہاتھ میں دے دیا اور نہانے کے لیے چل دیا۔ میں واش بیسن کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر منہ پر برش سے صابن تھوپنے لگا اپنی صورت کو بھی بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ میں اتنا بدصورت پہلے کبھی نہیں تھا جتنا اس وقت نظر آ رہا تھا میری نظروں کے سامنے ہرشا کا سوگوار چہرہ بھی گھوم رہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے باپ کی سفید چادر میں ڈھکی ہوئی لاش سے تھوڑی دور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے ہوئے چھت کو گھور رہی ہوگی۔ شاید مجھ ہی کو یاد کر رہی ہو! ہرشا، یہ موت تمھارے گھر میں سب سے اہم موت ہے! اقتصادی اور نظریاتی اعتبار سے بھی! جس اپار دُکھ میں تم خود کو مبتلا سمجھ رہی ہو وہ تمھیں ایک ذہنی آزادی

بھی عطا کر رہا ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ اپنے طور پر ہی سوچ سکو گی۔ اپنے بارے میں سارے فیصلے خود ہی کر لیا کرو گی۔ میرے اور تمھارے درمیان محبت اور نفرت کی جو کیفیت ہمیشہ موجود رہی ہے۔ وہ اب بدل بھی سکتی ہے۔ اگر تم چاہو گی تو! میرے اور تمھارے درمیان جو شخصیت حائل ہو جاتی تھی۔ وہ اب مر چکی ہے۔ اُسے بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔ اُسے تم خود بھی مار سکتی تھیں۔ لیکن تم بہت کمزور تھیں۔ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی تھیں۔ اب تو تم اُس شخصیت کی وجہ سے بہت اوپر اٹھنے کی کوشش کرو۔ مجھے افسوس ہے میں تمھارے پاس نہیں آ سکا۔ دِلّی جانے سے پہلے تمھیں دیکھ بھی نہیں سکتا۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ حالات اچانک میرے ہی خلاف ہو گئے ہیں۔ لیکن میں دِلّی جا کر بھی تمھیں بھول نہیں سکوں گا۔ تم وہاں بھی مجھے یاد آؤ گی۔ میں وہاں بھی تمھارا انتظار کروں گا۔ اِ گڈ بائی ہرشا!‘‘

آخری سلام

شکیلہ اختر

تو رادھا رانی —— تم جو اب تک پھولوں کی سیج پر سوتی رہی تھیں، آخر جیون کا سب سے بھیانک روپ بھی دیکھ ہی لیا نا ؟ ایئر کنڈیشن روم میں پہروں بیٹھی جس خیالی محبوب کی تصویریں بنا بنا کر تم بگاڑتی اور سجاتی رہی تھیں وہ تمہارا خواب کبھی پورا نہ ہو سکا —— اور تم خواہ مخواہ سپنوں کے تہہ خانوں میں دور تک اترتی چلی گئی تھیں ۔

—— تمہاری نگاہوں کے سائے گہرے ہوتے گئے اور تمہاری کویتاؤں میں ارمانوں کے لہو زیادہ سے زیادہ رنگین ہو کر چھلکنے لگے تھے ۔ تمہاری بنائی تصویروں میں زندگی سی بھر گئی تھی اور ان کے اندر نگاہوں کی تشنگی، چہرے کی افسردگی اور لبوں کی پیاس بھری خموشی اور فضاؤں پر چھائی ہوئی دھند اور انہی ساری چیزوں کو دیکھ دیکھ کر کچھ دلوں کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ تمہارے خیالوں اور کامناؤں کا دھارا یکدم سے کیسے بدل گیا ہے ؟ اور ہنستی کھیلتی ہوئی رادھا کی سوچوں میں یہ گمبھیرتا کہاں سے بھر گئی ہے ؟

—— رادھا رانی ! ایک دن میں نے تمہاری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا " کچھ دیئے جلا لو، کہ زندگی کے ہر موڑ پر اندھیروں میں ٹھوکریں لگتی ہیں " مگر تم نے میری بات نہ مانی ۔ اور آخر وہی ہوا جس سے میں ڈرتی تھی —— ! سپنے کبھی پورے ہوئے ہیں ؟ ممکن ہے کسی کے خواب کی تعبیر مل گئی ہو لیکن میں نہیں جانتی ۔ تم تو بڑی انٹلکچول سمجھی جاتی تھیں ۔ کالج کے اندر اور اپنے گھر میں بھی تمہاری باتوں کی سراہنا ہوا کرتی تھی ۔ ڈبیٹ میں جس طرح کھلے دل کے ساتھ تم اپنے خیالات اور آدرشوں کو پیش کرتی رہی تھیں وہ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی —— ! پھر بھی تم اپنے آپ سے مطمئن نہ تھیں اور یہی کہا کرتی تھیں کہ تمہیں اپنے سے ڈر لگتا ہے ۔ " بزدل لڑکی ! میں نے ہمیشہ تمہاری ہنسی اڑائی تھی ۔ بھلا کوئی اپنے آپ سے بھی ڈرتا ہے ؟ اور رادھا رانی ! سچ مچ تم اپنے سے ڈر گئیں تم اپنے آپ سے مات کھا گئیں جس دن تمہارے پتا نے تمہیں اپنے پاس بلا کر بڑے پیار سے کہا تھا کہ رادھا رانی ! کچھ لوگ ملنے آئیں گے، تم ذرا ان سے اچھی طرح ملنا " تم کچھ سمجھیں اور کچھ نہیں سمجھیں ! لیکن جب تم اپنی ماں کے ساتھ مہمانوں سے ملنے آئیں تب اچانک تم نے محسوس کیا تھا کہ اس وقت تمہاری حیثیت منڈی میں رکھی کسی سبزی، پھل یا جنس کی سی ہے اور خریدنے والے تمہیں بڑی گہری نگاہوں سے پرکھ رہے ہیں ۔ تم جو نہ جنس تھیں، نہ سبزی تھیں اور نہ پھل، ان تولنے والی نگاہوں کی تاب نہ لا سکیں ۔ اور اچانک تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور تمہاری گہری سیاہ آنکھوں میں نفرت بھری جھلاہٹ سی بھر گئی ۔ تو رادھا رانی ! تم اب تک لڑکیوں کی زندگی کے اس اتنے اہم موڑ سے انجان ہی بنی بیٹھی تھیں ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم جیسی لڑکیوں کی پیدائش کی خبر سن کر کبھی فخر و مسرت سے بندوق نہیں داغی جاتی ہے ۔ دنیا میں تمہارے آ جانے پر تمہاری ماں کا کمزور چہرہ مرجھا کر اور بھی جھک جاتا ہے " اسی اک خیال سے

کہ نجانے مارکیٹ کا بھاؤ تمہارے بیاہ کے وقت تک کیسا رہے گا؟ اور تم کس منڈی میں پسند کی جا سکو گی؟ ——— تو رادھا رانی! اس منڈی کا بھی ایک عجیب دستور ہے کہ بکو بھی تم ہی اور اپنی قیمت بھی تم کو ہی چکانی پڑے گی۔ کتنے گھاٹے کی سودا ہوتی ہیں لڑکیاں بھی! مگر ——— تمہارے اندر تو اتنی برداشت نہ تھی کہ خود ہی اپنی قسمت لیے اپنی تمناؤں کے دیپ جلائے اور پوجا کے پھولوں سے تھال سجائے کسی انجان قدموں پہ آرتی اتارنے کو تیار ہو جاتیں۔

——— تو رادھا رانی! زندگی کی اس دہلیز پر تمہارا یہ پہلا قدم تھا جس کا یہ انجام ہوا، پھر تمہاری سوچوں نے تمہیں کبھی شاداب ہونے نہ دیا تھا تم اپنی لائبریری اور اپنے تصورات میں کھوتی چلی گئیں اور جب کچھ دنوں کے بعد میں نے تمہیں دیکھا تو حیران رہ گئی!

——— "ارے یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ تم جو چٹکتی ہوئی کلیوں کی بہار تھیں۔ پھر یہ گیندے کے مرجھائے ہوئے پھولوں کی رنگت کہاں سے لے آئیں؟"

——— تم نے بڑی شگفتگی سے کہا تھا "شاید میں بیمار ہو رہی ہوں۔ مجھ سے تیز چلا نہیں جاتا۔ تھک جاتی ہوں اور پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔"

——— "ہونہہ! تو بے وقوف لڑکی! آخر تو نے اپنے آپ کو ستا ستا کر بیمار کر ہی لیا نا؟ اور بُنتی رہو چاند کی کرنوں سے اپنے چہرے کا نقاب۔ آخر کیا ملا تمہیں حقیقتوں سے نگاہیں چُرا کر ———؟ اور رادھا رانی دیکھتے ہی دیکھتے تم کسی شمع کی طرح پگھلنے لگی تھیں۔ درد کی تکلیف سے تم اچانک اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ تمہارے پپا نے گھبرا کر تمہیں ہوسپٹل میں داخل کر دیا تھا۔

اُفوہ! رادھا رانی! تمہارے ہوسپٹل کا سارا ماحول زندگی، اس کی رنگینیوں اور مسرتوں سے کس قدر دور تھا! اور ہر طرف سے جیسے دنیا کے فانی ہونے کا نظارا پیش کر رہا تھا غمزدہ، مرجھائی صورتوں والی راہبہ نرسیں اپنے گلے میں لمبی لمبی ڈوریوں والی تسبیح کے ننھے ننھے دانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی صلیبیں لٹکائے دنیا کی بے ثباتی کا دلوں پر نقش ڈال رہی تھیں اور مریضوں کے ہر اک کمرے میں کانٹوں کا تاج پہنے یسوع مسیح صلیب پر بیہوش لٹکے ہوئے اپنی سچائی اور معصومیت کا یقین دلا رہے تھے۔ ڈیٹول اور کلورین کی بُو سے بسا ہوا ہوسپٹل کا کونہ کونہ جھلک رہا تھا ——— لیکن رادھا رانی! تمہارے ہوسپٹل کے در و دیوار پر صلیبوں کے لرزتے ہوئے سایوں نے میرا دم گھونٹ رکھا تھا۔ شام کے ہلکے اندھیرے جب ذرا گہرے ہونے لگے تو تمہارے ہوسپٹل کے گرونڈ فلور کی طرف سے ایک ہی ساتھ اور ایک ہی لَے میں تھرتھراتی، کانپتی، نڈھال سی گڑگڑاتی ہوئی آوازوں میں کچھ لَے سنائی دیں جو یقینی طور پر نغمے تو کبھی نہیں تھے۔ ہاں شاید وہ کراہیں تھیں ڈوبتی اور اُبھرتی ہوئی سی کراہیں، جیسے دنیا سے رخصت ہوتی ہوئی سانسیں دم بھر کے لیے ٹھہر ٹھہر کر ایک ہلکا سا سہارا لے رہی ہوں ——— اور رادھا رانی! تم نے حیران ہو کر ڈیوٹی نرس سے پُوچھا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو اس نے بتایا تھا کہ "آسمانی باپ سے جو بیمار ہیں ان کی صحت اور جو مر چکے ہیں ان کے سکون کے لیے پریئر ہو رہا ہے" ——— اور ہوسپٹل کی وہ پہلی رات میں نے تمہارے کمرے میں ڈرتے ڈرتے اور جاگتے ہوئے گزار دی تھی ——— ! اور تم بہت دنوں بعد نیند کی گولیاں کھلا کر بڑے آرام سے سُلا دی گئی تھیں۔

تمہارے ڈاکٹر آتے رہے اور قسم قسم کے آلوں سے تمہاری جانچیں ہونے لگیں۔ سخت چہرے والے بڑے سرجن

کمار نے تمہیں دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا اپریشن کرنا پڑے۔

پھر اچانک تمہارے کمرے میں ایک دن اُجلی چادر سے ڈھکی ایک ٹرولی لائی گئی اور اس کے ساتھ ہی سفید ایپرن پہنے کئی کاغذ ہاتھ میں لیے ایک بہت ہی خوب صورت سا ڈاکٹر تمہارے پاس آگیا —— "آپ کو اکسرے کے لیے جانا ہے" —— اور تم رادھا رانی جو بڑی گمبھیرتا اور آدرشوں بھری کویتائیں لکھنے والی تھیں —— دم بھر کے لیے مسحور سی ہو کر رہ گئیں —— تمہارے سپنوں کا دیوتا اچانک اس طرح کہاں سے آگیا تھا؟ —— گلے میں اسٹے تھس کوپ ڈالے، تھکا تھکا سا، آنکھوں میں نیند کا خمار لیے جب وہ تمہاری ٹرولی کے ساتھ لفٹ سے نیچے اُترنے لگا، تب یک بیک پہلی بار تم نے مسرت کی اک لہر سی محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا کہ پُوجا کے پھُول انہی قدموں پر چڑھاتے ہُوئے اپنا جیون بھی دان کر دینے میں کتنی خوشی حاصل ہو سکتی ہے —— !

تب، رادھا رانی! ان دنوں تمہارے بیمار چہرے پر آپ ہی آپ ایک رونق سی آگئی تھی اور کمزور آنکھوں میں کبھی کبھی آشاؤں کے جلتے ہُوئے دیپ کی لَویں بھی کانپ سی جاتی تھیں۔

اور ایک دن تم نے مجھے سرگوشیوں میں بتایا تھا کہ اب تم اپنی رگوں میں لہو کی تیز ہوتی ہُوئی گردشوں کو محسوس کرنے لگی ہو۔ تمہاری آنکھوں میں پیار بھرا انتظار رہنے لگا ہے۔ اور جب تمہارا ڈاکٹر اپنے اسٹے تھس کوپ سے تمہارے قریب جھک کر تمہارے دل کی آواز سُننے لگتا ہے تو اس کی خوشبوؤں سے تمہارے دل کی دھڑکنیں تمہاری آرزوئیں بن کر اس کے اسٹے تھس کوپ میں تھرتھرانے لگ جاتی ہیں، اور جب وُہ اپنی انگلیوں سے تمہاری بیمار کلائی تھامے تمہاری نبض کی رفتار گننے لگتا ہے تو تمہارے چہرے پر سہاگ رات کی دُلہنوں کا سا نکھار آجاتا ہے اور تم لاج ونتی کی طرح اپنے آپ سے شرما کر اپنی باہوں میں سمٹ جانا چاہتی ہو۔

تمہارے چہرے پر شادابی کی پرچھائیوں کو دیکھ کر لوگ خوش ہو رہے تھے کہ تم اب صحت کی طرف لوٹ رہی ہو۔ تمہیں اس ہوسپٹل سے بڑا پیار ہو گیا تھا —— شاید اسی لیے کہ تم نے یہاں اپنی کامناؤں کی منزل پا لی تھی۔ اور تصوّر کا خیالی محبوب حقیقت کے رُوپ میں تمہاری نگاہوں کے سامنے آگیا تھا —— ! مگر رادھا رانی تمہاری نگاہوں میں حجاب سا کیوں رہنے لگا تھا؟ —— کیا سچ مچ تم اپنے آپ سے ڈرنے لگی تھیں؟ —— یا تمہارے سامنے کانٹوں کا تاج پہنے صلیب پر لٹکی ہوئی لہولہان مورتی تمہیں حقیقی اور مجازی محبت کا انجام یاد دلا رہی تھی —— ؟

تمہاری خاموش اور کمزور نگاہوں کو جیسے گویائی کی طاقت مل گئی تھی —— اور درد سے کراہتی ہُوئی آہ ایک پکار بن گئی تھی —— ہائے! رادھا رانی! اپنی ساری تمناؤں کو گلے سے لگا کر بھی تم کبھی کبھی تڑپ کر رہ جاتی تھیں —— تم جو ہمیشہ بلندیوں پہ اڑتی رہی تھیں —— چاند ستاروں کے سنگ آنکھ مچولی کھیلتے رہنا تمھیں پسند تھا پھر یہ اچانک ہماری دھرتی تمہیں اتنی پیاری کیسے لگنے لگی تھی؟ اسی لیے نا، کہ پوجا کے پھُول اسی زمین پر کھلتے ہیں۔

جس دن تم کو اپریشن کے لیے جانا تھا تم نے اپنے ڈاکٹر سے بس ایک ہی پرارتھنا کی تھی کہ وُہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔ اس نے تمہیں یقین دلایا تھا کہ بڑے ڈاکٹر کا اسسٹنٹ ہونے کی حیثیت سے اس کی تو وہاں پر رہنے کی ڈیوٹی ہی تھی اور وُہ ضرور وہاں پر رہے گا۔

جب تمہیں اسٹرلائز کیے ہُوئے کپڑے پہنا کر ٹرولی پر لٹایا گیا اور اپریشن روم کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس وقت تمہارے پپا اور ممی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ "بھگوان ——— اے میرے بھگوان! میری بچی کو بچا لے۔" ——— اور جب ربڑ کے بے آواز پہیوں پر چلتی ہُوئی ٹرولی اندر جا کر اور اندر کی طرف مڑتی چلی گئی۔ تب باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی بند ہوگیا۔ اور رادھا رانی! اتنے کڑے وقت میں تم بالکل اکیلی ——— ہم سب سے جدا تھیں ——— ! مگر تمہارا ڈاکٹر سر سے ہک کی اسٹرلائز کی ہوئی گول ٹوپی اور ہرا لباس پہنے ماسک باندھے تمہارے پاس تھا۔ مگر ہم سبھی بڑے نڈھال اور غمزدہ سے بند دروازے کے پاس سبز رنگ کی اونچی کرسیوں پر چپ چاپ مورتی سے بیٹھے تھے ——— ! کچھ ہی گھنٹے میں تم واپس لائی جا رہی تھیں تمہارے جسم میں چڑھائے جاتے ہُوئے گلوکوز کے پانی کی بوتل کو تھامے ہُوئے نرس تمہاری ٹرولی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی تمہاری آنکھیں بند تھیں اور تمہارے چہرے سے ایتھر کی تیز بُو چلی آ رہی تھی۔ تمہارا ڈاکٹر تمہارے بہت سے کاغذ سنبھالے تمہارے ساتھ ساتھ آ رہا تھا ——— شاید وُہ بہت تھک گیا تھا، اس کے چہرے پر ایسی غمناکی چھا رہی تھی جیسے ابھی ابھی وُہ اپنے کسی بہت ہی عزیز کو دفن کر کے آ رہا ہو۔ اڑی ہُوئی رنگت، سوکھے ہُوئے لب اور آنکھوں میں حسرت و افسردگی۔ مگر اچھا ہوا رادھا رانی جو تم اس کے اس رُوپ کو نہ دیکھ سکیں۔ تم بیہوش تھیں نا ——— اور پیٹ کا اتنا بڑا اپریشن کوئی کھیل تو نہ تھا ——— !

دھیرے دھیرے تم اچھی ہونے لگیں۔ سبھی خوش تھے مگر تمہارے پپا کی آنکھوں میں اک اضطراب سا بھر گیا تھا وہ جب بھی تمہارے قریب جاتے تو بڑے پیار اور رحم کے ساتھ تمہارے سر کو اپنے پہلو سے لگا کر تھپکنے لگتے تھے۔ اور تمہارا ڈاکٹر جو تمہارے ہوش میں آنے کے بعد کئی دنوں تک غائب رہا تھا۔ اور جب آیا بھی تو اس میں تمہاری طرف دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ نجانے کیوں وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا ——— اور رادھا رانی! جب تم نے ایک دن اس سے کہا تھا کہ "مجھے تمہارے اس ہوسپٹل سے محبت ہوگئی ہے ——— یہاں زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے اور زندگی کے پا لینے کا احساس ہوتا ہے ——— ! مگر تمہاری باتوں کو سُن کر وہ بڑے کرب سے بولا تھا "یہاں کے در و دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر کتنی ہی جانیں مٹتی بھی تو رہی ہیں" ——— !

تم ہوسپٹل سے اپنے گھر جانا نہیں چاہتی تھیں ——— مگر تمہارے سرجن کمار نے تمہیں جھوٹی تسلیاں دے کر گھر بھیج دیا تھا ——— تم بے چین بے چین سی تھیں جیسے تمہارا سکون چھن گیا ہو۔ لیکن رادھا رانی! تم تو شروع ہی سے اپنے آنسوؤں کو پی لینے میں ماہر تھیں ——— پھر تمہارا درد کون جان سکتا تھا ——— ہاں کبھی کبھی جب تم اپنے ضبط سے گھبرا جاتی تھیں تو ہوسپٹل کا نمبر ملا کر کہتیں: "ہلو ——— ہلو انکوائری! کیا آپ سرجن کمار جی کے اسسٹنٹ کو فون پر بلا سکتے ہیں؟" ——— اور رادھا رانی! کبھی تو وہ ایمرجنسی میں رہتا، کبھی اپریشن روم میں ——— اور کبھی تم اس کی مہربان آواز بھی سُن لیا کرتی تھیں۔ صرف ایک جانی پہچانی ہوئی آواز جو تمہارے لیے اس کی صورت بھی بن جاتی تھی۔ پیار کی لمس بھی اور نگاہوں کی تسکین بھی ——— ! بیچارہ مجبور انسان کیسے کیسے کھلونوں سے بہل جاتا ہے۔

پھر چند ہی مہینوں کے بعد تم اسی ہوسپٹل میں لائی گئی تھیں۔ بے حد کمزور اور پیٹ کے درد سے تڑپتی ہُوئی۔ تم نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو مشکلوں سے اُٹھا کر اپنے ڈاکٹر کو پرنام کیا تھا، تمہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کی رونق مٹ گئی تھی۔ وہ تو بہت پہلے ہی سے جانتا تھا رادھا رانی کہ تمہارا مرض، تمہیں کبھی

جینے نہ دے گا۔ جس دن تمہارا اپریشن ہوا تھا اور پیٹ کھلتے ہی چپکے سے سلائی کر دی گئی تھی کہ کینسر کا مرض چھری لگنے سے اور بھی تیزی سے بڑھنے لگتا ہے اور تمہارا کینسر تو اسی وقت بہت بڑھ چکا تھا۔ مگر تم کو دوبارہ ہوسپٹل میں آنے کی خوشی تھی۔ تم نے اپنے ڈاکٹر سے رُکے رُکے لہجے میں کہا تھا کہ زندگی مجھے پکار رہی ہے اِسی لیے تو یہاں آ گئی ہوں —— مگر وہ پکار کس کی تھی رادھارانی!

یہ تمہارا ڈاکٹر اچھی طرح سے جان رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ چراغ کی لو مدھم سے مدھم ہوتی چلی گئی۔ اور تمہارا درد اتنا بڑھ گیا تھا کہ انجکشن دے دے کر تمہیں سُلائے رکھا جاتا تھا۔ حالانکہ تم یہی چاہتی تھیں کہ تمہاری آنکھیں کھلی رہیں تاکہ تم اپنی آنکھوں کے ذریعہ حیاتِ تازہ کی لہروں کو اپنے اندر سمیٹتی چلی جاؤ۔ ہم سبھی تمہاری حالت کو دیکھ کر تمہاری ابدی جُدائی کے غم کو سہہ لینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اوہ رادھارانی! جب درد سے تڑپ کر تم ہوش میں آ جاتی تھیں تو تمہارے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو تھام لینے پر بھی تمہارا ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اور ہم سبھی بے بس بیٹھے تمہیں تسکین بھی نہیں دے سکتے تھے۔ بس تمہارا اب ایک ہی علاج باقی رہ گیا تھا کہ تمہیں انجکشن دے دے کر سلائے رکھا جائے، تمہاری آدھی کھلی اور آدھی چھپی ہوئی آنکھیں بےحد کمزور ہو گئی تھیں اور ہم کتنے سخت جان تھے رادھارانی! جو اس حال میں تمہیں دیکھ رہے تھے۔ تمہاری آنکھیں جب کھلتیں ان میں ایک تلاش ہوتی تھی۔ بڑی بے صبری کی تلاش! —— مگر جس کو تمہاری نگاہیں ڈھونڈتی رہتی تھیں اس کے اور بھی تو کام تھے۔

پھر نہ جانے کیسے اچانک سارا شہر پانی میں ڈوب گیا تھا، کوئی بند یک بیک ٹوٹ گیا تھا، اور یک دم سے دیکھتے دیکھتے سیلاب کا پانی سارے شہر میں بھر گیا، ہوسپٹل کا اندر اور باہر پانی سے جل تھل ہو رہا تھا، سڑکوں پر کشتیاں چلنے لگی تھیں ہوسپٹل کی نچلی منزل میں پانی بھر رہا تھا، بجلی اور پینے کے پانی کا لائن کٹ چکا تھا۔ لمبی لمبی سفید پوشاکیں پہنے ہوئے راہبہ اسٹافیں ہوسپٹل کے مریضوں کو ان کے گھر بھجوانے پر تُلی ہوئی تھیں، ان کو ریلیف کے لیے کھانا اور بچایا ہوا پانی لے کر، بہت سی دواؤں کے ساتھ ریلیف کیمپوں میں جانا تھا۔

ہوسپٹل کے احاطے میں چھوٹی بڑی کئی کشتیاں پانی کی لہروں پر ڈول رہی تھیں۔ تمہارے پاپا نے بھی کہیں سے ایک کشتی لائی تھی، جس گھڑی تم اسٹریچر پر لٹائی گئی تھیں اس وقت بھی تمہاری آنکھیں بند تھیں۔ تمہارے ڈاکٹر نے بھی تمہارا اسٹریچر پکڑا تھا اور زینوں سے اُترتے ہوئے ننگے پاؤں پانی کی لہروں میں ڈگمگاتی ہوئی کشتی پر تمہارے اسٹریچر کو رکھ دیا تھا۔ تمہاری اُس کشتی پر ہم سبھی لوگ تھے صرف تمہارا ڈاکٹر سفید ایپرن پہنے باہر کی طرف ڈوبی ہوئی سیڑھیوں کے پاس، پانی میں کھڑا بڑی حسرتوں سے تمہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کشتی ذرا زور سے ڈگمگائی اور ہچکولے کھاتی ہوئی جب وہ ہوسپٹل کی سیڑھیوں سے ہٹنے لگی تو تمہارے ڈاکٹر نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر بڑے احترام کے ساتھ درد میں ڈوبا ہوا تمہیں آخری سلام کیا تھا۔ مگر تم تو رادھارانی! ساری باتوں سے بےخبر سوتی رہی تھیں۔ لیکن میری آنکھوں سے اس وقت بے اختیار آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے تھے۔

کشتی چلتی رہی، گنگا کا پانی اپنے کناروں سے چھلک رہا تھا اور سُون کا بپھرا ہوا سیلاب سارے شہر کو ڈبوتے چلا جا رہا تھا۔

اور رادھا رانی ——— ! جب پانی سے بھرے ہوئے گھر میں تمہیں اسٹریچر سے اتارا جانے لگا تو وہاں صرف تمہارا ٹھنڈا جسم پڑا تھا ——— اور تمہاری آتما، بادلوں کے سنگ اڑتی ہوئی آکاش پر جا چکی تھی یا پھر ہوسپٹل کے گرد منڈلاتی رہ گئی تھی ——— کون جانے؟

لہو کے مول

شکیلہ اختر

منافؔ میاں نے اپنی چار خانے کی لنگی کے اُوپر اوڑھی ہوئی ملی دلی سی چادر کو اپنے کندھے پر ٹھیک سے جماتے ہوئے لال رنگ کی اینٹوں سے بنی اور شیشے کے اونچے اونچے دریچوں سے سجی ہوئی کوٹھی کو نظر بھر کر جب دیکھا تو ان کا دل کمشنر صاحب کی اس کوٹھی اور ان کے ان دیکھے رُعب سے تھوڑی دیر کے لیے کانپ گیا۔ بڑے بڑے محرابوں والے پورٹیکو کو دیکھتے ہی مناف میاں پہلے ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے لانے والے ساتھی سے بولے ؛

"نہ میاں نہ! اِتے بڑے گھر میں اَم راتے نوکری چرلیے نا۔" مگر جب سمجھانے بجھانے پر وہ راضی ہو کر اندر پہنچے تو بیگم صاحبہ کو دیکھتے ہی ان کی طبیعت خوش ہو گئی۔ دُبلی پتلی خوب صورت نرم و نازک سی لڑکی بیگم صاحبہ نے سب سے پہلے انھیں باورچی خانہ دکھلایا۔ پریشر ککر، رائیس ککر اور گیس کا چولھا دیکھتے ہی مناف میاں گڑگڑا کر بولے ؛

"ہجور بہادر! اپنی کے ای رُکم کچھو آتا جاتا نوئیں۔ بس سادھارن ماس مچھی بنانے سکتا ہوں۔"

بیگم صاحبہ ہنس پڑیں: "گھبراؤ نہیں۔ دھیرے دھیرے سب سیکھ جاؤ گے۔ سرکٹ ہاؤس کا خانساماں تمہیں سب کچھ سکھا دے گا۔ بس ذرا سیکھنے کی کوشش کرتے رہنا۔"

بیگم صاحبہ کو یہی سُوکھا مارا سا باورچی اُس وقت بڑا غنیمت لگ رہا تھا۔ پھر کمال مہربانی کے ساتھ بیگم صاحبہ نے اردلی سے کہا کہ "ملازموں کا کوارٹر باورچی کو دکھا دو۔"

مناف میاں باورچی خانہ اور اُس کے سامان کو دیکھ کر ایسے ماند پڑ گئے تھے کہ اُن سے قدم اٹھا کر چلنا بھی دُوبھر ہو رہا تھا۔ مگر جب وہ ٹائل بچھے کوری ڈور سے ہو کر ایک چھوٹے سے آنگن میں پہنچے تو سامنے وسیع محراب والے برآمدے میں شیشے لگے دروازے کے اندر سے جھلکتا ہوا، صاف ستھرا خوب صورت سا کمرہ باتھ روم سے لگا ہوا ان کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ مناف میاں کا جی کھِل اٹھا یہ ان کا کمرہ ہے! محل ایسے کمرے کا وُہ کبھی خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، ان کی سات پشتوں نے کھولا باڑی میں زندگی گزاری تھی، بانس کی بنی سوئی جھونپڑیوں سے آگے وہ کبھی کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، کمرے کے پیچھے ایک خوبصورت برآمدے کے ساتھ ایک اور دوسرا آنگن تھا۔ مناف میاں اس گھر کو دیکھتے ہی للچا گئے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں بڑے آرام سے رہ سکتے تھے۔ بیوی کے طعنوں سے چھلنی ہوئے کلیجے میں اب کہیں جا کے ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی، کمرہ، برآمدے اور دونوں آنگنوں میں ان کو اپنے بچے کھیلتے کُودتے دکھائی دینے لگے تھے، جب وہ نوکروں کے کوارٹر سے واپس آئے تب بیگم صاحبہ کے سامنے ذرا ہکلاتے ہوئے کہا: "سو تو ٹھیک ہے بیگم صاحب۔ مگر ایک ٹا بات ہے ہجور بہادر! سُن لیا جائے کہ ہم اپنا چھیملی ٹھو بھی اسی جگہ رکھے گا۔ گریب

آدمی روز روز کہاں سے آنے جانے سکے گا؟"

بیگم صاحبہ پہلے باورچی کے اچانک بھاگ جانے سے اتنی پریشان تھیں کہ مناف میاں کی یہ بات ماننے کو تیار ہوگئیں۔ پھر
ب سے غنیمت یہی بات تھی کہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو سمجھ اور بول بھی لیتے تھے۔

دوسرے دن مناف میاں کئی چھوٹی بڑی گٹھڑیوں، المونیم کی دو چار اُجلی کالی دیگچیوں، ایک بہت ہی لمبی تڑنگی بیوی اور
چھوٹے بڑے سات عدد بچوں کے ساتھ پچھلے دروازے سے اپنے کمرے میں آبراجے، دوسرے کمرے میں پہلے سے ایک اردلی
رسا بسا ہوا تھا اور اس کی نئی نویلی بیوی امیبہ بڑی خوش ہوکر باورچی کے رونق بھرے خاندان کو دیکھ رہی تھی۔ آج اس سُونے
ہنگن میں جیسے بہار آگئی تھی۔

بیگم صاحبہ نے جب یہ سُنا کہ باورچی اپنے لاؤ لشکر سمیت آگیا ہے تو اتنے بکھیڑوں کو خیال کرکے وہ ذرا افسردہ سی
ہوگئیں اور اگر جو کبھی ان سات بچوں کا ریلا ان کی طرف آگیا تو پھر کیسی آفت مچے گی! بیگم صاحبہ تو اپنے چھوٹے چھوٹے تین ہی بچوں سے
اب تک پریشان ہوتی آرہی تھیں۔ مگر مناف میاں بچارے بھی کیا کرتے؛ یہ تو ندیوں، دریاؤں، مچھلیوں اور اُپتلے ان گنت بچوں کی پیدائش
کا دیس ہی تھا۔ بھات، بھونی ہوئی کچی پکی مچھلیاں اور روتے بھٹکتے بچوں کی قطاریں بس یہی تو یہاں کی زندگی تھی اور یہ تو داتا کی دین تھی کہ
جھولیاں پھیلانے بنا، چھپّر پھاڑ کر گودیاں بھرتی چلی جاتی تھیں۔

مناف میاں اپنے کوارٹر میں ایسے مزے سے رس بس گئے، جیسے برسوں سے وہ یہیں رہ رہے ہوں۔ بیگم صاحبہ نے ان کی
لمبی تڑنگی بے ڈول سی بیوی کو گھر کی صفائی اور کپڑے دھونے پر ملازم رکھ لیا تھا اور ان کی سب سے بڑی دس برس کی لڑکی انورہ کمشنر صاحب
کی اکلوتی بیٹی بے بی کے ساتھ کھیلنے اور ساتھ ہی دیکھ ریکھ کے لیے لگا دی گئی تھی۔ مناف میاں بہت خوش تھے بیگم صاحبہ بڑی نرم مزاج
اور کم عمری کی وجہ سے بہت ناتجربہ کار تھیں مناف میاں کے چولھے پر پکنے والے گوشت مچھلی کا تیل مصالحہ بھی بیگم صاحبہ ہی کا رہتا تھا
اور تھوڑی بہت سبزی بھی وہ بہت اطمینان سے اپنے خاندان کی کفالت کے لیے لے لیتے تھے۔ سارے کاموں سے نبٹ کر جب
دو گھڑی کو وہ آرام کرنے لگتے تو زندگی بھر کے خواب ان کی آنکھوں میں جھلک اُٹھتے تھے۔ ندی کنارے ایک چھوٹا سا چمکیلے بانسوں کا
گھر، جو سندربن کے مضبوط، گول پتہ سے چھایا ہوا ہو، جس کے آگے کپڑا سُوکھنے کے لیے بانس کی الگنی ہو اور چھپر پر پھیلی ہوئی
سبزیوں کی لتیں لوٹ پوٹ کر رہی ہوں اور سامنے کا صحن ناریل کے درختوں سے بھرا ہوا ہو۔ دو بیگھہ دھان کے کھیت، ایک اچھا سا تیز
چلنے والا نوکا، دو پتوار اور مچھلیاں پکڑنے کا ایک جال —— بس یہی ان کی تمنائیں تھیں، ان چیزوں کے سوا انہوں نے کبھی کچھ نہیں
چاہا تھا —— مگر جب ان کی آنکھیں کھلتیں تو وہ اپنے سات روتے بسورتے بچوں اور لڑتی جھگڑتی بیوی کو دیکھ کر بجھ سے جاتے۔ انورہ
کے لیے بھی اب ساڑھی لانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ گلی ڈنڈا کھیلنے والے بیٹے بھی ہر گھڑی جال مُرغی خریدنے کو ٹھنکتے رہتے تھے، اور
چھوٹی چھوٹی چار بیٹیاں بھی جب دیکھو المونیم کا پیالہ تھامے کچھ نہ کچھ یا تو کھاتی رہتیں یا کھانے کو مانگتی رہتیں، کبھی کبھی مناف میاں کا جی
بہت جھنجھنا جاتا تھا کہ یہ اتنے سارے بچے اسی کے پاس مرنے کو کیوں آگئے تھے؟ کبھی سانس بھی تو چین سے لینے نہیں دیتے۔ برسوں
سے جسم پر گنجی لنگی کے سوا اُنھیں کُرتا تک نصیب نہیں ہوا تھا؛ اس پر سے بیوی کی مزاج داری یہ تھی کہ بیگم صاحبہ کا کام نہ تو خود کرے گی

اور نہ انورہ سے کرنے دے گی۔ دُبلے پتلے سے مناف میاں شاید بیوی کی مضبوطی سے خوف زدہ رہتے تھے، گھنٹوں بیوی کو مناتے، خوشامدیں کرتے، تب اگلے روز وہ کام کرنے پر تیار ہوتی تھی۔ بچے ماں کی نزاکت، آرام طلبی اور کام کی مشقتوں سے بے فکر اس نئے اور خوبصورت گھر میں بڑے خوش تھے۔ دو چھوٹی بچیوں سے بڑی بچی نجمہ کو سب سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ بیگم صاحبہ نے اپنی بے بی کے ساتھ کھیلنے کی اسے اجازت دے دی تھی۔

نجمہ نے ایسے پیارے پیارے کھلونے کبھی نہیں دیکھے تھے وہ گھنٹوں ان خوب صورت کھلونوں اور بے بی کے ساتھ بڑی خموشی سے کھیلتی رہتی تھی۔ نجمہ بڑی بڑی آنکھوں والی بہت پیاری بچی تھی۔ اس کی اچھی صورت دیکھ کر ہی بیگم صاحبہ نے اپنی بچی کے کئی فراک اسے دے دیے تھے۔ انورہ بے بی کی چھوٹی سی آیا تھی بے بی کو ٹھیک ٹھاک کرکے اپنی بہن کو بھی صاف ستھرا رکھا کرتی تھی، اس طرح بے بی کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے نجمہ بڑے آب و تاب سے رہنے لگی تھی۔ بے بی بڑی پیاری اور ذہین بچی تھی وہ نجمہ کے ساتھ رہ کر بڑی تیزی سے بنگلہ زبان بولنے لگی تھی۔ چار سال کی عمر میں اس کو یہ باتیں اچھی طرح سے معلوم ہوگئی تھیں کہ اس کے ساتھ کھیلنے والی نجمہ ذرا بھی گندی رہی تو پاپا نجمہ کے ساتھ کھیلنے سے روک دیں گے۔ اس کے دونوں بھائی منور اور محمود صبح سویرے ہی اپنے پاپا کی گاڑی پر اسکول چلے جاتے تھے، پھر اسکول سے آتے ہی ان کے دوست آجاتے، بخومو، موشو، رومی اور پتا نہیں ان کے اور سارے کتنے دوست گیند اور بلا ہاتھ میں لے لیتے۔ اور ایک وہ بچاری اکیلی ممی کے ساتھ رہ جاتی تھی۔ جب کبھی اس کی چھوٹی خالہ بی بنانی سے ملنے کو آجاتیں تب وہ دن اس کے لیے عید کا دن بن جاتا تھا۔ ننھی ننھی بہنیں ناہید اور فوزی کے ساتھ جی بھر کے کھیلتی۔

اور اب نجمہ ہر گھڑی اس کے ساتھ کھیلنے کو آگئی تھی، صبح سویرے ہی نیچے بڑے آنگن سے نجمہ کی باریک آواز آتی: "بے بی، آشو!" اور بے بی جلدی جلدی نائٹ گون اتار کر پھولا پھولا پریوں جیسا فراک پہنے اچھلتی کودتی اُوپر کی منزل سے نیچے اُتر آتی۔ نجمہ صاف ستھرے کپڑے میں بنی سنوری اس کے انتظار میں سب سے آخری زینے کے پاس کھڑی رہتی، دونوں ایک دوسری کو دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑتیں مسکراتے ہوئے نجمہ کے صندلی گال پر اک ہلکا سا گڑھا پڑ جاتا تھا۔ بے بی اس کی انگلیوں کو تھامے زینے کے نیچے کی گڑیوں والی کوٹھڑی میں گھس جاتی۔ دونوں بچیوں کی ایک ہی سی عمریں تھیں، ایک ہی جیسے قد و قامت تھے، ایک ہی سی معصوم ہنسی بھی تھی اور ایک ہی سے کھیلنے کے انداز بھی تھے، مزیک بچھے فرش کی اس چھوٹی سی کوٹھی میں نجمہ کو گڑیا کھیلتے، موٹر اور ریل چلاتے ہوئے کبھی اچھا نہ لگتا تھا، وہ کھلے کھیتوں میں دوڑ لگانے اور ندی نالوں میں آزادی سے نہانے والی بچی تھی، اب تک وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا اور کھلکھلا کر ہنسنا بھی جانتی تھی۔ مگر انورہ نے ایک محدود دائرے میں نجمہ کے بھولے پن پر پہرہ بٹھا دیا تھا، تہذیبی قدروں کی کوئی بندھن اس کی غربت اور فاقہ بھری زندگی میں نہ آئی تھی۔ اس گھر میں آکر کبھی کبھی بے بی کے پرانے کپڑوں میں اس کا جی اُلجھا اُلجھا سا لگتا تھا۔ جب بھی بے بی کے ساتھ مل کر وہ زور سے ہنسنا چاہتی تو انورہ اسے گھور کر دیکھتی اور وہ صاحب کے ڈر سے فوراً ہی اپنی ننھی ننھی انگلیوں کو منہ پر رکھ لیتی لیکن ہنسی کے فوارے اس کی چمکیلی آنکھوں سے، ڈھکے ہوئے لبوں سے اور گال کی ڈوبتی اُبھرتی ہوئی موہنی کے گڑھے سے اُبلے پڑتے تھے۔

کھیلنے میں نجمہ ہمیشہ یا تو رانی بننا چاہتی تھی یا پھر بیگم صاحبہ۔ ایسے وقت میں بے بی بچاری کے لیے بڑا مشکل ہو جاتا تھا

کیونکہ وہ آیا بن ہی نہیں سکتی تھی، انورہ جب بھی نجمہ کو آیا یا نوکرانی بنانے لگتی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ بلک بلک کر کہتی "ہونہہ! اتنا اچھا کپڑا پہن کے بھی آیا بنے گی؟" آخر ہار مان کر دو رانیاں بنتیں اور جب نہ تب انورہ ہی کو آیا یا سپاہی بننا پڑتا تھا۔ بنگلہ دیش کے دیہاتوں کی رہنے والی اتنی چھوٹی چھوٹی سی بچیاں بھی اپنے ننھے ننھے پیروں سے تھاپ دے کر اور اپنی ننھی منی انگلیوں، آنکھوں اور سر کے اشاروں اور کمر کی لچک کے ساتھ مست ہو ہو کر ناچنا جانتی تھیں اور شاید بے بی پر نجمہ کے اسی نرت کلا کا رعب پڑ گیا۔

ایک روز انورہ نے نجمہ کے ساتھ مل کر آنگن میں اینٹ اور مٹی کا ایک بڑا سا گھروندا بنایا، مٹی اور پانی میں لت پت ہو کر نجمہ نے بہت دنوں کے بعد خوشی کی ایک لمبی، گہری سانس کھینچی، اور جب بے بی پر اس کی نظر گئی تو بے اختیار ہنس پڑی۔ بے بی کیچڑ، مٹی اور پانی سے بچ کر ایک طرف کنارے کمر پر ہاتھ دھرے دور کھڑی بڑی حسرت سے نجمہ کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو مٹی میں لت پت دیکھ رہی تھی۔ گھروندا بن کر تیار ہو گیا، صرف اس کو لال رنگ کے گیرو سے رنگنا باقی رہ گیا تھا، بے بی کو بڑی جلدی تھی کہ گھروندا رنگا کر سجائے اور چھوٹی چھوٹی موم بتیوں کا اس میں چراغاں ہو ——— اور ساری گڑیوں اور سارے کھلونوں کی سجاوٹ سے اس کا یہ چھوٹا سا گھر جگمگا اٹھے ——— بے بی نے اپنی گاڑی کا ہارن سنا اور دروازے کی گھنٹی بجی ——— اور پھر اس نے زینے پر چڑھتے ہوئے اپنے پاپا کے قدموں کی آہٹ پہچان لی اور روز کی طرح اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر اپنے پاپا سے لپٹ جائے مگر اتنا اچھا گھروندا چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"بے بی بیٹا! آجاؤ۔" پاپا نے بے بی کا دم بھر انتظار کر کے آخر پکار ہی لیا۔

بے بی نے اوپر کی ریلنگ سے جھانک دیکھا۔ انورہ آنگن کے نل پر نجمہ کے مٹی میں لت پت ہاتھ دھلا رہی تھی۔ نجمہ اپنے بھیگے ہوئے ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال ٹھیک کرتی ہوئی بے بی کو دیکھ کر مسکرا کے بولی؛

"بے بی، امی جاچی" ——— اور وہ یہ کہتی ہوئی سرونٹ کوارٹر کی طرف مڑ گئی ——— بے بی کا جی اداس ہو گیا ——— بچارا گھروندا یکدم اکیلا رہ گیا تھا ——— !

دوپہر بیت چکی تھی۔ بے بی پاپا کے ساتھ گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک سرونٹ کوارٹر کی طرف سے روتی پیٹتی چیخیں آنے لگیں ——— آوازیں بڑی تیز اور بڑی لرزہ خیز ہوتی جا رہی تھیں، کمشنر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ گھبرا کر ریلنگ پر جھک کے پوچھنے لگے، "ارے بھائی! کیا ہوا ——— کیا ہوا؟"

بیگم صاحبہ سارے جسم سے کانپنے لگی تھیں، شور کی آواز سے بے بی چیختی ہوئی آکر ممی سے لپٹ گئی ——— "ممی جی ——— ممی!" سرونٹ کوارٹر کی طرف سے چیخیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ آخر ریلنگ سے ہٹ کر وہ لوگ تیزی سے سرونٹ کوارٹر کی طرف لپکے۔ مناف میاں کا خاندان آنگن میں کھڑا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا ——— آمینہ نے صاحب اور بیگم صاحبہ کو دیکھتے ہی رو کر کہا، "ہجور! اپنے گیٹ کے سامنے سڑک پر نجمہ بس سے کچل گئی" ——— !

بیگم صاحبہ نے تھرتھرا کر بے بی کو اپنے سینے سے اور بھی چمٹا لیا ——— "بس سے کچل گئی؟ ——— ہائے میرے اللہ نجمہ ——— !" ——— بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے دھاروں دھار آنسو بہنے لگے تھے۔ صاحب بڑے غمزدہ سے ہو کر ٹہلنے لگے تھے ———

مناف میاں، اسلم اردلی کے ساتھ بچی کی کچلی ہوئی لاش سڑک پر سے لانے کو چلے گئے —— مگر نجمہ گھر لائی نہ جا سکی، پولیس اسے پوسٹ مارٹم کے لیے ہوسپٹل لے گئی تھی۔

اسلم اردلی نے قریب ہی کی ایک دکان سے نجمہ کو سگریٹ لانے کو بھیجا تھا۔ نجمہ سگریٹ لے کر اپنے گھر کے سامنے سڑک پار کر رہی تھی کہ بھری ہوئی بس کے نیچے آ گئی، بس کا پہیہ اس کے جسم پر سے ہوتا ہوا گزر گیا تھا۔ نجمہ کے پھیلے ہوئے بے جان ہاتھ کی مٹھی میں دبے ہوئے اجلے اجلے دو سگریٹ دمک رہے تھے۔

نجمہ نے آخری بار بے بی سے کہا تھا: "بے بی! آمی جاچی۔"

اور وہ سچ مچ ہمیشہ کے لیے چلی گئی —— نجمہ کے اس حادثے پر بے بی مارے دہشت کے بیمار پڑ گئی، سارے گھر پر وحشت، زندگی سے بے اعتباری اور غمگینی چھا کر رہ گئی تھی، صاحب، بیگم صاحبہ اور تینوں بچے بڑے اداسی ہو گئے تھے —— گھروندا ویران پڑا تھا، ننھی ننھی رنگین موم بتیاں ڈبے کے تابوت میں بند پڑی تھیں —— نجمہ چلی گئی تھی! —— بے بی اور دونوں بچوں نے پہلی بار ایک ہنستی کھیلتی معصوم بچی کو مٹھی میں سگریٹ لیے اچانک موت کی نیند سو جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ حیران حیران نگاہوں سے افسردہ فضاؤں کو تکتے رہ جاتے، حیات و موت کا فلسفہ ان کی سمجھ سے باہر تھا —— بے بی کی طبیعت جب ذرا سنبھلی، تو اس نے بڑی کمزور آواز میں اپنے بھائیوں سے پوچھا:

"بھیا! نجمہ اب آسمان پر سے کب آئے گی؟"

محمود نے منور کو دیکھا اور منور نے بڑے دکھی لہجے میں کہا: "بے بی! ممی کہتی ہیں کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔"

"تو پھر گھروندا میں موم بتی کون جلائے گا؟ اور ... اور وہاں اب کون کھیلے گا؟"

"اب موم بتیاں کبھی نہیں جلیں گی بے بی! گھروندا میں نجمہ کبھی نہیں کھیلے گی۔ ممی کہتی ہیں آسمان بہت دور ہے وہاں جا کر پھر کوئی نہیں آتا ہے۔"

مناف میاں کا صبر اور چھ روتے بھنکتے بچوں سے گھری ان کی بین کر کر کے روتی ہوئی بیوی کو دیکھتے ہوئے کمشنر صاحب نے ٹرانسپورٹ کے ڈی۔ ایس۔ پی کو فون کر کے اس بات پر زور دیا کہ "بس والوں کو پانچ ہزار روپے بچی کے باپ کو ہرجانہ کے طور پر دینے پڑیں گے۔" قریب بیٹھی ہوئی بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں پھوٹ بہیں۔ "اتنی پیاری بچی کی ساری زندگی کی قیمت بس اتنی ہی تھی ——!"

اور مناف میاں کو کمشنر صاحب نے جب اپنے پاس بلا کر انہیں تسکین دیتے ہوئے کہا کہ "میں تم کو بس والوں سے پانچ ہزار روپے ہرجانہ دلوا دوں گا" —— تو اپنی لپٹی ہوئی چادر سے آنکھوں کا کونہ پونچھتے ہوئے مناف میاں گھبرا اٹھے

"پانچ ہزار روپے ——!"

مناف میاں کا جی بے چین بے چین سا رہا۔ کئی رات ان کو نیند نہیں آئی —— بیوی نیند میں بھی سسکیاں بھر رہی تھی، چھ بچے اوپر تلے بے ہنگم پڑے سو رہے تھے۔ مناف میاں نے نجمہ کی جگہ کو غور سے دیکھا، ایک بڑی ٹھنڈی سانس کھینچی ——

بیچاری بچی کو وہ گھر سے رخصت بھی نہ کر سکے تھے، ایسی کچلی ہوئی لاش کیسے گھر لائی جا سکتی تھی۔ ہوسپٹل سے پوسٹ مارٹم کے بعد اسی طرف کی مسجد میں سب کچھ کر کرا کے گھر لوٹ آئے تھے۔

اسی رات مناف میاں نے ایک جھپکی سی لی۔ خواب میں دیکھا کہ نجمہ اڑتی چلی جا رہی ہے اور اس کے سارے جسم سے نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی —— اتنے سارے نوٹ جو ان کے ہاتھوں میں آ آ کر بھی نکلے چلے جا رہے تھے۔ چکنے چکنے چمکتے ہوئے نوٹوں کو ان کے سارے بچے دوڑ دوڑ کر لوٹ رہے تھے اور اپنے اپنے کرتے کی گودیں بھرتے چلے جاتے تھے —— مناف میاں نے روپیہ [illegible]تے ہوئے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، نجمہ خون میں لتھڑی ہوئی روپے برساتی فضا میں تیرتی چلی جا رہی تھی۔ ——!

دوسرے دن مناف میاں بڑے سست اور کھوئے کھوئے سے رہے، اتنے دنوں کے بعد ہنستی مسکراتی ہوئی نجمہ کی پیاری صورت خواب میں دیکھی تھی، آخر انھوں نے اپنے سارے دکھوں کو اپنے ذہن سے جھٹکتے ہوئے سوچا —— "میری بچی جنت میں حور بن گئی ہے، اپنے مولا کے پاس بڑے آرام سے ہے، اور یہ روتے بلکتے چھ چھ بچے، میں انھیں کون سا سکھ چین دے رہا ہوں" —— یہ سوچتے ہوئے مناف میاں کا جی بڑا ہلکا سا لگا۔ سب سے چھوٹی بچی ان کی گود میں اونگھ رہی تھی اور دو چھوٹی بچیاں ان کی پیٹھ پر لدی ان سے پیسے مانگ رہی تھیں۔

دھیرے دھیرے نجمہ کا غم ہلکا پڑتا جا رہا تھا، بیگم صاحبہ کے دیے ہوئے نجمہ کے سارے کپڑے اب اس کی دوسری بہنیں پہنے پھرتی تھیں۔

نجمہ کے حادثے کے بعد بے بی نے ڈر کے مارے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا، مشکلوں سے اس کے پاپا اور ممی ساتھ لے جاتے تو سارا راستہ آنکھیں بند کیے پڑی رہتی تھی۔ بے بی کا ننھا سا دل نجمہ کے اس طرح اچانک بچھڑ جانے سے چور چور ہو گیا تھا، اس کے خوب صورت لبوں پر ہنسی تک نہ آتی تھی۔ جب کوئی نیا آدمی اس گھر میں آتا اُسے سب سے پہلے وہ اپنی نجمہ کی باتیں سناتی تھی۔

صاحب اور بیگم صاحبہ فون سے ڈی۔ ایس۔ پی کو جلد سے جلد روپے دلوانے کی تاکید کرتے جا رہے تھے۔ ایک دو بار ٹرانسپورٹ کے دفتر سے انسپکٹر بھی آتے رہے، جن سے مناف میاں اور اسلم کی تفصیلی باتیں بھی ہوتی رہیں، کمشنر صاحب نے کئی آفیسروں سے مل کر یہ بات طے کر دی تھی کہ اتنے بڑے حادثے پر مناف میاں کو پانچ ہزار روپے ضرور دیے جائیں۔

مناف میاں ایک عجیب الجھن میں مبتلا تھے ان کی آنکھوں میں چلتے چلتے آنسو تیر جاتے تھے۔ ایک آہ منہ سے نکل جاتی، پھر وہ جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیتے۔ یہ اللہ کی مرضی تھی۔ نجمہ اسی کی امانت تھی اسی نے لے لی۔ موت کا تو ایک دن مقرر ہے۔ یہ چھ چھ بچے ان کے لیے کچھ کم نہ تھے، ان کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہی ہے، اپنے خیالوں میں مناف میاں روپے کی تھیلی کو مضبوطی سے پکڑ لیتے۔ بچے تو پیدا ہوتے اور مرتے ہی رہتے ہیں، کسی کے مرنے کی قیمت کب ملی ہے۔ مناف میاں کا دل خدا کے شکر اور صاحب کے احسان سے بھر جاتا۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے بچھونے پر لیٹتے تو پانچ ہزار روپوں کی تھیلی ان کے دماغ میں جھنجھنا اُٹھتی۔ اتنے روپے کی جھنکار انہوں نے کبھی نہیں سُنی تھی —— سو سے زیادہ نوٹ یا روپے انہوں نے کبھی دیکھے بھی نہیں تھے ——

روپوں کے خوب صورت تصور سے اُن کا جی مہک اُٹھتا۔ ان کی آنکھیں چکا چوند ہونے لگتیں، ان کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ سچ مچ پانچ ہزار روپوں کے مالک بنا دیے جائیں گے۔ پھر ان کے تخیل میں دھان کے لہلہاتے ہُوئے کھیت جھلک پڑتے، ان کی نئی نوکا چاندی کی طرح چمکتی ہُوئی مچھلیوں سے بھری رہتی، پھر وہ اپنی نوکا کو پیارے پیارے چکنے پتواروں سے کھیتے ہوئے میگھنا کے اتھاہ سمندر جیسے پانی میں لے جاتے اور ان کی نوکا میگھنا کے مغرور اور چنچل سینے پر تیرتی رہتی، چڑیوں کی سریلی چپ چپ کی آواز انھیں لوری دینے لگتی تب مناف میاں میگھنا کے وشال پانی میں اس کی تیز روانی پر بہتے ہُوئے ڈر کر آنکھیں کھول دیتے ——— وہ اپنی کوٹھڑی میں پڑے ہوتے ——— اور بچے ہمیشہ کی طرح ان کے چاروں طرف بکھرے پڑے سوئے رہتے۔

اچانک کمشنر صاحب سرکاری کام سے چند مہینوں کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ مناف میاں نے بیگم صاحبہ سے کئی بار روپوں کے لیے فون کرایا۔ اسلم اردلی کے ساتھ دوڑ لگاتے رہے، اب روپے ملنے سے وہ کچھ کچھ مایوس ہوتے جا رہے تھے، اسی لیے مہینے بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد بیگم صاحبہ کے پاس آ کر بڑے دھیمے سُروں میں بولے:

"بیگم صاحب! ود پانی ٹھو بیشی روپے نہیں دینے مانگتی ——— بولنا کچھو کمتی کرو ——— تمہارا صاحب بڑا جاستی کر رہا ہے ——— تو بیگم صاحب! آمی، کچھو کمتی کرنا چاہتا ہے ——— جو بھی ملے، بال بچہ کھا کر لے لینے مانگتا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے بہت منع کیا مگر مناف میاں کی اپنی دوڑ نہ رُکی، ہفتے بھر بعد عید آنے والی تھی، بیگم صاحبہ نے مناف میاں کے غمزدہ خاندان سے چھپا کر اپنے تینوں بچوں کے لیے عید کے کپڑے بنائے ——— ایک دن بے بی نے اپنے کپڑوں کو دیکھتے ہُوئے پوچھا:

"ممی! اللہ میاں عید کے دن نجمہ کو کیسا کپڑا پہنائیں گے؟"

ممی نے جب الٹ کر بے بی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ کل عید آ رہی تھی۔ ان دکھیاروں پر کیا بیتے گی، بیگم صاحبہ نے گھر کی صفائی کراتے ہُوئے اپنا خیال بٹانا چاہا ——— مگر آج رہ رہ کر نجمہ کی بھولی بھالی معصوم صورت آنکھوں میں جھلکتی جا رہی تھی۔

بیگم صاحبہ نے ڈرائنگ روم کی صفائی، پردے کے پیچھے مناف میاں، ان کی بیوی اور انورہ کو کچھ سامان اٹھائے کھڑا دیکھا۔

بیگم صاحبہ نے بڑے پیار سے اس غمگین خاندان کو دیکھتے ہی پوچھا:

"کیا بات ہے بھئی، آ جاؤ!" بیگم صاحبہ کوچ پر بیٹھ گئیں۔ مناف میاں اپنی بیوی، بیٹی کے ساتھ گٹھری لیے قالین پر بیٹھ گئے۔

"بیگم صاحب! بس یہی کچھو سامان ٹھو لے آیا ہوں۔ ای ریشمی ساری انورہ ماں اپنا لیے لیا ہے، آؤ ——— ای تار والی انورہ لیا ہے، ای بلوچ ٹھو ہے، ای ٹُمل پینٹ، ای ٹُس سرٹ، یہ چپل، ای بچیا دونوں کا فراک ہے بیگم صاحب"، مناف میاں ہنس کر بولے: "او! ای لوگ کا سُوکھ بھی دیکھیں بیگم صاحب - ای ربن ہے۔ ای اُتنا، ای ناکھن پالس، ای تینوں لڑکا لوگ کا ربر کا جوتا ہے، ای میری کمیض ہے، ای لنگی ——— اور دیکھیے ہجور! اپنا کھُوب مجبوط کالا جُوتا جی لیا ہے" ——— مناف میاں ایک ہی سانس میں خوشی خوشی بولتے چلے گئے۔ انورہ کی ماں نے مسکراتے ہُوئے اپنے سارے بچوں کے کپڑے اور جُوتے رکھے۔ ان کی عید جیسے آج ہی آ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم سے باہر دروازے پر سارے بچے بڑی مسرتوں کے ساتھ اپنے اپنے کپڑوں کی جھلکیاں دیکھ

رہے تھے۔ بیگم صاحبہ پر جیسے سکتہ لگ گیا، اور ان کا دل ڈوبنے لگا تھا —— مناف میاں نے کمرے سے جاتے جاتے ذرا رُک کر کہا کیا کرتا بیگم صاحب! گریب آدمی ہوں —— عید کا ٹائم تھا، پھر بچہ لوگ کے لیے کیا کرنے سکتا تھا؟ یہ تو ہجور بہادر کی مہربانی تھی۔ پانی والا ایک ہمارے واستی نہیں دیا"

اکیلے کمرے میں بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے —— عید گزر گئی، مناف میاں کے خاندان نے زندگی میں پہلی بار ایسی رونق اور خوشیوں بھری عید منائی تھی —— مناف میاں کے چھوٹے بچے نئے جھلملاتے جوڑے اور جوتے پہنے اترائے اترائے پھر رہے تھے —— !

عید کے دُوسرے دن دوپہر کو مناف میاں اور ان کی بیوی اپنے سارے بچّوں کے ساتھ بیگم صاحبہ کو رخصتی سلام کرنے کو آگئے تھے۔ مناف میاں نے بڑے ادب سے گھر جانے کی اجازت مانگی، ابھی ان کے پاس ہزار روپے میں سے سات سو بچ رہے تھے اور وہ جلدی سے جلدی گھر جا کر اپنے رہن کھیت چھڑانا چاہ رہے تھے، مکان کا مرمّت کرانا تھا اور ایک نوکا کے ساتھ وہ مچھلیاں پکڑنے والا جال بھی خریدنا چاہتے تھے۔

بیگم صاحبہ نجمہ کے خون سے سینچی ہوئی، ان کی تمنّاؤں کے اظہار کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے جلدی سے مناف میاں کا حساب کرکے ان کو رخصت کر دیا۔ مناف میاں ہنسی خوشی اپنے خاندان کے ساتھ زینے سے اترتے چلے گئے۔ سیڑھیوں پر سے دھما دھم بچے کودتے پھاندتے ہوئے اتر رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کی کھوئی کھوئی نگاہیں دور خلا میں جیسے نجمہ کو تلاش کر رہی تھیں اور دور سے مناف میاں کے خاندان کی مسرّت بھری آوازیں آ رہی تھیں۔

—— اچانک بے بی مسرت بھری آواز میں بولی "ممی! ممی! کیا وہ لوگ اللہ میاں کے یہاں سے نجمہ کو لانے جا رہے ہیں؟"

سواریاں

جوگندر پال

دفتر لیٹ پہنچنے کے ڈر سے وُہ نہایت سرعت سے ناشتے کی میز سے اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا ہے۔

"ٹھہرو شیام، میں بھی آ رہی ہوں۔"

ہر صبح گھر سے نکل کر شوہر اور بیوی کو اپنے اپنے دفتر جانے کے لیے ایک ہی بس کو پکڑنا ہوتا ہے۔

"ذرا ٹھہر جاؤ پلیز!"

لیکن شیام باہر سڑک پر آ پہنچا ہے اور بس اسٹاپ کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھر رہا ہے کہ کیو کے اگلے حصے میں جگہ مل جائے —— "آئی ایم ساری!" وہ مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک جوان عورت سے ٹکرا گیا ہے اور ذرا آگے بڑھ کر اپنے چہرے سے ملائمت کو جھاڑ کر سر جھٹک دیا ہے —— خودکشی ہی کرنا ہے تو کسی موٹر کار سے ٹکراؤ —— اُس نے مڑ کر پیچھے دیکھا ہے۔ وہ لڑکی ابھی تک وہیں کھڑی ہے اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی ہے —— شیام نے اپنا سر کھجا کر سوچا ہے کہ دیکھی بھالی جان پڑتی ہے —— ارے ہاں! وہی تو ہے جو اُس دن بھی اسی طرح اچانک ٹکرا گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک بار میں شاید اسی سے ٹکرایا تھا —— نہیں! —— وہ مسکرانے لگا ہے —— یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وُہ لڑکی تو —— پر کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہو سکتا ہے یہ لڑکی میرے پیچھے لگ گئی ہو —— مسکراتے مسکراتے اُس کی رفتار اور تیز ہو گئی ہے —— پر مجھ سے اسے کیا ملے گا؟ میری بیوی کی اور میری کمائی سے مشکل سے اتنا بچتا ہے کہ مہینے میں صرف ایک سنڈے کو ہم کسی ریستوران میں کھانا کھا کے کہیں فلم دیکھنے چلے جاتے ہیں —— اُس نے پھر اپنا سر موڑ کر دیکھنا چاہا ہے کہ اس کی بیوی آ رہی ہے یا نہیں —— نہیں، اُس کی بیوی کے سوا سڑک پر ساری دنیا موجود ہے۔ وہ —— وہ لڑکی بھی جس سے وہ ابھی ابھی ٹکرایا ہے —— جاؤ بھئی، میرا پیچھا چھوڑو، کسی موٹر سے ٹکراؤ تاکہ تمہارا کچھ بگڑے تو کچھ فائدہ بھی ہو —— بھُوں! —— بھاؤں! —— اگر وہ جھٹ سے اُچھل کر پرے نہ ہو جاتا تو کُتّے کے دانت اُس کی دائیں ٹانگ میں گڑ جاتے۔ اُسے بازاری یا پالتو کتے سے کٹنے کا بڑا خوف لاحق ہے۔ پیٹ میں پورے چودہ انجکشن لگتے ہیں، یا شاید چودھویں انجکشن سے پہلے ہی آدمی درد کی شدت سے بھونک بھونک کر چلتا بنے —— کتا اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ہے اور گویا اس سے بچنے کے لیے وہ اور تیز گام ہو گیا ہے —— ہٹ! —— چل ہٹ! —— وہ سوچ رہا ہے کہ دفتر سے آج پھر لیٹ ہو گیا تو اِس مہینے کا چوتھا لیٹ مارک ہو جائے گا —— ہٹ! —— (اگر سر کا بھاری پن ختم نہ گیا تو آج پھر سارا دن غرق ہو جائے گا)

وہ بس اسٹاپ کے قریب آ گیا ہے۔ لمبا کیو ہے۔ وُہ اپنی بیوی کو کوسنے لگا ہے کہ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ دیر ہو جاتی ہے۔ میں اُس کی طرح کوئی عورت نہیں کہ افسر ہنس کر ٹال جائے —— اُسے تشویش کا احساس ہونے لگا ہے کہ بار بار لیٹ ہونے پر بھی

اس کا افسر کیونکر ٹال جاتا ہوگا —— ہاں، کیونکر؟ —— کیوں؟ ——

”کیو میں کھڑا ہونا ہے تو ذرا ٹھیک طرح سے ہو جئے۔“ پُشت سے کسی نے اس کے کندھے کو جھٹک کر کہا ہے۔

”آئی ایم ساری!“ اُس نے اپنی پوزیشن سنبھال کر اپنے گھر کے راستے کی طرف دیکھا ہے کہ شاید اس کی بیوی آ رہی ہے —— وہ —— وُہ تیز تیز چلی آ رہی ہے —— وہ —— جیسے وُہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ تیز رفتاری سے چل رہا ہو —— ”آہستہ چلو شوبھا“ اُس کی بیوی تیز چلنے کی عادی ہے۔ ”میری سانس پھولنے لگی ہے۔“

”تمہاری سانس پھولنے کا دیکھوں تو بیٹھ کر ہی رہ جاؤں۔“

اپنی بیوی کو اس قدر تیز چلتے ہُوئے دیکھ کر اُسے اُس پر ترس آنے لگا ہے۔ بیچاری کو اب آرام سے بیٹھ جانا چاہیے —— فلیٹ کا کرایہ، ڈھائی سو روپے، گروسر کا بِل، دو سو، دودھ والا، پچاس، میرے سگریٹ —— شیام، اگر تم سگریٹ چھوڑ دو تو ہم ہر سنڈے فلیٹیز میں کھانا کھا سکتے ہیں —— شیام نے کیو میں کھڑے کھڑے سگریٹ سُلگا لیا ہے اور بدستور اپنی بیوی پر نگاہ جمائے ہُوئے ہے اور اُس پر ترس کھا رہا ہے کہ اُسے اب آرام سے بیٹھ جانا چاہیے۔

(کیو میں میری جگہ محفوظ رہے تو یہیں کہیں سے سر کے درد کی گولی کھا لوں)

شیام کے پیچھے بھی کیو کافی لمبا ہو گیا ہے اور اُس نے چاہا ہے کہ اُس کی بیوی دوڑ کر اپنی جگہ سنبھال لے ورنہ اِس بس سے رہ جائے گی —— اور جب وہ کیو میں آ کھڑی ہوئی ہے تو اس نے اطمینان سے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا ہے اور کھانستی ہُوئی مسکراہٹ سے اُسے اشارہ کیا ہے کہ مَیں یہاں ہُوں اور اُس کے اشارے نے اِس بُوڑھے کی آنکھوں سے ٹکرا کر، اُس عورت کے کٹے ہوئے بالوں سے چُھوتے ہُوتے، اُس مَیلے سے خاموش آدمی کے کانوں میں شور مچا مچا کر —— وہاں اُس کی بیوی کو جا لیا ہے —— ہاں، بابا، دیکھ لیا ہے —— آرام سے اپنی جگہ پر کھڑے رہو!

بس آ گئی ہے!

شیام کو خیال آیا ہے کہ اپنی جگہ چھوڑ کر اپنی بیوی کے پاس چلا جائے تاکہ بس میں دونوں اکٹھا رہیں لیکن اُس کی بیوی کے پیچھے بھی کئی لوگ آ کھڑے ہُوئے ہیں اور وُہ کیو میں آگے بڑھ بڑھ کر پیچھے تک رہا ہے اور بس میں سوار ہو کر ایک درمیانی سیٹ پر آ بیٹھا ہے اور اُس کے ساتھ ایک اجنبی، جوان عورت بیٹھ گئی ہے اور کھڑکی کی طرف نظر اٹھائے باہر کیو میں شاید اپنے شوہر کو ڈھونڈ رہی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بس بھر گئی ہے، کھڑے رہنے کی بھی جگہ نہیں رہی اور شیام نے سواریوں کے سروں، چہروں، گردنوں، بازوؤں کے درمیان بنے ہُوئے سوراخوں میں سے جھانک جھانک کر بمشکل دیکھا ہے کہ اُس کی بیوی دروازے کے پاس اس طرح جُڑ کر کھڑی ہے جیسے کسی عجیب وضع کے وجود پر اتنے سر اُگے ہُوئے ہوں اور ہر سر میں یہ اندیشہ ہو کہ اپنا وجود اکھیڑ کر الگ کیا تو کوئی نہ کوئی ٹکڑا اِسی میں دھنسا رہ جائے گا۔

”کیوں بھائی، کیا چاہیے؟“

”بڑی مشکل سے آپ کا گھر ڈھونڈا ہے —— آپ کی بیوی اپنا بایاں بالائی بدن بس ہی میں دھنسا ہُوا چھوڑ آئیں ——

بیٹھیے! ——"

ہا ہا ہا ——— ہا ہا ——— ہا ——— !

(سر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے کوئی گولی کھا کر سوار ہونا چاہیے تھا)

"چلو ——— و !" کنڈکٹر کی آواز سن کر بیٹھے ہوئے مسافروں کے کان بھی خوشی سے کھڑے ہو گئے ہیں اور کھڑے ہو کر پھر بیٹھ گئے ہیں ——— ہاں، آرام سے بیٹھے رہو۔ پہنچ جاؤ گے۔

کہاں؛

ہر جگہ! ——— کان جہاں بھی ہوں، ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ اِسی لیے دانشوروں کا کہنا ہے کہ کچھ بھی ہو، ایک چُپ سادھے رکھو۔ کان ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں ——— یا ——— یا کچھ کہنا ہو تو شور مچاؤ تاکہ کسی کو کچھ سُنائی نہ دے۔ شور اور خاموشی اِس اعتبار سے ہم معنی ہیں کہ دونوں ہمیں کسی بھی کومٹ مَینٹ کا اسیر ہونے سے بچا لیتی ہیں۔ شور مچاؤ یا خاموش رہو! ——— بس میں کالج کے چند چھوکرے شور مچا رہے ہیں ——— جنریشن گیپ ——— لبریشن ——— اَینگر! ——— اور بوڑھے اور ادھیڑ بیٹھے چُپ بیٹھے ہیں، کسی کی کوئی کومٹ مَینٹ نہیں، سب سُکھی ہیں۔ سب دُکھی ہیں ——— نہیں، بس میں اتنی بھیڑ ہے کہ دُکھ سُکھ کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں، بس جہاں سے چڑھنا ہے، چڑھ جاؤ، جہاں اُترنا ہے، اُتر جاؤ!

شیام نے پہلے اسٹاپ پر پھر مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا ہے اور اُس کی بیوی نے مسکرا کر اُسے یقین دلانا چاہا ہے کہ مَیں جیسے بھی ہُوں، ٹھیک ہُوں، فکر مت کرو، حالانکہ چند اور سواریوں کے گھُس آنے کے بعد اُسے اب معلوم ہی نہیں کہ وہ اپنی جگہ پر جُوں کی تُوں کھڑی ہے، یا کوئی اور ہے جو اُس کی جگہ پر آ کھڑا ہوا ہے ——— وُہ آپ نہ جانے کہاں ہے ———

"ٹکٹ، پلیز!"

اُس نے اپنی بیوی کا ٹکٹ بھی کنڈکٹر سے لینا چاہا ہے لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کنڈکٹر کو کیونکر سمجھائے کہ دوسرا ٹکٹ وہ کس عورت کا کٹوا رہا ہے ——— اُس کا، جو اُن ڈھیر سارے مردوں کے بیچ ——— نہیں۔ بھائی، وہ ——— دو ——— ! ——— چھوڑو، ایک ہی دے دو! ——— اُسے اِس خیال سے کوفت ہونے لگی ہے کہ وُہ اتنی بھیڑ میں پھنس کر کھڑی ہے۔ اپنا ٹکٹ کٹوانے کے لیے ہاتھ جیب تک کیونکر لے جائے گی ——— اور پھر اپنے ہی ایک اور خیال سے وُہ ڈِھیلا سا ہو کر مسکرانے لگا ہے کہ اِس قدر ہجوم میں گھِر جائیں تو بھری جیبیں بھی کام نہیں آتیں۔

(میرا سر! ———)

شیام کے ساتھ بیٹھی ہُوئی عورت بھی بڑی بے چینی سے بار بار پیچھے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ شاید وہ آدمی ——— نہیں، وُہ جو اُس کی بیوی کی پُشت سے جُڑا ہُوا ہے اُس کا شوہر ہے اور وہ دل ہی دل میں اُس کی بیوی کو بس سے نیچے دھکا دے کر خود آپ وہاں کھڑی ہو گئی ہے اور پھر فوراً ——— یہاں سے اُٹھنے سے پہلے ہی یہیں اِسی سیٹ پر آ بیٹھی ہے کہ اِسے خالی پا کر کوئی اور نہ آ بیٹھے، جہاں اِتنے لوگ سیٹ کے بغیر ہوں، وہاں ایک بار سیٹ چھن جانے پر سارے عمر کھڑے کھڑے ہی گزارنی پڑ جاتی ہے۔

دوسرا اسٹاپ بھی نکل گیا ہے۔ شیام کی بیوی کو تیسرے اسٹاپ پر اُترنا ہے اور شیام کو چھٹے اسٹاپ پر۔ شام کو دفتر سے لَوٹتے ہُوئے بھی عام طور پر وہ ایک ہی بس میں ہوتے ہیں، لیکن اُس وقت بھی رَش کے باعث اکثر اُنھیں الگ الگ ہی بیٹھنا یا کھڑا ہونا نصیب ہوتا ہے ——— ایک بار یُوں ہُوا کہ وُہ اپنے تصور میں مگن تھا کہ راستے میں ایک عورت اُس کے ساتھ کی سیٹ پر آ بیٹھی، وُہ سمٹ کر اپنی سوچ کے پیچھے پیچھے ذہن کے اَور اندر گُھس گیا اور وہ عورت اُس کے اور قریب سرک آئی۔ لاشعوری طور پر وہ اور اِدھر ہو گیا اور وُہ عورت اور اُس کی طرف ——— اور پھر وُہ سوچ اس کے ذہن کے اندر ہی اندر کہیں اوجھل ہو گئی تو شاید اس کے پہلو میں بیٹھی ہُوئی عورت نے اُس کی پیٹھ پر ہولے سے چُٹکی لی ——— یا شاید ——— اُس نے بدستور آنکھیں بند کیے سوچا ——— اُسے دھوکا ہوا ہو۔ بُری سے بُری عورت بھی راستے میں اِس طرح کسی انجانے، شریف مرد کو چھیڑنے کی جرأت کیونکر کرے گی؟ ——— ہاں، مجھے دھوکا ہی ہوا ہے! ——— لیکن اُسے پھر اپنی پیٹھ پر ایک اور ملائم سی چُٹکی کا احساس ہُوا ہے ——— نہیں، یہ عورت مجھے واقعی پھانسنا چاہ رہی ہے ——— بَس ——— نہیں ——— ایک اور ملائم چُٹکی، اتنی ملائم کہ اُسے بھلا معلوم ہوا اور وہ انجان سا بنے پڑا رہا ——— لیکن پھر اُس سے رہا نہ گیا تو چور آنکھوں سے پہلو میں اپنی بیوی کا شنداں چہرہ دیکھ کر گویا اندھا ہو جانے کی خواہش سے اُس نے اپنی آنکھیں پُوری کی پُوری کھول لیں! ———

تیسرا اسٹاپ نا معلوم کب گزر گیا۔ اُس کی بیوی نے اُترنے سے پہلے اپنے شوہر کی طرف نظر اٹھائی ہو گی ——— یا عین ممکن ہے کہ ہجوم سے باہر نکلنے کی عجلت میں وُہ اُس کے دھیان میں ہی نہ آیا ہو ——— اُس نے پہلی بار نظر بھر کر اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا ہے اور جی ہی جی میں اُس سے اِس طرح مخاطب ہوا ہے کہ اُسے خود آپ بھی معلوم نہیں اُس نے کیا کہا ہے۔

”کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟“ اُس عورت نے پُوچھا ہے، یا ——— یا شیام کو یونہی لگا ہے کہ اُس نے پُوچھا ہے۔

”آئی ایم ساری!“ شیام کے مُنہ سے نکل گیا ہے ——— اور اُس عورت کی آنکھیں کھلکھلا کر ہنستے ہُوئے گویا ہوئی ہیں۔ ”کس بات پر؟“ یا پھر ممکن ہے اُسے پتا چل گیا ہو کہ شیام نے اُس سے کیا کہنا چاہا ہوگا اور اُس نے معذرت کو قبول کرنے کیلئے جواب دیا ہے۔ ”نیور مائینڈ! ——— دیکھیے ——— “ ذرا رک کر اُس نے شیام سے کہا ”مولچند آئے تو مجھے بتا دیجئے گا۔“

”مولچند تو پچھلا اسٹاپ تھا،“ شیام نے اپنے آپ کو بتایا ہے کہ وہیں تو میری بیوی اُتری تھی۔

وہ کھڑی ہو گئی ہے۔

”آپ بیٹھ جائیے۔ اگلے اسٹاپ پر اُتر جائیے گا۔“

وہ بیٹھ گئی ہے۔

”نہیں،“ شیام نے پھر رائے دی ہے، ”آپ دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو جائیے گا، اُترنے میں سہولت رہے گی۔“

اُس عورت نے پیچھے مُڑ کر دیکھا ہے۔ ”یہی بات تو مجھے ستا رہی تھی کہ نیچے اُترنے کے لیے دروازے تک کیسے پہنچوں گی؟“

اِس ضمن میں شیام نے اُسے اپنی بیوی کا تجربہ بتانا چاہا ہے۔

"جب مجھے بس سے اترنا ہوتا ہے شیام، تو میں اپنی سیٹ سے بے دھڑک ہو لیتی ہوں اور ——— اور جانتے ہو، کیا؛ ——— مردوں کو جوان عورت سے چھونے کی اتنی چور خواہش ہوتی ہے کہ عین موقع پر وہ اُس سے چھو جانے سے بچنے کے لیے اپنے آپ راستے سے ہٹتے جاتے ہیں ———"

"اور کسی کو چور خواہش کی بجائے بڑی کھلی خواہش ہو تو ———"

"نہیں، کھلی خواہشیں کہیں کھلے میدان میں ممکن ہیں، بھری بھری بسوں میں صرف چور خواہشوں کی گنجائش ہوتی ہے۔"

وہ عورت اپنی جگہ خالی کر کے دروازے کی طرف جانے لگی ہے اور قریب ہی سے ایک بوڑھا گویا سپرنگ بورڈ سے اُچھل کر وہاں آ گرا ہے اور سیٹ مل جانے کی خواہش سے بے اختیار ہنس رہا ہے۔

(آج پھر یقیناً میرا بلڈ پریشر اَپ سیٹ ہے۔ اُس دن بھی صبح سے سر میں درد اُٹھنا شروع ہو گیا تھا ———)

بوڑھا بدستور ہنس رہا ہے اور شیام نے سوچا ہے کہ بوڑھا باؤلا ہے۔ اُسے اگلے سٹاپ پر ہی اترنا ہو گا پر اس طرح جم کر جگہ گھیر لی ہے جیسے قیامت تک نہیں اُٹھے گا۔

"میرے بھائی!" بوڑھے نے شیام کے ذہن کو پڑھ کر کہا ہے۔ "اس طرح اتھل پتھل ہو تو آدمی کے سارے ٹھکانے لمحاتی ہوتے ہیں ——— انھیں دیکھو نا ———" اُس نے کھڑے لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے "جہاں جہاں انھیں پہنچنا ہے اِسی طرح کھڑے کھڑے پہنچنا ہے"۔ اور پھر ذرا جھجک کر "تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

شیام نے ایک درد آمیز مسکراہٹ سے کھڑے لوگوں کی قطار پر نظر دوڑائی ہے اور اُسے معلوم ہوا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے ہی بیٹھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور ——— اور جب اُنھیں واقعی بیٹھنے کا موقع میسر آتا ہے تو بیچارے بیٹھے بیٹھے گویا کھڑے ہوتے ہیں۔

"آگے چلو! ——— آگے چلو!" کنڈکٹر نے کھڑی سواریوں سے کہا ہے۔

"آگے کہاں جائیں؟" ایک لڑکی کو غصہ آ گیا ہے "جگہ کہاں ہے؟"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، آگے چلو ——— آگے جاؤ گی تو جگہ بنے گی بابا!"

"میں بابا نہیں ہوں"۔ لڑکی کو اور غصہ آ گیا ہے۔

"تو ہو جاؤ گی بی بی۔"

شیام کے پہلو میں بیٹھا ہوا بوڑھا ہنسنے لگا ہے ——— ارے! بے تحاشہ ہنستے جا رہا ہے، اور شیام کو خوف محسوس ہونے لگا ہے کہ بے چارہ ہنستے ہنستے دم نہ توڑ دے۔

(دم ٹوٹ جائے تو سر کا درد اپنے آپ رفع ہو جاتا ہو گا ———)

پتا نہیں کہ گاڑی چل رہی ہے یا بوڑھا ہنس رہا ہے ——— ہہ ہا ہہ ہہ ——— نہیں، گاڑی چل رہی ہے ——— ہہ ہہ! ——— نہیں، بوڑھا ہنس رہا ہے ———

شیام نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وہ تھک گیا ہے۔ وہ اپنے دفتر جا رہا ہے ——— نہیں، تھک کر اپنے دفتر سے لوٹ رہا ہے ——— اور اپنی بند آنکھوں کے باوجود اُسے معلوم ہے کہ گاڑی اب گھاٹ سے گزری ہے، اس کے بعد گورنمنٹ کوارٹرز آئیں گے ——— نہیں، یہ تو مارکیٹ ہے۔ گھاٹ سے اُس کے دفتر کی جانب جائیں تو مارکیٹ ہی آتی ہے، گورنمنٹ کوارٹرز تو گھاٹ کے پیچھے ہیں ——— اُس کے گھر کی جانب ——— نہیں، گاڑی اُس کے گھر کی جانب ہی جا رہی ہے۔ سارے دن کی دفتر کی جھک جھک کے بعد وہ شل ہو گیا ہے ——— مولچند آ گیا ہے۔ بس ٹھہر گئی ہے۔ بوڑھا اُتر گیا ہے۔ اُس کی بیوی دفتر سے لوٹتی ہوئی یہیں سے اُس کے ساتھ ہو لیتی ہے ——— غیر متوقع طور پر بہت سی سواریاں یہاں اُتر گئی ہیں اور اُس کی بیوی ——— وہ ہے! وہ تھکن سے مسکراتی ہوئی اُس کی طرف آ رہی ہے۔ اُس کے ساتھ آ بیٹھی ہے ——— بس چل دی ہے ——— تیز ہو لی ہے۔ وہ دونوں گھر جا رہے ہیں ——— گھر پہنچ کر وہ دونوں سیدھے رسوئی میں جائیں گے۔ اُس کی بیوی گیس کا چولھا جلا کر اس پر صبح کی تیار کی ہوئی سبزی گرم کرنے کو رکھ دے گی اور آٹے کی طرف متوجہ ہو جائے گی ——— اور وہ کراکری کو میز پر سیٹ کرنے میں جُٹ جائے گا ——— لیڈی سری رام! ——— کنڈکٹر نے چلا کر سواریوں کو اسٹاپ کے نام سے مطلع کیا ہے ——— وہ دونوں تیز تیز یہاں اُتر گئے ہیں اور سامنے کی اسٹریٹ سے گزر کر اپنے گھر کے عین سامنے آ گئے ہیں۔

"آؤ، رُک کیوں گئیں؟" اُس نے اپنی بیوی سے کہا ہے۔

اور اُس کی بیوی نے بالکونی کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں اُس کی بیوی کھڑی تعجب سے اُن دونوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔

"میں تو یہاں ہوں ——— یہ کون لے آئے؟"

"اُفوہ ——— ہ!" نامعلوم شیام اپنے سر کے درد سے بلبلایا ہے یا متعجب ہو کر بوکھلا گیا ہے۔ اُس نے سارے راستے میں اِس اجنبی عورت کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا اور ——— اور اِس عورت کے بازاری پن کی بھی انتہا ہے کہ چُپکے سے اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی ہے ———

"میں کہتی ہوں، یہ کون ہے؟"

"تم! ——— تم!" وہ بلبلا بلبلا کر بول رہا ہے "تم! ——— اور کون؟ ——— کوئی بھی عورت ہو وہ تم ہی ہو ——— مجھے اِس سے کیا، تم آپ ہی ہو یا کوئی اور؟ ——— !"

بس اڑی جا رہی ہے اور شیام نے اچانک ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھولی ہیں اور ——— اور اُس کی نظر پھٹنے لگی ہے اور اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ اُس کا اسٹاپ (دفتر کا یا گھر کا) پیچھے رہ گیا ہے اور اُسے آگے ہی آگے کہیں نہیں جانا ہے ——— اور اُسے جہاں جانا ہے وہ وہاں پہنچ کر آگے آ گیا ہے ——— اور یہاں سے واپسی کی کوئی بس نہیں۔

"ارے! ——— ارے بھائی لوگو!" شیام کے پہلو میں بیٹھا ہوا بوڑھا ایکا ایکی چلاتے ہوئے اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا ہے۔ "ذرا دیکھو، یہ سواری بے ہوش ہو گئی ہے ——— یا ——— یا اپنے ٹھکانے پر جا پہنچی ہے؟ ——— !"

چیونٹی اور راج ہنس

اختر جمال

بہار آتے ہی ہر طرف ہریالی کی لہر دوڑ گئی مرجھائی ہوئی گھاس سوکھے ہوئے درخت جھلسی ہوئی زمین سب نے شکر گذار ہو کر آسمان کی طرف دیکھا چرند پرند سب مگن تھے چڑیاں، کوے، مینائیں، فاختائیں، طوطے، چیلیں اور بگلے سب خوش ہو کر رقص کر رہے تھے۔ فضا میں تا حد نظر رنگین نقطے نظر آ رہے تھے۔ راج ہنس اپنے خوب صورت پر پھیلائے تیر کی طرح یوں آسمان میں جا رہا تھا جیسے اس کا گھونسلا زمین میں نہیں آسمان میں ہے۔

چیونٹی اپنے ننھے سے سوراخ میں سے سب پرندوں کا کھیل دیکھ رہی تھی اس نے سب کو اونچی اڑانیں لیتے دیکھا لیکن سب پنچھی تھک تھک کر آشیانوں میں لوٹ آئے۔ مگر راج ہنس اڑتا رہا — اونچے آسمان پر اونچا — بہت اونچا۔ لگتا تھا سب تاروں کو چھو کر چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔

چیونٹی کو راج ہنس بہت اچھا لگا۔ اتنا پیارا کہ وہ اسے دیکھ کر خدا کی شان پاکی اور بڑائی دیکھنے لگی اور پھر خدا کی تعریف کرنے لگی جو سب موجودات کا خالق ہے اور جس نے راج ہنس بنایا ہے راج ہنس جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی دوری کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اس لمحہ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔ خوشی اور حیرت سے وہ چلا اٹھی ”میں اڑ سکتی ہوں“۔ پرندوں نے اپنے اپنے گھونسلوں میں سے سر نکال کر اسے دیکھا اور ہنسنے لگے۔

چیونٹی کو اپنے شیشے جیسے چمکدار پر بہت اچھے معلوم ہوتے جیسے دو موتی! اپنا ننھا سا وجود بہت قیمتی معلوم ہوا۔ وہ سنبھل سنبھل کر اڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور پھر اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ سچ مچ اڑ سکتی ہے۔ وہ اڑی اور چھوٹے سے چشمے کے دوسرے کنارے پر چلی گئی۔ زمین پر گرتے ہی اس کے شیشے جیسے پر چکنا چور ہو گئے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ پر پانی کے قطروں کی طرح جھڑ گئے۔ جیسے ان کا جسم سے رشتہ ہی نہ تھا۔ بس دو بوندیں گرنے کا احساس ہوا۔ ایسے ہلکے پھلکے پر! لوگ کہتے ہیں کہ چیونٹی کے پر نکلتے ہیں تو اس کی موت آتی ہے۔ لیکن چیونٹی پر ٹوٹنے سے مری نہیں بلکہ زمین پر واپس آ کر سجدۂ شکر بجا لائی۔ زمین کو چوما۔ اور ننھے منے پر ٹوٹنے پر خدا کا شکر ادا کیا اور بولی میں نے ان پروں سے خود کو جانا میں دریائے حقیقت کی شناور ہوں! آہ میں راج ہنس ہوں! ایک راج ہنس اپنی لمبی اڑان کے بعد قریب ہی ایک جھاڑی کے پاس آرام کر رہا تھا۔ اسے چیونٹی کی بات پر ہنسی آ گئی اور دریائے حقیقت کی شناور! دو پانی کے قطرے جیسے پر! اور وہ چھوٹا سا چشمہ جو اس نے پار کیا ہے غریب چیونٹی وجود کا سب سے چھوٹا نقطہ! جس میں حرارت ہے زندگی ہے بینائی اور مہک ہے! لیکن اس کی نظر اور خبر بھی اس کے وجود کی طرح

محدود ہے! بیچاری بصیرت سے محروم ہے اس نے تو کون و مکاں میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ راج ہنس کو چیونٹی پر رحم آگیا۔ وہ ان پروں پہ اتنی خوش ہے جو ذرا سی دھوپ میں چٹخ کر ٹوٹ گئے۔ کائنات کی سب سے عاجز اور ناچیز ہستی غالباً چیونٹی ہی ہے اس کا وجود کتنا دلچسپ اور قابل رحم ہے۔ اس نے چیونٹی کے جھڑے ہوئے پروں کو دیکھا جو کانچ کی طرح کرچی کرچی ہو گئے تھے — اور جن کے پانے پہ چیونٹی کی آنکھ سے آنسو رواں تھے اور وہ خدا کا شکر کئے جا رہی تھی۔!

راج ہنس کا یہ حال تھا کہ وہ جتنی سیر و سیاحت کرتا اس کی پیاس ہی نہ بجھتی تھی۔ ایک بے چینی بے نام سی خلش! کچھ پا کر بھی نہ پانے کا احساس — ایک نامعلوم سا درد! اور وہ درد ہی اسے پرواز پر اکساتا تھا۔ آگے اور آگے لے جاتا تھا — لیکن آخر وہ کہاں تک جاتے۔ کوئی حد نہیں! صداقت کہاں ہے —! منزل —؟ ایک سوال بن گئی تھی۔

راج ہنس نے چیونٹی کے پروں کا انجام دیکھ کر سوچا کہ چیونٹی کی کہانی کتنی مختصر ہے۔ وہ چیونٹی کے پاس گیا اور بولا ارے کہانی تو ختم ہی نہیں ہوتی۔ بی چیونٹی تم نے تو ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا — آؤ میں تمھیں اپنے پروں پہ سیر کراؤں یہ چھوٹا سا چشمہ جسے تم دریا سے حقیقت سمجھ بیٹھی ہو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس سے آگے ندی ہے جو ہمالہ کی گود میں سو رہی ہے پھر دریا ہیں سمندر ہیں۔ خوبصورتی کی کوئی حد نہیں سفر ختم ہی نہیں ہوتا آگے اور آگے — خلا ہی خلا —! تمہیں لمحہ بھر کو پر ملے تو تمہاری سیاحت تمام ہوئی — کہانی ختم بھی ہو گئی!

چیونٹی شرما کر بولی مجھے پروں کی ضرورت ہی نہ تھی وہ پر تو اس کی عطا تھے دیئے اور لے لئے لیکن میں نے اسے جان لیا ہے یہ ننھا سا وجود مکمل ہے!

راج ہنس بولا۔ "اچھا تو آؤ اور اب میرے پروں سے دیکھو کہ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے — سفر ختم ہوتا ہے یا نہیں —!"

چیونٹی خوشی خوشی اپنا نقطہ برابر وجود راج ہنس کے سفید پروں میں چھپا کر بیٹھ گئی۔

چیونٹی نے راج ہنس کا عکس جب پہلی بار قریب سے چشمہ کے پانی میں دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ دنیا کی ساری خوب صورتی اور طاقت راج ہنس کے سفید اور مضبوط پروں میں سمٹ آئی ہے اور اب وہ عکس جیتی جاگتی حقیقت بن کر اس سے بول رہا تھا۔ چیونٹی اس کے سفید شفاف، نرم، دبیز اور ٹھنڈے پروں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

راج ہنس اڑنے لگا اڑتا گیا۔ چھوٹے سے چشمہ کو چھوڑ کر اس ندی کی طرف ہو لیا جو ہمالہ کی گود میں ازل سے محوِ خواب ہے پھر وہ اس دریا کی طرف گیا جس سے ندیوں نے جنم جنم کے لئے الفت کا پیمان باندھا تھا مگر جو اب منہ موڑ کر اس بڑے ڈیم کی طرف جا رہی ہیں جو انساں کے ہاتھوں نے بنایا ہے اور تقدیر کا قلم لے کر ازل سے لکھے ہوئے نقطے اور لکیریں بدل ڈالی ہیں۔ وہ دریا ندیوں کے روٹھ جانے سے اداس اداس بہہ رہا ہے۔ اب پہلا سا جوش جذبہ اور تلاطم اس کے سینے میں باقی نہیں رہا۔ بیچارہ دریا —!

راج ہنس دریا کو چھوڑ کر پھر دور پہاڑوں پر اڑنے لگا ہمالہ کی دودھیا برف پر دھنک کے سب رنگ مسکرا رہے تھے راج ہنس کو وہ رنگ اتنے خوب صورت لگے اس نے سوچا کہ زندگی رنگوں سے عبارت ہے زمین پر ہر طرف سبز رنگ تھا گہرا سبز ہلکا سبز — دھانی — ایک سبز رنگ میں بھی کئی سبز رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ راج ہنس رنگوں کی مدھرتا میں کھو گیا۔ اور رنگوں کی تعریف کرنے لگا —!

چیونٹی نے سوچا کہ یہ سب تعریفیں خدا کے لئے ہیں جس نے سب رنگ بنائے ہیں اور راج ہنس کی پرواز ہی اس کی عبادت ہے فضا میں رکوع اور سجود کے خوب صورت آداب بجالانا راج ہنس کو ہی آتا ہے۔

چیونٹی نے اپنے وجود کی آنکھیں کھول کر حیرت سے راج ہنس کو دیکھا اس کے سفید پر دل پہ قوسِ قزح کے سب رنگ اترآئے تھے۔ چیونٹی کو اس لمحہ یہ محسوس ہوا کہ راج ہنس کائنات کی سب سے خوب صورت حقیقت ہے! اسے وہ بہت پیارا لگا —! اور اس نے سوچا کہ تخلیق کی محبت خالق کی محبت ہوتی ہے۔! اور راج ہنس کی یہ محبت خدا کی محبت ہے۔ چیونٹی نے خدا کی محبت اپنے روں روں میں محسوس کی اور وہ خدا کی بڑائی پاکی اور عظمت کی تعریف کرنے لگی۔ عبادت کا ایسا سرور محسوس ہوا کہ اس نے سرور کی لذت میں ڈوب کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

راج ہنس آسمانوں میں اتنی دور چلا گیا جہاں سے ہمالہ برف کا ایک ننھا سا نقطہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چیونٹی کا وجود! راج ہنس کا حوصلہ بہادری، عزم ارادہ اڑان کی بے پناہ شگفتی اور شخصیت کے حسن کا سحر چیونٹی پہ اس طرح چھا گیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے جذب کی اس منزل میں پہنچ گئی جہاں وہ اپنی آنکھوں سے نہیں راج ہنس کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی — سوتی رہی چیونٹی کے ننھے سے دل کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ راج ہنس میں اسے خدا کا نور نظر آیا —! اور اس کا اپنا وجود بھی نور کا ایک ننھا سا نقطہ بن گیا —

راج ہنس چیونٹی کے دل میں تھا چیونٹی اس سے بولی۔ میں اور تو — نہیں وہ وہ —! بس وہی وہ — چیونٹی نے دل کی آنکھ سے خدا کا نور دیکھا اور اسے کائنات میں ہر طرف وہ نور نظر آیا —! چیونٹی بھی ایک روشن نقطہ تھی — راج ہنس بھی — اور وسعتوں میں وہی نور —! نور کی اس بارش میں چیونٹی بے خودی اور سرور کے عالم میں اس طرح کھو گئی کہ اس کو اپنے ننھے سے تن من کی کوئی سدھ نہ رہی —!

راج ہنس چاند ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا زمین پر لوٹ آیا۔ اس چشمہ کے پاس اترا جہاں سے چیونٹی اس کے پروں پر سوار ہوئی تھی۔

چیونٹی اب تک سرور کے عالم میں ڈوبی ہوئی تھی — اور اسے کوئی ہوش نہ تھا اس کی آنکھ ہی نہ کھلتی تھی۔

راج ہنس نے پوچھا " چیونٹی تو نے کیا دیکھا ؟"

چیونٹی بولی " راج ہنس میں نے تجھے دیکھا "

راج ہنس نے کہا " چاند ستارے کتنے قریب آ گئے تھے عالم موجودات کا سارا حسن بے نقاب تھا "

چیونٹی بولی " اے راج ہنس میں نے تیرے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھا — میں تو تیرے پروں میں منہ چھپائے سوتی رہی — میں عالم موجودات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی — مگر میں تجھے جان گئی !"

راج ہنس بولا " تو بھی عجیب ہے "۔ پھر اس نے سوچا چیونٹی کی ننھی منی آنکھیں شاید زیادہ دور تک دیکھنے سے محروم ہیں اس نے پوچھا " تو نے ہمالہ کی برف پر قوسِ قزح کے رنگ تو دیکھے ہوں گے ؟"

راج ہنس میں نے ہمالہ کو نہیں دیکھا میں نے تو قوس قزح کو تیرے سپید پروں پہ دیکھا۔ آہ میں تجھے کیا بتاؤں اس لمحہ تو کتنا سندر لگ رہا تھا۔ تیرے پروں کے رنگ یوں اتر آئے تھے جیسے میں دھنک پر سوار ہو کر اڑ رہی تھی۔ مگر پھر تو نے دھنک کو بھی پیچھے چھوڑ دیا آسمان کی سب رفعتیں تیرے سامنے سرنگوں تھیں —"

راج ہنس کو ہنسی آ گئی پگلی چیونٹی —! پھر تو نے شاید خلا کی سیر ہی نہیں کی جگمگاتی روشنیاں — ہر رنگ کی روشنی — رنگوں کی ناچتی دھنک — اور پانی کے قطروں کے ساتھ برستی ہوئی دھنک کی پھوار —! ہوا کے ساتھ بادلوں کا ختم نہ ہونے والا رقص — —! فضا کے نغمے — خاموشی کے گیت —! افسوس نہ تو نے کچھ دیکھا نہ سنا اتنے لمبے سفر میں تو نے آخر کیا پایا — کیا دیکھا —؟ مجھے تو تو نے زمین پر بھی دیکھا تھا کاش تو نے میرے علاوہ بھی کچھ دیکھا ہوتا —!

چیونٹی نے کہا راج ہنس آسمانوں کی سلطنت میں بھی سب سے زیادہ خوب صورت چیز تو ہے خلا کا مسافر —! میں نے اس سفر میں تجھے پایا ہے —! اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ تو ہر پرواز کے بعد زمین پر ہی لوٹ آتا ہے گھر کا راستہ نہیں بھولتا۔"

راج ہنس بولا " اے چیونٹی میں خلا میں جتنی دور جاتا ہوں زمین اتنی ہی خوب صورت لگتی ہے اور اس کی کشش بڑھتی ہی جاتی ہے — اور پھر میں زمین پر لوٹ آتا ہوں —! چاند تارے تو صرف آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے ہیں —! وجود کی پناہ گاہ بس زمین ہی ہے!

چیونٹی بولی اے راج ہنس زمین ہی صداقت ہے —! اور صداقت ہمارے اندر سے باہر نہیں ہے — باہر تو خلا ہی خلا ہے —! لیکن دل کے اندر محبت ہے اور محبت صداقت ہے، نور ہے معنی ہے —! اے راج ہنس میں جو ایک ننھی سی چیونٹی ہوں — زمین ہوں — معنی ہوں۔ !

راج ہنس نے سوچا بیچاری چیونٹی عالم موجودات اور کون و مکاں میں سب سے حقیر چیز —! وجود کا سب سے چھوٹا نقطہ —! یہ معنی کیسے ہے —! اور محبت جو آسمانوں اور زمینوں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے وہ اس کے ننھے سے دل میں کیسے سما سکتی ہے —! چیونٹی کا دل —! راج ہنس کو ہنسی آ گئی!

چیونٹی نے راج ہنس کے دل کی بات جان لی اور ہنس کر بولی " اے راج ہنس تو نے مجھے آسمانوں کی سیر کرائی ہے میں تجھے زمین کی سیر کرانا چاہتی ہوں۔ تیرے احسان کا بدلہ تو میں نہیں اتار سکتی یہ صرف شکریہ کا اظہار ہے —!"

چیونٹی نے پھر اپنے ننھے سے سوراخ کی طرف اشارہ کیا جو زمین میں نظر بھی نہیں آتا تھا اور بولی " آؤ میرے ساتھ زمین میں چلو — اور دیکھو کہ زمین کی کوکھ میں کیسے کیسے انمول خزانے ہیں —"

راج ہنس بولا " تو پاگل ہے میں اس ننھے سے سوراخ میں کیسے جا سکتا ہوں۔ میرے یہ خوب صورت اور عظیم پر آسمانوں میں اڑنے کے لئے ہیں۔ سوراخوں میں جانے کے لئے نہیں ہیں "

چیونٹی بولی " آؤ میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ میں تمھیں لے چلوں گی "

راج ہنس نے کہا " بھلا میں تیری پیٹھ پہ کیسے سوار ہو سکتا ہوں "

چیونٹی نے کہا "پھر اس کا مطلب تو یہ ہے کہ بڑا عاجز اور مجبور ہے نہ کہ چھوٹا؟ یہ پَر جو تمہاری قوت اور خوبصورتی ہیں ان سے تم خلا میں تو جا سکتے ہو مگر زمین میں جانے کے بے پَر کا ہونا چاہیے۔ اے راج ہنس اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں لمحہ بھر کے پروں کا کیوں شکریہ ادا کر رہی تھی —! اگر میرے بوجھل پَر ہوتے تو سدا خلا میں بھٹکتی مگر میرا رشتہ تو زمین سے ہے۔ محنت عمل انتھک جد و جہد — اتحاد، محبت — چیونٹی کی ننھی سی جان ان سب جذبوں کی علامت ہے۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ میں زمین ہوں —! اے راج ہنس جتنی دوڑ دھوپ تو خلا میں کرتا ہے اتنی ہی دوڑ دھوپ میں زمین میں رزق حلال کے لئے کرتی ہوں۔ پھر میں عالم موجودات کی سب سے حقیر چیز کیسے ہوں؟

راج ہنس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا —! اپنے پروں کی تعریف سن کر اسے گھمنڈ ہو چلا تھا — اور وہ سوچتا تھا کہ جس کے پاس پَر نہیں ہیں وہ بصیرت سے محروم ہے — اب ایک ننھی سی چیونٹی نے اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا —! وہ زمین کے اندر نہیں جا سکتا! اس نے عجز سے چیونٹی کی طرف دیکھا اور بولا "اے چیونٹی میں راز جو ہوں مجھے آسمانوں میں تلاش لے جاتی ہے۔ اپنی تلاش!"

چیونٹی ہنس کر بولی "اے راج ہنس میں محرم راز ہوں! اور تو آسمانوں میں اپنے آپ کو نہیں ڈھونڈ سکتا اس لئے کہ تو ایک چیونٹی کے ننھے سے دل میں قید ہے! جو زمین کے ایک چھوٹے سے سوراخ میں رہتی ہے! راج ہنس تو صداقت کی تلاش میں وقت کیوں ضائع کر رہا ہے۔ سب سے بڑی صداقت تو ہے!

"اے چیونٹی تو سچی ہے —! تو معنی ہے! تجھے دیکھ کر میں نے یہ جانا ہے کہ وجود جتنا چھوٹا ہو اتنا ہی اسے لے کر چلنا آسان ہوتا ہے —! میرے راستے میں میرے پَر حائل ہیں اور تیرے پَر نہیں تو آزاد ہے! آہ یہ پَر آزادی کا نہیں قید کا نشان ہیں!

"راج ہنس جب وجود کا بوجھ بالکل ہی اتار دیا جائے تو آسمان اور زمین کی سب دوریاں ختم ہو جاتی ہیں سب فاصلے مٹ جاتے ہیں میں وجود کی ایک ننھی سی گٹھڑی اٹھائے سرگرم سفر ہوں۔ ابھی چند لمحوں میں ایک شخص تیری تلاش میں آئے گا اور مجھے قدموں تلے روند ڈالے گا — میں تجھ سے اس وقت بھی کلام کروں گی لیکن آ میں مرنے سے پہلے تجھے راز بتا دوں — وہ پردہ ہٹا دوں جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہے — سن! وجود جب وسعتوں میں پھیلنا چاہتا ہے تو راج ہنس بن جاتا ہے مگر جب وجود سمٹتا ہے تو پھر ایک چھوٹا سا نقطہ بن جاتا ہے — ایک فقیر چیونٹی —! نہ میں ہوں نہ تو — بس وہ ہی ہے —! ہم ایک ہی لفظ ہیں! ایک تصویر کے دو رخ — ہمارے نام الگ الگ ہیں مگر روح ایک ہے!"

ذرا سی دیر بعد ایک شخص آیا اور چیونٹی کو روند کر گذر گیا چیونٹی کی آواز آئی "اے راج ہنس اب میں آسمان میں لمبی اڑان لینے جا رہی ہوں" دوسرے ہی لمحہ اس شخص نے راج ہنس کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ راج ہنس گرا اور تڑپنے لگا — پھر وہ جسم کی قید سے آزاد ہو کر چیونٹی سے بولا "میں اپنے خوب صورت پر چھوڑ کر زمین میں جا رہا ہوں"

چیونٹی نے کہا "آؤ اب ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلیں کہ اب آسمان اور زمین ایک ہیں!"

راج ہنس کے مردہ جسم اور پروں پر سیکڑوں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ راج ہنس نے چیونٹی سے کہا "وہ پر جو تجھے پسند تھے ان کا انجام دیکھ! میرا گرم گرم لہو چیونٹیاں پی رہی ہیں اور میرا گوشت پوست کھا رہی ہیں —"!

چیونٹی نے کہا ” اے راج ہنس تیرا گوشت اور گرم لہو ان سب چیونٹیوں کا ہی مقدر تھا — مگر تیرے پروں پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کرنا اور تیرے خوبصورت پروں پر قوس قزح کے سب رنگ دیکھنا صرف ایک چیونٹی کی تقدیر میں تھا!”

راج ہنس نے اپنے پروں کا انجام دیکھ کر کہا ” افسوس یہ حقیقت ہے جسم کے رشتوں کی —— جسم کا رشتہ میرا ان سب چیونٹیوں سے ہی تھا ان کو اب میرا جسم پوری طرح مل گیا ہے! روح ہی سچ ہے! روح جسے میں آسمانوں میں ڈھونڈتا رہا اور جو ایک ننھی سی چیونٹی کے دل میں قید ہو کر محفوظ تھی — !”

چیونٹی نے کہا ” تو بلند تھا اور میں پست! لیکن اللہ نے پستی اور بلندی کو ایک بنایا ہے —— اے راج ہنس نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا ہے سب ایک ہیں۔ جب سلیمان نے چیونٹیوں کے لشکر کو روند ڈالا تھا تو ایک چیونٹی کو اس سے کلام کرنے کی جسارت ہوئی تھی۔ اس نے سلیمان کو آئینہ دکھایا تھا —— اور بتایا تھا کہ ” اے سلیمان تو ایک چھوٹی سی چیونٹی ہے”۔ اور سلیمان جس کی آسمانوں اور زمینوں میں بادشاہت تھی اپنی حقیقت جان کر عجز سے سجدۂ شکر بجا لایا تھا اور بولا تھا کہ ” عالم موجودات میں سلیمان کی ذات ایک حقیر چیونٹی ہے!”

اے راج ہنس اب تو جسم کی قید سے نکل آیا ہے تو تو نے دیکھ لیا کہ میں وہی چیونٹی ہوں! تو عقل کی دنیا کا سلیمان تھا اور میں محبت تھی۔ مجھے چیونٹی ہونے پر فخر تھا اس لئے کہ میں وہ چیونٹی تھی جس کے دل میں قدرت نے راج ہنس کو قید کیا تھا — ! اور اب نہ کوئی میں ہوں — کوئی تو ہے!”

راج ہنس نے کہا ” اب لفظ اور معنی ایک ہیں!”

"ایک لمحے کا خدا"

رتن سنگھ

اُس لمحے میرے اندر کی ساری خوب صورتی باہر اُمڈی پڑ رہی تھی۔

جیسے پھوارے کے اندر سے نکل کر پانی، اُوپر کی طرف اُچھلتا ہے اور پھر قوسِ قزح بناتا ہُوا چاروں طرف بکھرنے لگتا ہے اور نیچے حوض میں جمع ہُوئے پانی پر جیسے بارش ہونے لگتی ہے اور اس کی پھوہار اردگرد کے ماحول کو نم کرنے لگتی ہے، کچھ اسی طرح سے میرے وجود میں چھپی ہُوئی خوب صورتی میرے اردگرد پھوہار بن کر بکھر رہی تھی۔

جس طرف بھی میری نگاہ جاتی، جس چیز کو بھی میری نظر چھُوتی وُہی خوب صورت ہوتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے اپنے اندر کی اِس خوبی کا کبھی احساس نہیں تھا۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ میرے اندر کوئی ایسی جادوئی قوت ہے جو ہر چیز کو کندن بنا سکتی ہے۔ لیکن وہ لمحہ پتا نہیں کیسا تھا، کتنا خوب صورت تھا، جب مجھے اپنی اِس قوت کا احساس ہوا، اس وقت میں نے نظر اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک عام سی ساڈھارن سی عورت ہے، جسے میں برسوں سے دیکھتا چلا آیا ہُوں۔ لیکن اُس وقت میری نظر پڑتے ہی جیسے اس کے چہرے پر چاند کا حُسن چھلکنے لگا۔ ستارے اُس کے بالوں میں زیور بن کر ٹنک گئے اور اُس کا سارا وجود پھُولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح مہک دینے لگا۔

اُس سے نظریں ہٹا کر میں نے اپنے آنگن میں لگے پودوں کو دیکھا تو یہ احساس ہُوا جیسے میری آنکھیں اِن پودوں کو ہریاول بخش رہی ہیں۔ اور وُہ یہ رنگ پا کر بہت نازک اور خوب صورت ہو گئے ہیں اور خوشی سے جھوم رہے ہیں۔ اُن پر رنگ برنگے پھُول کھل آئے ہیں اور ماحول مہک اٹھا ہے۔

پھر میری نظر آنگن کے اُوپر پھیلی ہُوئی کھُلی فضا کی طرف گئی تو ایسا لگا جیسے میری نگاہوں نے حدِ نگاہ پر نیلاہٹ بکھیر کر ایک نئے آسمان کی تشکیل کر دی ہے۔

میں ابھی اپنی نگاہوں کے اِس کمال کو بھی محسوس کر رہا تھا کہ ایسا لگا جیسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہُوئے نیلے آسمان پر موتی اچھال دیے ہوں اور وُہ موتی آسمان پر دانوں کی طرح بکھر کر ستارے بن کر چمکنے لگے ہیں۔

میں یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش بھی ہو رہا تھا اور حیران بھی۔ حیران اس لیے کہ مجھے ابھی تک، کبھی یہ احساس ہی نہیں ہُوا تھا کہ میں اتنے کمالات کرنے کے قابل ہوں۔ میں حیران تھا کہ آسمان کیسے میری نظر کے جادو سے فضا میں اٹک سا گیا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کس طرح وہاں ستارے اُگ سے آئے ہیں اور میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

ابھی میں یہی دیکھ رہا تھا کہ آنکھ کے ذرا سے اشارے پر ہاتھ نے اُوپر آسمان تک اُٹھ کر وہاں چاند کو ٹانک دیا اور اِس

طرح میرے گھر کے آنگن میں سے دکھائی دینے والے آسمان کا حُسن مکمل ہوگیا۔

میں اپنی نگاہوں کے اِس جادو کو، اِس تخلیق کو بڑی دیر تک غور سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اِس نظر میں کتنی طاقت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنگن کے اوپر آسمان کی چھت ڈال دی، پھر اُس آسمان کو خوب صورت بنانے کے لیے اُس پر نیلاہٹ بکھیر دی اور جھلملاتے ہُوئے چاند اور ستارے جڑ دیئے۔ اور...... اور......

تبھی مجھے احساس ہُوا کہ آسمان کی خوب صورتی اور میری بیوی کی خوب صورتی میں بڑی یکسانیت ہے۔ میری بیوی کے چہرے پر بھی چاند کی سی خوب صورتی ہے اور اُس کے بالوں میں زیور ستاروں کی طرح ٹکے ہیں اور اُس کی سانسوں میں پھولوں کی مہک ہے اور...... اور ......

اور میں خوش تھا کہ مَیں اِس قابل ہوں کہ اپنا آسمان بنا سکتا ہُوں۔ اُس میں چاند ستارے جڑ سکتا ہوں۔ پودوں کو ہریاول دے سکتا ہوں، اُن پر پھول کھلا سکتا ہُوں اور پھر چاند ستاروں اور پھولوں کے مجموعی حُسن اور مہک سے بیوی کے حُسن کو دوبالا کر سکتا ہوں اور ......

غرضیکہ میرے اندر پیدا ہُوا خدا مجھ پانچ چھ فٹ لمبے حقیر سے آدمی کو اِتنا بلند کر رہا تھا اُس لمحے کہ میں اپنے بنائے ہُوئے آسمان سے بھی اُونچے بنے ہُوئے آسمانوں اور ان آسمانوں پر چمکتے ہُوئے چاندوں، سورجوں اور ستاروں سے بھی اُونچا اٹھتا جا رہا تھا اونچے ہی اوپر پرواز کر رہا تھا۔ کبھی دل کرتا تو کسی ستارے کو توڑ کر اپنی زمین کے آنگن میں پھینک دیتا۔ کبھی دل کرتا تو کسی ستارے پر ہاتھ ڈال کر بھی اُسے پھر وہیں چمکتا رہنے دیتا۔

اِس طرح جب اِس دھرتی کا آنگن ستاروں سے بھر گیا تو دُوسرے ہی لمحے میں پھر اپنے گھر کے آنگن میں اپنی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ میری بیوی میرے سامنے بیٹھی سبزی چھیل رہی تھی اور اب پھر وُہ وُہی سادھارن سی عورت تھی، جس کے بالوں میں ستاروں کے بجائے سفید بادل چمک رہے تھے گھر کے آنگن میں لگے پودوں کے پتّے بھی پہلے کی طرح سُوکھے ہُوئے تھے۔

مطلب یہ کہ اب میری نظر میں وُہ قوت نہیں رہی تھی کہ پودوں کے پتّوں کو ہریاول عطا کر سکے، یا بیوی کے چہرے پر حسین چاند ستارے ٹانک سکے۔ اور آسمان اور چاند ستارے، سب کے سب نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اوپر فضا میں خلا سی پیدا ہو گئی تھی۔

اور میں تڑپ اٹھا ہوں۔

ایک لمحے کا خُدا میرے وجود کے اندر نہ معلوم کِن گہرائیوں میں چھپ گیا ہے۔ میں اپنے اندر جھانک جھانک کر کونے کونے میں اُسے ڈھونڈ رہا ہُوں تاکہ پھر میرے اندر وہی قوت پیدا ہو سکے تاکہ میں اب کی اپنے گھر کے آنگن پر ہی نہیں بلکہ اپنی دھرتی کے آنگن پر ایک نیا آسمان بنا سکوں، جس میں ایسے چاند اور ستارے چمک رہے ہوں جو ساری دھرتی کو ایک نئی روشنی ایک نئی زندگی عطا کر رہے ہوں۔

لیکن اُس ایک لمحے کے خدا کا کہیں پتا نہیں چل رہا۔

میری پریشانی اور گھبراہٹ بڑھ رہی ہے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ میں ایسے تڑپ رہا ہوں جیسے مچھلی کو پانی سے باہر پھینک دیا گیا ہو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آسمانوں کی بلندی سے مجھے سخت زمین پر زور سے پٹخ دیا گیا ہو اور انگ انگ ٹوٹ کر بکھر کر بھی درد سے بے حال ہو رہا ہو۔

اِس حالت میں، مَیں اپنے ذہن پر زور دے رہا ہوں کہ میرے اندر وہ ایک لمحے کا خدا کیسے پیدا ہُوا، اور وہ کیسے چھپ گیا۔

ذہن پر بہت زور دینے پر کچھ احساس ہو رہا ہے کہ کوئی خوب صورت خیال آیا تھا۔ کوئی اچھی بات ذہن میں آئی تھی، محبت کا کوئی جذبہ پیدا ہُوا تھا . . . اور اُس کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا وہ ایک لمحے کا خدا . . . . اور اُس خیال کے ذہن سے اوجھل ہونے ہی میری دُنیا اندھیر ہو گئی ہے اور مَیں پھر کوشش کر رہا ہوں تاکہ وہ لمحہ پھر زندہ ہو سکے۔

آنکھیں

قاضی عبدالستار

طاؤس کی غمناک موسیقی چند لمحوں کے بعد رک جاتی ہے۔

”سبحان اللہ..... جہاں پناہ...... سبحان اللہ“

”بیگم“ (بھاری اور رنجور آواز میں)

”جہاں پناہ..... اگر ہندوستان کے شہنشاہ نہ ہوتے تو ایک عظیم مصنف، عظیم شاعر، عظیم مصور، اور عظیم موسیقار ہوتے۔“

”یہ تعریف ہے یا غمگساری..... بہر حال جو بھی ہے مابدولت کے بیقرار دل کو قرار عطا کرنے کی جسارت کرتی ہے۔“

”جہاں پناہ کی آنکھوں نے آج پھر نیند کو باریابی سے محروم رکھا؟“

”بیگم۔“

”نصیب دشمناں.... کیا مزاج عالم پناہی۔“

”ہندوستان کے تخت پر جلوس کرنا آسان ہے لیکن سچ بولنا دشوار ہے۔ دشوارتر۔“

”نورجہاں بیگم کے سامنے بھی عالم پناہ!“

”بیگم۔“

”ظل الٰہی کو جو ارشاد فرمانا ہے وہ ارشاد فرما دیا جائیے.... پھر جلاد کو حکم دیا جائیے کہ ہمارے کانوں میں گھلا ہوا سیسہ ڈال کر الفاظ پر مہریں لگا دے۔“

”خوب.... جوانی آنکھیں قبول کر چکی..... بڑھاپا سماعت کو سولی پر چڑھا دے۔“

”کنیز کچھ سمجھنے سے قاصر ہے۔“

”آپ کے نام کا سکہ روئے زمین کی سب سے شاندار سلطنت کے بازار کا چلن ہے ہندوستان کی مہر حکومت آپ کی انگشتِ مبارک کی زینت ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ جہانگیر ایک جام کے عوض تاج ہندوستان آپ کو عطا کر چکا.... لیکن یہ کون جانتا ہے کہ جہانگیر آج بھی اپنی محبت کی تکمیل کا محتاج ہے۔“

”ظل اللہ۔“

”پوری کائنات کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے والی محبت اس ایک چھوٹے سے لمحے کی محتاج ہوتی ہے جب عاشق اپنے سینے کا آخری راز محبوب کے سینے میں منتقل کر دیتا ہے........ آج کون سی رات ہے بیگم۔“

"شوال کی چودھویں عالم پناہ۔"

"بہت خوب ..... آج کی رات آسمان سے اس لیے اتاری گئی کہ مابدولت آپ کے سر پر تکمیلِ محبت کا تاج رکھ دیں۔"

"ظلِ الٰہی .... کیا روئے زمین پر کوئی عورت ہے جس کے ہاتھ میں خاتمِ سلیمانی ہو اور سر پر محبت کا تاج؟"

نور جہاں بیگم۔

"جامِ زندگی کا ایک جام بنائیے اور اس طرح ہونٹوں سے لگا دیجئے کہ جام مابدولت کی آنکھوں سے دور رہے ..... ایک عمر ہونے کو آئی کہ جام میں آنکھیں نظر آئی ہیں ..... وہی آنکھیں ...... وہ بے پناہ آنکھیں۔"

"جہاں پناہ طبیبِ شاہی کی مقرر کی ہوئی مقدارِ شراب۔"

"نوش فرما چکے! یہ کیسی شہنشاہی ہے کہ ایک ایک جام کو ترستی ہے ......"

"بیگم.... ہماری محبت کے جشنِ تاجپوشی کے تصدق میں ایک جام عطا کر دیجئے۔"

"اتنی عزت نہ دیجئے جہاں پناہ کہ نور جہاں اس بارِ عظیم کی متحمل نہ ہو سکے۔"

(شراب ڈھالتی ہے .... ایک ہی سانس میں جام خالی ہو جاتا ہے)

"بیگم۔"

"کنیز ہمہ تن گوش ہے عالم پناہ۔"

"ایک مدت ہوئی کہ مابدولت زندہ تھے۔"

"ظلِ اللہ۔"

"جی ہاں بیگم... زندگی کا صرف ایک نام ہے۔ جوانی .... اور سلیم کی جوانی۔ دولتِ مغلیہ کے اولیں صاحبِ عالم کی جوانی ...... فردوس مکانی بابر بارہ برس کی عمر میں بادشاہ ہو گئے۔ جنت مکانی ہمایوں میدانِ جنگ میں تلوار چلاتے جوان ہوئے عرش آشیانی (اکبر) اپنے دادا جان کی طرح بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے اور اکبرِ اعظم کی ولی عہدی سلیم کا مقدر ہوئی۔ ...... عرش آشیانی نے جب شراب پر پہرے بٹھا دیئے تو مابدولت کے جاں نثار اپنی بندوقوں کی نالیوں میں شراب بھر کر لاتے اور پیمانے لبریز کر دیتے اور نظامِ ہضم بارود سے سینچی ہوئی شراب اس طرح ہضم کر لیتا جس طرح آج دوا کا پیالہ ہضم نہیں ہوتا۔ اس بے پناہ جوانی اور بے محابہ شہزادگی کا اثر تاجداری پر طاری رہا..... بیگم۔"

"عالم پناہ۔"

"یہ پردہ ہٹا دیجئے..... سنگِ مرمر کی زیبائی چاندنی سے ہوتی ہے۔ آج کی رات کی چاندنی اگر مابدولت جوان ہوتے تو ساری رات آپ کے ہاتھوں سے پیمانے قبول کرتے رہتے۔"

"جہاں پناہ۔"

"ہاں بیگم .... دوسرا سالِ جلوس تھا۔ مابدولت مینا بازار میں جلوہ افروز تھے کہ ایک لڑکی نے پان پیش کئے۔ گوریوں کی نزاکت

ر نفاست پسند خاطر ہوئی ۔ ہاتھوں پر نظر پڑی تو اور ہی عالم نظر آیا جیسے نور کے سانچے میں ڈھال دیے گئے ہوں۔ نگاہ بلند ہوئی تو معصوم شی آنکھوں میں ڈوب گئی اور محسوس ہوا جیسے اندر کہیں کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ جب ہوش آیا تو وہ نگاہ نیچی کیے لرز رہی تھی اور دونوں ہاتھوں میں شت کانپ رہا تھا۔ ماہدولت گردن سے ہار اتار رہے تھے کہ اس کی آواز طلوع ہوئی۔ جیسے کشمیر کے برف پوش پہاڑوں پر سورج کی کرن تی ہے ۔

"تحفۂ درویش کی قیمت کیا عالم پناہ۔"

"بیشک تحفۂ درویش قیمت سے بلند ہوتا ہے۔ یہ موتی اس نفاست اور نزاکت کی داد میں جوان گوریوں میں مجسم ہو گئی۔ ہم آگے ڑھے تو عرفان ہوا کہ ہم پیچھے رہ گئے۔ پہلی بار قلعۂ معلیٰ ویران معلوم ہوا۔ . . . . اکبر اعظم کے جانشینی کی بارگاہ خالی خالی محسوس ہوئی۔ پہلی بار ماہدولت کو غربت کا تجربہ ہوا۔ ایسی غربت جو دل کو مٹھی میں دبوچ کر ایک ایک قطرہ لہو نچوڑ لیتی ہے اور جب ہم نے چاہا کہ دل کی ویرانی کو شراب سے شاداب کریں تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ شراب نشے سے عاری ہو چکی۔ دیر تک شیشے خالی ہوتے رہے لیکن دل کا خلا پر نہ ہو سکا۔"

"جہاں پناہ! کنیز نے اپنی کم فہمی کی بنا پر قیاس کیا تھا کہ ظلِ الٰہی کا ملال شاہزادہ خرم اور شاہزادہ شہریار کی آویزش سے متعلق ہوگا لیکن ۔"

"خرم اور شہریار کی آویزش مغل تاجداروں کی روایت ہے۔ مغل سلطنت اس کا مقدر ہوتی ہے جس کی تقدیر کامگار اور شمشیر آبدار ہوتی ہے جب خسرو نے ماہدولت کے منہ پر تلوار کھینچ لی تو خرم اور شہریار بہر حال"

پھر جہاں پناہ ۔

پھر ماہدولت کے ہاتھ نے گھنٹہ بجا دیا۔ چوبدار کے بجائے محرم خاں کورنش ادا کر رہا تھا۔ ابھی اس کی بے ادب حاضری پر غور فرماتے کہ معروض ہوا ۔

"پان پیش کرنے والی صاحبزادی کا نام صالحہ خاتون ہے۔ جو بخارا کے شیخ الاسلام کی پوتی اور جلوہ دار شیخ عرب کی بیٹی ہیں ان کا کان عرب کی سرائے ہے۔"

"محرم خاں"۔

"ظلِ الٰہی"۔

"یہ قیمتی معلومات کس کے حکم سے فراہم کی گئیں"۔

"زبان مبارک سے نازل ہونے والے احکامات کی تعمیل پر بندۂ درگاہ کا فرض ہے لیکن محرم خاں جیسے مقرب بارگاہ کے منصب ق ہے کہ وہ عالم پناہ کے چشم و ابرو کی زبان سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو۔"

"جہانگیری چشم و ابرو کی زبان سمجھنا ایک نادر علم ہے۔ لیکن اس کا اظہار اس سے زیادہ نادر ہنر اور اس ہنر کا غلط استعمال بیداد کا مستوجب۔"

"خداوند"۔

"ماہدولت نے تمہارا قصور معاف کیا اور حکم دیا کہ خلعت ہفت پارچہ مع زر و جواہر کے ساتھ نواب صالحہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہو اور پیام

دو کہ جشنِ سالگرہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں۔"

"ہر چند کہ ابھی رات کی زلف کمر تک بھی نہ پہونچی تھی تاہم بے طرح انتظار فرما ہو چکے تھے۔"

"کتنی خوش نصیب تھی صالحہ بیگم کہ عالم پناہ اس کے منتظر تھے۔ کتنی بدنصیب تھی صالحہ بیگم کہ جہاں پناہ کی حضوری سے محروم تھی:"

"تمام رات وہ آنکھیں ہماری آنکھوں کے سامنے مجرئی کرتی رہیں۔ جن کی سیاہی میں ابدالآباد تک کے تمام مہجور عاشقوں کی سیہ بختی کا جوہر کھینچ کر انڈیل دیا گیا تھا۔ جن کی تاب کے سامنے تمام سمندروں کے تمام موتیوں کی آب پانی پانی تھی۔"

"سبحان اللہ . . . اگر ملک الشعرا اس تشبیہہ کو سن لیتا تو خجالت سے ڈوب ڈوب جاتا۔"

"وہ رات زندگانی کی سب سے بھاری رات تھی۔"

"کیا اس رات سے بھی بھاری جہاں پناہ . . . جس کی صبح اکبر اعظم کی تلوار طلوع ہونے والی تھی۔"

"ہاں بیگم..... اس رات کی دلداری کے لئے پچاس ہزار تلواریں سلیم کی رکاب میں تڑپ رہی تھیں اور صاحب عالم کے منہ سے نکلا ہوا ایک فقرہ اکبری تلوار کو غلاف کر سکتا تھا لیکن اس رات کی غمگساری کے لئے نور الدین محمد جہانگیر کے پاس ایک دامن فانوس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔"

"کاش...... اس رات کی خدمت گزاری کنیز کا مقدر ہوئی ہوتی۔"

"پھر سورج کی کرنیں سلام کو پیش ہوئیں..... مابدولت درشن جھروکے پر نزولِ اجلال کے اہتمام میں مصروف تھے کہ فریادی نے زنجیر ہلا دی۔"

"صالحہ بیگم؟"

"اس طرح باریاب ہوئی گویا وہ کشور ہندوستان کے قلعۂ معلیٰ میں نہیں کسی غریب عزیزہ کے گھر میں قدم رنجہ فرما رہی ہے—— نقاب کے اٹھتے ہی محسوس ہوا جیسے داروغۂ چاندنی خانہ نے قلعۂ معلیٰ کی تمام روشنیاں ایک شاہ برج میں انڈیل دی ہوں۔ استفسار پر اس طرح مخاطب ہوئی جیسے وہ جہانگیر سے نہیں اپنی ڈیوڑھی پر کھڑے ہوتے سوالی سے مخاطب ہے . . . . اس کی خطابت نے یقین دلا دیا کہ مابدولت نے محرم خاں کو سفیر بنا کر غلطی کا ارتکاب نہیں جرم سرزد فرمایا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ بھری دوپہر پہ رات غالب آ گئی ہے۔ وہ جا چکی تھی. . . . . اس کے غروب ہوتے ہی محرم خاں باریاب ہوا. . . . عرض کیا گیا کہ خلعت نامقبول اور دعوت نامنظور ہوئی۔

نجابت اور شرافت پہ اتنا غرور . . . . . ایسا تبختر . . . معاذ اللہ . . معاذ اللہ۔ ایک جام اور عنایت کہ زبان خشک ہونے لگی

(شراب ڈھالتی ہے . . . اور ایک ہی سانس میں آبگینہ ختم ہو جاتا ہے)

"جہاں پناہ۔"

گوش گزار کیا گیا کہ ارم آشیانی علیہ حضرت مریم زمانی ورودِ مسعود فرما رہی ہیں . . . . . . سلام کے جواب میں ارشاد ہوا کہ شیخو بابا کو اس مغرور لڑکی میں کیا نظر آ گیا کہ مغل جبروت و جلال کی بازی لگا دی گئی . . . . . . مابدولت سکوت فرما رہے . . . . . جب سکوت حد ادب سے گزرنے لگا تو علیہ حضرت نے سنا کہ صالحہ بیگم سر سے پاؤں تک کرشمۂ الٰہی ہے لیکن آنکھوں کی بے پناہی زمین و آسمان کے درمیان

اپنی مثال نہیں رکھتی . . . . سورج شاہ برج سے رخصت کی اجازت مانگ رہا تھا کہ علیا حضرت کی آمد ثانی کا غلغلہ بلند ہوا خوشخبری سنائی گئی کہ سفارش خاص پر نواب صائمہ بیگم رات کے کسی پہر قلعۂ مبارک میں جلوس فرمائیں گی۔

ظل الٰہی نے اس خوشخبری کو کس طرح قبول فرمایا۔

مابدولت نے غسل فرمایا . . . . . نیا لباس زیب تن کیا . . . . . نئے جواہر سے آراستہ ہوئے . . . . . اور خاصہ تناول فرمایا . . . .

داروغہ چاندنی خانہ کو حکم ہوا کہ ارک معلّی کا چپہ چپہ روشنی میں غرق کر دے۔

داروغہ بیوتات کو فرمان ملا کہ ذرہ ذرہ مشک و عنبر سے معطر کر دے داروغہ جواہر خانہ کو پروانہ پہونچا کہ شاہ برج کے طاق جواہرات سے لبریز کر دے۔ جمعدار کو مطلع کیا گیا کہ نواب صائمہ بیگم بہادر کی سواری کو نوبت خانے کی سیڑھیوں تک آنے کی اجازت عطا ہوئی۔ احکامات کی تعمیل ہو چکی تھی اور مابدولت انتظار کے تخت پہ جلوہ افروز تھے۔

"ظل اللہ کے دہن مبارک سے انتظار کا لفظ ادا ہو کر کنیز کی سماعت پر اس طرح گرتا ہے جیسے طاؤس پہ عقاب۔"

مقربین بارگاہ نے تہنیت دی کہ حضرت نواب صائمہ بیگم بہادر کی سواری نوبت خانے کی سیڑھیوں پر لگا دی گئی . . . . . چوبدار کی آواز پر ملاحظہ فرمایا کہ وہ سیاہ سوتی برقعہ پہنے چہرے پر بھاری نقاب ڈالے، دونوں بازوؤں پہ عورتوں کا سہارا لیے ہاتھوں میں ایک سرخ پیالہ سنبھالے آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ نقیب خاص کی آواز پر عورتوں نے اس کے بازو چھوڑ دیئے اور وہ کورنش ادا کرنے کے بجائے قدموں پر گر پڑی اور کانپتے ہاتھوں نے دراز ہو کر پیالہ تخت کی طرف بڑھا دیا . . . . . مابدولت تخت سے اتر پڑے دستگیری عطا کرنے سے پہلے اس کی نذر قبول کی . . . . . پیالہ ہاتھ میں آیا تو بیگم . . . . . جیسے آنکھوں سے بصارت چلی گئی۔

"جہاں پناہ"

پیالے میں اس کی آنکھیں تڑپ رہی تھیں۔

"ظل الٰہی"

"ہاں بیگم اس کی آنکھوں کے دیدے پیالے میں رکھے تھے . . . . . شہنشاہی کی پوری عمر میں آداب شہنشاہی کبھی اتنے بھاری نہ معلوم ہوئے . . . . . تاہم ہاتھوں نے اس کا نقاب اٹھا دیا . . . . . آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ زرد سنگ مرمر سے تراشا ہوا چہرہ ساکت تھا۔ پائے مبارک میں جیسے کسی نے زنجیریں ڈال دیں۔"

"نصیب دشمناں"

صرف اس قدر ادا ہو سکا کہ نواب صائمہ بیگم بہادر نے یہ کیا کر لیا۔

آواز آئی۔

"شہنشاہوں کی پسند غریبوں کو زیب نہیں دیتی۔ ناچیز کی آنکھیں جہاں پناہ کو پسند آ گئیں . . . . . نذر میں گزار دی گئیں . . . . . کلی کی کٹوریوں کی طرح قبول فرما لیجیے۔"

"سر سے پاؤں تک آنسوؤں میں پروئی ہوئی بھاری اجنبی آواز ایک ایک طبیب کا دامن سماعت پکڑ کر فریادی ہوتی . . . . لیکن"

"بیگم۔"

"ظلِ الٰہی۔"

"جب بھی تنہائی باریاب ہوتی ہے..... جہانگیر کی پیٹھ پر اس آواز کے تازیانے برسنے لگتے ہیں.... آنکھوں میں وہ زندہ دیدے انگاروں کی طرح دہکنے لگتے ہیں.... کاش..... وہ زندہ رہتی تو جہانگیری محل اس کو تفویض کر دیا جاتا اس کی دلداری اور دلآسائی کی جاتی تو شاید اس چوٹ کی تڑپ کم ہو جاتی بیگم۔"

"جہاں پناہ۔"

"ایک جام اور عطا کر دیجیے کہ سماعت جلنے لگی ہے اور بصارت دہکنے لگی ہے۔"

گوارا ہو نیشِ عشق

آغا بابر

افراد :-

مرزا کوچک سلطان	ایک امیر
رازی	اُس کا خورد سال بیٹا
میر ہاشم	ایک متمول جاگیردار
علی خواجہ	اُس کا مصاحب
دردانہ	میر ہاشم کی بیٹی
توختہ	میر ہاشم کا ملازم
نادر شابانی	مصوّر
استاد علی آقا	نادر شابانی کا شاگرد
رزاق میرزا	مصور نادر شابانی کے شاگرد
میر فرخ بیگ	
چنڈی داس	
چندر شیکھر	

(زمانہ : مغلیہ عہد کا آخری دور)

منظر اوّل :-

باغ کا گوشہ ۔ چودھویں رات کے چاند کی روشنی میں تین سنگ تراش پتھر کے ایک چبوترے پر اپنے اوزاروں سے کام کر رہے ہیں ۔ میرزا کوچک سلطان اپنے لڑکے رازی کو ساتھ لئے ہوئے داخل ہوتا ہے ۔

مرزا کوچک سلطان ۔ (چبوترے کو اِدھر اُدھر سے دیکھ کر) یہ تو اب مکمل ہو چکا ہے ۔ جو نوک پلک سنوارنا باقی تھی وہ تم نے آج سنوار دی ۔ (سنگ تراشوں کو اشارہ سے سمجھا کر) اب تم جا سکتے ہو ۔ (سنگ تراش اپنے اوزار سمیٹ کر تھیلوں میں ڈالتے ہیں ۔ مرزا پھر چبوترے کو قریب سے دیکھتا ہے) آج کا کام تو مختصر ہی تھا ۔ (مرزا اب ذرا فاصلے سے چبوترے کو دیکھتا ہے اور انگلی کو چبوترے کی طرف کر کے سوچ سوچ کر ہوا میں نقش بناتا ہے ۔ سنگ تراش اوزاروں کے تھیلے کر پہ ڈال کر جھک کر آداب بجا لاتے ہیں ۔ مرزا ان کے سلام کا جواب اشارے سے دیتا ہے ۔ سنگ تراش جاتے ہیں ۔)

---

[1] اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق رکھی ہے آج تلخیٔ زخمِ جگر کہاں حالی

رازی:- ابا! یہ معمار کہاں کے رہنے والے ہیں؟

مرزا کوچک سلطان:- کیوں؟

رازی:- کبھی آپس میں بولتے چالتے ہی نہیں سنا میں نے ان کو۔ بس خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

مرزا کوچک سلطان:- تمہیں معلوم نہیں یہ گونگے ہیں۔

رازی:- گونگے ہیں۔ اچھا۔ اسی لئے نہیں بولتے۔ مگر کیا تینوں کے تینوں۔

مرزا کوچک سلطان:- ہاں تینوں۔

رازی:- مگر گونگے بھی تو ہاتھ منہ کے اشارے سے کچھ باتیں کر لیتے ہیں۔ یہ تو بس۔

مرزا کوچک سلطان:- رازی بیٹا۔ ان کو گونگے ہی نہ سمجھو۔ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ ماہر ہیں اپنے کام میں۔ ان کا استاد سنگ تراشی میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔

رازی:- وہی جو ہماری پرانی حویلی میں اترا ہوا ہے۔

مرزا کوچک سلطان:- ہاں وہی۔ وہ ان کا استاد ہے۔

رازی:- ابا۔ آپ ہمیں باغ میں لے آتے ہیں مگر حویلی میں نہیں لے جاتے۔ کہتے ہیں وہ کچھ رات کو بناتا رہتا ہے حویلی میں اور دن بھر سوتا رہتا ہے عجیب قسم کا آدمی ہے وہ بھی

مرزا کوچک سلطان:- کون کہتا ہے؟

رازی:- ہم نے داروغہ سے پوچھا تھا کہ یہ بوڑھا دن بھر تو سویا رہتا ہے اور تم کہتے ہو ابا نے اس کو کسی کام پہ لگا رکھا ہے۔ یہ بات کیا ہے۔ تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ رات کو کام کرتا ہے دن کو سوتا ہے۔ اور اسے یہاں آئے کتنے ہی مہینے ہو گئے ہیں۔
ابا۔ یہ جاتا کیوں نہیں؟

مرزا کوچک سلطان:- بس کل تک اور یہاں ہے۔ پھر چلا جائے گا بیٹا۔

رازی:- وہ بناتا کیا رہتا ہے ابا۔

مرزا کوچک سلطان:- میں نے تمہیں کل بتایا نہیں تھا کہ اس چبوترے پہ ایک بت نصب کیا جائے گا۔

رازی:- جی بتایا تھا اور میں نے پوچھا تھا کہ بت کہاں ہے تو آپ نے کہا تھا آنے والا ہے۔

مرزا کوچک سلطان:- اوں ہوں۔ آنے والا نہیں۔ وہی بت تو وہ سنگ تراش بنا رہا ہے۔

رازی:- آپ نے مجھے نہیں دکھایا ابا جان وہ بت۔

مرزا کوچک سلطان:- کل دیکھ لینا۔ کل وہ اسی چبوترے پر نصب کر دیا جائے گا۔

رازی:- کل۔

مرزا کوچک سلطان:- ہاں کل۔

رازی :- مگر ہاں اَبّا ۔ یہ گونگے معمار چاندنی میں کیوں کام کرتے ہیں ۔ اِن کا استاد بھی رات بھر بُت بناتا ہے ۔

مرزا کوچک سلطان :- جیسا استاد ویسے شاگرد ۔

رازی :- لیکن یہ کام تو دن کی روشنی میں زیادہ اچھا ہو سکتا ہے مگر دن کو وہ کبھی اِدھر آتے بھی نہیں ۔

مرزا کوچک سلطان :- ہاں کچھ ایسا ہی ہے ۔ چھوڑو کوئی اور بات کرو ۔

رازی :- نہیں ابا مجھے بتاؤ ۔ وہ رات کو کیوں کام کرتے ہیں ۔ دن کو کیوں نہیں کرتے ۔

مرزا کوچک سلطان :- نہیں پگلے لڑکے ۔

رازی :- نہیں اَبّا ۔

مرزا کوچک سلطان :- (ٹھنڈی سانس بھر کر چاند کی طرف دیکھ کر) چاند سے پوچھو ۔ اِس چور کو سب حال معلوم ہے اِس کہانی کا ۔

رازی :- کس کہانی کا ۔

مرزا کوچک سلطان :- یہی کہ یہ لوگ رات کو چاندنی میں کیوں کام کرتے ہیں ۔

رازی :- ہماری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی ۔

مرزا کوچک سلطان :- یہاں بیٹھ جاؤ (بیٹھتے ہیں ۔ مرزا چاند کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے)

رازی :- آپ چاند کی طرف ٹکٹکی باندھے کیا دیکھ رہے ہیں ۔

مرزا کوچک سلطان :- رازی بیٹے چاند کے سفید ورق پہ وہ کہانی لکھی ہوئی ہے ۔ میں اُسے پڑھ رہا ہوں ۔

رازی :- (چاند کی طرف دیکھ کر، چاند پہ جو دھبہ سا پڑا ہوا ہے ۔ کیا یہی ہے وہ کہانی ۔

مرزا کوچک سلطان :- رازی بیٹے ۔ وہی تو بہت بڑا راز ہے ۔

رازی :- کس بات کا راز ۔

مرزا کوچک سلطان :- اُس کہانی کا ۔

رازی :- کس کی کہانی ہے وہ ؟

مرزا کوچک سلطان :- کیا بتاؤں تمھیں وہ کس کی کہانی ہے ۔ یوں سمجھ لو کہ بس چاند کی اپنی کہانی ہے ۔

رازی :- تو سنائیے پھر چاند کی کہانی ہم ضرور سنیں گے ۔

مرزا کوچک سلطان :- (چاند سے نظریں ہٹا کر) سنو بہت عرصے کی بات ہے کہ اس باغ اور اِس بارہ دری کا ایک مالک تھا ۔ یہاں اُس کی لڑکی رہا کرتی تھی ۔ بچاری کی ماں مر چکی تھی ۔ لڑکی اور لڑکی کے باپ دونوں کو فنونِ لطیفہ کا بہت شوق تھا ۔ اُس کا باپ بڑا امیر تھا اور چاہتا تھا کہ اُس کی لڑکی کی شادی بھی کسی نواب ہی سے ہو ۔

رازی :- مگر یہ باغ اور مکان تو ہمارے ہیں ۔

مرزا کوچک سلطان :- ہاں ہمارے ہیں لیکن بہت عرصہ ہوا ۔ اُن دنوں یہ باغ ہمارا نہ تھا ۔

رازی :- اچھا تو وہ امیر آدمی اپنی لڑکی کی شادی کسی نواب سے کرنا چاہتا تھا - بہت بڑا جاگیردار تھا وہ ؟

مرزا کوچک سلطان :- بہت بڑا جاگیردار تھا وہ - شاہی دربار تک اس کی رسائی تھی - خیر اس نے اپنی لڑکی کی شادی ایک نواب سے کردی جو عیاش تھا - جو شراب بہت پیتا تھا - جو دو بیویوں کو کھا چکا تھا - ایک زندہ تھی مگر بے اولاد - وہ اولاد چاہتا تھا مگر جب اس لڑکی سے بھی کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس نے اس سے بھی منہ پھیر لیا - وہ لڑکی بیمار رہنے لگی - پندرہ برس کے بعد اس کے ہاں بچہ ہوا مگر وہ خود چل بسی - اس کے مرنے کے بعد اس کے صندوقچے میں سے نواب کو ایک تحریر ملی جس میں لڑکی نے نواب کی سرد مہری، بدسلوکی اور اپنی تقدیر پر آنسو بہائے تھے اور آخر میں ایک اعتراف تھا - شادی سے پہلے کا ذکر ہے کہ یہ چاند اس باغ میں اسی طرح چمک رہا تھا -

(روشنی گل ہو جاتی ہے)

دوسرا منظر :-

چاروں طرف خاموشی ہے - باغ کا وہی حصہ - سنگ سیاہ کی ایک نصب شدہ نشست پر ایک خوبرو نوجوان بیٹھا چاند کو تک رہا ہے - یہ نوجوان نادر شابانی ہے - توختہ باغ میں سے گزرتا ہے - نادر شابانی چونکتا ہے -

نادر شابانی :- اس باغ میں انسان بھی ہیں -

توختہ :- (ٹھٹک کر) آپ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں -

نادر :- میں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہوں (چاند کی طرف اشارہ کرکے) چاند - درخشندہ - روشن چاند مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں مگر میں چاند بننا چاہتا ہوں -

توختہ :- (ہنس کر) مگر دیوانوں کو اس باغ میں آنے کی اجازت نہیں -

نادر :- اگر دیوانوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں تو پھر آپ کیوں کر آ دھمکے -

توختہ :- اشرافوں کی سی باتیں کیجئے آپ - میں سرکار والا تبار کا ملازم ہوں - آپ کو کس سے ملنا ہے ؟

نادر :- سرکار والا تبار کا ملازم - سرکار والا تبار کون ؟

توختہ :- اس باغ کے مالک اعلیٰ حضرت میر ہاشم

نادر :- (اٹھتے ہوئے) تو یہ باغ کسی کی ملکیت ہے - ہم تو سمجھے بیٹھے تھے کہ سرکاری ہے -

توختہ :- آپ کے سمجھنے کی کیا بات ہے - آپ تو اپنے آپ کو بھی چاند سمجھے بیٹھے ہیں - ہونہہ

نادر :- اعلیٰ حضرت میر ہاشم - نام کچھ آشنا سا معلوم ہوتا ہے -

توختہ :- بہت بڑے صاحب دولت ہیں یہاں کے - یہ علاقہ سارا اُن کا ہے - یہ باغ - یہ بارہ دری - وہ محل - بس اپنی تفریح کے لئے

بنا رکھا ہے۔ کبھی کبھی کچھ دنوں کے لئے یہاں آ جاتے ہیں۔ میں اُن کا رئیس الخدّام ہوں۔"

نادر: بہت خوب۔ تو اِس وقت وہ ہیں یہاں؟

توختہ: ابھی ابھی چاندنی کی سیر کو تشریف لے جائیں گے۔

نادر: چاندنی کی سیر کرتے ہیں۔ بڑے صاحبِ ذوق ہوئے پھر تو۔

توختہ: واہ! شاعری، مصوّری، موسیقی پہ تو وہ جان چھڑکتے ہیں۔ اور طرّہ یہ کہ خود بھی شوق فرماتے ہیں۔

نادر: ہوں۔ کس راستے سے گزریں گے۔

توختہ: اِسی راستے سے۔ میں بتا دوں گا آپ کو۔ ملنا چاہتے ہیں کیا آپ؟

نادر: جی ہاں۔ دل کچھ ایسے ہی کہہ رہا ہے۔

توختہ: مگر آپ ہیں کون؟

نادر: پوچھنا کیا ضرور ہے۔

توختہ: پھر بھی۔

نادر: کہہ دو۔ کوئی آیا ہے کہیں سے۔

توختہ: اوں ہوں۔ نام بتائیے صاحب مجھے دیر ہو رہی ہے پہلے ہی۔

نادر: نادر شابانی۔ کیا بعید ہے مجھے جانتے ہی ہوں۔

توختہ: نادر شابانی۔ (جاتا ہے)

نادر: (ٹہلتا ہے) میرے پاؤں کا چکر نجانے مجھے کہاں لے جائے۔ یہ آوارہ طبیعت۔ الٰہی توبہ۔ اِن صاحبِ ثروت لوگوں سے مل کر طبیعت ہمیشہ بیزار ہوتی رہتی ہے۔ مگر میر ہاشم۔ اِس نام میں کچھ کشش سی معلوم ہوتی ہے۔ یہ نام جیسے سنا ہوا ہو۔ سنگِ سیاہ کی نشست پر بیٹھتا ہے)

توختہ: (آکر جلدی سے) اٹھئے اٹھئے۔ اعلیٰ حضرت تشریف لا رہے ہیں (نادر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ میر ہاشم اور علی خواجہ آتے ہیں۔ میر ہاشم کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے پھولوں کا گچھا ہے۔ توختہ اُن کے پیچھے چلا جاتا ہے)

(نادر جھک کر کورنش بجا لاتا ہے)

میر ہاشم: آپ ہیں نادر شابانی؟

نادر: حضورِ والا۔

میر ہاشم: ہم ایک نادر شابانی کو جانتے ہیں جو مصوّر ہے۔

نادر: یہی ناچیز ہے وہ۔

میر ہاشم: خوب! توختہ نے جب آپ کا نام لیا تو ہمیں یونہی خیال آیا کہ شاید آپ وہ مصوّر نادر شابانی ہی ہوں۔ مگر پھر ہم نے کہا۔ بھلا آپ کا کیا

کام اِس دورافتادہ مقام پر۔

نادر :۔ جی میں وہی نادر شابانی ہوں مگر حضور اِس ناچیز کو کیونکر جانتے ہیں۔

میر ہاشم :۔ (مسکرا کر علی خواجہ کی طرف دیکھتا ہے) لو اب جواب دو اِس سوال کا علی خواجہ (علی خواجہ جواب میں صرف مسکرا دیتا ہے) یہ ہمارے مصاحب ہیں۔ علی خواجہ صاحب۔ بڑے عالم۔ بڑے ظریف۔ بڑی بڑی سنجیدہ باتیں ہلکے پھلکے الفاظ میں یوں بیان کر جاتے ہیں کہ ان کے ایک ایک لفظ کی داد دینی پڑتی ہے ہمیں۔

نادر :۔ بہت خوب۔ جادو بیانی بھی ایک نعمت ہے۔ مگر جسے خدا دے۔

علی خواجہ :۔ صاحبزادے! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو خود مصوری کا بہت شوق ہے کسی مصور کی بنی ہوئی تصویر ہو۔ سن لیں کہ کہیں ہے۔ سات تہوں میں ہو جب تک حاصل نہ کر لیں گے چین نہیں آئے گا سرکار کو۔

نادر :۔ جی مجھے ابھی توختہ سے معلوم ہوئی تھی یہ بات کہ سرکار والا کو فنونِ لطیفہ کا بہت شوق ہے۔

میر ہاشم :۔ (پیچھے مڑ کر) ارے توختہ تو ہمارے شوق کا اچھا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے (توختہ خفیف سی احمقانہ ہنسی ہنستا ہے جس میں اعتراف اور معذرت کی آمیزش ہے)

علی خواجہ :۔ تو مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے پاس جہاں مشہور عالم مصوروں کے شاہکار پڑے ہیں وہاں غیر معروف مصوروں کی ادھوری تصویریں بھی موجود ہیں جو اُن کی ناپختہ کاری کی غمازی کرتی ہیں اور پھر سرکارِ والا کے شوق نے ایک اور دلچسپ کروٹ لی ہے۔ مصور کی اُس تصویر کا جو اُس نے عوام کے سامنے پہلے پہل پیش کی ہو اُس کی دوسری تصویر سے مقابلہ کرتے ہیں۔ پھر دوسری تصویر کا تیسری سے اور یہ دیکھتے ہیں کہ اُس نے فن میں کتنی ترقی کی ہے۔

نادر :۔ بہت ٹیڑھا کام ہے یہ۔

علی خواجہ :۔ بہت۔ مگر اپنا اپنا شوق ہے اور بعض دفعہ تو آپ تصویر سامنے رکھ کر مصور کی فنی خوبیوں اور برائیوں کی ایسی ایسی دلچسپ تعبیریں کرتے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتیں۔

میر ہاشم :۔ (ہنستا ہے اور ہاتھ میں لئے ہوئے پھولوں کو سونگھتا ہے)

علی خواجہ :۔ غلام نے غلط عرض کیا؟

میر ہاشم :۔ ہرگز نہیں۔

علی خواجہ :۔ مثلاً واسدیو کی پہلی تصویر "زنگیلا شہزادہ" کو دیکھ کر حضور نے فرمایا تھا کہ واسدیو جسمانی خدوخال کے اظہار میں ماہر معلوم نہیں ہوتا مگر ہمیں یقین ہے کہ وہ ایک دن زنگوں کا بادشاہ ہو گا۔

نادر :۔ اور اِس میں کیا شک ہے کہ ہم لوگ اُسے زنگوں کا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔

میر ہاشم :۔ ہمیں آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے نادر شابانی۔

نادر :۔ اور جتنی مجھے ہوئی ہے حضورِ والا۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ معاف فرمائیے کہ آپ چاندنی کی سیر کو جا رہے تھے۔ میں مخل ہوا۔

میر ہاشم :- ہم سیر بھول گئے ہیں فی الحال۔ کتنی پیاری چاندنی ہے۔ توختہ ماہ رُخ کو گانے کے لئے حاضر کرو۔

توختہ :- بہتر سرکار۔

میر ہاشم :- ماہ رُخ کے گانے سے آپ ضرور محظوظ ہوں گے۔

نادر :- طبیعت نے جو حظ حضور پُر نور کی ملاقات سے اُٹھایا ہے وہ بیان نہیں ہو سکتا۔

میر ہاشم :- ذرا بیٹھ جائیں۔ کیوں علی خواجہ؟ کتنی پیاری چاندنی ہے۔

علی خواجہ :- بجا ارشادِ عالی۔

میر ہاشم :- بیٹھ جائیے نادر شابانی۔ تکلف برطرف۔ (میر ہاشم اور علی خواجہ ایک نشست پر بیٹھتے ہیں جو پہلے سے آراستہ ہے۔ سامنے کی نشست پر نادر۔ ماہ رُخ داخل ہو کر آداب بجا لاتی ہے۔ گاتی ہے)

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد
سر من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد
ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد
بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم بہ چہ کار خواہی آمد
کششے کہ عشق دارد نگزاردت بدیں ساں
بہ جنازہ گر نیائی بہ مزار خواہی آمد
بہ یک آمدن ربودی دل و دین و جانِ خسرو
چہ شود اگر بدیں ساں دو سہ بار خواہی آمد

(ماہ رُخ جاتی ہے۔ توختہ ایک سینی میں قہوہ کی تین پیالیاں لاتا ہے اور میر ہاشم کے سامنے پیش کرتا ہے وہ توختہ کو اشارہ کرتا ہے کہ پہلے نادر شابانی کو دو)

نادر : پہلے حضور۔

میر ہاشم : (پیالی اٹھاتا ہے۔ پھر نادر شابانی۔ پھر علی خواجہ توختہ خالی سینی لے کر پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے) ہاں تو کیا بات ہو رہی تھی وہ مصوری کے متعلق علی خواجہ۔

علی خواجہ : میں ان سے کہہ رہا تھا کہ حضور انور مصور کی تصویر سے اُس کی ذہنی کیفیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے دماغی رجحانات اور ارتقائی امکانات کے سلسلہ میں بہت دلچسپ امور کا اظہار فرمایا کرتے ہیں۔ مثلاً مشہدی کے متعلق سرکار کا خیال ہے وہ شاعر زیادہ ہے اور مصور کم۔

نادر :- آپ معاف فرمائیں خواجہ صاحب تو میں کچھ عرض کروں۔

علی خواجہ : کہئے۔ کہئے۔

نادر :- اِس میں شک نہیں کہ آپ نے بہت کام کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں مگر میرا سوال جوں کا توں ہے۔

علی خواجہ : کیا؟

نادر : کہ اعلیٰ حضرت مجھ ناچیز کو کیونکر جانتے ہیں؟

علی خواجہ: میں اس سوال کے جواب کی طرف آ رہا ہوں۔

نادر: تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔

علی خواجہ: آپ کی چار تصویریں اعلیٰ حضرت کے پاس موجود ہیں۔ (قہوہ کا گھونٹ پیتا ہے)

نادر: واللہ۔ میری چار تصویریں۔ اس عزت افزائی پر میں جس قدر ناز کروں کم ہے۔ خواہ اُن کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ آپ کی نظر میں۔ تاہم اُن کا آپ جیسے نقاد کے پاس موجود ہونا بڑے فخر کی بات ہے۔

میر ہاشم: (ہنس کر) یہ بھی اچھی کہی آپ نے (نادر شابانی ایک گھونٹ پیتا ہے علی خواجہ بات شروع کرتا ہے)

علی خواجہ: اگر اعلیٰ حضرت اجازت فرمائیں تو بتا دوں نادر شابانی کو آپ کی رائے —؟

میر ہاشم: ہاں ہاں ضرور۔

علی خواجہ: میاں صاحبزادے۔ آپ کی تصویروں کے متعلق اعلیٰ حضرت کی جو رائے ہے وہ تفصیل کے ساتھ خود ارشاد فرمائیں گے لیکن میں اتنا بتا دوں کہ انہوں نے آپ کی پہلی تصویر دیکھ کر کہا تھا کہ مصور ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپ کی باقی تین تصویروں کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں افسوس ہوا تھا کہ آپ وہیں کے وہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ زاویوں اور خطوط میں ترقی تھی مگر مجموعی طور پر بھی آپ تصویر میں وہ بات پیدا نہیں کر سکے جو کامیاب تصویروں میں ہوتی ہے۔ ہاں آپ کی پہلی تصویر "آوارہ فقیر" کے متعلق اعلیٰ حضرت کی رائے اچھی تھی۔ اگرچہ میں نے اسے اتنا پسند نہیں کیا تھا۔

نادر: جی۔

میر ہاشم: اور اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مصور خود آوارہ اور من موجی سا ہے۔ برا نہ ماننا نادر شابانی۔

نادر: ہرگز نہیں۔ مجھے تو سرکارِ والا کی ذہانت پر حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے وہ تصویر آوارگی اور غربت سے تنگ آ کر بنائی تھی۔

میر ہاشم: (خفیف قہقہہ) — خوب، اس میں ایک سچی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ورنہ وہ گہرائی تصویر میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ (گھونٹ پی کر) آپ نے برا تو نہیں مانا جب علی خواجہ نے کہا کہ آپ کی باقی تین تصویریں دیکھ کر ہمیں مایوسی ہوئی تھی۔

نادر: قطعاً نہیں سرکارِ والا۔ مجھے تو اپنی پہلی تصویر کی صحیح داد آج ہی ملی ہے۔ اور آپ اگر میری باقی تین تصویروں کو جلا کر راکھ کر دیں تو مجھے ملال نہ ہوگا۔ دنیا میں کون ہے ایسا قدر دان جو تصویر دیکھ کر مصور کو اس بات کی داد دے جو اُس کی ظاہری سطح کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ اتنی بصیرت کسے نصیب؟ (علی خواجہ اس دوران میں وقفوں کے ساتھ قہوہ پیتا رہتا ہے)

میر ہاشم: تو آپ کے دل میں اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ باقی تین تصویروں کو دیکھ کر ہمیں مایوسی کیوں ہوئی؟

نادر: میرے منہ کی بات چھین لی حضور نے۔

میر ہاشم: بھئی ہماری نکتہ چینی ناگوار نہ گزرے تو۔

نادر: قطعاً نہیں حضورِ والا۔ نکتہ چینی اور صحیح تنقید سے تعمیری پہلو نکل آتے ہیں بعض دفعہ۔ آپ بصد شوق فرمائیں جو چاہیں۔ یہ ناچیز تو

ابھی ایک نومشق مصوّر ہے ۔

میر ہاشم :۔ اس میں شک نہیں، جیسے علی خواجہ نے کہا ہے کہ "آوارہ فقیر" کے بعد کی تین تصویروں میں رنگوں کی آمیزش زیادہ نکھری ہوئی اور زیادہ خوشگوار ہے ۔ خطوط اور زاویوں کی نمائش پہلی تصویر کی نسبت زیادہ صحتمند ہے ۔ مگر نادر شابانی ۔۔۔ فنِ مصوّری کے صرف یہی دو ستون نہیں ۔ بلکہ ایک تیسرا ستون جو زیادہ اہم اور زیادہ کارآمد ہے وہ مصوّر کا اپنا جذبہ ہے ۔ اُس کے تخیل کی جولانی ہے جو استر کاری کی جان سمجھی جاتی ہے ۔

نادر : دریں چہ شک ۔

میر ہاشم :۔ پیالی توختہ کی طرف بڑھاتا ہے جو سینی پیش کرتا ہے ۔ پھر علی خواجہ اور نادر شابانی بھی اپنی اپنی پیالی سینی میں رکھ دیتے ہیں توختہ جاتا ہے ۔ اُٹھتے ہوئے) اب آپ اپنی تصویر "لیلیٰ" کو دیکھئے ۔ یہ صحیح ہے کہ عورت نازو ادا میں اپنے سر کو ایک دلربایانہ جنبش دیتی ہے جو آپ کی تصویر میں ظاہر ہے ۔ آپ کی "لیلیٰ" نے اپنے دوپٹہ کا تھوڑا سا آنچل اپنے ہاتھ میں اٹھا رکھا ہے ۔ یہ بھی جائز ہے ۔ اُس کی غزالی آنکھوں کی خوابناک پلکوں کا جو ہلکا سا سایہ اُس کے گلابی رخساروں پر پڑ رہا ہے یہ بھی برحق ہے ۔ تو آپ پوچھیں گے کہ پھر اُس تصویر میں کیا نہیں ۔ ہم کہیں گے وہ کیا نہیں ہی سب کچھ ہوتا ہے ۔

علی خواجہ : اور وہ کیا نہیں گویا زندگی کا وہ پھول ہے جو ہمیں بہزاد اور بساوں کے ہاں ملتا ہے ۔

نادر : بیشک ۔

میر ہاشم : دیکھئے نادر شابانی ۔ آپ نے اپنی "لیلیٰ" کو سبک اور نفیس کپڑے پہنا دیئے اس کے بالوں کی لٹوں کو آبنوسی رنگ دیدیا لیکن اُس کے بدن میں جوانی کا وہ خونِ صالح کہاں ہے جو ولولوں کو ابھارتا ہے، شوق کو جنم دیتا ہے اور جس سے زندگی کی دھڑکن محسوس ہونے لگتی ہے ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے اگر میں اُس کی گردن پر ہاتھ رکھ دوں گا تو وہ سنگ مرمر کی طرح سرد ہوگی ۔ مصور کو اپنی تصویر میں زندگی کے گرم گرم سانس کو قید کرنا ہوتا ہے ۔

علی خواجہ : میاں صاحبزادے ! آپ نے تصویر میں ایک ایسی چیز پیش کر دی ہے جو شکل و شباہت سے عورت معلوم ہوتی ہے ۔ آپ کا یہ سمجھ لینا قرینِ دانش نہیں کہ آپ کا فن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے ۔

میر ہاشم : آپ لوگ عورت دیکھے بغیر اُس کی تصویر بنا دیتے ہیں ۔

نادر :۔ اِس میں کلام ہے مجھے ۔ حضور کا یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ میں نے عورت نہیں دیکھی ۔

علی خواجہ :۔ اعلیٰ حضرت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہاتھ غیر شعوری طور پر ملتا جلتا وہی نقش اتار لیتا ہے جس کا مطالعہ آپ نے صرف اپنے استاد کے نگار خانے میں کیا ہوتا ہے ۔ آپ نہیں جانتے کہ مصور فطرت کا غلام نہیں آقا بھی ہے ۔

نادر :۔ بے شک ۔

میر ہاشم :۔ بے شک تو آپ نے کہہ دیا مگر یہ بھی خیال فرمایا کہ فن اور فطرت پر یہ فتح کیونکر پائی جا سکتی ہے ۔ فن کی الہامی عظمت کہاں پوشیدہ ہے (سینہ پر ہاتھ رکھ کر) یہاں ۔ اِن پسلیوں کے اوپر ۔ اِس کو کہتے ہیں ۔ مگر فن کار کی طبیعت میں گداز اور اُس کے قلب میں سوز کب

پیدا ہوتا ہے۔ جب کائنات سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتی ہے جب ذہن اور عقل کی باگیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ کہاں سے کہاں جا نکلے۔ لاحول ولا۔

علی خواجہ :۔ میاں صاحبزادے کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟

نادر :۔ مجھے اعلیٰ حضرت کی قابلیت اور آپ کی فنِ مصوری سے اس درجہ واقفیت پر تعجب ہو رہا ہے۔ میں یوں سمجھ رہا ہوں کہ آج مصوری کے بہت بڑے نقاد اور استاد سے ملاقات ہوئی ہے گویا۔ اس بندۂ ناچیز کو بعض صاحبانِ دولت و ثروت سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے مگر صرف دنیوی دولت کے سوا میں نے اُن کے پاس کچھ نہیں دیکھا اور سرکار والا کو تو خدا نے علم و فن کی دولت سے بھی مالا مال کر دیا ہے۔

علی خواجہ :۔ مگر صاحبزادے۔ اعلیٰ حضرت نے جو بلیغ اشارے کئے انھیں سمجھے بھی؟

نادر :۔ میں سمجھتا ہوں اُن کی باتیں خیال افروز بھی ہیں اور اچھوتی بھی۔

میر ہاشم :۔ (ہنس کر) ہاں اچھوتی بھی اور پرانی بھی کیونکہ آپ کے جذبے ابھی نادان ہیں۔ آپ کی "لیلیٰ" دیکھ کر ہمیں تو یہ محسوس ہوا تھا کہ آپ کے ہاتھوں نے کبھی عورت کو چھوا نہیں۔ جیسے علی خواجہ نے ابھی کہا کہ استاد کے نگار خانے کی عورت سے ملتا جلتا نقش بنانا اور چیز ہے اور کسی چلتی پھرتی چنچل سندری کے گداز بدن کو محبت میں ڈوب کر چھونا اور پھر اُس کا نقش بنانا اور چیز ہے۔ آپ کی باقی تصویروں میں بھی ہمیں یہی خامی نظر آتی ہے۔

علی خواجہ :۔ اب سمجھے صاحبزادے۔ اعلیٰ حضرت کا مطلب ہے کہ دل پر پہلے چوٹ کھاؤ پھر کائنات پر نگاہ ڈالو۔ ہر چیز میں محبت کا سوز و گداز اور حسن کی جاذبیت نظر آئے گی۔ تمہاری "لیلیٰ" اور باقی تصویروں کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے یہی بات فرمائی تھی کہ نادر شاہانی اس عالمگیر جذبے سے عاری معلوم ہوتا ہے کیوں سرکار والا میں نے بجا عرض کیا نا؟

میر ہاشم :۔ ہاں علی خواجہ ہم نے یہی کہا تھا کہ نادر شاہانی کے فن کو سہارے کی ضرورت ہے۔ جب اُس کا دل ڈوبے گا اُس کا فن ابھرے گا۔

علی خواجہ :۔ (ہنس کر) اب تو اعلےٰ حضرت کی بات اچھوتی نہیں صاحبزادے۔

نادر :۔ مجھے اعلےٰ حضرت سے پورا پورا اتفاق ہے۔

میر ہاشم :۔ گویا آپ مانتے ہیں کہ آپ کا دل سُونا پڑا ہے اور عشق کے سوزاں و تپاں شعلے سے آپ کو سینک تک میسر نہیں آئی۔

نادر :۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔

میر ہاشم :۔ (قہقہہ) آہاہا (پھولوں کے گچھے کو ذرا گھما کر) علی خواجہ ہمیں آج بہت کامیابی ہوئی ہے۔ ہم بہت خوش ہیں کہ ہمارے اندازے صحیح نکلے۔ دیکھا تم نے؟

علی خواجہ :۔ جی ہاں

میر ہاشم :۔ ہم نہ کہتے تھے کہ "لیلیٰ" بنانے والا مصور عشق کے بے چین شعلے سے محروم ہے۔ اُس کے فن کو سہارے کی ضرورت ہے۔

علی خواجہ :۔ جی ہاں سرکار والا۔

میر ہاشم :- نادر شابانی۔ اپنے دل پر کہیں سے محبت کی چوٹ کھاؤ۔ اپنی رنگ کی پیالیوں میں آرزوؤں کی دنیا آباد کرو۔ پھر دیکھو قلم کے ایک ایک بال سے پکار نکلے گی۔

نادر :- مجھے آج یقیناً بہت بڑے استاد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

میر ہاشم :- علی خواجہ۔ ہم نے اس وقت تک نادر شابانی سے اُن کے یہاں آنے کا مقصد تک نہیں پوچھا۔

علی خواجہ :- جی ہاں حضور۔ باتیں ہی کچھ اس طرح چھڑیں کہ . . . . .

میر ہاشم :- ہوش نہیں رہا۔ (ہنس کر نادر شابانی کے قریب آکر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر) نادر شابانی سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کی تصویروں میں آپ کا مستقبل بہت روشن نظر آتا ہے۔

علی خواجہ :- (مذاق سے) بشرطیکہ کہیں سے سوز و گداز کی چنگاری حاصل کر لیں۔

میر ہاشم :- علی خواجہ عشق کی چنگاری نہیں ہوتی۔ عشق تو ایک بے چین شعلہ ہے۔ ہاں تو آنا کیسے ہوا آپ کا یہاں؟ (پھولوں کا گچھا نادر شابانی کو دے دیتا ہے۔)

نادر :- کیا عرض کروں۔ سیلانی طبیعت کی آوارگی۔ اِن سبزہ زاروں کی کشش، دل کی ایک موہوم سی پیاس۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کس مقصد کے لئے پھر رہا ہوں۔

میر ہاشم :- یہی بڑے مصور ہونے کی دلیل ہے۔ ہم پرسوں یہاں سے واپس جا رہے ہیں۔ سردست آپ پرسوں صبح تک ہمارے مہمان رہئے اور اُس کے بعد پھر آپ کو ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔

نادر :- ہزار بار شکریہ اگر آپ حضور اِس آوارہ پر یہ پابندی عائد نہ کیجئے۔ میں نکلا ہوں۔ تو مجھے آج یہاں کل وہاں۔ جی بھر کے پھر لینے دیجئے۔ یہ پاؤں کا چکر آخر کہیں تو رکے گا۔ میں خدمتِ عالی میں پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔

میر ہاشم :- آپ کی مرضی۔ مگر ہم تو چاندنی کی سیر کرنے کو نکلے تھے علی خواجہ!

علی خواجہ :- جی ہاں سرکار۔

میر ہاشم :- تو آئیے پھر گھوم آئیں ذرا۔ آئیے نادر شابانی۔

علی خواجہ اور نادر :- چلئے حضور۔

میر ہاشم : (چلتے چلتے رک کر) کتنی پیاری چاندنی ہے۔ وہ دیکھا آپ نے چاند کے سینے پر ضربِ کاری کا نشان ہے اس نشان کو ساری دنیا دیکھتی ہے۔ یہی حال شاعر اور مصور کا ہے اگر قلب پر جذباتی ہوئی پڑے تو ایک چوٹ ہی کافی ہے جس کی پکار کو ساری دنیا دیکھتی اور سنتی ہے (میر ہاشم آگے بڑھتا ہے۔ علی خواجہ بھی ساتھ ہے مگر نادر شابانی چاند کو تک رہا ہے) آئیے نادر شابانی۔ آپ کیوں ٹھہر گئے وہاں؟

نادر : مجھے اگر حضور والا معاف فرمائیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ چاند کو دیکھتے ہی ایک تصویر کا خیال ذہن میں گھومنے لگا۔

میر ہاشم :- او— بہت شوق سے۔ مگر تو خیر دیکھو آپ کے ٹھہرنے کا انتظام اُس کمرے میں ہو سکتا ہے۔ (میر ہاشم اور علی خواجہ جاتے ہیں)

توختہ بھی جاتا ہے۔ نادر شاید ایک لمحہ چاند کی طرف دیکھتا ہے پھر اپنی نشست پر آ بیٹھتا ہے اور چاند کی طرف دیکھتا رہتا ہے ۔

نادر :۔ ستارے مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ چاند میرے کان میں کیا گنگنا رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ان تاروں نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہے اور اس چاند نے میرا راستہ روک لیا ہے۔ میں یہاں سے ہل نہیں سکتا۔ میں خود یہاں نہیں بیٹھا مجھے کسی نے بٹھا دیا ہے گویا یہ چاند جیسے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہہ رہا ہے۔

(توختہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا آتا ہے)

توختہ :۔ کمرے میں ضروری سامان سب موجود ہے۔ آپ آرام فرما سکتے ہیں۔

نادر :۔ (جو چاند کی طرف دیکھ رہا ہے) خدایا کیا ہے یہ چلتا ہوا جادو (توختہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا گزر رہا ہے۔ مڑ کر نادر کو دیکھتا ہے اور دہشت زدہ ہو کر بھاگ جاتا ہے) اے چاند! تو کب تک اپنی چاندنی سے میری امیدوں کا کفن بنتا رہے گا۔ اے رات کے ساقی! میں کب تک شام کے دھندلکوں میں اداس اداس بھٹکتا رہوں گا۔ کب تک چاندنی راتوں کی سفیدی میں اپنی سیاہ بختی پر آنسو بہاتا رہوں گا۔ زندگی تو کہاں ہے؟ کیا محبت ہی اس درد کا علاج ہے۔ غلط۔ عبث۔ وہم۔ محبت کے بغیر بھی فن ترقی کر سکتا ہے۔ محبت کیا ہے۔ ایک بھیڑ چال۔ ایک احمقانہ لفظ میں اپنی سرتوڑ کوششوں سے اپنی شب و روز کی محنت سے مصوری میں جان ڈال دوں گا۔ جس مصور کے پاس وجدان۔ ذہنِ رسا اور تخیل کی جولانی ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔ اسے محبت کی دیوی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں۔ (چاند کو دیکھ کر) مگر تو۔ تو تو اے چاند ہنس رہا ہے۔ مجھے منہ چڑا رہا ہے (بارہ دری کی چھت پر ایک عورت سفید لباس میں نمودار ہوتی ہے۔ مصور کو دیکھتی ہے سیڑھیاں اترتی ہے) چاند کو پاؤں لگ گئے۔ اوں ہوں۔ میرا اپنا تصور میری خیالی تصویر (عورت سیڑھی پہ رک جاتی ہے) میری تصویر رک کیوں گئی۔ اتر۔ اتر (عورت اترتی ہے) چل (عورت چلتی ہے چند قدم پر رک جاتی ہے) رک کیوں گئی۔ چل۔ میں کہتا ہوں چل۔ عورت رکی کھڑی ہے۔ مصور آگے بڑھتا ہے۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اور متعجب ہو کر پیچھے ہٹتا ہے) اے حسینہ! تو کون ہے (وقفہ) چاندنی رات میں دودھ کے دھلے ہوئے لباس میں تو موتئے کا پھول معلوم ہو رہی ہے۔ بتا تو کون ہے؟

لڑکی :۔ مصور تو خود جان کہ میں کون ہوں۔ تو کیا سمجھ رہا ہے تجھے کیا معلوم ہو رہا ہے۔

نادر :۔ مجھے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ کہکشاں کے جھرمٹ کا کوئی مسکراتا ہوا ستارہ اتر آیا ہے۔ مگر ستارہ تو کوئی نہیں ٹوٹا۔ نہیں چاند خود آ گیا ہے (چاند کو دیکھ کر) نہیں نہیں چاند تو وہیں کھڑا ہنس رہا ہے شبستانِ گردوں کی کوئی حسینہ چاندنی کے نور کا باریک آنچل لئے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ تو کوئی حور ہے۔ پری ہے۔ مگر کھڑے ہونے کا یہ انداز۔ اترنے کا یہ بانکپن یہ پھبن۔ نہ حور میں ہو سکتی ہے نہ پری میں۔

لڑکی :۔ میں نہ حور ہوں نہ پری۔ نہ چاند سے اتری ہوں نہ ستاروں کے جھرمٹ سے آئی ہوں۔ اس دنیا کی رہنے والی آدم زاد ہوں۔

نادر :۔ مگر تم آدھی رات کو یہاں کیوں آئی ہو۔

لڑکی :۔ شاید چاند نے تمہاری دعا سن لی ہو۔ قدرت نے تمہاری پکار ——

نادر :- میں کیسا مصوّر ہوں - یہ بات بھلا پوچھنے کی تھی - (اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر آگے بڑھتا ہے) اے حسینہ مجھے تم سے محبت ہے مجھے مصوری کی ضرورت نہیں - مجھے جاہ و جلال اور شان و شوکت کی ہوس نہیں - تمہیں میری دولت تمہیں میری شہرت ہو - ان سے کہیں زیادہ کشش ہے تم میں - میرے مُو قلم توڑ دو - جاؤ میری تصویروں کو جلا دو - مجھے نقاشی اور مصوری سے کوئی سروکار نہیں ہے - میں نے پا لیا زندگی کا راز - پا لیا (دائیں گھٹنے کو زمین پہ ٹیک کر اُس کے آنچل کو اپنے ہاتھ میں پکڑتا ہے) میرا اصل کام تم سے محبت کرنا ہے - لاؤ میں تمہارے ہاتھ پر وہ بوسہ ثبت کر دوں جو کئی برسوں سے میرے ہونٹوں کے نیچے جل رہا ہے (ہاتھ پر بوسہ دیتا ہے) میں مصور نہیں ہوں - میں عاشق ہوں - مصوری پہ ہزار لعنت - میری جان و دل کی ملکہ تم ہو -

لڑکی : ملکہ - میں سچ مچ ملکہ ہوں - میری خاطر تم نے اس چیز کو بھلا دیا ہے جس کے متعلق باغ کے اس گوشے میں کیا کیا باتیں نہیں ہوئیں - تم نے اے مصوّر اُس چیز کو بھلا دیا ہے جسے تم فن کہتے تھے اور جو تمہیں سب دولتوں سے زیادہ عزیز تھا - تمہاری پونجی تمہارا فن تھا -

نادر :- میری ملکہ - میں نے اپنی پونجی تمہارے قدموں میں ڈال دی ہے اور وہ تمہارے قدموں میں اسی طرح جل رہی ہے جس طرح کسی دیوی کے سامنے لوبان اور صندل جلتا ہے -

لڑکی :- مجھے دیکھو اے مصوّر - کیا تم میری تصویر بنا سکتے ہو ؟

نادر :- تم تو خوبصورتی کا مجسمہ ہو - مکمل حسن ہو - کانٹے میں تلا ہوا - سانچے میں ڈھلا ہوا - تمہاری تصویر کون بنا سکتا ہے میری حسینہ - ان بہکی بہکی نگاہوں کا جادو - اس کندنی بدن کے دلآویز خطوط - ان اعضا کا لوچ رنگوں سے بالاتر ہے - تن کے سمندر میں یہ ڈولتی ہوئی جوانی مُو قلم کے بس کا روگ نہیں - مگر نہیں - میں بناؤں گا تمہاری تصویر اور مصوروں کا باپ بھی اس تصویر کا ثانی پیدا نہ کر سکے گا اس دنیا میں - مصوّر اُسے دیکھ کر اپنے مُو قلم توڑ دیں گے - رنگ کی پیالیاں پھوڑ دیں گے - اسٹر پھاڑ دیں گے اور رشک سے جل مریں گے - آؤ پل بھر کے لئے اس سنگِ سیاہ کی نشست پہ بیٹھ جاؤ - تمہاری موجودگی سے ہر چیز دودھ میں نہائی کھڑی ہے (نشست کی طرف بڑھتے ہیں)

لڑکی :- مگر میں تو خود آج ایک سحر محسوس کر رہی ہوں - ان درختوں کی سرسراہٹ میں جو آج تک نہ سنا تھا اب سن رہی ہوں -

نادر :- (اُسے نشست پہ بٹھاتے ہوئے) صرف تمہاری موجودگی نے قدرت کے ان نظاروں میں شعریت کا رنگ بھر دیا ہے (خود اُس کے قریب زمین پہ بیٹھتا ہے) جو ستارے بجھے سوئے سوئے اور الجھے ہوئے نظر آتے تھے اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگڑائیاں لیتے ہوئے بیدار ہو رہے ہیں -

لڑکی :- ستارے تو رات بھر جاگتے اور چاند کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں - تمہاری روح کی محبوب تاروں میں کوئی خوابیدہ نغمہ بیدار ہوا ہو گا -

نادر :- نہیں حسینہ - کہکشاں کے بربط پہ چاندنی کی اس ٹھنڈی خاموشی میں محبت کا نغمہ گایا ہے تم نے - جس نے میرے روئیں روئیں میں غمِ عشق بیدار کر دیا ہے - تمہارا یہ احسان میں کس طرح بھول سکوں گا - دور آسمان پر تارے مسکرا رہے ہیں - چاند کی اس ٹھنڈی دنیا میں ہوا کے اندر ایک نیند سی رچی ہوئی ہے - میں چاہتا ہوں کہ تمام دنیا اسی طرح سوئی رہے اور یہ رات ایک مسلسل رات بن جائے - کیا دنیا کا کبھی ایسا نظام نہ ہو گا - جہاں مرد اور عورت تاروں کی چھاؤں میں اکٹھے رہ سکیں -

لڑکی :- تاروں سے بھرے ہوئے آسمان سے زیادہ روشن اور زیادہ خوب صورت دنیا کے دروازے تمہارے انتظار میں کھلے ہیں۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اگر کبھی کبھی زندگی بھی کس قدر خوشگوار ہو جاتی ہے ۔ جی چاہتا ہے کہ خود کو اس کے چنچل دھارے پر چھوڑ دیں ——

نادر :- اور بہائے جائے وہ جدھر چاہے ۔

لڑکی :- (آنکھیں بند کر کے) ہاں جدھر جی چاہے، دنیا ساکت ہو جائے ۔ کان گنگ، آنکھیں بند ۔ کچھ سنائی نہ دے ۔

نادر :- اور کائنات کا پتا پتا سو جائے اور صرف دو دلوں کی دھڑکن گونجتی رہے (پھولوں کا گچھا پیش کرتے ہوئے) ان دو پھولوں کی طرح ۔ دیکھو ان میں کتنی خوشبو ہے (لڑکی گچھا لیتی ہے مصور ہاتھ پکڑ کر) تمہاری انگلیاں کتنی خوب صورت ہیں ۔

لڑکی :- مگر تمہاری "لیلیٰ" کی انگلیوں جیسی تو نہیں ۔

نادر :- میری لیلیٰ ۔ کون میری لیلیٰ ۔

لڑکی :- جس کی تصویر تم نے بنائی تھی ۔

نادر :- (ہاتھ چھوڑ کر حیرت سے) تمہیں کس نے بتایا ۔

لڑکی :- میں نے خود دیکھی ہے ۔

نادر :- تم نے ۔

لڑکی :- میرے کمرے میں لٹکی ہوئی ہے ۔

نادر :- تمہارے کمرے میں ۔

لڑکی :- ہاں میرے کمرے میں ۔ اس کی تعریف سن سن کر مجھے اس کے بنانے والے سے —— اور قدرت تمہیں یہاں لے آئی ۔

نادر :- کیا تم یہاں رہتی ہو ۔ یہ کیا معمہ ہے ۔

لڑکی :- کچھ معمہ نہیں ۔ میں اعلیٰ حضرت میر ہاشم کی سب سے چھوٹی لڑکی ہوں ۔

نادر :- (حیرت) ایں !!!

لڑکی :- اور ان کی سب سے چھوٹی بیگم کی آخری اولاد ہوں ۔ اس لئے انھیں مجھ سے بہت پیار ہے مجھے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں ۔ ہم پرسوں اس شکارگاہ سے واپس جانے والے ہیں کیونکہ انہوں نے میری شادی ٹھہرا رکھی ہے ۔

نادر :- شادی کس کے ساتھ ۔

لڑکی :- ایک دولتمند عیاش کے ساتھ جو پشتینی رئیس ہے جو اپنی دو بیویاں کھا چکا ہے اور بے حد شراب پیتا ہے ۔ مگر اس کے ساتھ میں شادی نہیں کروں گی ۔

نادر :- وہ ہرگز تمہارے قابل نہیں ۔ مجھے تم سے محبت ہے اے حسینہ ۔ آؤ ہم اپنی دنیا بسا لیں ۔

لڑکی :- کہاں ؟

نادر :- جہاں چاند کی ایسی ہی ٹھنڈی دنیا ہو ۔ جہاں ہوا کے اندر ایسی ہی رچی ہوئی نیند ہو ۔

(نظر چاند پر پڑتی ہے اگر چاند کا چہرہ کیوں پھیکا پڑ گیا۔

لڑکی :۔ کیا تم دیوانے ہو۔

نادر :۔ تمہارا نام ؟

لڑکی :۔ دردانہ۔ مگر تمہارے لئے نادرہ ہوں۔ میں کہتی ہوں اعلیٰ حضرت کے آنے سے پہلے پہلے یہاں سے ہم ——

نادر :۔ ہرگز نہیں ہو سکتا یہ۔ نادر شابانی اعلےٰ حضرت سے دغا کرے۔ ہرگز نہیں۔ دیکھو چاند کانپ رہا ہے۔

لڑکی :۔ تم بزدل ہو۔ آخر مصوّر ہو۔ سپاہی نہیں۔

نادر :۔ (آواز میں نرمی) دردانہ۔ میری نادرہ۔ میں اعلیٰ حضرت کی باعزت اور پر وقار زندگی پہ یہ دھبہ نہیں لگانا چاہتا کہ اُن کی لڑکی ایک قلاش مصوّر کے ساتھ بھاگ جائے جس کو انہوں نے ایک رات کے لیے اپنی شکارگاہ میں پناہ دی ہے۔ دنیا مجھے ذلیل کہے گی۔ میں مرد ہوں آخر۔ میری عقل نہیں مانتی کہ میں اعلیٰ حضرت کا بڑھاپا خراب کروں۔ وہ بڑا عالم ہے۔ استادوں کا استاد۔ میں نے آج اُس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

لڑکی :۔ مگر نادر شابانی .....

نادر :۔ خاموش نادرہ۔ محبت کی دنیا میں خاموشی کی حکومت ہے۔ اس تاروں بھرے آسمان کو دیکھو جو ہر صبح اپنا خزانہ لٹا کر بھی خاموش رہتا ہے۔ تیرے ارادوں کی تصویر میرے دل میں اتر گئی ہے۔ دیکھا چاند نے اپنا منہ ڈھک لیا ہے۔ تو بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے ایک پشتینی امیر کی دلہن بننے والی ہے اور میں صرف ایک مصوّر ہوں۔ سیلانی مزاج اور قلاش۔ جاؤ تمہارا اپنا گھر تمہیں مبارک۔ میں تمہارے قابل نہیں۔ مگر یہ لمحہ بھر کی محبت میری زندگانی کا ماحصل۔ میری محبت کا صلہ...

لڑکی :۔ تم پچھتاؤ گے نادر۔ یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

نادر :۔ نہ آئے۔ تمہاری یاد تو آئے گی۔ مصوّر کے لئے وہی کافی ہے۔

لڑکی :۔ مگر تم پہلے عاشق تھے پھر مصوّر۔ کیوں ؟

نادر :۔ اسی لئے تو قربانی دے رہا ہوں کہ میں پہلے عاشق ہوں پھر مصوّر۔ عشق کا دیوتا سب سے پہلے قربانی مانگتا ہے۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو قربانی دو۔ باپ کی عزت بنی رہنے دو۔ اپنے بننے والے خاوند کا گھر روشن کرو۔ دیکھو۔ دیکھو چاند بدلی سے نکل آیا۔ پھر روشنی ہو گئی۔ اسی طرح ہاں اسی طرح اُس کے گھر میں روشنی ہو جائے گی۔

لڑکی :۔ مگر میں تمہیں نہیں بھول سکوں گی۔

نادر :۔ جب یاد آؤں تو اس چاند کی طرف دیکھ لینا۔ میری آنکھیں اپنے اس رازدار پر جمی رہیں گی اب۔ اب اس کی بدولت چار ہوا کریں گی ہماری نظریں۔

لڑکی :۔ یہ شکارگاہ میں تمہیں دیدوں گی مصوّر۔ یہ میرے جہیز میں ملنے والی ہے۔

نادر :۔ دیکھا جائے گا۔ میں کہتا ہوں اعلیٰ حضرت نہ آجائیں کہیں۔ تم اب چلی جاؤ۔

لڑکی :۔ پہلے تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ میں بعد میں جاؤں گی۔

نادر :۔ اوں ہوں (اشارہ کرتا ہے زینے کی طرف) جس طرح اتری ہو اسی طرح چڑھ جاؤ سیڑھیاں میں اب ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہروں گا یہاں۔

لڑکی :۔ تو کہاں پھرو گے مارے مارے۔ صبح چلے جائیے خدا کے لئے۔ اعلیٰ حضرت کیا کہیں گے۔

نادر :۔ وہ مصور کی رگ رگ جانتے ہیں۔ تم جاؤ۔ میں کہتا ہوں جاؤ۔ جا بھی چکو (لڑکی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی آنسو پونچھتی ہے) یہ تمہارے آنسو نہیں نادرہ میری قسمت کے ستارے ہیں۔ مت پونچھو۔ انھیں بہنے دو۔ میری دیوانہ تمہیں دریگانہ بنا دوں گا میں میری نادرہ تو نادرہ روزگار بن جائے گی۔ جا خدا حافظ۔ (لڑکی چند سیڑھیاں چڑھتی ہے اور مڑ کر دیکھتی ہے) میری ایک رات کی رانی میں تیرے خوبصورت خیال کو اپنے دماغ میں پھولوں کی طرح سجا کے رکھوں گا۔ نہ گھبرا۔ نہ گھبرا۔ یہ کھیل یونہی کھیلا جانا تھا۔ (لڑکی چھت پر پہنچتی ہے۔ مڑ کر دیکھتی ہے پھر چاند کو) تو نہیں جانتی۔ اے بے ضرر سی لڑکی کتنی طاقت ہے تجھ میں جان کو روندنے کی۔ نہیں جانتی تو میرا موقلم سونا اگلے گا۔ میرے دل کا گداز میرے فن کی نزاکت سنگ خارا کا سینہ چیر دے گی۔ فن کی الہامی عظمت زندہ ہو جائے گی۔ تو زندہ ہو جائے گی۔ تو زندہ ہو جائے گی میری چاند کی دیوی۔

لڑکی :۔ (چھت پر سے) خدا حافظ (پھولوں کو چومتی ہے اور پھولوں والا ہاتھ اونچا کرتی ہے۔ خود آہستہ آہستہ اوجھل ہو جاتی ہے۔ صرف پھولوں والا ہاتھ نظر آتا ہے)

نادر :۔ محبت کے پھول مرجھا سکتے ہیں مگر فن کے پھول سدا بہار ہوتے ہیں (پھولوں والا ہاتھ اوجھل ہو جاتا ہے) چلی گئی۔ غم عشق بیدار کر کے چلی گئی۔ (چاند کی طرف دیکھ کر) کیا کہا تھا تم نے اعلیٰ حضرت چاند کے سینے پہ ضرب کاری کا نشان ہے۔ اس نشان کو ساری دنیا دیکھتی ہے۔

ماہ رُخ : (ماہ رخ خاموشی سے دھیمے دھیمے چور قدموں سے داخل ہوتی ہے۔ قریب آ کر) ساری دنیا دیکھتی ہے جو کچھ یہاں ہوا اس بندی نے دیکھا۔

نادر :۔ تم ؟

ماہ رُخ :۔ میرا نام ماہ رُخ ہے مگر میں چاند نہیں۔ کہتے ہیں میرا مکھڑا چاند کا سا ہے۔ مجھے دیکھو۔ کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ (نادر خاموش ہے) تمہارے کان چور سے گئے۔ سنتے نہیں۔ بولو۔ میں تمہیں اچھی نہیں لگتی ؟

نادر :۔ تم اچھی ہو۔

ماہ رُخ : صرف اچھی۔ تم نے اُس لڑکی کے حسن کی تو بہت تعریف کی ہے جو تم سے مل کر ابھی ابھی گئی ہے۔ جاگیردار کی بیٹی۔ اور میں صرف اچھی ہوں۔ سن تیرا راز میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہیں یوں پکڑوا سکتی ہوں یوں۔ سن رہے ہو؟

نادر :۔ سن رہا ہوں۔

ماہ رُخ :۔ میری آواز میں جادو ہے۔ میرے لفظوں میں شراب ہے۔ آؤ میں تمہیں زندگی کے قریب لے جاؤں۔ آؤ میں بھی تمہیں اپنا حُسن

دکھاؤں۔ پھر میں تمہیں اچھی لگوں گی۔ آؤ۔ نادر شاہانی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اُسے اندر لے جاتی ہے۔ پس منظر میں دھیمی موسیقی جس کے رک جانے پر اندر سے ایک نسوانی چیخ کی آواز آتی ہے۔ ایک لمحہ خاموشی رہتی ہے۔ پھر نادر شاہانی خون آلود خنجر ہاتھ میں لئے باہر آتا ہے۔ خون آلود خنجر کو رومال سے پونچھ کر کمر میں لٹکا لیتا ہے اور رومال کو اپنی جیب میں ڈال کر چپکے چپکے تیز قدموں سے چلا جاتا ہے۔ باغ کا یہ حصہ ایک لمحہ کے لیے خالی رہتا ہے پس منظر میں جھینگر بولنے کی آواز آتی ہے۔ میر ہاشم اور علی خواجہ داخل ہوتے ہیں)

علی خواجہ :۔ مصور تو سو گیا جا کر۔

میر ہاشم :۔ تھکا ہوا تھا بیچارہ۔ جانے کہاں کہاں سے پھرتا ہوا ادھر آنکلا تھا۔ ہم بھی تو بہت دور تک نکل گئے تھے سیر کرتے۔ کیوں علی خواجہ۔

علی خواجہ :۔ جی ہاں سرکار (چاند کو دیکھ کر) چاند بھی کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔

میر ہاشم :۔ چاند کا چہرہ زرد کیوں ہے۔

علی خواجہ : یہ بھی تھکا ہارا ہے۔ نجانے کب سے تاریکیوں کا بوجھ ڈھو رہا ہے۔

(توختہ گھبرایا ہوا ننگے سر داخل ہوتا ہے)

توختہ :۔ وہ بھاگ گیا سرکار۔

میر ہاشم :۔ کون بھاگ گیا۔

علی خواجہ : توختہ تم سر سے ننگے ہو۔

توختہ :۔ (اپنے بال نوچ کر) ماہ رُخ مری پڑی ہے سرکار۔ وہ۔ وہ۔ وہ مصور اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے۔

(علی خواجہ توختہ کے ساتھ بارہ دری کے اندر جاتا ہے۔ میر ہاشم سوچتا ہوا آہستہ آہستہ قدموں سے ٹہلتا ہے۔ علی خواجہ اور توختہ آتے ہیں۔ نوچے ہوئے بالوں پر توختہ نے بے دلی سے پگڑی رکھی ہوئی ہے)

علی خواجہ : ماہ رُخ کے برہنہ سینے پہ خنجر سے وار کیا گیا ہے۔ اس کی نعش خون سے لت پت پڑی ہے۔

(خاموشی کا وقفہ جس میں صرف جھینگر بولنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

میر ہاشم : ہم نے تیز اور تند چلنے والی نٹ کھٹ لڑکیوں کی موت اسی طرح ہوتی دیکھی ہے۔ وارثوں کو قصاص دے دیا جائے گا۔

(توختہ اپنی ایک انگلی سے اپنا آنسو پونچھتا ہے)

(روشنی گل ہو جاتی ہے)

تیسرا منظر :۔

(رزاق میرزا بارہ دری کے بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے دوسری جانب سے میر فرخ بیگ آتا ہوا اُسے ملتا ہے۔)

میر فرخ بیگ :۔ رزاق میرزا۔ کہاں جا رہے ہو تم اِس وقت۔

رزاق میرزا :- غالیچہ لینے جا رہا ہوں ۔

میر فرخ بیگ :- غالیچہ لینے ۔ کیوں ۔ غالیچے کا کیا کرنا ہے ؟

رزاق میرزا : پتا نہیں ۔ استاد علی آقا کا حکم ہے باغ میں غالیچہ بچھا دو بڑے استاد کو بیٹھنا ہے ۔

میر فرخ بیگ :- ٹھیک ہے آج چودھویں کا چاند ہے نا ۔ بڑے استاد ہمیشہ اِس چاندنی میں بیٹھا کرتے ہیں ۔

رزاق میرزا :- مگر بیماری کی حالت میں بھی ۔

میر فرخ بیگ :- کیا تمہیں علم نہیں بڑے استاد کہا کرتے ہیں کہ میری پچاس سال کی مصوری کا تعلق صرف چاند سے ہے اور پھر جب ان کا شاہکار چاند اور مصور" بادشاہ سلامت کے دربار میں پیش ہوا تھا اور انہوں نے بیس ہزار روپے میں اُسے خریدا تھا تو بڑے استاد کہتے تھے کہ یہ اُس کی آدھی قیمت بھی نہیں ۔

رزاق میرزا :- بڑے استاد کی شاگردی میں آنے سے پہلے تو میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہ چودھویں کے چاند کو دیکھتے رہتے ہیں اور کئی بار ساری ساری رات نہیں سوتے ۔ کیا یہ سچ ہے فرخ بیگ ؟

میر فرخ بیگ : ہاں یہ سچ ہے ۔ میں نے استاد علی آقا سے سنا تھا اور استاد علی آقا ہی ایک ایسا شخص ہے جو کئی سال بڑے استاد کے ساتھ ساتھ کئی شہروں کی خاک چھانتا پھرا ہے ۔

رزاق میرزا :- ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ۔ سچی بات تو یہ ہے میر فرخ بیگ ۔

میر فرخ بیگ :- اِس میں کیا شک ہے ۔ دیکھ لو بڑے استاد کو جتنا عزیز علی آقا ہے ہم تم ہو سکتے ہیں ۔

رزاق میرزا :- ہرگز نہیں ۔

چنڈی داس :- (آتا ہے) تم غالیچہ بچھا رہے ہو ۔

رزاق میرزا :- نہیں تو ۔ کیوں ؟

چنڈی داس :- غالیچہ نہ بچھانا ۔ استاد علی آقا کہتے ہیں ۔

رزاق میرزا :- اچھی بات ۔

میر فرخ بیگ :- چنڈی داس تم اندر سے آ رہے ہو ؟

چنڈی داس :- (چاند کو دیکھتا ہے) دیکھو چاند کا چہرہ زرد ہے ۔

میر فرخ بیگ :- ہاں ۔ بڑے استاد کا کیا حال ہے اب ؟

چنڈی داس :- اب اچھے ہیں ۔

رزاق میرزا :- ہمیں آج اندر جانے کی اجازت کیوں نہیں ۔

چنڈی داس :- مجھے کیا معلوم رزاق میرزا ۔ اتنا جانتا ہوں کہ آج استاد علی آقا اور بڑے استاد کے درمیان بہت بحث ہو رہی ہے ۔

میر فرخ بیگ :- کس بات پر ۔

چنڈی داس :- معلوم نہیں کس بات پر مجھے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑے استاد نے کوئی تصویر ہم سے چھپا رکھی ہے اور اس جیسا شاہکار سارے نگار خانے میں موجود نہیں ۔

رزاق میرزا :- اچھا !!!

میر فرخ بیگ :- اور کچھ، تم تو اندر سے آ رہے ہو ۔

چنڈی داس :- اور کچھ معلوم نہیں مجھے ۔

رزاق میرزا :- اور کتنا عرصہ ٹھہرنے کا ارادہ ہے اِس جگہ ۔

چنڈی داس :- کیا معلوم ۔

میر فرخ بیگ :- بھئی سچی بات ہے ۔ ہمارا جی تو اِس جگہ نہیں لگتا ۔

چنڈی داس :- چاند کا چہرہ زرد ہے (میر فرخ اور رزاق میرزا ہنستے ہیں)

رزاق میرزا :- تم پاگل ہو جاؤ گے چاند دیکھ دیکھ کر چنڈی داس ۔

چنڈی داس :- تم نے بڑے استاد کو نہیں دیکھا آج ۔ چاند کا چہرہ بالکل استاد کے چہرے کی طرح زرد ہے ۔

(استاد علی آقا داخل ہوتا ہے ۔)

رزاق میرزا :- بڑے استاد کا کیا حال ہے استاد علی آقا ؟

علی آقا :- اب تو اچھی ہے طبیعت ۔ دیکھو میں تم سے ایک بات کہنے آیا ہوں

رزاق میرزا اور میر فرخ بیگ :- فرمایئے ۔

علی آقا :- یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ بڑے استاد چودھویں کی رات باہر آ کر بیٹھا کرتے ہیں ۔

میر فرخ بیگ :- جی ہاں ۔

علی آقا :- (چاند دیکھ کر) تو آج چودھویں کا چاند ہے ۔ بڑے استاد ابھی باہر آئیں گے (نشست پر بیٹھتا ہے) اور تمھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ اُن کا شاہکار آج تک ہماری نظروں سے چھپا رہا ہے

میر فرخ بیگ :- اُن کے شاہکار تو ۔

علی آقا :- ہاں ۔ ہاں ۔ بڑی بڑی قیمتوں پہ فروخت ہوئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ اُن کے جوہر کا نچوڑ تھے اور انھیں کی بدولت وہ چار دانگ عالم میں مشہور ہوئے ہیں (چنڈی داس زمین پہ بیٹھ جاتا ہے)

میر فرخ بیگ :- جی ہاں ۔

علی آقا :- مگر تم لوگوں کو ان کی شاگردی اختیار کئے کئی سال ہونے کو آئے میں تو اُن کے ساتھ ایک زمانہ سے پھر رہا ہوں ۔ وہ اکثر اپنے شاہکار کا ذکر کیا کرتے تھے اور میرے سیکڑوں بار اصرار کرنے پر بھی وہ کبھی اُسے دکھانے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے اور ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ وہ نگار گاہ میں پڑا ہے ۔ ہم جب سے یہاں آئے ہیں میں موقع کی تلاش میں تھا کہ استاد سے وہ

شاہکار دکھانے کو کہوں۔

رزاق میرزا:۔ تو پھر آپ نے کہا۔

علی آقا:۔ تمہیں معلوم ہے کہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں استاد بیمار ہیں اس لئے کوئی مناسب موقع نہ مل سکا مجھے کل جو اُن کی طبیعت بحال ہوئی تو میں نے اصرار کیا۔ مگر پہلے تو استاد کا رنگ سرخ ہو گیا۔ پھر اس پر زردی چھا گئی اور انہوں نے نہایت کمزور آواز میں کہا: "کل چودھویں رات ہے علی آقا!" اور غش کر گئے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئے۔

چنڈی داس:۔ دیکھو علی آقا! چاند کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ پرماتما خیر کرے۔ آج اسی طرح میں نے رات سپنے میں چاند کا چہرہ پھیکا پڑتا دیکھا ہے۔ بالکل اسی طرح۔ پھر باریک تارہ ٹوٹا جس کی لکیر بڑی دیر تک روشن رہی۔

علی آقا:۔ چنڈی داس۔ چاند تو چمک رہا ہے۔ کہاں ہے اُس کا چہرہ پھیکا؟

میر فرخ بیگ:۔ (ہنس کر) تمہیں یرقان تو نہیں چنڈی داس؟

چنڈی داس:۔ تم ہنستے ہو میر فرخ۔ میرا دل کہتا ہے کہ آج کوئی تارہ ٹوٹے گا۔ میں نے سپنے میں اسی طرح کا چاند دیکھا تھا۔

رزاق میرزا:۔ ہاں تو پھر استاد علی آقا بڑی مشکل سے ہوش میں آئے بڑے استاد؟

علی آقا:۔ ہاں ہوش میں آنے کے بعد نہ جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ مجھے اپنا شاہکار دکھانے پر رضامند ہو گئے۔

رزاق میرزا:۔ خوب۔ ۔۔

علی آقا:۔ مگر میں نے اُن سے ایک اور درخواست کی۔

میر فرخ بیگ:۔ وہ کیا؟

علی آقا:۔ میں نے کہا کہ آپ کا شاگرد میں اکیلا ہی تو نہیں۔ چنڈی داس۔ میر فرخ بیگ رزاق میرزا اور چندر شیکھر بھی تو بیچارے کوسوں کی مسافت طے کر کے آپ کے ساتھ ساتھ یہاں آئے ہیں۔ اُن کو خدمت کرتے بھی تو کئی برس ہو گئے ہیں۔

رزاق میرزا:۔ واہ وا۔

میر فرخ بیگ:۔ تو پھر کیا کہنے لگے۔

علی آقا:۔ کہنا کیا تھا۔ منوا لیا کہ سب دیکھیں گے وہ شاہکار جسے بڑے استاد نے ہم سے قاروں کے خزانے کی طرح کہیں چھپا کر رکھ چھوڑا ہے۔

رزاق میرزا:۔ مگر کب۔

علی آقا:۔ (اُٹھتا ہے) ابھی اور کب۔

رزاق میرزا:۔ ابھی۔

علی آقا:۔ چندر شیکھر سے استاد نے ایک کوٹھڑی کا تالا کھلوایا ہے اور میں تمہیں یہ خبر سنانے کے لئے باہر آیا ہوں۔

چندر شیکھر:۔ (برآمدے سے آواز دیتا ہے) استاد علی آقا۔

علی آقا:۔ آیا چندر شیکھر (جاتا ہے)

چندر شیکھر :- رزاق میرزا اور میر فرخ کو بھی لیتے آؤ اپنے ساتھ (رزاق میرزا اور میر فرخ جاتے ہیں)۔

چنڈی داس :- (وقفہ) اے پورنماشی کے چاند تجھ پر کیوں اداسی چھا گئی ہے۔ تیرا چہرہ کیوں پھیکا پڑ گیا ہے (دل پر ہاتھ رکھ کر) یہ دل مجھے بار بار کہتا ہے کہ آج آسمان سے تارہ ٹوٹے گا۔

علی آقا :- (برآمدے سے آواز) چنڈی داس۔ چنڈی داس۔

چنڈی داس :- آیا استاد (جاتا ہے)

(باغ کا گوشہ لمحہ بھر کے لئے خالی رہتا ہے کہ اتنے میں نادر شابانی تنہا باغ کے اس کونے کی طرف سے داخل ہوتا ہے جس طرف سے کبھی دردانہ آئی تھی۔ نادر شابانی ۔ بینائی کھو چکا ہے۔ اس نے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں۔ ٹھہرتا اور رکتا ہوا آتا ہے۔ صرف اندازے سے جھرنے کی دیوار تک پہنچتا ہے۔ اس پر ہاتھ رکھتا ہے۔ ذرا رکتا ہے۔ پھر شیخ کے درمیان تک آتا ہے۔ اندھوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر چلتا ہے۔ آپ ہی آپ کہتا ہے۔)

نادر شابانی :- کتنی پیاری چاندنی ہے۔ میرے ہاتھ چاندنی کو بھی ٹٹول لیتے ہیں۔

(پھر وہاں سے فوارے تک پہنچتا ہے۔ ٹٹول ٹٹول کر اس کے حوض کو چھوتا ہے۔ پھر حوض میں ہاتھ ڈال کر پانی اڑاتا ہے۔ وہاں سے پھر جھرنے کی طرف واپس جاتا ہے جھرنے کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر خاموش کھڑا ہے کہ بارہ دری میں سے علی آقا بھاگا ہوا آتا ہے۔)

علی آقا :- آپ یہاں بڑے استاد۔ ہم گھبرا گئے کہ اکیلے کہاں چلے گئے آپ؟

نادر :- آج اکیلا ہی چلا آیا میں۔ مگر اکیلا کون ہے؟ وہ انسان کتنا عظیم ہے جو اکیلا کھڑا ہے۔ تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟

علی آقا :- تصویر لا رہے ہیں۔

نادر شابانی :- اب لا بھی چکیں۔

علی آقا :- میں آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ کوئی ٹھوکر تو نہیں لگی آپ کو۔ آپ کہیں گرے تو نہیں؟

نادر شابانی :- نہیں علی آقا۔ میں تو اس باغ کے کونے کونے سے واقف ہوں۔ (بیٹھتا ہے) اس بارہ داری کے ایک کمرے میں - - - -

علی آقا :- آپ چپ ہو گئے۔

نادر شابانی :- یہاں اس بارہ دری کے ایک کمرے میں مجھے ٹھوکر لگنے لگی تھی۔ میں گرنے سے بچ گیا مگر ایک مغنیہ ہلاک ہو گئی تھی (تھوڑا سا ہنس کر) تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟

علی آقا :- (نادر شابانی کے پاس کھڑا کھڑا بارہ دری کی طرف منہ کر کے آواز دیتا ہے) رزاق میرزا۔ استاد تو ادھر بیٹھے ہیں۔

(بارہ دری سے ایک جلوس نمودار ہوتا ہے۔ آگے آگے چنڈی داس اور رزاق میرزا نے ٹیکن پر رکھی ہوئی ایک قد آدم تصویر اٹھا رکھی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے مشعلیں اٹھائے میر فرخ بیگ اور چندر شیکھر ہیں۔

مودبانہ طور پر آہستہ آہستہ چل رہے ہیں ۔)

نادر شابانی :۔ فوارے کے قریب رکھ دو (رکھ دیتے ہیں)

(تصویر کے دائیں چنڈی داس بائیں رزاق میرزا اور تصویر کے پاس ذرا ہٹ کر پیچھے کو میر فرخ بیگ اور چندر شیکھر مشعلیں لئے کھڑے ہیں ۔)

علی آقا :۔ رکھ دی گئی تصویر بڑے استاد ۔

نادر شابانی :۔ رکھ دی گئی ۔ تم تصویر کے پاس چلے جاؤ نا ۔

علی آقا :۔ جیسا حکم (جاتا ہے ۔ اشارے سے چنڈی داس کو استاد کے پاس جانے کو کہتا ہے ۔ چنڈی داس نادر شابانی کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)۔

نادر شابانی :۔ (اس کا آنا محسوس کر کے) کون؟ (چنڈی داس کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر) تم ۔ تم چنڈی داس ۔

چنڈی داس :۔ جی گرو دیو ۔

نادر شابانی :۔ تم کدھر کھڑے ہو علی آقا؟

علی آقا :۔ یہاں ہوں استاد ۔

(نادر شابانی جدھر سے علی آقا کی آواز آتی ہے جانے لگتا ہے ۔ چنڈی داس بازو سے تھامے رکھتا ہے ۔ نادر شابانی اس کا سہارا نہیں چاہتا اس لئے بازو سے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے دیتا ہے ۔ اندھوں کی طرح بازو پھیلائے علی آقا کی طرف قدم بڑھاتا ہے ۔ چنڈی داس اس کے ساتھ ساتھ بطورِ احترام چلتا ہے ۔ نادر شابانی کا ہاتھ تصویر سے جا کر چھوتا ہے ۔ وہ تصویر کو ٹٹولتا ہے پھر دائیں طرف اس کا ہاتھ علی آقا کو چھوتا ہے)

نادر شابانی :۔ تم علی آقا ہو؟

علی آقا :۔ آپ کا بندۂ ناچیز (نادر تصویر کے دوسری طرف کھڑے رزاق میرزا کو چھوتا ہے)

نادر شابانی :۔ تم رزاق میرزا ہو ۔ (پھر میر فرخ بیگ کو چھوتا ہے) اور تم میر فرخ ہو ۔ یہ مشعل ہے تمہارے ہاتھ میں؟

میر فرخ بیگ :۔ جی بڑے استاد ۔

(نادر شابانی وہاں سے پلٹتا ہے ۔ ساتھ چنڈی داس اسی طرح مدد کے طور پر ہاتھ اٹھائے ہوئے ہے ۔ نادر آ کر ٹٹول کر دیوار چھوتا ہے ۔ پھر سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا ہے ۔)

نادر شابانی :۔ چاند کو دیکھو ۔ ہے نا ضرب کاری کا نشان ۔ اس نشان کو ساری دنیا دیکھتی ہے ۔ یہی حال شاعر اور مصور کا ہے ۔ اگر قلب پر دندناتی پڑے تو ایک چوٹ ہی کافی ہے ۔ جس کی پکار ساری دنیا سنتی ہے اور دیکھتی ہے ۔

علی آقا :۔ مگر استاد یہ چوٹ پڑتی کس طرح ہے ۔

نادر شابانی :۔ محبت سے ۔

چنڈی داس :۔ محبت کیا ہے گرو دیو۔

نادر شابانی :۔ دنیا کی سب سے میٹھی اور سب سے کڑوی چیز۔ رُوح کا زیور۔ انسان کی دولت۔ مصور کی جان آہ محبت ایک راز ہے جو دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں رہتا ہے اور جب کوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ عورت ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں تو وہ سب کچھ کھو دیتا ہے۔ سب کچھ۔

چنڈی داس :۔ موت بھی تو ایک راز ہے گرو دیو۔

نادر شابانی :۔ مگر موت کے راز سے محبت کا راز عمیق تر ہے۔ چنڈی داس محبت ہی وہ چیز ہے جس سے انسان کو سروکار رکھنا چاہیے۔

علی آقا :۔ مگر استاد محبت حسن سے ہوتی ہے اور ہم کبھی معلوم نہ کر سکیں گے کہ حسن کیا ہے۔

نادر شابانی :۔ حسن صرف دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے علی آقا! حسن ایک خیالی نقش کی تخلیق کا نام ہے جسے ایک شخص اپنے ذہن میں دیکھ پاتا ہے۔ یاد رکھو یہی نقش حسن کی جان ہے۔

چندر شیکھر :۔ مگر حسن کی بیرونی شکل و صورت۔

نادر شابانی :۔ وہ تو صرف ثانوی حیثیت رکھتی ہے چندر شیکھر۔ یاد رکھو بہت بڑا فن کار ہی حسن کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھ سکتا ہے۔ میں جوانی میں اس وقت تک کسی عورت کی تصویر نہیں بنا سکتا تھا جب تک کہ کسی حسین عورت کے چہرے کا تصور نہ کر لیتا۔ بہت عرصہ گزرا ابتدا میں کہیں ایک تصویر ”لیلیٰ“ بنائی تھی میں نے۔ جس میں ہزار عیب تھے۔ مگر محبت ہو جانے کے بعد میں نے ایسے خوب صورت چہرے بنائے ہیں کہ صدیوں تک نہ بن سکیں گے اور پھر مجھے کسی حبشی عورت کو سامنے بٹھا کر بھی خوب صورت چہرہ بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی رہی۔

چندر شیکھر :۔ بے شک گرو دیو۔

نادر شابانی :۔ تم جانتے ہو میں نے برسوں تک کسی کو اپنا شاگرد نہیں بنایا مگر آخر علی آقا کی خدمت گزاری سے مجبور ہو کر اور کچھ اس وجہ سے کہ تم سب میں مجھے سوچ کی وہ گہرائی نظر آتی تھی جو مصوری کے لئے درکار ہوتی ہے اور یہ جوہر ہر کسی کی طبیعت میں نہیں ہوتا۔ میں نے تمہیں اپنی شاگردی میں لے لیا اور مجھ پر تھوڑے ہی عرصے میں ظاہر ہو گیا کہ تم سب اپنی اپنی جگہ جوہر قابل ہو اور میرے بعد میری شہرت عزت کا ستارہ تمہیں سے روشن رہے گا۔ چندر شیکھر کے نام میں کتنی کشش ہے۔ میں جب اسے پکارتا ہوں تو مجھے (چاند کو دیکھ کر) یہ چاند یاد آنے لگتا ہے اور جب اس سے باتیں کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاند سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمہاری مصوری چاند کی طرح روشن رہے گی چندر شیکھر!

چندر شیکھر :۔ (جھک کر) شکریہ گرو دیو۔

نادر شابانی :۔ اور علی آقا۔ تم تو اس فن کے استاد ہو۔ تمہاری تصویریں تعریف سے بالا ہیں۔

علی آقا :۔ شکریہ بے پایاں استادِ محترم۔

نادر شابانی :۔ اور میر فرخ بیگ تم ایک دن چغتائی فن کے بادشاہ مانے جاؤ گے۔

میر فرخ بیگ :۔ (جھک کر) ہزار بار شکریہ!

نادر شابانی:- اور تمہاری مصوری میں رزاق میرزا ایرانی اور عثمانی مصوری ہمیشہ ممتاز رنگوں میں جھلکتی نظر آئے گی۔ تم نے بہزاد اور وسونت کو بغل گیر کر دیا ہے اور یہ کوشش قابلِ دید ہے۔ اس کی قدر ہو گی ایک نہ ایک دن۔

رزاق میرزا:- میں تو ایک ذرہ بے مقدار ہوں بڑے استاد۔

نادر شابانی:- آج میں وہ شاہکار دکھا رہا ہوں تمہیں میرے شاگردو۔ جو میں نے اپنے دل کے لہو اور اپنی جانِ ناتواں کے سوز سے تیار کیا ہے جس میں میری زندگانی کا نچوڑ ہے۔ یہ تصویر بنانے سے پہلے میں برسوں تک اپنے دماغ میں نئے نئے بت ڈھالتا رہا۔ میں انگنت نقش بناتا اور مٹاتا رہا۔ لیکن مجھے اپنی روح کی تسکین کبھی حاصل نہ ہوئی۔ دنیا نے میری تصویروں "چاند اور زہرہ" "سلمانِ عاشق" اور "حسن جوانمرگ" کو آنکھوں سے لگایا ہے مگر میرے اس شاہکار میں ان سب تصویروں کا جوہر ہے۔ یہ تصویر محبت کی بے پناہ قوت اور ایک اضطراب انگیز انفرادیت کی حامل ہے۔

علی آقا:- اس شاہکار کا نام؟

نادر شابانی:- اس شاہکار کا نام (چاند کی طرف دیکھ کر) "محبوبہ"۔

علی آقا:- محبوبہ۔

نادر شابانی:- (ٹھنڈا سانس) دھیان کی نٹ کھٹ لہریں مجھے کس بھید بھری رات میں لے گئیں۔ نہیں علی آقا "نادرہ"۔

علی آقا:- نادرہ۔

نادر شابانی:- ہاں نادرہ ہے اس شاہکار کا نام۔

علی آقا:- خوب۔

نادر شابانی:- علی آقا۔ فن ہماری جراحتوں کے لئے مرہم کا سامان کرتا ہے اور فنکار اپنے فن میں ڈوب کر ہی اپنی روح کی تشنگی بجھاتا ہے۔

علی آقا:- دریں چہ شک۔

نادر شابانی:- یاد رکھو جب تک زندگی اپنی گوناگوں کیفیتوں اور کمزوریوں کے ساتھ قائم ہے فنکار اپنے زخموں کا اندمال اپنے فن میں تلاش کرتا رہے گا۔

چندر شیکھر:- اس میں کیا شک ہے گرودیو۔

نادر شابانی:- عشق کی جانگدازیوں اور حسن کی کرم فرمائیوں کی پرآشوب داستان ہے یہ تصویر میری تخیل کاری اور اندازِ فکر کا ایک تابناک پہلو۔ میری سلگتی ہوئی آرزوؤں کا مجسمہ۔ میں نے ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر اپنے شاہکار کا مسالہ تیار کیا تھا۔ میرے اس شاہکار کی عورت میری مخلوق نہیں بلکہ ایک صنعت ہے۔ ایک کارنامہ ہے۔ دنیا کی حسین ترین عورت۔ یاد رکھو فن کو بھی ایک سہارے کی ضرورت ہے اور میں آج اس عمر میں بھی عاشق زیادہ ہوں اور مصور کم اور یہی چیز کامیاب مصوری اور عالمگیر شہرت کا راز ہے۔

علی آقا:- آپ کا شاہکار دیکھنے کے لئے ہمارا رواں رواں بیتاب ہے استاد

نادر شابانی:- تصویر پر جو غلاف چڑھا ہوا ہے اُسے اتار دو علی آقا۔

علی آقا :۔ اتار رہا ہوں لیکن تصویر ایک اور کپڑے سے ڈھکی ہوئی ہے۔

نادر شابانی :۔ اس کپڑے کو تھوڑا سا اٹھاؤ۔

علی آقا :۔ اٹھا رہا ہوں۔

نادر شابانی :۔ اٹھا دیا۔

علی آقا :۔ جی۔

نادر شابانی :۔ پہلے اس عورت کے پاؤں دیکھو علی آقا۔ آبِ رواں کی طرح سبک۔ صندل کی طرح سفید چاندی سے ڈھلے پاؤں۔ بے اختیار چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں علی آقا۔

(علی آقا اور رزاق میرزا آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں)

رزاق میرزا :۔ استاد۔

نادر شابانی :۔ سارا کپڑا اٹھا دو۔ (علی آقا سارا کپڑا اٹھا دیتا ہے شمعوں کی روشنی تصویر پر پڑتی ہے اور سب نہایت اشتیاق کے ساتھ دیکھنے کو تھوڑا تھوڑا آگے بڑھتے ہیں) یہ عورت نہیں۔ یہ ملکہ ہے۔ دیکھو کس شاہانہ انداز میں نقرئی تخت پر بیٹھی ہے پا انداز پر رکھے ہوئے پاؤں دیکھو۔ لچکتی ہوئی کمر کا شاعرانہ خم اور ناک کے نتھنوں کا ابھار دیکھا تم نے۔ یہ سینہ سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہی رنگوں کا اعجاز ہے۔ آنکھوں کا کاجل اور ان میں رچی ہوئی نیند دیکھی تم نے۔ اور پھر نیند میں خمار کا ڈورہ جیسے مدھ کی کٹوری میں امرت گھلا ہوا۔ ان ہونٹوں کو جنھیں شگفتگی چوم رہی ہے اور جن پر شفق کی سی سرخی پھیلی ہوئی ہے اپنے دل کے لہو سے رنگا ہے میں نے۔ اس خزانۂ یگانہ اس لطیف نادرۂ عشق کے پیچھے جو پردے لٹک رہے ہیں ان کی ڈوریاں اور جھالریں نسیم صبح سے ہل رہی ہیں۔ کیا میں اس تصویر کے پس منظر میں بساون سے بازی نہیں لے گیا۔ کیوں علی آقا؟

علی آقا :۔ مگر استاد اس استر پر ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔

چنڈی داس :۔ گرودیو۔

نادر شابانی :۔ اپنے استاد کی توہین مت کرو علی آقا۔ میری برسوں کی محنت ہے یہ شاہکار۔ میں نے اسے شرابِ عشق سے مدہوش ہو کر بنایا ہے۔

چندر شیکھر :۔ مگر گرودیو یہاں تو کچھ بھی نہیں۔

نادر شابانی :۔ نہ تخت۔ نہ ڈوریاں نہ چاند سا چہرا۔

چندر شیکھر اور علی آقا :۔ کچھ بھی نہیں گرودیو۔

چنڈی داس :۔ (چاند کو دیکھ کر) مگر چاند ہے گرودیو جو پھیکا پڑ رہا ہے۔

نادر شابانی :۔ تمھیں چاند کی عصمت کی قسم علی آقا۔ سچ سچ بتاؤ۔

علی آقا :۔ میں سچ کہہ رہا ہوں میرے استاد۔ استر پر صرف رنگ کے چند دھبوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

نادر شابانی :۔ میری بینائی واپس آ گئی (کھڑا ہو جاتا ہے) میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ یہ شمعیں گل کر دو۔ باغ کی سب کلیاں توڑ دو۔

نہ میں چیزوں کو دیکھوں گا نہ چیزوں کو اپنی طرف دیکھنے دوں گا (بائیں ہاتھ کو اپنے سر پر لہراتا ہے اور اوپر دیکھتا ہے) میرے سر پر کس چیز کے پر پھڑپھڑا رہے ہیں (چاند کو دیکھ کر) مجھے یہ چاند مردہ عورت کی سیاہ پتلی کی طرح نظر آ رہا ہے۔ چاند کو چھپا دو۔ ستاروں کو ڈھک دو۔ اپنے آپ کو چھپا لو۔ (ایکدم چندر شیکھر کے ہاتھ سے مشعل لے کر تصویر کے کنارے کو آگ لگانے کی کوشش کرتا ہے) مجھے دو مشعل۔ جل جانے دو شاہکار (علی آقا بڑھ کر مشعل چھین لیتا ہے اور مشعل چندر شیکھر کو دے دیتا ہے اور خود مصور کو کندھوں سے تھام لیتا ہے) آج کی رات۔ آج کی رات میری عمر بھر کی محنت۔ آنے والی نسلیں مجھے دیوانہ کہیں گی۔

علی آقا:۔ مجھ سے بھول ہو گئی میرے استاد۔

نادر شابانی:۔ مشعلیں گل کر دو۔ کلیاں روند دو۔ چاند کو چھپا دو۔ میں کہتا ہوں جلا دو میرا شاہکار جلا دو (نیچے کو کھسکتا ہے)

علی آقا:۔ چنڈی داس۔ استاد کا بدن ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔

نادر شابانی:۔ (نقاہت) چاند۔ یہ چاند مجھے مردہ عورت کی سیاہ پتلی کی طرح نظر آ رہا ہے۔ وہ دیکھو چاند نے اپنی کرنیں سمیٹ لیں۔

چنڈی داس:۔ چاند کا چہرہ تو زرد ہے گرد دیلو۔

علی آقا:۔ چنڈی داس تھامنا استاد کو (چنڈی داس تھامتا ہے) مجھ سے بھول ہو گئی استاد۔ یہ تصویر تو ہمارے فن کا خاتمہ ہے۔ اب استر پہ شاہکار کے نقش ابھر رہے ہیں۔ یہ نٹ کھٹ چاندنی دغا کر گئی ہم سے۔ اب اس لاثانی شاہکار کا راز پا لیا ہم نے استاد۔

چندر شیکھر:۔ یہ بات جو اب تم کہہ رہے ہو پہلے کہنی چاہیئے تھی استاد علی آقا۔ مگر یہ بھول تم سے ہی نہیں ہوئی۔ ہم سب سے بھول ہوئی۔ یہ کھیل یونہی کھیلا جانا تھا (چنڈی داس اور علی آقا نادر شابانی کو اٹھاتے ہیں)

میر فرخ بیگ:۔ موت کے راز سے محبت کا راز عمیق تر ہے۔ استاد کہتے تھے۔ (علی آقا اور چنڈی داس نے نادر شابانی کو اٹھا رکھا ہے۔ چندر شیکھر اور میر فرخ بیگ اپنی مشعلیں رزاق میرزا کو دے دیتے ہیں اور خود تصویر کا ٹیکن اٹھاتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے رزاق میرزا تین مشعلیں بلند کئے ہوئے ہے۔ اس طرح یہ جلوس آہستہ آہستہ بارہ دری کی طرف جاتا ہے۔)

چنڈی داس:۔ (روانہ ہونے کے بعد میں چار قدم پر جلوس رکتا ہے۔ چنڈی داس چاند کی طرف دیکھتا ہے) چاند پھیکا پڑ گیا۔ اسی طرح میں نے رات سپنے میں چاند کا چہرہ پھیکا پڑتا دیکھا تھا اسی طرح۔ پھر ایک تارہ ٹوٹا جس کی لکیر بہت دور تک روشن رہی۔

(جلوس چلا جاتا ہے۔ روشنی گل ہو جاتی ہے)

چوتھا منظر:۔

(وہی پہلا منظر۔ نشست پر رازی اور میرزا کوچک سلطان بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرزا کوچک سلطان کی نگاہ چاند پر جمی ہوئی ہے)

رازی:۔ پھر کیا ہوا ابا جان۔

میرزا کوچک سلطان:۔ پھر۔ پھر مصور کے مر جانے کے بعد اس کے کاغذوں میں سے ایک وصیت ملی جس میں درج تھا کہ یہ شکارگاہ جو نادرہ

کو جہیز میں ملی تھی اور اس نے مصور کو بخش دی تھی۔ ہزار شکریہ کے ساتھ نادرہ کے بیٹے کو دیدی جائے اور مصور کے اندوختے کا مالک بھی وہی لڑکا قرار دیا جائے۔

رازی :- اندوختہ کیا تھا وہ؟

میرزا کوچک سلطان :- (چاند سے نظریں ہٹا کر) اندوختہ۔ مصوری کے چند نادر نمونے۔ ڈیڑھ ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی۔ پانچ ہزار روپوں کا ایک توڑا۔ اور مصور کا وہ ان جانا ان دیکھا شاہکار جس کا ایک کونہ مشعل کے شعلے سے خفیف سا جلا ہوا ہے۔

رازی :- تو وہ اندوختہ اس لڑکے کو دے دیا گیا۔

میرزا کوچک سلطان :- ابھی نہیں۔

رازی :- کیوں؟

میرزا کوچک سلطان :- بیٹا ابھی وہ لڑکا بالغ نہیں ہوا۔ جب بالغ ہو جائے گا تو۔ یہ امانت اُسے دے دی جائے گی۔

رازی :- مگر ابا یہ باغ اور بارہ دری تو ہماری ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مصور کی وصیت میں درج تھا کہ یہ بارہ دری اُس لڑکے کو دے دی جائے۔

میرزا کوچک سلطان :- مگر اُس لڑکے کا باپ میں ہوں۔ جب میرا رازی بالغ ہو جائے گا تو یہ امانت اُسے دے دی جائے گی۔

رازی :- ابا جان۔ ابا جان۔ میں ہوں وہ لڑکا۔

میرزا کوچک سلطان :- (کھڑا ہو کر رازی کو گلے سے لگاتا ہے) ایک سال ہوا مصور میرے خوابوں میں آتا تھا اور میں سوتے میں ڈر جاتا تھا۔ آخر عاملوں اور نجومیوں نے دریافت کرنے پر یہ علاج بتایا کہ چاندنی میں اُس مصور کا بُت تراشا جائے اور چاند کی پندرھویں کو اس باغ میں اسے نصب کر دیا جائے تو میرے ڈراؤنے خواب میرا پیچھا چھوڑ سکتے ہیں۔

رازی :- تو پھر کیا اب۔

میرزا کوچک سلطان :- ہاں جب سے یہ کام شروع کیا ہے گیا۔ خواب میں تمہاری ماں کو مسکراتا ہوا دیکھتا ہوں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے سینے پر بوجھ کی ایک سل پڑی ہوئی تھی جو ہلکی ہو رہی ہے اور اب کل تو اس چبوترے پر اُس مصور کا بُت نصب ہو ہی جائیگا

رازی :- (چاند کی طرف دیکھ کر) تو ابا چاند کے سفید ورق پر یہ کہانی لکھی ہوئی ہے....

میرزا کوچک سلطان :- ہاں۔ یہی کہانی لکھی ہوئی ہے —— جو اس طرح شروع ہوتی ہے کہ موت کے راز سے محبت کا راز عمیق تر ہے۔

بددُعا

(ایک تمثیل)

ابوسعید قریشی

کردار

بی بی جان : ۵۰/۵۵ سال کی کشمیری خاتون

زرینہ
مینا
تہمینہ
سمینہ
بی بی جان کی بیٹیاں - عمریں ۱۵ تا ۱۰

چند نوجوان : جن کے منہ پر پٹیاں بندھی ہُوئی ہیں۔ بی بی جان کے بیٹے

ظالم خاں، تاتاری غارتگر

سفاک خاں : اُس کا سالار اور ہونے والا داماد

جلاد خاں
ہلاکت خاں
شقاوت خاں
ظالم خاں کے بیٹے

ظالم خاں کے لشکری، غلام اور کنیزیں، نقیب

سموم : ظالم خاں کی بیٹی جو سٹیج پر نہیں آتی

نوجوان رقاصائیں

طبیب

جوالہ بیگم : ظالم خاں کی ایک بیوی

آتش : جوالہ بیگم کے بطن سے ظالم خاں کی بیٹی

پیرمرد : ظالم خاں کے قبیلے کا کاہن

شمامہ : خوبرو کنیز شقاوت خاں کی داشتہ

فصل اوّل ——— منظر "۱"

برفانی علاقے میں لکڑی کا مکان ——— عقب میں پشتے اور دریچے ——— مرصع ستون ——— فرش پہ ایرانی وضع کا قالین ——— کمرے کے کم و بیش وسط میں تین خوبرو دوشیزائیں شال بافی اور سوزن کاری میں مصروف ہیں ——— سقفی روشندان سے کمرے میں روشنی کے آبشار سے بہار کی آمد آمد کا پتا چل رہا ہے۔ کمرے کے شمال مغربی کونے میں بیرونی دروازے کے سامنے ہوا کو روکنے کے لیے قالین لٹک رہا ہے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک تخت ہے۔ قریب ہی تپائی پہ کشمیری وضع کا سماوار چمک رہا ہے۔ پاس ہی ایک لڑکی سنتور پہ کوئی طربیہ نغمہ بجا رہی ہے۔ باقی لڑکیاں اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں اور آپ سے آپ مسکرا رہی ہیں۔ کبھی کبھی ایک، دوسری کے کان میں کوئی بات کہتی ہے اور کمرہ قہقہوں سے معمور ہو جاتا ہے۔

دروازے کا قالین ہلتا ہے۔ اور بی بی جان، ادھیڑ عمر کی ایک باوقار خاتون جو اپنی عمر کے باوجود حسین ہے، چند اور خواتین کے ہمراہ داخل ہوتی ہے۔

بی بی جان ؛ طائرِ بہشت شاخساروں میں چہچہانے لگا لڑکیو، کوہ فلک بوس پہ برف پگھلنے لگی، چشموں میں بلبلے اُٹھ رہے ہیں، کونجوں کی قطاریں اَن دیکھے ملکوں کی جانب ہجرت کرنے لگیں۔ لیکن تمھارے کام مکمل نہیں ہوئے ہیں اب تک۔ اللہ جانے آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اتنی سست کہ چیونٹی بھی آگے نکل جائے۔ اور چند روز میں نفیریاں لے کر آجائیں گے آنے والے۔ اور تم اُس وقت بھی سوئی دھاگہ لیے ہی نظر آؤ گی۔

زرینہ ؛ ہم کہیں گے، رُک جاؤ بھئی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے دو دن تو میکے میں اور گزار لینے دو۔ صبر کرو تھوڑی!

(قہقہے)

مینا ؛ یہ جو زرینہ ہے نا، بی بی جان، جلدی تو اسی کو پڑی ہے سب سے زیادہ۔ اور بڑھ بڑھ کے باتیں کتنی بنا رہی ہے۔ جھوٹی، لپاٹن!

(قہقہے)

تہمینہ ؛ اور اپنی بھول رہی ہے یہ مینا کی بچی۔ بتاؤں بی بی جان کو تو کیا کہہ رہی تھی؟ بی بی جان ———

(مینا تہمینہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے ——— قہقہے)

مینا ؛ بات تو کر کے دیکھ، سوئی نہ چبھو دی تو میرا نام بھی مینا نہیں! چغلخور، خدا کی چور!

تہمینہ ؛ (مینا کا ہاتھ منہ سے ہٹاتے ہوئے) اچھا بھئی۔ نہیں بتاتی۔

زرینہ ؛ اب بول، بڑی آئی تھی کہیں کی۔ سوزن سے ڈر گئی نا!

تہمینہ ؛ ڈر گئی نا ڈر گئی! لحاظ آ گیا بس! کہ ہٹاؤ شرماتی پھرے گی حیا بانو۔

مینا ؛ اچھا! یہ بات ہے، تو کھول منہ؛

بی بی جان : بس بھئی بس۔ تم ہاریں نہ وہ جیتیں۔ یہ بتاؤ کام تمہارا کب مکمل ہو گا خیر سے ؟

مینا : (شال دکھاتی ہے) دیکھ لو بی بی جان۔ بیکار تو بیٹھی نہیں ہیں ہم۔ ہے نا ارم کا نقشہ !

بی بی جان : وہ تو خیر میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ لیکن ایسا بھی کیا کہ ایک ہی پھول پہ پہروں عرق ریزی کرتی رہو۔ تم نے تو پلکوں کی سوزن بنا لی۔ ایک ایک ٹانکا یوں لگاتی ہو، شہد کی مکھی پھول چوستی پھر رہی ہو جیسے۔

مینا : بات بھی تو جب ہی بنتی ہے بی بی جان کہ شال کو دیکھ کر شہد کی مکھی بھی بھول پڑے کہ سچ مچ کا پھول ہے۔

زرینہ : اور یہ کام بھی تو ہم نے آپ ہی سے سیکھا ہے بی بی جان۔

بی بی جان : ہمارے وقتوں میں تو ایک ایک شال پہ یوں سمجھو کہ موسم بدل جاتے تھے جب جا کے کام مکمل ہوتا تھا۔

تہمینہ : ایسا بھی کیا ہوا بی بی جان کہ آدمی کھیلے نہ کودے دن رات کڑھائی بُنائی میں ہی لگا رہے۔

بی بی جان : کام تو جب ہی بنتا ہے بیٹی کہ دیکھنے والا عش عش کر اُٹھے۔

تہمینہ : اور بنانے والے کو بناتے بناتے پہلے کو غش آ جائے۔ یا پھر آنکھیں کھو بیٹھے۔

مینا : دیکھا نا بی بی جان، کتنی شوخ ہو گئی ہے تہمینہ بانو !

بی بی جان : لڑکیاں شوخ ہی اچھی لگتی ہیں مینا۔ بچپن میں ہی بڑی بوڑھیاں بن بیٹھیں تو چار دن جو جینا ہے وہ بھی نہ جئیں۔ ویسے سچ تو یہی ہے بیٹی کہ سوزن کاری تو پلکوں ہی سے ہوتی ہے ایک طرح۔ چند ہی سال میں آنکھیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اب ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ میں تاروں کی چھاؤں میں دھاگہ ڈال لیا کرتی تھی سُوئی میں۔ پہلی ہی بار۔ اب دن کے اجالے میں بھی دقت ہوتی ہے کبھی کبھی۔ (سمینہ سے جو آہستہ آہستہ سنتور کے تار چھیڑ رہی ہے) لیکن تو کیا کر رہی ہے سمینہ بیٹی، تُو کیوں نہیں بولتی ؟

زرینہ : یہ تو سنتور کے پردے میں کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ تصور سے، اُس کے۔

(قہقہے۔ سمینہ اپنے پاس پڑا ہوا اُون کا گولا اُٹھا کے اُس کو مارتی ہے)

سمینہ : وِرد تو یہ کرتی ہے کسی کے نام کا، اور کہتی ہے مجھ کو۔ مکار کہیں کی۔ لومڑی !۔ ابھی ابھی آپ کے آنے سے پہلے مینا سے پُوچھ رہی تھی، کیسا ہے رحیم ؟ اچھا ہے نا !۔ مینا بولی : تجھے تو اچھا لگتا ہے نا۔

(بس پھر کیا تھا۔ باچھیں کھِل گئیں۔ بولنا بھول گئی۔ گال دہک کر انگارہ ہو گئے اور سوئی شال کے بجائے انگلی میں دھنس گئی)

(قہقہے)

زرینہ : دیکھا بی بی جان کس خوب صورتی سے بات ٹالتی ہے عیّار۔

مینا : اری تجھے کیا پتا کس کے نقش و نگار ہیں یہ شاخیں، یہ کلیاں، یہ کونپلیں، یہ پھول، یہ پتے ؟

تہمینہ : اچھا ! تو یہ درخت، شاخیں نہیں، دست و بازو ہیں کس کے۔ اور اس سے لپٹتی ہوئی بیل ؟

(قہقہے)

بی بی جان: (شال کو پھیلا کر دیکھتی ہے) تو نے تو سچ مچ فرشِ بہار بنا ڈالا سمینہ بیٹی۔

زرینہ: لیکن بی بی جان اس خیال سے مجھے تو نہ جانے کیا ہونے لگتا ہے کہ جس گدھے کو پھولوں سے رغبت نہیں ————

(قہقہے۔ سمینہ اُٹھ کر زرینہ کو مارنے کے لیے دوڑتی ہے۔ وہ قہقہے لگاتی بی بی جان کے گرد پناہ لیتی ہے)

سمینہ: (ٹالتے ہوئے) آپ سُن رہی ہیں بی بی جان۔ اپنے ہونے والے بہنوئی کو یہ کیا کہہ رہی ہے۔

بی بی جان: اس شریر کی تو عادت ہی ایسی ہے کہ نام دھرے بغیر نہیں رہ سکتی۔

سمینہ: اور اپنا اونٹ نہیں دیکھا اس نے، کوئی کل سیدھی نہیں ہے جس کی۔ چلتا ہے تو یوں۔ (نقل اتارتی ہے)

(قہقہے)

بی بی جان: (سمینہ سے) اچھا یہ بتا کہ شال تیری مکمل کب ہوگی؟

سمینہ: اوہو بی بی جان، کوشش تو کر رہی ہوں۔

مینا: جی ہاں۔ سنتور کے تاروں سے شال ہی تو بُن رہی ہے۔

سمینہ: میں تو انگلیوں کی تھکان دُور کر رہی تھی! لیکن —— چہ داند —— بوزنہ —— لذاتِ —— ادرک! تُو تو بڑا خفش سے بھی گئی گذری ہے۔ کیا مجال جو سم پر بھی سر ہلا دے۔

مینا: چھچھوروں کی طرح سر نہیں ہلایا کرتے سمجھدار لوگ!

بی بی جان: توبہ ہے بھئی۔ چڑیوں کا جھونجھ ہے یہ تو۔ کیا مجال جو مُنھ میں زبان پڑ جاتے چٹ بات اور پٹ جواب۔ بات دراصل یہ ہے بچّو! کہ جب کوئی چیز مکمل ہونے کو ہوتی ہے تو خوشی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا رنج بھی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے —— اور وہ تکمیل کو ٹالتا رہتا ہے۔

سمینہ: لیکن کیوں بی بی جان؟

بی بی جان: شاید اس لیے کہ اسے ایک منزل پر پہنچنے کے بعد علم نہیں ہوتا کہ اب مجھے کہاں جانا ہے؛ اب میری کوشش کا مقصود کیا ہوگا، لیکن جب یہ پتا چل جائے کہ ایک کام پورا کرنے کے بعد دوسرے کام پر ہاتھ ڈالنا ہے مجھے، تو پھر بات اور ہوتی ہے۔ بس کچھ کچھ یوں سمجھ لو کہ تمہارے فرض سے سبکدوش ہونے کی خوشی کے ساتھ ساتھ جی میں تمہاری جُدائی کا جو رنج ہے نا، وہ اس دھیان سے دور ہو جاتا ہے کہ ابھی مجھے تمہارے بھائیوں کا بیاہ کرنا ہے۔ ان کی بیویاں آجائیں گی تو گھر کا سناٹا دور ہو جائے گا۔

سمینہ: اے لو بی بی جان تو ہمیں ابھی سے بھول گئیں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہے)

زرینہ: اِس کے بھرّے میں نہ آجایئے گا بی بی جان۔ اس کی آنکھوں میں تو آنسو کنول کی پتیوں پر اوس کے مانند موجود رہتے ہیں پھونک مارو تو چھلک پڑیں۔ یہ آنسو تو دکھانے کے ہیں ہر وقت۔

*

تہمینہ : ورنہ جی میں تو اس کے کلیاں چٹک رہی ہیں کہ کب جاؤں۔

(قہقہے، سمینہ اس پہ ہاتھ اٹھاتی ہے، تہمینہ بی بی جان کی اوٹ لیتی ہے۔ اور پھر ایک دوسرے کا تعاقب کرتے کرتے رقص شروع ہو جاتا ہے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے مزے میں بی بی جان کے گرد ناچتی ہیں۔ دفعتاً باہر سے شور سنائی دیتا ہے۔ رقص ختم ہو جاتا ہے)

بی بی جان : یہ شور کیا ہے لڑکیو؟

رمینا : شکاری لوٹ رہے ہیں شاید۔

تہمینہ : جھیل کی برف پگھل گئی ہے نا، مچھلیاں مل گئی ہوں گی۔

زرینہ : ایک بوجھ بجھکڑ ہے تو بھی۔ مچھلیاں نہ ہوئیں ہرنوں کا گلہ ہو گیا، خرگوش پھنس گیا ہوگا پھندے میں، اور شور مچا رہے ہیں لڑکے۔

(شور بلند ہوتا ہے۔ گھوڑے کے ٹاپوں اور باہر سے وحشیانہ نعروں کی آوازیں آتی ہیں۔ سب بُت بن جاتے ہیں کوئی دروازے کے قالین کا پردہ برچھی سے اٹھاتا ہے۔ اور ظالم خاں، اُس کے بیٹے جلاد خاں اور شقاوت خاں اور سالار سفاک خاں اور کئی نیم وحشی حملہ آور داخل ہوتے ہیں۔ وہ کھال کے لباس میں ملبوس ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور گرز، اور کندھوں پہ کمانیں وغیرہ ہیں۔ ظالم خاں ماحول پہ نظر ڈالتے ہوئے قہقہہ لگاتا ہے اور اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔)

ظالم خاں : تو یہی ہے طیورِ بہشت کا آشیانہ جس کی ہم نے اتنی تعریف سُنی تھی سفاک خاں؟

سفاک خاں : ہاں، خانِ دوراں۔

ظالم خاں : (قہقہے لگاتا ہے اور لڑکیوں کی جانب بڑھتا ہے) طیورِ بہشت۔ سفاک خاں! (قہقہہ)

(بی بی جان، ظالم خاں اور لڑکیوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ لڑکیاں اس کی عبا کے پیچھے چھپ جاتی ہیں)

ظالم خاں : میرے راستے سے ہٹ جا بڑھیا۔

بی بی جان : تیرے دل میں خدا کا کوئی خوف نہیں ہے جو تُو ان بچیوں کے درپے آزار ہے! خدا کے غضب سے ڈر درندہ صفت انسان۔

ظالم خاں : (اپنے ساتھی سے) خدا کس وادی کا بادشاہ ہے سفاک خاں؟ اُس سے کہلا بھیجو کہ ظالم خاں سوائے طاقت کے اور کسی کو نہیں مانتا، اُس میں دم خم ہے تو گُرز لے کے آ جائے میدان میں۔ گھوڑا دوڑا لے۔ پنجہ لڑا لے۔ بھالا پھینک لے۔ ظالم خاں سے کوئی نہیں جیت سکتا بُڑھیا۔ اور وُہ بزدل نہیں ہے کہ کسی کے نام سے ڈر جائے گا۔ تیرے خدا کو اپنے بارے میں زعم ہے کوئی تو سامنے آئے۔ جو جیت جائے سب اس کا! کدھر ہے وہ؟

بی بی جان : خدا وہ ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا۔

ظالم خاں: جاہل عورت! مجھ کو تو میرے ماں باپ نے پیدا کیا تھا، جیسے بچھڑے اور بچھیرے اور بھیڑیں پیدا ہوتی ہیں یا پھر شتر پیدا ہوتا ہے ناقہ کے پیٹ سے۔

(ظالم خاں کے ساتھی قہقہے لگاتے ہیں)

بی بی جان: معصوم بچیوں کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی ہے تجھے؟

ظالم خاں: (سفاک خاں کی طرف دیکھ کر) شرم؟ وہ کیا ہوتی ہے سفاک خاں؟

سفاک خاں: یہ شاید اس عورت کی بولی کا لفظ ہے کوئی —— کیوں بڑھیا؟

بی بی جان: حیا —— حیا، بے غیرت! اب تجھے —— کیسے سمجھاؤں۔ (لڑکیوں سے) تم اپنے کان بند کر لو بچیو! یہ شخص اور اس کے ساتھی کافر ہیں۔ جنگلی ہیں یہ لوگ —— درندے! تہذیب و تمدن سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

ظالم خاں: وحشی اور درندے اور جنگلی۔ یہ لفظ ہم اُن بستیوں میں بھی سُن چکے ہیں جن کو ہم نے تاخت و تاراج کیا ہے۔

سفاک خاں: اور ایک بوڑھا، جس کو ہم نے شکنجے میں کسا تھا، اِن کا مطلب بتا چکا ہے ہمیں۔

ظالم خاں: لیکن ہم ایسے درندے ہیں بڑھیا، جن کو آدمی کے گوشت سے کوئی رغبت نہیں البتہ —— (مسکراتا ہے)

سفاک خاں: (لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بھیڑیں (دلنشی آمیز لہجے میں)، مگر ہم ان کو مارتے نہیں پالتے ہیں۔ دشت بے گیاہ کی برفانی راتوں میں ان کا قُرب ہم کو حدت پہنچاتا ہے۔

ظالم خاں: یہ ہمارے لشکروں کے لیے فرزند پیدا کرتی ہیں جن کو یہ مادہ بھیڑیوں کے دودھ پہ پالتی (زیر لب) بچھوں اور جنگلی جانوروں کا گوشت کھلا کر جوان کرتی ہیں۔

(لڑکیوں کی جانب بڑھتا ہے۔ بی بی جان لڑکیوں کے لیے اپنی عبا کا پردہ تان لیتی ہے)

بی بی جان: ہمیں اس عفریت سے بچا یو پروردگار۔ (زیر لب) تو ہی اِن بچیوں کی عزت و آبرو کا محافظ ہے خدایا۔ تیرے سوا ہمارا کوئی سہارا نہیں۔

ظالم خاں: یہ کیا بڑبڑا رہی ہے بڑھیا!

بی بی جان: ان معصوم بچیوں پر رحم کر ظالم۔

ظالم خاں: تو میرا نام کب سے جانتی ہے؟

بی بی جان: ظالم کے سوا اور کیا نام ہو سکتا ہے تیرا، اِن بچیوں کو دیکھ ظالم جن کے چہرے خوف سے لیموں کی طرح زرد ہو رہے ہیں۔ اس پر بھی رحم نہیں آتا تجھے۔ دل نہیں پسیجتا تیرا۔

ظالم خاں: زرد رنگ ظالم خاں کے پرچم کا رنگ ہے بڑھیا۔ اُس کو اپنے فرزندوں کے لیے ایسی ہی دوشیزاؤں کی تلاش تھی۔

بی بی جان: اِس کا خیال دِل سے نکال دے۔ یہ تو پہلے ہی اس سلسلۂ کوہ کے پہلو میں آباد وادی کے نوجوانوں سے منسوب ہو چکی ہیں، جن سے ہمارا صدیوں کا رشتہ ہے، جن سے ہمارے دریاؤں کے دھارے، بادلوں کے پانی،

ہواؤں کے رُخ، رسم و رواج اور دین و ایمان کے نہ ٹوٹنے والے رشتے ہیں۔ اِن کے خیال کو دل سے نکال دے ظالم خاں! - آج سے ایک ہفتہ بعد جب نیا چاند جھیل سے نکلے گا، نوروز کے موقع پر اِن کے شوہر انہیں لینے آجائیں گے۔

ظالم خاں: شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں کی چھاتیوں سے نوچ کر نیزوں پر اچھالنے والا ظالم خاں ان لڑکیوں کو ان کے ماں باپ کے گھر سے ہی نہیں، ان کے شوہروں کے خیموں سے بھی نکال سکتا ہے۔

لڑکیاں: اب کیا ہوگا بی بی جان؟ کیا ہوگا اب بی بی جان؟ (سسکیاں)

بی بی جان: اب کیا ہوگا؟ وہی جو اللہ کو منظور ہوگا! — میں سوچ رہی تھی کہ تمھارے فرض سے سبکدوش ہو کر میں تمہارے بھائیوں کے لیے دُلہنیں لاؤں گی۔

ظالم خاں: خُوب۔ تو بھائی بھی ہیں ان کے۔ اُنھیں اپنے فرزندوں سے تمہاری بیٹیوں کے رشتے کی اہمیت کے سبب میں اپنے مصاحبوں میں شامل کر لُوں گا۔

(سفاک خاں اور لشکری قہقہے لگاتے ہیں)

(کمرے کے دروازے کا پردہ اُٹھتا ہے۔ ظالم خاں کے لشکری اپنے ساتھ چند نوجوانوں کو ہانکتے ہوئے لاتے ہیں۔ اِن کے ساتھ چند بُڈھے بھی ہیں۔ سب کے مُنہ پر پٹیاں بندھی ہیں۔ بی بی جان لڑکیوں کو چھوڑ کر اُن کی طرف لپکتی ہے)

بی بی جان: میرے بچو! میرے بیٹو!

ظالم خاں: (قہقہہ لگاتا ہے) بچھیروں کی خاطر گھوڑی بچھیریوں کو چھوڑ کر چل پڑی سفاک خاں!

(سفاک خاں تائیدی قہقہے لگاتا ہے)

بی بی جان: ہماری بے لبسی کا مذاق اڑاتے وقت تجھے اس بات کا بھی خیال نہیں آتا کہ ظلم کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ تیرا دل رحم و کرم کے جذبات سے اتنا ہی عاری ہے ظالم خاں؟

ظالم خاں: ظالم خاں رحم و کرم کو تہذیب و تمدن کا طاعون گردانتا ہے کم عقل بڑھیا۔ ان وباؤں کی زد میں آنے والے قبائل کا علاج موت ہوتا ہے ——— فقط موت! ——— لیکن ——— ظالم خاں کا قبیلہ ابھی زندہ رہنا چاہتا ہے عورت!

بی بی جان: مگر میرے بڑے بیٹوں کے مُنہ کس جُرم کی پاداش میں بند ہیں؟

جلاد خاں: اس سے بڑھ کر اور کیا جُرم ہو سکتا ہے عورت! کہ تیرے بیٹے اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے، بول بھی نہیں سکتے اپنی صفائی میں — گونگے ہوں جیسے — ہمارا خیال تھا کہ ہمیں دیکھ کر یہ نوجوان مدافعت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ تلواریں ٹکرائیں گی — خنجر چمکیں گے — دست بدست لڑائی ہوگی — ناخنوں سے، پنجوں سے — سفید برف پہ سُرخ چمکتا ہُوا گرم گرم خون فواروں کی طرح اُچھلے گا — کچھ ان کا کچھ ہمارا — لیکن — یہ نہ ہُوا — کچھ نہ ہوا — کچھ بھی

نہ ہُوا۔ لڑنے کے بجائے جو مچھلیاں انہوں نے پکڑ رکھی تھیں، ہمارے سامنے ڈال دیں۔ جیسے ہم کوئی معذور تھے لُولے، لنگڑے، اپاہج یا بھکاری —— پھر —— شیروں کے مُنہ سے شکار چھیننے والوں کے سامنے کوئی چھیچھڑے ڈال دے جس طور۔

ظالم خاں: (جلاد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے) اِس نوجوان کا نام جلاد خاں ہے بڑھیا۔ اور جو کچھ اس نے کہا سُن لیا تُو نے! —— اِس سے بہتر داماد تجھے کہیں مل سکتا ہے عورت؟ اور اس کے بھائی بھی —— ہلاکت خاں اور شقاوت خاں۔

بی بی جان: توبہ ہے الٰہی! جن کے نام یہ ہیں، وُہ خود کیا ہوں گے؟

ظالم خاں: تیری بیٹیوں کو فخر ہونا چاہیے کہ اِن کے بچّوں کی مائیں بنیں گی۔

بی بی جان: ماں بننا ہر عورت کی آرزو ہوتی ہے ظالم خاں! لیکن سانپوں کی اولاد پیدا کرنے کی جگہ وُہ خالی کوکھ رہنا پسند کرے گی۔ تھور کی فصل اگانے کی بہ نسبت زمین بانجھ ہی بھلی۔

سفاک خاں: یہ بڑھیا ہوش میں نہیں ہے۔ بیٹیوں سے جُدائی کے خیال سے اس کے اوسان بجا نہیں رہے۔ اور جو کچھ منہ میں آتا ہے اول بلول بکے جا رہی ہے۔ شاید اس کو تیرے فرزندوں کے کمالات کا علم نہیں۔

ظالم خاں: تُو ٹھیک کہتا ہے سفاک خاں، یہ تیری دانائی کا ایک اور ثبوت ہے جس کی بنا پر میں اپنی بیٹی سموم کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔

جلاد خاں! چُپ کیوں کھڑا ہے تُو؟ اپنی ہونے والی خوشدامن کو اپنی تیغ زنی کے جوہر کیوں نہیں بتاتا؟ ایک وار میں تیری تلوار کتنے سر قلم کر سکتی ہے؟

جلاد خاں: دس سو۔

(لشکریوں سے مرحبا کی صدائیں)

اور میں اس کا ثبوت پیش کر سکتا ہوں —— مظاہرہ۔

بی بی جان: نہیں نہیں! ثبوت نہیں چاہیے ہم کو!

سفاک خاں: یہ خاتون ہوش میں آ رہی ہے خان۔

ظالم خاں: میرے دُوسرے بیٹوں کے کمالات سُن کر یہ اور بھی قائل ہو جائے گی۔ (شقاوت خاں سے جو ایک طرف کھڑا ہے) اور تُو شقاوت خاں! انکسار کے عارضے میں تُو کب مبتلا ہُوا جو خاموش کھڑا ہے۔ کون سا منظر زیادہ خوش آتا ہے تجھے؟

شقاوت خاں: مفتوح قوموں کے بچّوں اور بوڑھوں کو جب سرپٹ دوڑتے ہُوئے گھوڑوں سے باندھ کے سنگلاخ زمین پر گھسیٹا جائے۔ جب سہاگ لُٹیں، عصمتیں برباد ہوں اور لڑکیاں جب مدد کے لیے پکارتی ہُوئی دم توڑ دیں، جب ——

بی بی جان: (کانوں پہ ہاتھ رکھتی ہے) بس بس!

ظالم خاں؛ اور تُو کیا کہتا ہے ہلاکت خاں ؟

ہلاکت خاں؛ انسان اور حیوان، چرند و پرند کو ایذائیں دے دے کر زندگی کے بوجھ سے نجات دینا۔ بوڑھے جب اپنی اولاد کی جاں بخشی کیلئے گڑگڑائیں، لیکن ان کی آنکھوں میں امید کی چمک تلوار کی چکاچوند سے بجھ جائے۔ جب غلاموں کی کھال ادھیڑی جائے اور ان کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔

ظالم خاں؛ اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ میرے فرزند نہیں! —— میرا باپ ستم ایجاد خاں زندہ ہوتا اگر، تو اپنے پوتوں کی شاگردی کرتا (لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) یہ لڑکیاں تمہارے انعام ہیں فرزندو —— !!!

بی بی جان؛ رحم کر ظالم —— رحم —— تجھ کو بھی ایک روز مرنا ہے آخر۔ (وہ بازو پھیلا کر لڑکیوں اور وحشیوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے)

(ظالم خاں کے لڑکے لڑکیوں کی جانب بڑھتے ہیں۔ لڑکیاں ایک ایک قدم پیچھے پلٹتی ہیں۔ جھک کر کچھ اٹھاتی ہیں ان کے ہاتھ بلند ہو کر بیک وقت دل کی طرف بڑھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی سوزنیں ہیں۔ ان کے ہونٹوں سے لرزہ خیز چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ وہ دو زانو گر جاتی ہیں۔ بی بی جان سکتے میں ہے۔)

بی بی جان؛ (بی بی جان آہستہ آہستہ لڑکیوں کی جانب بڑھتی ہے) تم نے کیا کیا میری بچیو۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنے سوزن دلوں میں اتار لیے۔ کیا میں نے تمھیں اسی دن کے لیے پالا تھا کہ تم اپنے جہیز کے شالوں کے کفن بناؤ اور ہاتھوں کو حنا کے بجائے اپنے ہی خون سے رنگ ڈالو۔

ظالم خاں؛ تیری لڑکیاں اپنے بھائیوں کی بہ نسبت زیادہ غیرت مند اور بہادر نکلیں۔

بی بی جان؛ اور نہتوں پہ ہاتھ اٹھانے والے ظالم! تیری اور تیرے بیٹوں کی شجاعت میں بھی کوئی شک نہیں۔

ظالم خاں؛ تیرے طنز کے باوجود تیری بیٹیوں کو تیرے مذہب کے مطابق آخری رسُوم کی اجازت ہے۔

بی بی جان؛ اور تیرا مذہب کیا ہے؟

ظالم خاں؛ میرا نام ہی میرے مذہب کا جیتا جاگتا اعلان ہے۔

بی بی جان؛ نصب العین تیرا؟

ظالم خاں؛ موت! اور ہر ہوشمند شخص اس کی تائید کرے گا۔

بی بی جان؛ تُو نے زندگی کا نام نہیں سُنا؟

ظالم خاں؛ موت کی دو پہاڑیوں کے درمیان زندگی کی ایک چھوٹی سی وادی ہے اور بس۔ یعنی پہلے بھی موت اور بعد میں بھی موت۔

بی بی جان؛ اور مسلک تیرا؟

ظالم خاں؛ قزاقی —— غارت گری۔

بی بی جان؛ تو کتنا —— رحم دل ہے —— ظالم خان۔

ظالم خاں: اور قدر شناس۔

بی بی جان: ہوں ؟

ظالم خاں: تیری بیٹیوں کی بہادری کے بدلے میں تیرے بیٹوں کو محض غلام بنانے پہ اکتفا کروں گا۔

بی بی جان: تو نے ایک بھولی ہوئی بات مجھے پھر یاد دلا دی ہے۔

ظالم خاں: (تفاخر) یعنی ؟

بی بی جان: (افسوس) زندہ رہنے کے لیے خود کو اس کا مستحق ثابت کرنا پڑتا ہے۔ تیرے فرزند ارجمند جلاد خاں کو اپنی تیغ جوہر دار کے کمال کے مظاہرے کے لیے میرے بیٹوں کی گردنوں سے بہتر اور کوئی گردنیں نہیں ملیں گی، میرے بیٹوں کو زندہ رہنے کا واقعی کوئی حق نہیں!

ظالم خاں: ان کے قتل سے تیری اذیت بھی تو ختم ہو جائے گی عیار عورت!

(سفاک خاں اور جلاد خاں تحسین آمیز قہقہے لگاتے ہیں)

قصور شرط ہے۔ ان کے ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہیں اور یہ گھوڑوں کے اصطبل صاف کر رہے ہیں! (چیخ کر) لے جاؤ ان بہادر نوجوانوں کو اور اس بڑھیا کے سامنے ان سے گھوڑوں کو مالش کرواؤ۔ تا آنکہ یہ ہانپتے ہانپتے نڈھال ہو کر گر پڑیں۔ (بی بی جان سے) میری لذتِ ایجاد کی داد نہیں دے رہی ہے تو؟ ——— محترمہ! ——— تیری تہذیب میں باعزت خواتین کو یہی کہتے ہیں نا!

(سفاک خاں اور ساتھیوں کے فرمایشی قہقہے)

میں تیری پیشانی پر شکن دیکھ رہا ہوں عورت۔ وادی کی محصور و مخمور فضاؤں نے تیرے تصور کو محدود کر دیا ہے شاید۔ ورنہ تو میری دور اندیشی پر عش عش کر اٹھتی۔ میرے باد پا اور آتش نفس تازیوں کا قرب جو خون کی ندیوں سے ہنہناتے ہوئے گزر جاتے ہیں، تیرے بیٹوں کے سرد لہو کے لیے تریاق ثابت ہوگا عورت۔

بی بی جان: ستم ایجاد کی اولاد ——— ظالم!

ظالم خاں: (فاتحانہ قہقہہ ——— اور پھر سفاک خاں سے) سفاک خاں ؟

سفاک خاں: حکم خان زمان ؟

ظالم خاں: ان غلاموں کو گھوڑوں کی خدمت پر مامور کر دیا جائے اور نوجوان عورتوں اور مردوں کو چھوڑ کر اس وادی کے تمام بچے، بوڑھے، بیمار، جو بھی کام کرنے کے اہل نہیں، قتل کر دیے جائیں، بلکہ مہذب لوگوں کی زبان میں ان کی زندگی کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے۔ (زہر خند) نوروز کی صبح کو جشنِ بہار کی خوشی میں ان کے سر قلم کر دیے جائیں۔

(چند لشکری جاتے ہیں)

بی بی جان: مت بھول کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب تو اپنے مظالم کے لیے دھاڑیں مار مار کر روئے گا لیکن تیری آواز تیرے

گلے کا پھندا بن جائے گی! ——— جس طرح تُو نے ہم کو خوار کیا ہے، خدا تجھ کو بھی خوار کرے گا! ——— جس طرح میری معصوم بچیوں نے جان دی ہے اسی طرح تیری لڑکیاں ———

ظالم خاں؛ (بات کاٹتا ہے) یہ دُعا ہے کہ بد دعا! ۔ ظالم خاں بہرحال ہمہ تن گوش ہے۔

بی بی جان؛ میری اولاد اور میری بستی کے برناؤ پیر کے لہو کی مانند تیری اولاد کا لہو بھی تیری آنکھوں کے سامنے بہتا ہوا نظر آئے گا۔

ظالم خاں؛ تُو شاید یہ نہیں جانتی کہ خون منجمد ہو کہ سیّال، ظالم خاں کی آنکھیں اس کو دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں۔

بی بی جان؛ خدا کرے کہ تیرا اور تیرے اہل و عیال کا خون سفید ہو جائے۔

ظالم خاں؛ گیدڑوں کے بَین سے مرغ نہیں مرا کرتے جاہل عورت ——— لیکن تیرے جہل میں کچھ عجیب لطف سا ہے۔ تیری بے باکی تیری جان بخشی کا باعث بن گئی ہے۔ اور ہر چند کہ تُو مفت کا راتب کھائے گی لیکن دل بہلانے کے لیے آدمی بولنے والے پرندے بھی تو پالتا ہے ——— البتہ میں تجھے پنجرے میں بند نہیں کروں گا، آزاد اسیر، پابہ جولاں غلام کی بہ نسبت زیادہ اذیت میں مبتلا ہوتا ہے۔

بی بی جان؛ یہ کیوں نہیں کہتا کہ گنا ہوں اور مظالم کا زندانی ظالم، ایک کمزور عورت کو بھی زنجیریں پہنا لے سے ڈرتا ہے!

ظالم خاں؛ گناہ اور ظلم بے معنی باتیں ہیں بے وقوف عورت۔

بی بی جان؛ مظلوم کی آہ ——— مجبور کی بد دعا ———

ظالم خاں: (بات کاٹتا ہے) کروڑوں بد دُعائیں میرے گرد بگولوں کی طرح منتشر ہو چکی ہیں۔ لیکن فتح و نصرت ہر روز میرے قدم چُوم رہی ہے۔

بی بی جان؛ قضا و قدر کی مصلحتوں سے مَیں واقف ہُوں، نہ تجھ کو ان کا علم ہے ——— بیٹیوں کی موت ——— بیٹوں کی غلامی اور وادی کی تباہی کے بعد ایک بُڑھیا کیوں زندہ ہے؟ اس میں بھی کوئی مصلحت ہے۔ شاید اپنی تمام تر ذہنی اور روحانی اذیت اور غم و اندوہ کے باوجود اُس کو تیرا انجام دیکھنے کی مہلت دی گئی ہے۔

ظالم خاں؛ تیری باتوں میں چیستانوں کا لُطف ہے بُڑھیا۔

بی بی جان؛ مٹنے والی اُمتوں کے قصے ان چیستانوں کے جیتے جاگتے حل ہیں۔ ان کی بستیوں کے کھنڈر داستانیں ان کی! ——— تیرا انجام ان سے بھی عبرت ناک ہوگا۔

(کچھ لشکری آتے ہیں)

ظالم خاں؛ دیدہ خواہد شد (اپنے سرداروں اور لشکروں سے) آج ہم اِس گھر کے ——— اِس وادی کے مہمان ہیں سفاک خاں! ——— خوانِ یغما ہمیں بلا رہا ہے۔

لشکری لُوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چیزوں کے ٹُوٹنے پھُوٹنے اور قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ چھت سے آتی ہُوئی روشنی سمٹ کر بی بی جان پہ مرکوز ہو جاتی ہے اور تیزی سے تاریکی چھا جاتی ہے۔ پردہ

منظر ۲

چند روز بعد ——— ایک طرف خیموں کی طنابیں ——— سامنے کونے میں، اوپر، برف پوش چوٹیاں ——— جنوب مشرق سے آتی ہوئی ایک پگڈنڈی ——— عقب میں گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کی آوازوں کا شور ——— کبھی کبھی گونجوں کی آوازیں ——— سٹیج کی روشنیوں کے قریب پھولوں اور شگوفوں سے لدی ہوئی شاخیں جو بہار کا اعلان کر رہی ہیں ——— ایک خیمے کا پردہ اٹھتا ہے اور ظالم خاں، ہلاکت خاں، شقاوت خاں، سفاک خاں اور چند لشکری آتے ہیں ——— ظالم خاں کے ہاتھ میں دُنبے کی ران ہے جسے وہ کھا رہا ہے۔

ظالم خاں: یہاں کے دُنبوں کا گوشت اتنا نرم کیوں ہے سفاک خاں! ——— دو دن میں دانت بیکار ہو کے رہ گئے۔

سفاک خاں: لیکن ——— یہاں کی بھیڑوں کا قرب خان دوراں، اُپلوں کی آگ ہو جیسے۔

(قہقہے)

شقاوت خاں: بھڑکتی ہوئی بستیوں کے الاؤ بجھنے کے بعد ہلکی ہلکی آنچ آتی ہو جس طرح ——— پوستین کے مانند۔

ظالم خاں: تُو ٹھیک کہتا ہے شقاوت۔ آگ کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے ——— سلگتی، جلاتی۔

شقاوت خاں: گداز کر دینے والی۔

ظالم خاں: اور ہلاکت! تجھے کس طرح کی آگ پسند ہے بیٹے۔

ہلاکت خاں: بھڑکتی ہوئی، مچلتی چنگاریاں اڑاتی ——— شکار کے پیچھے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی گردنوں اور رانوں میں تڑپتی ہوئی مچھلیوں کی مانند۔

ظالم خاں: (قہقہہ) خوب خوب! ——— بچپن میں بھی تُو شعلوں کو پکڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور تیری ماں کہا کرتی تھی کہ یہ تو کسی ناری کی اولاد ہے، مٹی نہیں ہے اس کی نہاد میں۔

ہلاکت خاں: شعلے اور پھول کی اصل ایک ہے شاید ——— میں اب بھی شعلوں کو اپنی انگلیوں میں پکڑ لینا چاہتا ہوں ——— ہاتھ تلپتے وقت۔

ظالم خاں: (چونک کر) ہاں وہ بڑھیا کہاں ہے بیٹا؟

شقاوت خاں: اپنے خیمے کے ایک کونے میں مغرب کی طرف منہ کیے بیٹھی ہے ——— کبھی کھڑی ہو جاتی ہے، کبھی اپنی پیشانی فرش پہ ٹکا دیتی ہے اور اپنی بولی میں کچھ بڑبڑانے لگتی ہے۔

ظالم خاں: ہوں!

شقاوت خاں: اور کبھی ہاتھ پھیلائے بیٹھ جاتی اور اس کے ہونٹ بغیر آواز کے ہلنے لگتے ہیں۔

ظالم خاں: بد دُعائیں دے رہی ہو گی بے وقوف۔ (تضحیک آمیز قہقہہ)

ہلاکت خاں: (تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہُوتے) اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چُپ کیوں نہیں کر دیتے ؛

سفاک خاں: اس کی اذیت کو اتنی جلدی ختم کر دو گے خان زادے !

ظالم خاں: واہ کیسی بات کہی ہے سفاک خاں ——— تیرا ایک ایک لفظ میرے اس فیصلے کی تائید ہوتا ہے کہ تُو ہی میری بیٹی مسموم کے لیے سب سے موزوں شوہر ثابت ہو گا۔

(سفاک خاں کورنش بجا لاتا ہے)

تیرا ہونے والا بہنوئی درست کہتا ہے ہلاکت خان ! کہ مسلسل جان کنی کی لذت سر قلم کرنے کی راحت سے کہیں سوا ہے۔

ہلاکت خاں: میں اپنی کوتاہ اندیشی پہ شرمندہ ہُوں خان !

ظالم خاں: نہیں ——— ندامت کا لفظ مفتوح قوموں کے لیے مخصوص ہے۔ تمہارے کمالات اپنی جگہ مسلّم ہیں۔ بعض باتیں البتہ صرف تجربے سے آتی ہیں، تم سفاک خاں کی عمر کو پہنچو گے، تمہیں بھی خود بخود معلوم ہو جائیں گی۔ مثلاً یہی کہ ایک طرف مرگِ مفاجات ہے دُوسری جانب مرگِ مسلسل ——— سسکتی ——— کراہتی ——— ایڑیاں رگڑتی ——— موت کے لیے التجائیں کرتی اور دُعائیں مانگتی زندگی۔

(قہقہے)

بلاؤ اس بُڑھیا کو۔ اَن دیکھے خدا کے سامنے دُعائیں مانگتی ہے جوا فہ۔ لاؤ خبیث کو میرے سامنے لاؤ، لیکن تشدد سے نہیں، احترام سے ——— ظالم خاں مہذب انسان ہے۔ (قہقہہ)

وہ اپنی محترم مہمان کو رحم و احترام اور تہذیب و تمدن کے حربوں سے اپاہج کر کے مارنا چاہتا ہے۔

سفاک خاں: خانِ دوراں کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ آئینِ جہانبانی کی کلید ہوتا ہے۔

ظالم خاں: خوشامد سے مجھے نفرت ہے سفاک خاں ! ——— لیکن درست داد کی قدر نہ کرنا بھی انصاف سے بعید ہو گا۔ بہرحال میری بات بیچ میں رہے جا رہی ہے ——— جفا کی توقع کرنے والے کو جفا سے محروم کر دینا ظالم خاں کے مسلک کے خلاف ہے۔

(زہر خند)

سفاک خاں: اور یہی لذت ایجاد ہے خانِ دوراں۔

(ظالم خاں اس کی پیٹھ ٹھونکتا ہے)

ظالم خاں: تمہارا ہونے والا خسر اپنے ماحول سے نتیجے اخذ کرتا رہتا ہے سفاک خاں !

(اپنے بیٹوں کو گردنوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے)

اور تم نے بھی سُنا بیٹو ؟ لیکن تمہاری گردنیں پالتو سوٗروں کی طرح موٹی ہو رہی ہیں۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس چربی کو کم کرو۔

سفاک خاں: وہ آ رہی ہے خان !

(بی بی جان خیموں کی جانب سے آتی ہے اور ظالم خاں سے چند قدم کے فاصلے پر رُک جاتی ہے)

ظالم خاں: نوروز مبارک معزز خاتون!

بی بی جان: کاش! میری تقویم میں اس دن کی تحریر نہ ہوتی۔

ظالم خاں: تُو بُرا مانتی ہے تو اور بات ہے ورنہ میں تو اس دن کو تیری زندگی کا ایک اہم دن سمجھ کے مبارک دے رہا ہُوں۔ اپنی بہادر بیٹیوں کی رخصتی کے لیے، آج ہی کا دن تو مقرر کیا تھا تُو نے۔ لیکن جواں مرگ اس بے عزتی سے بال بال بچ گئیں کہ ایسے نوجوانوں کی بیویاں کہلائیں جو تیرے بیٹوں کی طرح عزّت و آبرو پہ جان دینا نہ جانتے ہوں۔

سناک خاں: ایسی بیٹیوں کی ماں واقعی مبارک کی مستحق ہے۔

بی بی جان: وحشیوں کی کنیزیں بننے کی بجائے اُن کا مرجانا ہی بہتر تھا۔

ظالم خاں: ہم اتنے وحشی نہیں ہیں محترمہ! جتنا تُو سمجھتی ہے۔ تیرے جشنِ نوروز میں ہم بھی شریک ہیں۔ خُون کی ندیوں میں بھی ہمیں گلاب کی کلیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ چٹانوں کی دراڑوں سے رِستے ہُوئے لہو کے ساتھ ساتھ ہمیں لاوے کی رعنائیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔

بی بی جان: تیرا جمالیاتی ذوق داد طلب ہے ظالم خاں۔ میں تیری درازیِ عمر کے لیے دعا کروں گی تاکہ تیرا نامۂ اعمال بے گناہوں کے لہو سے اور سُرخ ہو جائے۔

ظالم خاں: اور ہاں اب تک وہ بددعا تیری، اُس برف پوش چوٹی تک تو پہنچ چکی ہے۔ تُو نے دیکھا نہیں ہے شاید۔

بی بی جان: کوہِ سیماب کی چوٹی پر نوروز کا آفتاب لاکھوں سال سے اسی طرح منعکس ہوتا چلا آ رہا ہے۔

ظالم خاں: کیوں سُنی سنائی باتیں کرتی ہے عورت! مان کیوں نہیں لیتی کہ بند مکانوں کی تاریکیوں نے تیری قوم کا احساس طلوع و غروب بھی سلب کر لیا تھا۔

بی بی جان: صدیوں سے اس وادی میں بسنے والی قوم کو تُو ان پہاڑوں کے نشیب و فراز اور طلوع و غروب کے رنگ دکھانے آیا ہے —— تو!

ظالم خاں: سورج کی روشنی کپکپایا نہیں کرتی بُڑھیا۔

بی بی جان: تُو کیا جانے کہ بادلوں کے اُڑتے ہُوئے ٹکڑے ان پہاڑوں پہ کیسے کیسے پھُول کھلاتے ہیں!

ظالم خاں: میرا خیال تھا کہ تیرا مشاہدہ بھی تیری زبان کی طرح تیز ہو گا۔ لیکن ضروری نہیں کہ بے لگام گھوڑی دوڑ میں بھی سبقت لے جائے۔

بی بی جان: دریدہ دہن۔ (بی بی جان اس کو چانٹا مارتی ہے) ذلیل —— درندہ۔

ظالم خاں: تیری دراز دستی قابلِ داد ہے عورت —— تیری خُو کا عشرِ عشیر بھی تیرے بیٹوں میں ہوتا تو آج وہ غلام نہ ہوتے۔

(تازی ہنہناتا ہے)

اس تازی کو دیکھ رہی ہے؟ — اس کی پیشانی اور اس کے بدن کو دیکھا — اندھیروں میں مشعل جل رہی ہو جیسے — اس کی ماں مُشکی تھی، باپ سبزہ — اس کا بدن ماں پہ ہے اور ماتھا باپ پہ — اسی طرح تیرے بیٹوں کو شاید ان کے باپ کی خصلت ملی ہے — بزدلی۔

بی بی جان؛ شرافت اس کی؟

ظالم خاں؛ تیری وفا قابلِ ستائش ہے۔

بی بی جان؛ اب و جد کی شائستگی؟

ظالم خاں؛ لوگوں نے اپنی کمزوریوں کے لیے کیسے نام رکھ چھوڑے ہیں!

بی بی جان: بربریت اور درندگی کی طرح۔

ظالم خاں؛ جو شخص دُوسرے کا لہو بہانے سے ڈرتا ہے وُہ اپنے لہو کو بہنے سے نہیں روک سکتا محترمہ!

بی بی جان؛ تُونے یہی بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا؟

ظالم خاں؛ نہیں، یہ تو بات سے بات نکل آئی تھی۔ بلایا تو یُوں تھا کہ آج نوروز ہے نا۔ میں نے سوچا نئے سال کے نئے دن کی نئی روشنی اور بہار کی تازہ ہوا تیرے محبوس اور مغموم خیالات کے لیے صحت بخش ثابت ہوگی۔

سفاک خاں؛ مہمانوں کی مدارات بھی ظالم خاں کے مذہب کا بنیادی درجہ رکھتی ہے۔

بی بی جان؛ تیرے آقا کی وضعداری کا شکریہ۔ (خیمے کی جانب جانے لگتی ہے)

ظالم خاں؛ (اس کا راستہ روکتے ہُوئے) کہاں چلیں؟ "رفتن بہ اجازت" بھی میری مہمان نوازی کے اصولوں میں شامل ہے محترمہ! اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ میری مہمان عزیز جشنِ بہار کی تقریبات میں میری شریک نہ ہو۔ اور تُو تو ایسی مہمان ہے جس کو اپنی بددُعا کی قبولیت تک اِسی فضا میں قیام کرنا ہے۔ میں اپنے باپ کی کھوپڑی کی قسم کھا کر کہتا ہُوں کہ تیری تواضع میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہوگا۔ اور یہ جشن تو تیری ہی وادی کا جشنِ بہار ہے۔ اس لحاظ سے تُو مہمان ہی نہیں میزبان بھی ہے۔

(قہقہہ)

سفاک خاں؛ اور اس وادی کا جشن تو خانِ دوراں کی زندگی کا ایک یادگار جشن ہوگا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے اس کے عساکر کو ایسے ایسے پہاڑوں سے گزرنا پڑے گا جن کی بلندیوں کو دیکھ کر باتور بھی تیورا کے گر پڑے — ہاں، شاہین بھی!

ہلاکت خاں؛ کوہسار جن کے جنگلوں میں اژدہوں کے بسیرے ہیں اور شاخوں میں چھُپی ہُوئی موت چیتے کی شکل میں ناگہاں جھپٹتی ہے۔

(اپنی پوستین ڈرامائی انداز میں پھاڑتا ہے)

یہ دیکھ۔ یہاں سے یہاں تک — شانے سے آخری پسلی تک چیتے کے پنجے کے نشان — ظالم خبیث نے خنجر نکالنے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔

(بی بی جان کا زہرخند)

ظالم خاں؛ تُو ہنس رہی ہے ——— ہلاکت خاں جھوٹ بول رہا ہے جیسے ؛

بی بی جان؛ یہ کس نے کہا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے ۔ بلکہ تیرا بیٹا غیر شعوری طور پہ ایک اور صداقت کی طرف بھی اشارہ کر گیا ہے ۔

ظالم خاں؛ (قدرے توقف اور پھر قہقہہ) ہوں سمجھا ! ظالم میرا نام ہے ، خُبث میری خُوبی ۔ میرے فرزند ہلاکت خاں کا مشاہدہ داد طلب ہے لیکن ہماری باتوں سے جشن کی تقریبات میں خلل پڑ رہا ہے ۔ ہاں تو برف کی اُس دیوار پہ گلابی روشنی طلوع نوروز ہے گویا ؛

بی بی جان : کوہِ سیماب پہ روشنی کی ہر شعاع مچلنے لگتی ہے ۔ برف کا ایک ایک ذرّہ آئینہ سا جھلملا اٹھتا ہے ۔

ظالم خاں؛ اور اُس اُفق پہ وہ فاختئی دھبے سے کیا ہیں ؛

بی بی جان ؛ قازوں کی قطاریں اور بادلوں کے ٹکڑے ۔

ظالم خاں ؛ فضا میں کوئی خاص بات ؛

بی بی جان؛ شگوفوں کی خوشبو ۔

ظالم خاں؛ بند دروازوں کے پیچھے ، سرما کے آتشدانوں کا دُھواں تیرے مساموں میں اس قدر بس چکا ہے کہ تُو اس ہلکی فضا میں بھی جلتی ہُوئی لکڑی کو محسوس نہیں کر سکتی ۔ تیری بستی جل رہی ہے بُڑھیا !

(لشکریوں کے قہقہے)

اور کوہِ سیماب کی برفوں پر اُس کے شعلوں کا رقص تجھے شفق کا عکس بن کے دکھائی دے رہا ہے اور اُس طرف وہ اُڑتا بادل تیری بستی کا دُھواں ہے ۔ اُس میں تیرے گھر کا دُھواں بھی شامل ہے ۔

بی بی جان؛ جو جل گیا وہ میرا گھر کیوں ہونے لگا ۔

ظالم خاں؛ اس بے اعتنائی سے پتا چلتا ہے کہ تیری رگوں میں بھی کسی خانہ بدوش کا خُون ہے ۔ جس کی آل اولاد یہاں پہنچنے کے بعد واپسی کا راستہ بھول گئی اور خیموں کے بجائے لکڑی اور پتھر کے مکان بنا کر رہنے لگی ، متمدن قوموں کی طرح ۔

(قہقہہ)

بی بی جان؛ اور آج مدنیت کا ایک دشمن اُس کے خرمنوں کو جلا کے خوش ہو رہا ہے ، بستے شہروں کو جلا کے تجھے کیا مل جاتا ہے ظالم ؛

ظالم خاں ؛ تہذیب و تمدن کے قلعوں میں خود کو مامون و محفوظ سمجھنے والا ، تپتے صحراؤں اور بے آب و گیاہ میدانوں میں بھوک کی اذیت کو کم کرنے کے لیے گرگٹ اور درندوں کے شکاریوں کی اُس راحت کا اندازہ نہیں کر سکتا محترمہ ! جو بستیوں کو مسمار کر کے حاصل ہوتی ہے ۔

بی بی جان؛ بستیاں بسانے اور ویرانوں کو آباد کرنے کی راحت اُس سے کہیں سوا ہوتی ہے ظالم ! زمین کا دامن اتنا وسیع ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے ظالموں کو بھی رزق دیتی ہے ——— اس کو روند کر قہرِ الٰہی کو کیوں بلاتا ہے احمق !

ظالم خاں؛ (تضحیک آمیز قہقہہ) ” قہرِ الٰہی ! “ سُنا تم نے !

(اس کے ساتھی قہقہے لگاتے ہیں)

بد دعا بھی ——— ہوں اس کی تاثیر دیکھنے کے لیے تو میں نے تجھ کو زندہ رکھا ہے عورت! ورنہ تجھ کو بھی تیری بہادر بیٹیوں کے ساتھ دفن کر دیا جاتا۔

بی بی جان؛ اپنی ناپاک زبان سے بار بار میری معصوم بچیوں کا نام نہ لے مردود!

شقاوت خاں؛ کوہِ سیماب دیوار دُود بن گیا ہے خان!

(سب پلٹ کر ادھر دیکھتے ہیں۔ کوہِ سیماب سُرخ ہو جاتا ہے)

ہلاکت خاں؛ (اپنے بھائی سے) بادل ہٹ گیا اور برف کی چٹانوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

(چیخوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ ظالم خاں بی بی جان کا بازو پکڑ کر شگوفوں بھری ایک شاخ کو ہٹا کر بستی کی جانب اشارہ کرتا ہے)

ظالم خاں؛ وُہ دیکھ ——— تیری بستی وہیں تو تھی — اُس ٹیلے کے اوٹ ہیں ——— اور یہ چیخیں سُنیں تُو نے؟ ——— تیری بستی کے بچوں اور بوڑھوں کو زندگی کے بوجھ سے نجات دی جا رہی ہے۔

ہلاکت خاں: اور یہ چنگاریاں ان کے لہو کے چھینٹوں کا عکس ہیں شاید۔

(قہقہے)

بی بی جان؛ وُہ دن دُور نہیں جب تیرے خیموں سے بھی ایسی ہی چنگاریاں اُڑیں گی ——— تیرے حلق سے بھی ایسی ہی چیخیں بلند ہوں گی ——— لیکن کوئی تیری مدد کو نہیں آئے گا ——— چیخیں تیرے حلق ہی میں خشک ہو جائیں گی اور خیموں کا دُھواں تیرا گلا گھونٹ دے گا۔

ظالم خاں؛ بُزدل قوموں کی مائیں بددُعائیں دینے کے سوا اور کیا کر سکتی ہیں بے چاری ——— مگر بیٹیاں تو تیری بزدل نہیں تھیں ——— البتہ بیٹے تیرے ——— تاہم میں ان سے مایوس نہیں ہُوں۔ اگر ان کی رگوں میں بھی اس باپ کا لہو دوڑ رہا ہے۔

(بی بی جان اس کا گلا دبوچ لیتی ہے۔ باقی لوگ بیچ بچاؤ کرتے ہیں)

بی بی جان؛ خاموش نجس جانور! اب تو بدکلامی پر اُتر آیا۔

ظالم خاں؛ (گردن چھڑاتے ہُوئے) بس بس! ——— اور تم ایک طرف ہٹ جاؤ ہلاکت خاں، تمہارے باپ کی گردن اتنی کمزور نہیں ہے کہ ایک عورت کی گرفت میں آجائے ——— اور سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی مہمان کی جرأت کا قائل ہوتا جا رہا ہُوں ——— تیرے بیٹوں میں اس کا سواں حصہ بھی نکل آیا تو میں ان کو آزاد کر دُوں گا۔ ان کو اپنا حسب نسب ثابت کرنے کے لیے میں ایک ایسا نادر موقع دے رہا ہُوں کہ تُو عش عش کر اُٹھے گی۔ مگر اس سے قبل تیرا دل بہلانے کے لیے رقص۔

دف اور چنگ کی آواز آتی ہے۔

بی بی جان تضحیک آمیز قہقہہ لگاتی ہے۔

تُو ہنس رہی ہے کہ ہم کو رقص اور موسیقی سے کیا کام۔ تیری بے خبری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ لیکن پہاڑوں سے گھِری ہُوئی اُس وادی میں اس عورت کو کیا معلوم کہ آدم خور بھی اپنے شکار کو الاؤ پر بھُوننے سے پہلے ناچتے ہیں۔

سفاک خاں: مہذب قوموں سے ایک ہاتھ آگے ـــ شاید اپنے شکار کو مسحور کرنے کے لیے ـــ تاکہ جانکنی کی اذیت اس پہ کم ہو جائے۔

(قہقہہ)

بی بی جان: تُو میرے بیٹوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے گا شاید۔

ظالم خاں: ظالم خاں آدم خور نہیں ہے۔ وہ تو سیدھی بات جانتا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے آدمی کو اپنا حق ثابت کرنا پڑتا ہے۔ تیرے بیٹے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں! سفاک خاں! اپنے مہمان عزیز کی ضیافت طبع کے لیے جشنِ نوروز کی تقریبِ سعید پر تُو نے کیا اہتمام کیا ہے؟ خیال رہے کہ یہ اس قوم کی بیٹی ہے جس کی جمالیاتی حس اس درجہ بیدار ہو چکی ہے کہ باقی تمام حسیں سو گئی ہیں۔ اس کی نازک مزاجی کا احترام لازم ہے۔

سفاک خاں: صرصر و سموم و زمہریر سے ہماری طبیعتیں بھی تیز و تُند ہو چکی ہیں۔ اُن کنیزوں سے بھی جن سے ہم کو اولاد کی آرزو ہوتی ہے تیزی و تندی کی طلب ہوتی ہے ہمیں۔ ایسی عورتیں جن کے قُرب کے لیے کوشش و کاوش کی ضرورت ہو اور جو ہماری طاقت اور برتری کو محسوس کرنے کے بعد ہی ہمیں اپنے سانس کی آنچ آنے دیں! ـــــ سپر انداز خواتین، دُرشت خُو اولاد کے لیے ہماری خواہشات کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ شاید یہ رقص جو آج کی تقریب پہ بپا ہو رہا ہے اس کی وضاحت کر سکے۔

(تالی بجاتا ہے۔ ایک کنیز دوڑتی ہُوئی، ہانپتی کانپتی، اِدھر اُدھر دیکھتی ہُوئی آتی ہے اور اس کے پیچھے وحشیوں کی طرح چیختا چنگھاڑتا ایک لشکری۔ لڑکی مرد سے بچنے کی سعی میں مدافعت کرتی۔ بھاگتی جل دیتی، داؤ دکھاتی ہے جنگلی بلی کی طرح جھپٹتی ہے۔ حاضرین شور مچا مچا کے داد دیتے ہیں تاآنکہ لڑکی اور تھکے ہُوئے سانسوں کی آواز اور ایک گھٹی گھٹی سی چیخ بلند ہوتی ہے اور وُہ خیموں کی طرف نکل جاتی ہے۔ نوجوان اس کا تعاقب کرتا ہے۔ شور، تالیاں اور وقفہ)

ظالم خاں: تیری قوم نے بھی لہو گرم کرنے کا کوئی ایسا کھیل ایجاد کیا ہے ـــــ محترمہ؟

بی بی جان: سپردگی نسوانیت کا حُسن ہے، راز ہے، جوہر ہے ـــ جس سے وُہ ایک مرد کی حیوانیت کو سدھاتی، اُس کو اپناتی اور خاندان کی بنیاد رکھتی ہے۔ سپردگی محبت کا محور، عشق کا نقطۂ عروج، ایثار و قربانی اور وفا کا مظہر! ـــ اِس کو چھین کر تم نے عورت کو محض حیوان بنا دیا ہے جو اپنے نر کا مُنھ نوچتی ہے، دانت دکھاتی ہے، غُرّاتی ہے، کاٹتی ہے۔ وظیفۂ ازدواج کے راز کو رُسوا اور ذلیل کر کے گُرگ اور انسان میں کوئی فرق نہیں رکھا تم نے ـــ کوئی فرق نہیں رہا۔

ظالم خاں: تُو نے خود رو نعمتوں کی وادی میں آنکھ کھولی ہے، جہاں مرغ و ماہی آپ سے آپ شکاری کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

تجھے کیا معلوم کہ دشتِ بے گیاہ میں جہاں زندگی بقائے محض کے لیے بھی سعی کی ضرورت ہوتی ہے، انسان اور بھیڑیے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، بلکہ پنجوں اور خونخوار دانتوں سے مبرّا حیوان ناطق اپنے بھائی بھیڑیے سے کہیں زیادہ خطرناک درندہ ہے۔

سفاک خاں: عجیب اتفاق ہے کہ اِسی نوعیت کا ایک کھیل ہماری آج کی تقریبات میں بھی شامل ہے۔

(تالی بجاتا ہے۔ چند نقاب پوش نوجوان، آنکھوں کے سوا جن کے چہرے چھپے ہوئے ہیں، ایک جیسے وحشیانہ لباس میں ملبوس، ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے آتے ہیں اور قطار باندھ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں —— ظالم خاں کے بیٹے —— ہلاکت خاں اور شقاوت خاں اپنے باپ کے دونوں جانب تلواریں لیے کھڑے ہیں)

جلاد خاں: شقاوت خاں!

شقاوت خاں: حکم خان بابا!

ظالم خاں: آج تمہارا بھائی جلاد خاں نظر نہیں آ رہا۔ کل رات زیادہ تو نہیں پی گیا کہیں —— انگوری دیکھ کر؟

شقاوت خاں: صبح کاذب سے قبل ہی اِس بُڑھیا کی بستی کو آگ لگا کر وہ پڑوس کی وادی سے بھیڑیں ہانکنے نکل گیا تھا —— ضیافت کے لیے۔

ظالم خاں: بھیڑیں ہانکنے کے لیے! (بی بی جان سے) تُو نے ہمارے یہاں کا برّہ تو نہیں کھایا ہوگا محترمہ؟ جانور کا پیٹ چاک کر کے ہم اُس کو الاؤ پہ بھُونتے ہیں اور ابھی اس کا خون پُوری طرح خشک نہیں ہو پاتا کہ اُس کے ٹکڑے بانٹ لیے جاتے ہیں۔ اُس کے ریشوں سے رِستے ہُوئے گرم گرم لہو کی نمکین لذت کی خبر برتنوں میں گوشت بھُوننے والوں کو نہیں ہو سکتی۔

بی بی جان: وحشی —— درندے۔

ظالم خاں: تیرے کہنے سے ہمارے طور طریقے نہیں بدل جائیں گے محترمہ! —— ہم زندگی کی لذتوں کو باسی کرنے کے قائل نہیں ہیں —— اور دیکھ ہمارے دانت کس قدر تیز اور مضبوط ہیں —— ہم کُتوں کی طرح ہڈیاں توڑ کر ان کی مومیائی نکال لیتے ہیں (قہقہہ لگاتا ہے) اور کبھی کبھی ہم لوگ، جس طرح تم قہوہ پیتے ہو، شکار اچھا ہو، اگر غزال یا چکارا —— یا پھر —— توانا اور دلیر دشمن ہو، تو اُس کا خون بھی پی جاتے ہیں۔

(بی بی جان غش کھا کر گِر جاتی ہے)

سفاک خاں: ارے! یہ بُڑھیا بے ہوش ہو گئی۔

ظالم خاں: جانتے ہو کیوں —— ہلاکت خاں؟

ہلاکت خاں: تازہ لہو کا تذکرہ خان!

شقاوت خاں، اور تازہ ہوا سے بہتر بے ہوشی کا کوئی تریاق نہیں۔

(بی بی جان کو ہوش آجاتا ہے۔ ظالم خاں اس کو سہارا دینے کے لیے جھکتا ہے۔ وہ اُس کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے)

بی بی جان؛ میرے مذہب میں نامحرم کا لمس حرام ہے۔

ظالم خاں؛ (قہقہہ) تیرے مذہب کا احترام کیا جائے گا۔ مگر میں تو سہارا دے رہا تھا۔

بی بی جان: خدا کے سوا مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔

ظالم خاں؛ میں نے کئی اور قوموں کو بھی یہی کہتے سنا ہے۔ لیکن آج ان کی بستیاں ویران پڑی ہیں۔

بی بی جان: تم ایسوں کی عبرت کے لیے —— اُن کے اعمال کی سزا۔

ظالم خاں؛ میرے اعمال کی سزا تو میری فتوحات ہیں عورت!

بی بی جان؛ ظالم کی رسّی دراز ہوتی ہے۔ لیکن ایک روز اس کو ظلم کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

ظالم خاں؛ تیرا خدا بہت دُور رہتا ہے شاید۔ اُس کے آتے آتے میرے لشکر اپنا کام کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوتے ہیں، وُہ ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔

(قہقہے)

بی بی جان؛ اُس کے یہاں ہر بات کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔

ظالم خاں؛ (سفاک خاں سے) ہاں، وُہ لٹھیال کیا کر رہے ہیں سفاک خاں؛ کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

سفاک خاں: تیرے حکم کا انتظار ہے خان!

(ظالم خاں تالی بجاتا ہے)

ظالم خاں: میں نہیں چاہتا کہ ہماری مہمان گزشتہ چند روز کی یادوں میں مبتلا رہے۔ اور محترمہ! تیری ضیافتِ طبع کے لیے سفاک خاں اور میرے بیٹوں نے ایک نیا کھیل ایجاد کیا ہے —— بقائے زلیست کا تماشہ —— یہ غلام جن کے منہ بند ہیں اور ان پہ پٹیاں بندھی ہیں، اور جن کے چہروں پہ نقاب ہیں۔ آپس میں طاقت آزمائی کرینگے اور اِن میں سے جو اپنے حریفوں کو زیر کر لے گا آزاد کر دیا جائے گا اور اُس کو اس بات کا حق مل جائے گا کہ ہمارے لشکر میں شامل ہو جائے یا جہاں کہیں اس کا جی چاہے چلا جائے۔

بی بی جان؛ تُو کس قدر انصاف پسند ہے ظالم خاں!

ظالم خاں؛ داد کا شکریہ —— اور ہاں اگلے روز تُو کہہ رہی تھی کہ اِس وادی میں کسی کو کسی پہ برتری حاصل نہیں ہے۔ سب کو مچھلیاں پکڑنے اور میوے توڑنے کا مساوی حق ہے۔

بی بی جان: اور کوئی اپنی ضرورت کے علاوہ فالتو ذخیرہ نہیں کرتا۔

ظالم خاں: ہمارے یہاں بھی بہت سی املاک مشترک ہوا کرتی ہے۔ ہم تو اپنی کنیزیں تک بدل لیتے ہیں —— اکثر۔

بی بی جان: عورت بھی تمہاری املاک ہے گویا —— مویشیوں کے مانند۔

ظالم خاں: مگر ہم اتنے متمدن ضرور ہیں کہ اگر ان کی خواہش کے خلاف اُن کے آقا کے علاوہ کوئی اُن پہ دست درازی کرے تو آقا اپنے رقیب کو قتل کر دے گا۔ یہ ہمارا قبائلی آئین ہے۔

بی بی جان: بعض درندوں میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

ظالم خاں: (چیخ کر) لیکن یہ غلام کیا کر رہے ہیں! شاید یہ آزادی نہیں چاہتے۔ اگر یہ اپنے فیصلے سے پھر گئے ہیں تو انہیں بزدل غلاموں کے مانند قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔

سفاک خاں: اگر تم لوگ اپنے فیصلے پر قایم ہو تو اپنی لاٹھیاں بلند کرو۔

(غلام لاٹھیاں بلند کرتے ہیں)

خوب —— آزادی یا موت! —— یہ ان کا آخری فیصلہ ہے خان!

(نقارے پہ ضرب —— شور —— نقاب پوش نوجوانوں کی لاٹھیوں سے لڑائی —— آخر کار ایک ایک کر کے سب غلام سوائے ایک کے گر پڑتے ہیں —— تالیوں اور نعروں کا شور)

ظالم خاں: اب میں اس بہادر نوجوان کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں، جس نے زندہ رہنے کا حق ثابت کر دیا۔

(ایک لشکری اس نوجوان کا نقاب اتارتا اور اس کے مُنہ سے پٹی کھولتا ہے۔ نوجوان بی بی جان کی طرف لپکتا ہے)

نوجوان: ماں!

بی بی جان: (اس کو اپنی باہوں میں لیتے ہُوئے) بیٹا!

ظالم خاں: تیرے بیٹے نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کی رگوں میں بھی وہی خون ہے جو تیری بہادر بیٹیوں کی رگوں میں بھی موجزن تھا۔

(نعرہ ہائے تحسین —— ظالم خاں ہاتھ بلند کرتا ہے اور پھر خاموشی)

اور وُہ جنھوں نے غلامی کی زندگی کے مقابلے میں آزادی کی خاطر مردانہ وار لڑتے ہُوئے جان دے دی ان کے ماں باپ بھی داد کے مستحق ہیں۔

(نعرہ ہائے تحسین)

اُن کی رگوں میں بھی وہی خُون بہہ رہا ہے جس نے ان نوجوانوں کو غلامی سے نجات دلائی۔

(سناٹا)

بی بی جان: اور اُن ماں باپ کی قبروں پہ گھاس نہ اُگے جنھوں نے تجھ جیسے ستم ایجاد کو جنم دیا۔

ظالم خاں: ہم اپنے مُردوں کو تجھ جیسی دریدہ دہن کی بد دُعاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے، اُن کی املاک سمیت جلا دیتے ہیں۔ سویرے

ماں باپ کی قبر ہے نہ اس پہ گھاس —— تاہم یہ جان کر مجھے رنج ہوا کہ تُو اپنے بیٹے کی آزادی پر بھی خوش نہیں ہوئی ۔

بی بی جان : جہنم کے ایندھن —— میری معصوم بچیوں کو قتل، میری بستی کو نذرِ آتش کرنے، اور اس کے بوڑھوں اور بچوں کو تہ تیغ کرنے کے بعد یہ ستم باقی رہ گیا تھا کہ تو دھوکہ دے کر بھائی کو بھائی کے ہاتھوں قتل کرا دے ۔ تف ہے اُس دن پر جب تُو پیدا ہُوا، اور اُس دن پہ جب تُو مرے گا اور ان تمام ساعتوں پر جو ان کے درمیان ہیں ۔ جن میں تُو اپنے نجس وجود سے زمین پر فساد کرتا رہے گا اور بے گناہ بندوں کی اذیت کا سامان بنے گا ۔

ظالم خاں : میرے کان ایسی بے شمار بددُعائیں سُن چکے ہیں ۔ لیکن شاید تیرے خدا کو دعاؤں کی موجودگی میں بددعائیں سُننے کی مُہلت نہیں ہے یا شاید وُہ مجھ جیسوں کے ہاتھوں سے آباد شہروں کو برباد کر کے ایسی بستیاں بنا رہا ہے، ایسی تہذیبیں ۔ ایسے تمدن تخلیق کر رہا ہے، جہاں کے باشندے منہ زور گھوڑوں کی ہنہناہٹوں اور ان کے سُموں تلے زمین کے لرزنے کی صدا کے سوا اور کوئی آواز نہیں سُن سکتے —— تُو مجھے کس خدا سے ڈرا رہی ہے عورت ؟

(شور اور گھوڑوں کے سُموں کی آواز جو قریب پہنچ کے رک جاتی ہے ۔ اور ایک نوجوان لشکری خان کے سامنے سجدہ کرتا ہے)

نوجوان : جان بخشی خانِ اعظم ۔

ظالم خاں : بول —— کیا کہنا ہے تجھے ؟

نوجوان : تیرا بیٹا جلاد خاں گھوڑے سے گر کر ——————

(ظالم خاں اس کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے)

ظالم خاں : کیا بکتا ہے کمینے ؟

نوجوان : گھوڑا چٹان سے پھسلا ۔ لگام خانزادے کی کلائی سے لپٹ گئی ۔ مار کے مانند وُہ دُور تک چٹانوں پر گھسٹتا چلا گیا، اور اُس کا سر ——————

(ظالم خاں اُس کا گلا دبوچ کر چیختا ہے)

ظالم خاں : خاموش —— خبیث جانور ۔

(ظالم خاں نوجوان کا گلا گھونٹ کر اس کے مُردہ جسم کو پھینک دیتا ہے)

اس کی لاش کُتّوں کے آگے پھینک دو ۔

(کچھ لشکری نوجوان کی لاش لے جاتے ہیں اور کچھ لوگ جلاد خاں کی میّت کو بانسوں سے لٹکائے داخل ہوتے ہیں اور اس کو زمین پہ ڈال دیتے ہیں ۔ ظالم خاں اپنا چہرا اپنے بازوؤں سے ڈھانپ لیتا ہے ۔ اُس کے حلق سے زخمی درندے کی سی آواز نکلتی ہے اور پھر زیرِ لب)

آہ ! آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو کیا کرتی !

بی بی جان: یہ جاننے کی تجھے اب بھی ضرورت ہے!

ظالم خاں: (چونک کر) تُو؟

بی بی جان: ہاں — مَیں — جس کی معصوم بچیوں نے تیرے بیٹوں کے لمس کی بہ نسبت موت کو ترجیح دی — اور جن کی ماں اس کے باوجود بھی زندہ ہے — تیرا انجام دیکھنے کے لیے۔

ظالم خاں: اب تو تیرے سینے میں خوشی کے چشمے اُبل رہے ہوں گے۔

بی بی جان: میرا مذہب دشمن کی موت پر بھی خوشی کی اجازت نہیں دیتا۔ مرگِ دشمن کی خوشیاں وُہ منائے جس کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہو۔ یہ تو محض عبرت کی ایک ساعت ہے — تیرے لیے بھی اور جو دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں، اُن کے لیے بھی۔

ظالم خاں: (زہر خند) یا — محض ایک حادثہ۔

بی بی جان: کون جانے پردۂ افلاک میں ابھی اور کتنے حادثے پوشیدہ ہیں!

ظالم خاں: تیری قوم کی تباہی کی طرح۔

بی بی جان: یا — تیرے ولی عہد کی ناگہانی موت کے مانند۔

(بی بی جان کا لڑکا سر جھکائے ایک طرف چلنے لگتا ہے)

ظالم خاں: تُو کہاں جا رہا ہے؟ کیا نام ہے تیرا؟ — تُو اگر چاہے تو اپنی ماں کے پاس بھی رہ سکتا ہے۔ میں اُس کی آخری زندگی کا سہارا نہیں چھیننا چاہتا۔

بی بی جان: میرا سہارا صرف خدا کی ذات ہے۔

ظالم خاں: تُو پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ گھبرا نہیں، تیرا بیٹا اب کہیں بھی تو نہیں جا سکتا، لوٹ آئے گا ابھی۔ ہاں — اگر کوئی جگہ ہے اس کے جانے کی تو الگ بات ہے۔

بی بی جان: لاعلمی میں اپنے بھائیوں کے نادانستہ قتل کا بوجھ کاندھوں پر اٹھاتے کوئی ہوش میں رہ سکتا ہے! — یہ بھی ہوش میں نہیں ہے۔ کون جانے اس کے ضمیر کا بوجھ اسے کہاں لے جائے — بہرحال اسے جانے دو — جاؤ بیٹا — جاؤ — اللہ تمہارا گناہ معاف کرے۔

(لڑکا جاتا ہے — پردہ)

فصلِ دوم

وقت: — رات — مشعلوں کی روشنی میں ایک طرف ظالم خاں کا خیمہ نظر آتا ہے اس کے ساتھ ہی پھولوں سے سجا ہُوا ایک اور خیمہ — دُوسری طرف اِن کے بالمقابل سفاک خاں کا خیمہ ہے۔ پس منظر میں بھی خیمے ہی دکھائی دیتے ہیں — سامنے نیم قوس کی شکل میں زین پر اونٹوں کے

کجاوے اور گھوڑوں کی زینیں ہیں جن کو کرسیوں کی طرح استعمال کیا گیا ہے ——— ظالم خاں اور اس کے بیٹے شقاوت خاں اور ہلاکت خاں اور چند لشکری ان کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ایک طرف بی بی جان کی کرسی نظر آ رہی ہے لوگ اِدھر اُدھر چل رہے ہیں۔ عقب میں عورتوں کے قہقہوں کی آوازیں اور قبائلی رقص کی دھن سنائی دے رہی ہے ——— بیچ میں کھوپڑیوں کا انبار ہے۔

نقیب : (اپنے گلے میں پڑی ہوئی نوبت لیے آتا ہے) ظالم خاں کے سنگ دل ساتھیو! جن کی ہیبت سے دشت و جبل لرزتے ہیں شقاوت خاں اور ہلاکت خاں کے باپ، ظالم خاں کے لشکریو! جن کی دہشت سے تہذیب و تمدن کے گہواروں میں کلاہ پوش شہنشاہ اپنے قلعوں کی بند دیواروں کے پیچھے بھی کانپتے ہیں ——— ظالم خاں کے ظالم دوستو! جانتے ہو آج کیا دن ہے؟

(سناٹا)

جانتے ہو کہ آج ہمارے آقا اور سردار، ظالم خاں کی ذاتی اور آبائی نوادر کی نمائش کیوں ہو رہی ہے؟ ——— یہ کھوپڑیاں! ——— یہ کمانیں! ——— یہ گرز! ——— اور جانتے ہو کہ آج خیموں پہ پھول کیوں لگے ہیں؟ ——— آج (نوبت پہ ضرب) ہماری آقازادی سموم، سالارِ لشکر سفاک خاں کے خیمے میں جا رہی ہے۔

(نعرہ ہائے تحسین)

اور یوں آج کی ساعت ایک نئی نسل کی نوید ہے جو ظلم و تعدی کی روایات کو زندہ و تابندہ رکھے گی۔

بی بی جان : تیرا نقیب ایک بات کہنا بھول ہی گیا ظالم خاں!

ظالم خاں : وہ کیا محترمہ؟

بی بی جان : یہ لمحہ استبداد کو اپنی کوکھ میں پرورش کرنے والوں کے لیے عبرتناک انجام کی نشان دہی کرے گا ——— نقیب یہ کہنا بھول گیا۔

(ظالم خاں برہمی کی حالت میں نیزہ اٹھائے اس کی طرف بڑھتا ہے)

ظالم خاں : تُو اس موقعہ پر بھی خاموش نہیں رہ سکتی نحوست مآب قطامہ! مت بھول کہ تیرے ہونٹوں پہ مُہر بھی لگ سکتی ہے۔

بی بی جان : وہ ماں جس کی بیٹیاں اپنے سینے میں سوزن اتار سکتی ہیں، ہونٹ سِلنے سے نہیں ڈرتی ظالم خاں! ——— لیکن ایسا کرنے سے پہلے اتنا سوچ لے کہ تیرے لشکری کیا کہیں گے! ——— وہ کہیں گے کہ ظالم خاں اپنی بات سے پھر گیا۔ یاد رکھ، حاکم جابر ہو یا رحم دل، رعیت کو جب اس کی بات کا اعتبار نہ رہے، اعتماد اٹھ جائے تو اس کا آخری وقت آ پہنچا ——— حرف یعنی حکم جو اس کی طاقت کا سرچشمہ ہیں، وہی اس کے گلے کا پھندا بن سکتے ہیں۔

ظالم خاں : تیری منطق کبھی کبھی مجھے لاجواب کر دیتی ہے عورت! ——— اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ کاش! تُو اور میں ایک ہی خیمے میں رہ سکتے۔ کیونکہ تیرے بالوں میں روشنی کی چند کرنوں کے سوا تیرے چہرے پہ عمر کا کوئی نشان نہیں۔

بی بی جان؛ جو کچھ تُو نے کہا ہے وُہ کہنے سے قبل کاش تُو نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیا ہوتا جس پر تیرے ضمیر نے جور و جفا کی جُھریوں کا جال بُن رکھا ہے۔ لحد کا گوشہ تیرے خیمے کی بہ نسبت لاکھ درجہ خوشگوار ہوگا۔

ظالم خاں؛ کاشش! میں نے تجھ سے کوئی وعدہ نہ کیا ہوتا۔ اور لحد کے لیے تیری آرزو کو پُورا کر سکتا۔

بی بی جان؛ تیرا انجام دیکھنے کے سوا میری کوئی آرزو نہیں ہے درندے!

(ظالم خاں تلوار کھینچتا ہے)

ظالم خاں؛ شاید یہ تیری زندگی کا آخری سانس ہے حرافہ!

بی بی جان؛ تجھے تو درندگی پہ فخر تھا اپنی —— اتنا غضب ناک کیوں ہوگیا؛

(تلوار نیام کر لیتا ہے)

رُک کیوں گیا۔ ہاتھ کیوں سو گیا؛ کچھ مُنہ سے ہی بول —— زبان کیوں سُن ہوگئی —— یا —— شاید تجھے جلاد خاں یاد آرہا ہے۔ (زہرخند) کیوں؛

ظالم خاں؛ ظالم خاں تیرے لہو سے اپنے ہاتھ آلُودہ نہیں کرنا چاہتا —— اِس لیے! —— بُڑھیا۔

بی بی جان؛ (لرزہ خیز لیکن نرم لہجہ) نہیں —— اس لیے کہ تیرا انجام دیکھنا میرا مقدّر ہوچکا ہے۔ جب تک میں تجھے سِسک سِسک کے دم توڑتے ہُوئے نہ دیکھ لُوں گی، میں نہیں مر سکتی۔

ظالم خاں؛ (اپنے لشکریوں سے) اس خبطی خاتون کی باتیں سُن رہے ہو تم لوگ —— اس کی ہرزہ سرائی کو تم کیا نام دو گے؛

لشکریوں کی ملی جلی آوازیں یک ساتھ؛ — دیوانگی —— جنون —— پاگل پن۔

بی بی جان؛ لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ دیوانے اپنی دُھن میں ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو کوتاہ نظر فرزانوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔

(نقارے پر ضرب —— ظالم خاں کے خیموں کے مقابل خیموں سے، سفاک خاں ایک جلوس کی شکل میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ نما ایک مِشعل ہے جسے وہ کھوپڑیوں کے ڈھیر کے سامنے زمین میں گاڑ دیتا ہے)

سفاک خاں؛ چنگیز اور ہلاکو کی یادوں کو زندہ رکھنے والے ظالم خاں کی تلوار ہمیشہ لہو میں نہاتی رہے۔

(ظالم خاں اپنی تلوار کھینچ کر اسے بوسہ دیتا ہے اور پھر اس کی نوک کو سفاک خاں کی پیشانی پر رکھتا ہے جس سے ایک قطرہ لہو کا نکلتا ہے۔ ظالم خاں اس کو اُنگلی سے چُھو کر سب کو دکھاتا ہے۔ حاضرین "ظالم خاں زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہیں)

سفاک خاں؛ خانِ دوراں، فاتحِ عالم ظالم خاں کو خانہ زاد غلام سفاک خاں اُس کا وعدہ یاد دلانے کی جسارت کرتا ہے جس کی رُو سے خانِ دوراں اپنی بیٹی سموم کو اِس غلام کے ساتھ ایک ہی خیمہ عطا کرنا چاہتا تھا۔

ظالم خاں؛ ظالم خاں اپنا ہر وعدہ پُورا کرتا ہے ——— دشمن سے بھی۔

بی بی جان: (زہر خند) لیکن ابھی ابھی وُہ اپنا وعدہ بھُول چلا تھا۔

ظالم خاں؛ وہ تو محض مذاق تھا میری محترم مہمان! تجھ کو قتل کر کے ظالم خاں اپنی راحت کو طول کر دینے کی بجائے مختصر کر دے گا؟ وہ اتنا جاہل نہیں ہے عفیفہ!

بی بی جان؛ لیکن تُو نے کبھی اِس امکان پر بھی غور کیا ہے کہ اوروں کی اذیت سے لذت حاصل کرنے والا خود بھی کسی اذیت، کسی کرب میں مُبتلا ہو سکتا ہے!

ظالم خاں؛ ظالم خاں بد دُعاؤں سے ڈرنے والے دن پیدا نہیں ہُوا تھا ——— محترمہ!

بی بی جان؛ ٹھیک ——— وہ جس کی لاش گھوڑے کے ساتھ چٹانوں پر گھسٹتی چلی گئی تھی، وُہ کس کا بیٹا تھا؟

ظالم خاں؛ تیری بد دُعا کا نتیجہ نہیں تھا وُہ ——— تیرے بیٹوں کی طرح کنارے پر بیٹھ کر کانٹوں اور ڈوریوں سے مچھلیاں پکڑنے والوں کو کینچوے بھی پانی میں کھینچنا پسند نہیں کرتے۔

(ظالم خاں اور اُس کے ساتھیوں کا فرمائشی قہقہہ)

البتہ تیری بیٹیاں ———

بی بی جان؛ مت بھُول کہ تیری زبان ان کا نام لینے کے لایق نہیں ہے ——— جلاد کے باپ!

ظالم خاں؛ (غضب ناک) تُو نے پھر کچوکا لگایا بد لگام عورت!

بی بی جان: بس ——— ایک ہی بار بیٹے کے نام سے تڑپ اُٹھا! ——— اور تُو جو بار بار مجھے میری معصوم بیٹیوں کی یاد دلا رہا ہے یہ سمجھتا ہے کہ میرے سینے میں دل نہیں ہے۔

ظالم خاں: میں تیری بیٹیوں کا صدق دل سے قدر دان ہُوں۔

بی بی جان: شکریہ ——— تیرے بیٹوں کی بہنیں بھی کیا اپنی آبرو بچانے کی خاطر جان پہ کھیل جاتیں؟

ظالم خاں؛ ظالم خاں کی بیٹیوں کو نہیں تو اور کیا غلام زادیوں کو عزت کا پاس ہوگا!

سفاک خاں: (آگے بڑھ کے) ایک بدحواس بُڑھیا کی بے معنی باتوں کے باعث خانِ دوراں کے وعدے کے ایفا میں تاخیر ہو رہی ہے۔

ظالم خاں: (جیسے کوئی بھُولی ہُوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے) تُو ——— کیا کہہ رہا تھا؟ کیا نام ہے تیرا؟ ——— جلاد خاں، میرا مطلب ہے سفاک خاں۔

بی بی جان: تیری زبان تیرے خیالات کی غمازی کر رہی ہے سفاک خاں کے ہونے والے خُسر!

ظالم خاں؛ تجھے اپنی مرضی کے مطابق نتیجہ اخذ کرنے کا اختیار ہے محترمہ! ——— لیکن ظالم خاں کے لیے غم بھی صحرا کے آسمان پر بادل کے اس ٹکڑے کی مانند ہوتا ہے جو بِن برسے ہی گزر جاتا ہے۔ لیکن تیری خرافات تقریب میں تاخیر ہو رہی ہے۔

(نوبت پہ ضرب ——— سفاک خاں جھک کر خان کے قدم چُومتا ہے اور پھر مؤدبانہ کھڑا ہو کر

دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے)

سفاک خاں: خانِ دوراں ظالم خاں جس کے سامنے شیر دل پہلوانوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے، جس کے آگے مست ہاتھی چیونٹی کے مانند مٹی میں لوٹنے لگتا ہے۔

(نعرہ ہائے تحسین)

آتش نفس ظالم خاں جس کے غضب سے آگ اُگلنے والے اژدہے پناہ مانگتے ہیں۔

(نعرہ ہائے تحسین)

ظالم خاں جس کی پیدائش نوکِ نشتر کی مرہونِ منت ہے اور جس کے نام کی دہشت سے گینڈے کے بطن میں پرورش پاتے ہوئے بچے شق ہو جاتے ہیں۔

(نعرہ ہائے تحسین)

ظالم خاں جس کے خوف سے ہونے والی مائیں قبل از وقت اپنا بوجھ پھینک دیتی ہیں —— ظالم خاں جس کی لگائی ہوئی آگ دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں ہر وقت سُلگتی رہتی ہے! —— اُس ظالم خاں کو سفاک خاں کا سلام پہنچے۔

ظالم خاں: ظالم خاں اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے لیکن اس وقت قصیدہ خوانی کا مُدعا؟

سفاک خاں: مَیں خانِ دوراں کو اس کی بیٹی سموم کے بارے میں اس کا وعدہ یاد دلانے آیا ہُوں۔

ظالم خاں: سُن لیا اُس نے —— لیکن تجھے خود کو ان سب کے سامنے سموم کا حقدار ثابت کرنا ہوگا۔

سفاک خاں: بھیڑیوں کے بھٹ میں پرورش پانے والے سفاک خاں کے بدن پر ستر معرکوں کے نشان موجود ہیں۔

(اپنی پوستین پھاڑ کر زخموں کے نشان دکھاتا ہے)

(نعرہ ہائے تحسین)

ظالم خاں: خوب —— خوب —— لیکن ظالم خاں کے بدن پر تو ایک بھی نشان نہیں ہے۔

(سناٹا)

سفاک خاں: سفاک کو خان سے موازنہ منظور نہیں۔ لیکن شاید خان کے پاس کوئی طلسماتی مرہم ہے جس سے زخموں کے نشان مِٹ جاتے ہیں۔

ظالم خاں: (ظالم خاں قہقہہ لگاتا ہے) نہیں، یہ وہ راز ہے جس کو ظالم خاں نے اپنے بوڑھے اتالیق سے سیکھا تھا۔

(توقع آمیز خاموشی)

جانتے ہو وہ راز کیا ہے؟ —— امن ہو یا جنگ، کسی کو پہلا وار کرنے کا موقع ہی مت دو۔ دوست بھی اگر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہو اور تمھیں اس کی نیت پر شک کا شائبہ ہو جائے تو اس کا ہاتھ قلم کر دو۔

بی بی جان: اور تجھ جیسے ظالم کے دل میں ایسا گمان قطعاً بعید از قیاس نہیں ہو سکتا کہ ایک روز کوئی ہاتھ تیری گردن کی طرف بھی بڑھنے

والا ہے۔ جو تجھ کو تیرے گناہوں کی سزا دے گا۔ شقی اتالیق کے شقی شاگرد کو شاید اپنا انجام بھی معلوم ہوگا۔

ظالم خاں: انجام ——— (قہقہہ) لیکن استاد اور شاگرد دونوں کو اس پہ فخر تھا کہ رقت مجھے چھو کر بھی نہیں گئی۔ جب میرے اتالیق کو اپنے مرنے کا یقین ہوگیا تو اس نے اپنی فصد کھول دی اور غلام سے کہا کہ میرے معرکوں کا حال مجھے سناؤ۔ اور پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک اشک سا جو مرنے والے کی آنکھوں سے ڈھلک جایا کرتا ہے اُس کی آنکھوں میں وُہ بھی نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا کہ مرد کی آنکھ میں آنسو، بزدلی کی دلیل ہوتا ہے۔

بی بی جان: ہاں ——— تُو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے شاید ——— جلاد خاں کی لاش کو دیکھ کر تیری آنکھوں میں بھی تو آنسو نہیں آئے تھے، اور تُو نے اپنا منہ دُوسری طرف پھیر لیا تھا گویا وہ تیرے بیٹے کی نہیں کسی اجنبی کی لاش تھی۔

ظالم خاں: خاموش دریدہ دہن عورت!

(ظالم خاں غصے میں کچھ بڑبڑا کے سنبھل جاتا ہے اور سفاک خاں سے مخاطب ہوتا ہے)

ہاں تو سفاک خاں؛

سفاک خاں، عالیجاہ!

ظالم خاں، تُو اپنے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ ستر معرکوں کے زخم، ستر جنگوں کے نشان کسی بھی تیغ آزما کے لیے باعثِ فخر ہوسکتے ہیں۔ لیکن تو میری بیٹی سموم کے لیے کیا تحفہ لایا ہے جس سے تیرے دل میں اس کے لیے خواہش اور قدر دانی کا پتا چل سکے۔ ایسا تحفہ جس کو دیکھ کر رقیب بھی سر جھکا دے۔

(سفاک خاں کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنستا ہے ——— سفاک بھی فرمائشی قہقہہ لگاتا ہے —— حاضرین بھی ایک دُوسرے کے کندھوں پر ہاتھ مار کے ہنستے ہیں ——— سفاک مڑ کر تالی بجاتا ہے اور پھر مکمل سناٹا چھا جاتا ہے)

سفاک خاں، فاتحِ دوراں کی بیٹی کو اس کے باپ کا سپہ سالار تحفوں سے بلند و بالا گردانتا ہے۔

ظالم خاں: تیری دانائی قابلِ داد ہے سفاک خاں!

سفاک خاں، خادم، خانِ اعظم کی مردم شناسی کا احسان مند ہے۔

ظالم خاں؛ تیری دلاوری اور دانائی کا میں ہمیشہ قائل تھا۔ مگر دُولہا کا دُلہن کو تحفے تحائف دینا ایک دستور بن چکا ہے۔

سفاک خاں: سفاک خاں کا سر بھی خان اور اس کی بیٹی کے لیے حقیر تحفہ ہونا ——— تاہم ———

(سفاک خان تالی بجاتا ہے۔ مختلف ممالک کے ملبوسات میں ملبوس کنیزیں، طرح طرح کے خوان لیے، ایک ایک کر کے خان کے سامنے سے گزرتی ہیں اور ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ہر بار جب کوئی کنیز خان کے سامنے جھکتی ہے تو حاضرین نعرۂ تحسین بلند کرتے ہیں۔ آخر میں ایک خوبرو نوجوان ہرن کی کھال کا لباس پہنے آتا ہے)

اور یہ آخری آہُو نے تتار ہے۔ جب اِس کے لہو کی بُوندیں اپنی مادہ کو پکارتی ہُوئی نافہ بن جاتی ہیں تو طائرانِ شفق رنگ نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ اور پھر کائنات کی تمام آوازیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ آہُو نے تتار اور اس کی مادہ کے سانسوں اور سُموں کی صدا کے سوا! بعض لوگ اس ساعت کو بہشت کا نام دیتے ہیں۔ ایک لازوال لمحہ جس کا اِرتعاش آدمی کی رُوح کو کھینچ لیتا ہے، میں تیری بیٹی کے لیے یہی ساعت بہشت لے کر آیا ہوں ——— لمحۂ فردوس۔

ظالم خاں: (بی بی جان سے، تیری بہشت تو یہیں آ گئی بُڑھیا۔ لیکن دوزخ، جس سے تو مجھے ڈرایا کرتی ہے اس کی تو اب تک کوئی خبر نہیں۔

بی بی جان: وہ ساعت قریب آ رہی ہے جب تو کہے گا کہ اے کاش! میں نے اس کی آرزو نہ کی ہوتی۔

ظالم خاں: سنا ہے دوزخ میں خُوب آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ دھڑا دھڑ جلتی ہُوئی بستیوں اور شعلوں میں لپٹے ہُوئے شہروں کی مانند۔

بی بی جان: ضروری نہیں کہ آگ ہی ہو، بھڑکتی ہُوئی دکھائی دینے والی۔

ظالم خاں: ہُوں؟

بی بی جان: تپ کی طرح — یا پھر ضمیر کی آگ ہوتی ہے جیسے!

ظالم خاں: یہ ہذیان سُن رہا ہے سفاک!

(دونوں قہقہہ لگاتے ہیں)

آگ کی کوئی اور قسم بھی ہوتی ہے؟ (بیٹوں سے) شقاوت، ہلاکت!! بچپن میں تمہیں پہیلیوں کا بہت شوق تھا۔ یہ نئی پہیلی بھی سُن لو "ضمیر کی آگ"! ——— ہاں، بڑی بی! آگ کی اور قسم کوئی؟

بی بی جان: اور حسد کی آگ، جو حاسد کو اندر ہی اندر کوئلہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔

ظالم خاں: سُن رہے ہو لڑکو؟

شقاوت
اور ہلاکت: سُن رہے ہیں خان!

ظالم خاں: اور کونسی آگ ہوتی ہے بُڑھیا، عقل کی پُڑیا؟

(قہقہے)

بی بی جان: بھوک کی آگ ——— انتقام کی آگ ——— اور ———————

(معنی خیز خاموشی)

ظالم خاں: اور کیا؟

بی بی جان: ہوس کی آگ۔

(ظالم خاں: (قہقہہ) سُن رہا ہے سفاک؟ سُن رہا ہے ہلاکت؟ (ہنسی کا غوطہ) اور تو بھی سن رہا ہے شقاوت؟ یہ بڑھیا تو ایسی ایسی باتیں نکالتی ہے کہ مارے ہنسی کے آدمی سانس بھی نہیں لے سکتا۔ (ہنسی کا ایک اور دورہ) ہاں، تو

رقابت کی آگ۔

(سفاک کھانستا ہے)

مگر وہ تمہارے تحفے؟

(کنیز، خوان لاتی ہے۔ اس میں دو کھوپڑیوں کو ستار کے تونبے کی طرح ہڈی کی ڈانڈ سے جوڑا گیا ہے)

سفاک خاں: سموم کو موسیقی سے بہت لگاؤ ہے نا —— یہ دو نومولود بچوں کی کھوپڑیاں ہیں اور یہ اُن کی آنتیں۔ اپنی نوعیت کا یہ واحد ساز ہے۔

(ظالم خاں اس ساز کو اٹھاتا ہے اور تانت کو انگلی سے چھیڑتا ہے)

جیسے ماں کے سینے سے چمٹا ہُوا بچہ دودھ کے لیے بلکتا ہے۔ سموم اسے پسند کرے گی۔ (کمر بند سے ایک خنجر نکالتا ہے اور خان کو پیش کرتا ہے)

اور یہ مرصع خنجر شہر نگاراں کی یادگار ہے۔ شاید میں نے ہی پہلی بار اس سے وُہ کام لیا جس کے لیے خنجر بنائے جاتے ہیں۔ شہزادے کے خون کا ایک آدھ جما ہُوا قطرہ شاید اب بھی اس پہ نظر آجائے۔

ظالم خاں: خنجر آزمائی تو کبک و فاختہ پر بھی ہو سکتی ہے سفاک خاں۔ اور کیا لائے ہو تم اپنی دُلہن کے لیے؟

سفاک خاں: گونگے اور بہرے زنگی غلام۔ (زنگی غلام آتے ہیں اور خان کے سامنے کورنش بجا لاتے ہُوئے ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں)

(دو کنیزیں آتی ہیں —— ایک گوری، ایک کالی)

اور یہ ہیں لیل و نہار —— کنیزیں جن میں خود اپنے دلوں کی بات بھی مخفی رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ شہزادیوں کی رازداں، محلوں کی پاسباں۔

ظالم خاں: یہ تیرا بہترین تحفہ ہے۔ راز اُسی وقت تک راز ہے جب تک سینے کے اندر محفوظ ہے۔ لب پہ آیا تو ہوا لے اُڑی۔

(سفاک تعظیماً سجدہ کرتا ہے)

سفاک خاں: اس کے علاوہ ایک جاں نثار کی، وفا، خانِ اعظم —— وفا۔

(ظالم خاں اُس کو سینے سے لگاتا ہے اور پھر بیٹوں سے مخاطب ہوتا ہے)

ظالم خاں: تمہارے باپ نے تمہاری بہن سموم کے لیے غلط شوہر کا انتخاب تو نہیں کیا؟

شقاوت اور ہلاکت: نہیں خانِ اعظم۔

ظالم خاں: درست —— تو اس کو خدمت کا انعام ملنا چاہیے —— سموم!

(تالیاں)

ظالم خاں: سموم ——— جس کی تندی کے سامنے صحرا کے بگولے پیچ و تاب کھا کے رہ جاتے ہیں اور جس کا پالتو چیتا اُس کی ایک ہی ڈانٹ سے پلّے کی مانند دُم دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ سموم کو خبر کرو کہ سفاک اس کو لینے آیا ہے۔

(نوبت بجتی ہے، کنیزیں سُرخ خیمے کی طرف بڑھتی ہیں۔ خیمے کا پردہ اٹھتا ہے اور پھر سناٹا)

یُوں لگتا ہے کہ میری بیٹی سفاک کے ساتھ جانے سے قبل اپنی شہرت کی تصدیق کر رہی ہے۔

(قہقہے)

سفاک خاں: شاید تم کو بھی اپنی شہرت کا کوئی ثبوت دینا ہوگا سموم کے سامنے۔

(سفاک قہقہہ لگاتا ہے اور خیمے کی طرف بڑھتا ہے لیکن پردہ اٹھا کے گویا بُت بن جاتا ہے۔ پھر دو کنیزیں خیمے سے ہاتھ پاؤں بندھی ایک کنیز کو اٹھا کر باہر لاتی ہیں۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے۔ ظالم خاں قہقہہ لگاتا ہے)

ظالم خاں: شاید میری بیٹی نے جاتے جاتے کوئی نیا کھیل ایجاد کیا ہے۔

(کنیزیں دوسری کنیز کے ہاتھ پاؤں کھولتی اور اس کے مُنہ سے کپڑا نکالتی ہیں)

تیری آقا کدھر ہے لڑکی؟

(کنیز سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی ہے لیکن چُپ ہے)

سفاک خاں: خان پوچھتا ہے کہ شہزادی سموم کہاں ہے لڑکی؟

(کنیز پھر بھی کوئی جواب نہیں دیتی)

یہ کنیز بہری تو نہیں ہے؟ یا گونگی؟

ظالم خاں: اتنی خوش گلو اور خوش گفتار لڑکی رباط میں نہیں ہوگی سفاک۔ یہ تو سموم کو شرارت سوجھی ہے کوئی ——— تجھے تنگ کرنے کے لیے۔

(دونوں قہقہے لگاتے ہیں)

سفاک خاں: اور یہ اس کی ہمراز ہے؟

ظالم خاں: دلوں کے راز تو دل ہی جانتے ہیں۔ لیکن کنیزیں اکثر ہمراز ہُوا کرتی ہیں۔

سفاک خاں: اس کو شاید یہ معلوم نہیں کہ سفاک خاں کے پاس ایک ایسی طلسماتی کلید ہے جس کے سامنے دلوں اور زبانوں کے قفل آپ سے آپ کھل جاتے ہیں۔

(وہ تیزی سے خیمے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کا ایک غلام ایک کوڑا اس کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ وہ کوڑا

[illegible] سا ہو آتا ہے۔ سامنے [illegible] قہقہہ لگاتے ہیں۔ ظالم خاں سفاک خاں کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

ظالم خاں: رک جاؤ سفاک۔

ہر چند کہ اس خوش گلو لڑکی کی چیخ بھی سازندے یا مرغ کی طرح خوش آیند ہوگی۔ لیکن کچھ [illegible]

سختی کرنے سے اور مُہر بہ لب ہو جاتے ہیں۔ سختی ان کی ضد کے لیے تازیانے کا کام کرتی ہے۔ یہ لڑکی انہی خیموں میں پلی بڑھی ہے اور سموم کی منظورِ نظر ہونے کے سبب خواجہ سراؤں نے بھی اس سے کبھی سختی نہیں برتی۔ یہ صرف التفات کے معنی جانتی ہے۔ انعام و اکرام کا مطلب سمجھتی ہے ـــــ اور ـــــ جانتی ہے کہ یہ داد و دہش کی شب ہے۔

(سفاک خاں اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر کنیز کے گلے میں ڈال دیتا ہے وہ اس کے قدموں میں سسکیاں لیتی ہوئی گر پڑتی ہے)

لڑکی : (ہچکیاں لیتی ہوئی) وہ کسی اور کی محبت کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھی خان!

سفاک خاں: تو کیا بک رہی ہے لڑکی؟

(لڑکی دو زانو ہو جاتی ہے، سر ہلاتی ہے اور اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانک لیتی ہے)

دروغ گوئی کی سزا کا علم ہے تجھے؟

(لڑکی پھر سر ہلاتی ہے کہ ہاں)

سفاک خاں: لیکن وُہ مردود کون ہے لڑکی؟

لڑکی : خان زادی کا میر شکار۔

ظالم خاں: ناہنجار ـــــ احسان فراموش! دشت غزال کے قتل عام میں جس کی معصوم صورت پہ ترس کھا کے میں نے اپنی تلوار روک لی تھی لیکن افعی کا بچہ ڈس کے رہا۔

سفاک خاں: وہ اب کہاں ہیں لڑکی؟

لڑکی : میرا مُنھ بند کرتے وقت وہ کوہ سُرخ کا نام لے رہے تھے۔

ظالم خاں: کوہ سرخ کی کیا بساط ہے ـــــ ظالم خاں کے غضب سے وہ سمندر کی غاروں میں بھی نہیں بچ سکتے۔ ان کا تعاقب کیا جائے۔ شکاری کتوں کے ساتھ ان کا سراغ لگایا جائے سفاک! ـــــ اور انھیں زندہ یا مُردہ میرے سامنے لایا جائے ـــــ رہا تو سفاک خاں تو تیرے لیے میری دُوسری بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ جس کی زلفیں مارِ صحرا کی مانند لہراتی ہیں۔ اُس کی کم عمری کا غم نہ کھا۔ مرد کے تصوّر کی حدّت سے ہماری لڑکیاں خوبانیوں اور انجیروں کی طرح پک جاتی ہیں ـــــ شاخ پر ہی۔

بی بی جان : اتنا بے حیا باپ بھی دنیا میں نہیں ہوگا۔

ظالم خاں: تو خاموش رہ بڑھیا! تہذیب کے بادے انسانی فطرت کو نہیں بدل سکتے ـــ اور پھر میں اپنی بیٹی کی بات کر رہا ہوں۔ تیری بیٹی کا ذکر نہیں کر رہا ـــــ اس کی غداری کا مجھے غم ہے۔ جب اس کی ماں مری تھی تو میں نے اس کو کسی بچھیری کی طرح سانسوں کی آنچ دے دے کر سنبھالا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اس ذلیل فاحشہ کو اسی دن کے لیے زندہ کر رہا ہوں میں تجھ سے شرمندہ ہوں سفاک!

بی بی جان: پاکدامن عورتیں صرف پاکباز مردوں کا انعام ہوتی ہیں —— جن کے ماں باپ انھیں اپنے ہاتھ سے رخصت کرتے ہیں۔ خنزیروں کے ریوڑ میں ایک کیا اور دُوسرا کیا۔

ظالم خاں: تُو ! —— تو پھر بولی منحوس عورت !

بی بی جان: میں وقت کی آواز ہوں ظالم خاں —— انتقام کی صدا ! —— تو مجھے چُپ نہیں کر سکتا —— میں بے کسوں کی فریاد ہوں۔ جس کی تاثیر سے عرش کے کنگرے ہل جاتے ہیں —— ابھی تو اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔

(پردہ)

فصل سوم

(ظالم خاں کا خیمہ —— ظالم خاں مے نوشی میں مصروف ہے —— ایک کنیز مورچھل جھل رہی ہے، ایک دف کے ساتھ کوئی وسط ایشیائی رقص کر رہی ہے)

ظالم خاں: (چیخ کر) بند کرو یہ شور !

(رقص ایک دم رُک جاتا ہے —— رقاصہ بُت بن جاتی ہے، جیسے کسی دُوسرے حکم کی منتظر ہے)

(ظالم خاں کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے)

نہیں نہیں وہم تھا میرا —— وہم ! —— وہم —— وہم —— لیکن وہ مجھے پکار رہی ہے، جیسے ہر شکار کے بعد پکارا کرتی تھی —— اپنے آقا اپنے اسوار سے ہنہنا کر داد طلب کر رہی ہو جیسے۔ اور کہہ رہی ہو: دیکھا میں نے سوئر کو کس کس طرح گھیرے میں لیا، اور تیرے نیزے کی زد میں لا کر اس پہ حلقۂ زیست کس طرح تنگ کر دیا !

ایک کنیز، رقاصہ سے: ہمیں تو کوئی آواز نہیں آئی۔ شاید یہ شراب کی تاثیر ہے۔

دوسری رقاصہ: خان آج معمول سے زیادہ پی گیا ہے، یہ ساتواں جام تھا۔

ایک رقاصہ: ہفت آتشہ کا ساتواں جام۔

ظالم خاں: (غضب ناک) پی مَیں رہا ہُوں، اور پیمانوں کا شمار تم کر رہی ہو بدبختو ! —— نشہ ہو گیا ہے مجھے۔ یہی کہنا چاہتی ہو؟ —— سُن لو، اور آیندہ کے لیے گرہ سے باندھ لو کہ نشہ مجھے اُس وقت ہوتا ہے بیوقوف ہرنیو، جب خون کے دریا بہہ رہے ہوں، ہفت آتشہ کے شیشہ و قدح سے ظالم خاں کو نشہ نہیں ہوتا۔

(تلوار کھینچ کر دونوں کو خیمے کی دیوار کے ساتھ دوش بدوش کھڑا کر کے ان کی گردن پہ تلوار رکھ دیتا ہے)

بولو —— ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا؟

دونوں: نہیں —— خانِ اعظم !

(خان تلوار ہٹا کے قہقہہ لگاتا ہے)

ظالم خاں: تم ناچتے ناچتے رک کیوں گئیں؟ —— ناچو تا آنکہ تمہارے پاؤں کے زنگولے میرے لہو دوڑنے لگیں۔

(لڑکیاں ناچتی ہیں —— ظالم خاں لڑکھڑاتے ہوئے، ان کے ساتھ ناچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن گر پڑتا ہے پھر اُٹھتا ہے)

ہو! (غلام آتا ہے) اُس جوشاندے کی پُڑیا کو بلاؤ —— طبیب کو۔

(غلام جاتا ہے طبیب کو لے کر لوٹتا ہے —— اور خود واپس چلا جاتا ہے)

طبیب: غلام کورنش بجا لاتا ہے خانِ دوراں! —— حضور کے دشمنوں کی طبیعت ناساز تو نہیں ہے آقا؟

ظالم خاں: تمہاری تہذیب و تمدن اور زبان کے محاورے میری سمجھ سے باہر ہیں حکمت خاں —— اِس خیمے میں دشمن صرف اپنا سر قلم کروانے کے لیے آئے گا یا خراج دینے۔

طبیب: میرا مطلب ہے، خان خدانخواستہ بیمار تو نہیں؟

ظالم خاں: تیرا خدا، خان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا حکمت خاں۔

طبیب: گزارش ہے کہ نصف رات گئے جب طبیب کو طلب کیا جائے تو ——

ظالم خاں: آقا اپنے غلام کو ہر وقت طلب کر سکتا ہے گاؤزبان کے ڈنٹھل!

طبیب: غلام حکم کا منتظر ہے۔

ظالم خاں: کاش تُو نے یہ کہا ہوتا کہ "بلا وجہ نیند میں خلل مجھے خوش نہیں آتا ہے ظالم خاں! مَیں جا رہا ہوں" لیکن تیری قوم میں یہ کہنے کی جرأت ہوتی تو آدھی رات گئے میرے سامنے دست بستہ کیوں نظر آتا —— ضرورت سے زیادہ دولت قوموں کو سہل انگار اور بزدل بنا دیتی ہے اور ان کی آوازیں زبان بندی سے پہلے ہی سلب ہو جاتی ہیں۔ غلامی سے پہلے ہی گنگ ہو جاتی ہیں۔ بزدل قوم کے بودے فرزند! تُو، کہ تو نے تمام عمر بنفشہ کی باسی پتیاں چنی ہیں۔ کیا تیرا علم میری چہیتی گھوڑی کے لیے، جو سوئر کی تھوتھنی کا زخم کھا کر تڑپ رہی ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا؟

طبیب: بندہ انسانوں کا علاج کرتا ہے خانِ اعظم!

ظالم خاں: درست! تُو طبیب شاہی تھا۔ تیرے آقا کو نیزہ بازی سے شغف تو ضرور ہو گا؟

طبیب: میرے مولائے نعمت اِس قسم کے کھیل نہایت اہتمام سے دیکھا کرتے تھے۔

ظالم خاں: یعنی محض تماشائی۔

طبیب: حضور

ظالم خاں: تیری راست گوئی قابلِ تعریف ہے —— تیرا آقا اُس وقت بھی تماشائی ہی تھا، جب میری فوج اس کے شہر میں قتلِ عام کر رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کو اپنی پری خانوں کا دُکھ تھا۔ عشرت کدوں کا ماتم، نشاط گاہوں کا غم، شبستانوں کی گل شدہ

شمعوں کا داغ تھا اس کو۔ اور جب اس کی گردن ماری جا رہی تھی تو اس کا سراپا سحر دم کسی زرد رو بجھتے ہوئے شعلے کی طرح لرز رہا تھا۔ تو بھی تو اُسی کے نظامِ حیات کا جزو تھا۔ تیری بیاض میں معجونوں، مرکبات اور کشتوں کے سوا اور کیا ملے گا! لیکن تیرے آقا کو کبھی تو کوئی زخم ضرور لگا ہوگا —— بول! —— بولتا کیوں نہیں جانشینِ سقراط؟ —— تیر، تلوار، خنجر کا زخم؛ پتنگ اڑاتے وقت ڈور سے ہاتھ تو ضرور کٹا ہوگا —— اس سے تو انکار ناممکن ہے کیوں؛ (قہقہہ)

طبیب : جہاں پناہ دستانے پہن کر پتنگ اڑایا کرتے تھے خانِ دوراں!

ظالم خاں ؛ (قہقہہ) خوب! لیکن ابیاتِ خرافات کی بیاض کے لیے کلک تراشتے وقت تو ——

طبیب ؛ خوشنویسوں کی موجودگی میں ان کو کلک تراشنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔

ظالم خاں ؛ شاید شعر کہنے کے لیے بھی خوش گوار، ماہر لوگ موجود ہوں جنہوں نے اپنے ہنر کو وظیفوں اور خلعتوں کے عوض بیچ دیا ہو۔

طبیب ؛ نمکخوار یہ کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔

ظالم خاں ؛ حیرت ہے کہ آدمی کو عمر بھر خراش تک نہ آئے —— تاہم ایک بار پھر سوچ لے مسیحِ دوراں —— شاید کوئی بھولی بسری بات یاد آجائے۔

طبیب ؛ حضور —— ایک بار

ظالم خاں ؛ ہاں، ہاں —— ایک بار۔

طبیب ؛ سیرِ گل کے موسم میں شہد کی مکھی نے۔

ظالم خاں : (قہقہہ) خوب خوب! وہ منظر تو دیدنی ہوگا۔ (تالی بجاتا ہے) پروانہ!

(کنیز شہد کی مکھی کا سا لباس پہنے آتی ہے)

وہ کونسا ناچ ناچا کرتا ہے تو —— رقص النمل۔

(رقاصہ شہد کی مکھی کا ناچ شروع کرتی ہے —— اس کے ساتھ ہی ظالم خاں تالی بجاتا ہے۔ ایک حبشی آتا ہے)

حبش خاں ؛ اس عطار کو لے جاؤ جس کی دُکان میں نشاط گاہوں کے لیے مجربات کے سوا اور کچھ نہیں۔ زخم کے لیے مرہم، نہ زلیست کے لیے تریاق! —— لے جاؤ اور اس کا سر مُونڈ کے اُس پر گوبر کا پلستر باندھ کر اسے صحرا میں چھوڑ دو۔

(غلام گڑگڑاتے ہوئے طبیب کو لے جاتے ہیں —— رقص تھوڑی دیر جاری رہتا ہے، اتنے میں ایک اور غلام آتا ہے)

غلام ؛ داروغہ اصطبل حاضری کی اجازت چاہتا ہے خان!

ظالم خاں : داروغہ اصطبل؛ (قدرے توقف) اس سے کہہ دو کہ خان جانتا ہے کہ وہ کیا کہنے آیا ہے۔ اُس سے کہہ دو کہ رہوار کی میت ایسی جگہ گاڑی جائے جہاں درندوں کا گزر نہ ہو —— اور —— شکاریوں کو حکم دیا جائے کہ اس جنگل سے سوئر

کی نسل ختم کر دی جائے جس کے دانتوں نے میری سبک گام کو مجھ سے چھین لیا۔ جب وُہ اپنے گال میرے گالوں سے مس کرتی تھی تو ہمیشہ کسی تندرست عورت کی طرح محسوس ہوتی تھی، جس کے بدن سے آرزوؤں کی بھاپ اُٹھ رہی ہو —— (فاصلہ سے) لیکن تُو کیوں بُت بن گئی؟ رقص کا مطلب ہے حرکت —— تو رقص کوئی جس سے سبک گام کی یاد تازہ ہو کر بھول جائے۔ کوہ و صحرا میں اس کے سموں کی گونج کی طرح۔

(رقص شروع ہوتا ہے —— ظالم خاں شراب کے جام میں جھانکتا ہے اور اپنے عکس سے باتیں کرتا ہے)

جلاد کے بعد سموم، سموم کے بعد سبک گام —— ایک کے بعد دوسرا —— اور دوسرے کے بعد تیسرا زخم —— یہ اُس بدعا کی تاثیر تو نہیں ہے ظالم خاں؟ (پکارتا ہے) ہو!

(کنیز آتی ہے)

وہ عورت کہاں ہے؟

(کنیز جاتی ہے)

ایک کے بعد دُوسرا، دُوسرے کے بعد تیسرا۔

(کنیز آتی ہے)

کنیز : وہ کہتی ہے کہ رات اللہ نے عبادت اور استراحت کے لیے بنائی ہے۔

ظالم خاں : اور اِتنے سے جواب کے لیے تُو نے اِتنی دیر لگا دی مردود! —— چاہنے والا مل گیا ہوگا کوئی راہ میں۔

کنیز : وہ فرش پہ دوزانو بیٹھی، ہاتھ پھیلائے زیرِ لب کچھ کہہ رہی تھی آقا —— کبھی کبھی کوئی لفظ بلند ہو جاتا اور خیمے کے پردے اس کی گونج سے لرز جاتے۔

ظالم خاں : بددعا بددعا۔ میں جانتا ہُوں وہ کیا پڑھ رہی تھی —— بددعا، کنیزک! —— اِس خانوادے کی تباہی کے لیے بددعا۔

(کنیز کی طرف بڑھتا ہے، وہ سہم جاتی ہے)

بددعا سے —— تجھ کو بھی —— ڈر لگتا ہے کنیزک؟

(لڑکی اثبات میں سر ہلاتی ہے)

بزدل! —— بددُعاؤں سے ڈرتی ہے بیوقوف لڑکی؟ یا شاید تو سمجھتی ہوگی کہ خان بھی بددُعاؤں سے ڈرتا ہے —— تائید کر اِس کی —— خوشنودی حاصل کرنے کے لیے —— ہوں؟

(کنیز، سہمی ہُوئی کبھی انکار اور کبھی اقرار کے طور پہ سر ہلاتی ہے)

دیکھ (اس کا بازو پکڑ کے قہقہہ لگاتا ہے) یہ گرفت —— اس کی سختی محسوس کر رہی ہے نا؟

یہ پنجہ —— ظالم خاں ڈرنے والے دن پیدا نہیں ہوا تھا —— اس روز چمکتا ہوا سورج گہنا گیا تھا کہ آج میرا ہمسر پیدا

ہو گیا (گرفت ڈھیلی کر کے ——— رازدارانہ لہجے میں) جلاد ——— سموم اور سبک گام تو حادثے تھے ——— اور ایسے چھوٹے بڑے ہزاروں حادثے ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ حادثات کی دنیا میں چند اور حادثے ———

(بی بی جان آتی ہے)

ظالم خاں: (چونک کر) تو! ——— لیکن تو نے کہا تھا کہ رات ——— عبادت اور استراحت کے لیے بنی ہے یا بنائی ہے تیرے خدا نے۔ تجھ کو تو سجدہ میں ہونا چاہیے تھا یا خواب میں!

بی بی جان: تیری تباہی سے پہلے مجھے نیند نہیں آئے گی ظالم خاں!

ظالم خاں: میری تباہی! (قہقہہ) بے وقوف خچر!

بی بی جان: تیری بد زبانی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

ظالم خاں: میں معافی چاہتا ہوں۔

بی بی جان: تو کس کس جرم کی معافی مانگے گا ——— اور پھر میں ہوں بھی کون معافی دینے والی ——— تیری کنیز آئی تھی کوئی اور ستم ظریفی سوجھی ہے تجھے۔

ظالم خاں: تو سمجھتی ہے کہ یہ تیری بد دعا کا اثر تھا ——— جلاد اور سموم اور سبک گام سنکی بڑھیا! ——— یہ سب حادثے تھے! زندگی اور موت کی طرح کے حادثے۔

بی بی جان: لیکن ہر حادثے کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔

ظالم خاں: مثلاً

بی بی جان: سزا اور جزا ——— بدلہ یا صلہ ——— تنبیہ یا عبرت۔

ظالم خاں: خوب خوب!

بی بی جان: فوری یا دیر سے ——— ظلم کا بدلہ وہاں تو مقدر ہو ہی چکا ——— یہاں بھی۔ اس دنیا میں ——— جیتے جی بھی۔

ظالم خاں: جیتے جی کوئی شخص ظالم خاں کو زیر نہیں کر سکتا ——— مر گئے تو خاک ——— تیری بد دعا خاک کے ذروں کو ڈھونڈتی پھرے گی اکٹھا کر کے سزا دینے کے لیے۔ (قہقہہ لگاتا ہے)

بی بی جان: عدم سے وجود میں لانے والا سب کچھ کر سکتا ہے۔

ظالم خاں: تو باؤلی ہو گئی ہے بڑھیا! بیٹوں اور بیٹیوں اور قوم کے غم سے تو اپنے اوسان کھو بیٹھی ہے۔

بی بی جان: اور اب مجھ کو یہ دیکھنا ہے کہ مجھے اس حالت پر پہنچانے کے بعد تجھ پہ کیا گزرتی ہے۔

ظالم خاں: کیا تو سچ مچ باور کر بیٹھی ہے کہ گھوڑے سے گر کے میرے بیٹے جلاد کی موت ——— میری بیٹی سموم کا اپنے میر شکار کے ساتھ فرار اور میری رہوار سبک گام کا سؤر کے دانتوں سے زخم کھا کے مر جانا تیری بد دعا کا نتیجہ ہے؟

بی بی جان: اس کا جواب وقت دے گا۔

ظالم خاں ؛ دنیا مجھ کو خانِ دوراں کے نام سے پکارتی ہے —— زمانے کے دھارے بدلنے والا۔

(دفعتاً کسی نوجوان عورت کے چیخنے اور پھر اُسی کے دیوانہ وار قہقہوں کی آواز آتی ہے ——
سناٹا —— اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی آوازیں —— جوار بھاٹا ہو جیسے)

اتنی رات گئے یہ کون چیخ رہا ہے !

(ایک کنیز لرزہ براندام آتی ہے اور بوکھلائی ہُوئی خان کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے)

کنیز ؛ شہزادی آتش کو نصیب دشمناں کچھ ہو گیا ہے خانِ دوراں —— چیختی ہے کبھی ، ہنستی ہے کبھی اور کبھی دیوانہ وار رقص کرنے لگتی ہے۔

ظالم خاں ؛ ابھی ابھی یہ اسی کی آواز سنائی دے رہی تھی ؛

بی بی جان : میری بیٹیوں کا قاتل اپنی بیٹی کی آواز بھی نہیں پہچان سکتا !

ظالم خاں ؛ (غصہ دباتے ہُوئے) تو پھر بولی حرافہ !

بی بی جان ؛ جب سے تیری بیٹی ، تیرے معتمد سفاک خاں کے پہلو سے بچنے کے لیے اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوئی ہے ، تجھ کو ہر عورت حرافہ نظر آتی ہے کور چشم !

ظالم خاں ؛ ایک ایک بات تیری ، ایک ایک حرف تیری زبان سے نکلا ہوا ، تیر و نشتر کا حکم رکھتا ہے۔

بی بی جان ؛ سودائے جہانگیری کا یہ دیرینہ علاج ہے ظالم خاں ! —— یُوں بھی جنون کی فصد کھولنا اطبا کے ہاں پرانا علاج چلا آیا ہے۔

(شہزادی آتش کی چیخوں اور دیوانہ وار قہقہوں کی ایک اور لہر)

• تیری بیٹی تجھے بلا رہی ہے شاید۔

ظالم خاں؛ میری بیٹی ؟

(کھلے سُرخ بالوں والی ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتشیں کپڑوں میں ملبوس خیمے میں داخل ہوتی ہے)

تُو —— جوالہ بیگم تُو یہاں کس لیے آئی ہے ؟

جوالہ بیگم : میری بیٹی تڑپ رہی ہے اور تو یہاں عیش و نشاط کی محفل جمائے بیٹھا ہے۔

ظالم خاں : وُہ تیری ہی بیٹی نہیں ہے جوالہ بیگم ، اُس کی رگوں میں میرا لہو بھی گردش کر رہا ہے۔

جوالہ بیگم : تیرا لہو سفید ہو چکا ہے ورنہ تو اس کو نظر بند نہ کر دیتا۔ تاروں کی چھت ، جنگل کا سبزہ ، ہوا کے جھونک سب اس کے لیے ممنوع ہیں —— میر شکار کے ساتھ فرار ہونے والی سموم میری بیٹی تو نہیں تھی ، جو تُو نے آتش کو خیموں کی رسیوں اور قناتوں کی طنابوں سے باندھ رکھا ہے اور تیری منظورِ نظر کنیزوں اور معتمد زنگی غلام کے سوا کسی اور کا اس کے خیمے سے گزر ہی نہیں۔

ظالم خاں ؛ اس کو اپنے آپ سے بچانے کے لیے یہ ضروری تھا۔

جوالہ بیگم ؛ سفاک کی خاطر تو نے میری بیٹی کو جہنم میں جھونک دیا۔ جب سے نیا چاند ہوا ہے وہ بار بار سوتے سے ہڑبڑا کے اُٹھتی ہے

اور پھر کبھی، چیخنے لگتی ہے اور کبھی، دیوانہ وار قہقہے لگانے لگتی ہے — قبیلے کے پیر مرد کو بُلا، جس کی آنکھیں اندھیروں کے بھید بتاتی ہیں۔ اور اس سے پُوچھ کہ میری بیٹی کو کیا ہو گیا ہے ؟

کنیز : وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔

پیر مرد : (لاٹھی ٹیکتا ہُوا آتا ہے اور پُر اسرار انداز میں پکارتا ہے) سایہ —— سایہ —— سایہ۔

جوالہ بیگم : (خان سے) سُن رہا ہے ؟ (ظالم کو جھنجھوڑتی ہے) سُن لیا !

ظالم خاں : سایہ ؟ کس کا سایہ ؟ کیسا سایہ ؟ مجھ کو تو کوئی سایہ نظر نہیں آ رہا۔

پیر مرد : آگ کا سایہ۔ الاؤ کے سینے میں اندھیرے کا سایہ۔ دن کے پہلو میں رات کا سایہ۔

ظالم خاں : مہمل۔ بے معنی۔ بکواس !

جوالہ بیگم : آگ سے مراد آتش۔ اس پہ سایہ ہے۔ آسیب ہے !

(دفعتاً نسوانی چیخوں کی آواز قریب آتی ہے اور ایک نوجوان لڑکی جس کے بال شعلوں کی طرح سُرخ ہیں، لباس نارنجی ہے، ناچتی ہُوئی داخل ہوتی ہے)

لے خود ہی دیکھ لے۔

(لڑکی دیوانہ وار قہقہہ لگاتی ہے)

پیر مرد : سایہ ! سایہ ! یہ اُس کی آواز ہے — اُس کا قہقہہ ! — میں اِس آواز کو پہچانتا ہُوں۔

ظالم خاں : اور اس کا علاج بُوڑھے ؟ علاج اس کا ؟

پیر مرد : اذیت —— سزا

جوالہ بیگم : نظر بندی اور آسیب کے سوا بھی کوئی اذیت باقی رہ گئی ہے میری بچّی کے لیے ؟

ظالم خاں : تُو چُپ رہ عورت ! — ہاں، بوڑھے ! علاج کیا ہے اس کا ؟

پیر مرد : سائے کو سائے سے کاٹو — دُھوئیں کو دُھوئیں سے اڑا دو —— گیلی لکڑی کا کڑوا دُھواں۔

(آتش سمٹ سی جاتی ہے)

آتش : نہیں نہیں نہیں۔ (چیختی ہے)

پیر مرد : یہ آسیب کی آواز ہے۔ آسیب کی آواز۔

ظالم خاں : (تالی بجاتا ہے) ہو۔

(غلام آتے ہیں۔ آتش دوڑ کے باپ کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ جاتی ہے)

پیر مرد : گیلی لکڑی کا کڑوا دُھواں۔

آتش : (گڑگڑاتے ہُوئے) مجھے معاف کر دو، معاف کر دو مجھے ! کچھ نہیں چاہیے مجھ کو ! — کوئی آسیب نہیں ہے مجھے —

مجھے معاف کر دو خان بابا ــــ معاف کر دو مجھے۔

پیر مرد: اب معافی مانگ رہا ہے آسیب، سزا سے بچنے کے لیے منتیں کر رہا ہے۔

(وقفہ اور لڑکی ہچکیاں)

ظالم خان: جا ــــ معاف کیا ــــ اب چُپ بھی ہو جا لڑکی ــــ کہہ تو دیا معاف کیا میں نے۔

بی بی جان: اور اُس کو بھی معاف کیا جس کا سایہ اس لڑکی کو پریشان کر رہا ہے؟

ظالم خان: میں تیری بات نہیں سمجھ سکا بڑھیا!

بی بی جان: تیری کھوپڑی میں شاید اُونٹ کی اوجھڑی بھری ہے جو تو اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتا اور تیرے کانوں میں سیسہ پڑا ہے جو لشکر کی چہ میگوئیاں نہیں سن سکتا۔ تیری بیٹی آس لگائے بیٹھی ہے ــــ کہ تو نے اُس کو بھی معاف کیا، آسیب کو بھی۔

ظالم خان: تو پھر پہیلیاں بوجھوا رہی ہے عیار عورت! ــــ آسیب! کونسا آسیب؟

بی بی جان: وہی جو تیرے منظورِ نظر، سفاک کی بھینٹ چڑھانے کے لیے، اِس بھیڑ کی رکھوالی کر رہا تھا ــــ زنگی غلام ــــ محافظ اِس کا۔

ظالم خان: (چیخ کر خنجر کھینچتا اور بی بی جان پہ وار کرتا ہے) بڑھیا!

(آتش درمیان میں آجاتی ہے اور خنجر بی بی جان کی بجائے اس کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے)

جوالہ بیگم: (آتش کی لاش سے لپٹ جاتی ہے) ظالم! یہ لہو دیکھ رہا ہے، خونخوار درندے! ــــ اس کا ایک ایک قطرہ انتقام کے لیے پکار رہا ہے بیٹی کے قاتل! ــــ دیکھ رہا ہے یہ خُون ــــ یہ لہو دیکھ رہا ہے؟

ظالم خان: بہہ جانے دو اِس ننگِ خاندان کا لہو بہہ جانے دو یہ، سیاہ خون۔

بی بی جان: خون سُرخ ہی ہوتا ہے دانائے دوراں! گورے، کالے، پیلے گندمی ــــ خون سب کا سُرخ ہی ہوتا ہے۔ خُون کا جلد کے رنگ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ارسطوئے زماں!

ظالم خان: لیکن غلام کے لہُو سے پیدا ہونے والی اولاد بھی غلام ہی ہوتی ہے۔

بی بی جان: ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے تاوقتیکہ تجھ جیسا ظالم اُسے غلام نہیں بنا لیتا۔ رنگ، نسل اور مرتبے کی بنا پر کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔

ظالم خان: چُپ ہو جا رذیل عورت! (کنیزوں سے) اور تم کیا دیکھ رہی ہو؟ (جوالہ بیگم اپنی بیٹی کی لاش سے لپٹ کر بیہوش ہوتی ہے) لے جاؤ ذلت کی ان غلاموں کو لے جاؤ!

(کنیزیں جوالہ اور آتش کو اٹھا کر لے جاتی ہیں)

بی بی جان: سموم جب اپنے میر شکار کے ساتھ فرار ہوئی اور تُو نے اُس کے بدلے آتش کو سفاک کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا تھا تو یاد ہے تُو نے کیا کہا تھا؟

ظالم خاں؛ کیا کہا تھا؟

بی بی جان: کہ اس کی کم عمری کا دھیان مت کر —— مرد کے خیالات کی حدت ——

ظالم خاں: چپ ہو جا ساحرہ۔ میرے غم کو اپنے الفاظ کی ہوا نہ دے۔

بی بی جان؛ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ تجھ کو صدمہ ہوا ہے فاتح عالم! تعجب کی بات ہے کہ ظالم کا بھی غم سے کوئی سروکار ہے!

ظالم خاں؛ مگر مت بھول کہ غم میرے لیے رات کے اندھیرے کی طرح ہے جو دن کے اُجالے کو اور روشن کر کے ظاہر کرتا ہے (شراب کے قدح کی طرف بڑھتا ہے اور جام بھرتا ہے) شراب پیئے گی بڑھیا؟ —— لیکن تیرے مذہب میں تو یہ ممنوع ہے نا۔
کاش! تو جانتی کہ تو نے کیا چیز اپنے اوپر حرام کر رکھی ہے!

بی بی جان؛ جو حیوان کو درندہ بنا دیتی ہے۔

ظالم خاں؛ خود فراموشی کا اس سے بڑھ کر نسخہ جالینوس کے پاس بھی نہیں تھا۔ اور وہ جس کو بیٹوں اور بیٹیوں کا غم ہو۔ تیری طرح۔ اُس کے لیے بھی۔

بی بی جان؛ میرا غم تو غلط کرے گا ظالم! —— تو! —— چند ایک مٹکے اور منگوا لے اس مشروب کے۔ تجھے ضرورت پڑے گی۔

ظالم خاں؛ پھر وہی بددعا —— بیٹوں اور بیٹیوں کے غم نے تجھے کہیں کا نہیں رکھا ہے دیوانی! —— لے اپنے دکھ فشردہ انگور میں ڈبو دے۔

بی بی جان؛ میرا مذہب ہر اُس چیز کی ممانعت کرتا ہے جس سے حلال و حرام کی تمیز مٹ جائے۔

ظالم خاں؛ یہ وہ کشید نہیں ہے عقل کی پڑیا —— خوبانیوں اور انگوروں کے عرق کے علاوہ اس میں آہوئے تتار کا لہو بھی شامل ہے۔
اس کے ایک ایک جرعے میں اپنی ہی جوانی کی خوشبو سے بہکے ہوئے وحشی کی مستی بھی شامل ہے —— ایک ایک بوند اس کی شباب رفتہ کو پکارتی ہوئی آواز ہے —— پی کر تو دیکھ —— چکھ تو سہی۔

بی بی جان؛ مجھ کو اس خرافات سے متاثر کرنے کی سعی لاحاصل ہے وحشی!

(ظالم خاں جام لیے بی بی جان کی جانب بڑھتا ہے)

ظالم خاں: اس کے اندر جھانک کے دیکھ عورت —— اس کی تہہ میں تجھ کو اپنی جوانی کا عکس نظر آئے گا —— دیکھ۔

بی بی جان؛ دیکھ رہی ہوں۔

ظالم خاں؛ (امید افزا لہجہ میں) کیا؟

بی بی جان؛ درندوں کے غول، خون کے دریا، برباد عصمتیں، یتیم بچے، لٹے سہاگ، بھڑکتی ہوئی بستیاں، غلاموں کے ریوڑ، تہذیبوں کے کھنڈر۔

(ہاتھ مار کے پیالہ پھینک دیتی ہے)

لے جاؤ اس پلید شے کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔

ظالم خاں، ناسپاس عجوزہ!

بی بی جان: شیطان لعین!

ظالم خاں، (قہقہہ) مجھے اس واردئے شباب کی قسم کہ تجھ جیسی عدت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ کاش ہم ایک دوسرے کے دوست ہوتے۔

بی بی جان: شاید تُو نے وُہ مقولہ نہیں سُنا کہ مخلص دشمن منافق دوست سے ہزار درجہ بہتر ہوتا ہے۔

ظالم خاں، تجھ جیسی دشمن کا وجود میرے لیے طمانیت کا باعث ہے! اور اسی خوشی میں۔ (تالی بجاتا ہے)

(کنیز آتی ہے)

ہماری مہمان کی ضیافتِ طبع کے لیے شُترِ بے مہار کا رقص!

(شُترِ بے مہار کا رقص شروع ہو جاتا ہے ——— اس دوران میں ظالم خاں دو چار جام غٹاغٹ پی جاتا ہے اور رقص کی داد دیتا ہُوا تخت پہ اوندھا گر پڑتا ہے ——— بی بی چند ساعت بُت بنی دیکھتی رہتی ہے اور پھر جانے لگتی ہے ——— دفعتاً ظالم خاں اٹھتا ہے)

رُک جا غیرت مند خاتون!

(بی بی جان پلٹتی ہے)

تُو نے مجھے سخت مایوس کیا ہے۔ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ تیری غیرت محض الفاظ تک محدود ہے۔ تیرا انتقام ایک انحطاط پذیر عجوزہ کی آواز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ——— اور ——— تیرا وجود ایک مُردہ رُوح ہے جو اپنے پیکر کو صدیاں پہلے چھوڑ چکی ہے۔

بی بی جان، تیرے بہتان کی دلیل کوئی ——— ثبوت اس کا؟

ظالم خاں، میں سمجھتا تھا کہ مجھے بے ہوش پاکر ———————

بی بی جان، میں تجھے قتل کر دوں گی! ——— یہی ہے نا؟ ——— لیکن یہ انجام اس اذیت سے کہیں کم تر ہوتا جس کا تُو مستحق ہے میری بد دعا یاد ہے تجھ کو؟ ——— مرنے سے پہلے تجھے ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔

ظالم خاں، اب تک تیرے انتقام کی آگ بجھی نہیں ہے کیا؟

بی بی جان، میں تجھے جس عذاب میں مبتلا دیکھنا چاہتی ہُوں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ظالم خاں: پی میں رہا ہُوں اور نشہ تجھے ہو گیا جو خواب دیکھنے لگی۔

بی بی جان، خوابوں کو حقیقتوں کے پیرہن پہنتے دیر نہیں لگتی۔ تجھ جیسوں کے لیے عبرتناک انجام کی وعید ہے۔

ظالم خاں، حادثات کو عذاب کا نام دے کر تُو اپنا جی خوش کر رہی ہے کہ یہ بد دُعا کا نتیجہ ہیں۔ لیکن حادثے معمول نہیں بنا کرتے۔

(گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز قریب آتی ہے اور پھر چند گرد پوش لشکری ایک خوبرُو اور کم عمر

نوجوان کو نیزوں کے نرغے میں لیے داخل ہوتے ہیں،

خوب خوب! کوئی نیا غلام ہے شاید! خوبرو ہے ——— بہت۔

ایک لشکری: تیسرے بیٹے ہلاکت خاں کا غلام اور ——— (دُوسرے لشکری کی طرف دیکھتا ہے)

دُوسرا لشکری: اور قاتل، خانِ دوراں۔

ظالم خاں: (چیخ کر اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپاتے ہُوئے) نہیں!

بی بی جان: حقیقتوں کو تسلیم کرنا بے گناہوں کے قتل کی بہ نسبت زیادہ بہادری کا متقاضی ہوتا ہے فاتح عالم!

ظالم خاں: (پنجے پھیلائے بی بی جان کی طرف بڑھتا ہے) خاموش خبیث بُڑھیا!

لشکری: اِس غلام نے اپنے آقا ہلاکت خاں کو جب وہ مرغ زرّیں کی تلاش میں تھا۔ پہاڑ کی چوٹی سے ایک ایسے کھڈ میں دھکیل دیا ہے جس کی تہہ میں تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

ظالم خاں: (غلام کا گلا دباتے ہُوئے) نمک حرام ذلیل کُتّے ——— میرے بیٹے نے تجھ پر ایسا کون سا ظلم کیا تھا جس کا بدلہ تُو نے لیا ——— بول۔

بی بی جان: اِس کا گلا دبا کے تُو اِس سے بولنے کی توقع بھی رکھتا ہے خانِ ——— دوراں؟

ظالم خاں: (غلام کی گردن سے اپنے ہاتھ ہٹا لیتا ہے) تُو مجھے ہر قدم پہ ذلیل کر رہی ہے عورت!

بی بی جان: عزّت اور ذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے ظالم ——— کون جانے تیری تقدیر میں ابھی اور کتنی خرابی رقم ہو چکی ہے۔

ظالم خاں: (کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہُوئے ——— چیخ کر) میرے کان تیری آواز کے لیے بہرے ہو چکے ہیں نجس روح!

بی بی جان: اور تیرے قلب اور آنکھوں پر اللہ تعالیٰ نے مُہریں لگا دی ہیں۔

ظالم خاں: (دانت پیس کر رہ جاتا ہے اور دوبارہ غلام سے مخاطب ہوتا ہے) بول ——— سوئر! میرے بیٹے نے تجھے کیا دُکھ دیا تھا۔ (غلام کے مُنھ پہ چانٹا مارتا ہے وہ لڑکھڑا کے سنبھلتا ہے)

غلام: اُس نے میرے شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا، عبادت گاہوں کی بے حُرمتی کی۔ اُن کے فلک بوس میناروں سے پناہ لینے والوں کو اٹھا اٹھا کے نیچے پھینکا اور معبدوں کو قصاب خانوں میں تبدیل کر دیا۔ اس نے بے بس عورتوں کی چیخوں پر قہقہے لگائے اور خلقِ خدا کو قتل کر کے کھوپڑیوں کے انبار لگا دیے۔ اس نے میری قوم کو نیست و نابُود کر دیا۔

ظالم خاں: لیکن تو بچ رہا؟

بی بی جان: مُوسیٰ، فرعون کے محل میں پرورش پا سکتا ہے، تو تیرے بیٹے سے اپنی قوم کا بدلہ لینے والا بھی تیرے خیموں میں انتقام کی ساعت کا انتظار کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قادر ہے۔

ظالم خاں: تُو پھر اپنے خدا کو بیچ میں لے آئی بُڑھیا ——— لیکن اس کو شاید اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ میرا بیٹا اپنے نام کی ہیبت کے باوجُود کس قدر رحم دل واقع ہُوا تھا۔ خوبرُو نوجوانوں کو دیکھ کر وُہ ہلاکت آفریں جنگجو کی بہ نسبت بعض اوقات شاعر بھی

بن جاتا تھا۔ اس غلام کے چہرے کی معصومیت نے اس کا دل موم کر دیا ہوگا —— دیکھ اس کے چہرے کو دیکھ —— موت کے قرب کے باوجود بھی اس کے چہرے پر ایک ناقابل بیان اور پُراسرار شگفتگی نظر آ رہی ہے۔

بی بی جان: فرض کی ادائیگی کے بعد آسُودگی کا احساس موت کو بے معنی بنا دیتا ہے۔

ظالم خاں: تیری منطق اس کی موت کو نہیں ٹال سکتی —— محترمہ! —— لے جاؤ اور اس کو بھی اسی چوٹی سے گرا کر ہلاکت خاں کے پاس پہنچا دو۔ میرے بیٹے کو اپنے خادم کی ضرورت ہوگی۔

(لشکری غلام کو لے جاتے ہیں)

بی بی جان: غالباً تُو بھی کسی نہ کسی شکل میں حیاتِ بعد الموت کا قائل ہوتا جا رہا ہے ظالم خاں۔ لیکن یاد رکھ کر خلقِ خدا کو دُکھ دینے والوں کے لیے اس دنیا میں بھی عبرتناک سزا ہے۔

ظالم خاں: تُو مجھے دیوانہ کر دے گی بڑھیا!

بی بی جان: دیوانگی تو دُکھوں سے فرار ہوتا ہے —— تو ہوش میں رہے گا —— اور اپنا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھے گا تُو روئے گا لیکن کوئی تیرے آنسو پُونچھنے والا نہیں ہوگا۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے —— ظالم خاں طنزیہ قہقہے لگاتا ہے)

تُو پکارے گا لیکن کوئی سُننے والا نہیں ہوگا۔

تیرے ہونٹ پانی کو ترسیں گے لیکن کوئی تیرے حلق میں پانی کی بُوند ڈالنے والا نہیں ہوگا۔

(ظالم خاں کا قہقہہ اور پردہ)

فصل چہارم —— منظر "۱"

ایک طرف خودرو سبز درختوں کا جُھنڈ —— دوسری جانب اُوپر ایک کونے میں چمکتا ہُوا ظالم خاں کا سُرخ خیمہ۔

سٹیج خالی ہے —— ایک خوبرو کنیز طاؤس ہاتھ میں لیے درختوں کے جھنڈ کی جانب سے چہلقدمی کرتی ہوئی آتی ہے اور طاؤس کے تاروں کو چھیڑتی ہُوئی تماشائیوں کی طرف مُنہ کر کے پتھر پر بیٹھ جاتی ہے یُوں لگتا ہے کہ وُہ فی البدیہہ شعر کہہ رہی ہو —— ایک ایک شعر —— اور اپنی دھن میں محو ہے چند مصرعوں بعد ظالم خاں چپکے سے آتا ہے اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

شمامہ: مری زندگی
زہر آلود اک سانس ہے
جبر آمیز —— اک خواب

خوں آشام دریا کہ جس کا کنارہ نہیں
نہ کشتی
نہ پتوار کوئی
مگر سانس کا زیر و بم
زیر و بم سانس کا

میری ہستی کی ناؤ
تنفس کی لہروں پہ ہچکولے کھاتی
بہے جا رہی ہے
کہ جیسے کنول کا دیا

مری زیست
اک اسپِ تازی کے مانند ہے
بے عناں
دشت و ندیا پہ مثلِ ہوا
اڑا جا رہا ہے یہ مرکب
فقط خارِ مہمیز سے آشنا
نہ جادہ ہے کوئی مگر
نہ منزل کا کوئی نشاں
افق تا افق
ریگِ صحرا ہے
دشت و نما
مری زندگی
مثلِ کبکِ قفس آشنا
نیلگوں — سیمگوں آسمانوں سے محروم ہے — منفعل
مگر —

سوچتی ہوں کہ شاید —— کسی دن
صبا پھر سے دستک دے اور یہ قفس
شوقِ پرواز کی آرزو سے پگھل کر
مہ و مہر کی قربتوں کا بہانہ بنے

ظالم خاں: خوب خوب خوب خوب

(لڑکی کا ساز ہاتھ سے چھُوٹ جاتا ہے —— ظالم خاں ساز اٹھا کے اس کو دیتا ہے)

ڈر نہیں —— ڈر مت —— (ساز کو چھیڑتا ہے) ساز بھی بہت خوب صورت ہے تیرا۔

تو کون ہے لڑکی ؟

شامہ: (صحرانشینوں کی طرح ٹھوڑی، ہونٹ اور ناک آنچل سے چھپاتے ہُوئے) ایک کنیز

ظالم خاں: (اس کے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہُوئے) تیرا چہرہ چھپانے کی چیز تو نہیں۔ ایک عالم کو دکھانے کے لائق ہے۔ نام کیا ہے تیرا ؟

شامہ: کنیز۔

ظالم خاں: ڈر نہیں —— میں تیرا نام پُوچھ رہا ہُوں ساحرہ۔

شامہ: کنیز کا نام بھی ہوتا ہے کوئی ؟

ظالم خاں: (اس کو ٹھوڑی سے پکڑ کے آنکھوں میں جھانکتا ہے) تُو ٹھیک ہی کہتی ہے قتالہ —— کوئی نام تیرے حسن کا متحمل نہیں ہو سکتا —— تیرے آقا کا کیا نام ہے کافرہ ؟

شامہ: آقا۔

ظالم خاں: تیری معصومیت ظالم خاں کو بے قابو کیے دے رہی ہے۔ تو اپنے آقا کا نام بھی نہیں جانتی —— لیکن —— اس کی شکل و صورت —— ناک نقشہ ؟ حلیہ اس کا ؟

شامہ: کنیز کو اس کے آگے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مجال نہیں۔

ظالم خاں: تیری تربیت قابلِ داد ہے —— تیرا وطن

شامہ: خیمہ۔

ظالم خاں: (قہقہہ) تُو اپنے آقا کی آواز پہچانتی ہے ؟

شامہ: خوابگاہوں کے اندھیرے صرف سانسوں کی صدا سُن سکتے ہیں۔

ظالم خاں: تُو شاعرہ بھی ہے لڑکی —— بلکہ ایک نغمہ جو نسوانی پیکر میں ڈھل گیا ہے یا تو قاف کی پری ہے جو میرے لشکر کو بہکانے کے لیے پہاڑوں سے اُتر آئی ہے۔

شمامہ : پریوں کے تو پر ہوتے ہیں۔ (اپنے کندھوں کو دیکھتی ہے)

ظالم خاں : تیرا تجاہل مجھے قتل کر کے رہے گا شاید! —— سُن؛ —— ساحرہ —— تیرے سامنے حاکمِ دوراں ظالم خاں ہاتھ باندھے کھڑا ہے —— حاکمِ دوراں —— دنیا کے بادشاہ جس کے غلام ہیں۔

شمامہ : غلام! —— وُہ کون ہوتے ہیں؟

ظالم خاں : جس کو تُو حکم دے سکے وہ غلام کہلائے گا۔ جس کا جان و مال تیرے قبضے میں ہو، اس کو تیرا غلام کہیں گے۔

شمامہ : میرا کوئی غلام نہیں ہے۔

ظالم خاں : آقاؤں کا آقا، ظالم خاں تیرا غلام ہے قتالہ —— ہاں —— ظالم خاں —— جس نے ایک سے ایک قوم کو زیر کیا، جس نے انسانی کھوپڑیوں سے چوگان کھیلا۔ آج وہ اپنا سر تیرے قدموں پر رکھتا ہے تیری زلفوں کا اسیر۔

شمامہ : اسیر کیا ہوتا ہے؟

ظالم خاں : تیری سادگی نے حاکمِ دوراں کو احمق بنا کے رکھ دیا ہے لڑکی۔

شمامہ : احمق!

ظالم خاں : تیری معصومیت مجھے بے دست و پا کیے دے رہی ہے۔ آتش نفس صحرازادیوں، سرکش شہزادیوں اور خونخوار درندوں کو سدھانے والا ظالم آج سگِ حضوری کی مانند تیری نگہِ التفات کا ملتجی ہے۔

شمامہ : تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میرا آقا تو مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کرتا۔

ظالم خاں : کور ذوق اور اندھا ہے وُہ۔ آج سے تیرا آقا میں ہُوں کنیزک۔

(کنیز سہم جاتی ہے —— اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

ارے تو ڈر گئی قمری —— ڈر نہیں —— میرے ساتھ آ —— اس کنج میں —— اس سُرخ خیمے میں —— جہاں ظالم خاں اور تیرے سوا اور کوئی نہ ہوگا —— جہاں تُو کنیز نہیں ملکہ کہلائے گی —— ملکۂ عالم۔

(اس کو ہاتھ سے پکڑے، چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔ لڑکی تھم تھم کے چلتی ہے اور بار بار پلٹ کر دیکھتی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

منظر ۲

(وقت: —— رات —— شقاوت خاں کا خیمہ جس کے پردوں پر تلواریں اور ڈھالیں آراستہ ہیں —— تخت پر چیتے کی کھال بچھی ہے —— شمامہ، کنیز چیتے کی کھال پہ سمٹی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اس کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا ہے۔ شقاوت خاں آتا ہے)

شقاوت خاں : شمامہ! کہاں ہے تُو؟ دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہُوں (پوستین کی جیب سے کچھ نکالتا ہے) لیکن تُو ٹوٹی ہوئی شاخ کی

طرح ساکت کیوں پڑی ہے ——— کہ نافہ آہو کی خوشبو بھی تجھے بیدار نہیں کر رہی۔

(شمامہ سسکیاں لیتی ہے)

ٹھیک ——— تو آج تُو نے کوئی نیا کھیل ایجاد کیا ہے۔ اور ابھی تو گھات میں بیٹھی ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ کرے گی۔ خوب جانتا ہوں میں تجھے۔ (قہقہہ لگاتا ہے) تجھے شاید معلوم نہیں کہ تیری ایک ایک ادا میرے جذبات کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ تند ہوائیں شعلوں کو بھڑکاتی ہیں جس طرح۔

(اس کو چھُوتا ہے۔ وہ اُس کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔ شقاوت قہقہہ لگاتا ہے)

ہاں ——— ایسے! ——— گربہ صحرا کی طرح۔ تُو جانتی ہے کہ مریل بے جان عورتوں سے قطعاً کوئی رغبت نہیں ہے مجھے۔ عورت وہ جو مُنہ زور ناقہ کی طرح ہو۔ اسپِ تازی کی مانند جو ایال پہ ہاتھ نہ رکھنے دے اور قُرب کے احساس ہی سے جس کی مچھلیاں تڑپ تڑپ جائیں۔ اور مَیں نے تجھے لشکر سے چھپا کر اس لیے رکھا ہے کہ تیری خُو سے مجھے صرصر کا خیال آتا ہے جو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تناور کھجوروں کو بیدار کرتی ہے ——— اور پھر ریت کے تودوں کو اڑا کر صحرا کا نقشہ بدل دیتی ہے لیکن سُورج ڈھلتے ہی شُتربانوں کے سینوں کا سانس، حُدی کا زمزمہ بن جاتی ہے اور ان کی آوازوں سے وسعتیں آباد ہو جاتی ہیں۔ آج تیری تُندی و دُرشتی کو کیا ہُوا جس نے اِس خیمے کے لیے، تیرے سوا تمام دُوسری عورتوں کے وجود کو ختم کر دیا ہے۔ جاگ گردباد کی بیٹی جاگ ——— بیدار ہو۔

شمامہ: تُو کس کی بات کر رہا ہے شقاوت خاں!

شقاوت خاں: اُس کی ——— اُس کی جس کو آج صبح شکار جانے سے پیشتر میں اِس خیمے کے دروازے میں چھوڑ گیا تھا۔

شمامہ: (زہر خند) تُو میرا مُنہ کیا دیکھ رہا ہے۔ اِس خیمے کی طنابیں تو کٹ چُکیں ——— طنابیں اُڑ گئیں ——— اِس کے پردے ایک سرد لاش کو چھپائے ہُوئے ہیں۔

شقاوت خاں: (اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے) مجھے تو کوئی لاش نظر نہیں آ رہی۔

شمامہ: غور سے دیکھ ——— ایک عورت کی لاش جس کے سانسوں میں آگ کی حدت تھی۔ جس کے الفاظ سنگلاخ میدانوں میں تازیوں کے سموں تلے کی چنگاریوں کی طرح اڑتے تھے۔ لیکن اُس کے سانس اب ہچکیاں بن چکے ہیں اور الفاظ گلے کا پھندا۔

شقاوت خاں: یہ تُو کیا کہہ رہی ہے شمامہ!

(وہ اُس کو بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہتا ہے۔)

شمامہ: شمامہ نہیں ——— میں ایک زہر آلُود لاش سے اُٹھتا ہُوا تعفن ہوں۔ مجھے ہاتھ مت لگا خان زادے۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک مرد، اُس کا پہلا مرد ہی عورت کی زندگی کا محور ہوتا ہے۔ اس فریب نے مجھے وُہ کچھ گوارا کرنے پر بھی آمادہ کر دیا جس کی بہ نسبت میں نے موت کو ترجیح دی ہوتی۔ میں اپنی قوم کے غم کو بھی بھُول گئی جس کے خیموں کو تیرے لشکر نے روند ڈالا تھا۔ اِس خیمے کی چھت کو میں نے آسمان سمجھ لیا، اور طنابیں میرے لیے زمین کی حدیں بن گئیں۔ اُفق تک کے

کنارے —— لیکن —— (بجلی کی سی تیزی سے اُٹھتی ہے اور شقاوت خاں کی کمر سے بندھا ہُوا خنجر اپنے سینے میں پیوست کرنے کے لیے بلند کرتی ہے)

شقاوت خاں: (اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) شمامہ! یہ تو کیا کر رہی ہے؟ کیا ہو گیا ہے تجھے۔

شمامہ: نہیں نہیں، چھوڑیئے مجھ کو۔ شمامہ، جس نے تیرے سوا کسی مرد کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی اب وہ —— ایک —— بھنبھوڑی ہوئی ہڈی ہے —— اور کچھ نہیں —— ایک لاش، ایک میت جسے دفن ہو جانا چاہیے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ شیر نے شغال کا شکار قبول کر لیا۔ دیکھ میرے گالوں کو دیکھ —— میرے بازوؤں کو دیکھو! —— اُس کے ناخنوں کے نشان ان پہ اب بھی موجود ہیں —— ان سے رِستا ہُوا لہو، میری عفت اور تیری مردانگی کا مذاق اڑا رہا ہے۔

شقاوت خاں: (چیخ کر) شمامہ! وُہ، وُہ۔ کون ہے وہ اجل رسیدہ جس کو میری املاک پہ ہاتھ ڈالنے کی جُرأت ہُوئی؟

(شمامہ روتی ہوئی ایک پردے سے چہرہ چھپا لیتی ہے)

اپنا چہرہ مت چھپا —— میری طرف دیکھ —— شمامہ پہ ہاتھ ڈالنے والے بازو قلم کر دیے جائیں گے، میں اس کی لاش کتوں سے نچواؤں گا۔ اُس کو ان سدھے گھوڑوں کی دُم سے باندھ کر سنگلاخ زمین پر چھوڑ دوں گا۔ بھیڑیوں کے بھٹ میں ڈال دوں گا اُسے —— سُن رہی ہے شمامہ!

شمامہ: اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے جس کی خاطر تو اتنا اہتمام کرے گا۔ مجھ جیسی لاکھ کنیزیں تیرے ایک اشارے پہ رقص کناں۔ تیرے پہلو میں آگریں گی۔ میری زندگی ختم ہو چکی ہے لیکن تیرے لشکر کو تیری ضرورت ہے۔ اپنے باپ کی وسیع و عریض سلطنت کے اکیلے مالک کو کیا پڑی ہے کہ مجھ جیسی ایک زندہ لاش کی خاطر خود کو پریشان کرے۔ یہ خنجر میری ذلت کا واحد علاج ہے۔

شقاوت: نہیں شمامہ! —— وہ جو بھی تھا اُس نے تجھ کو ذلیل نہیں کیا، میرے منہ پر تھوکا ہے۔ مجھ کو تیری گردن اور گالوں پہ ناخنوں کے نشانوں، تیری آنکھوں سے بہتے ہُوئے آنسوؤں، تیرے اُچھلتے ہُوئے سانسوں اور ہچکیوں کا انتقام بھی نہیں لینا ہے اپنی رسوائی کا بدلہ بھی چکانا ہے۔ جب تک میں اس کو تڑپتا ہوا نہیں دیکھوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔

شمامہ: نہیں —— شہزادے! مجھے تیری زندگی عزیز ہے۔ مجھ پہ دست درازی کرنے والا تجھ کو بھی اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔

شقاوت: دو درندوں میں سے ایک کو ضرور دوسرے کے راستے سے ہٹنا ہوگا۔ جنگل کا یہی دستور ہے، جلد بتا وُہ کون تھا —— کدھر سے آیا اور کدھر کو گیا —— اس کا حلیہ، اس کا خیمہ؟

شمامہ: تُو ایسا ہی مُصِر ہے تو مجبور ہُوں۔ اس خیمے کے قناتوں کے باہر شمال مغربی کونے میں جہاں چشمے کے آئینے میں چاند کسی خمیدہ شاخ کی طرح دکھائی دیتا ہے —— ایک خیمہ ہے سُرخ خیمہ۔

شقاوت: کنیزک؟

شمامہ: آقا

شقاوت : یہ تُو کیا کہہ رہی ہے ؟

شامہ : تیرے حکم کے مطابق اس کا پتا بتا رہی ہُوں آقا !

شقاوت : مگر یہ کیوں کر ممکن ہے ؟ وہ —— وہ تو خان کا خیمہ ہے ۔

شامہ : تو میں جھوٹ بک رہی ہُوں نا ! —— میرے گالوں اور گردن پہ ناخنوں کے نشان (اپنی آستینیں پھاڑتے ہُوئے) میرے بازوؤں پہ انگلیوں کی گرفت کی نیلی تحریر —— یہ سب جھوٹ ہے ! —— مکر ہے ! —— فریب ہے ! —— ذلیل مرد تیری غیرت کا بھرم کھل گیا ۔ تیری وفا کے وعدے محض فریب تھے —— اور یہ میری سادگی تھی جو تیری باتوں کا اعتبار کر لیا کاش ! مجھے معلوم ہوتا کہ میں تیرے لیے محض ایک کھلونا ہوں ۔

شقاوت : (اُس کے مُنہ پہ ہاتھ رکھ دیتا ہے) نہیں ، نہیں —— میری غیرت پہ آج تک حرف نہیں آیا —— اپنے نام کو میں نے کبھی خفت نہیں اٹھانے دی —— سرخ خیمہ ، آج اور بھی سُرخ ہو جائے گا —— آ میرے ساتھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ ۔

(تلوار نکالتا ہے اور شامہ کو بازو سے پکڑ کر جاتا ہے —— پردہ گرتا ہے)

منظر ۳

(وقت : رات —— ظالم خاں کے سُرخ خیمے کے اندر —— ظالم خاں ایک تخت کے اُوپر
بچھی ہُوئی شیر کی کھال پہ اوندھے منہ لیٹا ہے)

(خیمے کی دیواروں پر آلاتِ حرب کے علاوہ شکار کیے ہُوئے جانوروں کی کھالیں اور سروں کے علاوہ
انسانی کھوپڑیاں بھی نظر آ رہی ہیں فرش پہ —— تخت پہ تپائی پر آلاتِ مے کشی بکھرے پڑے ہیں)

ظالم خاں : (نشہ آلود آواز میں) کنیزک —— (تخت پہ ٹٹولتا ہے) قتالہ —— تُو —— کہاں ہے ؟ —— ساحرہ ! (وقفہ جیسے غنودگی طاری ہو گئی ہو) تُو —— تیرا —— نام کیا ہے ستم آرا ؟ (ہنستا ہے) کنیز ، کوئی نام نہیں ہے جس کا (نشہ آلود قہقہہ اور اپنا چہرہ تماشائیوں کی طرف موڑتا ہے) تیری سنگدلی کا بہت شہرہ سُنا تھا ، جلاد خاں —— پتھر —— عشق و محبت کے جذبات سے عاری —— جس پہ حُسن کا سحر و فسوں بھی کارگر نہیں ہوتا (کہنیوں کا سہارا لے کے ہاتھ بڑھاتا ہے اور پیالے میں شراب انڈیلتا ہے اور ایک گھونٹ پینے کے بعد) سُن رہا ہے خانِ دوراں ؛ کیا بھلا ؟ —— آج —— آج جلاد خاں اسی کو ڈھونڈ رہا ہے جس کا کوئی نام نہیں ہے —— جو —— فقط ایک گمنام کنیز ہے تیرے کسی لشکری کی داشتہ ۔ لیکن اس کی آنکھوں میں تیرتے ہُوئے معنے ۔ سانسوں میں لبسی ہُوئی مشک و زعفران کی مہک اور اس کے مساموں سے اُبھرتی ہُوئی ناقابلِ بیان آنچ نے تجھے مدہوش کر دیا ہے خانِ دوراں ! —— ہاں —— لیکن —— شاید یہ اس کی سادگی کا سحر تھا جس سے تو اپنی ایذا پرستی کے سبب ناآشنا تھا اور جس نے تجھ کو بے دست و پا کر دیا ہے (اٹھتا ہے اور پھر تخت پر ٹٹولتے ہُوئے) تو کہاں ہے کنیزک —— جانِ عالم کدھر ہے تو ؟ (ایک لمبا گھونٹ بھرتا ہے)

کہاں ہے وہ ساحرہ (جام میں جھانکتا ہے تو آج معمول سے زیادہ پی گیا ہے ظالم، کیا سمجھے ورنہ اس کنیزک کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ، تاک سے اُڑی اور جام میں تحلیل ہو گئی۔ میرے تخیل کی تخلیق ——— تاک کا تحفہ (ہنستا ہے) تصور کا فریب (اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیرتا ہے) لیکن آج اتنی پیاس کیوں لگ رہی ہے خان؟ شاید تو جلاد خاں کو نہیں جانتا جو مرتے ہوؤں کے ہونٹوں سے پانی کا پیالہ مس کر کے پیچھے کھینچ لیا کرتا ہے (لڑکھڑاتا ہوا ایک اور جام انڈیلتا ہے ——— دفعتاً اس کی نگاہ قالین پر پڑے ہوئے ہار اور ایک ریشمی چادر پہ پڑتی ہے۔ وہ انھیں اٹھا لیتا ہے) نہیں نہیں وہ واہمہ نہیں تھی ——— یہ ٹوٹا ہوا ہار اور یہ اس کی چادر ——— معطر پیرہن۔ تو ——— تو ——— کہاں ہے وہ؟ ——— وہ ——— وہ ——— قاف کی پری (آواز دیتا ہے) کوئی ہے؟

(خیمے کا پردہ کھلتا ہے ——— شقاوت خاں ایک ہاتھ میں تلوار لیے اور دُوسرے سے کنیز شمامہ کی کلائی تھامے داخل ہوتا ہے)

شقاوت خاں: بول شمامہ! ——— یہی ہے وہ خیمہ؟

شمامہ: (جلاد خاں کی طرف اشارہ کرتی ہے) اور یہی ہے وُہ عفریت!

ظالم خاں: (بیٹے اور کنیز کو دیکھ کر خوشی سے) تُو ——— اور تُو؟ تُو اس کو لے آیا شقاوت بیٹے ——— قتالہ کو لے آیا۔

شقاوت خاں: تُو اس کو پہچانتا ہے اجل گرفتہ!

جلاد خاں: (صدمہ جسے کانوں کا اعتبار نہیں آ رہا) بیٹے!

شقاوت خاں: تیرا کوئی بیٹا نہیں ہے نجس جانور۔

ظالم خاں: کیا بکتا ہے کُتّے؟ (خیمے کی دیوار سے آویزاں ایک تلوار کھینچتا ہے)

شقاوت خاں: سنبھل ——— خنزیر!

(تلواریں ٹکراتی ہیں۔ چریں گرتی ہیں اور پھر دست بدست لڑائی، جس میں شقاوت خاں جلاد خاں کو اٹھا کر فرش پہ پٹخ دیتا ہے)

ظالم خاں: (کراہتے ہوئے) آہ ——— میری کمر۔ (اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے) کاش! میں اُٹھ سکتا لعین! اور تُو پھر دیکھتا کہ بُوڑھے شیر کے بازوؤں میں اب بھی گینڈے کی گردن توڑنے کی طاقت موجود ہے۔

شقاوت خاں: متعفن مخلوق! تو سمجھتا تھا کہ میری چہیتی عورت پہ حملہ کر کے تُو بچ نکلے گا۔

ظالم خاں: (لیٹے لیٹے پلٹتا ہے اور درد سے کراہتا ہے) میرا دھڑ مفلوج ہو چکا ہے کوڑھی! ورنہ ——— لیکن ——— (جیسے کوئی بات دھیان میں آئی ہے) لیکن

شقاوت خاں: لیکن کیا؟ تیرے گلے میں پھندا کیوں لگ گیا مردار خور ——— گورخر ——— خوک ———

ظالم خاں: لیکن؟ (اپنی پیٹی سے خنجر نکال کر پھینکتے ہوئے)

(خنجر شقاوت خاں کو لگتا ہے)

اس خنجر کا زہر ابھی کارگر ہے مارِ آستین۔

(شقاوت لڑکھڑاتا ہُوا خیمے سے باہر نکل جاتا ہے اور اس کے حلق سے زخمی درندے کی سی آواز بلند ہوتی ہے)

شمامہ: (فاتحانہ قہقہہ لگاتی ہے) آج میں نے اپنی قوم کا بدلہ لے لیا۔ آج میں نے ہر اس قوم کا بدلہ لے لیا ظالم خاں، جس کو تُو نے غلام بنایا —— جس کی بستیوں کو تُو نے راکھ کے ڈھیر بنا دیا غارت گر! —— جن کی عصمتوں کو تُو نے موریوں میں بہا دیا ہے گوبر کے کیڑے! —— (دیوانہ وار قہقہہ لگاتی ہُوئی باہر چلی جاتی ہے)

ظالم خاں: (کراہتا ہے) بد دعا، بد دعا —— بُڑھیا کی بد دعا۔ (نڈھال) اپنی بد دعا واپس لے لے بڑھیا۔ آہ —— کوئی ہے؟

(بی بی جان آتی ہے لیکن ظالم خاں کو خبر نہیں ہوتی)

اُف یہ پیاس —— میرے حلق میں زقوم کے کانٹے اُگ رہے ہیں۔

بی بی جان: دوزخیوں کے لیے اسی کی وعید ہے فاتح عالم! —— زقوم کے بیج تیرے ہی ہاتھوں نے بوئے تھے اس کا بھی پھل چکھ۔

ظالم خاں: تیری کسر باقی رہ گئی تھی عورت! —— اپاہج جان کے تُو بھی —— (آواز گلوگیر ہو جاتی ہے اور پھر کسی درندے کی طرح یک لخت) کوئی ہے؟ یہ خدام۔ یہ غلام۔ یہ کنیزیں۔ یہ محافظ کہاں مر گئے سب کے سب؟ ان کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی۔ (ہانپتا ہے)

بی بی جان: ظالموں کا ظلم صرف سانس کی ڈوری کے ساتھ بندھا ہوتا ہے —— ہوا کی ایک لہر ہوتا ہے۔ اور بس۔ ان کا حکم، ان کا رعب، ان کا دبدبہ، اور نام کی دہشت تارِ عنکبوت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے خانِ دوراں! —— اور اس تار کے ٹوٹتے ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے —— تیرے خدام اور غلام اور کنیزیں اور عسکری سب آزاد ہیں —— سب کے سب۔

(بکھرتے ہُوئے ہجوم کا شور)

یہ آوازیں نہیں سُن رہا ہے۔ ایک کمزور لڑکی نے تیرے لشکرِ جرار کو منتشر، تیری قلمرو کو پارہ پارہ اور فتوحات کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا ہے خانِ اعظم! تُو پکارتے پکارتے تھک جائے گا لیکن تیرے مُنہ میں کوئی پانی تک چوانے نہیں آئیگا۔

ظالم خاں: یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے عورت! —— تو نے ہی اس کنیز کو سبق پڑھایا ہوگا۔

بی بی جان: یہ سب قدرت کے انتظامات ہیں ظالم خاں! —— مشیتِ ایزدی —— تیرے بیٹوں جلاد خاں اور ہلاکت خاں کے انجام کے مانند۔ تیری بیٹی سموم کے فرار اور آتش کی دیوانگی کی طرح —— قدرت کا انتقام۔

(خیمے میں دھوئیں کا ایک مرغولہ آتا ہے ——— ظالم خاں کھانستا ہے)

ظالم خاں: یہ ——— یہ دھواں کیسا ہے! یہ دھواں

بی بی جان: اپنی چھاؤنی اور خیموں کے دھوئیں کو بھی نہیں پہچانتا خان زمان؟

ظالم خاں: مجھ میں ہلنے کی سکت ہوتی تو تیری زبان گدی سے کھینچ لیتا۔

بی بی جان: تو برا مانتا ہے تو نہ سہی۔ مجھ سے بھول ہوئی۔ یہ تیری چھاؤنی کا نہیں بلکہ ان بستیوں اور شہروں کا دھواں ہے جو تیری ہوس کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئیں۔ یہ ان کھیتوں اور کھلیانوں کا دھواں ہے جن کو جلا کر تو نے جشن منائے۔ یہ ان امنگوں، آرزوؤں اور امیدوں کا دھواں ہے جنہیں تو نے روند ڈالا ——— اور دھوئیں کے ان مرغولوں میں ——— میری بستی، میری بیٹیوں اور بیٹوں، اور میری آہوں کا دھواں بھی شامل ہے ظالم خاں! ——— یہ دھواں تہذیب و تمدن، شائستگی اور شرافت کی ان تمام اقدار کا دھواں ہے جنہیں تو نے نیست و نابود کرنے کی ہر امکانی کوشش کی۔ تیری بھڑکائی ہوئی آگ کا دھواں اب تیرا ہی گلا گھونٹنے کو بڑھ رہا ہے خانِ بے درماں۔ تیری خیمہ گاہ شعلوں میں گھری ہوئی ہے اور اس دھوئیں سے تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔

(خیمے میں دھواں بھرنا شروع ہو جاتا ہے ——— ظالم خاں کھانستا ہے)

ظالم خاں: اُف یہ گرمی ——— یہ پیاس ——— یہ دھواں۔ (کراہتا ہے)

بی بی جان: گھبرا نہیں، فاتح عالم! تیری اذیت جلد ختم ہوا چاہتی ہے۔ چند ہی ساعت میں یہ آگ تیرے خیمے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی ——— اور تیرے آخری سانس بھی ختم ہو جائیں گے اور پھر ——— اور پھر تیری تلواریں اور ڈھالیں اور خنجر اور پیش قبض، نیزے اور بھالے، زرہیں اور خود اور سنانیں شعلوں کی گرمی سے پگھل کر دھات کے ڈھیر ہو جائیں گے۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرنا شروع ہوتا ہے ——— خان وقفوں سے کھانستا ہے)

پگھل پگھل کر دھات کے ڈھیر ہو جائیں گے یہ آلاتِ حرب ———
اور پھر ——— کل کو ——— کل کوئی کسان ان کو بھٹی میں ڈال کر کھیتوں کے لیے ہل ڈھال لیں گے اور زمین ایک بار پھر سبزہ و گل ——— مکئی اور گیہوں کی فصلوں ——— رنگ رنگ کے پھلوں، تتلیوں اور جگنوؤں اور چہچہوں اور قہقہوں سے آباد ہو جائے گی۔

(پردہ گرتا ہے اور عقب میں چھاؤنی کے شور کے ساتھ طرب انگیز موسیقی سنائی دیتی ہے)

لوک ریت

ممتاز مفتی

کردار

چودھری چانن : ۔ عمر ۵۰ سال
برکتے : —— اس کی بیوی۔ عمر ۴۵ سال دبلی پتلی۔ سانولا رنگ۔ کرخت خدوخال۔
اکبر : —— ان کا بڑا بیٹا۔ عمر ۳۰ سال۔ اونچا قد بت۔ مزدور۔ گندمی رنگ۔ بھرا بھرا جسم۔
شیدا : —— منجھلا بیٹا۔ عمر ۲۰ سال۔ پتلا دبلا۔ تیز طبیعت سانولا۔
علیہ : —— چھوٹا بیٹا۔ عمر بارہ سال۔ بھرا بھرا جسم۔ گندمی رنگ۔
سیجے ناں : —— خوبصورت مٹیار۔ عمر ۲۴ سال۔ بھرا ہوا جسم سفید رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔
پینو : —— برکتے کی بہن کی بیٹی۔ عمر نو سال۔ پتلی دبلی۔ تیز طبیعت۔
دولا : —— چانن کا پڑوسی۔ عمر ۳۵ سال۔
نوراں : —— پڑوسن۔ عمر ۳۰ سال۔
ساجی : —— نوراں کی بڑی بیٹی۔ سفید رنگ۔ تیز اشارے کرنے والی۔ عمر ۱۶ سال۔
بانو : —— ساجی کی چھوٹی بہن۔ ۱۴ سال۔
سائیں : —— فقیر۔ پیر قسم کا۔
جیرا : —— نائی۔
ڈاکیہ۔
حکیم صاحب۔

سین

اس کھیل میں صرف ایک سین ہے شہر کا ایک مضاف۔ کارخانے کے مزدوروں کی ایک بستی۔ ایک کوارٹر کا صحن پچھلی طرف دائیں ہاتھ دو کوٹھڑیاں ہیں۔ دو دروازے۔ باقی اونچی دیوار پیچھے دور کارخانہ کی چمنی دائیں ہاتھ کوٹھڑیوں سے ملحق ٹین کی چھت کا باورچی خانہ ہے۔ چھت دو بانسوں پر کھڑی ہے سامنے دیواریں نہیں۔ باورچی خانے میں چولہا ہے۔ پاس اونچی

گھڑونجی پر دو مٹکے دھرے ہیں۔ پاس پرانی میٹ سیف ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبے تختے پر برتن پڑے ہیں۔ ایک طرف اپلوں کا ڈھیر ہے۔ دوسری دیواروں پر بھی اپلے لگے ہوئے ہیں۔ باورچی خانے سے ورے دیوار چھوٹی ہے۔ اس کے دوسری طرف رودے کا گھر ہے۔ اکثر لڑکیاں یا عورتیں دیوار سے جھانک کر باتیں کرتی ہیں۔

بائیں ہاتھ چھوٹی دیوار ہے جس میں ایک دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ گلی میں کھلتا ہے۔

صحن میں پیچھے بھینس بندھی ہے۔ ورے ایک ٹوکرا اوندھا پڑا ہے جس میں مرغیاں بند ہیں صحن میں ایک سوکھا درخت ہے جس کے گرد اونچا پلیٹ فارم بنا ہے جس پر بیٹھنے کی جگہ ہے۔

دو چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ کچھ دیواروں کے ساتھ کھڑی ہیں۔

اس سیٹ میں تین دروازے ہیں۔ کونے کی کوٹھڑی کا دروازہ جس میں سگاں بیمار پڑی ہے۔ اس کے ساتھ ملحقہ کمرے کا دروازہ جس میں جےناں اور اکبر رہتے ہیں۔

صحن کا دروازہ جو باہر گلی میں کھلتا ہے۔

پہلا ایکٹ

صبح سویرے ابھی پو نہیں پھوٹی۔

کونے کی کوٹھڑی سے سگاں کی کھانسی کی آواز۔

باورچی خانے میں ایک بلب جل رہا ہے۔

دونوں کوٹھڑیوں میں بلب جل رہے ہیں۔

دروازوں سے روشنی آ رہی ہے۔

حکیم سگاں کے کمرے کے اندر ہے۔

برکتے کونے والی کوٹھڑی کے دروازے میں کھڑی ہے۔ سامنی کوٹھڑی میں جےناں کھڑی ہے۔

صحن میں ایک چارپائی پر پینو سو رہی ہے۔ پاس جلتی لالٹین پڑی ہے۔

قریب ایک چارپائی پر جانن بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔

دیوار سے بالو اور ساجی سر نکالے کھڑی ہیں۔ کچھ دیر کوئی نہیں بولتا۔

پھر ساجی۔ آوازیں دیتی ہے۔

اس سین میں آہستہ آہستہ دن چڑھتا ہے۔

ساجی۔ ماسی (باآواز بلند)

(جے ناں مڑ کر ساجی کو دیکھتی ہے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ کا اشارہ کرتی ہے) (وقفہ)

(مرغا اذان دیتا ہے)

ساجی ۔ ماں پوچھے ہے ۔ ماسی (چانن ساجی کی طرف دیکھتا ہے)

چانن ۔ کیا پچھے ہے تیری ماں ساجی ۔

ساجی ۔ ماں پچھے ہے ماسی سگاں کا کیا حال اے ۔

چانن ۔ ماں سے کہہ دعا کر ۔

ساجی ۔ وہ پوچھے ہے حکیم جی کیا کہیں ہیں ۔

(حکیم جی باہر نکلتے ہیں پیچھے پیچھے برکتے ہے چانن کے پاس رک جاتے ہیں ۔

چانن ۔ کیوں حکیم جی ۔

(حکیم سر ہلاتا ہے)

برکتے ۔ پر کوئی دوا ۔ دارو ۔

(پھوٹتی ہے) (پینو جاگتی ہے)

حکیم ۔ دوا دارو تے آخری ساہ تک چلدا اے بھینے ۔ پر ہُن تے دعا دا ویلا اے ۔ دعا کر بھین تیری دی جان عذابوں چھُٹ جائے ۔

(برکتے ۔ پینو کو جگاتی ہے پینوں آنکھیں ملتی ہے)

برکتے ۔ کڑیئے جاروا اے آ ۔ (برکتے پینو کو تسلی دیتی ہے)

(حکیم جی جاتے ہیں ۔ ساتھ پینو جاتی ہے)

(نوراں ، ساجی ، بانو اُتر جاتی ہیں)

(برکتے پینو کا بستر لپیٹتی ہے اٹھا کے لے جاتی ہے ۔ جے ناں اپنے کمرے میں داخل ہو جاتی ہے چانن اکیلا رہ جاتا ہے ۔ سوچ فکر میں گم ۔ دولا داخل ہوتا ہے ۔ مکمل دن ۔ سگاں کی لمبی کھانسی سنائی دیتی ہے)

دولہ ۔ کون بیمار ہے چودھری کیا برکتے ہے ۔

چانن ۔ وہ کہاں بیمار پڑے گی ۔ اسے نہیں لگتی بیماری

دولہ ۔ تو بھی حد کرتا ہے چودھری ۔ (ہنس کر)

چانن ۔ حد کی اس میں کیا بات ہے ۔ چاہے دیکھ لے اندر جا کے ۔ ٹلی کی طرحیوں ٹن ٹن بولے ہے یہ تو اس کی بہن سُگّاں ہے ۔ کد سے اپنے گاؤں ڈوکڑی میں بیمار پڑی تھی وہاں اکیلی پڑی تھی ۔ تو بہن نے یہاں بلوالیا دوا دارو کے لیے ۔ ٹبا روگ ہے حالت اچھی نہیں ۔ (سگاں کھانستی ہے ۔ دونوں سنتے ہیں کھانسی کی آواز ۔ وقفہ)

دولہ ۔ او ہوں ۔ یہ کیا بچے گی ۔

چانن ۔ بس آخری دموں پر ہے ۔

دولہ ۔ تو پھر مٹی کچھ لائی ہے نایوں کہو ۔ شہر کی مٹی میں سمانا جو لکھا تھا نصیب میں سو آگئی یہاں سہر میں ۔

چانن ۔ سنا تو کہ آیا دولے بیٹھ جا واری لے ۔

دولہ ۔ رات آیا تھا ۔

چانن ۔ بیٹھ جا بیٹھ جا کہاں گیا تھا تو ۔

دولہ ۔ گاؤں گیا تھا ۔

چانن ۔ اپنے موجو مال ؟

دولہ ۔ اور کہاں جانا ہے چودھری اب تو وہی اپنا گاؤں ہے نا

چانن ۔ سنا کیا حال چال ہے گاؤں کا ۔

دولہ ۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے چودھری ۔ اجو کی بھینس گابن ہو رہی ہے ۔ غلام مد نے جمین بیچ دی ۔

چانن ۔ جمین بیچ دی ۔

دولہ ۔ ہاں ۔ بیچ دی ۔

چانن ۔ یہ وس نے اچھا نہیں کیا دولے ۔ سمجھ لے جس نے جمین بیچ دی وس نے اپنی ماں بیچ دی ۔

دولہ ۔ سچ ہے چودھری بے سک ۔

چانن ۔ دیکھ لے تو ماں نے جمین نہیں بیچی ۔ چاہے گاؤں چھوڑ کر سہر آ گیا ہوں ۔

دولہ ۔ وہ حبیب بی بی کے گھر والا ممدو بھی آ رہا اے سہر ماں اپنے بیخ نے نیا کوٹھا بنا لیا اے ۔

چانن ۔ ہوں ۔

دولہ ۔ رحیمے گجر کے لڑکے کے کھتنوں پہ گیا تھا ماں ۔ اپنا سنگی اے نان ۔ ماں نے کیا ہو آؤں نہیں تو کہے گا کہ سہر جا کر انہوں کو چھوڑ بیٹھا ۔

چانن ۔ اچھا کیا تے نے ۔

دولہ ۔ گاؤں میں سب تیرا پوچھتے تھے ۔

چاتن ۔ میرا کیا پوچھنا ہے دولے ۔

دولہ ۔ کہتے تھے چودھری چانن کب آئے گا اپنی جمین پر ۔

چانن ۔ اب کہاں آنا کہاں جانا دولے ۔ اب تو چودھری چانن اپنے سے گیا ۔

دولہ ۔ تو تو کہتا تھا میں اپنی جمین پر لوٹ جاؤں گا ۔

چانن ۔ (آہ) ہاں کہوں تو تھا ۔ اب تو خالی کہنا ہی کہنا رہ گیا ہے کہہ کہہ کر جی راجی کر لیتے ہیں (دونوں خاموشی سے حقہ پیتے

ہیں) (پینو بوتل سے کر باہر سے آتی ہے پاس سے گزرتی ہے کوٹھڑی میں داخل ہو جاتی ہے)

دولہ ۔ یہ کس کی ہے چودھری۔

جانن ۔ (چونک کر) یہ ۔ یہ ۔ اپنی پینو ہے سُگّاں کی بیٹی جو سُگّاں نہ آجاتی دولے تو ماں تو تیار بیٹھا تھا ۔

دولہ ۔ کس لئے ۔

جانن ۔ گاؤں جانے کے لئے جی چاہے ہے دولے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں چلا جاؤں اپنی جمین پہ جو راجوری چلا جاؤں پر جب بھی جانے لگوں ہوں کوئی رکاوٹ آجاوے ہے اب کی بار یہ سُکّو آگئی ۔

دولہ ۔ جی چاہے ہے تو رکے کیوں ہے تو (پینو باہر نکلتی ہے چبوترے پہ بیٹھ کر گڈیاں کھیلنے لگتی ہے)

جانن ۔ سمجھ لو حرام خوری کی لت پڑ گئی ہے یہاں نکما پڑا رہا ہوں نا دو سال ۔ ہڈیوں میں سے کام نکل گیا ہے آرام نے چاٹ لیا دولے ۔ یہ بھی ہفیم ہوتی ہے ۔ آرام کی ہفیم جسے لگ جائے سمجھ لو وہ اپنے آپ سے گیا۔

(جے ناں باہر نکلتی ہے ذرا سہمتی ہوئی پیڑھے پہ بیٹھ جاتی ہے)

دولہ ۔ پھر کہتے ہو جانے کو جی بھی چاہے ہے (ہنس کر)

جانن ۔ (ہنس کر) ہاں جانے کو جی چاہے ہے ۔ جی چاہے ہے پھر سے اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جاؤں دوجوں کی روٹیوں پہ پڑا ہوں نا۔ چودھری جانن نہیں کمیں بنا بیٹھا ہوں یو سمجھے دولے جو اپنے پیروں پہ کھڑا ہو تو مرد اور جو دوجوں کی کمائی پہ بیٹھا ہو وہ مرد نہیں ہووے ہے کمیں ہووے ہے کمیں ۔

دولہ ۔ تو بھی عجیب باتاں کرے ہے چودھری اللہ کے فجل سے اپنے گھر میں بیٹھا ہے ۔ تین بیٹے ہیں ہاں سچ علیئے کا پتہ چلا کچھ ۔

جانن ۔ اونہوں کچھ پتہ نہیں چلا۔

دولہ ۔ گاؤں میں سب ہی پھکر کریں تھے علیئے کے بارے میں ۔

جانن ۔ نہیں دولے پھکر کی بات نہیں ماں جانوں وہ گھر سے بھاگ گیا ۔ آجائے گا کسی روج اور (کونے والے کمرے سے برکتے داخل ہوتی ہے خود بخود باتیں کئے جاتی ہے دولے اور جانن کی طرف نہیں دیکھتی اس کے ہاتھ میں ایک تھالی ہے جس میں دال پڑی ہے وہ کنکر چن رہی ہے)

برکتے ۔ بس سمجھ لو آخری بخت ہے پر وہ مرے گی نہیں جد توڑی —— پر یہاں گھر کی عجت کا کھیال بھی ہو کسی کو (جے ناں کو دیکھتی ہے) تو اس لڑکی کا دھیان تو بس بننے سنورنے میں لگا رہے ہے ۔ روج اللہ مارا اخروٹ کا چھلکا لے کر بیٹھ جاتی ہے دانت نہ ہوئے چھریاں ہو گئیں (دفعتاً دولے کو دیکھ کر) تو کیا دولہ ہے ۔

(جے ناں غصے سے برکتے کی طرف دیکھتی ہے اور اندر داخل ہو جاتی ہے)

دولہ ۔ سلام کہوں ہوں بہن برکتے ۔

برکتے ۔ اللہ جندگی دے ۔ تو کیا گاؤں گیا تھا ۔

دولہ ۔ ہاں بہن ابھی بتا رہا تھا چودھری چانن کو گاؤں بڑا پھکر کریں ہیں اپنے جیلے کے بارے میں۔

برکتے ۔ ہیئے میرا علیہ ۔ پر اس سے بات کرنے کا پھائدہ اسے گھر کے دکھ درد سے باسطہ بھی ہو کوئی اتنا نہیں کہ سہر جا کر دوے کی ڈھونڈ کرے بس حقہ لیا اور بیٹھ رہا گڑ گڑ ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔

چانن ۔ یہ تو بس اپنی ہی ہانکے ہے علیہ بچہ تو تھا نہیں کہ کھو جاتا بھئی چھ جماعتیں پاس تھا اللہ کے فضل سے ۔

برکتے ۔ ہیئے ماں جانوں کی موٹر تلے آ گیا بس (آنسو پونچھتی ہے) میرا پلا پلایا جوان گھبرو پتر ۔

چانن ۔ جو موٹر تلے آ گیا تو اب ایک مہینے بعد ڈھونڈن کا پھیدہ ہاں موٹر تلے جو آ گیا دولے ۔

برکتے ۔ سن لے سن لے تو اس کی باتاں یہ تو چاہے ہے کہ میرا پتر موٹر تلے آ جائے ۔

چانن ۔ کسی طورے جینے نہیں دیوے ہے یہ ۔ جو کہوں اللہ چاہے لڑکا کھیر سے ہے تو کہے ہے نہیں جرور موٹر تلے آ گیا اور جو کہوں موٹر تلے آ گیا تو کہے ہے یہ چاہے ہے کہ میرا پتر موٹر تلے آ جائے ۔

دولہ ۔ نہ بھئی اب تم آپس میں نہ جھگڑو ۔

ہر وقت جھگڑتی ہے تو جبھی علیہ تنگ آ کر بھاگ گیا گھر سے اس کی وزہ سے بھاگا ہے وہ ہر وقت کی ٹوک ہر وقت کی ٹک جندگی حرام کر رکھی تھی اس کی سو وہ گھر سے بھاگ گیا اس کی وزہ سے ۔

برکتے ۔ کیوں میری وزہ سے کیوں میں کیا ایسی بری ہوں ۔

چانن ۔ تو ۔ تو تو اس گھر کی گدھ ہے گدھ گھر کو لاس بنا رکھا ہے تے نے کہ تیری اپنی چونچ ہری رہے ۔

دولہ ۔ نہ بھی چودھری گھر والی سے نہیں لڑا کرتے ۔

چانن ۔ وس سے کون لڑ سکے ہے دولے کس میں جان ہے جو اس سے لڑے ۔

برکتے ۔ سن لے تو اس کی باتاں ۔ بھلا ماں سے پتر بھاگ جائے ۔ ہے کوئی بات ۔

چانن ۔ تینوں پتروں کے سروں پہ ہر وقت ٹھونگے مارتی رہے ہے بیچارے گنجے ہو گئے ہیں ۔ یہ بس بے جبان چپ چاپ جلم سہتے جائیں ہیں ٹکر ٹکر وس کا منہ تکیں ہیں ۔ اُن پہ جلنے کا احسان کر رکھا ہے وس نے دولے ۔ وہ چھوٹا کچھ جان والا نکلا سو گھر چھوڑ کر بھاگ گیا ۔

برکتے ۔ ہیئے کتنا جبر ہے اس کے دل ماں میرے لئے ۔

(کمرے میں سگاں کو پھر کھانسی کا دورہ پڑتا ہے اور مسلسل کھانسی سے بے حال ہو جاتی ہے ۔ پینو اٹھ کر اندر جاتی ہے ۔ باہر چانن برکتے اور دولہ متفکرانہ انداز سے سنتے ہیں)

چانن ۔ جا جا اندر بہن کی سدھ لے دو روج کی مہمان ہے وہ ۔

برکتے ۔ ہیئے میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ۔ وس کی جان نہیں نکلے گی نہیں تخے گی جد توڑی (آنسو پونچھتے ہوئے کونے کے دروازے سے اندر چلی جاتی ہے ساتھ ہی پینو جاتی ہے پیچھے پیچھے)

دولہ۔ اچھا چودھری ماں چلتا ہوں اب۔

اکبر۔ سلام کہوں ہوں چاچا (بیرونی دروازے سے اندر داخل ہو کر۔ ورک مین لباس میں)

دولہ۔ جیتا رہ کہاں سے آیا ہے تو۔

اکبر۔ کرختے سے۔

دولہ۔ اس وخت (باہر جاتا ہے) اکھبتی واہ۔

چانن۔ اوبرٹیم لگا کر آیا ہے تو۔

اکبر۔ ہاں بابا۔

چانن۔ تجھے جو کہا ہے اوبرٹیم نہ لگایا کر۔

اکبر۔ (خاموش)

چانن۔ بولتا نہیں۔ جباب دے۔

اکبر۔ ماں نے کہا تھا۔ (کمرے کی طرف جاتا ہوا رک جاتا ہے)۔

چانن۔ اور جو تیری گھر والی رستہ تکتی رہتی ہے تیرا۔ وہ۔

اکبر۔ ماں نے کہا تھا ماسی بیمار ہے۔ دوا دارو کرنا ہے پیسہ چاہئے۔

چانن۔ وہ کیا بچ جائے گی دوا دارو سے۔

اکبر۔ مجھے کیا کھبر۔

چانن۔ تجھے کچھ کھبر بھی ہے کبھی اپنی لوگائی کی بھی کھبر لی ہے۔ جو کرختے میں اوبرٹائم ہی لگانا تھا۔ تو اُسے کیوں لا کر باندھ دیا یہاں گھر ماں کیوں بیاہ کیا تے نے۔

اکبر۔ ماں نے کہا تھا بیاہ کروں گی تیرا میں نے کیا جو کرنا ہی ہے تو سنے تو کر دے۔

چانن۔ تو پھر ماں اب تجھ سے اوبرٹیم کیوں کراتی ہے۔

اکبر۔ پوچھ اس سے۔

چانن۔ وس سے کیا پوچھنا۔ مجھے مالم ہے۔

اکبر۔ تو پھر مجھ سے کیوں پوچھے ہے تو۔

چانن۔ تجھے بھی مالم ہو۔ اس لئے کراتی ہے اوبرٹیم تجھ سے کہ اپنے پتر کا راسن کر کے لوگائی کو دے۔

اکبر۔ مجھے نہیں سمجھ آوے ہے۔

چانن۔ کیا آئے گا تجھے سمجھ میں۔ ہوس کر۔ اب تو مرد ہے۔ ماں کی گودی سے نہ چمٹ۔ (اپنے آپ سے) مجھے تو تیری لوگائی ڈر آوے ہے۔

اکبر۔ ڈر کیوں۔

جانن۔ دے جے ناں نہیں دے تو چن ہے۔ گونگا جن۔ جن اور چن میں کچھ زیادہ پھرک نہیں ہوتا۔

اکبر۔ تو تو ماں کو سمجھا۔ ماں نہیں جانوں ہوں بو باماں۔

جانن۔ جاگتے کو کون جگائے پتر۔ تیری ماں سب جانے ہے وہ سب کھڈ بیت چکی ہے۔

اکبر۔ ایک بات پوچھوں بابو۔

جانن۔ پوچھ۔

اکبر۔ جے ناں نے تو نہیں کہا کچھ تجھ سے۔

جانن۔ (ہنس کر) جو وہ کہنے والی ہوتی تو پھر پھکر کس بات کا تھا۔ وہ پھندگارنے والی نہیں۔ بل کھانے والی ہے۔ بولتی نہیں پر جب نگاہ بھر کر دیکھتی ہے تو اپنا کوٹھا لرجتا ہے۔ جانے کس برج دہم سے آ رہے ہیچے۔ تو اوبرٹیم کرنا چھوڑ دے اکبر جاہے ماں کچھ بھی کہے یاد رکھ میری بات پلے باندھ لے۔ وہ شیدا جو ہے وہ اوبرٹیم کرے۔ چاہے روج کرے گھر لوگائی جو نہ ہوئی۔ پر تو۔

اکبر۔ ماں کہتی ہے شیدا نہ لگائے اوبرٹیم۔

جانن۔ دیکھ لیا ناہیو پر مخومت کرنا چاہے ہے تیری ماں۔ شیدے کی گھر والی جو نہ ہوئی پھر مخومت کیسی۔ تیری تو ہے جبھی تجھ سے کرائے ہے اوبرٹیم۔

(جے ناں اپنی ہی دھن میں باہر نکلتی ہے دروازے سے وہ گندمی رنگ کی مٹیار ہے بھرا بھرا جسم ماتھے پر تیوری موٹی موٹی آنکھیں بارعب خاموش)

جے ناں۔ پینو۔ پینو کہاں گئی۔ اے پینو (دفعتاً اکبر کو دیکھتی ہے رک جاتی ہے۔)

جانن۔ (گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے) ماں جرا انجام مدے کے گھر سے ہو آؤں تو جد توڑی تمباخو رکھ دے جے ناں۔ حقہ بجھ گیا ہے۔

(جانن دروازے سے نکل جاتا ہے۔)

(جے ناں نے گویا بابا کی بات نہیں سنی وہ ویسی ہی کھڑی اکبر کو دیکھ رہی ہے اکبر اس کی نگاہ تلے گھبرایا ہوا ہے آنکھ نہیں ملاتا)

جے ناں۔ مجھے بتا کر کیوں نہ گیا اوبرٹیم کرنے۔

اکبر۔ (خاموش)

جے ناں۔ میں کیا پوچھوں ہوں۔

اکبر۔ کیا پوچھے اے تو۔

جے ناں۔ پہلے تو تو گونگا تھا اب بہرا بھی ہو گیا کیا میں کہوں ہوں مجھے بتا کے کیوں نہ گیا اوبرٹیم کرنے۔

اکبر - میں نے کیا تو گرمی کھائے گی ۔

بجے ناں - اور ایسے نہیں کھاؤں گی گرمی ۔

اکبر - تیرا تو کام ہی ہے گرمی کھانا ۔

بجے ناں - تو نہ کھائیو گرمی - برف ہی رہیو ۔

اکبر - کس پر کھاؤں گرمی

بجے ناں - اپنی ماں پر اور کس پہ ۔

اکبر - کیوں ۔

بجے ناں - جس نے تجھے جوت رکھا ہے گھر کا چھکڑا ہانکن کو باقی سب بیٹھ کر کھاویں ہیں ۔

اکبر - (خاموش)

بجے ناں - وہ شیدے سے کیوں نہیں کراتی اور ٹیم ۔

اکبر - مجھے نہیں پتہ ۔

بجے ناں - کچھ پتہ بھی ہے تجھے ۔

اکبر - (خاموش)

بجے ناں - ہوش کر ۔ مرد بن - کیوں اپنی ہڈیاں گال رہا ہے تو ۔ کس کے لئے ۔

اکبر - بس اب چھوڑ ۔

بجے ناں - اپنا کنبہ کم تھا کیا جو وہ بہن کو اٹھا لائی ہے اب کرا وس کا دوا دارو ۔

اکبر - وہ تو چار روج جئے گی ۔

بجے ناں - اور جو اس کی لڑکی ہے بینو ۔ وہ ۔

اکبر - اس کا کیا ہے ۔

بجے ناں - کہاں جائے گی وہ ماں کے مرنے کے بعد ۔

اکبر - جانا کہاں ہے اس نے ۔

بجے ناں - ساری عمر کا بوجھ بن جائے گی وہ تیرے سر پہ - پہلے پال پھر وس کا بیاہ کر (وقفہ) دوجوں کے بچے پالتا رہ - اپنے ہوں گے تو کیا کرے گا ۔

اکبر - اپنے تو دے بھی ۔

بجے ناں - ماں نہیں دیتی کیا ۔

اکبر - دے کے دکھایا بھی ہو - چھ سال بیت گئے ۔

جے ناں۔ تو جو اوبرٹیم کرتا رہے ہے۔

اکبر۔ کد سے لنڈورے بیٹھے ہیں۔

جے ناں۔ اپنا گھر ہو۔ اپنا وخت ہو۔ اپنی مرجی سے سویں اپنی مرجی سے جاگیں۔ جب بات ہے۔ بعد اب تو تو گھر کے کوہلو کا بیل بنا ہوا ہے اور میں بیٹھی تیری راہ دیکھوں ہوں اور تیری ماں یوں دیکھے ہے میری طرپھ جیسے قصائی دیکھتے ہیں بھینس کو۔ گھر تو وس کا ہے۔ ہم تو بردے ہیں بردے۔

اکبر۔ چھوڑ بھی۔

جے ناں۔ کیسے چھوڑ دوں۔ بتا۔ وہ بالو کو کیوں نہیں جانے دیوے ہے اپنی جمین پہ۔ جب بھی وہ تیار ہووے ہے اسے روک لے ہے اور تیری ماں آپ کیوں بیٹھی ہے یہاں شہر میں۔

اکبر۔ تو پھر میں کیا کروں۔

جے ناں۔ تو اوبرٹیم کر۔ تو آ کیوں جاتا ہے گھر میں۔

اکبر۔ تجھے کیا نیند نہیں آتی میرے بنا۔

جے ناں۔ ہاں نہیں آتی۔

(گہری خاموشی چھا جاتی ہے جے ناں اسے گھورتی ہے۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہتا ہے۔)

(اس دوران میں برکتے کوٹھڑی سے باہر نکلتی ہے قریب آتی ہے کھڑی دیکھتی ہے۔ اکبر نظر نہیں آتا)

برکتے۔ کس سے باتیں کر رہی تھی تو۔ (جے ناں آگے چل پڑتی ہے پھر رک جاتی ہے)

جے ناں۔ (خاموش)

برکتے۔ (اکبر کو دیکھتی ہے) تُو تو آ گیا۔ میں نے بھی کہا کیا بات ہے۔

اکبر۔ ابھی آیا ہوں ماں ابھی ابھی۔

برکتے۔ جبھی اِس کے دیدے پھٹے وے ہیں تجھے دیکھ کر۔ آواج نہیں سنے ہے میری۔ میرے پاس نہیں آئے ہے۔ نہ آئے میرے جوتے سے (جے ناں کھڑی غصے سے دیکھتی ہے)

اکبر۔ میں نے ہی اسے روکا تھا ماں۔

برکتے۔ تو رُوکے گا۔ تو رُکنے والا اور یہ رکنے والی ہنہ۔

اکبر۔ نہیں ماں۔

برکتے۔ بس رہنے دے تجھے کیا دِکھے نہیں ہے۔ یہ تو نظروں سے کھا جائے بس چلے تو۔ اُلّو بنا کے پنجرے میں ڈال لے تجھے۔

اکبر۔ وہ بولے نہیں ہے ماں اور تو بولے جا رہی ہے (غصہ)

برکتے۔ وسے بولنے کی کیا جرورت ہے یہ تو بن بولے یا تال کرے ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں ماں۔ گلا تو مجھے پھاڑنا پڑے ہے۔

(بیجے ناں نفرت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے)

برکتے۔ یو تو اُجاڑ مانگے ہے۔ بس کھد ہو خصم ہو تیجا نہ ہو کوئی۔

(بیجے ناں غصے سے بھوت بن کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے دونوں اس کی طرف دیکھتے ہیں)۔

برکتے چبوترے پہ بیٹھ جاتی ہے۔

برکتے۔ دیکھ رے مجھ سے بات کرنے کی روادار نہیں۔ میری بات پہ کان نہیں دھرے ہے۔ یوں سر اُٹھا کر چلے ہے جیسے ملاد کی بیلک ہو۔ پر ماں بتا دوں اس گھر ماں وہی ہو گا جو ہوتا آیا ہے گھر کی عجت بھی کوئی چیج ہے آکھر ماں تو جان دے دوں گی پر بڑوں کی ریت کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گی۔ ہاں کان کھول کر سن لے تو۔

(جانن پچھلے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ کھڑا بات سنتا رہتا ہے)

جانن۔ تو بڑوں کی ریت نہ چھوڑیو گھر کی محبت کی مالا جپتی رہیو۔

برکتے۔ بس تیری ہی کمی تھی۔

جانن۔ تجھے کس کی کمی ہے تو تو کھد گھر کی ریت ہے۔

برکتے۔ تو تو جب بھی کرے گا میرے کھلاف بات کرے گا۔

جانن۔ تیرے کھلاف بات کر سکتا ہے کوئی اس گھر میں بھاگوان۔

برکتے۔ تیرا بس چلے تو ــــــ

جانن۔ کسی کا بھی نہیں چلنے ہے۔ میرا کیا ہے۔

برکتے۔ تیری بات تو جہر بھری ہوتی ہے۔

جانن۔ تو میری بات چھوڑ اپنا کام کئے جا۔ بھاگوان۔

برکتے۔ میں نہ ہوں تو چوپٹ ہو جائے یہ گھر۔

جانن۔ تو ریت کا چوپٹ کھیلے جا۔

اکبر۔ چھوڑ ناں تو کیوں گسہ کرے ہے۔

برکتے۔ میرا گسہ کون سہے ہے یہاں۔

اکبر۔ سبھی سہیں ہیں ماں۔

برکتے۔ وہ تیری بیجے ناں یوں دیکھے ہے میری طرپھ جیسے ......

جانن۔ کیوں نہ دیکھے تو جو اس کے گھر والے سے اوپر ٹیم کرائے ہے۔

برکتے۔ اور یہ دو جی مجھ سے ٹھٹھے کرے ہے۔

جانن۔ بھاگوان تجھ سے ساری جندگی گجاری ہے میری بخشس کے لئے تو یہی بہت ہے۔ جندگی بھر تیری مانی ہے اب اگر

جو کبھی کبھی مٹھڈ کر لیا تو کیا ہوا۔

اکبر۔ تو ہی جانے دے بابو تو ہی چھوڑ۔

چانن۔ میں کیسے جانے دوں اکبر۔ میری تو یہ ساری جندگی کی مایا ہے دیکھ لے یہی دھن کمایا ہے ماں نے جندگی بھر۔

پینو۔ ماسی ماسی (کونے والے دروازے سے چیختی ہوئی باہر نکلتی ہے۔ ماسی ماسی ماں۔ ماں کو کیا ہو گیا ماسی۔)

برکتے۔ کیا ہوا تساں کو۔

پینو۔ آنکھیں کھلی ہیں پر دیکھتی نہیں۔ منہ بند ہے۔ ہلتی نہیں بولتی نہیں اور ہاتھ یوں چلائے ہے پڑے پڑے جیسے کبوتر اڑا رہی ہو۔

برکتے۔ اے خیر ہو۔ اللہ خیر کرے (کمرے کی طرف بھاگتی ہے کونے والے دروازے سے اندر داخل ہو جاتی ہے)۔

پینو۔ بابا۔

چانن۔ ہوں۔

پینو۔ کیا ہے ماں کو۔

چانن۔ بیمار ہے۔

پینو۔ کیوں بیمار ہے۔ بابا۔

چانن۔ تو جا اکبر ادھر جے ناں تیرا انتجار کرے ہے۔

پینو۔ بتا بھی بابا۔

چانن۔ تیری ماں کا جی نہیں اچھا۔ جا جے ناں کے پاس بیٹھا کر (اکبر سے)

اکبر۔ اچھا۔

چانن۔ دیکھ لڑیو نہیں وس سے۔

اکبر۔ نہیں لڑتا۔ پر

چانن۔ پر کیا۔

اکبر۔ جرا ماسی کو دیکھ لوں۔

چانن۔ چھوڑ۔

اکبر۔ اچھا نہیں ماں کہے گی۔

چانن۔ اچھا تو دیکھ آ۔

(اکبر جاتا ہے پیچھے کونے والی کوٹھڑی میں داخل ہوتا ہے)

پینو ۔ بتا نا بابا ۔

چانن ۔ کیا پوچھے ہے تو بول ۔

پینو ۔ بمار مر جاویں ہیں نا ۔ اللہ کے پاس چلے جاویں ہیں ۔

چانن ۔ ہاں ۔

پینو ۔ پر ماں کہے تھی ماں نہیں مروں گی ۔

چانن ۔ اچھا ۔ (اپنے دھیان سے ۔ دفعتاً سمجھ کر تعجب) کیا کہا پینو ۔ ماں کیا کہے تھی ۔

پینو ۔ کہے تھی جد توڑی تیرا بیاہ نہ ہوگا ماں نہیں مروں گی ۔ بابا ۔ بیاہ کیا ہووے ہے ۔

چانن ۔ (ہنس کر) ماں کیا بتاؤں کیا ہووے ہے بیاہ ۔

پینو ۔ جیسے بیدی کا ہوا تھا نا ویسے ہووے ہے نا بیاہ ۔

چانن ۔ ہاں ویسے ہی ۔

پینو ۔ مجھے سب پتہ ہے بابا ۔ جو بیدی نے مہندی لگائی تھی لال جوڑا پہنا تھا ۔

چانن ۔ اچھا ۔

پینو ۔ میں بھی مہندی لگاؤں گی ہاتھوں پر ۔ لال جوڑا پہنوں گی ۔ (تالی بجا کر) دلہن بنوں گی ۔ ہے نا بابا ۔

چانن ۔ پگلی ابھی تو چھوٹی ہے جب بڑی ہو جائے گی پھر ۔

پینو ۔ اوں میں تو اتنی بڑی ہوں ۔ (پنجوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہے) کیوں بابا بڑی ہوں نا دیکھ ۔ میری طرف دیکھ ۔

چانن ۔ (ہنستا ہے) اچھا (اپنے آپ سے) تم جنانیاں تو پیدا ہوتے ہی بڑی ہو جاؤ ہو ۔

شیدا ۔ (باہر سے داخل ہو کر) ماں کہاں ہے بابو ۔

چانن ۔ تو کہاں سے آیا ہے اس بخت ۔

شیدا ۔ رحمت کے گھر سویا تھا رات ۔ ماں کہاں ہے ۔

چانن ۔ ماں نے سمجھا او برٹیم کر کے آیا ہے تو ۔

شیدا ۔ نہیں تو ۔

چانن ۔ تو کیوں نہیں کرتا اوبرٹیم ۔

پینو ۔ مجھے بتا نا بابا تو نے کہا تھا ماں بتاؤں گا ۔

چانن ۔ پھر بتاؤں گا جا تو جا کر کھیل ۔

پینو ۔ بتا نا بابا ۔

شیدا ۔ (غصے میں) جا دوڑ یہاں سے ۔

پھینو ۔ ہوں بڑا آیا ہے (منہ چڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے ۔ سامنے کمرے میں)

چانن ۔ ہوں بتا نا مجھے تو کیوں نہیں کرتا اوبرٹیم بڑے بھائی کو دار پہ چڑھا رکھا ہے تے نے وہ لوگائی والا ہے اسے گھر رہنا چاہئے تو تو اکیلا ہے ۔

شیدا ۔ ماں کہتی ہے ۔

چانن ۔ کیا کہتی ہے ۔

شیدا ۔ کہتی ہے جب تک بڑا بھائی سر پہ ہے تو کیوں کرے اوبرٹیم ۔

چانن ۔ پر کیوں ۔

شیدا ۔ کہتی ہے یہی بڑوں کی ریت ہے ۔

چانن ۔ وس کی ریت ہمیں سے ڈوبی ۔ تو ہی بتا کیا اچھی لگتی ہے یہ بات کہ تو نکمے اور بڑے بھائی کو یوں جوت رکھے ۔

شیدا ۔ مجھے نہیں مالوم ماں جو کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہو گا ۔

چانن ۔ تو بھی کچھ کہے گا یا نہیں ۔

شیدا ۔ میں کیا کہوں ۔

چانن ۔ کچھ تو پھوٹ منہ سے ۔

شیدا ۔ باپو ۔ تو ایسی باتیں کیوں کرے ہے ۔

چانن ۔ کیسی باتاں ۔

شیدا ۔ ہر وقت ایسی باتاں کرے ہے تو جیسے جیسے ـــــ

چانن ۔ جیسے کیا ۔

شیدا ۔ جیسے ـــــ

چانن ۔ بول بھی ۔

شیدا ۔ پتہ نہیں ۔ کیسے کہوں ۔

چانن ۔ جا ۔ ماں سے پوچھ لے جا کر ۔

شیدا ۔ دیکھا پھر ویسی بات ۔ تو مجھے ماں کا طعنہ کیوں دیوے ہے مجھے وس کے کھلاف اکساوے کیوں ہے ۔ ایسا نہ کیا کر باپو ۔

چانن ۔ کیوں ۔

شیدا ۔ مجھے نہیں اچھا لگتا ۔ ماں جو کرتی ہے اچھا کرتی ہے وہ گھر چلاتی ہے گھر کی عجت کا کھیال رکھتی ہے کہتی ہے ہمارا سر نیچا نہ ہو ۔

چانن ۔ ہنہ ۔ سر نیچا نہ ہو ۔

شیدا ۔ اور تو ہر بخت ماں سے چڑے ہے ۔ وہ ہر بات میں تیرے گھر کی محبت کا کھیال رکھے ہے تیرا ساتھ دیوے ہے پر تو نہیں دیوے ہے اس کا ساتھ ۔

چانن ۔ تیرا کیا ہے تجھ سے جو ماں کہے کہ باپو کا سر کاٹ لا ۔ تُو تو پھرک نہ کہے گا باپو کا سر کاٹ کر وس کے قدموں میں رکھ دے گا ۔ ہے نا ۔

شیدا ۔ ایسی بات نہ کر باپو ۔

چانن ۔ جا جا جو ماں کہے ہے وہی کر ۔ مجھ سے کیوں الجھتا ہے تُو ۔

شیدا ۔ (غصے سے) ہاں وہی کروں گا پھر (کمرے والے دروازے کی طرف چل پڑتا ہے ۔ اکبر باہر نکلتا ہے)

اکبر ۔ شیدا ادھر اس کوٹھڑی میں نہ جا ۔ ماسی کی حالت اچھی نہیں اُدھر آجا ۔ شاید آج کی رات نہ گجار سکے ۔ (شیدا واپس صحن میں آ جاتا ہے)

چانن ۔ تو ڈاکدار کو دکھا دو ۔

اکبر ۔ ماں کہے ہے ڈاکدار کو دکھانا بے فجول ہے ۔ ماسی کی جبان بند ہو گئی ہے ۔

چانن ۔ بے ہوس ہو گئی ہو گی ۔

اکبر ۔ نہیں آنکھیں کھلی ہیں ۔ ٹکر ٹکر دیکھے ہے پر بات نہیں کرے ہے ۔

چانن ۔ تو پھر ۔

اکبر ۔ ماں نے کہا ہے سائیں کو بُلا لا ۔

چانن ۔ وہ کیا کرے گا ۔

اکبر ۔ پتہ نہیں (دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)

چانن ۔ شیدے جو ایسی حالت ہے تو تُو لوگوں کو کھبر کر دے ۔

شیدا ۔ ماں کہے گی تو کر دوں گا ۔

چانن ۔ یہ بھی ٹھیک ہے اس گھر ماں تو وہی ہووے ہے جو ماں کہے ہے ۔

ساجی ۔ (دیوار سے ساجی سر نکالتی ہے) بابا ۔ کیا حال ہے ماسی سگاں کا ۔ ماں پچھے ہے ۔

(ساجی بار بار شیدے کی طرف دیکھتی ہے ۔ شیدا ساجی کو اشارے کرتا ہے)

چانن ۔ حال اچھا نہیں پتر ۔

شیدا ۔ جبان بند ہو گئی ہے ۔

ساجی ۔ ماں پچھے ہے ہم آجائیں کیا ...... ۔

چانن ۔ نہیں پتر ۔ تم آکے کیا کرو گی کوئی بات ہوئی تو ماں آواج دے دوں گا ۔

ساجی ۔ اچھا بابا ۔ (نیچے اتر جاتی ہے)

چانن ۔ دیکھ شیدے تو چٹائی بچھا دے یہاں ۔ جو لوگ آئے تو وہ بیٹھیں گے کہاں

(شیدا اٹھ کر چٹائی بچھاتا ہے ۔ سائیں داخل ہوتا ہے پیچھے اکبر ہے)

سائیں ۔ مولا ای مولا ۔ باقی رولا ای رولا ۔

(برکتے باہر نکل آتی ہے ۔ جے ناں جھانکتی ہے)

برکتے ۔ آجاؤ سائیں جی اکھری بخت ہے دم ہونٹوں پر اٹکا وا ہے پر نکلے نہیں ہے نجابع میں پڑی ہے ۔

سائیں ۔ گھور ہنیرا اک چانن تیرا ۔ جینا مرنا اس کے ہتھ وچ ہے ۔ کوئی دم نہیں مار سکدا ۔ پتہ نہیں ہل سکدا حکم بنا ۔ اک اللہ اور سبھی باقی سب ہوس ۔

(سائیں اندر جاتا ہے کوٹھڑی میں)

چانن ۔ چمکا ہوا ہے سائیں کیوں نہ چمکے پیر جو بنا رکھا ہے وسے ۔ جو وسے کیدے وہی کرے ہے ۔ وس کے کہنے پر چلے ہے ۔

سائیں ۔ (اندر سے سائیں کی آواز) اس کے من وچ چکر اے ۔ جد توڑی دل وچ رولا اسے شانت نہ ہوسی چنتا پھکر رولا دور کرو من شانت کرو ۔

چانن ۔ باتاں کا دھنی ہے باتاں کی کمائی کھاوے ہے اللہ ہی پھکر کرے کیا پتہ یو کیا پٹی پڑھا دے ۔

شیدا ۔ تو ماں کے کھلاف بات کرنے سے باج نہ آئیو ۔

اکبر ۔ تو چپ کر بڑوں کی باتوں میں دکھل نہیں دیا کرتے ۔

چانن ۔ بول لینے دے اسے دل کی بھڑاس نکال لینے دے یہ بھی بولنا سیکھے مرد بنے ۔

(سائیں باہر نکلتا ہے پیچھے برکتے ہے)

سائیں ۔ سب رولا ای رولا ۔

برکتے ۔ تو کیا حکم ہے سائیں جی ۔

سائیں ۔ (رک کر) اس کے من کی چنتا دور کرو ۔ نہیں تو اس کا دم یونہی اٹکا رہے گا ۔ تجھے تو پتہ ہے تیری بہن کیا چاہے ہے ۔ مولا ای مولا ۔ (باہر نکل جاتا ہے)

برکتے ۔ بس وہی ہوا جس کا ڈر تھا وہی ہوا جو ہونا تھا ۔

شیدا ۔ کیا ہوا ماں ۔

برکتے ۔ وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے اس گھر میں ۔

چانن ۔ وہی ہوگا جو تو چاہے گی ۔ تو ہی اس گھر کی ہونی ہے ۔

برکتے ۔ بس تو نہ بول بیچ ماں ۔

جانن - جیسے تیری مرضی (برکتے سر پکڑ کر کھاٹ پر بیٹھ جاتی ہے)

برکتے - میری مرضی کون جانے ہے۔ وہی ہوگا جو بڑوں کی ریت ہے جو باپ دادا کرتے آئے جس ماں گھرانے کی شوبھا بڑھے۔

شیدا - ہاں ہاں ماں تو کہہ تو سہی۔

برکتے - جو تو میرا پتر ہے جو تو نے میرا دودھ پیا ہے تو اب وس کا حق ادا کرنا ہوگا۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ برکتے کے لڑکوں نے بڑوں کی ریت توڑ دی۔ گھر کی عجت پر بٹہ لگایا۔

اکبر - تو فکر نہ کر ماں۔

برکتے - کیسے نہ کروں فکر ادھر تیری ماسی پڑی تڑپ رہی ہے۔ جبان بند ہوگئی ہے دھڑ ماں سے جان نکل گئی ہے۔ پر وہ یونہی تڑپتی رہے گی ہونٹوں پہ جان اٹکی رہے گی وے نجاح میں ہی رہے گی مجھ سے وس کا دکھ دیکھا نہیں جائے ہے (روتی ہے) میری رانڈ بہن کوئی اپنا نہیں کوئی دکھ بانٹنے والا نہیں۔ (ہچکی)

شیدا - تو بات تو کر ماں روے کیوں ہے۔ ہم تیرے پتر ہیں تو حکم کر۔

اکبر - ہم کیا بیگانے ہیں ماں۔

برکتے - اپنے بن کر دکھاؤ تو اپنا سمجھوں ماں (آنسو)

جانن - تو مطلب کی بات کر ناں۔

برکتے - (غصے میں) تو نہ بول بیچ میں - میں اپنے پتروں سے بات کر رہی ہوں تجھے کیا لینا دینا ہے۔ میری عجت تیرے ہاتھ میں نہیں۔ میرے پتروں کے ہاتھ میں ہے۔ شکر ہے اللہ کا۔

(ساجی اور بانو دیوار سے جھانکتی ہیں۔ جے ناں دروازہ میں کھڑی ہو کر سنتی ہے۔)

اکبر - تو نہ بول باپو۔

جانن - میں تو پہلے ہی چپ ہوں۔

شیدا - تو ہم سے بات کر ماں ہم جو سنتے ہیں تیری بات۔

برکتے - وہ نہیں مرے گی - اس کی روح کو چین نہیں پڑے گا جد توڑی ——

شیدا - جد توڑی کیا۔

برکتے - جد توڑی وسکی اکلوتی بچّی کو سہارا نہ مل جائے۔

اکبر - ہم جو ہیں ماں ہماری بہن ہے وہ۔

برکتے - بہن کون بنا سکے ہے سب منہ جبانی کی باتاں ہیں۔

اکبر - ہم جو بنا دیں ہیں۔

برکتے - جو کل میرا دم نکل جائے تو کیا تمہاری گھر والیاں وسے گھر میں رکھیں گی وسے اپنا سمجھیں گی۔ اور کل جد وہ جوان ہوگئی تو کس طرح

اس گھر میں رہ سکے گی۔ لوک کیا کہیں گے۔ گھر کی عجت کے پرچے اڑیں گے۔ لوگ باتیں کریں گے۔ طعنے دیں گے۔ اگر سگاں کی لڑکی لڑکا ہوتا تو اور بات تھی۔ پر یہ لڑکی ہے۔ ہاں۔

اکبر۔ تو پھر اس کا کیا ہو سکے ہے۔

برکتے۔ جد توڑی نشگاں کی آنکھوں کے سامنے پینو کا نکاح نہیں ہوتا وہ شانت نہیں ہوگی۔ میں کہوں ہوں نہیں ہوگی۔

چانن۔ کس سے نکاح کرے گی تو پینو کا۔

برکتے۔ تو نے پھر دیا دکھل۔

اکبر۔ آخر تو بتائے گی تو ہی پتہ چلے گا ہمیں کہ تیرے دل میں کیا ہے۔

چانن۔ وس کے دل کا پتہ چلا ہے بھلا کسی کو کبھی۔ ماں پوچھوں ہوں کس سے کرے گی تو پینو کا نکاح۔

برکتے۔ شیدے کا۔ (سب بولتے ہیں "شیدے کا پینو سے" حیرت سے دیکھتے ہیں۔)

اکبر۔ ماں یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔

برکتے۔ یہ ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔ لوک کیا کہیں گے کہ مرتے وقت بھی بہن نے سہارا نہ دیا۔ بہن کی لاج نہ پالی وس کی معصوم بچی کا ہاتھ نہ تھاما۔

چانن۔ لیکن شیدے سے۔ (چانن اور قریب آجاتی ہے)

شیدا۔ ہیں ہیں۔ ماں۔ ہیں۔

برکتے۔ ہاں تو تو جو میرا پتر ہے تو میری لاج رکھے گا۔ گھر کی عجت اب تیرے ہاتھ میں ہے جو تو نے میرا دودھ پیا ہے تو میرے چٹے سر پہ دھول نہ ڈلوا۔

اکبر۔ لیکن ماں کوئی جوڑ بھی ہو دونوں کا۔

برکتے۔ شیدے کیا تو مجھے جلیل کروائے گا۔ کیا تو چاہے ہے کہ لوگ میرے منہ پر تھوکیں۔

شیدا۔ ماں۔

برکتے۔ ماں کہتے شرم نہیں آوے جو ماں کہے ہے تو ماں کی لاج پال اور نہیں پال سکے تو ماں کیوں کہے ہے تو۔

شیدا۔ باپو بول تو کیوں نہیں بولتا (روتی آواز) بول باپو بول۔

چانن۔ کیا بولوں ماں میں تو ساری جندگی بول نہ سکا تم نے مجھے بولنے نہ دیا تم جو میرے پتر ہو۔ مجھے اپنے پتروں نے بولنے نہ دیا تم سب نے ہر بات میں ماں کا ساتھ دیا اور مجھے اپنا بیری سمجھا۔ اُلٹا مجھے ڈانٹتے رہے دھتکارتے رہے اب میں کیا بولوں۔

برکتے۔ تو کیا بولے گا تجھے کیا پتہ گھر کی عجت کسے کہتے ہیں۔

چانن۔ دیکھ لو یہ سامنے گھر کی عجت جو یہ کہے وہی سچ ہے۔ جو یہ کہے اسی میں گھر کی شوبھا ہے جو یہ کہے وہی ہو کر رہے گا بس یہی دیوی

ہے اس گھر کی اس کی پوجا کرتے کرتے جندگی تبادی اس کے چرنوں میں پھول چڑھاتے چڑھاتے بڈھا ہو گیا اب تم وس کے چرنوں میں پھول چڑھاؤ۔

بجے نال۔ (اپنے آپ سے) ہونہہ دیوی دیویاں کیا اپنے ہی بچوں کا کلیجہ کھا دیں ہیں۔

اکبر۔ (چپکے سے غصّے میں) تو نہ بول بجے نال تو کیوں آئی ہے اِدھر۔

چانن۔ تو کیوں لڑکتا ہے وسے۔ ساری دنیا تماشا دیکھ رہی ہے وہ کیوں نہ دیکھے تماشا۔

برکتے۔ میں کیا تماشا ہوں۔

چانن۔ تو تو مداری ہے تماشا تو سارا دیکھ رہی ہے۔ تو کئے جا تماشا اپنے بچوں کا۔ ان میں سے کسی میں جان نہیں۔ کوئی نہیں بسے گا۔ جتنا جلم جی چاہے توڑ یہ تو یہی کہنا چاہیں ہیں کہ ماں کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔

برکتے۔ میں کیا اپنے لئے کہوں وہ میری طرپھ سے چاہے جو جی میں آئے کرے چاہے اپنی ناک کٹوا دے۔ گھر کی عجت پہ بٹہ لگا۔ مجھے کیا لینا دینا۔

اکبر۔ اس میں ناک کٹوانے کی کیا بات ہے ماں کیا ہم بینو کو نکاح کئے بغیر اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے۔

برکتے۔ ہونہہ اپنے گھر۔ یہ گھر کیا تمہارا ہے اپنے گھر میں کون جانے ہے تمہیں گھر گھر والی کا ہووے ہے۔ خصم کا نہیں۔ تیری گھر والی کا بس چلے تو ابھی مجھے گھر سے نکال باہر کرے اور کی بات چھوڑ۔ یوں تخال پھینکے جیسے دودھ سے مکھی نکالیں ہیں۔ تو کیا اپنی جنانی کا خصم بن سکا ہے کدی۔ تیری کیا مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر وس کی طرپھ دیکھے۔ دیکھ تو کس طریوں دیکھ رہی ہے میری طرپھ۔

بجے نال۔ تو میری بات چھوڑ۔

برکتے۔ کیسے چھوڑوں تیری بات تیری بات تو تیرے ماتھے پر لکھی ہے۔ کوئی پڑھے چاہے۔

اکبر۔ ماں۔ (غصّہ) پر یہ جان لے تو ——

برکتے۔ پر دو نہیں جانتی ماں کل بینو جوان ہو گئی تو کس طرح رہے گی اس گھر ماں تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔ دنیا کیا کہے گی اور پھر تم۔ تمہارا ابھی کیا اعتبار۔ جوان لڑکی کو دیکھ کر تو بھائیوں کے دیدے پھٹ جاتے ہیں اج کل منہ بولی بہن کس شمار و قطار میں ہے۔

چانن۔ بھاگوان ——

برکتے۔ بس تو نہ کر بات میں کہوں ہوں شیدے کا بیاہ بینو سے ہوگا۔

(چھاتی بجاتی ہے) ہو کر رہے گا اور ابھی ہوگا اسی وقت . . . . ساجی جرا مولوی صاحب کو بلا لا۔ (ساجی اتر جاتی ہے)

چانن۔ جلم نہ کر بھاگوان۔ لوک ریت پوری کرنے کو کیوں اپنے پتر کی قربانی دے رہی ہے تو۔

برکتے۔ دے رہی ہوں۔ تو دکھل دینے والا کون ہے۔

چانن - اب کیوں نہیں بولتا تو شیدے -

شیدا - میں - میں - میں -

چانن - قربانی کے بکرے کی طرح میں میں کیا کرے ہے -

شیدا - میں (ہچکی)

چانن - دیکھ تو - یہ بیس سال کا ہے اور پینو سات سال کی ہے -

برکتے - لڑکی جوان ہونے میں دیر لگتی ہے کیا - آج اتنی سی ہے کل جوان -

(شیدے کی ہچکی جاری رہتی ہے)

چانن - پر دونوں ماں آنا پھرک ہے -

برکتے - (شیدے سے) تو کیا فُسّس فُسّس کرے ہے شیدے -

شیدا - ماں - میں تو -

برکتے - بول نا - کیا بولتا ہے تو -

شیدا - میں بولوں (ہچکیوں کے ساتھ)

برکتے - ہاں - تو بول کیا بولتا ہے -

شیدا - ماں تو کچھ نہیں بولتا - ماں (ہچکی) کچھ بھی نہیں (ہچکی)

(پینو سرخ کپڑے پہنے سونے والے کمرے سے داخل ہوتی ہے - اُسے دیکھ کر سب خاموش ہو جاتے ہیں -)

پینو - دیکھ ماسی ماں نے لال کپڑے پہنے دیکھ -

شیدا - (ہچکی) -

پینو - بابا - دیکھ پھول والا لال کرتا اچھا ہے نا بابا - بابا - میں اپنے ہاتھوں پہ مہندی لگاؤں گی -

شیدا - (ہچکی) -

پینو - ماسی مجھے مہندی لگا دے (خاموش) بابا - میں نے کہا تھا نا کہ میرا بیاہ ہوگا (تالی بجاتی ہے) کہا تھا نا (چانن سر ہلاتا ہے) -

پینو - تو تو کہتا تھا نہیں ہوگا کہتا تھا ماں چھوٹی ہوں ماں کیا چھوٹی ہوں کیوں ماسی اتنی بڑی تو ہوں ماں -

(شیدا ہچکی - برکتے مسکراتی ہے شیدا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے)

پینو - کیوں شیدے تُو تو روے ہے کیوں روے ہے تو -

(خاموشی)

پینو - بابا - یہ بولتا کیوں نہیں -

چانن - کیا بولے گا یہ - بس کر شیدا اب تو ساری عمر کا رونا ہے -

(دولہ داخل ہوتا ہے)

دولہ۔ بہن برکتے مولوی صاحب آ گئے۔

مولوی صاحب۔ (داخل ہو کر) السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

برکتے۔ آجاؤ مولوی صاحب۔

ساجی۔ بانو نوراں ڈھولک لے کر اندر آتی ہیں۔

برکتے۔ چل تو شیدے (بازو سے پکڑ لیتی ہے)

دولہ۔ یہیں بیٹھ جائیں بہن۔ وڈیے ماں۔

برکتے۔ اونہوں اندر چلو سگاں کے سامنے نکاح پڑھیں۔ دے آنکھوں سے دیکھے وسے تسلی ہو۔

(برکتے مولوی شیدا بینو دولہ اندر جاتے ہیں۔)

جانن۔ اکبر باہر رہ جاتے ہیں۔ سب عورتیں ڈھولک رکھ کر گانا شروع کر دیتی ہیں۔

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

(وہی منظر۔ چھ ماہ بعد۔ چند ایک معمولی تبدیلیاں۔ صحن میں ایک چارپائی کھڑی ہے۔ اس پر چادر پڑی ہے اس کے پیچھے اکبر نہا رہا ہے بالٹی، پانی ڈونگے کی آواز۔ نہلتے ہوئے شور مچاتا ہے ایک طرف پیڑھے پہ جناں بیٹھی قمیص پہ بٹن ٹانک رہی ہے اکبر کے نہانے کی آوازیں سنتی ہے۔ وقت الصبح)

جے ناں۔ تو نہا رہا ہے یا کبڈی کھیل رہا ہے۔

اکبر۔ مجھ سے کہا کچھ۔

جے ناں۔ نہیں تجھ سے نہیں۔ (ہنستی ہے)

اکبر۔ ہنستی کیوں ہے تو۔

جے ناں۔ ہنسنا زرم ہے کیا۔

اکبر۔ مجھ پہ ہنسے ہے نا۔ کرتا ہوں تجھے ٹھیک۔ ٹھہر جا۔ (مرغا بانگ دیتا ہے)

جے ناں۔ کرے میرا کیا کرتا ہے (ہنس کر)۔

اکبر۔ دیکھ تو سہی۔

جے ناں۔ ہنہ دیکھ تو سہی (ہنس کر)

(اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے تولیے سے بدن پونچھتا ہے)

اکبر۔ تو جلدی بٹن ٹانک تا مجھے دیر ہو رہی ہے۔

جے ناں۔ آج تو کیوں جا رہا ہے کمانے۔ آج تو چھٹی ہے۔

اکبر۔ ہاں چھٹی تو ہے پر آج بڑے صاحب نے آنا ہے۔

جے ناں۔ کس لئے آنا ہے بڑے صاحب نے۔

(بنیان پہنتا ہے پاجامہ پہنتا ہے) (زیادہ روشنی)

اکبر۔ آج بزٹ ہے جو صاحب کھس ہوا تو ......

جے ناں۔ تو کیا۔

اکبر۔ شاید ترقی مل جائے۔ اگلا گریڈ مل جائے تو موج ہو جائے۔

(باہر نکل کر آئینہ رکھ کر بال بنانے لگتا ہے)

جے ناں۔ مل بھی جائے تو کیا۔

اکبر۔ کیوں۔

جے ناں۔ چاہے جتنا کما لے۔ سب بھسم ہو جائے گا اس گھر کی بھٹی ماں۔

اکبر۔ برا جہر ہے تجھ ماں۔

جے ناں۔ خاموش۔ اوں۔ جہر (لاڈ)

اکبر۔ گھر کا سوچ کر اک ہو جاتے ہے تو۔

جے ناں۔ اپنا گھر بھی ہو۔ سرائے میں بیٹھے ہیں۔

اکبر۔ بس ڈھاک کے وہی تین پتر۔ اب بھی تو کھس نہیں ہے اب تو میں نے اوبرٹیم کرنا چھوڑ دیا ہے۔

جے ناں۔ تے نے کہاں چھوڑا ہے۔

اکبر۔ تو کس نے چھوڑا ہے۔

جے ناں۔ وہ تو شیدے نے جد کر کے اوبرٹیم کرنا شروع کر دیا ......

اکبر۔ چلو یونہی سہی۔ کچھ تو مال تو ......

جے ناں۔ شیدا تو بالکل بدل گیا ہے وہ شیدا تو رہا ہی نہیں جد سے دس کا پینو سے نکاح ہوا ہے چھ مہینے ماں اتنا بدل گیا ہے۔

اکبر۔ مجھے تو نہیں دکھتا۔

جے ناں۔ تجھے کچھ دکھے بھی ہے۔

اکبر۔ ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے مجھے تو صرف تو ہی دکھے ہے۔

جے ناں۔ (لاڈ سے) ہونہہ۔

اکبر۔ تجھ پہ تو نئے سرے سے جوانی آگئی ہے۔

جے ناں۔ گپّیں نہ مارا کر۔

اکبر۔ تیری قسم ایسے دکھ رہی ہے تو جیسے گٹی کی دودھیا چھل ہو۔

جے ناں۔ ہٹ (لاڈ)۔

اکبر۔ بس اب ایک لڑکا دے دے۔

جے ناں۔ (شرماتی ہے) لے اپنی قمیچ۔

اکبر۔ (قمیص پہنتا ہے) بھئی واہ۔ تو تو دلہن بن گئی اب۔

جے ناں۔ دیکھ لے۔

اکبر۔ اب لڑکے کی ماں بھی بن نا۔

جے ناں۔ سنکی ہے۔ تجھے یہی خیال آیا۔

اکبر۔ دوجی قمیچ کس کی ہے۔ (الگنی پر دوسری قمیص لٹکتی دیکھ کر)

جے ناں۔ شیدے کی ہے۔

اکبر۔ میں نے کہا شیدا گھر کیوں نہیں رہتا اب۔

جے ناں۔ کیسے رہے۔ ماں بہنوں سے کہے ہے۔ تو نہ جایا کر شیدے کے پاس جس سے بیاہ ہو جائے وس کے پاس نہیں جایا کرتے (ہنس ہنس کر)

اکبر۔ اچھا۔

جے ناں۔ اور کہتی ہے جو شیدا تیری بانہہ پکڑے تو مجھے بتایو۔

اکبر۔ یہ تو عقل کی بات ہے جے ناں وہ بیس سال کا ہے یہ سات سال کی اگر جو.....

جے ناں۔ اگر جو۔ ہونہہ۔ پہلے کیوں نہ سوچا اگر جو۔ آج عقل آگئی۔

اکبر۔ تجھ سے کون سر کھپائے۔

جے ناں۔ نہ کھپا۔ (وقفہ)

اکبر۔ میں نے کہا ماں جاگی نہیں ابھی۔

جے ناں۔ سب سو رہے ہیں ابھی تو ڈری۔ صریحہ بالو جاگے ہے تمبا خو رکھ دیا تھا۔

اکبر۔ جے ناں۔ تو بہنوں کا کھیال رکھا کر۔

جے ناں۔ (ہنس کر) سارا دن مرے گلے کا ہار بنی رہے ہے۔

اکبر۔ اچھا۔ وہ علیہ بھی تو تیرے گلے کا ہار بنا رہے تھا۔

جے ناں۔ وہ تو میرا راجا تھا۔

اکبر۔ کتے کی طرح یوں تیرے پیچھے پھرتا تھا۔

جے ناں۔ سچ پوچھ تو اس گھر میں جو مجھ سے کسی نے محبت کی ہے تو بس ایک جلیے نے کی ہے۔

اکبر۔ اور میں جو کرتا ہوں۔

جے ناں۔ مطلبی کی۔ تو کیا جانے محبت کسے کہیں ہیں۔

اکبر۔ جو وہ محبت کرتا تھا تجھ سے تو تجھے چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔

جے ناں۔ اکبر وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا میرا دل گواہی دیوے ہے۔

اکبر۔ تجھے کیا پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے۔

جے ناں۔ جہاں بھی ہے وہ گھر سے ہے جانے سے پہلے کہے تھا بھابی میں تو نوکری کروں گا اور جو کماؤں گا تجھے دونگا سب تجھے دوں گا۔
(ہنستی ہے) کہے تھا یہ ماں کو نہ بتانا۔ (ہنستی ہے)

اکبر۔ بے عقل ابھی سے نوکری کی سوچے تھا نوکری تو عمر بھر کرنی ہے پھر پڑھ لکھ لیتا۔

جے ناں۔ اوں ہوں۔ پڑھ کے نہ دے گا وہ۔

اکبر۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔

جے ناں۔ ٹھہر جا میں قرآن لے آؤں اس کے تلے سے گزاروں گی تجھے (اندر داخل ہو جاتی ہے)

اکبر۔ (ہنستا ہے) اچھا تو جلدی کر دیر ہو رہی ہے (کچھ دیر بعد) آ بھی۔ اب کہاں چلی گئی۔ (وقفہ) اوہو مجھے دیر ہو رہی ہے میں جاتا ہوں۔ اگلے برٹ پر سہی . . . (جاتا ہے)

جے ناں قرآن اٹھائے کمرے سے نکلتی ہے خوشی خوشی۔ اکبر کو غیر موجود دیکھ کر دھک سے رہ جاتی ہے دیر تک حسرت بھری نگاہ سے دیکھتی رہتی ہے۔

جے ناں۔ اللہ خیر کرے (اپنے آپ سے پھر آہستہ آہستہ واپس اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔)
(ساتھ والی کوٹھڑی کے دروازے میں چانن آ کھڑا ہوتا ہے)

چانن۔ زلدی کر دیر ہو گئی ہے دیکھ تو دن چڑھ آیا ہے آبھی نا اب (بلند)

برکتے۔ (اندر سے) ابھی آئی ٹھہر جا۔

چانن۔ بھاگوان بس کر اس عمر ماں سیسہ دیکھنے کا بھیدہ۔ (آگے آ جاتا ہے صحن میں)
(برکتے باہر نکلی ہے ساتھ والی کوٹھڑی سے)

برکتے۔ چل اب۔

چانن۔ پوڈر بھی لگا لیتی تھوڑا سا۔

برکتے۔ مسخری نہ کیا کر چل اب۔

(دونوں باہر نکلتے ہیں۔ صحن کے دروازے سے)

بینو۔ (کوٹھڑی سے نکل کر با آواز بلند) ہے دیکھ جے ناں میں نے گڑیا کا کرتا بنایا۔ (دیکھتی ہے جے ناں نہیں ہے) (وہیں بیٹھ کر گڑیا کو کرتا پہنانے لگتی ہے۔ گڑیا سے باتیں کرتی ہے پیٹھ صحن کے دروازے کی طرف)۔

بینو۔ اتنا اچھا کرتا ہے یہ اب تو پہن لے اسے۔ نہ کبھی پہلے یہ کرتا تو اتار دے یہ کرتا تو پرانا ہے۔ آہاہا یہ نیا کرتا کتنا اچھا ہے (کرتا پہناتی ہے۔) (شیدا صحن کے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ ہاتھ میں پوٹلی ہے بینو کو اکیلے دیکھ کر ٹھٹھکتا ہے دبے پاؤں اس کی طرف بڑھتا ہے بینو چیخ مارتی ہے۔

شیدا۔ چیخیں کیوں مارے ہے تو۔

بینو۔ ماں ڈر گئی۔

شیدا۔ تو تو کھوہ مکھواہ ڈرے ہے۔

بینو۔ چھوڑ مجھے چھوڑ بھی۔

شیدا۔ آہستہ بول شور کیوں مچاوے ہے۔

بینو۔ چھوڑ ماں کہے تھی جو تیرا ہاتھ پکڑے تو مجھے بتانا۔

شیدا۔ نہ۔ نہ۔ ماں کو نہ بتانا (چھوڑ دیتا ہے) تو تو کھواہ مکھواہ مجھ سے دور بھاگے ہے۔

بینو۔ ماں کہے ہے جس سے بیاہ ہو جائے وس کے پاس نہیں جاتے۔

شیدا۔ تو پھر جے ناں کیوں جاتی ہے اکبر کے پاس۔

بینو۔ مجھے نہیں پتہ۔

شیدا۔ تجھے کب ہوش آئے گا کب بڑی ہوگی تو۔

بینو۔ (کھڑی ہو جاتی ہے) میں تو اتنی بڑی ہوں۔

شیدا۔ ابھی کہاں (آہ) (جے ناں دروازے سے سر نکالتی ہے دیکھتی ہے مسکراتی ہے پھر چھپ کر دیکھتی ہے)

بینو۔ کیوں۔

شیدا۔ دیکھ تو ابھی تو ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں تیرے پنڈے میں۔

بینو۔ تو کب بڑی ہوں گی میں۔

شیدا۔ جد پھول لگیں گے جد پنڈا بھر جائے گا۔ جیسے جے ناں کا ہے۔

بینو۔ ہاں ہاں جے ناں بیٹھے ہے تو چوکی بھر جاوے ہے۔

شیدا۔ پھر تو بھی بیٹھے گی تو چوکی بھر جاوے گی۔

بینو۔ اچھا۔ پھر۔ پھر۔ کیا ہو گا۔

شیدا۔ پھر۔ (سوچ میں پڑ جاتا ہے)

پینو۔ بتا نا پھر کیا ہو گا۔

شیدا۔ اب میں تمھیں کیا بتاؤں۔ (اپنے آپ سے آہ بھر کر)

پینو۔ بتاؤ نا۔ بتاؤ بھی نا۔

شیدا۔ شور نہ مچا۔

پینو۔ کیوں۔

شیدا۔ کسی نے سن لیا تو۔

پینو۔ تو کیا۔

شیدا۔ ہاں تمسے ہوئی تجھے۔

پینو۔ مجھے؟ میں کہوں گی شیدے نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔

شیدا۔ نہ نہ نہ ایسا نہ کرنا آ میں تجھے کچھ دوں۔

پینو۔ کیا ہے۔

شیدا۔ یہ دیکھ (پوٹلی سے ابلا ہوا انڈا نکالتا ہے)

پینو۔ تو مجھے انڈے کیوں کھلاوے ہے برفی کیوں نہیں لاوے ہے میرے لئے۔

شیدا۔ برفی تو کمالی میٹھی ہووے ہے اور انڈا گرم ہووے ہے گرم۔

پینو۔ ہنہ یہ تو ٹھنڈا ہے۔

شیدا۔ اوپر سے ٹھنڈا ہے اندر سے گرم ہووے ہے۔ گرم

پینو۔ اچھا۔

شیدا۔ یہ تجھے گرما دے گا۔

پینو۔ سچ۔

شیدا۔ ہاں۔ ہاں۔

پینو۔ پھر۔

شیدا۔ تو جلدی بڑی ہو جائے گی تیرا اینڈا ابھر جائے گا جیسے سجے نال کا ہے۔ (ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

پینو۔ چھوڑ چھوڑ میرا ہاتھ چھوڑ میں چیخوں گی۔

شیدا۔ شور نہ مچانا۔ شور نہ مچانا۔ نہ نہ۔

پینو۔ پھر چھوڑ۔ (ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہے) اور صحن کے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔)

(شیدا دیکھتا رہ جاتا ہے۔)

جے ناں۔ (باہر نکلتی ہے) کون۔ شیدا ہے (جے ناں کے ہاتھ میں تھالی ہے۔ تھالی میں دال ہے چلتی ہے)

شیدا۔ ہاں (گھبرایا ہوا)

جے ناں۔ کہاں سے آیا ہے تو (چبوترے پر بیٹھ جاتی ہے تھالی سامنے رکھ لیتی ہے۔)

شیدا۔ کرکھنے سے آیا ہوں اوبرتھیم کر کے۔

جے ناں۔ ہر وخت باہر ہی رہے ہے تو آجکل کیا بات ہے شیدے۔

شیدا۔ ویسے ہی۔

جے ناں۔ بات تو ضرور ہے کوئی۔ رہے بھی چپ چپ ہے تو۔ وہ بات ہی نہیں رہی۔

شیدا۔ گھر آ کر کروں بھی کیا۔

جے ناں۔ پہلے بھی تو یہی گھر تھا۔ سارا دن گھر رہے تھا تو پر اب۔ کیا بات ہے۔

شیدا۔ کچھ نہیں۔

جے ناں۔ (شرارت) کیا ہوا ہے تجھے۔

شیدا۔ پتہ نہیں جے ناں۔

جے ناں۔ پھر بھی۔

شیدا۔ جی نہیں لگتا۔

جے ناں۔ کیوں۔

شیدا۔ گھر آؤں تو ماں گھورے ہے نظر میں رکھے ہے جیسے میں نے کوئی جُرم کیا ہے۔

جے ناں۔ کیوں۔

شیدا۔ کہے ہے پینو سے بات نہ کر۔

جے ناں۔ وہ تو تیری بیاہتا ہے (شرارت)

شیدا۔ (تڑپ کر) تو بھی مخول کرتی ہے جے ناں۔

جے ناں۔ پگلا لڑکیوں کو جوان ہوتے دیر لگتی ہے کیا۔

شیدا۔ چھ مہنے تو ہو گئے۔ وہ کدی جوان نہیں ہو گی کدی نہیں۔

جے ناں۔ کیوں۔

شیدا۔ جو ہر وقت ماں سے چمٹی رہے وہ کیا جوان ہو سکے ہے کدی۔ ماں نے تو پینو کو کئی بار کہا ہے کہ تیرے پاس رہا کرے۔

جے ناں۔ کیوں میرے پاس کیا ہے۔

شیدا۔ تیرے پاس۔ تیرے پاس۔

بےناں۔ بتا نا۔

شیدا۔ مجھے نہیں مالم۔ بس میرا جی چاہے ہے کہ وہ تیرے پاس رہا کرے۔

بےناں۔ ایک بات پوچھوں شیدے۔

شیدا۔ پوچھ۔ دو پوچھ۔ دس پوچھ۔

بےناں۔ اس وقت جب تیرا نکاح ہوا تھا اس وقت تو کیوں چپ رہا تیرے منہ میں گھنگھنیاں کیوں پڑ گئیں۔

شیدا۔ پتہ نہیں کیوں۔ پر ماں کے سامنے میری جبان کھنچ جاوے ہے۔

بےناں۔ تو پھر اپنے کئے کی سزا بھگت۔

شیدا۔ تُو تو ایسی باتیں نہ کہہ بےناں۔ تُو تو جانے ہے تجھے تو مالم ہے۔ سارے گھر میں صرف تو ہی تو ہے۔

بےناں۔ (شرارت) کیوں گھر میں تو سبھی ہیں۔

شیدا۔ ہوں گے۔ پر۔

بےناں۔ پر کیا۔

شیدا۔ تجھ سے ہی تو بات کروں ہوں۔ اور جو تو ہی طعنے دے تو ——

بےناں۔ میں طعنے تو نہیں دیتی ہوں۔

شیدا۔ تو بڑی اچھی ہے جو تو نہ ہو تو میں گھر آؤں ہی نہ کدی (ہچکی)

بےناں۔ تو تو خواہ مخواہ رو دے ہے۔ اب پینو کو جوان ہونے میں کیا دیر ہے۔ جی بُرا نہ کر۔

(صحن کے دروازے سے پینو داخل ہوتی ہے)

پینو۔ بےناں ماں نہیں آئی۔

شیدا۔ دیکھ لے اسے تو ہر وقت ماں کی دھن لگی ہے۔

پینو۔ بےناں دیکھ میں نے قمیض پر موتی ٹانکے۔ (گڑیا کی قمیص دکھاتی ہے)

بےناں۔ آجا یہاں آکر دکھا مجھے۔

پینو۔ نہ نہ۔

بےناں۔ کیوں۔

پینو۔ شیدا جو ہے وہاں۔

شیدا۔ (غصے میں) دیکھ لیا بےناں۔ نہ جانے کب عقل آئے گی اسے کب بڑی ہوگی۔

بےناں۔ جلدی جلدی بڑی ہونا پینو۔

پینو۔ پھر کیا ہوگا۔

جے ناں۔ پھر تو دلہن بنے گی۔

پینو۔ اور اس روج جو بنی تھی جو گوٹے والے کپڑے پہنے تھے کیسے اچھے اچھے کپڑے پہنے تھے میں نے (تالی بجا کر)

شیدا۔ آہستہ بول چیختی کیوں ہے تو۔

جے ناں۔ تو کیوں گسہ کرے ہے اس کی بات پہ کھواہ مکھواہ۔

پینو۔ مجھے ہر وقت گھورتا ہے بازو پکڑے ہے ہونہہ (منہ چڑا کر کمرے میں بھاگ جاتی ہے)

شیدا۔ سب اس کی شرارت ہے جے ناں۔

جے ناں۔ کیا۔

شیدا۔ جان بوجھ کر مجھے گسہ چڑھاوے ہے یہ۔ منہ چڑاوے ہے میرا۔

جے ناں۔ بچی جو ہوئی۔

شیدا۔ ہونہہ۔ بچی ہے۔ بڑی پکی ہے جو ماں کہتی ہے وہی کرے ہے۔

جے ناں۔ تو ماں پہ گسہ کر۔ ناں۔ اس کا کیا دوش ہے۔

شیدا۔ پر یہ ماں کی بات میں کیوں آتی ہے۔

جے ناں۔ تو کیا ماں کی بات پہ نہیں چلا کرے تھا ہونہ ماں کی طرف سے بابا سے کبھی لڑا اتھا تو کھو وہی کہے ہے کہ ماں کے سامنے میری جان کھیچ جاتی ہے گلت ہے کیا۔

شیدا۔ ٹھیک ہے جے ناں۔ پر وہ جب کی بات تھی۔

جے ناں۔ ان دنوں تو تو کسی کی نہیں سنتا تھا کہے تھا جو ماں کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔

شیدا۔ ان دنوں مجھے سمجھ نہیں تھی جے ناں۔

جے ناں۔ تو کیا پینو کو سمجھ ہے۔ بول کیا کہے ہے تو۔

شیدا۔ تو ٹھیک ہی کہتی ہے جے ناں۔

جے ناں۔ پینو کا تو کوئی دوش نہیں نا اس نے تو تیرا کچھ نہیں بگاڑا۔

شیدا۔ کچھ نہیں پر۔

جے ناں۔ پر کیا۔

شیدا۔ پر۔ مطلب ہے۔

جے ناں۔ بول بھی نا۔

شیدا۔ وہ جو اتنی کی اتنی ہی ہے چھ مہنے ہو گئے جرا بڑی نہیں ہوئی۔

جے ناں۔ (ہنستی ہے) پاگل۔ یہ کیا وس کے بس کی بات ہے۔

شیدا۔ (خاموشی)۔

جے ناں۔ اب بول بھی۔

شیدا۔ نہیں وسکے بس کی تو بات نہیں۔

جے ناں۔ تو پھر۔

شیدا۔ پتہ نہیں جے ناں۔ پر مجھے وسے دیکھ کر گسہ آوے ہے۔

جے ناں۔ آخر کیوں۔

شیدا۔ شرارت کرتی ہے نا مجھ سے۔

جے ناں۔ کیا۔

شیدا۔ بس جان بوجھ شرارت کرے ہے۔

جے ناں۔ آخر بتا بھی نا مجھے۔

شیدا۔ کیا بتاؤں تجھے۔

جے ناں۔ کیوں مجھ سے پردہ ہے کیا۔

شیدا۔ نہیں تو مجھے سرم آوے ہے۔

جے ناں۔ سرم آوے ہے کس بات پہ۔

شیدا۔ دیکھ نا۔ پینو ہونٹوں پہ سرخی لگایوے ہے۔

جے ناں۔ پھر کیا ہوا۔

شیدا۔ پھر میرے سامنے آجاوے ہے اور پھر ہونٹھ نکال نکال کر مجھے دکھاوے ہے۔

جے ناں۔ (ہنسی ضبط کرتی ہے) سبھی لڑکیاں سنگھار کریں ہیں۔

شیدا۔ پھر سرمہ لگا کر میری طرپھ دیکھے ہے آنکھیں مٹکاوے ہے۔

جے ناں۔ اس میں کیا ہے تو تو کھواہ مکھواہ پاگل ہو رہا ہے۔

شیدا۔ سبھی مجھ کو پاگل سمجھیں ہیں سبھی ایک صرپھ تو۔

جے ناں۔ نہ نہ شیدے جی برا نہ کر (پینو داخل ہو کر شیدے کی طرف دیکھتی ہے۔)

شیدا۔ میں تو نہیں کروں ہوں آپ ہی ہو جاوے ہے جی کرے ہے روؤں چیخیں مار مار کر روؤں گھر میں کوئی بھی تو میرا طرپھدار نہیں سبھی مجھے یوں دیکھیں ہیں جیسے کوئی زرم کر کے آیا ہوں ماں یوں دیکھے ہے جیسے قصائی ہو بابو میرا مجاک اڑائے ہے کہے ہے جا جا ماں کی گود میں بیٹھ جا کر۔

پینو۔ ہونہہ اتنا بڑا ہو کر رووے ہے (منہ چڑاتی ہے)

شیدا۔ تو پھر آگئی۔ دوڑ جا یہاں سے۔

پینو۔ نہیں جاتی کرلے میرا کیا کرتا ہے۔

جے نال۔ نہ نہ تو نہ بول شیدے۔

شیدا۔ اور وہ جو بولتی ہے۔

جے نال۔ وہ بچی ہے۔

پینو۔ میں ماں سے کہوں گی شیدے نے میری باہنہ پکڑی تھی۔

جے نال۔ نہ ماں سے نہ کہنا۔

پینو۔ تو پھر یہ مجھے گھورے کیوں ہے۔

جے نال۔ یہ تو مجاک کرے ہے تجھ سے۔

پینو۔ ہونہہ مجاک کرے ہے اتنی اتنی آنکھیں نکالے ہے مجھ پر دیکھ لے جے نال۔ دیکھ لے۔

شیدا۔ جو تو نے ماں کو بتایا۔ تو۔

پینو۔ بتاؤں گی۔ بتاؤں گی۔ جرور بتاؤں گی۔ (منہ چڑاتی ہے)

شیدا۔ میں اسے ماروں گا بری طرح سے ماروں گا ہڈیاں توڑ دوں گا۔

(پینو کے پیچھے بھاگتا ہے پینو چیخیں مارتی ہے جے نال شیدے کو روکتی ہے۔ ماں اور جانن صحن کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں پینو ماں کی طرف بھاگتی ہے۔ شیدا رک جاتا ہے یوں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے جیسے پتھر کا بنا ہو۔)

پینو۔ مجھے مارے ہے ماں کہے ہے تری ہڈیاں توڑ دوں گا۔

برکتے۔ سرم نہیں آوے تجھے لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ لوک سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیا گھر کی بدنامی نہ ہوگی۔ کہیں گے برکتے کے پتر نے لڑکی پہ ہاتھ اٹھایا۔ منہ میں انگلیاں ڈال لیں گے۔ کہاں تو۔ اور کہاں یہ چھوٹی سی بچی۔ سرم نہ آئی تجھے۔ اس پہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے گھر کی عجت کا خیال نہ آیا اس سے تو اچھا تھا تجھے موت آجاتی۔

(پینو چلی جاتی ہے دروازہ سے)

جانن۔ سوچ سمجھ کر بات کر بھاگوان۔

برکتے۔ اور یہ بی بی وس کی طرہوں دیکھو یہ کھڑی تماسہ دیکھے ہے یہ تو اس گھر کو تماسہ سمجھے ہے چاہے گھر کی عجت خاک میں ملے اس کو کیا پڑی۔ گھر کا درد بھی ہو اپنا گھر سمجھتی بھی ہو۔ صرپھ خصم سے لگاؤ ہے باقی سب چاہے بھاڑ میں جائیں اسے کیا لینا دینا تماسہ دیکھے ہے یہ تو اس گھر کا۔ ہاں۔

جے نال۔ گھر کا نہیں تیرا تماسہ دیکھوں ہوں (اندر چلی جاتی ہے اپنے کمرے میں)

چانن ۔ سن لیا نا ۔ اور اکسا اُسے بار بار سمجھاؤں ہوں وسے نہ بولا وسے بولنے پہ مزبور نہ کر ورنہ ۔

برکتے ۔ ورنہ کیا ۔

چانن ۔ ورنہ بھسم ہو کر رہ جائے گی تو ـــ اور جس گھر کی عجت کی تو دِیوانی ہے وہ دھڑام سے آ رہے گا نیچے ۔

برکتے ۔ تو وس کی حمایت نہ کر ۔

چانن ۔ میں وس کی حمایت نہیں کر رہا تجھے عقل کی بات بتا رہا ہوں ۔ بہو کے منہ نہیں آتے ۔ سنا تو نے ۔ وہ تو بے جبان ہے ۔

برکتے ۔ بڑی بے جبان دیکھے لو ۔ اور تو بھی تو بے جبان ہے ۔ جبان تو صرپھ میرے منہ میں ہے اس گھر میں ۔

چانن ۔ جبان کہاں ۔ تیرے منہ میں تو قینچی ہے قینچی ۔

برکتے ۔ جو قینچی ہوتی تو کب سے گھر کے پُرجے اڑ گئے ہوتے ۔

چانن ۔ پُرجے تو کد سے اڑ گئے ۔ اب تو صرپھ ڈھانچہ رہ گیا ہے ۔ اور تجھے تو صرپھ دکھاوے کی پرواہ ہے نا ۔ تابوت پڑ رہے بس ۔

(شیدا انھیں مصروف دیکھ کر کھسکنا چاہتا ہے)

برکتے ۔ لے تو کہاں جا رہا ہے ۔ میری طرپھ دیکھ ۔ اب تو بے جبان بنا کھڑا ہے تو جیسے بکری ہو ۔ اور اُس وقت لڑکی پر پنجے جھاڑ رہا تھا تو بول کیا اس گھر میں رہنا ہے تو نے یا ـــ

شیدا ۔ میں اس گھر میں نہ رہوں گا ماں ۔

برکتے ۔ کیا کہا تے نے ۔

شیدا ۔ ماں نے کہہ دیا ۔ بس ۔

برکتے ۔ کیا کہہ دیا ۔ ماں بھی تو سنوں ۔

شیدا ۔ ماں یہاں نہیں رہوں گا ۔

برکتے ۔ آکھر کیوں (وقفہ) کوئی وزہ ۔

شیدا ۔ میں وہاں نہیں رہوں گا ۔ جہاں ـــ

برکتے ۔ جہاں کیا ـــ بول ۔

شیدا ۔ جہاں پر لڑکی رہے ہے ۔ (پینو کی طرف اشارہ)

برکتے ۔ کیوں اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے ۔

چانن ۔ بگاڑنے والی تو پتر تیرے سامنے کھڑی ہے ۔

برکتے ۔ تو نہ بول بیچ ماں ۔ پاگل ہو گیا ہے تو شیدے ۔

شیدا ۔ ہاں مجھے پاگل کھانے بھیج دو (پاگل کی طرح چلاتا ہے) میں پاگل ہوں میں پاگل ہوں (دونوں باہیں اوپر اٹھا کر چلاتا ہے) ۔

برکتے۔ ہے کیا ہو گیا ہے میرے پتر کو۔

(چانن کی طرف اشارہ)

برکتے تو کیا دیکھ رہا ہے جا کر تھام اسے۔

چانن۔ تیری کرتوت کا نتیجہ دیکھ رہا ہوں۔ یہ تیری لوک ریت کا پھل ہے۔ اب چکھ اس کا مجا۔

(شیدا نڈھال ہو کر چارپائی پر گر پڑتا ہے۔)

(ساجی بانو نوراں دیوار پہ سر نکالتی ہیں۔)

برکتے۔ ہے کرپڈ دکرپڈو۔ میرے پتر کو کیا ہو گیا (سب بھاگتے ہیں جے ناں دروازے میں آ کھڑی ہوتی ہے شیدے کو دیکھا کرتے ہیں) ہے کیا ہو گیا میرے پتر کو۔ اب میں کیا کروں (روتی ہے)۔

چانن۔ جنانی بھی کیا گورکھ دھندا ہوتی ہے پہلے آپ ہی آپ بگاڑتی ہے پھر روتی ہے۔ تجھے کئی بار کہا ہے جب اولاد جوان ہو جائے تو اس سے نہیں الجھا کرتے چھوٹے کو تو تو نے ٹھونگے مار مار کر گھر سے بھگا دیا اب اس کو گھر سے نکل جانے پہ اکساتی ہے تو۔

برکتے۔ تو دیکھ تو سہی۔ کیا ہوا ہے میرے لال کو۔

چانن۔ کچھ بھی نہیں، ہونا ہوانا کیا ہے۔

برکتے۔ بس تُو تو ہمیشہ یہ کہتا ہے کہ کچھ نہیں ہوتا۔

چانن۔ اور کیا کہوں یہ کہوں کہ شیدے کی حالت اچھی نہیں۔

برکتے۔ بس تیری حجت باجی نہ گئی۔ اسے کوئی حکیم کو بلاؤ۔ جے ناں تو کیا منہ دیکھ رہی ہے میرا جرا دولے کو آواج دے حکیم کو بلا لائے۔

چانن۔ کوئی جرورت نہیں دولے کو بلانے کی۔

برکتے۔ بس تجھے تو اپنی اولاد سے بیر ہے۔

چانن۔ محبت تو تُو ہی کرتی ہے ناں۔ (طعنہ) کیوں شیدے اب جی کیسا ہے۔

شیدا۔ مجھے کچھ نہیں چھوڑ دو۔ (اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے)

برکتے۔ دیکھو تو منہ جرد ہو رہا ہے۔ (ساجی۔ بانو۔ نوراں اتر جاتی ہیں۔)

شیدا۔ میں ٹھیک ہوں ماں۔

برکتے۔ گُسّہ نہ کر پتر۔ میں تو تیرے بھلے کی کہوں ہوں۔

چانن۔ یہ تو بے چاری جگت کے بھلے کی سوچے ہے اپنی بات تو کدی ——

برکتے۔ تو نہ بول کھواہ مکھواہ۔ تو گسے تو نہیں شیدے سے۔

شیدا۔ نہیں ماں مجھے کوئی گُسّہ وُسّہ نہیں۔

برکتے۔ اے تو کیا چمٹی ہوئی ہے مجھ سے (پینو سے) جا کر کھیل۔

(پینو جےناں کے پاس جاتی ہے)

برکتے۔ ٹھہر میں تجھے دودھ دوں۔ پی لے گا تو دل کو طاقت ملے گی (جاتی ہے باورچی خانے سے)

چانن۔ میں نے کہا جےناں۔ اکبر کہاں ہے۔

جےناں۔ کرخنے گیا ہے۔

چانن۔ آج تو کرخنے میں چھٹی تھی۔

جےناں۔ کام پہ تو نہیں گیا وہ۔

چانن۔ تو پھر۔

شیدا۔ آج بزٹ ہے نا بابا۔ بڑا صاحب آ رہا ہے۔

چانن۔ اوہ۔

جےناں۔ کہے تھا ابھی لوٹ آؤں گا بزٹ بھگتا کر۔ (برکتے دودھ کا پیالا لاتی ہے باورچی خانے سے)۔

برکتے۔ اے پی اے پی لے نا۔ میرا بڑا اچھا پتر ہے۔

دولہ۔ (داخل ہو کر) میں نے کہا کیا ہوا شیدے کو۔

چانن۔ آجا دولے۔ آجا۔

دولہ۔ یہ شیدا تو بیٹھا ہے سنا تھا بیہوش ہو گیا تھا۔

چانن۔ بیہوش تو نہیں ہوا پر جوش میں جرور آ گیا تھا۔

دولہ۔ جوش میں۔ یہ شیدا تو کدی نہیں آیا جوش میں۔

برکتے۔ نہ جانے کیا ہوا یوں دھڑام سے گرا جیسے گائے کا بھوس گرے ہے۔ (شیدے سے) لے پی لے دودھ۔

چانن۔ اوہ جس گائے نے گرایا۔ وہ رہی یہ تمہارے سامنے۔

دولہ۔ (ہنس کر) کیوں بہن یہ کیا کہے ہے چودھری۔

برکتے۔ اس کا کیا ہے یہ تو یوں ہی بولتا ہے۔ (شیدے سے) پی لے پتر پی لے ماں۔

چانن۔ بولتا ہوں تبھی۔ پر میرے بولنے سے کوئی بے ہوش ہو کر نہیں گرا آج توڑی۔ میری جبان ماں اتنا اثر کہاں۔ یہ کرامات تو تیری بہن، کو ہی حاصل ہے۔

دولہ۔ کیا ہوا ہے شیدے۔

شیدا۔ ویسے ہی چکر آ گیا تھا چاچا۔

چانن۔ وہ چکر دیا ہے اس بھاگوان نے کہ ——

برکتے۔ اَب یہ پھر جھگڑا کر رہا ہے۔

دولہ۔ نہ بھئی چودھری۔ تو برکتے سے نہ لڑا کر۔

جانن۔ نہ بھئی اپنی کیا مجال ہے البتہ جرا مسخری رہتی ہے تھوڑی تھوڑی۔ جرا دل بہلا لیتے ہیں۔ اتنا تو ہونا ہی چاہیئے یہی تو کمائی ہے جو ماں نے جندگی بھر کی ہے۔

دولہ۔ بڑی اچھی بات ہے بہن برکتے۔

جانن۔ ہاں کچھ جیادہ ہی اچھی ہے ساری دنیا کا پھکر لگا ہے اس اکیلی جان کو ہر کسی کی بھلائی سوجھتی ہے اپنا کھیال نہیں (طنز) برکتے دیکھ کتنے میٹھے میٹھے جخم لگا دے ہے۔

شیدا۔ اچھا تو بابا۔ جرا میں ہو آوں۔

برکتے۔ کہاں جانے گا تو۔

شیدا۔ جرا غلام محمد کے ہاں جاؤں گا۔

برکتے۔ اس وقت نہ جا بڑا اچھا پتر ہے میرا

شیدا۔ کیوں۔

برکتے۔ بس کہا جو ہے تجھے۔

دولہ۔ ہاں ہاں بھئی اس وقت نہ جا پھر چلا جائیو اچھا بھئی چودھری میں جرا گائے کے لیے دانہ لے آوں باجار سے۔

جانن۔ بیٹھ جرا دو لے تماخو پی۔ پھر لے آئیو دانہ۔

دولہ۔ نہ بھئی گھر والی چار روز سے کہہ رہی ہے دانہ لے آ پر نہیں لایا۔

جانن۔ تجھے بھی گھورے ہے گھر والی میں سمجھا اس معاملے میں تو بچا ہوا ہے۔

دولہ۔ (ہنستا ہے) یہ اتنے گھرو بیٹھے ہیں چودھری پوچھ لے ان سے کوئی بھی تو نہیں بچا ہوا گھر والی کی گھرکیوں سے۔ کیوں بھئی۔

جانن۔ تو ڈرتا کیوں ہے۔ پھر لے آئیو دانہ۔

برکتے۔ تو وس کی عقل پہ نہ جا یہ تو الٹی پٹی پڑھا دے ہے۔ (دور کارخانے میں سائرن بجتا ہے سب خاموش ہو کر سنتے ہیں۔)

(سجے نان باہر نکل آتی ہے پینو ساتھ ہے)

برکتے۔ اللہ خیر کرے۔

جانن۔ لیکن آج تو کارخانہ بند ہے شیدے۔

شیدا۔ ہاں باپو۔ آج تو بزٹ ہے۔

دولہ۔ یہ گھوگھو تو جب بجتا ہے جب کوئی ایکسی ڈنٹ ہو جائے۔

برکتے۔ اللہ اپنا فضل و کرم کرے۔

چانن: جب کارخانہ ہی چالو نہ ہو تو ایکسڈنٹ کیسا۔

دولہ: ہاں۔ یہی تو میں سوچوں ہوں۔

شیدا: شاید آگ لگ گئی ہو۔

برکتے۔ ہئے آگ۔ ہائے میرے اللہ (سائرن کی آواز بند ہو جاتی ہے)

چانن۔ جب بھی میں یہ گھوگھو سنتا ہوں تو جی چاہے ہے کہ سب کو لے کر گاؤں چلا جاؤں وہاں جا کر پھر سے اپنی جمین پر کام کروں وہاں گھوگھو تو نہیں بجتے وہاں ایکسڈنٹ تو نہیں ہوتے نہ کسی کا باجو ٹوٹتا ہے نہ ٹانگ۔

برکتے۔ پر جمین پر اپنا گجارہ کیسے ہوگا یہ بھی سوچا ہے تے نے کدی۔

چانن۔ سچ پوچھ دولے جمین پہ سوکھی کھا لینی اچھی یہاں شہر میں گوشت کھانے سے وہ روکھی اچھی۔

(جےناں اور پینو اندر جاتی ہیں)

دولہ۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

چانن۔ یہاں سہر میں تو رولا ہی رولا ہے دولے ہر کسی کو اپنی پڑی ہے ہر کوئی اپنے میں کھویا ہوا ہے۔ دوجے کی کھبر نہیں کسی کو گوانڈھی کو گوانڈھی کی کھبر نہیں۔ کوئی بھکیر کو روٹی دینے کا روادار نہیں۔ دوجے کا حال پوچھنے کی کسی کو پھرست نہیں۔ بھار چڑھا ہوا ہے بکھار۔ اپنے دوجخ کی بھٹی کو آپ گرم کرنے میں لگے ہائیں ہیں یہ سہر والے۔ یہ کیا چیج بنائی ہے انہوں نے جسے سہر کہیں ہیں۔

دولہ۔ بات تو تیری ٹھیک ہے چودھری۔

برکتے۔ تو پھر اس کی باتاں میں آ گیا دولے میں کہوں ہوں اس کی باتاں نہ سنا کر اس کی باتاں میں افیم ہے جہر ہے۔

چانن۔ جنانی اور سہر سمجھ کر لو ایک چیج ہے دولے سہر کو بھی پیسے کا بکھار چڑھا ہے جنانی کو بھی روپے کا بکھار چڑھا ہے پھر جنانی سہر کو چھوڑ کر کیسے جائے اونہہ یہ بھاگوان نہیں جانے گی۔ ویسے تو آرام سے بیر ہے یہ گاؤں میں کیسے رہ سکے ہے ویسے تو رولا چاہے۔ جنانیاں دولے میں کس رہیں ہیں۔ یہ تو کھد رولا ہوویں ہیں۔ ادھر یہ کارخانہ گھوگھو بجاتا رہے ہے اُدھر یہ میری بھاگوان گھوگھو بجاتی رہے ہے۔

برکتے۔ لو سن لو۔ کون سا گھوگھو بجاتی ہوں میں۔

دولہ۔ تو بھی عجیب باتیں کرتا ہے چودھری۔

چانن۔ آخر تو جو آیا ہے ہے یہاں ہمارے گھر۔ تو اسی بھاگوان کا گھوگھو سن کر آیا ہے نا۔ ابھی ابھی وس نے شیدے کا ایکسڈنٹ کیا ہے۔ نہیں کیا کیا۔

برکتے۔ ہے اللہ۔ اس کی جبان میں کیڑے پڑیں۔

دولہ۔ (ہنستا ہے) نہیں تو باتاں میں اس سے نہ نپٹ سکے گی بہنے۔

برکتے۔ بے مجھے تو بات نہیں کرنے دے ہے یہ۔

چانن۔ تو اپنا کام کئے جائے بھاگوان میں تو کھالی باتیں کررہوں ہوں۔ کئے جا اپنا کام تو۔

دولہ۔ اچھا بھئی میں تو چلتا ہوں اب۔ (چل دیتا ہے صحن کے دروازے سے ہنستا ہوا)

برکتے۔ کیوں لوگوں کو تماشہ دکھاتا ہے تو اس میں گھر کی ہیٹی ہووے ہے کب سمجھ آئے گی تجھے۔

چانن۔ ماری تو تو ہی ہے بھاگوان میں تو تیرا بچہ جمورا ہوں۔

برکتے۔ چل شیدے اندر چل۔ اس کے پاس نہ بیٹھا کر۔

شیدا۔ میں نہیں جاتا اندر۔

برکتے۔ چل بھی نا کیا ہوگیا ہے تجھے، جو میرا کہنا نہیں مانے ہے تو

چانن۔ مالم پڑتا ہے تیرا جادو اتر گیا۔ جو شیدا تیرے سامنے آج یوں بول رہا ہے آج گونگے کو جبان لگ گئی ہے۔

برکتے۔ تنے نے بھی بگاڑ رکھا ہے سارے گھر کو۔

چانن۔ تو سنوارنے والی جو ہے۔ کئے جا اپنا کام بھاگوان۔

دولہ۔ (باہر سے) چودھری۔ میں نے کہا چودھری۔

شیدا۔ یہ تو چاچا دولہ ہے۔

دولہ۔ بہن برکتے۔ بے بہن برکتے۔

برکتے۔ کیا کہے ہے یہ....؟

چانن۔ پتہ نہیں.... بلا رہا ہے تجھے۔

دولہ۔ میں نے کہا تیرے ناؤں کا کھرچہ آیا ہے۔

(جے ناں باہر نکلتی ہے پینو سنتی ہے)

چانن۔ کیا کہے ہے یہ۔ کھرچہ آیا ہے۔

برکتے۔ باہر جا کر دیکھ.... میرا منہ کیا دیکھے ہے۔

دولہ۔ قلم سیاہی لے آ... گوٹھا لگانا ہے۔

شیدا۔ گوٹھا لگانا ہے؟

برکتے۔ دونوں یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے ہیں۔ جرا باہر جا کر تو دیکھو۔

چانن۔ کیا بات ہے دولے (بلند)

برکتے۔ تو اندر کیوں نہیں آجاتا۔ دولے۔ (ساجو بانو سر نکالتی ہیں)

شیدا۔ چاچا۔ اندر آجا۔

دولہ۔ (دروازے میں) تمہارے ناؤں کا کھرچہ آیا ہے۔ ہاتھ میں منی آرڈر فارم ہے۔)

جانن۔ کھرچہ کیسا۔

دولہ۔ ملی آرڈر ہے۔ ڈاکیہ لایا ہے۔

شیدا۔ ڈاکیہ۔

جانن۔ ملی آرڈر کہاں سے آئے گا ہمیں (زور سے) ناؤں تو دیکھ کسی اور کا ہوگا بھئی۔

دولہ۔ مجھے نہیں مالم تو دیکھ شیدے۔

شیدا۔ یہ تو جےناں کا ناواں ہے۔

برکتے۔ جےناں کے ناؤں۔

جےناں۔ ہئے میرے ناؤں۔ کس کی جان ہے جو میرے ناؤں کھرچے بھیجے۔

شیدا۔ ہے تو جےناں کے ناؤں۔

جانن۔ کوئی اور جےناں ہوگی۔

دولہ۔ اور جےناں کون ہوگی یہاں بستی میں تو کوئی بھی نہیں۔

برکتے۔ دیکھ تو کتنے کا ہے۔

شیدا۔ پچاس روپلے کا ہے۔

دولہ۔ وہ کہے تھا آدھ سو ہیں۔

جانن۔ وہی آدھ سو ہوتے ناں۔

برکتے۔ آیا کہاں سے دیکھ تو۔

شیدا۔ (غور سے دیکھ کر) پتہ نہیں چلے کچھ۔

جانن۔ تو جرا بلا نا ڈاکیے کو۔ وسے پتہ ہوگا۔

دولہ۔ وہ کھت بانٹ رہا ہے آوے ہے ابھی۔

برکتے۔ پر ہمیں ناواں کس نے بھیجنا ہے اور پھر جےناں کے ناؤں۔

جےناں۔ میرا ناؤں نہ لے کوئی کھبردار جو کسی نے میرا ناؤں لیا تو۔

جانن۔ تو کیوں گرم ہوئے ہے کھوامکھواہ۔

شیدا۔ یہ تو کرانچی سے آیا ہے (جوش میں)

برکتے۔ اے کرانچی سے کون ناواں بھیجے گا۔

دولہ۔ دیکھ تو۔ بھیجنے والا کون ہے۔

برکتے ۔ ہاں ۔ یہ دیکھ بھیجنے والا کون اے ۔

شیدا ۔ ا ۔ آئی ۔ آئی ۔ آ ۔ آ ۔ پڑھا نہیں جاتا ۔

چٹھی رساں ۔ (صحن کے دروازے سے داخل ہو کر) اسلام علیکم ۔

جانن ۔ وعلیکم سلام ۔ کیوں بھئی یہ ناداں کراچی سے آیا ہے کیا ۔

چٹھی رساں ۔ کراچی سے علی احمد نے بھیجا ہے جنے ناں کے نام ۔

برکتے ۔ ہے کہیں میرا علیہ نہ ہو ۔

جانن ۔ بس تو پھر وہی ہے اپنا علیہ ۔

دولہ ۔ بہن برکتے تجھے مبارخ ہو چودھری تجھے مبارخ ہو ۔ (بے حد خوش)

جنے ناں ۔ علیہ (بے حد خوش) نے بھیجا ہے ۔

جانن ۔ میں کہوں تھا نا بھاگ گیا ہے علیہ اور یہ مانتے نہیں تھی اب بول ۔

برکتے ۔ سکر ہے میرا علیہ کھیر سے ہے ۔

چٹھی رساں ۔ سیاہی تو لے آونا ۔ انگوٹھا لگوانا ہے ۔

جانن ۔ دیکھ لے بھیجا وس نے جے ناں کے ناؤں ہی ہے حد کا بڑا پکا ہے ۔

برکتے ۔ پر یہ کراچی کیسے پہنچ گیا پڑھ تو کچھ لکھا ہے رسید پر ۔

چٹھی رساں ۔ سیاہی لانا جی ۔

برکتے ۔ اے مینو ۔ اندر سے سیاہی تو لے آ منہ کیا دیکھ رہی ہے میرا

چٹھی رساں ۔ لکھا ہے میں کھیریت سے ہوں یہاں نوکری پر ہوں اگلے مہینے آؤں گا سب کو سلام درجہ بدرجہ ۔ علی احمد ۔

برکتے ۔ ہے تو وہ کھیر سے ہے اللہ جندگی دراج کرے میں تو درگاہ پہ گھی کا دیا جلاؤں گی ۔

دولہ ۔ اور ہمارا منہ میٹھا کب کرائے گی بہن ۔

برکتے ۔ ہے میرا پتر مل گیا جندگی پھر سے روسن ہو گئی نصیبا پھر سے جاگ اُٹھا ۔ میں سارے محلے میں پتاسے باٹوں گی ۔

دولہ ۔ میں تو لڈو کھاؤں گا بہن ۔

بالو ، ساجی ۔ ماسی ماں کہے ہے پڑوسیوں کو نہ بھولنا ۔

برکتے ۔ جو جی چاہے کھانا ۔ سب کو بانٹوں گی ۔

جانن ۔ دیکھ تو پہلے خود ہی بھگایا وسے گھر سے اب وس کے گھر آنے پر پتاسے بانٹے گی ۔

چٹھی رساں ۔ میں نے کہا بہن اب انگوٹھا بھی لگا دونا ۔

برکتے ۔ میں لگا دوں ۔

چٹھی رساں ۔ اس پر جے ناں کا انگوٹھا لگے گا ۔

جے ناں ۔ میں لگاؤں گی انگوٹھا ۔ میں لگاؤں گی ۔

چانن ۔ دیکھ لے جے ناں روپے اس نے تجھے ہی بھیجے ہیں (ہنستا ہے) رانجھا جو تھا تیرا وہ ۔

ساجن ۔ اے ماسی ماں پوچھے ہے کیا علیے کا کھت بھی آیا ہے ۔

بانو ۔ تجھے مبارخ ہو بہن ۔

برکتے ۔ کھیر مبارک ہو بہن اللہ کا ہجار ہجار شکر ہے اتنی دیر کے بعد لڑکے کی کھبر ملی ۔

نوراں ۔ مبارخ ہو بہن برکتے (دیوار پر چڑھ کر)

ساجی ۔ کب آ رہا ہے علیہ ۔

بہکتے ۔ اگلے مہینے کی دس کو آ رہا ہے ۔ یہی لکھا ہے خط میں ۔

ساجی ۔ تجھے مبارخ ہو ماسی ۔

چٹھی رساں ۔ یہاں لگا دے اور یہاں ۔ بس یوں ٹھیک ہے ۔

جے ناں ۔ میرے ناؤں بھی کچھ لکھا ہے علیے نے ۔

چانن ۔ میں نے کہا اسے دے دے اٹھنی جے ناں سنے ہے تو اٹھنی دے دے اسے ۔

وقفہ (اٹھنی دیتی ہے)

میں نے کہا دودھ کا گلاس پیتا جا بھائی ۔

چٹھی رساں ۔ نہیں نہیں مہربانی ہے تیری اسلام علیکم (صحن کے دروازے سے جاتا ہے ۔)

جے ناں ۔ میں آج ڈھولک رکھوں گی ڈھولک ۔

برکتے ۔ آج بھی نہیں رکھے گی تو تو کب رکھے گی پھر ۔

دولہ ۔ میں نے کہا ساجی پکڑا دے اسے ڈھولک ۔

ساجی ۔ ابھی لاؤں ہوں ماں ۔ (دیوار سے اتر جاتی ہے)

جے ناں ۔ اے جلدی سے لا میرا تو جی چاہے ہے کہ ناچوں ۔

چانن ۔ لو بھئی یہ تو ڈھولک رکھیں گی تو اپنے کو حبا تماخو بھی رکھ دے ۔

برکتے ۔ بس تو تو سارا دن گڑ گڑ کرتا رہے گا ۔

چانن ۔ دیکھ لے دولے محلے والوں کو پتاسے دینے کو تیار رہے یہ چٹھی رساں کو اٹھنی دے ہے درگاہ پر گھیو کا دیا جلائے گی میں تماخو مانگوں تو کیا کورا جواب دے ہے ۔

برکتے ۔ بس تو اپنی شکیت نہ چھوڑیو ۔

(ساجی اور بانو ڈھولک اٹھائے داخل ہوتی ہیں۔ جے ناں جاگ کر ڈھولک پکڑ لیتی ہے بیٹھ جاتی ہے۔ برکتے
ان کے قریب چوکی پہ بیٹھ جاتی ہے)

برکتے۔ لڑکیو۔ وہ گیت گاؤ۔

ساجی۔ کونسا۔ ماسی۔

برکتے۔ وہ۔ اے جبان سے ہی اتر گیا ہے ہاں۔ وہ۔ (گیت کے بول) لڑکیاں گانے لگتی ہیں مرد ایک طرف بیٹھے ہیں شیدا چوری
چوری ساجی کی طرف دیکھتا ہے جے ناں جی لگا کر گاتی ہے ٹرک کی آواز۔ ہارن بجتا ہے۔ عورتیں گانا ختم کر دیتی ہیں)

چانن۔ یہ کیسی آواج ہے۔

دولہ۔ ٹرخ کی آواج مالم پڑے ہے۔

چانن۔ یہ ٹرخ یہاں کیسے آ گیا۔

شیدا۔ میں جا کر دیکھوں۔

چانن۔ تو جا دولے۔ دیکھ تو۔ (جاتا ہے دروازے میں کھڑا ہو جاتا ہے شیدا ساتھ جاتا ہے باہر چلا جاتا ہے۔)

دولہ۔ یہ تو کرخنے کا ٹرک مالم پڑے ہے۔

چانن۔ کرخنے کا ٹرخ۔ وہ گھوگھو۔ اللہ کھیر کرے۔

دولہ۔ (چلا کر)۔ چودھری۔

چانن۔ ہاں۔ کیا ہے۔

دولہ۔ یہ تو۔ یہ تو۔

چانن۔ کیا ہے دولے۔ کیا ہے۔

دولہ۔ یہ تو ایکسی ڈنٹ مالوم پڑے ہے بہن برکتے بہن برکتے کسی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا بہن۔

برکتے۔ کس کا (چل کر آتی ہے)

چانن۔ وہی گھوگھو۔ ضرور کسی کا ایسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔

برکتے۔ ہے اللہ نہ جانے کس کے سر پہ مصیبت ٹوٹی ہے۔ اللہ کھیر کرے۔

دولہ۔ وے ٹرک سے باہر نکال رہے ہیں۔

چانن پوچھ تو کس کا اکسیڈنٹ ہوا ہے۔

دولہ۔ مالوم نہیں پڑتا۔

برکتے۔ ہے اللہ کھیر کرے۔

دولہ۔ لا رہے ہیں۔ اوپر کمبل پڑا ہے۔

چانن - کمبل پڑا ہے تو سمجھ لو ختم ہو گیا -

نوراں - اسے کون ختم ہو گیا ماسی ماسی بتا نا - چاچا - اے چاچا -

برکتے - میں کہوں ہوں - باہر جا کر دیکھو تو -

پینو - کیا ہوا - ماں ؟ - کیا ہوا -

ساجی - کہتے ہیں کرنخنے کا ٹرک ہے اکسی ڈنٹ ہو گیا -

شیدا - (چیخ کر) ماں (اندر داخل ہوتا ہے -)

جے نال - یا اللہ -

برکتے - کیا ہے شیدے ؟

شیدا - ماں - (چیخ کر) ماں اکبر -

جے نال - ہے میرے اللہ -

برکتے - کیا ہوا میرے اکبر کو - بولو - بتاؤ -

دولہ - اکبر کا ایکسی ڈنٹ بہن (چیخ کر)

شیدا - (روتے ہوئے) مشین میں کچلا گیا ہے ماں (روتا ہے)

جے نال - (لمبی چیخ مارتی ہے) کیا کہا -

برکتے - (چیخ کر) میرا اکبر - کیا ہوا میرے اکبر کو -

برکتے - اسے بولو بھی کیا ہوا میرے اکبر کو -

شیدا - اکبر ہمیں چھوڑ کر چلا گیا - ماں -

(دو آدمی سٹریچر پر لاش اندر لاتے ہیں - دو آدمی ان کے ساتھ ہیں - سب چیختے ہیں جے نال اکبر کہہ کر چیخ مار کر بیہوش ہو جاتی ہے -)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

(وہی سین - چار ماہ بعد - وقت دن - صحن میں معمولی تبدیلیاں - باورچی خانے کے پاس دیگ پڑی ہے نیچے بجھے بجھے سے کوئلے - دیگ کو دم دیا ہوا ہے - میرا حجام دیگ کے پاس کھڑا ہے - قریب ہی برکتے شوربے کا بڑا دگچہ پکا رہی ہے - دروازہ کے قریب چارپائی پر بیٹھے دولہ اور چانن حقہ پی رہے ہیں -)

دولہ - بات سمجھ میں نہیں آتی ہے چودھری -

چانن ۔ کیا ۔

دولہ ۔ اکبر کو فوت ہوئے کتنے روز ہوئے ہیں ۔

چانن ۔ (حساب لگا کر) کوئی چار مہینے ہوگئے ۔

دولہ ۔ دیکھ نا یا تو چالیسویں روج کھتم دیتے ہیں اور یا سال کے بعد یہ چوتھے مہینے تم کیسا کھتم دے رہے ہو ۔

چانن ۔ مجھے کیا پتہ دولے پوچھ وس (برکتے) سے وس گھر میں تو وسی کی مرجی چلے ہے میں تو بہ والا ہوں جو کام اس نے کہا کر دیا ۔

دولہ ۔ (آواز دیتا ہے) بہن برکتے ۔

(برکتے بالکل نہیں سنتی ویسے ہی بیٹھی رہتی ہے)

دولہ ۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اسے اکبر کے مرنے کے بعد گم کھا گیا اسے کیوں چانن ۔

چانن ۔ اونہوں اسے کوئی نہیں کھا سکے ہے ۔

دولہ ۔ (ہنس کر) دیکھ تو اسے تو اپنی سدھ بدھ نہیں ہے ۔

چانن ۔ پتہ نہیں کس کی تاک لگائے بیٹھی ہے جب یہ سوچ میں ڈوب جاتے تو کچھ رجھکڑ چلے گا ہاں (ہنستا ہے)

دولہ ۔ (ہنستا ہے) (دونوں زور سے ہنستے ہیں)

(برکتے چونکتی ہے ان کے قریب آتی ہے)

برکتے ۔ (چانن سے) میں پوچھوں ہوں یہ کیا کھی کھی کرنے کا موقع ہے آج کے روج تو ٹھٹھے نہ کر ۔ آج میرے اکبر کا کھتم ہے (آنسو پونچھتی ہے)

دولہ ۔ کھتم دینے میں کیا دیر ہے جیرے ۔

جیرا ۔ بس چاول تیار ہیں میں کریم کو لے آؤں تو چلیں (باہر چلا جاتا ہے)

دولہ ۔ یہاں نہیں ہوگا کھتم کیا ۔

چانن ۔ اکبر کی قبر پہ کھتم کرائے گی چاول وہیں بانٹے گی ۔

دولہ ۔ اچھا چودھری مال وجو کر آؤں (باہر جاتا ہے)

برکتے ۔ علیہ کہاں ہے پینو ۔

پینو ۔ اندر جے ناں کے پاس بیٹھا ہے ۔

برکتے ۔ ایک مہینہ ہوگیا اسے کراچی سے آئے ہوئے ہر بخت جے ناں سے چمٹا رہتا ہے ہر بخت ۔

چانن ۔ بھاگوان اسے جے ناں سے پیار ہے ۔

برکتے ۔ پیار کی بھی حد ہووے ہے لوک کیا کہیں گے ۔

چانن ۔ ہر بخت وہی لوک ۔ رسی جل گئی ہو بل نہیں گیا ۔

برکتے ۔ اے ہے آخر وہی کرنا چاہئے جو بڑے کرتے آئے ہیں ۔

چانن۔ اب تو میں سے نہ کہیو یہ بات ورنہ پھر بھاگ جائے گا وہ بھی جدی ہے تری طریوں۔

برکتے۔ بالکل سر پھرا ہے دوسے۔ اِس پر گیا ہے نا اس لئے۔

چانن۔ روتی کیوں ہے دوسے نے اپنے آپ پہ بنتے تو ایک مجھ پہ ہی سہی۔ اور دیکھ اب بچے ناں کو علیے کا طعنہ نہ دیجو وہ پہلے ہی بھری بیٹھی ہے جو تے نے ٹھونکا دیا تو پھوٹ پڑے گی۔

برکتے۔ اُسی کا غم تو کھائے جا رہا ہے میں ہر وخت اسی سوچ میں پڑی ہوں۔

چانن۔ دیکھ ایک بات کہوں۔

برکتے۔ کیا ہے۔

چانن۔ ٹھنڈے دل سے سنیو۔ ابال میں نہ آیو۔

برکتے۔ تو بات تو کر۔

چانن۔ جو تو نے شیدے کا نکاح بینو سے کیا ہے اچھا نہیں کیا تے نے۔

برکتے۔ اور کس سے کرتی۔

چانن۔ اس کا جوڑ تو علیہ سے ٹھیک رہتا۔

برکتے۔ علیہ اس وقت ہوتا تو تھا اس وقت تو یہ بھی مالم نہ تھا کہ وہ جندا بھی ہے کہ نہیں۔

چانن۔ تو انتجار کر لیتی۔

برکتے۔ اور بہن پڑی تڑپتی رہتی بچاری ماں اسے موت نصیب نہ ہوتی۔

چانن۔ چلو مان لیا اس وقت مجبوری تی پر اب تو نہیں۔

برکتے۔ اب کیا ہو سکے ہے۔

چانن۔ شیدے سے تلاخ لے کر علیہ سے کر دے۔

برکتے۔ سرم نہیں آتی تجھے۔

چانن۔ کیوں۔

برکتے۔ اب لڑکی کو تلاخ دلائے گا تو۔ بھی واہ۔ لوگ کہیں گے برکتے کے گھر میں بھی تلاخ ہوگئی کچھ اپنی عجت کا بھی خیال ہے تجھے۔

چانن۔ پر بھاگوان ——

برکتے۔ نہ نہ اس گھر میں چاہے کچھ ہو پر تلاخ نہ ہوگی کبھی ہاں۔ یاد رکھ دہائی کھدا کی بڑا بھائی تلاخ دے اور چھوٹا کرے کبھی سنی ہے ایسی بات۔ تیرے منہ میں جانے کیا بھرا ہوا ہے جو ایسی الٹی الٹی باتیں سوجھتی ہیں تجھے۔

چانن۔ تو ابال کیوں کھاتی ہے۔

برکتے۔ تو بات ہی ایسی کرتا ہے بے سرمی کی منہ اُلٹا ہے تیرا۔

چانن ۔ تو بات کو سوچا بھی کر بھاگوان ۔

برکتے ۔ نہ نہ میں نہیں سوچتی اللہ بچائے ایسی سوچ سے تُو تو کافروں سی باتیں کرتا ہے سوچ نے تجھے فرنگی بنا دیا ہے بے شرم ہوگیا ہے ۔ اللہ کے حکم سے بھی منکر ہو گیا تو ۔ نہ سنت نہ شریعت ۔

چانن ۔ تو بات کو سوچا بھی کر بھاگوان ۔ بھڑ کی طرحیوں چمڑ گئی ۔

برکتے ۔ تو بچھو کی طرحیوں ڈنک مارنے سے باج نہ آئیو ۔

(سائیں دروازے میں رک جاتا ہے ۔) مولا ای مولا ۔ (پینو گھر سے باہر نکل آتی ہے ۔)

سائیں ۔ شاباشے برکتے شاباشے جنانی ہے تو تو ہے ایک بار جو منہ سے کہہ دیا کرکے دکھایا ۔ مولا علی مولا علی (نعرہ) (دولہ اور جیرہ داخل ہوتے ہیں ساتھ دو آدمی)

دولہ ۔ آہا سائیں جی بھی آ گئے ۔ (پڑوس کی دیوار سے دو سر ابھرتے ہیں ۔ بانو ساجی)

دولہ ۔ (دیگ کا دم توڑتے ہوئے) لے بھائی چاول تو ٹھیک ہو گئے ۔

برکتے ۔ پر تو نے وجو بھی کیا ہے کہ ویسے ہی مارے ہے دیگ میں ہاتھ ۔

جیرا ۔ وجو کرکے ہی آیا تھا ختم کے چاول ویسے تو نہیں پکاتا بہن ۔ تو بھئی لے چلو دیگ ۔

سائیں ۔ (ہنس کر) کتنا کھیال ہے اسے پاک بندے کی پاک باتیں ۔ مولا علی (دونوں آدمی دیگ کو اٹھاتے ہیں باہر نکل جاتے ہیں ۔)

(دولہ بڑا دیگچہ اٹھاتا ہے برکتے چنگیر اٹھاتی ہے اور چانن چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے)

چانن ۔ دولے یہ حقہ لے چلوں اور تمباکو کی تھیلی بھی ۔

دولہ ۔ ہاں جرور ۔

سائیں ۔ (اٹھ کر نعرہ مارتا ہے) یا پنج تن پاک ۔ مولا ای مولا ۔ (باہر چلا جاتا ہے)

برکتے ۔ کسی وخت تو ساتھ دیا کر تو ۔ (جاتے ہوئے)

چانن ۔ نیک بخت ۔ میں تو تیار ہوں ۔

برکتے ۔ شیدے اور علیے کو آواج دے ناں ۔

چانن ۔ وہ دونوں چلے بھی گئے قبرستان کو ۔

برکتے ۔ سچ ۔

چانن ۔ اور کیا ۔

پینو ۔ (دروازے سے نکل کر) نہیں ماں علیہ تو اندر ہے ۔

برکتے ۔ دیکھا نا لڑکے پہ جادو کر رکھا ہے ڈائن نے ۔

چانن ۔ اوہو ۔ تو اب چل علیے کو کچھ نہ کہہ ۔ رہنے دے اسے یہیں ۔

برکتے ۔ علیا اے علیہ ۔

چانن ۔ ماں کہوں ہوں جھگڑا نہ کر تو اس بخت ۔

برکتے ۔ علیے ۔

علیہ ۔ (باہر نکلتا ہے) کیا ہے ماں ۔

برکتے ۔ ہمارے ساتھ کھتم پہ چل ناں ۔

علیہ ۔ نہ ماں نہیں جاتا ۔

چانن ۔ اچھا تو باہر بیٹھو آ کر گھر اکیلا ہے ۔

علیہ ۔ اچھا ۔

برکتے ۔ تو آ لڑکی (پینو سے)

پینو ۔ آ رہی ہوں ماں ۔ (سب باہر جاتے ہیں چانن پینو برکتے)

(علیہ اندر جاتا ہے ——— سامان لے کر واپس آتا ہے ساتھ جے ناں ہے)

(علیہ صحن میں سامان وغیرہ رکھتا ہے جے ناں اداس بیٹھ جاتی ہے ۔)

علیہ ۔ بھابھی ۔ میں نے تیرے چرخے کو تیل دیا تھا آج ۔

جے ناں ۔ اچھا ۔ (بے رخی سے چارپائی پہ بیٹھی رہتی ہے)

(وقفہ)

علیہ ۔ اور میں نے تیری ساری پونیاں بنا دیں اندر پڑی ہیں دکھاؤں ۔

جے ناں ۔ اونہوں ۔ (وقفہ)

علیہ ۔ یہ پونیاں اچھی نہیں تو دوسری بنا دوں ۔

جے ناں ۔ نہیں علیے نہیں (اکتا کر)

علیہ ۔ تو پھر تو بیٹھ کیوں نہیں جاتی چرکھے پہ ۔

جے ناں ۔ اچھا ۔

علیہ ۔ نہیں جی کرتا تو نہ سہی کیوں بھابھی ۔

جے ناں ۔ (خاموش کھوئی ہوئی)

علیہ ۔ تو بولتی نہیں بھابی ۔

علیہ ۔ تو تو مجھ سے باتیں کیا کرے تھی جب ———

جے ناں جب کی بات جب کے ساتھ گئی ۔

علیہ ۔ اب کیا ہے ۔

جے نان ۔ (آہ بھر کر) ہاں ۔ اب کیا ہے ۔

علیہ ۔ تو دکھ کیوں لگا بیٹھی ہے بھابھی ۔

جے نان ۔ اور کیا کروں علیے اب تو کچھ بھی نہیں ۔

علیہ ۔ میں جو ہوں بھابھی ۔

جے ناں ۔ ہاں ۔

علیہ ۔ میں جتنا کماؤں گا سب تجھے دوں گا ۔ سب ۔

جے ناں ۔ اچھا !

علیہ ۔ ماں کو نہیں دوں گا ۔

جے ناں ۔ نہ ایسی بات نہ کر ۔

علیہ ۔ کیوں نہ کروں ۔

جے ناں ۔ اچھی نہیں لگتی ۔

علیہ ۔ پر سچی تو ہے میرے لئے تو یہ گھر تیری وزہ سے ہے تو نہ ہو تو میں بھاگ جاؤں پھر سے ۔

جے ناں ۔ نہ یوں نہ کہا کر ۔ تیری ماں ہے ۔ باپو ہے بھائی ہیں ۔

علیہ ۔ نہ بھابھی بس تو ہی ہے صرپھ تو

جے ناں ۔ نہ علیے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے میرے لال ۔

علیہ ۔ کیوں ۔

جے ناں ۔ ماں سنے گی تو کیا کہے گی ۔

علیہ ۔ کیا کہے گی ۔

جے ناں ۔ بُرا مانے گی ۔

علیہ ۔ پڑی مانے ۔

جے ناں ۔ نہ علیہ (منت سے) میری بات نہیں مانتا تو ۔

علیہ ۔ مانتا ہوں ۔

جے ناں ۔ تو ماں کو بُرا نہ کہا کر ۔

علیہ ۔ مجھے نہیں اچھی لگتی ۔ جرا بھی نہیں لگتی ۔

جے ناں ۔ کتنا پیار کرتی ہے وہ تجھے ۔

علیہ۔ تیرے پاس کیوں نہیں بیٹھتی وہ۔

جے ناں۔ (خاموشی سے اس کا منہ دیکھتی ہے۔)

علیہ۔ تجھ سے بات بھی نہیں کرتی وہ۔

جے ناں۔ کھواہ مکھواہ تو ایسی باتیں منہ سے نکالے ہے جو ——

علیہ۔ جو کیا؟

جے ناں۔ (غصے میں) بس کچھ نہیں۔

علیہ۔ تو بات کیوں نہیں کرتی بھابھی۔

جے ناں۔ (آب دیدہ ہوکر) علیہ تو ہر وقت میرے پاس نہ بیٹھا کر۔

علیہ۔ کیوں۔ تو تنگ ہوتی ہے؟

جے ناں۔ نہیں۔ نہیں۔ علیہ!

علیہ۔ تو پھر۔

جے ناں۔ بس تجھ سے کہا جو ہے نہ بیٹھا کر۔

علیہ۔ بُرا لگتا ہوں تجھے۔

جے ناں۔ نہ علیے ایسی بات نہ کر تو تو بہت ہی اچھا ہے۔

علیہ۔ سچ؟

جے ناں۔ سچ۔

علیہ۔ تو کھول کرتی ہے بھابھی میں تو کچھ بھی نہیں اور تو اتنی اچھی ہے۔ تو تو بڑی اچھی ہے بھابھی۔ بھابھی میں جندگی بھر تیرے ساتھ رہونگا۔

جے ناں۔ ہے علیے تجھے کیا کہوں (ایک طرح اپنے آپ سے)

علیہ۔ کیا کہے ہے تو بھابھی۔

جے ناں۔ کچھ نہیں (آبدیدہ)

علیہ۔ کچھ تو کہتی ہے تو۔

جے ناں۔ اونہوں۔

علیہ۔ مجھے پتہ ہے۔

جے ناں۔ کیا؟

علیہ۔ تو اس گھر میں دکھی ہے۔ ہے نا؟

جے ناں۔ نہیں علیہ میرا دانہ پانی اُٹھ گیا یہاں سے۔

علیہ ۔ چل بھابی دونوں اکٹھے چلے جائیں ۔

جے ناں ۔ ہئے میرے اللہ (گھبرا کر)

علیہ ۔ ہاں نوکری کروں گا ۔

جے ناں ۔ پر علیہ تیری ماں کیا کہے گی ۔

علیہ ۔ مجھے نہیں اس کی پرواہ ۔

جے ناں ۔ تو ماں کی بات کیوں نہیں مانتا ۔

علیہ ۔ اگر جو تو میری ماں ہوتی تو میں تیری ہر بات مانتا گھر سے کبھی نہ بھاگتا ۔

جے ناں ۔ بھابھی بھی تو ماں سماں ہوتی ہے علیے ۔

علیہ ۔ سچ تو پھر تو مجھے کیوں اپنے پاس سے اٹھاتی ہے تبا ؟

جے ناں ۔ تیری ماں برا مانتی ہے اس لیے ۔

علیہ ۔ وہ تو جب بھی یہی کہتی تھی ۔

جے ناں ۔ کب ۔

علیہ ۔ تو چھوڑ اس کی بات کو بھابھی ۔

جے ناں ۔ ایک بات پوچھوں ۔ علیہ بتائے گا ؟

علیہ ۔ پوچھ ۔

جے ناں ۔ تو گھر سے بھاگا کیوں تھا ؟

علیہ ۔ یہ نہ پوچھ بھابھی ۔

جے ناں ۔ کیوں ؟

علیہ ۔ جو بتا دوں تو تُو بُرا مانے گی ۔

جے ناں ۔ نہ میں نہیں بُرا مانتی تبا ۔

علیہ ۔ تجھے دکھ ہو گا بھابھی ۔

جے ناں ۔ (جھوٹی ہنسی) دکھ کھواہ مکھواہ کا ۔ بتا بھی نا ۔

علیہ ۔ ماں نے کہا تھا تو جے ناں کے پاس نہ بیٹھا کر ۔

جے ناں ۔ میرے پاس ؟

علیہ ۔ ہاں ۔

جے ناں ۔ کیوں ۔

علیہ ۔ کمتی تھی ۔ اب تو جوان ہو گیا ہے ۔

جے ناں ۔ ہنستی ہے اور تو نے کیا کہا ۔

علیہ ۔ میں نے کہا بیٹھوں گا ۔ کرے جو میرا کرنا ہے مجھے پھر گسہ آگیا اور میں بھاگ گیا ۔

(دور سے سائیں کا نعرہ)

سائیں ۔ مولا ای مولا ۔ اور سب رولا ای رولا (دور سے)

جے ناں ۔ لے وہ آبھی گئے ۔ (اٹھ بیٹھتی ہے) تو میرا چرخہ اندر لے آ ۔

علیہ ۔ تو یہاں کیوں نہیں بیٹھتی ۔

جے ناں ۔ میں نہیں بیٹھتی یہاں ۔

(علیہ چرخہ اٹھاتا ہے سب لوگ داخل ہوتے ہیں پہلے برکتے اور پھر دیگ اٹھانے والے پھر سائیں اور آخر
میں دولہ ۔ چانن اور شیدا ۔)

دولہ ۔ یہاں رکھ دو بھئی دیگ (خود دیگچہ بھی رکھتا ہے)

برکتے ۔ بیٹھ جاؤ سائیں جی ۔

چانن ۔ تماخو تو رکھوا دے چلم میں دولے ۔

سائیں ۔ نہ بی بی ۔ اب ہم جاتے ہیں میری کھوشی پوری کر دی ۔ مولا علی (نعرہ)

سائیں ۔ مولا علی سب رولا ای رولا (باہر نکل جاتا ہے دیگ رکھ کر دونوں آدمی چلے جاتے ہیں ۔ دولہ چلم بھر کر لاتا ہے ۔)

دولہ ۔ اچھا بہن تو میں چلتا ہوں چاول تو شام کو ہی بانٹنے ہیں ۔

(علیہ چرخہ چھوڑ کر باقی چیزیں اٹھانے آتا ہے)

برکتے ۔ ہاں وہ تو شام کو ہی ہو گا ۔

دولہ ۔ میں پھر آجاؤں گا ۔ (چل پڑتا ہے)

برکتے ۔ جرا ٹھہر تو سہی دولے ۔

دولہ ۔ (رک کر) کوئی کام ہے کیا ؟

برکتے ۔ ہاں ۔ بیٹھ جا ۔

چانن ۔ واری سے ۔ ۔ (دولہ بیٹھ جاتا ہے)

برکتے ۔ شیدے تو بھی چوکی لے لے اور بیٹھ جا ۔

شیدا ۔ کیوں ؟

برکتے ۔ (سختی سے) کیا جو ہے تجھ سے بیٹھ جا یہاں ۔

جانن۔ اللہ کھیر کرے (اپنے آپ سے)

برکتے۔ علیہ او علیہ۔ (علیہ باہر آتی ہے) جرا ادھر آ۔

(علیہ قریب آتی ہے بازو پکڑ کر بٹھا لیتی ہے)

بیٹھ جا یہاں دو گھڑی کے لئے بینو تو جا اندر جا کر جے ناں کے پاس بیٹھ

(بینو برے دل کے ساتھ چلی جاتی ہے)

دولہ۔ چودھری بات کیا ہے!

جانن۔ مجھے کیا پتہ۔ پوچھ اس مداری سے پنڈاں لگا لیا ہے اب تماشا دکھائے گی۔

برکتے۔ دیکھ ہر وخت ٹھٹھا نہیں کرتے۔ یہ مجاک کا وقت نہیں دیکھ دولے میں کہوں کوئی ایسا وخت بھی ہوتے ہے جب گھر میں بیٹھ کر انسان کچھ سوچے ہے مسورہ کرے ہے۔

(خاموشی طاری ہو جاتی ہے) (وقفہ)

دیکھ رے دولے تو سیانا ہے تو سمجھتا ہے کہ گھر کی محبت کیا چیج ہوتی ہے تجھے بڑوں کی ریت کا پتہ ہے یہ شیدا اور علیہ تو دونوں بچے ہیں انھیں ابھی ان باتوں کا کیا پتہ رہا ان کا باپ تو وہ سدا الٹے دھارے بہے ہے۔

جانن۔ تو اپنی بات کر بھاگوان۔ میرا جگر چھوڑ۔

دولہ۔ اب تو نہ بول چودھری جھگڑا نہ ہو جائے۔

جانن۔ میری تو بولتی بند کر دی ہے پہلے سے ہی اس نے۔

دولہ۔ ہاں بہن تو اس کی بات کا دھیان نہ کر۔

جانن۔ پہلے تو بہت کرتی ہے میرا دھیان جواب نہ کرے گی۔

شیدا۔ کوئی کھاس بات ہے بابا۔

جانن۔ مجھے کیا پتہ تو دیکھتا جا اس مدارن کو۔ (ہنس کر)

برکتے۔ دیکھ رے دولے ہر بات میں میری ہیٹی کرتا ہے اور پھر میرے پیٹ جائیوں کے سامنے۔

شیدا۔ ماں تو تو بات کرے گی ان سے (اٹھ بیٹھتا ہے) ہم نے کیا کرنا ہے یہاں۔

برکتے۔ (رعب سے) بیٹھ جا بیٹھ جا تو۔

جانن۔ بھاگوان۔ کہتا تو یہ ٹھیک ہی ہے۔ بات تو تو نے ہم سے کرنی ہے نا۔ ان کو کیوں بٹھا لیا تو نے۔

برکتے۔ نہیں۔ ان کا ہونا جروری ہے۔

جانن۔ آکھر کیوں۔

برکتے۔ بس کہہ جو دیا (رعب سے) بیٹھ جا شیدے۔

دولہ ۔ ہاں بھئی بیٹھ جا وہ جو کہتی ہے ۔ ہاں تو اپنی بات کر بہن ۔

برکتے ۔ یہ کرنے بھی دے بات ۔

دولہ ۔ پھر وہی بات تو چھوڑ اس کو ۔ بات کر ۔

برکتے ۔ بات تو تیرے سامنے ہے دولے کوئی ڈھکی چھپی نہیں ساری دنیا کی نجریں لگی ہوئی ہیں ہمارے گھر پہ جب سے میرا اکبر اللہ کو پیارا ہو گیا ہے (آنسو پونچھتی ہے)

دولہ ۔ تو جے ناں کی بات کر رہی ہے نا ۔ بہنے ۔

برکتے ۔ ہاں وہ اس گھر کی بہو ہے عجت ہے اس گھر کی ۔

دولہ ۔ بے سک بے سک ۔

برکتے ۔ اللہ رکھے جوان ہے وہ اس گھر میں رانڈ بن کر نہیں رہ سکتی ہے گھر میں جوان لڑکے ہیں لوگوں کی جبان کون بند کر سکے ہے تو تو آپ سیانا ہے دولے ۔

دولہ ۔ بے سک بے سک ۔

برکتے ۔ تو کیوں نہیں بولتا ۔ چپ کیوں ہو گیا ۔ کیا گلت کہہ رہی ہوں ۔

چانن ۔ وسن نو بھئی بولوں تو کہتی ہے تو نہ بول اور نہ بولوں تو کہتی ہے تو کیوں نہیں بول رہا ۔

دولہ ۔ (ہنس کر) بات تو ٹھیک کر ریا اسے چودھری ۔

چانن ۔ ہمیشہ سچ کہا اور مار کھائی اپنی تو جندگی یوں بیت گی ۔

برکتے ۔ (چھاتی بجا کر) پر میں کہے دیتی ہوں جے ناں اس گھر کی بہو ہی رہے گی ۔ رانڈ نیوں سہاگن بہو ۔

دولہ ۔ شاباشے بہن ۔

برکتے ۔ یہ نہ کہے کوئی کہ برکتے کے گھر میں کوئی ایسی بات ہوئی جس میں گھر کی ہیٹی ہتی ۔ نہ نہ میں تو مرجاؤں گی پہ گھر پہ حرف نہ آنے دونگی ۔

چانن ۔ تو پھر کیا کرے گی تو یہ بتا ۔

دولہ ۔ ہاں ۔ ہاں ۔ بات سمجھ میں نہیں آئی ۔

برکتے ۔ جے ناں کی عدت کھتم ہو چکی ہے آج اس کا نکاح ہو جائے گا ۔

چانن ۔ نکاح ۔

دولہ ۔ پر کس سے ۔

برکتے ۔ میرے علیے سے ۔

دولہ ۔ علیے سے ۔

علیہ ۔ ماں (کھڑا ہو جاتا ہے)

چانن۔ تو اپنی بات سے باج نہ آئے گی نا۔

دولہ۔ لیکن پہلے سے۔

چانن۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ عقل کر۔

برکتے۔ تو تو خود بے عقلی کی بات کرے ہے سن لے دولے یہ کہے ہے کہ شیدا پینو کو تلاخ دے دے اور ـــــ

دولہ۔ پر بہن۔

برکتے۔ نہیں نہیں اس گھر میں تلاخ نہیں ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ جب توڑی میرے دم میں دم ہے نہیں ہوگی۔ (چھاتی بجا کر)

علیہ۔ پر ماں۔

برکتے۔ تو چپ رہ۔ دیکھ نا دولے اب میرے پاس ہے ہی کیا بس لے دے کے یہی ایک علیہ ہے جگر کی بوٹی ہے میرا علیہ اللہ رکھے بارہ سال کا گبھرو ہے۔ کوئی بچہ نہیں۔

علیہ۔ (غصے میں) نہیں ماں۔

برکتے۔ نہیں نہیں کیا کرتا ہے تو۔ کیا تو چاہے ہے کہ جے ناں ساری عمر رنڈ رہے ساری عمر دکھی رہے بول۔

علیہ۔ پر ماں۔

دولہ۔ چپ کر تو۔ بڑوں کی باتوں میں بولنا اچھا لگتا ہے کیا۔

چانن۔ پر اس نیک بخت سے کوئی پوچھے یہ تیرا کیا نیائے ہے کہ سات سال کی چھوکری کو بیس سال کے گبھرو کی دم سے باندھ دیا اور بارہ سال کے بال کو ۲۵ سال کی مٹیار کی گود میں ڈال رہی ہے۔

دولہ۔ بات تو سچ کہہ رہا ہے بہن۔

برکتے۔ اس میں میرا کیا دوش بھائی دولے۔ ان کے نصیب ہی ایسے تھے اگر اس وقت علیہ گھر میں ہوتا تو تھا اب میں اس کے سوا کر ہی کیا سکتی ہوں۔

چانن۔ اب نصیب کو کوس رہی ہے اب گھر کی تخدیر تو یہ کھدے گڈیاں سمجھ رکھی ہیں اِن سے کھیل رہی ہے۔

برکتے۔ ہائے تو نے کبھی میرے دل میں نہ جھانکا۔

چانن۔ اس کال کوٹھڑی میں کون جھانک سکے ہے۔

برکتے۔ (آہ بھر کر) ساری جندگی تبادی میں نے۔ اس کے بھلے کے لئے کیا کیا نہ کیا میں نے دولے اس گھر کے لئے جان ماری چوچوں کو پراں تلے لئے بیٹھی رہی انہیں پالا اس کی کھدمت کی اس پر جان چھڑکی گھر کی عجت کو سینے کے ساتھ لگا کر بیٹھی رہی اور دولے یہ کہے ہے کہ کھیل رہی ہوں میں ان سے۔ جیتے جی اللہ کے بندے نے میری قدر نہ کی (آنسو پونچھتی ہے) مر جاؤں گی تو سمجھ میں آئے گا اس کے۔

دولہ۔ سچ کہہ رہی ہے تو بہن۔

برکتے۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے میرے اپنے پیٹ جائے مجھے پیارے نہیں کیا۔ کیا میں ان کا برا چاہوں ہوں کیا ان کی تکلیف سے مجھے تکلیف نہیں ہوے ہے۔ یہ سمجھیں ہیں مجھے بے ناں سے بیر ہے۔ پر دولے تو ہی بتا جو بیر ہو تو کیا میں اپنے علیے کو اس کے قدموں میں ڈال دیتی کیا۔ مجھے اپنے علیے سے پیار نہیں کیا۔ میں شیدے کے دکھ کو نہیں جانوں ہوں کیا۔

شیدا۔ تو میری بات چھوڑ ماں۔

برکتے۔ مجھے پتہ ہے کہ شیدا بینو کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہے پر میں کیسے بینو کو اپناتی اپنی بہن کا دل کیسے ٹھنڈا کرتی ہاں اس وقت علیا ہوتا تو ——

جانن۔ پھر اب کردے ٹھیک ابھی تو ہاتھ سے کچھ نہیں گیا جمین پہ بیری گرے ہیں دودھ تو نہیں گرا جو اٹھایا نہ جا سکے۔

برکتے۔ سن سے دولے کیا کہہ رہا ہے یہ۔

دولہ۔ سن رہا ہوں۔

جانن۔ اس میں برا کیا ہے عقل کی بات ہے۔

برکتے۔ پر تو یہ بتا کبھی ایسا ہوا بھی ہے کہ ایک بھائی نے تلاخ دی اور دوجے نے کرلی نہ بہ نہ ہوگا اس گھر میں لوگ کیا کہیں گے، کہیں گے برکتے کے گھر میں تلاخ ہوگئی۔

دولہ۔ پھر بہن۔

برکتے۔ شریعت کی اور بات ہے دولے گھر کی عجت کی اور بات ہے۔

جانن۔ اس کے سامنے کون بول سکے ہے دولے کسی کی نہیں چلی کسی کی نہیں چلے گی۔ جو کہے گی وہی ہوگا پہلے بڑے کے گلے میں گھنٹی باندھ دی اب چھوٹے کی گود میں ڈھول رکھ دیا دولے ان کی تو یہ حالت ہے کہ نہ ہنس سکیں نہ رو سکیں۔

علیہ۔ (اٹھ بیٹھتا ہے) ماں —— ماں۔

جانن۔ بھاگوان تو وہ مجاخ کر رہی ہے وہ ٹھٹھا کر رہی ہے کہ ——

علیہ۔ ماں۔

جانن۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہنسوں یا روؤں

علیہ۔ ماں میری بات سن۔

برکتے۔ بول تو کیا کہے ہے۔

علیہ۔ میں بیاہ نہیں کروں گا بھابی سے۔

برکتے۔ (رعب سے) کیوں نہیں کرے گا تو۔

علیہ۔ نہیں کروں گا۔

برکتے۔ آخر کیوں نہیں۔

علیہ۔ کہہ جو دیا ماں۔

برکتے۔ آ میرے لال اِدھر آ۔

علیہ۔ نہیں میں نہیں آتا۔

برکتے۔ میری بات تو سن (پکڑ کر پیار کرتی ہے) بتا مجھے کیوں نہ کرے گا تو جے ناں سے بیاہ۔

علیہ۔ مجھے بھابھی سے پیار ہے ماں اس لیے۔ (سب ہنستے ہیں)

برکتے۔ پگلا لڑکا۔

علیہ۔ سچ ماں۔ میں جھوٹ نہیں کہتا۔

برکتے۔ (پیار کرتی ہے) اسی سے بیاہ کرتے ہیں پتر جس سے پیار ہو۔

علیہ۔ نہیں ماں میں نہیں کروں گا۔

برکتے۔ نہ میرے پتر ایسی بات نہیں کرتے۔

دولہ۔ کتنا سیدھا ہے یہ علیہ ہمارا۔

برکتے۔ اس میں کوئی بُرائی ہے جو تو انکار کر رہا ہے۔

علیہ۔ (تڑپ کر) اس میں برائی نہیں ماں۔

برکتے۔ تو پھر۔

علیہ۔ میں اس کے لیق نہیں ہوں ماں۔

برکتے۔ کیوں کیا کمی ہے تجھ میں۔

علیہ۔ کمی نہیں ماں۔

برکتے۔ تو پھر۔

علیہ۔ وہ بڑی اچھی ہے ماں بڑی اچھی ہے اور میں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔

(ہچکی کی آواز سنائی دیتی ہے سب کمرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ دروازے میں جے ناں کھڑی رو رہی ہے
پاس ٹرنک پڑا ہوا ہے۔)

دلہن۔ کون۔ جے ناں ہے؟ (پینو نکل کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے)

برکتے۔ تو یہاں کھڑی ہے جے ناں۔

جے ناں۔ ہاں میں کھڑی ہوں (ہچکی)۔

برکتے۔ تو جا اُدھر یہاں کیوں کھڑی ہے تو۔

جے ناں۔ میں جا رہی ہوں۔

چانن۔ جا رہی ہے۔

برکتے۔ کہاں جا رہی ہے تو۔

جے ناں۔ میرا ٹرنک اٹھوا دے بابا۔

دولہ۔ پر تو۔ کہاں جا رہی ہے۔

جے ناں۔ مالوم نہیں۔

چانن۔ مالوم نہیں۔

شیدا۔ جے ناں۔

جے ناں۔ یہاں سے جا رہی ہوں یہاں میرا دانہ پانی کھتم ہو گیا۔

برکتے۔ تو نہیں جا سکتی اس گھر سے تو اس گھر کی عجت ہے۔ تو باہر پاؤں رکھے گی تو میں جہر کھا لوں گی۔

چانن۔ اُسے دھمکی کیوں دے رہی ہے تو۔

برکتے۔ تیرا تو نکاح ہے آج تو کہاں جائے گی۔

جے ناں۔ بس ہو چکا ایک بار۔

برکتے۔ پر تو نہیں جا سکتی۔

جے ناں۔ مجھے کوئی روک سکے ہے۔

برکتے۔ لوگ کیا کہیں گے جے ناں۔

جے ناں۔ مجھے نہیں پرواہ کسی کی۔

برکتے۔ ہمیں تو ہے تو اس گھر کی بہو نہیں کیا اس گھر کی عجت نہیں بول کیا کہتی ہے۔

دولہ۔ عقل کر لڑکی۔

چانن۔ جے ناں کیا تو گسے میں ہے۔

جے ناں۔ نہیں۔

چانن۔ تو پھر۔

جے ناں۔ میں کسی سے بیاہ نہیں کروں گی۔ (چل پڑتی ہے)

علیہ۔ بھابھی نہ جا۔ نہ جا بھابھی۔ میں تجھ سے بیاہ نہیں کروں گا میں تیرے لیق نہیں پھر تو کیوں جا رہی ہے۔

جے ناں۔ (بڑھ کر علیے کو پکڑ لیتی ہے) ایسی باتیں نہ کیا کر علیہ۔

علیہ۔ تو پھر کیوں جا رہی ہے تو؟

جے ناں۔ مجھے جانا ہی ہو گا علیے۔

علیہ ۔ تو مجھے ساتھ لے چل ۔ لے چلے گی لے چل بھابھی ۔

(بے ناں رو پڑتی ہے ۔)

پلینو ۔ میں بے ناں کے ساتھ جاؤں گی کیوں بابا میں جاؤں بول نا بابا ۔

چانن ۔ میں تو کُھد اپنی جمین پر جا رہا ہوں اپنے گاؤں ۔ (اٹھ بیٹھتا ہے)

دولہ ۔ عقل کر چودھری تو بھی ۔

برکتے ۔ بے ناں کیوں میری عجت دھول میں ملا رہی ہے تو ۔

بے ناں ۔ بس میں تیرے گھر میں نہیں رہوں گی ۔

برکتے ۔ میرے گھر میں نہیں رہے گی میں نے تجھے کون سا دکھ دیا ہے بہو ۔ جو تو میرے گھر میں نہیں رہے گی میرا ایک ہی پتر ہے
وہ تو میں نے ترے قدموں میں ڈال دیا تجھے میرا علیہ منظور نہیں کیا

(بے ناں چپ رہتی ہے)

علیہ ۔ نہ ماں نہ کہہ نہ کہہ ماں (رو کر) اسے تکلیف ہوئی ہے ۔

دولہ ۔ بول بھی لڑکی ۔

برکتے ۔ تو بے شک نہ کہہ دے پر کچھ تو کہہ کیا تجھے میرا علیہ منظور نہیں ۔

بے ناں ۔ (تو چیخ مارتی ہے) نہ کہہ نہ کہہ نہ کہہ یہ بات مجھ سے ۔

چانن ۔ پھر تو جا کیوں رہی ہے (بیٹھ جاتا ہے)

بے ناں ۔ میں اس کے گھر نہ رہوں گی (برکتے کی طرف اشارہ) نہیں رہوں گی ۔

برکتے ۔ اچھا تو تُو میرے گھر نہ رہے گی نا سن لے پھر تو اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی ۔ سنا تے نے میرے گھر میں ہی نہیں رہنا تو نے ۔
تو لے سنبھال اپنے خصم کو اور اپنے گھر کو اور دیکھ علیہ تو نے جو بے ناں کو تکلیف پہنچائی کچھ جو گھر کی عجت کھراب کی تو
میری روح بد دعا دے گی تجھے ۔

چانن ۔ کیا کہہ رہی ہے تو بھاگوان ؟

برکتے ۔ چل اُٹھ کیا منہ دیکھ رہا ہے میرا چل کر سے کہہ رہا تھا تو اپنی جمین پہ جاؤں گا ۔ چل ہم دونوں گاؤں چلیں اپنی جمین پر
میرے گھر میں ہی نہیں رہنا چاہتی نا یہ ۔ اپنے گھر میں تو رہے گی چل ہم گاؤں چلیں ۔

دولہ ۔ شاباشے بہن ۔ شاباشے بھئی ۔

چانن ۔ بھاگوان یہ تو کہہ رہی ہے تو ۔ مجھے یقین نہیں پڑتا دے ۔ ذرا چٹکی بھر تو مجھے میں کہیں کھاب تو نہیں دیکھ رہا ۔

برکتے ۔ اندھا ہے تو کیا دیکھتا نہیں گھر کی عجت کا سوال ہے بڑوں کی ریت کا سوال ہے ۔

دولہ ۔ واہ بہن واہ بہن ۔ (نوراں ساجی بانو اتر جاتی ہیں)

چانن ۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا ۔ ریت ہاتھ سے نہ جائے ۔ چاہے آپ ٹوٹ جائے کھاکھ ہو جائے چل پھر میں تو کب سے تیار ہوں ۔

شیدا ۔ پر ماں نکاح تو کروا کر جا تو ماں ۔

برکتے ۔ کیوں جے ناں کیا کہتی ہے تو ۔

جے ناں : (ایک چیخ مار کر دونوں بانہوں فرطِ محبت سے پھیلا کر) ماں علیہ (رو کر) پر ماں میں تو بھابھی کے لیق نہیں ماں (جے ناں علیے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

(اسی دوران پڑوس کی عورتیں ڈھولک لے کر آ جاتی ہیں)

جے ناں ۔ (علیے کی طرف فرطِ محبت سے جھک کر) نہیں علیے ایسی بات ناں ۔

(پھر دفعتاً شرما کر پیچھے ہٹ جاتی ہے ۔ ڈھولک بج رہی ہے ۔)

چانن ۔ واہ بھاگواں ۔ آج تو کھش کر دیا تے نے ۔

پردہ ——— پردہ ——— پردہ

میر کلو کی گواہی

احمد جمال پاشا

کردار :-

میر کلو : پیشہ ور گواہ، عمر تقریباً ۵۵ سال سر پر چنی ہوئی آڑی دوپلی، آنکھوں پر گول عینک، منہ میں پان، شیروانی، پاجامہ سلیم شاہی، ہاتھ میں بٹوا، پانوں کی ڈبیا اور نفیس چھڑی، سانولے سلونے۔ دُبلے پتلے، چہرے پر بلا کی سنجیدگی، ہر بات کا بہت سوچ سمجھ کر اور بہت زور دے کر جواب دیتے ہیں۔

احسن :- (فریق اول) —— عمر تقریباً ۴۵ سال، سادہ وضع، گلے میں مفلر، کوٹ پر پاجامہ، پیر میں نیوکٹ، گول مٹول، گھریلو اور کاروباری قسم کا انسان اپنے کام سے کام، بات بات پر گھبرانے اور جلدبازی کی عادت۔

وکیل (فریق اول) ادھیڑ عمر کا موٹا تازہ مگر بےحد پھرتیلا، گلے میں سفید اسکارف، سیاہ کوٹ، سفید پتلون، رنگین موزہ، کالا جوتا، بغل میں مقدمہ کی فائلیں دبی ہوئی، آواز بھاری، پُر اعتماد لہجہ۔

منشی (وکیل فریق اول) پولیس کا ریٹائرڈ سپاہی، بوڑھا گھاگ۔ پُھرتیلا، بھرا بھرا جسم، گھنی مونچھیں، آڑی مانگ، آنکھوں میں سرمہ، منہ میں پان، چہرے پر تیل کی چمک، چُپڑے بال، لچھے دار باتیں۔

رحمت (فریق مخالف) خاموش قسم کا انسان، عمر تقریباً ۶۰ سال، دُبلا پتلا، نحیف و لاغر، سیاہ رامپوری ٹوپی، کُرتا، صدری، پاجامہ اور پاؤں میں چپل، ہر بات غور سے سننے اور دیکھنے کی عادت۔

وکیل (فریق مخالف) دُبلا پتلا نوجوان، عینک لگائے، سیاہ کوٹ، ورسٹیڈ کا پتلون، براؤن شوز، نہ گھبرانے والا مستقل مزاج اور باہمت مگر تُنک مزاج، ہاتھ میں کاغذات۔

منشی (وکیل فریق مخالف) بھدے جسم کا ادھیڑ عمر کا، قمیص پتلون کے اوپر، کچھ ترچھا دیکھتا ہے۔ ہاتھ میں کاغذات کا جھولا، پیروں میں چپل، موٹی آواز۔

جج —— سُرخ و سپید، خوبصورت انگریزی وضع کے بال جو کنپٹیوں پر زیادہ سفید ہیں، چمکتی ہوئی چاند، سیاہ کوٹ کے اوپر روب اور پتلون حسین مگر باوقار چہرہ، بڑی بڑی ذہین آنکھیں، سُنہری کمانی کی عینک، عمر تقریباً ۵۵ سال، رعب داب، بات۔ انداز اور آواز میں تمکنت۔

پیشکار —— سیاہ رنگ، موٹی عینک، بند گلے کا کوٹ اور پتلون، نیوکٹ شوز، ہاتھ میں فاؤنٹین پین، میز پر کاغذات پر نگاہیں جمائے ہوئے۔

چپراسی —— سر پر صافہ، وردی پہنے ہوئے، کمر میں پٹکا جس پر عدالت کا مونوگرام چمک رہا ہے۔ پاؤں میں چمرودھا، بہت ہی باٹ دار

آواز، پکار کے وقت ایک ہی سانس میں آواز لگاتا ہے۔ بوڑھا ہے۔ مگر آواز نوجوانوں سے بڑھ کر ہے۔

پولیس: پولیس کا سپاہی وردی پہنے ہوئے بندوق لئے مجرموں کے کٹہرے کے سامنے بالکل اٹنشن کھڑا ہوا ہے۔

تماشائی: کمرۂ عدالت میں فریقین اور وکلاء کے پیچھے ذرا فاصلے سے بہت سے تماشائی، زیادہ جوان اور ادھیڑ عمروں کے قمیص، پاجامے، دھوتی، صافے اور پتلون میں کھڑے اور بیٹھے ہیں۔ کچھ کے لباس معمولی اور میلے کچیلے بھی ہیں۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران گواہ کے جواب پر یہ سب زور سے ہنستے اور جج کے آرڈر آرڈر کہنے پر ان کی ہنسی ہلکی ہو کر بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ کارروائی میں حصّہ نہیں لیتے۔ ان کی تعداد کم یا زیادہ بھی کی جا سکتی ہے۔

زمانہ ——— حال

وقت ——— دن

مقام ——— عدالت

(انجم مان پوری مرحوم کے مضمون "میر کلّو کی گواہی" کو اسٹیج کی ضرورتوں کے پیشِ نظر ترمیم اور اضافے کے ساتھ ڈرامائی روپ میں پیش کیا جا رہا ہے۔)

پہلا منظر

احاطۂ کچہری، املی، نیم اور پیپل وغیرہ کے درختوں کے نیچے، ٹین کے سائبانوں میں جگہ جگہ قریب اور دور بے ترتیب تخت پڑے ہوئے ہیں۔ ہر تخت پر ایک یا ایک سے زائد ٹین کے کالے بکس رکھے ہوئے ہیں۔ جن پر انگریزی، اردو اور ہندی میں وکیل کا نام لکھا ہوا ہے ہر بکس کے سامنے اس وکیل کا منشی بیٹھا ہوا ہے۔ تخت کے اوپر یا تخت کے گرد تپائیاں، کرسیاں، مونڈھے یا بنچیں ہیں۔ جن پر وکیل جا بجا بیٹھے ہوئے یا ادھر اُدھر کھڑے یا آ جا رہے ہیں ان کے ساتھ یا ان کے اردگرد موکل ہیں۔ جگہ جگہ ٹائپسٹ اور اسٹامپ فروش۔ دکانیں جمائے ہوئے ہیں۔ انہی کے بیچ میں چائے کے ہوٹل، پان کی دکانیں، سائیکل اسٹینڈ اور چاٹ بیچنے والے خوانچے جمائے ہوئے ہیں۔ انہی کے سامنے عدالتوں اور دفاتر کی عمارتوں کا سلسلہ ہے۔ ایک طرف حوالات ہے جس کی سلاخوں میں ملزم قیدی نظر آ رہے ہیں۔ پولیس پہرہ دے رہی ہے اور ایک طرف پولیس کی گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔

پردہ اُٹھنے پر احاطہ کچہری کی ایک جھلک نظر آ رہی ہے۔ کچہری کا منظر اسٹیج کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تفصیلات اور جزئیات ضرورت کے مطابق کم یا زیادہ کر لی گئی ہیں۔ لوگوں کے شور و غل میں عدالت کے چپراسی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ پکار کے ساتھ ہی احسن کھڑا، گھبرایا ہوا، اپنے وکیل سے باتیں کرتا ہوا سامنے دکھائی دے رہا ہے۔

عدالت کا چپراسی: (آواز لگاتے ہوئے) کلّو ولد للّو حاضر ہو، کلّو ولد للّو حاضر ہو، کلّو ولد للّو حاضر ہو ——”

احسن: (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) وکیل صاحب، وکیل صاحب، (زور دیتے ہوئے) وکیل صاحب! میں کہتا ہوں وکیل صاحب،

غضب ہو گیا ۔ غضب ! گواہوں کی پکار شروع ہو گئی ۔ مگر گواہ تو اب تک نہیں آئے ۔ نہ جانے کہاں مر گئے کمبخت ؟ وکیل صاحب ! اگر ہم فوراً گواہ حاضر نہ کر سکے تو مقدمہ خارج ہو جائے گا ۔ وکیل صاحب بڑا غضب ہو جائے گا ۔ اگر آج کسی طرح گواہی گزر جاتی تو اگلی پیشی تک گواہ پیش کرنے کا موقع مل جاتا اور بات بن جاتی ۔ وکیل صاحب ! خدا کے لئے کچھ کیجیے ، کچھ کیجیے ——

وکیل :۔ (اطمینان سے) احسن صاحب (دلاسہ دیتے ہوئے) بھلا اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے اگر گواہ نہیں آئے تو نہ آئیں ۔ آخر گواہی دینے والوں کی یہاں کون سی کمی ہے ، ایک سے ایک استاد پڑا ہوا ہے (منشی جی کی طرف مڑ کر) منشی جی ! دیکھئے لپک کر پکڑیے ، وہ جا رہے ہیں میر کلو ، کہیں نکل نہ جائیں ——

منشی جی :۔ (اپنے تخت پر وکیل کے بکس کے سامنے کاغذات پھیلائے وکیل صاحب پر نظر جمائے اُن کی باتیں غور سے سُن رہے ہیں ، لپک کر اُٹھتے ہیں اور پکارتے ہوئے دوڑتے ہیں) اجی میر صاحب ! او میر صاحب ! ارماں میر صاحب ! ارے بھئی سنا میر صاحب ! رُکیئے نا میر صاحب ! بھئی آخر ہماری بھی تو سُنیئے ——

میر کلو :۔ (تیز چلتے میں مڑ کر دیکھتے ہیں ، چال آہستہ ہو جاتی ہے ، پلٹتے ہیں ، رُکتے ہیں ۔ اُس کے بعد مسکرا کر منشی جی کی جانب دیکھتے ہوئے تپاک سے فرشی سلام کرتے ہوئے بڑھتے ہیں) حضت ! تسلیمات عرض کرتا ہوں ، فرمائیے منشی جی ! بندے کے لائق کوئی خدمت ؟

منشی جی : (ہانپتے ہوئے رُکتے ہیں ۔ چہرے پر تبسم پھیل جاتا ہے اور اسی تپاک سے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں) اجی میر صاحب ! وہ آپ کو جناب ہمارے وکیل صاحب قبلہ یاد فرما رہے ہیں ——

میر کلو : بہت خوب ، بہت خوب (پان چباتے ہوئے) مگر حضت ! آخر آپ کے قبلہ وکیل صاحب تشریف کہاں رکھتے ہیں ؟

منشی جی : (زور دے کر) اجی وہ رہے ، وہ کیا ، وہ اُدھر ، بالکل آپ کے سامنے ——

میر کلو : (ہنستے ہوئے) دیکھ لیا ، وہ رہے ، چلیئے ۔

منشی جی : (ہنستے ہوئے وکیل صاحب کی طرف بڑھتے ہوئے) آئیے ، آئیے ۔ !

وکیل صاحب : (میر صاحب کا دونوں ہاتھوں سے استقبال کرتے ہوئے) آئیے ، آئیے میر صاحب ، آپ ہی کی تلاش تھی ، (احسن کی طرف مڑتے ہوئے) احسن صاحب ! یہ ہیں ہمارے میر کلو صاحب ، فنِ گواہی کے مشہور ماہر (زور دیتے ہوئے) اور پیشہ ور گواہوں کے استاد ۔ بس چپکے سے ان کے داہنے ہاتھ میں کھٹ سے پچیس۲۵ روپے نذرانے کے رکھ دیجیے اور پھر دیکھئے تماشا ——! (احسن گھبرا کر کبھی وکیل صاحب کو سوالیہ نشان بنا دیکھتا ہے ، کبھی میر کلو اور کبھی منشی جی کو —— وکیل صاحب ہنستے ہوئے) احسن صاحب جلدی کیجئے ۔ بس کھٹ سے میر صاحب کی مٹھی اور جیب گرم کیجیے (ذرا زور دے کر) میں جو کہتا ہوں وہ کیجیے ۔!"

احسن : (جیب میں ہاتھ ڈال کر روپے نکال کر گنتا ہے اور پس و پیش کے انداز میں روپے میر صاحب کی طرف بڑھاتا ہے ۔ مگر نظریں

وکیل صاحب پر لگی ہوئی ہیں) یہ لیجئے ! میر صاحب پچیس روپے —!

میر کلّو : (روپے لے کر جیب میں رکھتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کر کے ہنس کر) اجی حضرت ! بھلا اس کی کیا ضرورت تھی ؟ تسلیمات ! (روپے جیب میں رکھتے ہی میر صاحب، وکیل صاحب اور اُن کے پیچھے منشی جی چلنے لگتے ہیں)

احسن : (پیچھے لپکتے ہوئے گھبرائی آواز میں) ارے ! ارے آپ لوگ تو عدالت کی طرف چل دیئے ۔ میرا مطلب ہے، ذرا بھی کچھ آخر مقدمہ تو سمجھ لیجئے، وکیل صاحب میر صاحب کو یہ تو بتا دیجئے کہ مدعا علیہ کون ہے ؟ آخر اس کا نام کیا ہے ؟ مقدمہ کی نوعیت کیا ہے ؟ کتنی رقم کا دعویٰ ہے ؟ آخر یہ کہیں گے کیا —؟

میر کلّو : (پُر اعتماد لہجے میں) احسن صاحب ۔ جس طرح اچھا حکیم اور ڈاکٹر مریض کی نبض دیکھ کر مرض بتا دیتا ہے، اور مریض سے حال پوچھنا اپنی توہین سمجھتا ہے ۔ اسی طرح ہم کسی بھی مقدمے کے بارے میں گواہی کے لئے کچھ پوچھنا یا سُننا اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں ۔ چلئے پکار ہو چکی ہے —!

احسن : (چہرے پر وحشت برس رہی ہے، بہت ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں) ارے موٹی موٹی باتیں تو مقدمہ کے بارے میں سمجھ لیجئے —!

وکیل : چلئے ! چلئے احسن صاحب بس آپ فرض کر لیجئے کہ یہ سب کچھ سمجھ گئے ۔ سب کچھ —!

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(دوسرا منظر)

(پردہ اُٹھتا ہے ۔ کمرۂ عدالت ایک بڑا ہال ہے جس میں سامنے دیوار پر ایک طرف کلاک لگا ہوا ہے دوسری طرف وزیر اعظم کی فریم کی ہوئی تصویر سامنے ایک اونچی ڈائس پر ایک بڑی سی میز ہے جس کے سامنے ایک ہتھے دار اونچی کرسی پر جج صاحب بڑے وقار کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اس بڑی میز پر ایک طرف ٹیبل لیمپ روشن ہے ۔ میز پر ایک بڑا سا شیشہ رکھا ہوا ہے جس کے ایک طرف کاغذات کی ٹرے رکھی ہوئی ہے اسی کے ساتھ ایک کلینڈر اسٹینڈ ہے اور ایک قلمدان ہے جس میں پن ہولڈر میں پر کا قلم لگا ہوا ہے ایک لکڑی کی موگری رکھی ہوئی ہے جس کو جج آرڈر آرڈر کہتے وقت میز پر مارتا ہے ۔ اسی کی بغل میں گھنٹی ہے اور سامنے کچھ کاغذات رکھے ہوئے ہیں ۔ داہنی طرف ایک چھوٹی میز پر پیشکار مؤدب بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے اس کی پشت پر اور کمرے کے سامنے مجرموں کا کٹہرہ ہے ۔ جس کے سامنے ایک سنتری پولیس کی وردی میں بندوق لئے اٹینشن کھڑا ہے ۔ اور بائیں طرف ہاتھ باندھے ہوئے مؤدب چپراسی کھڑا ہے ۔ جج صاحب کی میز سے ملا ہوا لمبا ڈسک نما کاؤنٹر ہے جس پر وکیل صاحب جج صاحب کی طرف منھ کئے ہوئے کھڑے ہیں اُن کے ایک طرف احسن ہیں اور دوسری طرف میر کلو اور ان کے پیچھے وکیل صاحب کے کاغذات سنبھالے ہوئے منشی جی کھڑے ہیں سب کا منھ جج صاحب کی طرف ہے لیکن دونوں وکیلوں کو کن انکھیوں سے اُن کے موکل اور منشی دیکھتے بھی جاتے ہیں مگر میر کلّو سب سے بے نیازانہ اطمینان سے کھڑے ہوئے ہیں ۔ ان کی دوسری طرف مقابل میں کاؤنٹر پر وکیل فریق مخالف کھڑے ہوئے ہیں اُن کے ایک طرف رحمت ہیں اور دوسری طرف

اُن کے منشی جی کھڑے ہوئے ہیں ——— اُن کے پیچھے کچھ فاصلے سے دو ایک میزیں، کچھ کرسیاں اور اُن کے پیچھے دیوار سے ملی ہوئی کچھ بنچیں ہیں۔ جن پر کچھ تماشائی بیٹھے اور کچھ میزوں کے گرد کھڑے ہوئے ہیں اُن میں کچھ وکیل بھی شامل ہیں سب کے مُنہ جج کی طرف ہیں مگر پُر اشتیاق نظروں سے میر کلّو کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ اندر داخل ہونے اور باہر جانے کے دو دروازے تماشائیوں کی پشت کی جانب ہیں جن پر چقیں پڑی ہوئی ہیں)

وکیل : (جج صاحب سے) حضور میر کلّو اس مقدمہ میں بطورِ گواہ کے پیش ہیں۔ ان کا بیان قلمبند کیا جائے۔

جج : (میر کلّو سے) میر کلّو! کہیے ـ جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

میر کلّو : جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

وکیل فریق مخالف :۔ (رحمت سے) ارے یہ احسن صاحب تو کلّو کے بجائے میر کلّو کو لے آئے۔

رحمت : (غور سے دیکھتے ہوئے) میر کلّو! اجی یہ تو گواہ نہیں گواہوں کے بادشاہ ہیں، دروغ حلفی کے جرم میں ایک بار سزا بھی پا چکے ہیں۔ نجانے کیسے چوک گئے تھے کہ پھنس گئے۔ مگر آسانی سے چٹکی میں نہیں آتے (ٹھنڈی سانس بھر کے) اب مقدمہ کی خیر نہیں۔

وکیل فریق مخالف : میر کلّو صاحب! آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر آئے ہیں۔ ؟

میر کلّو :۔ آجکل کون ملک کا خادم ایسا ہے جو جیل یاترا نہ کر آیا ہو ———

(تماشائیوں کی ہنسی کی آوازیں)

وکیل فریق مخالف : بھلا آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلے میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ؟

میر کلّو : وہی قانون شکنی ———

(تماشائیوں کے ہنسنے کی آوازیں)

وکیل فریق مخالف : (جھلائے ہوئے طنزیہ لہجہ میں) بھلا کس قانون کو توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذمہ لی تھی ——؟

میر کلّو : مہاتما گاندھی نے ملکی قانون توڑنے کا انگریزوں کے خلاف بیڑا اُٹھایا تھا۔ کچھ قومی لیڈروں نے قانون جنگلات کی خلاف ورزی کا ذمہ لیا میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت قانون شہادت کی اصلاح کی ہے اسی لئے قانون شکنی کے لئے میں نے اسی کو منتخب کیا ——

وکیل فریق مخالف : حضور! جج صاحب! یہ صاحب دروغ حلفی کے جرم میں سزا پا چکے ہیں، مگر اپنی زبان سے صاف اقرار نہیں کرتے۔

جج :۔ تو آپ اُس فیصلے کی نقل داخل کر سکتے ہیں! دوسرا سوال کیجئے۔

وکیل فریق مخالف : کیوں میر صاحب! احسان علی مرحوم کو آپ جانتے تھے ——؟

میر کلّو : اے حضور جاننے کی ایک ہی کہی۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے، نہ مجھے اُن کے بغیر آرام، نہ اُن کو میرے دیکھے بغیر چین ——

وکیل فریقِ مخالف: اُن کی عمر کیا تھی — ؟

میر کلو: (زور دیتے ہوئے) یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان تھی —!"

(ہنسی اور قہقہے کی لہریں)

وکیل فریقِ مخالف: یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف کہئے وہ بوڑھے تھے یا جوان —؟

میر کلو: عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے۔ مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

(ہنسی کی لہریں)

وکیل فریقِ مخالف: بال سفید تھے یا سیاہ — ؟

میر کلو: نزلے کی وجہ سے بال سفید ہو گئے تھے لیکن جب خضاب لگا لیتے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔" (ہنسی کی لہر)

وکیل فریقِ مخالف: رنگ گورا تھا یا کالا — ؟

میر کلو: نہایت ہی گورے چٹے آدمی تھے لیکن وہی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا سا ہو گیا تھا — (ہنسی کی لہر)

وکیل فریقِ مخالف: لانبے تھے یا ناٹے — ؟

میر کلو: قد تو لانبا تھا۔ لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے — (ہنسی کی لہر)

وکیل فریقِ مخالف: (جھلا کر) آپ سوال کا صاف صاف جواب کیوں نہیں دیتے؟ یہ کیا؟ کہ لانبے تھے اور ناٹے بھی؟ گورے بھی تھے اور سانولے بھی؟ بال سفید بھی تھے اور سیاہ بھی؟ بھلا اس سے حلیے کا کہیں صحیح اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔؟

میر کلو: جناب خفا ہونے کی تو کوئی بات نہیں —

وکیل فریقِ مخالف: اچھا پھر صاف صاف بتائیے کہ وہ لانبے تھے یا ناٹے؟

میر کلو: قد تو لانبا تھا، لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے—" (ہنسی کی تیز لہر)

وکیل فریقِ مخالف: (غصے میں) میر صاحب! میں پھر کہتا ہوں کہ آپ سوال کا صاف صاف جواب کیوں نہیں دیتے، یہ کیا کہ لانبے تھے اور ناٹے بھی، گورے بھی تھے اور سانولے بھی، بال سفید بھی تھے اور سیاہ بھی، اس سے حلیے کا کہیں صحیح اندازہ مل سکتا ہے؟

میر کلو: جناب وکیل صاحب! اس میں خفا ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ ایک دو روز کی ملاقات ہوتی تو اس وقت کی خاص وضع اور صورت بیان کرتا۔ برسوں دن رات کا ساتھ رہا۔ جن مختلف حالتوں میں میں نے دیکھا صاف صاف بتا دیا —

وکیل فریقِ مخالف: اچھا اُن کے داڑھی تھی یا نہیں — ؟

میر کلو: وہ عجب آزاد وضع اور رند مشرب آدمی تھے جی میں آیا تو چاروں ابرو کا صفایا بول دیا اور کبھی داڑھی بڑھائی تو خواجہ خضر کو بھی مات دے دی —

(ہنسی کی لہر موسیقی کے جھناکے کے ساتھ اُبھرتی ہے)

وکیل فریقِ مخالف: (سخت لہجہ میں غصہ کرتے ہوئے) فضول باتوں کی ضرورت نہیں، میں نے پوچھا تھا کہ داڑھی رکھتے تھے یا نہیں،

صرف ہاں یا نہیں کہہ دیتے۔ اس کے علاوہ کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا بھر کے قصے کہانیوں سے ہمیں مطلب نہیں۔

میر کلّو: بہتر ہے آئندہ سے انہی دو لفظوں میں جواب دوں گا —

وکیل فریق مخالف: احسان علی خاں مرحوم برابر رہتے کہاں تھے —؟

میر کلّو: جی ہاں — (ہنسی اور قہقہوں کی تیز لہر)

جج: آرڈر! آرڈر! —

وکیل فریق مخالف: (بگڑتے ہوئے) یہ! یہ جی ہاں، کیا؟ میں پوچھتا ہوں کہ رہتے کہاں تھے؟ تو آپ فرماتے ہیں کہ جی ہاں (لہجہ بنا کر) جی ہاں! بھلا یہ اس سوال کا جواب ہوا —؟

میر کلّو: جناب ہی نے فرمایا تھا کہ جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہو —!

وکیل فریق مخالف: (سمجھاتے ہوئے) میں نے ہر سوال کے لئے تھوڑی یہ جواب بتایا تھا، اچھا اب کہیے کہ وہ کہاں رہتے تھے —؟

میر کلّو: اپنے مکان میں — (ہنسی کی لہر)

وکیل فریق مخالف: (بُرا سا منہ بنا کر بگڑتے ہوئے) لاحول ولاقوۃ! بھی عجیب سمجھ ہے میرا اس سے یہ مطلب ہے کہ وہ شہر میں رہتے تھے یا دیہات میں؟

میر کلّو: دونوں جگہ کبھی شہر کبھی دیہات — (ہنسی کی لہر)

وکیل فریق مخالف: دیہات میں اُن کا مکان کس رُخ پر ہے (مسکراتے ہوئے زور دے کر) آپ تو وہاں بھی اُن کے ساتھ جاتے ہی ہوں گے —؟

میر کلّو: جی ہاں! برابر ساتھ دیہات بھی جایا کرتا تھا —

وکیل فریق مخالف: (غصہ ہوتے ہوئے) اصل سوال آپ پھر کھا گئے۔ دیہات میں ساتھ جانے کو میں نہیں پوچھتا۔ اس کا جواب دیجئے کہ وہاں اُن کا مکان کس رُخ پر ہے؟

میر کلّو: شہر میں رہنے والے کو رُخ کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں جب جب گیا سمت کا مجھے صحیح پتا ہی نہ لگا —

وکیل فریق مخالف: یہ روپیہ کس کام کے لئے انہوں نے لئے تھے؟

میر کلّو: اپنی ضرورت کے لئے — (تماشائیوں کے تیز قہقہوں اور جج کی آرڈر آرڈر کی آوازیں)

وکیل فریق مخالف: کون سی ضرورت؟ کیا کوئی خاص ضرورت آ پڑی تھی۔ جو بغیر قرض لئے کام نہ چلتا —؟

میر کلّو: وہ بڑی ہمت کے آدمی تھے۔ خاص اور عام ضرورتیں دونوں اُن کے لئے ایک تھیں اپنے پاس دو چار ہزار روپے رکھنا ضروری سمجھتے تھے —

وکیل فریق مخالف: کب روپے اُنھوں نے لئے؟

میر کلّو: جب ضرورت پڑی — (ہنسی کی تیز لہر اور آرڈر آرڈر کی آوازیں)

وکیل فریق مخالف: (بہت ہی گمبھیر لہجے میں) کتنے دن ہوئے —؟

میر کلّو: (حساب لگاتے ہوئے) تین سو ساٹھ دن کا ایک سال ہوتا ہے اب حساب کرنا اور جوڑ کے بتانا کہ سب ملا کر کتنے دن ہوئے

ذرا مشکل ہے۔

وکیل فریقِ مخالف: (بگڑتے ہوئے) دنوں کو جوڑ کر بتانے کو میں نہیں کہتا، یہ بتایئے کہ کتنے سال ہوئے؟

میر کلو: پرونوٹ میں لکھی ہوئی تاریخ دیکھ کر آپ بھی جوڑ سکتے ہیں کہ کتنے سال ہوئے۔

وکیل فریقِ مخالف: (فاتحانہ لہجے میں) تو پھر صاف کہیے نا کہ ہمیں یاد نہیں۔

میر کلو: جی ہاں! پڑھنا چھوڑے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ حساب وساب اب واقعی یاد نہیں ——

وکیل فریقِ مخالف: حساب بھولنے یا یاد رکھنے کا سوال نہیں، پرونوٹ کب لکھا گیا تھا ——؟ آخر کتنا زمانہ ہوا۔ یہ یاد ہے یا نہیں؟

میر کلو: وکیل صاحب! زمانے کے بارے میں جو آپ پوچھتے ہیں تو جہاں تک مجھے یاد آتا ہے انہوں نے اپنی زندگی ہی کے زمانے میں قرض لیا تھا —— (ہنسی کی لہریں اور آرڈر آرڈر کی آوازیں)

وکیل فریقِ مخالف: (غصّہ میں) کیسے میر صاحب! مرحوم سے آپکی بڑی پُرانی دوستی تھی، برسوں ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن کی تحریر تو آپ ضرور پہچانتے ہوں گے ——

میر کلو: مرحوم میں ایک یہی تو کمال تھا۔ جس پر وہ برابر فخر بھی کرتے تھے وہ نہایت ہی خوش نویس ہفت قلم تھے ہمیشہ ایک نئی شان سے لکھتے۔ قلم پر اتنا زیادہ اختیار تھا کہ اُن کا ایک خط کبھی دوسرے سے ملا ہی نہیں —— (ہنسی کی تیز لہریں)

جج: (بھاری آواز میں) آرڈر! آرڈر! وکیل صاحب آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے یا عدالت برخاست کی جائے، کیونکہ اب وقت ختم ہو چکا ہے ——

وکیل فریقِ مخالف: مائی لارڈ! گواہ سے صرف ایک اور سوال کر کے جرح ختم کرتا ہوں۔

جج: پوچھئے ——

وکیل فریقِ مخالف: اچھا میر صاحب! یہ تو بتایئے کہ مرحوم مرے کس بیماری سے تھے ——؟

میر کلو: (بے اختیار دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں اور چلاتے ہوئے کہتے ہیں) ہائے! ہائے! اُف! ارے رونا تو اسی کا ہے کہ ان کے علاج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ حکیم۔ وید۔ ڈاکٹر سب ہی کا علاج پر علاج کیا گیا مگر کوئی اصل مرض کا پتا ہی نہ لگا سکا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ جناب وکیل صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ اُن کو موت کی بیماری تھی ——! ارے میرے دوست' ہائے ہائے تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔

(میر کلو چلا چلا کر رونا شروع کر دیتے ہیں اور دھڑام سے گر پڑتے ہیں۔ موسیقی کی لہروں کے ساتھ ہنسی اور قہقہے کی آوازیں بلند ہوتی جاتی ہیں۔)

جج: (بآوازِ بلند) آرڈر! آرڈر! عدالت برخاست کی جاتی ہے ——

(میر کلو اپنے مرحوم دوست کو یاد کرتے ہوئے بے تحاشا رونے کی آواز اور لوگوں کی اُن کو چُپ کرانے کی آوازیں۔ اسی کے ساتھ قہقہوں اور ہنسی کی تیز آوازیں۔ موسیقی کی تیز لہروں کے ساتھ اُبھر کر آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتی ہیں اور اسی کے ساتھ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(ماخوذ)

حُسنِ زن، حُسنِ ظن

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

"تم کو شاید یہ محسوس ہو گیا ہوگا کہ میں تم پر عاشق ہو گیا ہوں۔"

"ہاں پہلے ہی دن سے تم مجھ کو غور سے دیکھتے آ رہے ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ تمہاری توجہ ضرورت سے زیادہ ہے۔"

"میں بھی محسوس کرتا رہا کہ تم زیادہ سے زیادہ حسین ہوتی جا رہی ہو۔"

"تو کیا یہ پہلی نگاہ کا یعنی پہلی نظر کا عشق نہیں ہے؟"

"پہلی نظر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوا۔ میں نے عموماً دیکھا ہے کہ پہلی نظر میں جو اچھی معلوم ہوئی وہ غور کی نظر میں بری لگی اور پھر بری ہی لگتی رہی یہاں تک کہ اس سے دل ہٹ گیا۔ مگر تمہارے معاملہ میں یہ نہیں ہوا۔ ہر بار ملاقات میں تم زیادہ سے زیادہ اچھی معلوم ہوئیں اور اب تو ایسی اچھی معلوم ہو رہی ہو جیسی کبھی بھی کوئی نہیں نظر آئی۔"

"اچھا تو معاملہ یہاں تک پہونچا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا۔" اور اسے ہنسی آئی جس سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے اور میرے عشق کو کوئی چیز ہی سمجھ رہی ہے۔

اس ہنسی نے میرا منہ بند کر دیا اور میں نے اسے دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔ سڑک سناٹے کی تھی اوپر پہاڑی نظر آ رہی تھی اور سڑک داہنے کو مڑ کر ایک کالونی میں جا رہی تھی۔ میں کبھی سڑک کے موڑ کو دیکھتا اور کبھی دزدیدہ نظر اس پر ڈالتا۔ اس کی ہنسی تو ختم ہو گئی تھی مگر چہرہ کھلا ہوا تھا اور آنکھوں میں شوخی کھیل رہی تھی۔

اس نے کچھ کہنے کے لئے کہا۔ "ہم اس موڑ سے واپس ہو جائیں گے۔"

"سڑک نہیں ہے تو کیا۔ ہم اس پہاڑی تک کیوں نہ چلیں۔"

"اور اگر پہاڑی کے اوپر بھی چلے چلیں تو کیا حرج ہے۔"

"تم کبھی پہلے اس پہاڑی پر گئی ہو۔"

"کیوں نہیں بارہا۔ وہاں سے عجیب سماں نظر آتا ہے۔ اُدھر دور پر سمندر موجیں مارتا تو نہیں نظر آتا مگر ہاں ایک سطح پانی کی سمجھ میں آتی ہے جو آسمان سے مل جاتی ہے اور ادھر سارا شہر عمارتوں پر عمارتیں لدی ہوئی اور ان کے درمیان بڑی بڑی عمارتیں جیسے قائد اعظم کا مقبرہ۔ حبیب بینک کی بلڈنگ، وغیرہ بڑی دلکش نظر آتی ہیں اور شام ہوتے ہی بجلیاں جل جاتی ہیں جوں جوں اندھیرا چھاتا جاتا ہے توں توں بجلیاں اور بھی روشن ہوتی جاتی ہیں۔ بالکل اندھیرا ہو جانے پر بس تارے ہی تارے نظر آتے ہیں

میں اس سماں میں محو ہو کر اپنے کو بھول جاتی ہوں۔ مگر یہ سماں روز نہیں دیکھنے کو ملتا۔ پہاڑی کافی دور ہے اور پھر اس پر چڑھنا بھی دقت سے خالی نہیں ہے۔"

"اگر آج اس پہاڑی کے اوپر تک چلیں تو کیسا ہو۔"

"ہاں یہی وقت ہے۔ شام ہوتے ہوتے پہاڑی کے اوپر تک پہونچ جائیں گے اور شہر پر رات چھاتے اور تارے نکلتے دیکھ لیں گے۔ تم اور ہم بالکل اکیلے ہوں گے اور واپسی پر یہاں بھی اندھیرا چھا چکے گا شاید راستہ نہ ملے۔"

"نہیں میں بہت دفعہ رات میں واپس ہوئی ہوں۔ ادھر کی بجلیوں سے گھر کا پتا چل جاتا ہے اور میں سیدھی چلی آتی ہوں۔"

"تو پھر کیا ہے۔ ادھر ہی قدم بڑھائیں۔"

……

وہ کسی طرح حسین نہیں کہی جا سکتی تھی اور سب سے پہلی ملاقات میں وہ مجھے حسین نہیں معلوم ہوئی تھی۔ کالا رنگ رات میں اتنا کالا نہیں معلوم ہوا تھا مگر آنکھ ناک اور چہرہ کی ساخت میں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی کہ جاذب نظر ہوتی۔ پھر دن کی روشنی میں دیکھا تو کافی ڈھلی ہوئی معلوم ہوئی۔ مگر اس میں ایسی بیباکی تھی کہ وہ قریب سے قریب تر آتی گئی اور اس کے چہرہ کے نقائص مٹتے گئے۔ اس کے پاس جانے میں کوئی روک نہیں تھی بلکہ اس کے دل کے دروازے ہمیشہ پاٹوں پاٹ کھلے تھے اور ہر وقت وہ مجھے ان میں داخل کرنے کو تیار تھی۔ یہ لگاؤ مجھے پہلے کبھی کسی عورت میں محسوس نہیں ہوا تھا اور اسی نے مجھے بے پناہ زور سے کھینچا۔ ہم دونوں مصروف تھے اور اپنے کاموں میں آٹھ بجے صبح سے دو بجے تک مشغول رہتے۔ ہمارے دفاتر کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ ضرور تھا مگر ہم ایک ہی بلڈنگ کے دو فلیٹوں میں رہتے تھے۔ اس کا فلیٹ میرے فلیٹ کے بالکل اوپر تھا۔ اس میں اس کے ساتھ ایک اور عورت اور ایک لڑکا رہتا تھا جو کسی طرح اس کے عزیز خاص تھے۔

دفتر سے آکر ہم دونوں آرام کرتے اور سہ پہر کی چائے کے بعد وہ سنگھار کئے ہوئے میرے فلیٹ میں اتر آتی۔ ہم دونوں شطرنج کھیلتے رہتے اور پھر ساتھ ٹہلنے نکل جاتے۔

اس کے چہرہ اور جسم کے نقائص ایک ایک کر کے غائب ہوتے گئے اور ان پر عجیب حسن چھا تا گیا۔ میں اس کے ساتھ شطرنج کھیلنے اور ٹہلنے میں زیادہ سے زیادہ محو ہوتا گیا اور دفتر میں کام کرتے وقت دھیان اس کی طرف جاتا اور اس کا چہرہ ذہن کی آنکھوں کے سامنے صاف صاف کھنچ جاتا۔ سیاہ رنگ میں ایک خاص چمک آجاتی۔ ملک کی اٹھان آسمان کی طرف سے جاتی ہوئی معلوم ہوتی۔ منہ کا خط اور خاص طور پر مسکراہٹ سے اس کا کھلنا دل کو باغ باغ کر دیتا اور دل میں ہوک اٹھتی کہ اپنے دفتر کا سب کام چھوڑ کر اس کے دفتر جاؤں اور اسے دیکھنے میں محو ہو جاؤں۔

چنانچہ میں نے ایک دن ایسا ہی کیا اور وہاں جا کر عجیب سماں میرے سامنے آیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھی تھی اور متعدد کلرک اس کے پاس آتے جاتے رہے۔ وہ ان سب سے نہایت بیباکی سے بات کرتی۔ ایک آدھ ہنسی مذاق کی بھی بات ہوتی اور پھر وہ چلے جاتے۔ میں کافی دیر بیٹھا رہا مگر اس نے کہا: "ہمارا بوس بڑا بد دماغ ہے اور مجھ سے تو خاص طور پر فرنٹ رہتا ہے۔ اس لئے اگر تم چلے جاؤ

تو اچھا ہے اور اب یہاں آنے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔"

جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو مجھے اس کے چہرہ پر ایک سختی محسوس ہوئی اور اس سختی کی وجہ سے اس کی شکل کے وہ سب نقائص جو میرے جذبۂ عشق نے چھپاتے تھے ابھر آئے۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہوئی اور اس کے پاس سے بھاگ آنا ہی اچھا معلوم ہوا۔

میں نے اپنے دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور اب وہاں جانے کی بجائے میں نئی جیٹی کے پل پر پہونچا اور وہاں پڑی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے دل کو ایک شاک سا لگا تھا مگر یہ کچھ زیادہ نہیں تھا اس لئے کچھ ہی دیر کے بعد جیٹی کی لہروں پر اس کا ہنسی سے کھلکھلاتا ہوا چہرہ نظر آنے لگا اور میں اسے دیکھتا رہا۔

پھر خراماں خراماں ٹاور تک آیا۔ یہاں بسیں آجا رہی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ اپنے گھر جانے والی بس پر بیٹھ لوں مگر ٹاور کی گھڑی پر نظر گئی تو محسوس ہوا کہ ابھی جلدی ہے اور میکلوڈ روڈ کے بائیں فٹ پاتھ پر خراماں خراماں چلتا ہوا مڑا اور فریر روڈ پر آگیا۔ یہاں صدر کو جانے والی ایک قریب قریب خالی بس پر لپک کر بیٹھ لیا اور صدر میں ریگل کے بس اسٹاپ پر اترا۔ مجھے کسی چیز کو دیکھنے سے سروکار نہ تھا اور نہ کسی چیز کو دیکھتا تھا۔ میں اسی کے خیال میں گم تھا۔ اس کا ناراض چہرہ کافی ڈھلا ہوا نظر آیا تھا مگر اب اس کا تصور رنگ سے بھر گیا تھا اور جو نقائص کچھ لمحوں کے لئے ابھرے تھے غائب ہو گئے تھے۔ اس کے چہرہ اور جسم کا ڈھلا پن پہاڑی ہی پر محسوس ہو گیا تھا مگر موقع اور وقت نے اور سب سے زیادہ جذبات کے سیلاب نے ان پر ایسا رنگ چڑھا دیا تھا کہ وہ دنیا کی حسین ترین چیز معلوم ہوتے تھے۔ دفتر میں اس کے رویہ نے اس حسین ترین تصویر پر پانی ضرور پھیر دیا تھا۔ مگر اب پانی پھرنے کے بعد زیادہ روشن تصویر آنکھوں کے سامنے آئی تھی اور ناراضگی سے تنی ہوئی بھویں اور شکن دار ماتھا ایک بالکل نیا اچھوتا کرشمہ نظر آنے لگے تھے۔ میرے تصور کی تصویر اور بھی زیادہ دلکش ہو گئی اور اس کو ذہن میں لئے ہوئے میں پیدل اپنے فلیٹ کی طرف چلتا رہا۔

……

میں اس کے فلیٹ پر یہ سمجھ کر گیا تھا کہ اب وہ ضرور آ گئی ہو گی اور کھانا کھانے کے بعد سو کر اٹھ بیٹھی ہو گی اور کچھ دیر شطرنج کھیل کر ہم ٹہلنے جائیں گے مگر فلیٹ میں پہونچتے ہی وہ عورت سامنے آئی جو اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ پہلے مسکرائی اور پھر زور سے ہنستی رہی۔

میں کچھ غصے میں واپس ہونے والا تھا کہ اس نے سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ ..... وہ تو آج شام کو بلکہ رات گئے آئے گی کیا معلوم رات بھر نہ آئے .... مجھے تم پر ترس آتا ہے۔"

میں اس طرح صوفے پر گر گیا جیسے بہت تھکا ہوا تھا۔ اس نے سامنے بیٹھ کر کہنا شروع کیا "تم بالکل جوان ہو تم پر مجھ کو ترس آتا ہے۔"

"میں آپ کے یہاں اتنے عرصہ سے آ رہا ہوں۔ آپ کا اور ان کا کیا رشتہ ہے۔"

"وہ میری بڑی بہن کی لڑکی ہے۔ اس نے مجھے اپنے لڑکے کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیا ہے۔"

"اس کا لڑکا؟"

"یہ لڑکا دیکھتے نہیں ہو۔ یہ اسی کا ہے۔ بارہ برس کا یہ ہے۔ تم اسے جوان سمجھ رہے ہو۔ تم سے بارہ یا پندرہ برس بڑی ہو گی۔ کاٹھی

اچھی ہے اس لئے معلوم نہیں ہوتی۔ کالے رنگ کے لوگ بہت دیر میں ڈھلتے ہیں۔ تم اس کے پیچھے جان دے رہے ہو۔ میری ایک اور بھانجی ہے کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کے ساتھ نکاح کر لو۔ وہ تمہارے جوڑ کی ہے۔ رنگ بھی صاف ہے۔ چلو تو آج ہی اس سے ملا دوں۔ تمہارے جوڑ کی رہے گی۔ یہ سب چکر چھوڑ دو بلکہ یہ آپ ہی آپ چھٹ جائے گا۔"

میں عجیب عالم میں آ گیا اور بجائے کچھ کہنے کے اک دم سے اٹھ کر فلیٹ سے باہر آ گیا۔ لڑکا ہاکی اسٹک لئے ہوئے آیا۔ اور میرے پاس سے گزرتا ہوا باہر چلا گیا۔

بلڈنگ سے باہر نکل رہا تھا کہ وقار صاحب جو سب سے نیچے کے فلیٹ میں رہتے تھے ساتھ ہو لئے اور ہنس کر بولے۔ "آج وہ تمہاری استانی ساتھ نہیں ہے"۔

"استانی؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں وہ استانی ہی ہے تم کو اب تک کچھ معلوم نہیں۔ میں عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ سچ مچ استانی تھی۔ ایک اسکول میں عرصہ تک پڑھاتی رہی۔ پھر ملک سے باہر چلی گئی اور ایک لڑکا لے کر آئی۔ کہتی ہے کہ امریکہ میں ایک شخص سے شادی ہوئی تھی۔ وہ یہاں آنے کو نہیں کہتا تھا اس لئے لڑکا لے کر چلی آئی۔ اسکول کی نوکری چھوڑ کر اب ایک فرم میں نوکر ہے۔ مگر فطرت سے استانی ہی ہے۔ تم ایسے نوخیز لڑکوں کو درس دیتی ہے۔ دو چار دن تمہیں درس دیا اب اور کوئی پھنس گیا ہو گا اسے راہ پر لگا رہی ہو گی۔ مگر تم فکر نہ کرو تم کو وہ چھوڑنے والی نہیں ہے اور تم بھی اسے چھوڑ نہ سکو گے۔ آج نہیں کل پھر ملے گی اور تم زندگی بھر اس پہ ریجھے ہی رہو گے۔ دیکھتے جاؤ گے کہ کتنے آئے اور کتنے گئے مگر تم بھی کبھی الگ نہ ہو سکو گے . . . . . اچھا اب مجھے ادھر جانا ہے۔"

وہ لپکتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف گئے اور میں سوچتا ہوا خراماں خراماں آگے بڑھا۔ میرے خیالات میں اب ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ تصور میں اس کا چہرہ آیا تو کافی بدنما معلوم ہوا۔ مجھے کسی اور عورت کا تجربہ نہیں تھا اور اسی کے تجربہ کو میں عام سمجھ رہا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے بہتر بھی عورتیں ہیں۔ ہر معنی میں بہتر۔ میں بازار میں آیا جہاں بڑی بھیڑ اور چہل پہل تھی۔ کثرت سے عورتیں آ جا رہی تھیں۔ ہر عورت کو غور سے دیکھتا اور دل یہ کہتا "یہ اس سے تو اچھی ہے"۔ دو چار تو بہت زیادہ اچھی معلوم ہوئیں اور وہ ان کے سامنے وہ ڈھلی ہوئی معلوم ہوئی۔ میرے لئے اس کی طرح جوان بنی ہوئی اور حقیقت میں جوان عورتوں میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں تھی مگر پھر بھی ایک یا دو عورتیں ضرور ایسی نظر آئی تھیں جو صاف صاف اس سے چھوٹی اور باکرہ ضرور تھیں۔ ان ہی کا تصور لئے ہوئے میں گھر لوٹا۔

. . . .

کافی رات گزر چکی تھی مگر میں نے اپنے فلیٹ کا دروازہ نہیں بند کیا تھا کہ اکدم سے وہ دندناتی ہوئی میرے فلیٹ میں آئی اور نہایت بیباکی سے میرے پلنگ پہ آ کر بیٹھ گئی۔ میرا یہ عالم ہوا کہ ؎

گلہ کیسا وفور شوق میں جی نکلا پڑتا ہے
قیامت کا اثر رکھتا ہے آنکھیں چار ہو جانا

میرے ذہن میں اس کا جو بدنما تصور قائم ہوا تھا وہ ایک دم سے مٹ گیا اور اس کا چہرہ بالکل نئی طرح پر روشن ہو گیا۔

"تم مجھ سے خفا ہو گئے۔ اس میں آخر بات ہی کیا ہے۔"

"نہیں خفگی کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میں زندگی بھر تم سے خفا نہ ہوں گا۔ مگر جب سے تمہارا ساتھ رہنے لگا ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ہی ساتھ رہو۔"

"یہ تمہاری غلطی ہے۔ ناتجربے کاری۔"

"ہاں تم تو بڑی تجربہ کار ہو۔ استانی رہ چکی ہو اور اب بھی استانی ہی ہو۔"

"ہاں مجھے استانی ہی سمجھو میں تم کو اور تمہارے ایسے لڑکوں کو جنسی تربیت دیتی ہوں۔ نہ معلوم کتنے لڑکوں کو راہ پر لگا دیا۔ تم کیا سب ہی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جتنے جوان ہوتے ہو اتنے ہی زیادہ دھوکے میں آتے ہو مگر جوں جوں بڑھتے جاتے ہو اور تجربہ کرتے جاتے ہو ان دھوکوں سے نکلنے کے زیادہ قابل ہوتے جاتے ہو۔ قوت فیصلہ۔ توازن وغیرہ آتے جاتے ہیں۔ میں اس راہ میں تم ایسے نوخیز لڑکوں کی مددگار ہوں۔ یہی میرا مشن ہے۔ میری خالہ اور سب ہی عورتیں اس بات کو نہیں سمجھتیں۔"

جب وہ یہ سب کہہ رہی تھی تو میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم اور چہرہ کے نقائص جن پر زیادہ توجہ ہو گئی تھی ایک ایک کر کے غائب ہوتے گئے اور پھر وہ اتنی سی اچھی لگنے لگی جتنی پہلے لگی تھی۔ اور پھر میں وارفتہ ہو گیا۔

.. ..

یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ میری نہیں ہو سکتی اور وہ کسی ایک کی ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میرے ایسے مجھ سے کچھ بڑے یا کچھ چھوٹے لڑکے نہ معلوم کتنے اس کے پاس آتے اور وہ ان کے ساتھ سیر کرنے جاتی۔ ان لڑکوں کے ساتھ جاتے ہوئے میں نے اسے بارہا دیکھا اور اس نے مجھ سے اس طرح رخ پھیر لیا کہ جیسے مجھے جانتی ہی نہیں تھی۔ ایسے نہ معلوم کتنے موقعے آئے۔ پہلے پہلے مجھے برے لگے مگر پھر میں ان کا بڑی آسانی سے روادار ہوتا گیا اور ان لڑکوں سے الگ ہو کر وہ نہایت درجہ کھل کر مجھ سے ملتی۔ میرے فلیٹ میں بڑی بیباکی سے گھسی ہوئی چلی آتی۔ دروازہ بند کر دیتی اور میرے پاس مجھ سے مل کر بیٹھ جاتی۔ ہر بار وہ کچھ نہ کچھ زیادہ حسین معلوم ہوتی۔ سیاہ رنگ پر بڑی خاص رونق نظر آتی کبھی وہ مجھ سے بڑی اونچی معلوم ہوتی اور میں اس کے سامنے جھک جاتا کبھی وہ مجھ سے بہت زیادہ چھوٹی نظر آتی اور میں اس پر حاوی ہو جاتا۔ یہ عجیب بات تھی۔ اس کا چہرہ ہی وہ کرشمہ نہیں تھا جو مجھے سب کچھ بھلا دیتا تھا بلکہ اس کا سارا وجود ایک ایسا کرشمہ تھا جو حقیقت کی دنیا سے بہت دور ایک عجیب اور دلکش عالم کا نمائندہ معلوم ہوتا تھا۔ میں سوچنے لگا تھا کہ اس کے کثرت سے لوگوں سے تعلق سے کیا فرق پڑتا تھا اور لوگ اس کے پاس آتے تھے اور چلے جاتے تھے مگر میرے پاس وہ خود آتی تھی اور ہر پھیرے مجھے زیادہ سے زیادہ متاثر کر جاتی تھی۔

اس کی صورت کے وہ نقائص جن کو میں نقائص مانتا تھا رفتہ رفتہ اوصاف میں تبدیل ہوتے گئے۔ پختہ سیاہ رنگ میں ایسی چمک آ گئی کہ مجھے گورے اور سانولے رنگوں سے نفرت ہوتی گئی۔ اس کا مخصوص ناک نقشہ ہی میرے لیے ایسا ماڈل ہو گیا جس سے میں اوروں کی صورتوں کو ملاتا اور ناقص پاتا۔ مجھے کسے ہوئے جسم کی جوان لڑکیاں بھی دکھائی دیتیں۔ اس کی خالہ نے اپنی

دوسری بھانجی سے بھی مجھ کو ملوایا۔ یہ گورے رنگ کی چھوٹے قد کی بالکل جوان لڑکی تھی، جو پہلے پہلے مجھ سے بڑی شرمائی اور پھر کھلتی گئی۔ اس کا امتحان قریب آیا تو میں اسے اس کے گھر پڑھانے جانے لگا۔ اس کا دُبلا کسا ہوا جسم اس کی خالہ زاد بہن کے ڈھلے ہوئے جسم کے مقابلہ میں بہت زیادہ دلکش نظر آتا۔ وہ مسکراتی بھی تھی مگر اس مسکراہٹ میں وہ بے باکی اور لگاؤ نہیں تھا۔ جو اس کی بہن کے یہاں دل کے لیے مقناطیس کا کام کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں دونوں کی ہر چیز کا شعوری اور لاشعوری دونوں طور پر مقابلہ کرتا گیا۔

دونوں سے ملاقاتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ ایک دل میں زور کے ساتھ داخل ہوتی تھی مگر تھوڑی دیر میں پھڑپھڑا کر نکل جاتی تھی بلکہ اکثر غائب ہو جاتی تھی۔ دوسری دل میں گھستے ہوئے ڈرتی رہی بلکہ وہ اگر گھس آتی تو وہاں ہمیشہ کے لیے دبک کر بیٹھ جاتی اور وہیں رہتی۔

بہن پاس ہو گئی اور خالہ نے مجھے اشارہ دیا کہ شادی کا پیغام دوں۔ اسی زمانہ میں ایک ملاقات میں اس نے مجھ سے کہا "ہم لوگوں کو ہر سال چھٹی ملتی ہے ایک مہینہ کی" تاکہ تفریح کریں اور میں اب ایک مہینہ کے لیے لاہور وغیرہ جا رہی ہوں"۔

میں اسے اسٹیشن پہنچانے گیا۔ جب گاڑی چھٹی تو وہ کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ جوں جوں گاڑی آگے کھسکتی ووں ووں اس کے چہرے کا تاثر زیادہ دلکش ہوتا گیا۔ مسکراتا ہوا چہرہ غور سے دیکھتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں میرے تصور میں ایسی جم گئیں کہ پورے مہینے میں ان پہ سر دھنتا رہا۔ اس کی خالہ زاد بہن باوجود بھری جوانی اور گٹھے ہوئے جسم کے اچھی نہ لگی اور اس کا ڈھلا جسم تصور میں زیادہ سے زیادہ لذیذ ہوتا گیا۔

.. ..

وہ مہینہ عجیب کشمکش کا تھا۔ ایک طرف اس کا جاتے وقت کا چہرہ سر پہ سوار رہتا۔ دوسری طرف اس کی خالہ اور خالہ زاد بہن نے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ دونوں میرے فلیٹ میں آ جاتیں اور ایسا بھی ہوا کہ خالہ بھانجی کو چھوڑ کر چلی بھی جاتی۔ میرے تخیل کی صورت اور سامنے کی حقیقی صورت میں ایک کشمکش رہتی۔ ایک ڈھلی ہوئی دوسری کسی ہوئی۔ مگر میرے لئے کون دلکش تھی۔ پہلی بیباک تھی اور اسی تعلق کے سبب کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کرتا تھا۔ دوسری ایک جال یا پھندا تھی جو ایسا گلے میں پڑتی کہ دم گھٹ ہی کر رہ جاتا۔ میں اسے چھوتا تو کیا غور سے دیکھتے ہوئے بھی ڈرتا۔

میں زیادہ سے زیادہ وقت دفتر میں گزارتا اور اس کے بعد اکیلا ٹہلنے نکل جاتا۔ اب ایک نہیں بلکہ دونوں کی تصویریں سامنے آتیں معلوم ہوتا کہ دونوں اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی ہیں اور میں دونوں سے بھاگ رہا ہوں یا یوں سمجھیے کہ پہلی کے سلسلے میں پکڑے جانے کا سوال ہی نہیں۔ کوئی ذمہ داری نہیں جب جی چاہے لے جب جی چاہے الگ مگر دوسری جال میں ایسا گرفتار کرنا چاہتی ہے کہ کبھی نہ نکل سکوں۔ پہلی دور تھی اور تخیل میں اس کی تصویر زیادہ سے زیادہ حسین ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری حقیقت میں اس سے زیادہ حسین تھی مگر برابر بدنما ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی سے شروع ہی سے کھل کر مل گیا تھا۔ دوسری کے ساتھ کھلنے میں ڈر لگتا تھا پہلی کے ساتھ شادی کا سوال ہی نہ تھا۔ دوسری شادی ہی کے لئے میری طرف دوڑائی گئی تھی۔

اسی دوران میں نہ معلوم کس طرح میرے والدین کو خبر ہوگئی ۔ انہوں نے مجھے سکھر بلایا اور باتوں کے بعد ایک دن والد نے کہا ” میں نے سید صاحب کی لڑکی کے ساتھ تمہاری شادی طے کر لی ہے ۔ مجھے معلوم ہوا کہ تم کراچی میں واہی تباہی پھر رہے ہو ۔ ایک بدمعاش عورت کے فلیٹ میں جاتے تھے وہ کہیں چلی گئی اب اس کی بہن تمہارے فلیٹ میں آتی ہے ۔ میں تمہاری زندگی یوں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا ۔ میرا فرض ہے کہ تم کو راہ پر لگاؤں ۔ یا تم اپنی رائے سے ان دونوں کو چھوڑ کر کسی سے شادی کر لو یا پھر میرے کہنے پر چلو ۔“

میں نے سید صاحب کی لڑکی انجم کو بھی کالج سے آتے ہوئے دیکھا ۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا ۔ وہ ان دونوں سے زیادہ دلکش معلوم ہوئی جو میرے ذہن میں عجیب طرح کشمکش کر رہی تھیں ۔ میں نے آٹھ دن کے اندر یہ محسوس کیا کہ انجم ان دونوں کو دھکیل کر میرے ذہن پر حاوی ہو گئی ۔

چلتے وقت میں نے والد سے کہا ” میں کراچی کی زندگی سے عاجز ہوں ۔ اگر یہاں کوئی کاروبار یا آمدنی کا ذریعہ نکلے تو فوراً یہاں آجاؤں گا ۔“

کراچی واپس آکر میں نے خالہ سے کہہ بھی دیا ” میں اب یہاں کی نوکری چھوڑ دوں گا ۔ سکھر میں ہی رہوں گا اور کوئی کاروبار کروں گا ۔“

خالہ اور بھانجی دونوں دنگ رہ گئیں اور بھانجی فلیٹ سے اپنے گھر چلی گئی اور میرے ذہن سے غائب ہوگئی مگر اس بڑی بھانجی کا جو لاہور گئی تھی جاتے وقت کا تصور میرے ذہن پر حاوی رہا ۔ ظاہر تھا کہ انجم اور اس کے ساتھ شادی کر کے سکھر میں رہنے کا خیال غالب آگیا مگر بار بار یہ بھی خیال آیا کہ اس پہلی محبوبہ کو بھی دیکھ لوں جو میرا پہلا جنسی تجربہ تھی اور جس کا تصور مجھے عجیب طرح سے باندھے ہوئے تھا ۔

……

کینٹ اسٹیشن پر میں تیز رو کے آنے کا انتظار کر رہا تھا ۔ کیوں ؟ وہ آرہی تھی ۔ اس سے کیا غرض تھی ؟ کچھ نہیں ۔ ملازمت سے بھی میں نے چھٹی لے لی تھی ۔ جتنی بھی چھٹی مل سکتی تھی سب ہی جمع کر کے لے لی تھی ۔ اپنے فلیٹ کا بھی ایک صاحب سے سودا کر لیا تھا ۔ میں چلا بھی گیا ہوتا ۔ مگر اس کا جاتے وقت کا چہرہ ایسا سر پہ سوار تھا کہ اسے ایک دفعہ اور دیکھے بغیر میں نہیں جا سکتا تھا ۔ دل کہہ رہا تھا بس ایک دفعہ اور آخری دفعہ ۔ آنے کی اطلاع اس نے مجھے ہی دی تھی ۔ میں نے اس کی خالہ کو بتایا تھا تو وہ بولی تھیں ” آپ آ جائے گی ۔ اسٹیشن جانے کی کیا ضرورت “ مگر میں نے اپنی سکھر کو روانگی اس کے آنے تک ملتوی کر دی تھی ۔ اس کے ساتھ گزاری ہوئی سب ہی یادیں آرہی تھیں ۔ اس کی بہن سے اس کا مقابلہ بھی ہو رہا تھا ۔ انجم بھی یاد آتی اور اس کے ساتھ زندگی کے خواب بھی ابھرتے ۔ مگر ایک آخری ملاقات ۔ آخری دیدار کے لئے دل تڑپ رہا تھا ۔ اس کا سن اور اس سن کی وجہ سے نقائص کا بھی پورا احساس تھا اس کے ساتھ مستقل رہنے کا خیال بھی ممکن نہ تھا ۔ مگر پھر بھی دیکھ لینا ضروری تھا . . . . . .

گھنٹی بجی ریل آتی دکھائی دی ۔ سب مسافر کھڑے ہو گئے ۔ انجن میرے سامنے سے سنسناتا ہوا گزرا ۔ کھڑکیوں سے

بہت سی شکلیں جھانک رہی تھیں۔ گاڑی رک گئی۔ میں پیچھے والے کمپارٹمنٹس میں جھانکتا ہوا آخر تک پہنچ گیا۔ ایک کمپارٹمنٹ میں وہ نظر آئی۔ کیا وہی تھی؟ وہی جس کو میں نے اتنی بار دیکھا تھا اور جس کا اتنی دیر سے بیقراری کے ساتھ انتظار کرتا رہا تھا؟

"اچھا تم آگئے؟" اس نے ڈبہ سے اترتے ہوئے کہا۔

میں اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سب نقائص جن کو میری نظر ٹال جایا کرتی تھی بہت زیادہ نمایاں تھے۔ چہرہ کی کھال لٹکی ہوئی۔ سیاہ رنگ کی چمک پر لدی پڑی ہوئی تھی گالوں میں گڑھے صاف نمایاں۔ دل نے کہا "کیا اسی کو دیکھنے کے لئے بیقرار تھے"۔ جی چاہا کہ اس کی طرف سے منہ پھیر لوں۔

قلی نے اس کا سامان اٹھایا اور وہ باہر کی طرف چلی۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ اس کے جسم پر نگاہ جاتی تو وہ کافی ڈھلا معلوم ہوتا۔

اسٹیشن سے نکلتے ہوئے میں نے کہا: "میں نے لمبی چھٹی لے لی ہے اور گھر چلا بھی جاتا جہاں میں ہمیشہ رہنے کی طے کر چکا ہوں فلیٹ ایک دوست کو دے دیا ہے۔"

اس نے نہایت بے پرواہی سے کہا: "اچھا۔ اچھا۔"

"اور وہاں میری اپنی کزن انجم سے شادی بھی ہو جائے گی۔"

"یہ تو بہت ہی۔ بہت ہی اچھا ہو گا۔ مبارک ہو، بہت مبارک ہو۔"

اس نے ایک ٹیکسی میں اپنا سامان رکھوایا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

حالانکہ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر جاؤں مگر میں امید کر رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہے گی۔

مگر اس نے بیٹھ کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا چلو اور نہایت سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے کہا "اچھا خدا حافظ"۔

"خدا حافظ" میرے منہ سے بھی میکانیکی طرح پر نکل گیا۔

دلی شہر میں ایک حادثہ

کرتار سنگھ دُگل

ریڈیو پر خبر تھی۔ جن پتھ اور راج پتھ کے چوراہے میں کل رات ایک موٹر اور ٹرک کی ٹکر ہو گئی۔ موٹر، دیوان چند پوری سسٹم کا کوئی ملازم چلا رہا تھا۔ اُس کی جائے واردات پر ہی موت واقع ہو گئی۔ مرحوم اپنے پیچھے تین اسکول میں جانے والے بچے اور بیوی چھوڑ گئے ہیں۔ ٹرک کا ڈرائیور فرار ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔

موہن لعل ملہوترا نے یہ خبر سُنی اور چائے کا چمچ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی بیوی اور بچے پہاڑ گئے ہوئے تھے کتنی دیر تک اُسے اپنے بچے یاد آتے رہے۔ اور پھر اُس نے انھیں شملہ ٹیلی فون کیا۔ اپنی بیوی کو ہدایتیں دیتا رہا، لوٹتی بار ٹیکسی میں نہ آئیں ٹرین میں آئیں۔ شملہ میں سیر کرتے ہوئے بچوں کو پیچھے دلی سڑک پہ نہ جانے دیا جائے۔

" زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔!" اُس دِن دفتر میں کام کرتے ہوئے اُس نے کئی بار یہ بات کہی۔ کئی لوگوں سے رات کے حادثے کا ذکر آیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا موٹر والا شراب میں دھت تھا۔ کوئی کہتا دوش ٹرک والے کا ہے۔ ٹکر اس قدر شدید ہوئی تھی کہ موٹر دوہری ہو گئی تھی۔ ٹرک نے سڑک پر لگی لال پیلی بتی کا کھمبا اکھاڑ کر پرے پھینک دیا تھا۔ آدھی رات کا عمل تھا۔ نہ آدمی! نہ آدم زاد۔

" سڑک پر خون کی تلیا بن گئی ہے۔"

" ٹرک والا کہاں جائے گا۔ آج نہیں تو کل پکڑا جائے گا۔

بے چارہ گھبرا گیا ہوگا۔ کئی بار اِس طرح کے حادثے کے بعد لوگ ڈرائیور کو پکڑ کر ایسا پھینٹتے ہیں کہ وہ ادھ مرا ہو جاتا ہے!"

" ٹرک کا کچھ نہیں بگڑا۔ صرف پگ ڈنڈی پہ جا چڑھا ہے۔"

" میں ہوتا تو ٹرک کو لے کر اُڑ جاتا!"

" پکڑا جاتا تو پھر بھی جاتا۔ ٹرک پر گڈھے پڑ گئے ہیں۔"

" میں ہوتا تو ٹرک کو موقع پر سے بھگا کر لے جاتا پھر چاہے کھائی میں لڑھکا دیتا۔ حادثے میں خون کے الزام سے تو بچ جاتا!"

مسٹر ملہوترا کو یتیم ہو گئے بچوں کا دھیان آ رہا تھا معصوم جان، ماں چاہے لاکھ پیار کرنے والی ہو، باپ کے بغیر بچے کہیں کے نہیں رہتے کون انھیں پڑھائے گا؟ کون اُن کی دیکھ بھال کرے گا؟ پتا نہیں ان میں بیٹیاں کتنی ہیں، بیٹیوں کی ذمہ داری اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔

مسٹر ملہوترا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

”دو بیٹے اور ایک بیٹی۔“

”کیا تم انھیں جانتے ہو؟“

”نہیں، آجکل فیشن ہی دو بیٹے، ایک بیٹی کا ہے!“

مسٹر ملہوترا کو، اُس کے ساتھیوں کا حادثے میں مارے گئے کسی کے بارے میں اِس طرح باتیں کرنا عجیب لگ رہا تھا۔ اُسے بار بار اپنے بچے یاد آ رہے تھے۔ شاید اِس لئے کہ اُس کے اپنے بھی تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ پہلے ایک بیٹا ہُوا، پھر ایک بیٹی۔ پھر ایک بیٹا۔

مسٹر ملہوترا سوچتا، اب اُن بچوں کی ماں سنگار نہیں کرے گی۔ سادہ کپڑے پہنا کرے گی۔ کہیں نوکری کرے گی۔ ہو سکتا ہے کسٹم والے ہی اُسے کوئی چھوٹی موٹی نوکری دے دیں۔ آج کل یوں ہو جاتا ہے کہ جب کوئی ملازم یوں مر جاتا ہے، سرکار اُس کے کنبہ کی گذر اوقات کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیتی ہے۔ آخر بچوں کو پڑھانا ہوگا، اُن کی بیاہ شادیاں کرنی ہوں گی۔

”آپ بھی کس سوچ میں ڈوب رہے ہیں۔ محکمہ کسٹم کا افسر تھا، اُسے پیسوں کی کیا کمی؟“

”سرکاری ملازم آجکل بھوکے ننگے ہوتے ہیں!“

”نہیں، نہیں یہ تو بڑے شاہی ٹھاٹ باٹھ سے رہتا تھا۔ مجھے نام بھول رہا ہے اُس بستی کا، جس میں اِس کی کوٹھی تھی۔“

”موٹر بھی بدیسی تھی، چاہے بیوی بھی بدیسی ہو!“

”بیوی بدیسی ہوئی تو اپنے دیش چلی جائے گی!“

”— اور ساتھ بچوں کو بھی لے جائے گی۔“

کوئی مر گیا تھا، بے وقت موت! کوئی گھر برباد ہو گیا تھا اور یہ لوگ کس طرح فضول باتیں کر رہے تھے۔ مسٹر ملہوترا کو اپنے دفتر کے ساتھیوں پر افسوس ہو رہا تھا۔

ٹفن کے لئے اپنے ساتھی افسروں کے ساتھ بیٹھا، مسٹر ملہوترا کبھی کچھ منہ میں لیتا، کبھی کچھ۔ اُسے ہر چیز پھیکی پھیکی سی بےمزہ سی لگ رہی تھی۔ بار بار ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کی کچلی ہوئی کھوپڑی اُس کی آنکھوں کے آگے گھوم جاتی، ٹوٹی ہوئی ٹانگیں، لت پت چھاتی مسٹر ملہوترا سوچتا، شاید اِسی لئے کہ اُس کے اپنے تین بچے تھے، چھوٹے چھوٹے اسکول میں جانے والے تین معصوم بچے۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو اُن کا کیا ہوگا؟

”ضرور اُس نے بیمہ کروا رکھا ہوگا!“

”ہاں ہاں کسٹم کا افسر تھا، بیمہ تو ضرور کروایا ہوگا۔“

”پھر تو جو پیچھے بچے ہیں مالا مال ہو جائیں گے!“

" اُن دنوں ہم پالم رہتے تھے۔ ایک پائیلٹ کا حادثہ ہوگیا، بیچارے کی جان چلی گئی۔ ہم سب کو بڑا افسوس ہوا۔ سارے بڑے افسر پریشان تھے۔ اُس کے بھی تین بچے تھے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی بچوں کی ماں کو بیمہ کمپنی اور سرکار کی طرف سے کوئی دو لاکھ روپیہ ملا۔ کچھ ہفتے بیتے کہ اُس نے موٹر خرید لی اور کچھ ہفتے بیتے تو ہر شام اُس نے ہوٹلوں میں جانا شروع کر دیا۔ کبھی کسی پارٹی میں جا رہی ہوتی تو کبھی کسی ناچ گانے میں شامل ہوتی۔ تین مہینے نہیں بیتے تھے کہ سننے میں آیا کہ اُس نے کسی کے ساتھ بیاہ کر لیا ہے۔"

" جس عورت کے پاس دو لاکھ روپیہ ہو، کون اُس سے بیاہ نہیں کرے گا؟"

مسٹر ملہوترا کا منہ لال سُرخ ہوگیا۔ کس طرح بیہودہ باتیں اسکے ساتھی کر رہے تھے۔ کوئی مر گیا تھا اور اُن کو مذاق سوجھ رہا تھا۔ اُس نے شکر کیا کہ ٹفن کا وقت ختم ہوا۔ اور وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

" میری جان میں تم سے ٹیلی فون پر بات کر چکا ہوں!" مسٹر ملہوترا اپنی بیوی کو چٹھی لکھ رہا تھا۔ "ساری بات ٹیلی فون پر ہو نہیں پائی، اس لئے میں نے سوچا، خط ہی لکھ دوں۔ آج دلّی میں ایک دردناک حادثہ ہو گزرا ہے اور دفتر میں میرا جی نہیں لگ رہا۔ کوئی دیوان چند پوری محکمہ کسٹم کا افسر، کل رات کناٹ پلیس کی طرف سے آ رہا تھا۔ اُس کی موٹر کی کسی ٹرک کے ساتھ جن پتھ اور راج پتھ کے چوراہے پر ٹکر ہوگئی۔ بیچارہ کسٹم کا افسر وہیں کا وہیں ختم ہوگیا۔ پیچھے تین بچے چھوڑ گیا ہے اور بیچاری بیوہ! اسی لئے تو میں نے ٹیلی فون کیا تھا۔ آجکل یہ ٹرک والے بڑے لاپروا ہو گئے ہیں۔ تم لوگ پہاڑ پر بیٹھے ہو۔ میرا دھیان ہر وقت تم سب میں رہتا ہے۔ سیر کرنے کے لئے نکلو تو اپنا اور بچوں کا دھیان رکھنا۔ شملہ کی مال روڈ پر چاہے موٹریں نہیں چلتیں لیکن کئی بار گھوڑے بھی بدک جاتے ہیں۔ پہاڑی پر چڑھتے اُترتے وقت پاؤں ہی پھسل جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، یوں یہاں بیٹھا پریشان ہو رہا ہوں، ہفتہ دس دن کی چھٹی لے کر خود ہی کیوں نہ آ جاؤں؟ اور پھر لوٹتی بار تم سب کو سنبھال کر لے آؤں گا۔ میں تو باٹرین میں آؤں گا۔ ان بس والوں پر مجھے کوئی بھروسہ نہیں ....!"

مسٹر ملہوترا اپنی بیوی اور بچوں کو کتنی ہی دیر تک چٹھی لکھتا رہا۔ اُس نے شملہ جانے کے لئے عرضی لکھی اور چپڑاسی کو ریل ٹکٹ خریدنے کے لئے بھیج دیا۔

اتنے میں کوئی خبر لے کر آیا کہ مسٹر پوری دفتر سے لوٹ رہا تھا۔ آجکل سرکاری افسروں کا بُرا حال ہوتا ہے۔ آدھی رات تک اپنے عملے کو بٹھائے کام کرتا رہا۔ گھر لوٹتے وقت راستے میں حادثہ ہوگیا۔

" لیکن سوال یہ ہے کہ کسٹم کا دفتر کہاں اور حادثے کی جگہ کہاں؟"

" راستے میں کناٹ پلیس گیا ہوگا کوئی چیز خریدنے!"

" آدھی رات کون سی دُکانیں کھلی رہتی ہیں؟"

" یار تم لوگ تو ایسے جرح کر رہے ہو جیسے کوئی حادثے میں نہ مارا گیا ہو بلکہ قتل کر کے فرار ہوگیا ہو۔" مسٹر ملہوترا اپنے ساتھیوں پر حیران ہو رہا تھا۔

" بھائی میری تو ایسے سرکاری ملازم سے کوئی ہمدردی نہیں جو آدھی رات تک بیٹھا دفتر میں کام کرتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کا

حق مارتا ہے۔"

"تم لوگ بڑے بے رحم ہو!" شام کو گھر لوٹتے وقت وہ اپنے ساتھیوں پر خفا ہونے لگا۔ "کوئی آدمی مر گیا ہے، کسی کا سہاگ لٹ گیا ہے۔ کئی بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ ہنستے بستے کسی آنگن میں اندھیرا چھا گیا ہے، کسی کی دنیا ویران ہو گئی ہے۔ اُس بیوی کا سوچو جو اپنے گھر والے کی راہ دیکھ رہی ہوگی اور اُس کے بچوں کا باپ اب کبھی نہیں لوٹے گا۔ اُن معصوم بچوں کا سوچو جو اب کسی کو پتا کہہ کر پکار نہیں سکیں گے، جن کے ارمان مسل کر رکھ دیئے گئے ہیں ....!"

کتنی ہی دیر یوں جذباتی ہو کر مسٹر ملہوترا بولتا رہا۔

اور پھر راستے میں منڈی آ گئی۔ کوئی کسی دکان میں اور کوئی کسی دکان میں پھل اور سبزیاں خریدنے چلا گیا۔ مسٹر ملہوترا نے ڈھیر سارا پھل اپنے بچوں کے لئے خریدا۔ ابھی اور خریدے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ شملہ کے لئے کل گاڑی پکڑے۔

اُس کی بیٹی کو ختائیاں بہت پسند تھیں۔ اُس نے ختائیوں سے دو لفافے بھروا لئے۔

اور مسٹر ملہوترا کو پھر وہ بچے یاد آنے لگے جن سے اُن کا باپ چھن گیا تھا۔ اب اُن کے لئے کوئی ختائیاں خرید کر گھر نہیں لایا کرے گا۔

مسٹر ملہوترا سوچتا۔ اُس نے ختائیوں کے دو لفافے کیوں لئے تھے؟ پتا نہیں کیوں؟ اُس کی بیٹی کے لئے تو ایک ہی لفافہ کافی تھا۔ اُس کے بیٹوں کو ختائیاں خاص پسند نہیں تھیں۔ اور شملہ جیسی جگہ میں ختائیاں زیادہ دیر رکھی جائیں تو خستہ نہیں رہتیں۔

اُس رات کھانے کی میز پر اُسے لگا جیسے اُن کا نوکر کچھ زیادہ ہی خاموش ہو۔ ویسے ہر وقت اُس کی زبان چلتی رہتی تھی۔ اپنے آپ سے ہی بولتا رہتا تھا۔ اور کوئی نہ ہوتا تو رسوئی میں کام کرتے ہوئے۔ آگ، پانی اور برتنوں سے باتیں کرتا رہتا۔ آج غیر معمولی طور پر چپ تھا۔ مسٹر ملہوترا نے اس طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے آپ کو اُس میں دیکھ رہا ہو۔

کھانا ختم ہوا تو اُس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ گھر کی خاموشی سے اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اُس نے سوچا، کچھ من بہل جائے۔ خبریں آ رہی تھیں۔ اور پھر ٹیلی ویژن پر اُس حادثے کی تصویر دکھائی گئی۔ موٹر دوہری ہوئی پڑی تھی۔

"صاحب یہ ہمارے پڑوسیوں کی موٹر ہے!" نوکر نے اُسے بتایا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک اُٹھا۔

"آپ کو پتا نہیں کیا، پوری صاحب جو ساتھ کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ اُن کا حادثہ ہو گیا ہے۔ صاحب بڑا ظلم ہوا ہے چھوٹے چھوٹے اُن کے بچے ہیں!"

"ساتھ کے کس فلیٹ میں؟"

"ایک ہی تو فلیٹ ہمارے ساتھ لگتا ہے۔ بیچ میں دیوار سانجھی ہے۔ شاید آپ کی اُن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟"

"وہ نیلے رنگ کی جن کی موٹر ہے؟"

"ہاں صاحب بڑا ظلم ہوا ہے۔ سارا دن لوگ اُن کے ہاں آتے رہے ہیں۔ رو رو کر بیوی کا بُرا حال ہو گیا ہے۔"

"جبھی تو صبح باہر موٹریں اکٹھی ہو رہی تھیں۔"

گھر والے اُس وقت لاش لینے ہسپتال گئے ہوئے تھے۔

"کب سے یہ لوگ اِس فلیٹ میں رہتے ہیں؟"

"وہ تو کب سے یہاں رہ رہے ہیں، شاید ہم سے بھی پہلے.....!"

"ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ نہ وہ کبھی آئے، نہ ہم ہی کبھی اُن کے ہاں گئے!"

"صاحب آپ کو اُن کے گھر ہو آنا چاہیئے۔ پڑوس کا معاملہ ہے!"

"ہاں! ہاں!!" اور مسٹر ملہوترا سوچنے لگا کہ اُن سے تو تعارف نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد نوکر نے پھر یاد دلایا۔

"اب دیر ہو گئی ہے، صبح ہو آؤں گا!" مسٹر ملہوترا یہ کہہ کر سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ ساری رات اُسے لگا کہ جیسے سامنے دیواروں سے سسکیاں سنائی دے رہی ہوں۔

اگلے روز جب وہ شملہ کے لیے تیار ہو رہا تھا، نوکر نے پھر اُسے پڑوسیوں کے پرسے کے لئے یاد دلایا۔

ہر بار نوکر اِس کا ذکر کرتا، مسٹر ملہوترا خاموش ہو جاتا۔

تعارف ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ بنا جان پہچان کے اُن کے ہاں کیسے جاتا؟ مسٹر ملہوترا سوچ میں پڑ جاتا۔

اور پھر اِسی شش و پنج میں اُس کی گاڑی کا وقت ہو گیا۔ اور مسٹر ملہوترا شملہ اپنے بچوں کے پاس چلا گیا۔

کھلی آنکھ کا سپنا

سائرہ ہاشمی

دیکھو جوزفین احمد چاند سفید سے کے دو شاخے میں اٹکا رنگ و بُو میں ڈوبی اِس خوبصورت محفل کو دیکھ رہا ہے۔ خدا کی یہ کائنات اِس وقت کتنی دلنشیں اور پُرکشش لگ رہی ہے۔ خداوند جو سب کا خدا ہے اپنی اِس تخلیق پر کتنا خوش ہوگا۔ میں نے اِس خمار آلود محفل میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہوئے باہر دیکھا ہے اور اپنی ساتھی سے کہا ہے۔

" خداوند کسی کا خدا نہیں . . . خدا کہیں بھی نہیں . . . "۔ جوزفین احمد نے اپنی تراشیدہ زلفوں کو ہولے سے جھٹک کر جواب دیا ہے۔ " آتنی مایوسی " میں حیران ہوں۔

نہیں مایوسی اور اُمید دو متوازی لائنیں ہیں جو ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ لیکن میری زندگی میں یہ متوازی لائنیں غائب ہیں۔ صرف ایک سیاہ لائن ہے جو میری ساری زندگی کو اپنے دائرے میں لئے ہوئے ہے۔ اور میری زندگی کیا ہے صرف مایوسی سیاہ اور گہرا اندھیرا"۔ وہ مایوسی سے بولی اور پھر ہولے سے ہنس دی۔

میں نے جوزفین احمد کو دیکھا ہے۔ لیکن اُس کا جام ویسا ہی بھرا رکھا ہے۔ پھر اُس نے جام کو اپنی لمبی مخروطی انگلیوں میں تھام لیا ہے اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی ہے۔ وہ اپنے گرد بیٹھے لوگوں کو نہیں دیکھ رہی۔ میں بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔

جوزفین احمد! جوزفین احمد! میرا دل ہولے ہولے دھڑک رہا ہے۔ مدھم باس میرے چاروں طرف رچی ہے۔ اور میں جانتا ہوں اِس میں جوزفین احمد کے جسم کی مدھم باس بھی شامل ہے۔ مجھے لوگوں کے قہقہے سنائی نہیں دے رہے۔ شاید میں اپنے دِل کے جزیرے میں قید جوزفین احمد کا منتظر ہوں۔

میں اپنے جام کو تھامے اُس میں برف کو ہولے ہولے گھلتا دیکھ رہا ہوں، ہولے ہولے گھلتا۔ برف گھلتی جا رہی ہے۔ معدوم ہوتی جا رہی ہے اور میں یہ کیوں سوچ رہا ہوں کہ جوزفین احمد بھی اِس سفید اور یخ ٹکڑے کی مانند ایک روز معدوم ہو جائے گی اور اُس کی آنکھوں کی اُداسی کو سب بھول جائیں گے۔ شاید میں بھی!

سفید باوردی بیرے دبے قدموں چلتے اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ میں نے نئی بوتل کھولی ہے۔ میں جوزفین احمد کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اُس کی گہری اُداس آنکھوں میں کچھ ڈھونڈ رہا ہوں۔ اپنا آپ . . . . . اپنے وجود کا عکس . . . . . لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں۔ ایک خلا ہے . . . . ایسا خلا جو اُداسی کے ذرے سے تخلیق ہوتا ہے۔ وہ مجھے کیوں نہیں دیکھتی۔ کیا شراب کی مستی اُس کے غمزدہ دِل کو گرما نہیں سکی . . . . وہ کیوں لوگوں کی طرح میرے وجود سے آگاہ نہیں لگتی . . . . شاید میں زیادہ پی گیا ہوں . . . . لیکن نہیں۔ ہم دونوں کے جام ہمارے سامنے دھرے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف لوگ خوش ہیں . . . . لیکن ہم دونوں . . . . . .

میں کہنا چاہتا ہوں . . . . جوزفین احمد مجھے دیکھو۔ میری آنکھوں میں جھانکو . . . . لیکن میں لفظوں کا سہارا لئے بغیر اُس

تک پہنچنا چاہتا ہوں ..... اپنی ذات کے بھروسے۔ میں نے اپنے جام میں مئے کو انڈیلا ہے۔ لیکن بسکٹی رنگ کا ٹھنڈا لاوا میز کی چکنی سطح کو بھگو رہا ہے۔

طاہر نذیر ہوش میں آؤ۔ جوزفین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ہے لیکن اس کی آنکھیں ویسی ہی اُداس ہیں۔ جو قہقہہ اُس کے لبوں سے نکلا ہے۔ اُس میں خوشی کی جھنکار نہیں۔

جوزفین احمد جہاں تم ہوگی وہاں ہوش کا گزر نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی ہے ..... لوگ مدہوش ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی آواز میں اپنے اندر کی تمام چاہت کو سمو کر اُسے جواب دیا ہے۔ میری آواز بوجھل ہے۔ کیا میں غمزدہ ہوں ..... لیکن کیوں۔ قربان علی کی اس رنگ و بو کی محفل میں غم کا تو کہیں گزر نہیں۔ اور میں بھی ہمیشہ کی طرح خوشی کی تلاش میں ہوں۔ ایسی خوشی جو گرم قہقہوں اور جام کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ جو ساتھ بیٹھی خوبصورت عورت کے جسم سے ابھر کر ہمیں وقتی طور پر گھیر لیتی ہے۔

دیوار پر ٹنگی پینٹنگ میں پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ تند جھونکے سب کچھ اپنے ساتھ اُڑائے لئے جا رہے ہیں لیکن میں کیوں اس قدر ساکت و جامد ہوں۔ مجھے بھی باتیں کرنی چاہئیں۔ قربان علی کی اس قدر بڑی محل نما کوٹھی کی دوسری منزل کے لان کا سبزہ کس قدر ٹھنڈا ہوگا۔ سمندر سے آتی ہوا ریشمی پردوں کو اڑا رہی ہے اور ہنڈولوں کی خوبصورت روشنیاں ہلکورے لیتی سب وجودوں کو آپس میں گڈ مڈ کر رہی ہیں۔ میں نے لوگوں کی طرف دیکھنا چاہا ہے۔ لیکن جوزفین احمد؟ جو میرے اس قدر نزدیک ہے۔

” جوزفین تمہارا جادو مجھ پر چل گیا ہے۔“ میں نے آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ میں برف کے لوتھڑے میں حدت پیدا کرنی چاہتا ہوں۔ لیکن اُس نے بڑی لاپرواہی سے میری طرف دیکھا ہے اور وہ جام کو تھامے بیٹھی ہے۔ وہ پی نہیں رہی۔

” آؤ جوزفین احمد باہر چلیں۔“ دوسری منزل کی اِس لان کی سبز گھاس پر آسمانی ٹھنڈک دبے پاؤں اتر رہی ہے۔ نیچے گاڑیوں کے تیز ہارن ہیں۔ اور دور ہٹتی ہوئی اُن کی فلڈ لائیٹس اندھیروں کو منور کر رہی ہیں۔ چند جوڑے بازوؤں میں بازو ڈالے لان میں محو رقص ہیں۔ چاند نیچے تیراکی کے تالاب میں اُتر کر ساکن ہوا جیسا لگتا ہے۔

” آؤ جوزفین ہم نیچے اُس تالاب پر چلیں جس کے کنارے اندھیروں میں ڈوب گئے ہیں۔“ میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا ہے۔

اور مسز قربان علی نے اپنی منقش ساڑھی کا پلو اپنے بازو پر پھیلاتے ہوئے کہا ہے۔

” طاہر نذیر کیا تم میری دوست کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکتے ہو۔ سچی اور ہمیشہ رہنے والی مسکراہٹ اور تم دونوں کے جام بھرے کیوں رہتے ہیں۔ بھرے جام بد ذوقی کی نشانی ہیں۔“ مسز قربان علی کی مسکراہٹ کس قدر اشتہا انگیز ہے۔ لیکن جوزفین کا ہاتھ اس قدر ٹھنڈا! میں کسی اور طرف بھی تو بڑھ سکتا ہوں ..... پر ..... یہ عورت ..... میں وقتی طور پر ہی سہی لیکن اس کی گرفت میں ہوں .....

جوزفین احمد نے آگے بڑھ کر اُسے پیار کر لیا ہے اور مسکرا دی ہے۔ میں اور آگے جھک گیا ہوں۔

"جوزفین احمد تم اداس کیوں رہتی ہو؟ ..... تم کھل کر مسکراتی کیوں نہیں ہو؟ دیکھو" دلکش دھنیں ڈرائنگ روم دیواروں سے ٹکرا کر بکھرتی چلی جا رہی ہیں۔ لوگ ہنس رہے ہیں۔ پی رہے ہیں۔ وہ سب خوش ہیں۔

"طاہر نذیر تم خوبصورت باتیں کرتے ہو۔ لیکن میں کیا کروں ..... میرے اندر کا قید خانہ مجھے رہائی نہیں دیتا۔ میں سیتا کی طرح اس حصار میں قید ہوں ....."

"کیا تم کسی راون کی منتظر ہو۔ جوزفین میرے ساتھ آؤ میں تمھیں اس حصار سے باہر کھینچ لوں گا۔ میں راون ہوں۔" شاید میرا سر زیادہ پینے سے بوجھل ہے۔ نہ جانے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ہاں میں جوزفین احمد کے جادو کی گرفت میں ہوں ..... جوزفین احمد جو خوبصورت اُداس شہزادی کی طرح ایک ویران جزیرے کے اندھیروں میں قید لگتی ہے۔

اُس نے جام کو میز پر رکھ دیا ہے اور میرا ہاتھ تھامے اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ فرنچ طرز کی کھڑکیوں کے پٹ وا ہیں اور سمندر کی نم آلودہ ہوا اس کے گھنے بالوں میں گھس رہی ہے۔ میں نے باہر جاتے جاتے مڑ کر دیکھا ہے۔ لوگ پی رہے ہیں۔ اپنی اپنی ساتھی کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں .....

میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی زور زور سے قہقہے لگاؤں دیوانہ وار ناچوں ... لیکن جوزفین احمد کا ٹھنڈا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے اور اس کے اندر کی ٹھنڈک میرے جسم میں اُتر رہی ہے۔ اُس کے دل کا بوجھ ہولے ہولے مجھے دبا رہا ہے۔ میں باہر کھڑے ہو کر چاند کو دیکھ رہا ہوں .....

جوزفین چلتے چلتے رُک گئی ہے۔ "جوزی ..... آگے چلو .... اور آگے ...." لیکن وہ ساکت کھڑی ہے۔ اُس نے آہستہ سے اپنے کندھے پر لٹکتے اپنے پلو کو کھینچ کر سر پہ ڈال لیا ہے۔ اُس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے ہیں اور اُس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں۔ جیسے وہ کوئی مناجات دُہرا رہے ہوں میں نے اپنے پیچھے اُٹھتے شور کو نظر انداز کر کے ایک نئی پُرسوز آواز کو سُنا ہے۔ اذان کی مقدس آواز جو روز ہی ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ وہ لوگوں کے قہقہوں اور کھنکتے جاموں کو عبور کرتی ہوا کی خنکی میں گھل رہی ہے۔ پھر بھی مجھے جوزفین احمد کے رُکنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اُس کا پلو سے ڈھکا ہوا سر۔

پھر جیسے وہ چونک پڑی ہو۔ اُس نے جلدی سے پلو کو سر سے اتارا اور تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتی تیراکی کے خوبصورت تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی ہے۔ میں بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

"جوزفین احمد میں تمہارے اِس خود ساختہ قید خانے کو مِٹا دینا چاہتا ہوں۔" میں نے اُس کے پاس بیٹھ کر بڑی قطعیت سے کہا ہے۔

"طاہر نذیر کیا تمہارا ہاتھ اُس قید خانے تک پہنچ جائے گا۔ وہ قید خانہ جس سے رہائی میرے اپنے بس میں بھی نہیں لگتی۔" اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اگر اُس تک پہنچنے کا راستہ مجھے مل جائے تو" ..... میں نے اُوپر دیکھا ہے۔ اُوپر لان میں تیز دھنوں پر مہمان

بوجھل قدموں سے ناچ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے بازوؤں میں جھولتے ہوئے۔

غبار آلود جذبات سے بوجھل سر کو میں نے اپنے دونوں گھٹنوں پر ٹکا دیا۔ اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ میں کیوں اس عورت کے پیچھے چلا آیا ہوں۔ جو اس قدر نزدیک ہونے کے باوجود اس قدر دور لگتی ہے کسی غمگین گیت کی طرح پُرسوز۔

"میرے قید خانے کا راستہ؟ طاہر نذیر! اس کا راستہ تو میں بھی نہیں جانتی۔" اس نے سگریٹ کو منہ میں دبا کر لائیٹر جلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے لائیٹر سے سگریٹ کو سلگا دیا ہے۔ وہ ننھا سا شعلہ جو روشنیوں کے طوفان میں بالکل بجھا ہوا سا لگتا ہے۔ لیکن وہ اس کے خوبصورت اور غمگین چہرے کو روشن کر رہا ہے اور اس کی آنکھیں .... اس کی آنکھوں میں اس کی ویران روح کی چیخیں منجمد ہوئی لگتی ہیں۔ ایسی روح جو تنہائیوں میں بھٹک رہی ہو .... تڑپ رہی ہو۔ بغیر کسی رہائی کی آس کے .... میں اس کا غم اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ میں اس کا چہرہ تکتے ہی رہنا چاہتا ہوں۔

"جوزفین احمد تمہاری یہ خود ساختہ دیواریں ہوا کے جھونکے سے گر بھی تو سکتی ہیں۔"

طاہر نذیر میں نے ان دیواروں کو اینٹ اینٹ ایستادہ کیا ہے۔ میرے دل کی ناکامیاں۔ مایوسیاں اور محبتیں۔ سب اس میں شامل ہیں۔ کیا یہ مضبوط نہ ہوں گی؟

"تم ان دیواروں سے باہر نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی ہو۔ اتنی بھی مایوسی کیا؟" میں نے سمندر سے آئی تیز ہوا میں اڑتے اس کے بالوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا ہے۔

"میں مایوس نہیں ہوں۔ طاہر نذیر۔ مایوسی تو اس کے بعد ہوتی ہے۔ میرا سارا ذہن تو ایک خلا ہے۔ جو نہ سمجھتا ہے۔ نہ سوچتا ہے۔ بس میں صرف زندہ ہوں۔ اس لئے کہ میں مر نہیں سکتی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔

"تالاب کے کناروں پر منی پلانٹ اور ربڑ کے بڑے بڑے پودوں میں چھپا کوئی جھینگر تیز آواز میں بولا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ چاند سفیدے کے دو شاخے سے اوپر اٹھ آیا ہے۔ اور شفاف نیلے آسمان کے بیچوں بیچ کھڑا شریر بچے کی مانند ہمیں دیکھے جا رہا ہے۔

"جوزفین احمد انسان اتنا بے بس نہیں۔ ہو سکتا ہے بہت ساری خوشیاں تمہاری منتظر ہوں۔ بہت سارے اچھے لوگ تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں۔ بہت ساری راہیں تمہارے قدموں کی دھمک کی منتظر ہوں۔" میں نے اس کے سامنے بیٹھ کر اسے بہلانے کی کوشش کی ہے۔ "ہاں .... انسان بے بس نہیں۔ انسان مر بھی سکتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے میں مرنا نہیں چاہتی۔ شاید میرے دل میں مرنے کی بھی کوئی خواہش نہیں۔" ہو سکتا ہے میں کسی روز ان اندھیروں سے نکل ہی جاؤں۔ لیکن کب؟ میں نہیں جانتی۔"

جوزفین احمد زندگی کتنی حسین ہے۔ یہ لان کا سبزہ۔ یہ رات کا جادو۔ لوگوں کے قہقہے۔ یہ سب زندگی کے جز ہیں۔ اور ہم ان سے علیحدہ رہ کر کچھ بھی نہیں۔ یہ تمہاری بڑی بڑی خوبصورت بھوری آنکھیں۔ یہ تمہارے گھنے بالوں کا سایہ۔ تم تو خود مجسم زندگی ہو۔"

"میں اُداس تو نہیں ہوں۔ طاہر نذیر۔ بس میں زور زور سے ہنس نہیں سکتی۔ میری ہنسی میرے اندر ہی کہیں دم توڑ دیتی ہے۔ اور پھر مجھے لگتا ہے ایک بے کراں ویرانہ مجھے نگلنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ تب میں اکیلی اور خوفزدہ کھڑی رہ جاتی ہوں اور پھر مجھے لگتا ہے۔ جیسے میں اس بیکراں ویرانی میں تیر رہی ہوں۔ ایسا خلا جو زمانوں پر محیط ہو۔ جہاں کوئی نہ ہو انسان نہ ہو۔ خدا نہ ہو۔ جہاں میرا اپنا آپ بھی نہ ہو۔" وہ بولتے بولتے دوبارہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"جوزفین احمد کیا تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟" میں نے اُوپر ڈرائینگ روم کی کھڑکیوں کے اترتے سفید پردوں کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا ہے۔ اِن رنگینیوں کے اُوپر آسمان کی نیلاہٹ چھائی ہوئی ہے ...... وہ چاند کو دیکھنے لگی ہے۔ اُس کے بال اُس کے چہرے کا ہالہ کئے ہوتے ہیں۔ اور اُس کی آنکھوں سے گرد لگے رنگ میں اُس کی آنکھیں کسی معبد میں دیوی کی آنکھوں سے مشابہ لگ رہی ہیں جن میں انجانا سحر ور جادو ہوتا ہے۔ میں نہ جانے کس بات کا کونسی خوشی کا منتظر وہاں اُس کے پاس اس کے جواب کا منتظر کھڑا ہوں۔ میں کیوں اُن لوگوں میں نہیں جاتا جو جام پر جام لنڈھاتے زور زور سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ہے۔ "دیکھو میں اِس کا جواب دیتا ہوں۔ ایک بوجھل آواز میرے پیچھے سے اُبھری ہے .... میں ساکت کھڑا ہو ..... میں نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ میں جوزفین کی موجودگی میں پتھر کا ہو گیا ہوں .....

مسٹر قربان علی نے اپنے بے بال کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا ہے۔

"خدا جام کے اندر چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور جب میں جام اپنے اندر اُنڈیلتا ہوں تو میرا خدا میرے اندر چلا جاتا ہے اور پھر میں باہر کے خدا سے لاپروا ہو جاتا ہوں ....." مسٹر قربان علی نے جوزفین احمد کے سامنے جھک کر اُس کے سفید خوبصورت اور ٹھنڈے ہاتھ کو بوسہ دیا ہے۔ بیرا ٹرے میں جام اور شراب رکھ کر دبے قدموں واپس مڑ گیا ہے "... خاتون آپ اُداس ہیں اور میں آپ کی اُداسی کی وجہ سے شرمندہ ہوں .... میری بہترین شراب آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ آپ ہمیں مایوس نہ کریں۔" اُس نے دوبارہ اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے واپس مڑ گیا ہے۔ دوسرے مہمانوں کے پاس۔ ہم پھر اکیلے کھڑے ہیں ..... روشنیوں اور اندھیروں کے امتزاج سے بنے اُس جال میں ہم دونوں کھڑے اُس کو جاتا دیکھ رہے ہیں

جوزفین احمد نے تالاب کے ساکت پانی میں ایک چھوٹی سی کنکری پھینکی ہے۔ ایک چھوٹا سا بھنور اور بس۔ "لیکن میرے جام میں خدا نہیں چھپتا۔ مسٹر قربان علی ...... اس لئے کہ میرے اندر کوئی خدا نہیں۔ میرے اندر کوئی روشنی نہیں۔ میرے قدموں تلے کوئی راہ نہیں۔" وہ شاید اپنے اندر اُمنڈتے آنسوؤں کو روکنے کے لئے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے ہوئے کانپ رہی ہے۔

میں نے اضطراری طور پر اپنے بالوں میں انگلیوں کو اُلجھا دیا ہے۔ میں اُسے کچھ کہنا چاہتا ہوں ... لیکن میں خاموش کھڑا ہوں۔ میرا سراپا اُس کے خیالوں میں ڈوبا ہوا ہے۔

جوزفین احمد نے غم بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی ہے۔ ادھوری اور نامکمل ہنسی اُس کے رنگین لب پر آکر اٹک سی گئی ہے۔ "طاہر نذیر۔ زمانے ہوئے۔ میں نے بھی خدا کو دیکھا تھا۔ خدا جو میرے پاپا کی نمازوں میں تھا۔ خدا جو

میری ممی کی بائیبل میں تھا۔ پھر مما اور خدا دونوں ہی مجھے بھٹکنے کے لئے اکیلا چھوڑ گئے۔

شاید تم نے اُس خدا کو اپنے اندر نہیں اتارا ہوگا۔ میں نے اُس کے دُکھ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اتارا تھا لیکن پھر وہ میرے خیالوں سے بھی نکل گیا۔"

لیکن میں تمہارے ساتھ مل کر تمہارے خدا کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ ہم دونوں میں نے چند گھونٹ مے دونوں جاموں میں انڈیلی ہے لیکن جوز فین احمد نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ وہ خیالوں میں کھو سی گئی ہے۔

"ہو سکتا ہے میرا خدا میری مما کے ساتھ ہی مجھ سے بچھڑ گیا ہو۔" وہ بہت آہستہ سے بولی اور اُس نے جھک کر سبز بیل سے ایک پتہ توڑا اور اُسے ہتھیلی پر مسلنے لگی۔ لوگ سب طرف پھیل گئے ہیں۔ ہمارے سامنے درختوں کی شاخیں روشنی میں چمکتیں اور پھر ہوا کا کوئی جھونکا اُن کو اندھیرے میں چھپا دیتا ہے۔ زندگی بھی تو دھوپ چھاؤں کا ایک کھیل ہے۔

میرا جام میرے سامنے رکھا ہے۔ تب میں نے اپنے دِل کو جوز فین کی رفاقت میں ایک بار پھر عجیب انداز میں دھڑکتے پایا ہے جیسے وہ پھر آہستہ آہستہ پکار رہا ہو۔

جوز فین احمد ..... جوزی ..... جوز فین احمد ...... میں اُٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ بے چینی اور اضطراب کی ایک رو مجھے ڈبو رہی ہے۔

"جوز فین احمد آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" میں نے جام کو گھاس پر انڈیلتے ہوئے کہا۔ چاند کا خمیدہ ٹکڑا ابھی تک آسمان کے بیچوں بیچ کھڑا ہے اور مسٹر قربان علی اپنی نشے میں لڑکھڑائی زبان میں کسی دوسری خاتون کے سامنے جھکے اُسے کہہ رہے ہیں۔

"خاتون آپ اُداس ہیں اور میری بہترین شراب آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔"

جوز فین احمد نے اپنی ساڑھی کے پلو کو اپنے گرد لپیٹ کر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا ہے "کسی فرصت کے وقت تم میرے گھر آنا ......" اُس نے سگریٹ کو رک کر منہ میں دبایا اور آنکھیں بند کر کے کھڑی ہوگئی۔ لائیٹر کے ننھے شعلے نے اُس کے اُداس چہرے کو روشن کر دیا اور پھر دبیز دھوئیں میں اُس کا سارا چہرہ چھپ گیا ... چہرہ جو اُداس ہے لیکن پھر بھی خوبصورت ہے۔

ہاں میں آؤں گا ... کسی روز ..... کسی وقت میں نے گاڑی کے اندر بیٹھ کر اُس کو دیکھے بغیر جواب دیا۔ چاند میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے اور سڑک پر ٹیوبز کی روشنیاں۔ دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیل رہی ہیں۔

"جوز فین احمد تمہارا جادو عجیب ہے۔ شاید تم اِس سے آگاہ نہیں ہو۔" میں نے ایکسلریٹر پر اپنے پاؤں کا زور ڈالتے ہوئے زور سے کہا۔ وہ خاموش ہے۔

میرا دل اور بھی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔

ممی نے مسز اعظم کے گھر سے آ کر اپنے گوٹے کناری والے دوپٹے کو کرسی پر پھینکا اور تھکی تھکی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں لان میں بیٹھا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا جس کی خوبصورت ہیروئن نے میری ساری توجہ جذب کر رکھی تھی۔ کیوں کہ وہ

جوز فین احمد سے مشابہہ تھی اور مجھے جوز فین احمد بے طرح یاد آ رہی تھی۔

"میرے اچھے بھیا ذرا نوکر کو آواز دینا۔ پیاس کے مارے میرا بُرا حال ہے۔ یہ میلاد کی محفل۔ اُف میں کس قدر تھک گئی ہوں۔" اُس نے اپنے تراشیدہ بالوں کو سر پر سمیٹ لیا تھا۔

"تہمینہ میری بہن۔ جو کسی الف لیلوی شہزادی کی طرح خوبصورت ہے! اور اُسے دیکھ کر میں ہمیشہ فخر محسوس کرتا ہوں۔"

میں ہنس پڑا۔

ٹمی گھبرا کر بولی۔ کیوں بھیا ہنسے کیوں ہو۔ کیا میں بُری لگ رہی ہوں۔" وہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"نہیں ٹمی۔ تم تو بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بالکل شہزادی سی۔ میں پیار سے بولا۔ لیکن ایسا لگتا ہے تم میلاد سے نہیں۔ کسی شادی کی تقریب سے آئی ہو۔"

"ارے بھیا" ٹمی ہنس کر پھر بیٹھ گئی "میں تو ڈر گئی تھی کہ شاید میں بدصورت لگ رہی ہوں۔"

"اے بھیا میلاد میں مسز اعظم کے ہاں عورتیں اتنی بن سنور کر آتی ہیں کہ کیا کہوں۔"

"کیا تم سے بھی زیادہ گوٹا کناری لگے کپڑے پہن کر آتی ہیں؟" میں نے ٹمی کو چھیڑتے ہوئے حیران ہو کر پوچھا۔

ٹمی ہنس پڑی۔

"واہ بھیا۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر دیکھو تو پتا چلے اور پھر میلاد کے بعد کس فراٹے سے سگریٹ پیتی ہیں۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔" ٹمی نے سگریٹ پینے کے انداز میں دو انگلیوں کو منہ سے لگا کر مصنوعی کش کھینچا۔

"کیا واقعی؟۔۔۔" میں حیران ہو رہا تھا۔ میلاد اور سگریٹ دو متضاد چیزیں۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

"اور بھیا ایسی شاندار دعوت ہوتی ہے کہ بس۔۔۔" اُس نے شاندار کو بہت لمبا کر کے بولتے ہوئے بتایا۔

اور پھر عورتیں سگریٹ پیتی ہیں اور ہو سکتا ہے کچھ ڈرنک بھی کرتی ہوں۔ میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔

"اور بھیا وہ جوز فین احمد ہے نا جس کی جرمن مما اُس کے پپا کو چھوڑ کر واپس وطن چلی گئی ہے۔ وہ بھی وہاں آئی تھی۔ عورتیں کہتی ہیں وہ کوئی اصلی مسلمان تھوڑی ہے۔ آدھی عیسائی بھی تو ہے۔ عورتیں اس کے آنے پر دبے لفظوں میں اعتراض کر رہی تھیں۔"

"ہو سکتا ہے وہ پوری مسلمان ہو۔۔۔" میں نے رسالہ بند کر کے پورے طور پر دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔۔۔ مجھے اُس کا ڈھکا ہوا سر اور جڑے ہوئے ہاتھ یاد آ گئے تھے۔

"لیکن بھیا وہ میلاد کے بعد ڈائننگ روم میں ایک طرف بیٹھی ڈرنک کر رہی تھی اور سگریٹ پی رہی تھی۔"

"ہو سکتا ہے ٹمی۔ جوز فین احمد خدا کو ڈھونڈنے اُس محفل میں گئی ہو۔" مجھے جوز فین کی خوبصورت اُداس آنکھیں یاد آ گئی تھیں۔ جن میں درد کی جوت سی جلتی نظر آتی تھی۔

"ارے بھیا تم بھی کمال کرتے ہو۔ بھلا کبھی کسی کا خدا بھی گم ہوا ہے۔" ٹمی نے اندر جاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "میرے خیال

میں وہ پوری مسلمان نہیں ہے ۔ اور اُسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا ۔ بھلا اُس کا کیا کام وہاں ۔ اُس کی ماں تو جرمن عیسائی تھی ۔

" تمہیں ایک راہ چننا چاہیے جوزفین احمد ۔ تم کون سی راہ چل رہی ہو " میں نے دل میں کہا ۔ میں جوزفین احمد کے گھر جاؤں گا ۔ میں نے کرسی پر پڑے ہوئے ممی کے دوپٹے کو اُٹھا لیا ۔ شاید اس میں جوزفین کے سگریٹ کی خوشبو ہو ۔ لیکن میں نے جلدی سے دوپٹہ کرسی پر ڈال دیا ۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں ۔ آسمان پر بادل ہلکے ہلکے تیر رہے تھے ۔ درختوں کے سائے بھیگے سے تھے ۔ اور لان کے کناروں پر آموں کے جھنڈ میں کوئل تیز تیز آواز میں بول رہی تھی ۔ برہا کا گیت ، دکھ کا گیت ۔ اکیلے رہ جانے کا نوحہ انتظار کی جلن ۔ میرے اندر بھی بے بسی کا ملا جلا احساس چھا گیا ۔

" شاید میں جوزفین کے لئے اُداس ہوں " میرا اپنا جذبہ مجھے دکھی کر رہا تھا ۔

جوزفین کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا ۔

" آخر میں کیوں اُس کے وجود سے آگاہ ہوتا جا رہا ہوں ۔ آخر میں کیوں اُس گھر کی طرف جا رہا ہوں جو میری منزل نہیں بن سکتا "

سڑک کے کنارے پر اکا دکا املتاس کے درخت پیلے پھولوں سے لدے تھے اور ہوا کے تیز جھونکے اُن کو سڑک پر بکھرا رہے تھے ۔ پتیاں جو بکھر رہی تھیں ۔ مٹنے کے لئے ۔ فنا ہونے کے لئے ۔ انسانی جذبوں کی مانند ۔ میں نے سیٹی بجانے کی کوشش کی ۔ لیکن سیٹی کی آواز میرے ہونٹوں سے آگے نہ نکلی ۔ حالانکہ میں اُداس نہیں تھا ۔ میں خوش بھی تو نہیں تھا ۔

ڈرائنگ روم کے نرم صوفے میں دھنسے میں نے جوزفین احمد کی طرف دیکھا ۔ اُس کا چہرہ سگریٹ کے دھوئیں میں چھپا ہوا تھا ۔ وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی ۔ جیسے وہ کھلی آنکھ سے ایک سپنا دیکھ رہی ہو ۔

جوزفین احمد ۔ تم دوسرے کو بھی اپنی طرح تہی دامن کر دیتی ہو ۔

ہاں .... طاہر نذیر ۔ میرے پاس تمہیں خوش کرنے کے لئے کوئی جذبہ نہیں ۔ ہم ساتھ نہیں چل سکتے ۔ پھر جھوٹی باتوں سے کیا فائدہ ۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے ۔

میں جانتا تھا .... میں نے اپنے آپ کو آنے والی مایوسی کے لئے تیار کیا تھا .... اس لئے اُس وقت میں نے وہاں بیٹھے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچا لیا تھا .... میں اس وقت بھی اُس سے محبت کی توقع میں نہیں آیا تھا .. میں تو بس آ گیا تھا ۔ اُسے دیکھنے ۔ اُس کی قربت کا احساس کرنے .... اُس کی خوبصورت آنکھوں کی اُداسی میں ڈوبنے ۔ میں ہولے سے ہنس دیا ۔

" تمہیں زندگی کا ایک راہ تو چننا ہی پڑے گا ۔ زندگی اس طرح نہیں گزر سکتی ۔ تمہیں ہمت کرنی ہی پڑے گی ۔ جوزفین احمد "

" طاہر نذیر اُس روز تم نے میرے خدا کے بارے میں پوچھا تھا لیکن مجھے بتاؤ ۔ خدا کہاں ہے ؟ ۔ میں کون سے خدا پر یقین کروں ۔ کون سے خدا کو ڈھونڈوں " وہ اُٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی ۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا ۔ اُس کا ہاتھ لبریز رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں سارے کمرے میں پھیلا ہوا تھا ۔

" جوزفین خدا کو سمجھنا اتنا آسان تو نہیں " میں نے کہا تھا ۔

"لیکن اُسے گم کرنا بہت آسان ہے۔ وُہ خود ہی ہمارے وجود۔ ہمارے خیالوں سے نکل کر کہیں چلا جاتا ہے اور پھر لگتا ہے وہ کہیں تھا ہی نہیں۔ ہمارے اندر۔ ہمارے باہر.... وہ کہیں بھی نہیں ہوتا .... اس تک پہنچنے کی ساری راہیں دھندلا جاتی ہیں ... بتاؤ وہ کہاں ہے۔ وہ خود کیوں میری راہیں روشن نہیں کرتا؟ وہ خود کیوں میری مایوسیوں کو نہیں سمجھتا؟ وہ صرف تماشا کیوں دیکھتا ہے۔ تماشا کیوں بناتا ہے ..... وہ دل کو شیشہ بناتا ہے اور پھر حالات کے ہاتھوں میں پتھر پکڑا دیتا ہے۔"

"اور تم شک میں پڑ گئی ہو۔ اُس کی موجودگی سے منکر ہو گئی ہو؟"

"ہو سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے طاہر نذیر میں نے اُسے کبھی جانا ہی نہ ہو۔ خدا جب انسانوں کو تباہی سے بچا نہیں سکتا تو ایمان اُٹھ ہی جاتا ہے۔" اُس کی آواز میں احتجاج اور شکائت سی تھی۔

"کیا تم اپنی مما کا ذکر کرنا چاہتی ہو....؟"

"اُنہوں.... ہوں۔" وہ کھو سی گئی تھی۔ شائد اپنی مما کی یاد اُسے گھیرے ہوئے تھی.... میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ ہاں... میری مما جو اپنی محبت کے لٹنے پر اُجڑ گئی تھیں۔ شائد نفرت کا جذبہ محبت سے زیادہ طاقتور ہے شائد۔" وہ پھر کھو سی گئی تھی۔

"جوزفین احمد۔ نفرت بھی محبت کا ہی منفی انداز ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کے لئے کہا۔ اس کی آواز اُس کے اندرونی غم سے بوجھل تھی۔ جیسے آسمان پر گہرے سیاہ بادل گھر آئے ہوں۔

"تم مرد ہو کہہ سکتے ہو... لیکن میں نہیں ..... میں عورت ہونے کے ناطے مما کے غم کو سمجھ سکتی ہوں۔ تم نہیں...."

"ہو سکتا ہے جوزفین احمد تمہارے پاپا بھی دکھ کے انہی راستوں پر سفر کر رہے ہوں جن پہ تمہاری مما چل رہی ہیں ... .. ہو سکتا ہے تمہارے پاپا بھی دکھ اور اکیلے پن کے زخم خوردہ ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے .... کون بتائے گا۔"

"میں بتا سکتی ہوں .... میں جو اُس عورت کی بیٹی ہوں ...." جوزفین نے پاس پڑے ایش ٹرے میں زور سے سگریٹ کو مسل کر پھینک دیا۔ "میں جانتی ہوں طاہر نذیر۔ کتنے برس ہوئے اُس مرد نے میری مما کا ذکر بھی نہیں کیا۔ اُس عورت کا ذکر نہیں کیا جو میری ماں تھی۔ جس کی یاد آج بھی میرے دل کو اتنا دکھی اور اکیلا کر جاتی ہے اور دنیا میں کوئی بھی تو نہیں جس سے میں اس کا ذکر کر سکوں۔" وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی تھی۔

"جوزفین احمد میں تمہارے دکھ سننے کے لئے تیار ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ میں اُس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نہ جانے کیوں بیٹھا رہا۔ "نہیں تم کس طرح سمجھ سکو گے۔ کیا تم اس رات کے درد کو محسوس کر سکو گے جب پہلی بار میں اپنی مما کے دکھ سے آگاہ ہوئی تھی۔ میں نے اُنھیں جانا تھا۔ اُس رات سے پہلے میں نے اپنی مما کو کبھی نہیں جانا تھا۔"

دادی ماں مجھے نماز پڑھاتی تھیں اور قرآن شریف پڑھنا بھی میں نے دادی ماں سے ہی سیکھا تھا۔ ہر رات کو جب میں اپنے بستر پہ لیٹنے لگتی تو مما دبے قدموں میرے پاس آتیں اور میرے پلنگ کے پاس دوزانو ہو کر آنکھیں بند کر کے میرے لئے دعا مانگتیں اور جھک کر میری پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے چھوتیں اور پھر دروازہ بند کر کے چلی جاتیں۔

میں اس کی مما کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"میں نے انھیں عبادت کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔" مجھے تو مما کا نازک سا وجود یاد آتا ہے جیسے وہ اب بھی میرے پاس ہی کہیں اپنا لمبا سایہ پہنے ہوا میں تیرتی ہوئی پھر رہی ہوں۔ سارا وقت گھریلو کاموں میں مصروف۔ پپا کے آرام اور خوشنودی کے لئے کوشاں۔ اپنے ہی دل کے جذبوں میں بند کلی کی مانند نازک اور خوبصورت۔

"ہاں میں نے سُنا ہے تمہاری مما ایک بہترین گھریلو خاتون تھیں۔" میں نے میز پہ پڑے زردی مائل سفید مگنولیا سے پھول کو چھوتے ہوئے کہا۔ "ایسا مگنولیا کا پھول، اُس کی مما کی طرح۔"

وہ تیزی سے بولی۔ "عورت صرف گھریلو عورت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ اُس مرد کی محبت کی متلاشی رہتی ہے جس کے لئے اُس نے اتنے بندھن توڑے ہوں۔ لیکن میری مما بالکل تنہا رہ گئی تھیں۔ سمجھتے ہو طاہر نذیر۔"

"تم نے کیونکر جانا۔۔" میں نے اپنے تجسس کو مشکل سے دباتے ہوئے پوچھا۔

"میں شاید برسوں ہی مما کے رونے کی وجہ نہ جان پاتی۔ اگر میں اس روز مما کے کمرے میں نہ جاتی۔ پپا دنوں سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ سارے گھر میں عجیب خاموشی اور اُداسی تھی۔ دادی اماں مما سے بہت کم بولتی تھیں۔ وہ دن کا اکثر وقت عبادت میں گزار دیتی تھیں۔ میں نے بھی نماز پڑھی تھی لیکن میرا دل بے چین سا تھا.... میں نے سوچا ہو سکتا ہے مما بھی اُداس ہوں۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر چبوترے سے صحن کو عبور کرتی ان کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ وہ فرش پہ دو زانو جھکی رو رہی تھیں۔ میں نے چپکے سے اُن کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بے تحاشا ان کو چومنے لگی۔ اُن کے آنسوؤں کی نمکینی میرے اندر اُتر آئی تھی۔ میں زندگی میں پہلی بار تکلیف دہ رنج سے آشنا ہوئی تھی اور طاہر نذیر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں جو ابھی زندگی کی اُونچ نیچ سے واقف بھی نہیں تھی۔ مجھے یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ رونا روح کی تنہائی کا رونا تھا۔ مما اور پپا بچھڑ چکے تھے۔ وہ اتنی بھری پُری دنیا میں اکیلے رہ جانے کا درد تھا جو آنسو بن رہا تھا۔ اُن کے اندر کی جوت شاید بجھ چکی تھی۔ اور طاہر نذیر جب انسان کے اندر کی جوت بجھ جائے تو بڑا اندھیرا ہوتا ہے... مما بھی اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔

"مما میں آپ کے ساتھ ہوں۔" میں نے اُن کو کہا تھا۔ "آپ اکیلی نہیں ہیں مما۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم دونوں ساتھ ہیں۔" اور پھر مما نے میرے ہاتھ پکڑ لئے تھے اور ہم دونوں مسکرا پڑے تھے۔ میں نے مما کا دُکھ جان کر عورت کا دُکھ جان لیا ہے طاہر نذیر۔

"کیا تمہاری مما نے تمہیں پپا کے رویئے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔" میں کہانی سننے والے کی طرح سوال کر رہا تھا۔

"نہیں۔ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آگئی تھیں۔ شاید میں بڑی ہو چکی تھی اور پھر میں کسی کو بتائے بغیر مما کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ عبادت کرتے وقت میرا دل اچاٹ ہو جاتا۔ مما کی بتائی ہوئی دعائیں میرے لبوں پہ آجاتیں۔ دوراہوں پہ چلنے کی کوشش میں بھٹک گئی ہوں.... لیکن راہ تو اب بھی مجھے دکھائی نہیں دیتا۔"

"کیا تمہاری مما مذہب میں بہت یقین رکھتی تھیں؟" میں اس کے جذبات کے ریلے کے ساتھ بہہ رہا تھا....

"نہیں پہلے وہ اتنا یقین نہیں رکھتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ محبت جو خود ایک مذہب ہے۔ بھلا ایک جگہ میں دو خدا کیسے سما سکتے ہیں۔ مما اکیلے رہ جانے سے خوفزدہ تھیں اور اکیلا رہ جانا بہت جان لیوا ہوتا ہے طاہر نذیر۔" وہ آہستہ آہستہ ہچکیاں لے کر رونے لگی تھی....

میں آگے بڑھ کر اُس کے آنسو سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ اُسے تسلی کے چند الفاظ کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا دُکھ اِن الفاظ سے بہت اونچا اور مقدس ہے۔ اس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے دُکھ سے میرا سارا وجود بھر گیا تھا۔ میں نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور خاموش بیٹھا اُسے دیکھنے لگا۔

"اور جانتے ہو طاہر نذیر پھر مما پورے بیس سال بعد واپس چلی گئی تھیں"۔ جوزفین نے ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"لیکن لوگ کہتے ہیں...." میں نے اپنے آپ کو فوراً روکا میں اُسے کسی مزید دکھ میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

"ہاں.... لوگ کہتے ہیں وہ غیر ملکی عورت بیس سال بعد اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی گئی۔ لیکن حقیقت کوئی نہیں جانتا۔ کون اُس اکیلی اور ویران عورت کے دل میں جھانکتا اور جب میں نے ایئرپورٹ پر پاپا کے ساتھ کھڑے ہو کر سفید رومال ہلایا تو مجھے لگا جیسے میرے سینے کے اندر سے کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ شاید وہ چیز میرے گرد چلتی تیز ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میں نے پاس کھڑے پاپا کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن پاپا سر نیہوڑائے تیز تیز قدموں سے واپس جا رہے تھے اور اُس وقت مجھے لگا تھا جیسے میں ایک خلا میں تیر رہی ہوں۔ مجھے مما کا خدا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے پاپا کے خدا کی موجودگی کا بھی احساس نہ تھا اور وہاں کھڑے مجھے لگا تھا کہ خدا تو کہیں بھی نہیں ہے۔ طاہر نذیر خدا نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہم تینوں یوں اکیلے نہ بھٹکتے۔" وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن زخمی سی مسکراہٹ اس کے کانپتے ہونٹوں پر ساکت ہو گئی تھی۔ اُس نے سگریٹ سلگا کر تیز تیز کش لینے شروع کر دیئے تھے اور جب میں نے خدا حافظ کہنے کے لئے اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی خالی نگاہوں سے دور کہیں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ شاید اپنے اُس وجود کو ڈھونڈ رہی تھی جو جوزفین احمد اور جمشید احمد کے درمیان خلا میں کہیں گم ہو گیا تھا.... کیا میں اُس وجود کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ کیا میں اُس کی ویران بھٹکتی روح کو تلاش کر لوں گا۔ سوال ہی سوال میرے اندر اُٹھ رہے تھے۔ سوال جن میں شک تھا۔ اپنے اندر اُٹھتے جذبوں کا شک بھی اُس میں شامل ہو گیا تھا۔ کیا اِن اُداسیوں تک میری پہنچ بھی ہو گی۔ جوزفین احمد میرے پاس بیٹھی تھی لیکن مجھ سے دور۔ بہت دور۔ خدا حافظ کہے بغیر ہی میں واپس چلا آیا تھا۔

اور پھر میں نے سُنا کہ جوزفین احمد کہیں چلی گئی ہے۔

زندگی کا تیز بہاؤ مجھے بہائے لئے جا رہا تھا۔ جب بھی کبھی میرے ہاتھ میں جام ہوتا تو مجھے قربان علی کے تیراکی کے

تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی جوزفین حمد یاد آجاتی۔ روشنیوں کے دھارے کے اوپر بیٹھا میں ملگجے آسمان کو دیکھنے لگتا۔ تاروں کی جوت نہ جانے اس قدر مدھم کیوں ہوتی جا رہی تھی۔ میرا دل اس غمگین چہرے کے لئے بے چین ہو اٹھتا۔ وہ کہاں تھی۔ میں نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا تھا۔ مجھے لگتا اگر میں اس کا نام لوں گا تو میں اس کے وجود کو آلودہ کر دوں گا۔ میرے دل کی ساری محرومیاں میرے گرد اکٹھی ہو جاتیں اور پھر میں جام کو سامنے رکھے خاموش بیٹھا رہتا۔

اس روز بھی میں جوزفین کی یاد کی لہروں میں ہمیشہ کی طرح ہوتے ہوئے بہہ رہا تھا۔ دل نہ جانے کیوں کسی چہرے کو نقش بنا کر ذہن کی سکرین پر چلاتا رہتا ہے اور انسان دکھ اور غم کا انوکھا سا احساس لئے بے بسی سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔

جوزفین سے ملے اس سے باتیں کئے مہینوں ہی تو ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ مجھے اپنی تمام حیات پر چھائی لگتی۔ جوزفین جو کھو گئی تھی۔

اور جب نوکر نے شام کی ڈاک لا کر دی تو میں آسمان پر تیرتے ننھے ننھے سفید بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ سفید بوگن بیلا کے پھول لان کی گھاس پر تاروں کی مانند تیز ہوائیں بکھیر رہے تھے۔ اس تمام طمانیت اور سکون کے بیچ میرا دل ہی تو بے چین تھا۔۔۔۔ میں نے لاپرواہی سے لفافہ چاک کیا تھا۔ وہ جوزفین کا خط تھا۔ میرے اندر کا سارا خون میرے چہرے کو جلا رہا تھا اور مجھے لگا تھا جیسے آسمان کچھ اور نیلا ہو گیا ہو۔ پھول کچھ اور خوبصورت ہو گئے ہوں۔

اس نے لکھا تھا۔

"طاہر نذیر۔۔۔ بے یقینی کے دھارے پر بہتے بہتے میں اکتا چکی ہوں۔ کنارا تو کہیں نظر نہیں آتا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح خوش رہ سکتی۔ زندگی کی سطحی سچائیوں کو چپکے سے مان لیتی۔ میرے دل کے اندر کوئی کھوج نہ ہوتی۔ میں دو پاٹوں میں پس تو نہیں رہی کیونکہ کسی ایک راہ کو چننا تو میرے اپنے اختیار میں ہے لیکن مجھے تو راہ ہی دکھائی نہیں دیتی۔ میں کھوج میں نکلی ہوں۔ کیا خبر کسی دن میں تمہیں کسی کلب میں ملوں۔ یا بیراگ لے لوں۔ یا ہپی بن کر دکھوں سے چھٹکارا حاصل کر لوں!

کونسی راہ میرے دل کے سکھ کو جاتی ہے۔ اس کا کھوج مجھے خود ہی لگانا ہے اور پھر کوئی پچھتاوا میرا پیچھا نہ کرے گا۔ نہ ممّا کی جدائی نہ پپا کی دوری۔ میں تمہیں دعا مانگنے کے لئے بھی نہیں کہوں گی کیونکہ وہی دعا آسمانوں تک پہنچ سکتی ہے۔ جو درد میں ڈوب کر مانگی جائے اور جلتے ہوا اس زندگی کے صحرا میں اکیلے بہتے رہتے میں خود ایک خوف ایک اذیت اور ایک عذاب سے گزر رہی ہوں — تم نہ جانے کیا کرتے ہو گے۔"

اس نے خط کو اچانک ہی ختم کر دیا تھا۔ میں نے اس کے خط کو بار بار پڑھا تھا۔ اس نے اپنا کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں بتایا تھا۔ ٹھکانہ بھی تو وہی بتا سکتا ہے۔ جسے خود اپنے ٹھکانے کا علم ہو۔

اپنے کمرے کے باہر ریلنگ پر جھکے سمندر سے آتی تیز نم آلود ہوا کو اپنے گرد ناچتے محسوس کر کے بھی میں ہمیشہ خود کھو جایا کرتا تھا۔ سفید بوگن بیلا کے پھول دھیرے دھیرے میرے چاروں طرف ڈھیر ہوتے رہتے اور ایسے میں مجھے جوزفین احمد کا فقرہ یاد آتا۔

"اکیلے رہ جانا بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔"

بھولنے کی مصیبت

سرور جمال

ایک مرتبہ کسی تقریب میں ایک صاحبہ میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں چہرہ بڑا ہی پرکشش تھا لیکن غیر معمولی تن و توش کی شخصیت تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انھیں کہیں دیکھا بھی ہے۔ تقریب ختم ہونے پر میرے شوہر ان خاتون اور ان کے شوہر سے باتیں کرتے ہوئے میرے پاس آئے اور بولے "ان سے نہیں ملیں؟"

میں ان سے باتیں کرنے لگی باتوں کے دوران میں نے ان سے کہا "معاف کیجئے گا میں بار بار آپ کی طرف دیکھ رہی تھی دراصل آپ کی شکل ساجد صاحب کی بیگم سے بہت ملتی ہے۔"

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا اور میرے شوہر بولے "یہ مسز ساجد ہی تو ہیں۔"

مجھ پر شرمندگی کا دورہ سا پڑ گیا اور جھینپ مٹانے کے لئے بولی۔

"اوہو! معاف کیجئے گا میں پہچان نہ سکی۔ آپ کی صحت ماشاءاللہ پہلے سے کچھ اچھی ہوگئی ہے۔" یہ بات کہتے ہوئے مجھے اس بات کا خیال نہیں رہا کہ دنیا کی زیادہ تر عورتیں اپنے آپ کو نازک اندام سمجھتی ہیں۔ لیکن جب انہوں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ایسی قسمت کہاں بہن! بیماریاں تو بلا کی طرح چمٹی ہوئی ہیں۔ چہرہ تک تو ہرا نہیں ہوتا۔" تب مجھے خیال آیا کہ واقعی کسی موٹی عورت کو موٹا کہنا کسی موٹی گالی سے کم نہیں اور ایک بار پھر مجھے معذرت کرنا پڑی۔

بات یہیں تک رہتی تو ایک بات بھی تھی۔ مجھے تو لوگوں کے پتے نہیں یاد رہتے۔ خطوں کے جواب لکھنا بھول جاتی ہوں۔ خط لکھ لیتی ہوں تو پتا دماغ سے نکل جاتا ہے۔ ڈائری اور نوٹ بک کی مدد سے پتا لکھ لیا تو پوسٹ کرنا بھول گئی۔ اگر خوش قسمتی سے پوسٹ کر بھی ڈالا تو ٹکٹ لگانا بھول گئی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیرنگ خط پھر مجھے ہی واپس مل جاتا ہے۔

ٹیلی فون کے نمبر تو کبھی یاد نہیں رہتے۔ ڈائریکٹری میں بہت احتیاط سے کسی کا فون نمبر دیکھ کر نوٹ کر لینے کے باوجود صحیح نمبر پر رنگ کرنا بھول جاتی ہوں۔ ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک جگہ ٹیلی فون کرنے کے لئے نمبر ملانے کے بعد جب ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو ادھر سے ایک بڑی ہی دبنگ اور خوف ناک آواز آئی۔

"ہلو! آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔" اس آواز سے خائف ہو کر میں بڑی منمناتی ہوئی آواز میں بولی "کیا مسز صدیقی گھر پر ہیں؟"

"یہاں کوئی مسز صدیقی نہیں رہتیں! یہ شری کرشنم اچاری آئی۔ جی صاحب کا بنگلہ ہے۔ آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں؟" ادھر سے تقریباً ڈپٹتی ہوئی آواز آئی۔ آئی جی کا نام سن لینے کے بعد میں اپنا نام بتلانے کی حماقت کیسے کر سکتی تھی۔ "ساری رانگ نمبر۔"

کہہ کر جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔

ڈائرکٹری میں ایک بار پھر ان کا فون نمبر دیکھا۔ بہت احتیاط سے ایک کاغذ پر نوٹ کیا اور پھر ڈائیل گھمایا۔ "ہلو" ادھر سے آواز آئی۔ "کیا مسز صدیقی گھر پر تشریف رکھتی ہیں۔" "یہ کیا تماشا ہے۔ آپ سے کتنی بار کہا جائے کہ یہ مسز صدیقی کا گھر نہیں۔"

"آئی۔ جی صاحب کا بنگلہ ہے آئی۔ جی۔ صاحب کا سمجھیں!" ادھر سے وہی شخص کاٹ کھانے والے انداز میں دھاڑا۔ اور اس کے بعد ہفتوں کہیں فون کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

بھولنے کی مصیبت تو میری روزانہ کی زندگی پر ہی چھائی ہوئی ہے۔ کیا مجال کہ میری اپنی ہی رکھی ہوئی چیز آسانی سے وقت پہ مجھے مل جائے۔ اب ایک چھوٹی سی چیز رومال ہی کو لیجئے۔ میرے ہاتھ سے رومال جس قدر گم ہوتے ہیں اتنی شاید اور کوئی چیز کھوتی ہو۔ ہمیشہ نئے رومال بنا کر یا خرید کر رکھتی ہوں لیکن رومالوں کا کیس ہمیشہ خالی ملتا ہے۔ کیونکہ میں اس میں رومال رکھنا بھول جاتی ہوں۔ گھر سے باہر نکلتے وقت رومال یا رومالوں کے کھیل کی تلاش کی مصیبت سر پہ کھڑی ہوتی ہے۔ ایک تو تیار ہونے سے پہلے یہ بکس وہ بکس الماری، دراز، سنگار میز کے خانوں کا بار بار جائزہ لینے کے بعد کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈھ کر میلا، پرانا اور بدرنگ رومال نکال کر احتیاط سے رکھ لینے کے باوجود چلتے وقت پھر اس کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ ارے بھئی یہ رومال کہاں گیا اور پھر پورا گھر چھان لینے کے بعد کہیں نہ کہیں سے رومال برآمد ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن کھانے کے بعد جب ہاتھ پونچھنے کے لئے رومال دیکھتی ہوں تو وہ پھر غائب۔ غالباً رکشے میں گر گیا یا جہاں بیٹھی تھی وہاں رہ گیا۔

ایک آفت اور میرے ساتھ رہتی ہے اور وہ ہے کنجیوں کے کھونے کی مصیبت۔ بار بار کی مصیبت سے بچنے کے لئے ڈپلی کیٹ اور ٹرپلی کیٹ کنجیاں تک بنوائیں لیکن وقت پر سب غائب ہو جاتی ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے ساری تیاری کے بعد چلتے وقت جب کنجیوں کا پتا نہیں ملتا تو مجبور ہو کر ہم جانے کا پروگرام کینسل کر دیتے ہیں اور جب میں مایوس ہو کر ساری بدلنے کے لیے اتارنے لگتی ہوں تو چیخ پڑتی ہوں۔ "ارے یہ رہا گچھا۔ ساری میں لگا مردار کمر میں جھول رہا تھا۔"

گھڑی میں بڑی باقاعدگی سے لگاتی ہوں لیکن اس میں چابی بھرنا اور وقت دیکھنا بڑی بے قاعدگی سے بھول جاتی ہوں اس لئے سبھی ٹائم پیس بند ملتا ہے اور گھر سے باہر نکلنے پر پتا چلتا ہے کہ میری رسٹ واچ بند ہے۔

ایک مصیبت اور میرے ساتھ ہے۔ لوگوں کے چہرے یاد رہتے ہیں نام بھول جاتی ہوں۔ نام یاد رہا تو چہرہ ذہن سے غائب۔ اکثر دو چار بار کی ملاقات کے بعد کسی بڑے مجمع میں کسی بھی ملاقاتی کو دیکھ کر سوچتی ہی رہ جاتی ہوں کہ انھیں کہاں دیکھا تھا۔ اکثر لوگ شکایت کر دیتے ہیں فلاں جگہ آپ نے مجھے دیکھا لیکن ملیں نہیں۔ بعض لوگ یہ بھی سوچنے لگتے ہیں کہ غالباً میں ان سے خفا ہوں۔ ان باتوں سے مجھے تو اب ایسا خوف آنے لگا ہے کہ جو شخص میری طرف ذرا بھی غور سے دیکھتا ہے میں جھٹ سے اسے سلام کر لیتی ہوں لیکن اکثر اس سے پُرلطف واقعات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک بار ہم دونوں راج بھون میں مدعو تھے۔ دربار ہال کے مین گیٹ سے داخل ہوتے وقت دروازے کے کونے میں کھڑے ایک شخص پر میری نظر پڑی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا۔ میں ایک منٹ کے لئے

سوچنے لگی یہ کون شخص ہو سکتا ہے۔ غالباً یہ مجھے جانتا ہے۔ ممکن ہے یہ شہر کا کوئی معزز شہری ہو۔ اتنا سوچنا تھا کہ میں نے درباری آداب کے مطابق جھٹ سے جھک کر اسے سلام کر لیا۔ آس پاس کھڑے کچھ لوگوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ کچھ دبی دبی سی ہنسی کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ میرے شوہر چپکے سے بولے۔

" ہائیں یہ کیا کر رہی ہو یہ تو یہاں کا دربان ہے!"

یہ بھولنے کی عادت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے جو کبھی تو ہنساتی ہے اور کبھی رلاتی ہے۔ اب ہمارے شوہر نامدار کو لیجئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ گھر میں کسی طرح کی بے قاعدگی نہ ہو ہر چیز اپنی جگہ فٹ فاٹ ہونا چاہیئے۔ لیکن بڑی باتیں بھول جایا کرتے ہیں۔

جب یہ دفتر کے علاوہ گھر سے باہر کہیں بھی جاتے ہیں کھانا پینا سونا آرام کرنا اور جہاں تک میرا خیال ہے گھر تک کو بھول جاتے ہیں۔ وہ شاپنگ کرتے وقت یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ جیب میں کتنے روپے ہیں یا ہیں بھی کہ نہیں۔

ایک بار ہم بازار کچھ ضروری سامان خریدنے گئے۔ ہمارے ساتھ ہماری آٹھ سالہ بھانجی 'دیبا' بھی تھی۔ کھلونوں کی ایک بڑی دکان کے سامنے وہ مچل گئی خالہ جان ہم گڑیا لیں گے۔ میں اس کی عادت سے واقف تھی اس لیے اسے بہلا کر آگے نکل جانا چاہا لیکن 'یہ' اسے لے کر دکان کے اندر داخل ہو گئے کہ " میں دلاؤں گا اسے گڑیا۔"

" اچھا بیٹے! تمہیں کیسی گڑیا چاہیے۔"

" آنکھیں کھولنے اور بند کرنے والی اور جو ہنستی اور روتی بھی ہے۔ خالو جان مجھے ویسی ہی گڑیا دلا دیجئے۔" دکاندار نے طرح طرح کی گڑیاں سامنے رکھ دیں اور دیبا نے ایک بڑی سی گڑیا اٹھا لی۔ " اچھا اور کیا لو گی؟" یہ بولے اور اس نے جھٹ ایک اور کھلونا پسند کر لیا۔ کھلونوں کی پیکنگ کا آرڈر دے دیا گیا۔ لیکن کیش میمو دیکھ کر جناب کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ ستر روپے بچانوے پیسے۔

" جناب یہ ستر روپے بچانوے پیسے کیسے؟ آپ کی دکان پر تو صریحاً لوٹ ہے۔"

" واہ صاحب واہ! سارے بازار میں ان کھلونوں کی یہی قیمت ہے۔ پچپن روپے کی گڑیا ہے اور پندرہ روپے بچانوے پیسے کا یہ دوسرا کھلونا۔"

میں خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھی۔ دیبا بڑا سا پیکٹ اٹھائے خوشی کے مارے اچھل رہی تھی اور 'یہ' جب پینٹ اور کوٹ کی تمام جیبیں جھانک لینے کے بعد بغلیں بھی جھانک چکے تو میری طرف بڑھے اور بولے۔

" میں تو سمجھا تھا کہ یہ کھلونوں کی دکان ہے لیکن یہ تو ہاتم تائی کی دکان نکلی۔ میری جیب میں تو پورے پندرہ روپے بھی نہ ہوں گے کچھ کرو بھئی عزت کا معاملہ ہے۔" تو صاحب اس عزت کو بچانے کے لئے جو ضروری چیزیں خریدنے کے لئے میں گھر سے نکلی تھی انہیں کٹ کیا اور دکاندار کا حساب صاف کیا۔

ان کی بھول کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنیئے:۔

ایک بار ہم فرقت کاکوروی صاحب مرحوم کے یہاں گئے۔ وہاں ان کے بھائی توفیق صاحب اور ان کی بہن حلیمہ خاتون

بھی تھیں۔ ہم لوگوں کے جاتے ہی فرقت صاحب نے سب کا باقاعدہ تعارف کرایا پھر باتیں ہونے لگیں۔ ان کی دلچسپ باتوں میں وقت کا کچھ پتا نہیں لگا۔ باتوں کی رَو میں یہ بھول چکے تھے کہ وہ سب کا تعارف کرا چکے ہیں لہذا چلتے ہوئے ان کی بہن سے بولے "اچھا یہ بتلائیے آپ ان دونوں میں سے کس کی بیگم ہیں۔" توفیق صاحب کا چہرہ شرم اور غصہ سے لال ہو گیا۔ لیکن فرقت صاحب معاملہ کو سنبھالتے ہوئے اپنی مخصوص ہنسی ہنس دیئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ گھر آ کر میں نے ان کی غلطی کی طرف توجہ دلائی تو ہنس کر بولے خدا کا شکر کرو میں ویسی غلطیاں نہیں کرتا۔

"کیسی غلطیاں ؟"

"تو سنو ایسی غلطیاں !"

ایک بار میرے ایک دوست اپنی کار میں بیٹھے دفتر سے گھر جا رہے تھے راستہ میں ایک جگہ بھیڑ کی وجہ سے انھیں رک جانا پڑا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ماجرا کیا ہے وہ بھی کار سے اتر کر بھیڑ میں گھس گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچہ چیخ چیخ کر رو رہا ہے اور پبلک اسے چپ کرانے میں مصروف ہے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ کسی کا بچہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا ہے اور اتنا چھوٹا ہے کہ نہ تو اپنے ماں باپ کا نام بتا سکتا ہے اور نہ پتا۔

میرے دوست کو اس بچے پر بڑا ترس آیا۔ انہوں نے کہا لائیے میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اور پھر اس بچے سے پوچھا۔

"بیٹے میرے پاس رہو گے"

اتنی محبت پا کر وہ بچہ خاموش ہو گیا اور ان سے چمٹ گیا۔ بچے کو لئے ہوئے جب وہ گھر پہنچے تو دور ہی سے بیوی کو آواز دی۔

"لو بھئی چھ بچے تو ہمارے پاس پہلے ہی سے موجود تھے ایک اور پال لیں گے"

ان کی بیوی بچے کو دیکھ کر لپکیں اور اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

"اے ہے یہ تو اپنا پپو ہے دوپہر ہی سے غائب ہے۔ میں تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہو گئی تھی خدا کا شکر ہے تمہیں مل گیا !"

غزل نمبر

پہلے یہ نمبر ایک جلد میں تھا
اب
ترمیم و اضافہ کے بعد چار جلدوں میں
پیش کیا جا رہا ہے

شخصیات نمبر

پہلے یہ نمبر دو جلدوں میں تھا
اب
ترمیم و اضافہ کے بعد تین جلدوں میں
پیش کیا جا رہا ہے

نقوش کے یہ مقبول ترین نمبر بھی جلد ہی آپ تک پہنچ رہے ہیں

ولایتی زعفران

ضمیر جعفری

یہ ۲۴ر جولائی ۱۹۷۶ء کا ذکر ہے۔ ڈاکیے نے ایک پیکٹ لا کر دیا۔ کھولا تو اُس میں سے دو کتابیں نکلیں۔ انگریزی کی منتخب فکاہیہ اور طنزیہ نظموں کے مجموعے:

(1) THE POCKET BOOK OF
HUMROUS VERSE
BY: DAVID MECORD

اور

(2) HUMROUS VERSE
BY E.V. KNOX

مجھے اعتراف ہے کہ اس سے پیشتر انگریزی میں اس نوع کی نظمیں یک جا صورت میں میری نگاہ سے نہیں گزری تھیں۔ ورق گردانی پر ان نظموں کے موضوع، ان کی اُپج، بے تکلفی، جرأت، اور اسلوبِ اظہار کی سادہ سادہ قدرتی سی شگفتگی، اور میٹھے مگر گہرے طنز نے دامنِ دل کو ورق ورق پر کھینچنا شروع کر دیا۔ اور میں ایک سچی وابستگی کے جذبے کے ساتھ ان میں سے بعض منتخب نظموں کو اُردو میں منتقل کرنے لگ گیا — "منتخب" ان معنوں میں کہ جن نظموں کے مزاح کی گدگدی یا بطن کے درد کی لطیف لہر کے لمس کو میں محسوس کر سکا۔ چند نمونے ہدیۂ قارئین ہیں۔

انگریزی ادب سے ہمارا سمبندھ اب خاصا پُرانا ہو چکا ہے۔ انگریزی ادبیات کا اچھا خاصہ سرمایہ اُردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ "آمد و رفت" کے اس عمل میں کچھ عجب نہیں کہ کوئی صاحب مجھ سے پہلے ان میں سے بعض منظومات کو اُردو میں ڈھال کر اپنے تراجم چھپوا بھی چکے ہوں مگر مجھے اُس کا علم نہ ہو

اپنی زیرِ نظر کاوش کے بارے میں بھی یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ

اس کو لفظ بہ لفظ ترجمہ نہ سمجھا جائے۔ میں نے اصل کے عکس کو یا اُس کی روح کو اپنے لفظوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے "عبارت" سے زیادہ "اشارت و ادا" سے سروکار رکھا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے یہ ضِد بھی نہیں باندھی کہ پانی سر سے ہی کیوں نہ گزر جائے، میں پُوری کی پُوری نظم کو سَر کرکے چھوڑوں گا۔ اس کے برعکس، جس نظم کا جتنا حصّہ میری گرفت میں آ سکا، یا جس کی شگفتگی کے مزاج کو اپنے ماحول اور زبان اور محسوسات کے مزاج سے ہم آہنگ پایا، میں نے انھیں چند لائنوں کو اپنے مقدّر کا موتی سمجھ کر چُن لیا۔ بعض مقامات پر، جہاں قسمت ارض و سما کھُلتی ہُوئی محسوس ہُوئی ایسا بھی ہُوا کہ میں بنیادی خیال کی روشنی میں آگے بڑھتا ہوا لطف و سرور کی ایک رَو میں، نظم کے چوکھٹے ہی سے باہر نکل گیا۔ اور کبھی کبھی تو باگ ہاتھ سے اِس طرح بھی چھوٹی کہ میں اُس نظم کو اپنی نظم بھی کہہ سکتا ہوں۔ مگر وہ میری نظم تو جب ہوتی اگر اُس کے بنیادی خیال کو بھی میں نے ہی سوچا ہوتا۔ بیشتر منظومات کے عنوانات بھی اپنی "گرہ" سے مہیا کیے ہیں تاکہ مفہوم میں سلاست اور ابلاغ کا جوہر، کم از کم میری مقدرت کی حد تک تو کھٹکتا رہے۔ انگریزی نظموں کا متن ساتھ نہیں دیا گیا البتّہ شاعر کا نام لکھ دیا ہے تاکہ سرچشمے کی نشان دہی ہو جائے۔

مجموعی طور پر میں اپنی اِس کاوش کو آزاد نظموں کا آزاد ترجمہ، بلکہ "ترجمانی اور بعض صورتوں میں، ترجمہ بمعہ تجاوزات کہوں گا۔ اس کے باوجود ترجمے کے بارے میں، اپنے دوست سیّد عبدالحمید عدمؔ کے ایک شعر کے بمصداق، میرا احساس یہ ہے کہ

جو دلکشی گناہ کی نیّت میں ہے عدمؔ
وہ دلکشی ملی نہ کبھی ارتکاب میں

اوہ — ارے ہاں! یہ بتانا تو میں بھُولے جا رہا تھا کہ کتابوں کا یہ تحفہ مجھے اُردو زبان کے مایۂ ناز مزاح نگار (میجر جنرل) شفیق الرحمٰن نے بھیجا تھا۔ میں اپنی اس کاوش کو موصوف ہی کی نذر کرتا ہوں —

ضمیر جعفری

مسز ولیم

"مسز ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو
کبھی پتھر، کبھی مکھن، کبھی افیون تھی یارو

اگرچہ جسم کہنہ سال میں خاصی گرانی تھی
اگرچہ قد بھی کچھ ترچھا تھا کاٹھی بھی پرانی تھی
گلابی گفتگو میں اب بھی خوشبوئے جوانی تھی

بڑی بی، زندگی سے والہانہ پیار رکھتی تھی
رسیلی آنکھ، تازہ روغنی رخسار رکھتی تھی
ہر اُنگلی ہاتھ کی ناخون تھی، شبخون تھی یارو!

"مسز ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
جو اِس کے واسطے نازک اَچھوتے پھول لاتے تھے
ستارے توڑ کر جو اس کے رستے میں بچھاتے تھے
وہ اس "مغرور لیڈی" سے عموماً جھاڑ کھاتے تھے

مگر جو اس تلوّن آشنا سے دُور رہتے تھے
وہ اِس کی مہرباں نظروں سے "موتی چور" رہتے تھے
یہ اُن کے دردِ دل کی مرہم و معجون تھی یارو!
مسز ولیم عجب انداز کی خاتون تھی یارو!

شبِ آدینہ جب سرجان بینگ آتے تھے گھر اِس کے
کئی اربابِ خوش خلوت بھی سنگ آتے تھے گھر اِس کے
زر و زیور، جواہر، رنگ رنگ آتے تھے گھر اِس کے
رومالوں میں "شِلنگوں" کے "شلنگ" آتے تھے گھر اس کے

زِ سرتا پا، خوشی سے سُرخ تھی، "گل گون" تھی یارو!
"مسزِ ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
ابھی دانتوں میں تھیں موتی کی لڑیاں۔ لوچ باہنوں میں
ابھی کچھ ساحلی کونجوں کی حسرت تھی۔ نگاہوں میں

وہ اِس سِن میں بھی اک سروِ رواں تھی، سیرگاہوں میں

محلّے بھر کی افواہوں کا "ٹیلی فون" تھی یارو!
"مسزِ ولیم" عجب انداز کی خاتون تھی یارو!
(طامس مور)

انگریز

(SIR W.S. GILBERT)

انگریز کا جی تو چاہتا ہے
گھُل مل جائے
سب خطۂ ارض کے لوگوں سے

وہ گورے ہوں یا کالے ہوں
جس ملک کے رہنے والے ہوں
انگریز مگر اندر سے وہی انگریز رہے
اپنے محدود جزیرے کا

قبریں

(C.K. CHESTERTON)

وہ لوگ جنھوں نے جیتے جی
انگلینڈ کی خاطر دُکھ جھیلے
اور کشٹ سہے
اُن کی قبریں، اس مٹّی کی آغوش میں ہیں
اور انگلستان کے پنکھ پکھیرو
پر افشاں
اس نیل گگن کے غُرفوں میں
اور اے میری پیاری ارضِ وطن!
وہ لوگ جو اور جزیروں میں
تیری آن کی خاطر ڈٹ بھی گئے اور کٹ بھی گئے

اُن کج کلھوں کی قبریں ہیں
ان دُور دراز زمینوں میں،
لیکن وہ لوگ جو آج سبھی
سرتاج ہُوئے، مہاراج ہُوئے
اُن کی قبریں موجود نہیں ؟

کاہل کسان

ایک شخص !
ایک کاہل کاشتکار
سخت غربت کا شکار
تا کمر ڈوبا ہُوا
بھوک کی دلدل کے بیچ
فصل بوتا ہی نہ تھا
فصل بوتا ہی نہ تھا
رُت بوائی کی جب آتی تھی تو کھا جاتا تھا بیج

(نامعلوم)

ہفتم جنگ

EDMAND C. BENTLEY

خان بہادر ہفتم جنگ
کپڑوں کے بھی سات ہی رنگ
گھوڑا نٹ کھٹ، آپ دبنگ
ڈیوڑھی اندر آٹھ ملنگ
چرس اُڑائیں، پی کر بھنگ
اکثر دیکھے اُن کے سنگ

خان بہادر ہفتم جنگ

مرغی کا انعام

اِک خطیبِ خوش بیاں نے ایک مرغی سے کہا
حُسن تیرا — واہ وا
سرمگیں تیری نظر
ریشمیں تیری ادا — واہ وا
کتنی پیاری، کیا سڈول
اس پہ مرغی نے، اُسی جا بیٹھ کر
کُڑکُڑا کر اِک — "کُڑڈوں" کی
اور اِک انڈا دیا
گول گول
کتنا دلکش! کتنا پیارا! — کیا سڈول!

(نامعلوم)

راجہ سعادت علی

تھا ہمارے محلّے میں اک آدمی
نام تھا اُس کا راجہ سعادت علی
نام کے عرف کتنے بگڑتے رہے، لاڈ سے، پیار سے
پہلے سادا ہُوا، پھر وہ سیدا ہُوا
اپنے یومِ ولادت پہ پَیدا ہُوا
اِس کی شادی کا دِن بھی، وہی روز تھا
اس کی بیوی کی جس روز شادی ہُوئی
پھر وہ اک روز دُنیا سے رُخصت ہُوا
موت بھی اُس کو آئی اُسی روز ہی
مرگیا، یعنی راجہ سعادت علی

(نامعلوم)

حوصلہ افزائی

ایک لڑکی پاس کے گاؤں میں تھی
بولتی تھی جیسے کوئی فاختہ
شام کو — ہُو ہُو کرے — ہُو ہُو کرے
یا پپیہا صبح کی "ٹھکار"[1] میں

---

[1] پنجابی کے لفظ ٹھکا یا ٹھک سے

کُو کرے — کُو کُو کرے

دَوڑ کر پیڑوں پہ چڑھ جاتی تھی وہ
اپنی اِک چھوٹی بہن کو ساتھ لے جاتی تھی وہ
دُور سے تالی بجانے کے لیے

(نامعلوم)

میرا چہرہ

(ANTHONY EUWER)

مرا چہرہ، اے مرے دوستو
نہ تو چاند ہے، نہ گلاب ہے
مگر اسے کہ تُم!
میری خلوتوں کے حبیب ہو، میری جلوتوں کے قریب ہو
میری زندگی کے رفیق ہو! میری چاہ ہو
میری دھڑکنوں کے گواہ ہو!
مرے دوستو، مرے آشناؤ تمھیں کہو!
کہ وہ — "میں جو ہوں"
وہ جو میرا جوہرِ ذات ہے
کبھی تابِ رُخ سے چھلک سکا؟
کسی شیشہ گر کی دکان میں، کبھی جا سکا، یا سما سکا!
کبھی بک سکا، کوئی پا سکا؟
کوئی اُس کے دام چکا سکا؟

برمنگھم کی میم

(OLVIR HERFORD)

برمنگھم میں تھی اِک نار
تیز زبان، صبا رفتار
لائی ایک نئی گرگابی
سیر کو نکلی بڑی شتابی
جیسے چلے جوان چکور
کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ

جھٹ پٹ، جھٹ پٹ، جھٹ پٹ، جھٹ پٹ

جوتا کٹ کٹ کاٹے پاؤں
مانے دھوپ، نہ جانے چھاؤں

وہ منہ زور

جب گھر آئی

لیٹی اوڑھ کے گرم رضائی

"ہائے ہائے — مر گئی ہائے

مرہم مل مل کرے ٹکور
برمنگھم کی تیز چکور

کلکتے کا بابو

کلکتے کا بابو دیکھا

نام اُس کا تھا پھتّن

کالے کالے بال تھے اُس کے، کالا کالا متّھا

منہ میں چُونا، کتّھا

تیز تیز جب بولے

باتوں میں ہچکولے

روٹی — رے رے، روٹی

مکّھن — نانا، مکّھن
کلکتے کا بابو دیکھا

نام اُس کا تھا پھتّن (نامعلوم)

چوک کا اسٹور

(RICHARD H. FIELD)

چوک کا اسٹور دیکھ

اِک کمالِ صنعتِ شیشہ گری

جگمگاتی، آئینہ در آئینہ الماریاں

اطلس و کمخواب بھی

انجم و مہتاب بھی

مشرق و مغرب کی نادر صورتیں
چاندنی کی مورتیں
پیرہن، موتی، زری جھومر، حسیں جھلکاریاں
فرش شیشہ بند، چھت بلور کی
ایک تنکا بھی گلی سے اُڑ کے آ سکتا نہیں
آج کی معلوم دنیا کی ہر اک شے ہے یہاں
ہاں ۔ صداقت کے سوا

فن کار

(F. R. SCOT)

یہ محفل ہے فن کاروں کی
سچائی کے اوتاروں کی
انصاف کے پہرہ داروں کی
سر کے اُوپر دیواروں پر
تصویریں ہیں
شہزادوں کی، ملکاؤں کی، آقاؤں کی

کتابیں

(IRWIN EDMAN)

کتابیں ؟
جن میں گُر لکھے ہیں
ہنسنے اور رونے کے
نہ ہونے اور ہونے کے
کسی کو رام کرنے کے، کہیں آرام کرنے کے
بھلائی سے بُرائی چھانٹنے چھڑنے کی ترکیبیں
ترقی کے سنہرے، آزمودہ کارگر نسخے
بڑے لوگوں کی دعوت میں چقندر کاٹنے کا فن
میں پڑھ کر ان کتابوں کو
یہ اکثر سوچتا ہوں کتنی صبحیں مر گئی ہوں گی ؟

ایک مسخرہ

میں اَن پڑھ تھا
میں بازار میں، جوتے پالش کرتا تھا
بوڑھے، گنجے، پنشنروں کے سر کی مالش کرتا تھا

(نامعلوم)

اُونچی سبز حویلی میں

(اک میجر جنرل رہتا ہے)

گاؤں سے باہر
مٹیالی، گدرائی بھوبھل اینٹوں کے اسکول سے ہٹ کر
نیلی سی، باریک سی، اِک خوابیدہ پگ ڈنڈی کے اُوپر
ایک لکیر جو کھیتوں میں بَل کھاتی ہے
اِک اُونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

وہ پہلی بڑی لڑائی میں
لفٹین ہُوا، کپتان ہُوا
کیا ترچھی ٹوپی رکھتا تھا، جو سیدھی دل میں جا اُترے
کیا کَش کَش کرتی، چار سنہرے بکلس والی پیٹی تھی
خود اُس کے اپنے ماتھے پر بھی ماں کے پیار فروزاں تھے
برما پہنچا، جاپان گیا
اسوان گیا، میلان گیا
ترپولی۔ شط اسمارہ

ہر منظر آنکھوں کا تارا
صحرا چھانے ، ساحل گھومے
موسم چکھے ، چہرے چومے
اسمارا سے ایران گیا
وہ جس پلٹن میدان گیا
دشمن بھی لوہا مان گیا
زخمی بھی ہُوا ـــ قیدی بھی ہُوا
جنرل ہو کر ـــ آخر وہ فوج سے گھر آیا
اب کھیتی باڑی کرتا ہے
ہاتھوں میں کھُرپا مالی کا
اِک خاکی "نکر" ٹانگوں پہ
فصلوں کی نلائی کرتا ہے
مٹی کی کھُدائی کرتا ہے
لوگوں کی بھلائی کرتا ہے
" گھر پالی ٹماٹر کھاتا ہے
اور گاتا ہے !
ہپ ہپ ہُرّے ! ہپ ہپ ہُرّے

تسکین کا دریا بہتا ہے
اُس اُونچی سبز حویلی میں
اِک میجر جنرل رہتا ہے

بالوں پہ سفیدی چھٹکی ہے
کچھ پیٹ کا خط اُبھرا اُبھرا
کچھ ٹھوڑی لٹکی لٹکی سی
جینے کا مگر دستور وہی
انداز وہی، آواز وہی، اوقات وہی، منشور وہی!
دو بیٹے فوج میں افسر ہیں
اک میجر پیدل پلٹن کا
اِک کرنل کسی رسالے میں
چک لالے میں!
خط آتے ہیں، خط جاتے ہیں
(یوں ہلکے ساز بجاتے ہیں)
اِک ستھرا "شیلف" کتابوں کا
(جھرمٹ انسان کے خوابوں کا)
اور طاقوں میں تصویریں بھی

صف کے جاں باز جیالوں کی
میدان میں مرنے والوں کی
چھوٹے سے "مویشی خانے" میں
اِک چوکس کُتّا بیٹھا ہے
اِک سانڈل گائے تھان بندھی
اک دُبلا مشکی گھوڑا بھی
چائے کے ساتھ پکوڑا بھی
وہ گرم پکوڑا کھاتا ہے
اور گاتا ہے
ہِپ ہِپ ہُرّے ! ہِپ ہِپ ہُرّے !
اِن سادہ سے دو لفظوں میں
یادوں کی راس رچاتا ہے
خوابوں کے چاند جگاتا ہے
خوش رہتا ہے
ہر آتے جاتے راہی سے، جو گزری ہے وہ کہتا ہے
اُس اُونچی سبز حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

(ڈم ڈم سے ماخوذ)

فیصلہ دل کا

(PHYLLIS MCGINLEY)

مختصر سی کوئی سطر
ایک جملہ، ایک لفظ
دفعتاً کر دے اُداس
ڈوب جائے، سارا منظر آس پاس
کوئی جانی دوست کہہ دے — ”الوداع“
کوئی یہ لکھے کہ پیسے بھیج دو
یار سے قطعِ محبت کا پیام
ایک جملہ، ایک لفظ
دل میں اِک گمبھیر، نم افسردگی پیدا کرے
زندگی سے برہمی پیدا کرے

زندگی کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھا چاہیے
کوئی کہہ دے — تو ہے میری زندگی
”چاندنی — راگنی — بانسری“
”باعثِ آبادیٔ ما پائے تست“
”گانٹھ نکٹائی کی ہے کتنی درست“
”سرخوشی کی موج ہے تیری نظر“
”روشنی کی اوج ہے تیرا ہنر“
”تیرے دانتوں میں نہیں کوئی خلا“
”ایک چیک ملفوف ہے دس پونڈ کا
ایک جملہ، ایک لفظ
سر سے پا تک شہد کا رس گھول دے
اِک نئی اُمید کا در کھول دے

کیبن بوائے

(KIETH PRESTON)

میں کہ اپنی بحریہ کا نامور کپتان ہوں
بادباں کھلتے ہیں میرے حکم پر
میرے ”سگنل“ پر سمندر میں اُتر جاتے ہیں ”لانچ“
پانیوں میں نغمہ خواں رہتا ہوں میں
ساگروں پر حکمراں رہتا ہوں میں
لیکن اِس منصب کے سب طبل و عَلم کے باوجود
اپنی فطرت کے سرودِ محتشم کے باوجود
میں اک آسودہ خوشی کے سائے میں تھا
جب اس کشتی پہ اِک چھوٹا سا ”کیبن بوائے“ تھا

غمِ روزگار

(OGDEN NASH)

نہ جانے کتنا اُداس رہتا
میں زندگی بھر
نہ گر غمِ روزگار ہوتا

اپنی تعریف میں اخبار کا شذرہ پڑھ کر

(IRWIN EDMAND)

اخبار نے مقالہ
چھاپا تیری ثنا میں
اور بانس پر چڑھایا تیرے کمالِ فن کو
باور ہوا تجھے بھی
لہجہ ترا نیا ہے، مضمون بھی ہے تازہ، اسلوب بھی نرالا
تُو اولیا قلم کا، قندیل جان و دل کی
اپنا شمار سمجھے اُونچے مفکّروں میں

سخت جان

(JOHN GAY)

ڈاکٹر کی دوا سے نہیں جو مرا
اُس کو پھانسی کے پھندے
سٹین گن کی گولی سے
ڈرنا عبث ہے

زندہ دل بوڑھا

(EDWARD LEAR)

میرے قصبے کا اِک بوڑھا
تیس برس سے پنشن کھاتا
اپنے آپ کو چھوکرا سمجھے، تیرہ چودہ سال کا
شہر میں کوئی میچ نہ چھوڑے کرکٹ اور فٹ بال کا
چوک میں آکر،
باغ میں جاکر، بچّوں کی ٹولی کے اندر
شور مچائے، ڈنٹر پیلے
کرے کلیلیں
دَوڑے آنکھ مچولی کھیلے
چوسے گنّا، کھائے کیلے
گلے میں تِتلی، نیروبی یا کمپالا کی ہنسلی ڈالے
سر پر جو کچھ بال بچے ہیں
لٹیں پروئے، کچیں نکالے
بچّہ تو خیر اب وہ کہاں ہے
لیکن بوڑھا بھی کب جاپے ستّر، اسّی سال کا
شہر میں کوئی میچ نہ چھوڑے کرکٹ اور فٹ بال کا

افسر خط لکھواتا ہے

(JOHN HOLMES)

افسر خط لکھواتا ہے
اپنی حسیں، نوخیز، نکیلی، بانکی، شوخ "اسٹینو" کو
سوچ کی لہر میں لفظ ٹٹولے
دائیں گھومے، آگے کھسکے، بائیں ڈولے
پنسل رکھ کر، نئے سیگار کا ڈبہ کھولے
پھیرے ہاتھ کبھی وہ اپنے چپڑے چپڑے گالوں پہ
سر کے کترے بالوں پہ
بھینچ کے ہونٹ کرے کچھ — "من من"
ناک کبھی کھجلاتا ہے
خود ذرا سا گاتا ہے
افسر خط لکھواتا ہے

پالیسی

(CAROLYN WELLS)

قدیمی نوادر کے اسٹور سے
بھیڑ کی کھال کی شال میں نے خریدی
کہ تحفے میں دُوں اُس "ببر بھیڑیے" کو
جو پنجے جما کر
مرے گھر کی دہلیز پر "غرفشائے"

قبر کتبے

(۱)

میاں بیوی کی مشترکہ قبر پر

اس قبر کے قبّے کے نیچے
ہم موت کی نیند ہیں، سوئے ہوئے
یعنی — میں اور میری زوجہ
اُس کا منہ مغرب کی جانب، میرا منہ مشرق کی جانب
محشر کے گجر کی "دھپ" سُن کر
وہ مجھ سے اگر پہلے اُٹھی

میں جاگ کے پھر سو جاؤں گا

(نامعلوم)

(۲)

(ایک جوانامرگ احمق)

FRANCIS WITH TING MATCH

آنجہانی ایک احمق شخص تھے
یہ تو تھا معلوم مر جائیں گے آپ
لیکن اِس پھُرتی کے کیا کہنے جناب ؟

(۳)

ماہرِ تعمیرات کی قبر پر

(SIR JOHN VANBOKUCH)

تیری تربت پہ مٹی کے گراں تودوں سے ظاہر ہے
کہ تو بھی جو بناتا تھا، بہت بھاری بناتا تھا
جہاں نصف اینٹ لگتی تھی، وہاں پتھر لگاتا تھا
نمک دانی بنانی ہو تو الماری بناتا تھا

(۴)

ہوٹل کے گھاگ بیرے کی قبر پر

DAVID MECORD

ہوٹل کے بوڑھے بیرے
جان سٹرانگ کو موت آئی ہے

موصوف رہے معروف بہت

اب اسّی سال کے بعد آخر

اللہ سے آنکھ ملائی ہے

(۵)

بیوی کی قبر پر

(JOHN DRY DEN)

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جن ایّام سے
وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

ہوٹل

(THOMAS HOLMES)

جو تُو ملتان میری جان جائے
نہ ہوٹل "میم" — میں ہرگز ٹھہرنا
نہ ہوگا پیٹ کی خاطر نوالہ
نہ کوئی شخص گھنٹی سننے والا

بادشاہ سلامت

EARL OF RUCHESTOR

یہ قبر ہے ملکِ معظّم کی
سرتاج تو اُس کا تھا وزنی
(سونے ، ہیرے کا تاج تھا وہ)
پر لفظ میں کوئی وزن نہ تھا — کچھ وَقر نہ تھا!
کچھ کارِ حماقت بھی نہ ہُوا
نَے عقل کی کوئی بات کری

اندازِ دلبری

ROBERT HER ICK

جس کو عورت کرے پسند
اُس کَن راکھے آکھیاں بند

کپڑے کتنے بھی ہوں تنگ
جکڑا، پکڑا، اِک اِک رنگ
جتنی تنگ اُتنی خورسند
کس کر باندھے چاروں بند
بے شک دو کپڑا دوچند
تنگ لبادہ بڑا پسند

شیر

(G . K CHESTERTON)

چیتا ساتھ اگر چلتا ہوں
جنگل، لاکھ ہو اُلجھا، اندھا، گھنا، اندھیرا
ڈر نہیں رہتا
شیر کسی کو ”سَر“ نہیں کہتا

انصاف

LORD BOWEN

بارش تو برستی ہے یکساں
حقدار پہ بھی، عیّار پہ بھی
بھیگے ہے مگر حقدار بہت
حقدار کے گھر جو چھتری تھی
عیّار نے سینہ زوری سے یا چوری سے
وہ اپنے سر پہ تانی ہے
مسٹر! یہ ریت پُرانی ہے

روشنی کے اندھے

DAVID MECORD

بہت لوگ ہوں گے
کہ جو دیکھ لیتے ہیں، دن دوپہر کو
فلک کی کسی کھوہ میں، یا گپھا میں
کوئی دھندلا دھندلا — اکیلا دُکیلا
ہمکتا سا اِک ننھا مُنّا ستارہ
مگر ایسے انساں بہت کم ملیں گے
کہ جو دیکھ پائیں
دمکتی ہوئی کہکشاں آسماں پر
مسرّت کا جو دودھیا راستہ ہے

سخت گیر باپ

CAPTAIN BARRY GRAHAM

جیک اور جِل اور انڈر بِل
تینوں بچوں نے جب مِل کر
گھر میں کھڑ بڑ شور مچایا
اُچھلے، کُودے، چیخے، دھاڑے
الماری میں برتن توڑے، دروازوں کے پردے پھاڑے
باپ اُن کو دریا پر لایا
اِک اِک کرکے، پُل اُوپر سے، تینوں کو دریا میں گرایا
تیسرا بچّہ، شاید جِل یا انڈر بِل تھا
جب دریا میں ڈوب رہا تھا
قبلہ والد ماجد بولے
بچّوں کو بس دیکھا جائے، سُنا نہ جائے!

تعلیم

DAVID MECORD

اُستاد اِستادہ بچوں پر
دانش دَر کھولے، لیکچر دے، حکمت کے موتی بو جائے
شاگرد یہ موتی چُن نہ سکے، ہاں گِنتے گِنتے سو جائے

راستے کی چاپ

MORRIS BISHOP

اِس نظم کا ذائقہ مختلف ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی ”بعض ظرافتیں“ میرے ہاتھ نہ آسکی ہو۔ اس کا ترجمہ کرتے وقت مجھے خود تعجب ہُوا کہ اس نوع کی نظم ایسے شگفتہ مجموعے میں کیونکر در آئی۔ مگر جب میں ایک مرتبہ اس کے اندر اتر گیا تو اس کے حزن میں زندگی کی ایک ایسی حسین صبح مسکراتی ہُوئی محسوس ہُوئی کہ میں نے اپنے آپ سے کہا — ”میاں اب چلنے دو“ (ض)

مل گئی ایک پُرانی کاپی آج مجھے الماری سے
یادوں کا دریا بہہ نکلا، میری خواب پٹاری سے
اِک اِک نقش سے چھن چھن نکلی جوت پُرانی یادوں کی
کچھ چہرے خوش قد لڑکوں کے، کچھ شکلیں اُستادوں کی
آڑی ترچھی، نرم لکیریں، دل کی سجل تصویریں ہیں
جن کو چُپ چُپ پوجا میں نے، یہ اُن کی تصویریں ہیں
کچھ ورقوں پر پنسل سے جو خاص نشان بنائے تھے
کچھ کلیوں کے نقشے سے تھے یہ، کچھ پیڑوں کے سائے تھے
بول اُٹھے سب نقطے شوشے یادوں کی شہنائی میں
جاگ پڑا مدّت کا سویا شہر مری تنہائی میں
رنگیں کلغی طاؤسوں کی، پتلے سینگ غزالوں کے
عکس، ہمارے بال پنے کے رنگ برنگ خیالوں کے
دیکھ رہا ہوں چند شناسا نمبر ”ٹیلی فونوں“ کے
راتوں کو ہنستے تھے جن پر منصوبے ”شب خونوں“ کے
تھام مجھے اے وقت کی ظالم گردش تھم کر تھام مجھے
آج اچانک یاد آئے کیا پیارے پیارے نام مجھے

میرا دوست، میرا بھائی

منظور الٰہی

زِ رفتنِ تو من از عمر بے نصیب شُدم
سفر تو کردی و من در وطن غریب شُدم

عمر میں اتنا فرق تھا کہ منصور میاں کو گود میں اُٹھانا مجھے یاد پڑتا ہے، تب بھی جو پیار سے بُلائے بلا تکلف اُس کی آغوش میں آجاتے تھے، یہ عادت آئندہ زندگی میں ’سوشل‘ ہونے کی نشاندہی کرتی تھی۔ عمر میں فرق۔ اس بات کی دلیل نہیں کہ بڑا بھائی ’بزرگ‘ ہے اور برادرِ خورد ’برخوردار‘، طبائع متضاد نہ ہوں تو ماہ و سال کا فرق دوستی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہوتا۔ چھوٹا بھائی ہو یا بیٹا بیس بائیس برس کا ہو جائے تو اُس کے ساتھ دوستی ہو جاتی ہے یا رُوکھا پن دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے۔

پچیس برس پہلے والد مرحوم نے وعدہ کیا تھا کہ منصور ایف ایس سی پاس کر لیں تو ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی تربیت کے لئے جرمنی بھجوا دیئے جائیں گے لیکن لائل پور میں ’کزنز‘ کی کثرت تھی، دن رات خوش گپیاں، قصے کہانیاں، منصور پہلی کوشش میں ناکام ہو گئے، انہوں نے کتابِ زندگی کا پہلا سبق اسی تلخ تجربے سے سیکھا، مسلسل محنت اور سعیِ پیہم سے ہی ’تلخ زندگانی انگبیں‘ ہے، اُنہی دنوں مجھے پہلی بار ضلع کا چارج ملا تھا۔

منصور نے خط میں لکھا "آپ کو معلوم ہو گا میں ایف ایس سی میں کامیاب نہیں ہو سکا، یہ سراسر میرا قصور ہے، میں نے محنت نہیں کی، آپ کی اجازت ہو تو آپ کے پاس رہ کر دل جمعی سے پڑھوں اور مقامی کالج میں داخلہ لے لوں" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن مجھے یقین نہ آیا کہ منصور جو لکھ رہے ہیں اُس پر واقعی عمل کر سکیں گے، شاید ایک کھلنڈرا عارضی طور پر سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہے! لیکن آفریں ہے کہ منصور میاں نے اپنا وعدہ خوب نبھایا، میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، ہمارا بیشتر وقت اپنے اپنے کمرے میں گزرتا، اپنے کام سے کام، رات کے کھانے پر آدھ گھنٹے کے لئے اکٹھے ہوتے تو کوئی بات ہوتی، منصور کیمبلپور کالج میں داخل ہو گئے اور بہت جلد اپنے ہم جماعتوں سے گھُل مِل گئے، جلد گھل مل جانے کا ملکہ انھیں فطرت سے ودیعت ہوا تھا، اساتذہ کے دل میں بھی انہوں نے اپنے لئے ایک مقام پیدا کر لیا تھا، اپنے ٹیوٹر کے اِصرار پر انگریزی کے انٹر کالجیٹ مباحثے میں حِصّہ لیا اور ایبٹ آباد سے ٹرافی جیت لائے۔

منصور میرے پاس ہی تھے جب راولپنڈی کے جلسۂ عام میں وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کے دردناک قتل کی خبر ملی، اسی شام شہر کے چند معززین با چشمِ پُرنم اس سانحۂ عظیم پر افسوس کے لیے آئے تھے لیکن جب رات گئے مقامی کلب سے ہنسی مذاق، قہقہوں اور ٹھٹھوں کی بلند آوازیں آنے لگیں تو ہمیں سخت تعجب ہوا، بدقسمتی سے کلب میں ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے

ہمیشہ انگریز کی طرفداری کی تھی۔ پھر بھی ایسا قومی المیہ ہونے پر ہنسی مذاق کا کون سا موقع تھا، منصور کی زندہ دلی رخصت ہو چکی تھی اور وہ غم واندوہ کی تصویر تھے، کچھ دیر ہم سرنیچے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے، پھر منصور اُٹھ کر کلب گئے اور ممبروں کو میرا پیغام پہنچایا کہ ہوش کی دوا لیں، مبادا کوئی جیوٹ چاقو لے کر کلب میں گھس آئے۔

منصور میاں ایف ایس سی میں اچھے نمبر لے کر کامیاب ہو گئے تو والد مرحوم نے اپنا وعدہ پورا کیا، اُن دنوں یورپ جانے کے لئے بمبئی سے بوٹ ملتا تھا، پاسپورٹ اور کاغذات کی درستی وجۂ تاخیر ہوئی، جب منصور بندرگاہ پر پہنچے تو جہاز لنگر اُٹھا چکا تھا اور پائیلٹ گہرے پانیوں کی طرف اُس کی رہنمائی کر رہا تھا، منصور میاں دُھن کے پکے تھے، جس چیز کے پیچھے پڑتے ہاتھ دھو کر پڑتے، اُن کا بیان تھا کہ میں نے تہلکہ مچا دیا۔

" میرا کیریر تباہ ہو جائے گا۔
میں کہیں کا نہ رہوں گا۔
میں بے آسرا ہوں، میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

پورٹ اتھارٹی کو جہاز واپس بلاتے ہی بنی، تماشہ دیکھنے کے لئے جہاز کے مسافر عرشے پر جمع ہو چکے تھے، جب اکیلے مسافر کے لئے سیڑھی لگائی گئی تو انہوں نے پرجوش تالیوں سے نو وارد کا خیر مقدم کیا۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں جرمنی میں طالب علمی کا زمانہ بچوں کا کھیل نہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے تک ملک مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ منظم اور محنتی جرمن قوم ملبہ سے ایک نئے جرمنی کی تعمیر میں سرگرم تھی، سخت سردی تھی، سنٹرل ہیٹنگ ابھی دور کی بات تھی۔ لینڈ لیڈی کے ہاں غسل کا اہتمام نہ تھا، منصور کہیں اور جا کر پانی گرم کرتے اور بالٹی میں ڈال کر لے آتے۔ ایک روز لینڈ لیڈی نے پوچھ ہی لیا" یہ روزانہ جو غسل کرتے ہو تمہاری طبیعت تو اچھی ہے نا؟"

خوراک وافر نہ تھی۔ اُبلے گوشت کا چھوٹا ٹکڑا ہوتا، باقی آلو، دن بھر ورکشاپ میں عملی تربیت ہوتی، رات کو انجینئرنگ اسکول میں پڑھائی ہوتی جہاں پہلے چھ ماہ جرمن زبان سیکھنے میں صرف ہوئے۔ جرمن بولنے میں منصور نے ایسی دسترس حاصل کر لی تھی کہ اہلِ زبان حیران ہوتے تھے۔ محنتِ شاقہ کی عادت، سخت گیر تربیت، کام کو کام سمجھنا اور ہمہ تن مستعد ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہونا شام کو تھکے ماندے گھر لوٹنا اور تفریح کی تلاش، زندگی کے متعلق منصور نے یورپی نقطۂ نظر کو اپنایا، عنفوانِ شباب میں یہ چھاپ ایسی لگی کہ تا عمر رہی۔ عمر بھی کتنی پائی۔ چوالیس برس پورے نہ ہوئے تھے کہ رخصت بھی ہو گئے!

جب اُن کی یاد آتی ہے تو ایک کھلکھلاتا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ گھنگھریالے بال، روشن جبیں، بُشرے سے پھوٹتی ہوئی مسکراہٹ کی کرنیں۔ چوڑا چکلا سینہ۔ خوش قطع، خوش لباس۔ ہاتھ میں بریف کیس، محنتی، مستعد، چاق و چوبند۔ ایک کامیاب بزنس ایگزیکٹو کی تصویر۔ . . . اپنی مختصر زندگی میں منصور میاں نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ پاکستان اور یورپ کے بڑے شہران کی زد میں رہتے تھے۔ گھر آکر وہ بڑے مزے سے اُن جگہوں کے قصے سناتے۔ بقول ایک دوست کے جس جگہ منصور موجود ہوتے وہ جگہ حسین ہو جاتی۔ جہاں بیٹھتے محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔

منصور میاں کا تعلق اُس کم یاب جنس سے تھا جسے ہم جانِ محفل کہتے ہیں۔ انھیں ہر چھوٹی بات میں مذاق کی تلاش رہتی۔ کیمپس پر کی سڑکوں پر، پھر برسوں بعد کھلا کب ہیں۔ میرے بہت سے شناسا انھیں سلام کرنے میں پہل کرتے، یقیناً وہ زیادہ وجیہہ اور صحت مند تھے۔ لیکن خاندانی مشابہت سے غلط فہمی ہو جاتی۔ وہ اس انداز سے جواب دیتے گویا منصور نہیں۔ منظور ہو۔ اور بہت محظوظ ہوتے۔ ہر ایک معمولی واقعہ اس انداز سے بیان کرتے جیسے کوئی اچھوتا نادر وقوعہ ہو۔ طرزِ بیان میں تازگی اور شگفتگی ہوتی عجیب و غریب حرکتیں کر کے یا منہ مٹک کے چل کر ایسی ایکٹنگ کرتے کہ ممدوح کی شکل آنکھوں کے سامنے آجاتی اور لوگ مارے ہنسی کے بے اختیار ہو جاتے۔

جن دنوں وہ فرم کی طرف سے ڈھاکہ تعینات تھے، انھیں شرارت سوجھی۔ تین چار دوستوں کو کراچی سے تار بھجوا دیئے کہ اُن کے عزیز فلاں فلائیٹ سے ڈھاکہ پہنچ رہے ہیں۔ وہاں اُن گھرانوں سے رابطہ قائم رکھا اور دیکھتے رہے کہ مہمانوں کے لئے کمرے تیار کئے جا رہے ہیں، پکوان پک رہے ہیں۔۔۔۔ دو چار احباب کو ساتھ لے کر اُس شام ایرپورٹ پر پہنچ گئے، دوست ہمہ تن انتظار تھے۔ اور یہ دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ جب اُس فلائیٹ سے کوئی نہ آیا اور دوستوں کی پریشانی بڑھی تو صحیح قصہ بتلایا۔ اور ان لوگوں کے گھر جا کر ضیافت اُڑائی۔ دل لگی کے انداز بھی عجیب تھے۔

مزاح اور حاضر جوابی کے علاوہ منصور میں حق بات کہہ ڈالنے کی جرأت بھی تھی۔ قیام جرمنی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک روز پروفیسر کلاس میں پڑھا رہا تھا کہ ازدواجی تعلقات کی بات شروع ہو گئی۔ جانے اُسے کیا سوجھی، کہنے لگا۔

"میرے دوست منصور کو لیجیے، مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں اس کے والد کے حرم میں متعدد بیویاں ہیں۔" منصور نے بتلایا تھا کہ کلاس میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ مارے غیرت کے میرا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن میں نے فی الفور کہا "میرے والد کا حرم ہو گا لیکن اُس نے ہر کوچے میں قحبہ خانہ نہیں کھولا ہوا۔" کلاس پر اوس پڑ گئی، پروفیسر معذرت خواہ ہوا۔

وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ دور کی پیداوار تھے، اُردو اور فارسی ادب سے انھیں قطعاً دلچسپی نہ تھی، شعر یاد رکھنے کا ملکہ تھا نہ برجستہ استعمال کا ذوق، غالباً سرما ۱۹۵۸ء میں اشفاق احمد نے ایک ہلکے پھلکے ماہنامے "داستان گو" کا اجرا کیا، خریداروں کی تلاش ہوئی تو میں نے اپنی فہرست میں منصور میاں کا نام بھی شامل کر لیا، رسالہ انھیں وی۔ پی۔ بھیج دیا گیا۔ جواب میں انہوں نے میرے مضمون سے پنجابی کا ایک فقرہ نقل کر بھیجا۔

" ایہہ ساڈے ورگیاں دا واسطے نئیں "

ہمارے دوست اطہر سے اُن کو یہی شکایت تھی، دونوں اکثر جہاز میں ہم سفر ہو جاتے، راولپنڈی سے لاہور تک پرواز مختصر ہونے کی وجہ سے اُردو کے دو چار شعر ہی ہوتے اور اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق منصور میاں داد دیتے لیکن لاہور سے کراچی کی طویل پرواز صبر آزما ہوتی۔ "لاہور کے مطار سے اُڑتے ہی اطہر صاحب دُختِ رز کو تکلیف دیتے، پھر فارسی کا شعر پڑھ کر میری طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے تو میں محجوب ہو کر باہر کے موسم کی بات کرتا اور دل میں سفر جلد ختم ہونے کی دعا کرتا۔"

کوئٹہ ہو یا ڈھاکہ یا کراچی منصور میاں خوش آمدید کہنے کے لئے ہمیشہ ٹارمیک پہ موجود ہوتے۔ بعض دفعہ تو طیارے کا دروازہ کھلتے ہی اُن پہ نظر پڑتی۔ میں ڈھاکہ اور کراچی میں بسا اوقات منصور اور گیتی کا مہمان ہوا۔ مہمان نوازی میں وہ شاید ایک دوسرے پہ سبقت

سے جانا چاہتے تھے۔ بید آرام دہ کمرہ، صبح صبح منصور ڈریسنگ گاؤن پہنے بیڈ ٹی کی ٹرے اور اخبارات اُٹھائے مہمان کمرے میں آجاتے، گرم چائے کے گھونٹ روح کو طراوت بخشتے، حالاتِ حاضرہ پہ تبصرہ ہوتا، چھوٹی چھوٹی باتیں اور لطیفے، میں کبھی کہتا تمھیں گیتی کے ساتھ چائے پینی چاہیے، تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ بیگم ابھی سو رہی ہیں۔

منصور میاں کو میرے کراچی میں تعینات ہونے کی بڑی خوشی تھی۔ صحنِ چمن میں خوش آمدید کی پارٹی ایک یادگار تقریب تھی، الوداعی پارٹی میں بھی اُسی پیار کا مظاہرہ تھا۔ منصور اور گیتی کی موجودگی اور کراچی میں ڈیڑھ پونے دو برس کا قیام — اس کی یاد ایک حسین خواب کی طرح ہے جو پلک جھپکتے بیت گیا۔ جب منصور میاں بیوی بچوں کے ساتھ دو ماہ کے لئے مشرقِ بعید کے CRUISE پہ چلے گئے تو اُن کے بغیر ہم اُداس ہو گئے تھے، اس وقت سان گمان نہ تھا کہ یہ مستقل جدائی کا پیش خیمہ ہے۔

خلیق اور ملنسار تو وہ ہمیشہ سے تھے لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ نے باہمی وابستگی کا ایک اور در ہمارے درمیان وا کیا، اس زمانے میں دل و دماغ کی عجب کیفیت تھی، سرکاری سطح پر بُری خبروں کی پردہ پوشی کی جاتی لیکن شبانہ دھائیں دھم دھم پہ کون پردہ ڈالتا، اپنی بےبسی پہ دل کڑھتا۔ ہم میاں بیوی اپنے مکان سے کم باہر نکلتے تھے لیکن اُن دنوں تین چار بجے کے بعد گھر بیٹھنا دوبھر ہو جاتا، در و دیوار کاٹنے کو آتے، ہم منصور میاں کے ہاں پہنچ جاتے، وہاں چائے کا دَور ہوتا، پھر لمبی سیر پہ نکل کھڑے ہوتے، جنگ کی خبروں پہ طویل بحث تمحیص، لایعنی، لاحاصل، لیکن اُس سے کوئی مفر نہ تھا، اجتماعی غم غلط کرنے کے لئے بھی ہم عزیز ترین دوستوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

زندگی کے گزرتے ہوئے لمحوں سے منصور خود حظ اُٹھاتے اور چاہتے تھے کہ سب لطف اندوز ہوں۔ رات کو کھانے کے بعد دوستوں کو فون کر کے سینما دیکھنے کی دعوت دے رہے ہیں اور کچھ نہیں تو ایمپیرز میں کوفی ہو جائے اور پھر پی۔ آئی۔ ڈی سی شاپ سے پان ؎

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبحِ بہارے شبِ ماہے دریاب — غالب

کبھی شام کو محفل جم جاتی، بوگن ویلا کی کومل شاخیں خنک ہوا میں مستانہ وار جھوم اُٹھتیں، رات بھیگنی شروع ہوتی تو 'رات کی رانی' اپنا جادو جگاتی، گفتگو کا سلسلہ ٹوٹنے ہی نہ آتا، باتیں — موتیوں کی لڑیاں ایک دوسرے سے اُلجھتیں پھر خود بخود سلجھ جاتیں، بات آگے بڑھتی تو منصور فوراً 'اُ' کی تہ کو پہنچ جاتے۔ ؏

تو سخن نگفتہ باشی بسخن رسیدہ باشد

وہ گزرے ہوئے لمحے صدائے جرس کی نذرِ غبارِ کارواں میں جذب ہو گئے یا ایک زندہ حقیقت بن کر ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہیں؟ وہ مایا کا کھیل تھا نہ فریب، دو دلوں کی ہم آہنگی لمحۂ گریزاں کی دلفریبی کو اپنی گرفت میں لئے تھی، وہ 'زندگی' تھی۔

منصور میاں کے مکان کے باہر اب کاروں کی قطاریں نہیں ہوتیں، مہتاب کے برآمدے میں احباب کا ہجوم نہیں ہوتا۔ خیریت پوچھنے کے لئے ٹیلیفون کی گھنٹی بار بار نہیں بجتی۔ . . . . . لیکن یادوں کی خوشبو تا دمِ واپسیں میرے ساتھ رہے گی اور تشکر و امتنان سے لبریز دل کے ساتھ میں اُن خوشگوار ساعتوں کو آواز دوں گا جو ایک پیارے بھائی کی صحبت میں بسر ہوئیں ؏

باتیں ہماری یاد رہیں یہ باتیں پھر نہ سنیے گا

مجھے بھرپور وشواس ہے کہ سنہری جھیل کے اُس پار وہ ہمارے منتظر ہوں گے، وہی دلپذیر مسکراہٹ لبوں پہ کھیل رہی ہوگی، گرمجوشی سے بغل گیری ہوگی اور ـــ

بنشینیم و با تو راز گوییم
غمہائے گزشتہ باز گوییم
(خواجہ حسین)

ہیمرسمتھ ہسپتال کا ڈاکٹر گولڈمین منصور کا معالج تھا، خوش شکل، خوش اطوار گولڈمین چار برس منصور کا علاج بڑی ہمدردی اور تندہی سے کرتا رہا، وہ اپنے فن میں یکتا تھا لیکن بالآخر قدرت کے سامنے بے بس ہوگیا اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "میں مرض کا پھیلاؤ نہیں روک سکتا، میں شکست مانتا ہوں، مسٹر الٰہی کو پاکستان لے جائیے۔" اور یہاں یہ خود اعتمادی کہ منصور میاں گولڈمین کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہے ہیں: "ڈاکٹر جب تک بالکل تندرست نہیں ہو جاتا میں ہرگز پاکستان واپس نہ جاؤں گا۔" اور ڈاکٹر منصور کو طفل تسلی دیتا رہا۔ "آپ اچھے ہو جائیں گے، اب پاکستان چلے جاؤ، تین ماہ تک چیک اپ کے لیے آجانا۔" ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ ....

آخری سفرِ انگلستان میں محمود، منصور کے ہمراہ تھے، عمیق ایکس رے کے مسلسل علاج سے منصور بہت نحیف ہو چکے تھے، ڈاکٹر گولڈمین نے محمود کو خبردار کر دیا تھا کہ مریض کی حالت نازک ہے، انتقالِ خون اور ٹیکوں کے سہارے سے انھیں اس قابل بنایا گیا کہ لندن سے کراچی کا ہوائی سفر برداشت کر سکیں، محمود میاں اس طویل پرواز کے متعلق سخت متفکر تھے لیکن چلنے پھرنے سے ممانعت کے باوجود آخری روز منصور شاپنگ پہ جانے کے لیے اصرار کرنے لگے، محمود نے پیکنگ کا بہانہ کر کے بمشکل پیچھا چھڑایا، یہ جانتے ہوئے کہ مرض جان لیوا ہے منصور نے بیماری کا مقابلہ بڑی جرأت اور پامردی کے ساتھ کیا، چار برس قبل لندن میں ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا ایسی حالت میں ایک برس سے تین برس تک ہی مہلت ہوتی ہے، اس کے باوجود منصور نے سات آٹھ ہزار روپے کی ملازمت چھوڑ دی۔ اپنا کاروبار شروع کیا اور کامیابی سے چلایا، رہائش کے لئے ایک خوب صورت بنگلہ اپنی نگرانی میں تعمیر کرایا۔

مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

انہوں نے بیماری کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے نہ ڈاکٹروں کے کہے کو حرفِ آخر سمجھا، ناقابلِ بیان تکلیف اپنی جان پہ سہی لیکن عیادت کرنے والوں پہ کبھی ظاہر نہیں کیا کہ مستقبل قریب میں زندگی کی دہلیز سے گزر جانے کا امکان بھی ہے، کبھی اشارتاً بھی اُس کا ذکر نہ کیا، وہ بہت ذہین تھے، بیماری کی سنگین نوعیت سے وہ یقیناً بے خبر نہ ہو سکتے تھے، تو کیا وہ ڈاکٹروں کو جھٹلانا چاہتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ وہ ہر CRiSiS سے یونہی سبکسار گزر جائیں گے؟ اتنے بہادر تھے کہ ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے یا انھیں بیوی بچوں اور بھائی بہنوں کی دل شکنی منظور نہ تھی، انگلستان سے واپسی پر نکسیر پھوٹی تو اِس طرح کہ گھنٹوں چلتی رہی، بیشتر خون بہہ گیا، جب رُکی تو فقرہ چست کیا۔ "میرا جسم بھلا فرنگیوں کا خون کیوں کر قبول کرتا، سب باہر نکال پھینکا نا!" اس وقت مزاج پرسی کے لئے ایک دوست آئے تو اُس کی سمارٹ تبسم کی داد دینے لگے، ایک روز خون کا دباؤ اتنا کم ہوا کہ نبض ٹٹولنی محال ہوگئی، گھنٹوں غنودگی کا عالم رہا، رات جوں توں کر کے بسر ہوئی۔ صبح دیکھا کہ شیو کر کے برآمدے میں بیٹھے پائپ پی رہے ہیں، میں نے دُور سے

سیلوٹ کیا تو ہنسنے لگے ۔

بیماری نے شدت اختیار کی تو ہمہ وقتی نائٹ نرس کی ضرورت پڑی لیکن جس کے نام قرعۂ فال پڑا اُس بیچاری کو خوش شکل تو کیا کسی طور قبول صورت بھی نہیں کہہ سکتے تھے ۔ منصور اُن دنوں ہسپتال میں تھے میں کمرے میں داخل ہوا ۔ تو اُن کی رگِ ظرافت پھڑکی ۔ "یہی ہماری قسمت میں رہ گئی تھی ، بیماری کیا خاک ٹھیک ہوگی ۔" وہ بات نہ سمجھی اور اِدھر اُدھر تکنے لگی اور مجھے سلطان باہو کا مصرع یاد آیا جو معرفت کا رنگ لئے ہے ۔ ع

میں کوجھی میرا دلبر سوہنا میں کیونکر اُس نوں بھانواں ھُو

آخری دنوں میں منصور مُشتِ اُستخواں رہ گئے تھے ۔ موذی سرطان نے اندر ہی اندر سے چاٹ لیا تھا ، اُن دنوں ٹانگیں دباتے ہوئے کبھی یہ جاں گُسل احساس ہوتا کہ نحیف و نزار سہی منصور ہمارے درمیان موجود تو ہے ، کل جانے کیا ہو ؟

شدید علالت کے دنوں میں زہرا کمرے میں داخل ہوئیں تو منصور نے ٹوک کر پوچھا ۔

"بھابھی ! آپ نے باہر کی دیوار پہ چسپاں ROLL نہیں دیکھا ، بھئی کمال ہے ، میں انگلستان سے لے کر آیا ہوں ۔" ساری دیوار موسمِ بہار میں ہرے بھرے جنگل کا منظر پیش کر رہی تھی ، تناور درخت ، گنجان ٹہنیاں فرشِ زمین پر اُفتادہ رنگین پھول ، سینری میں پھیلاؤ کے علاوہ عمق کا تاثر ، لیکن منصور چاہتے تھے کہ ہم اُسے ایک نئے زاویے سے دیکھیں ، شام کے سائے لمبے ہونے لگے تو پھر کہا "اب منظر رنگ بدل رہا ہے ، ترچھی شعاعیں پڑنے سے یوں معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے جنگل میں شام ہو رہی ہو ۔"

جزئیات میں دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ نامکمل شے سے الجھن ہوتی تھی ، غسل خانے کی ٹونٹی سے پانی کا قطرہ قطرہ رِس رہا تھا گیتی کو کہا کہ پیچ کس منگوا کر ٹھیک کر دیجئے ۔

کام کرنے کی لگن اور زندگی کے ساتھ شغف آخری دم تک قائم رہا ، رخصت ہو جانے سے چند ماہ قبل تیز بخار رہنے لگا تھا ، متواتر بخار سے اچھے بھلے شخص کے حواس گم ہو جاتے ہیں ، اسپرین کی گولی کھانے سے وقتی طور پہ بخار کم ہو جاتا تو منصور کپڑے پہن کر دفتر چلے جاتے یا گھر پہ شرکائے کار کے ساتھ میٹنگ شروع کر دیتے ، تفصیلات طے کرتے ، ہر بات کی تہہ تک پہنچتے ، کسی سے ملنا ضروری ہوتا تو اپنی بیماری کا بتلا کر اُسے گھر بلوا لیتے ۔ ایک روز تو حد کر دی ، ابھی ہسپتال ہی میں تھے کہ جرمنی سے ایک اہم شخصیت آ گئی ، کیا دیکھتا ہوں کہ چائے سامنے دھری ہے اور ہسپتال کے برآمدے میں شد و مد کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر واضح کر رہے ہیں ، "جرمن سے کچھ اختلافِ رائے ہو گیا ؟" میں نے پوچھا ، جواب تھا "میں جان بوجھ کے زور سے بول رہا تھا ، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بیمار ہوں !" اس شخص کی ہمت کی داد دیجئے جو مرض الموت کے شکنجے میں ہو اور گزر جانے سے چھتیس گھنٹے پیشتر اسٹینو کو بلوا کر جرمن اور انگریزی زبان میں سات کاروباری خط لکھوائے ۔

جس بہادری سے منصور نے مرض کا مقابلہ کیا میں اُس جرأت کو سلام کرتا ہوں اور جس اولوالعزمی اور ثابت قدمی سے گیتی نے حقِ رفاقت ادا کیا وہ قابلِ ستائش تھا ، آشا کے ستارے ایک ایک کر کے ڈوب جاتے ، امید کے چراغ بادِ صرصر کے بے رحم جھونکوں کی زد میں ہوتے لیکن گیتی کے پائے ثبات میں لغزش نہ آتی ، ایسا وقت بھی آیا جب قوی دلوں کا پتہ پانی ہو گیا ۔ لیکن ایک نازک اور ناز و نعم

میں پلی ہوئی لڑکی نے نہ صرف صبر و سکون کا دامن تھامے رکھا بلکہ فرائض کی انجام دہی کی ایک نئی مثال قائم کی۔

منصور کی کامیاب زندگی قابلِ رشک تھی اور ان کی حوصلہ مندی لائقِ تقلید، تکلیف ناقابلِ برداشت ہی کیوں نہ ہو، مصیبتوں کا پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے — لیکن مسکراتے رہو اور پُر اُمید۔

منصور میاں کی شخصیت ہیرے کی مانند پہلو دار تھی — خیرہ کن دمک کے ساتھ کاٹ میں ہیرے کی سختی، چار برس قبل جب وہ علاج کے لئے پہلی بار انگلستان گئے تو لندن میں چھ ماہ قیام کرنا پڑا تھا، دو ماہ کے بعد منصور نے بچوں کو بُلوا بھیجا، اُن دنوں کراچی کے اسکو میں گرما کی تعطیلات تھیں۔ بچوں نے سوچا تھا بچھڑے ماں باپ سے ملاقات ہوگی اور سیر و تفریح رہے گی مگر سفر کی تھکن دور نہ ہوئی تھی کہ منصور خود جا کر انھیں اسکول داخل کروا آئے اور سختی سے متنبہ کیا کہ دل لگا کر پڑھنا ہوگا، پھر ایک شفیق باپ کی طرح انھیں لیک ڈسٹرکٹ، ایڈنبرا اور پیرس کی سیر کے لیے لے گئے۔ گھی کا نوالہ، شیر کی آنکھ۔

آخری دنوں میں منصور لندن سے واپس آنے پر رضامند نہ ہوتے لیکن بچوں کی کشش انھیں وطن لے آئی، انھی دنوں معصوم افشاں یرقان میں مبتلا ہوئی، منصور کے کمرے میں بچوں کا داخلہ بند ہو گیا، پھول سے بچے کمرے کے باہر بیتابانہ منڈلاتے، پیار سے محروم۔ ہاتھ کے لمس سے محروم۔ بیچ میں دبیز شیشہ حائل تھا۔

"بابا!"

"بابا کی جان" اور وہ حسرت بھری نظر سے تکتے۔

لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ   تا چہا در دلِ غالب ہوسِ روئے تو بود

منصور ماں باپ کے بڑے لاڈلے تھے۔ کھانے کی میز پر شرارت سے ایسی بات کہہ دیتے کہ ابا زور سے چٹکی لیتے، منصور چیختے تو ساتھ ہی گوشمالی ہو جاتی، منصور کہاں دبتے تھے کڑوا مذاق کر دیتے اور بھاگ کھڑے ہوتے، ابا ہنستے ہنستے پیچھے ہو لیتے۔

منصور میاں کا فون آتا تو امی کا چہرہ کھِل اُٹھتا، عمر کی لکیریں معدوم ہو جاتیں، دو چار دن کے لیے آ جاتے تو منہ پہ رونق آ پہروں باتیں کرتیں اور جی نہ بھرتا، منصور کی تکلیف کا انھیں علم تھا لیکن کوئی پوچھتا تو یہی جواب دیتیں "طبیعت کچھ خراب تھی، اب بہتر ہے، خدا کا شکر ہے۔" وہ بیماری کی نوعیت نہیں سمجھتی تھیں، نہ ہی یہ باور کرنے کے لئے تیار تھیں کہ مرض جان لیوا ہو سکتا ہے۔ کس کی ہمت تھی کہ بیمار ماں کو بتاتے انہونی ہو چکی . . . . . .

مرورِ ایام امی نحیف ہو گئیں۔ کمزوری بڑھتی گئی۔ لاشعوری طور پر بیٹے کا دکھ اُن کے دل نے ضرور محسوس کیا ہوگا، والد کے مرنے پر منصور نے بلک بلک کر کہا تھا "وہ مجھ پہ بہت مہربان تھے، وہ مجھ پہ بہت مہربان تھے۔" آج اسی صحن میں ایک اور قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ جب سائبان تلے ہم لوگ دلوں میں بپا طوفان کو دباتے اُن کی مغفرت کی دُعا کر رہے تھے ملحقہ کمرے میں امی چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے اپنے بچے کی صحت کی دُعا مانگ رہی تھیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے حسبِ معمول بسم اللہ کہہ کر خوش آمدید کہا، ایسے موقع پہ آنکھوں کی چمک ماں کی عظیم محبت کی آئینہ دار ہوتی، اُس روز شاید انہوں نے میرے چہرے کے پیچھے کچھ دیکھ لیا۔

"طبیعت تو اچھی ہے نا؟"

"جی امی۔"

"خدا کرے سب اچھے رہو، دعا کرو اللہ منصور کو بھی آرام دے۔" میں کیا جواب دیتا، دعا تو ہم مانگ آئے تھے، مگر شفا کی نہیں

سَتّیے بے خبرے تیرا لُٹیا اے شہر بھنبھور

بھائی بہنوں، عزیزوں دوستوں کی دعائیں قدم قدم پر اُن کے ساتھ رہیں، اس عمر میں ایسے روگ نے اپنے بیگانے کے دل میں ہمدردی کی لہر بیدار کر دی تھی، ماں کی بیماری دلِ دردآشنا کے لیے بھاری پتھر ہے کہ جیتے جی جس کا احساس سوتے جاگتے ہے، بہن نے خط میں لکھا کہ غلافِ کعبہ پکڑ کر اس کی صحت کی دعا مانگنا، فضائے کعبہ دعاؤں سے معمور تھی، سیاہ غلاف پر سنہرے حروف میں آیاتِ قرآنی کی زردوزی ہو رہی تھی، دائیں بائیں آہ و بکا کی صدائیں تھیں، تضرع اور زاری کی ہچکیوں کے ساتھ میں نے غلاف تھام لیا اور دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہا . . . .
لیکن قدرت کا فیصلہ اٹل تھا، تقدیرِ ربی پوری ہو کے رہی، انسان جانتا ہے کہ وہ بالکل بے بس ہے لیکن مزاجِ یار کے سامنے سرِ تسلیم خم بھی نہیں کرتا۔

راضی دلِ دیوانہ بتقدیر نہ شد

ہمیں اُن کی موت کے لئے تیار رہنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا، ہم معجزہ رونما ہونے کی دعا کرتے رہے۔ معجزہ ہوا، مہینوں بعد تیز بخار سے نجات ملی، ۲۳ مارچ کو منصور میاں بچوں کے ساتھ روشنیاں دیکھنے چلے گئے۔ ڈیفنس کالونی کے خیابانِ بادبان سے ایرپورٹ تک بتیاں ہی بتیاں تھیں، شمع بجھنے سے پہلے وہ روشنیوں کا آخری میلہ تھا۔

چار برس پہلے سقوطِ ڈھاکہ کا خنجر سینے میں پیوست تھا کہ دعا مستجاب ہوئی تھی، حرمین شریفین سے بلاوا آ گیا تھا، منصور ایرپورٹ پر رخصت کرنے آئے تو میں نے احرام باندھ لیا تھا، تن پر دو چادریں تھیں، وہ مجھے اس لباس میں دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور لپٹ گئے، جب منصور ہم سے رخصت ہو رہے تھے تو ویسی ہی سفید چادریں اُن کی آخری زینت تھیں اور اُن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ گرد و پیش کے نالہ و شیون سے بے نیاز تھی۔

کراچی میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر ایک بزرگ نے لاتعداد جگمگاتی بتیاں دیکھیں تو وحدہٗ لاشریک کی قسم کھا کر کہا کہ "بٹوارے سے پہلے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس اتنی دولت نہ تھی جتنی آج اس شہر میں ہے . . . ."

ہم بھی اپنی عزیز ترین متاع دامنِ کوہ میں چھوڑ آئے تھے، شہر کی ان گنت روشنیاں اُس پہاڑی کے قدموں تلے بکھری ہیں جو شہرِ خموشاں کا بوجھ اُٹھائے ہے۔

عصمت چغتائی

میرزا ادیب

موجودہ صدی کی غالباً چھٹی دہائی کا ذکر ہے کہ عربی و فارسی کے عالم اور مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند نے پاک و ہند کے تہذیبی رشتوں کی تلاش سے متعلق نئی دہلی میں پاکستان اور ہندوستان کے معروف اہلِ قلم اور فن کاروں کی ایک کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ اتفاق سے مجھے بھی اس کانفرنس میں شامل ہونے کا موقع مل گیا۔ کانفرنس کے اختتام پر رسالہ 'شمع' کے مالک حافظ محمد یوسف نے اپنی کوٹھی میں شرکائے کانفرنس کو چائے کی دعوت دی جس میں ممبئی تک کی بعض نامور شخصیتیں بھی موجود تھیں۔

اس موقعے پر میں نے دیکھا کہ ایک بڑی پیاری سی بچی اپنی شرارتوں سے مہمانوں کو پریشان کر رہی ہے۔ سردار جعفری چائے کی پیالی سامنے رکھے ہوئے مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ اس بچی نے بڑی ہنرمندی سے وہ پیالی اٹھا کر اوپندرناتھ اشک کے آگے ٹکا دی اور طشت پر سے ایک سیب اٹھا کر پیالی کی جگہ سردار جعفری کے آگے رکھ دیا۔ میں اس سے بظاہر دور میز کے آخری کونے میں کھڑا تھا۔ اور بزعمِ خویش اس کی دراز دستیوں سے محفوظ تھا مگر یکایک میں نے محسوس کیا کہ وہ شوخ طبع لڑکی میرے پاس بھی پہنچ گئی ہے۔ اس سے پیشتر کہ میں کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کرتا اُس نے آملیٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا بمع چمچ کے میرے منہ میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ میں گھبرا گیا۔ یہ کارروائی ہو رہی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی۔

”معاف کیجیے میرزا صاحب! میری بچی بڑی شریر ہے۔“

یہ الفاظ ایک ناٹے قد کی عینک پوش چہرے والی خاتون نے کہے تھے۔ ظاہر ہے یہ اس شریر بچی کی ماں تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بچی تو واقعی شریر تھی مگر میں سمجھتا ہوں اس کی ماں اپنے زمانے میں اس سے زیادہ نہیں بلکہ بہت زیادہ شریر تھی۔ صرف میں ہی نہیں بڑے بڑے جغادری ادیبوں نے بھی اسے شریر کہا ہے۔

مرزا نعیم بیگ گوالیاری کہتے تھے ”اس لڑکی نے تو اپنی شرارتوں سے ہمارا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ ایسی شریر لڑکی ہمارے سارے خاندان میں نہیں ہے۔“

مرزا عظیم بیگ نے اپنے خط میں لکھا ”ہاں ٹھیک ہے۔ میری بہن ہے ہی بڑی شریر۔“

اور احمد شاہ پطرس بخاری نے ایک مضمون لکھا جس میں اسے اردو ادب کی شریر لڑکی کا خطاب دے دیا۔

پطرس نے بالکل درست کہا تھا۔ ارے صاحب! جو خاتون لحاف کے اندرونی راز اس بے تکلفی سے بیان کر دے کہ ثقہ قسم کے بزرگ سر پیٹ کر رہ جائیں وہ شریر نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی!

خانِ اعظم چنگیز خاں جہاں کہیں بھی جاتا تھا ایک طوفان برپا کر دیتا تھا اور یہ شریر خاتون اسی چنگیز کی سچی پوتی ہے کیونکہ یہ

جب ادب کی دنیا میں وارد ہوئی تو ہر طرف ایک طوفان برپا ہو گیا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ادب کی فضاؤں میں یہ طوفان برپا کرنے والی علی گڑھ کی فارغ التحصیل ایک لڑکی ہے مگر وہ جو ادبی پیشگوئیاں کرتے رہتے ہیں ان نجومیوں نے اطلاع دی کہ موجودہ طوفان تو بہت معمولی ہے۔ یہ لڑکی تو ایسے ایسے طوفان برپا کرے گی کہ ہماری حیادار عصمت مآب کلاسیکی روایات پیشے سے منہ ڈھانپ لیں گی۔ ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ اور یہ پیشین گوئی واقعی سچ ثابت ہوئی۔ اس شریر خاتون نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی گھروں کے اندر رہنے والی نوجوان لڑکیوں کی وہ باتیں صاف صاف بیان کر دیں جنہیں وہ خود سے بھی چھپا کر دل کی خلوتوں میں رکھتی تھیں۔ ان پردہ پوش لڑکیوں کے والدین تلملا اُٹھے اور انہوں نے ان رسالوں پر سخت پابندی لگا دی جس میں بقول ان کے اس کے عریاں افسانے چھپتے تھے لیکن اس پابندی کا اثر کچھ اُلٹا ہی پڑا۔ یہ لڑکیاں ممنوعہ رسالے اپنے تکیوں کے نیچے چھپا چھپا کر پڑھنے لگیں اَن پڑھ مائیں اپنی لاڈلیوں کو اِس انداز سے پڑھتے ہوئے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتی تھیں کہ فرض شناس بیٹیاں کتنی محنت سے امتحان کی تیاری کر رہی ہیں۔

ایسے میں ایک لڑکی رازدارانہ طور پر اپنی سہیلی سے پوچھتی۔

”عصمت کا کوئی نیا افسانہ آیا ہے؟“

اِس کی سہیلی اسی رازدارانہ لہجے میں جواب دیتی۔ ہاں آیا ہے۔ ادبی دنیا کے تازہ شمارے میں۔ عنوان ہے ”تل“۔

جب یہ افسانہ ادبی دنیا میں چھپا تھا تو اس کے مدیر محترم جناب صلاح الدین احمد نے لکھا تھا۔ ”عصمت چغتائی کی نظر کافی باریک بیں ہے۔ وہ ایک ایسا تِل بھی دیکھ لیتی ہے جسے دوسروں کی نظریں بالکل نہیں دیکھ سکتیں۔“

عصمت کا تِل — ایک تِل ہی تو تھا لیکن بزرگ نگاہیں اسے ایک ایسے دھبے کے روپ میں دیکھنے لگیں جو ہماری مشرقی تہذیب کی پیشانی پر ایک مکروہ داغ بن کر پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

لیکن اس وقت مجھے نہ تو اِس داغ کا ذکر کرنا مقصود ہے جو عصمت چغتائی نے اپنی شریر مگر حقیقت افروز تحریروں سے مشرقی تہذیب کے ماتھے پر لگایا اور نہ مرزا غالب کی طرح داغِ حسرتِ دل کا شمار کرنا ہے۔ اِن خوشگوار گھڑیوں میں تو مجھے اُس عصمت چغتائی کی کچھ باتیں کرنا ہیں جسے میں زندگی میں صرف دو تین بار مِلا ہوں، جس کے چند افسانے میں نے ادبِ لطیف میں چھاپے تھے جس کا پہلا ناول ٹیڑھی لکیر مکتبہ اردو سے میری نگرانی میں شائع ہوا تھا۔ اور جس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ایک زمانے میں میرا من بھاتا مشغلہ تھا۔

آل انڈیا ریڈیو کے دنوں میں میرے ساتھ سلطانہ کام کرتی تھیں۔ ہمارا تعلق عورتوں اور بچوں کے پروگراموں سے تھا —— یہ سلطانہ بعد میں سردار جعفری سے بیاہ کر کے سلطانہ جعفری بن گئیں۔ مجھے معلوم نہیں اب ان کی ضخامت کا کیا عالم ہے۔ اُن ایام رفتہ میں تو یہ حالت تھی کہ جب وہ اپنے کمرے کی طرف آتی تھیں تو کوئی نہ کوئی من چلا ضرور کہہ دیتا تھا۔

”کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے“

تو یہ سلطانہ میرے اور میرے ساتھ راجہ فاروق علی خاں اور امین الرحمٰن کے لئے دائرہ معاونِ عصمت چغتائیہ بن کر رہ گئی تھیں۔ جب ہم لوگوں کو ریڈیو کے پروگرام بنانے اور بگاڑنے سے فرصت ملتی تو سلطانہ سے کہتے۔

”اچھا تو سلطانہ بیگم! عصمت چغتائی ایسی ہیں جیسی آپ نے کل بتائی تھی؟“

"کل میں نے کیا بتایا تھا اس کے متعلق؟" وہ پوچھتیں۔

"کچھ شرارتیں بتائی تھیں — بڑی حاضر جواب ہیں۔ منہ پھٹ ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

سلطانہ بگڑ جاتیں۔ "میں نے منہ پھٹ نہیں کہا تھا۔ عصمت منہ پھٹ نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے؟" راجہ غا. وق جو سلطانہ کو ناراض کر کے لطف لیتا تھا، جھٹ پوچھ بیٹھتا۔

"اچھی خاصی معقول خاتون ہے۔"

اور اپنی رائے صائب ثابت کرنے کے لئے سلطانہ کوئی نہ کوئی واقعہ سنانے لگتیں۔ مثلاً ایک بار انہوں نے بتایا۔ عورتوں میں یہ بات ہو رہی تھی کہ اگر پاؤں کی ایڑی کے اندر کپڑا سینے والی سوئی چلی جائے تو کیا ہوتا ہے — اس کا جواب ایک تجربہ کار عورت نے دیا کہ سوئی ایک جگہ رک نہیں جاتی — وہ آگے بڑھتی رہتی ہے — جو سوئی ایڑی کے راستے اندر چلی جاتی ہے وہ پاؤں کی کسی انگلی سے باہر نکل جاتی ہے — عصمت کہنے لگی اور اگر سوئی دائیں بائیں جانب جانے کی بجائے اُوپر چڑھنے لگے تو سر میں سے نکل آئے گی۔

یہ واقعہ سنا کر سلطانہ پوچھتی۔ یہ تو محض ایک مزاحیہ فقرہ ہے۔ اس سے کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ منہ پھٹ ہے؟

ایک روز میں نے پوچھا "سلطانہ! یہ تو بتایئے عصمت کی شادی شاہد لطیف سے ہو چکی ہے۔ وہ تو سارا دن افسانے لکھتی رہتی ہوں گی۔ کھانا کون پکاتا ہے۔

سلطانہ بولیں۔ ارے یہ کیا کہتے ہو۔ عصمت تو ایک وقت میں سترہ سترہ کھانے پکا لیتی ہے۔

"سترہ کھانے ایک وقت میں پکاتی ہے!" کسی نے حیرت سے پوچھا۔ اور سلطانہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

ایک سوال کیا گیا۔

"سلطانہ! کہا جاتا ہے عصمت گندے افسانے لکھتی ہیں۔ انھیں معلمہ کیسے رکھا گیا ہے!"

جواب ملا۔

"عصمت اپنی تمام شاگردوں میں بے پناہ پاپولر ہے۔ اگر اسے ملازمت سے برخاست کیا جائے تو لڑکیاں سٹرائک کر دیں گی۔"

ایک صاحب کی والدہ معلمہ تھیں — انہوں نے ایک روز سلطانہ سے پوچھا "استانی اپنی شاگردوں کو نصیحتیں بھی کیا کرتی ہیں عصمت کیا کرتی ہیں۔"

سلطانہ زچ ہو کر بولی۔

"عصمت کیا کرتی ہے۔ پڑھاتی ہے اور کیا کرتی ہے نصیحت وصیت وہ نہیں کرتی۔ اس سے اُسے نفرت ہے۔"

سلطانہ نے یہ بالکل درست کہا تھا عصمت کو نصیحت دینے اور سننے سے نفرت ہے۔ جس زمانے میں ان پر لاہور کی ایک عدالت میں فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا تو وہ میاں اسلم کے ہاں ٹھہریں — میاں صاحب نے غالباً پہلی ہی بزرگانہ نصیحت ہی کی تھی کہ عصمت بوریا بسترا باندھ کر میاں صاحب کا دلی شکریہ ادا کر کے ہاں سے رخصت ہو گئیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عصمت چغتائی کی تخلیقات کا ذکر اس وقت میرے موضوع سے خارج ہے مگر ان کی شرارتوں کا بار بار ذکر کر کے میں نے اپنے لئے بھی ایک الجھن پیدا کر لی ہے اس لئے ایک آدھ بات کہنی ضروری ہے۔ شرارتوں کا بھی ایک دَور ہوتا ہے۔ یہ دَور بہر صورت بیت جاتا ہے۔ آتش کی جوانی کی باتیں اپنے موقعہ و محل ہی کے اعتبار سے

درست ہوتی ہیں۔ فرد کی زندگی مختلف ادوار میں سے گزرتی ہے اور آگے ہی آگے بڑھ کر نئے نئے تجربوں کو سینے سے لگاتی رہتی ہے۔ سٹریٹ فورڈ آن ایون کا باسی ایک دور میں MUCH ADO ABOUT NOTHING اور TWELTH NIGHT لکھتا ہے لیکن جب زندگی اپنی پوری زہرناکیوں کے ساتھ اُس پر جھپٹ پڑتی ہے تو وہ ہیملٹ، میکبتھ، اوتھیلو اور کنگ لیئر کے ایسے دنیا کو دیتا ہے۔ عصمت چغتائی کا بھی ایک دَور تھا — جس میں اس نے لحاف جیسا افسانہ لکھا تھا — اور جب یہ دَور ختم ہو کر دَورِ ماضی کے اندھیروں میں ڈوب گیا تو اس نے "چوتھی کا جوڑا" لکھا جو میں سمجھتا ہوں اُردو کے دردناک ترین افسانوں میں شامل ہوتا ہے۔

عصمت نے بہت مدت ہوئی بمبئی میں محنت کشوں کے ایک جلسے میں کہا تھا۔

آج ہزاروں آنکھیں میرے سامنے چمک رہی ہیں۔ اس چمک میں زندگی کی خوشی ہے۔ زندگی کی آرزو ہے اور آج جب وہ ہمارے شہر میں آئی ہیں تو ان کے اردگرد ہزاروں، لاکھوں آنکھیں چمک رہی ہیں۔ اِن میں وہ آنکھیں بھی ہیں جو ان کے سامنے ہیں — وہ بھی جو ابھی تک انھیں دیکھ نہیں سکیں اور وہ بھی جو انھیں دیکھ نہیں سکیں گی۔

یہ سب آنکھیں روشن ہیں — خوشی سے، زندگی کی آرزو سے اور اس خیال سے کہ عصمت کا قلم تھکا نہیں — ابھی تک رواں دواں ہے۔

عصمت چغتائی — کل کی اَدب کی شریر لڑکی شب و روز کے مرحلے طے کر کے بوڑھاپے کی منزل پر پہنچ گئی ہے اس کے سر پر کرنوں کا تاج سجا ہوا ہے — مگر اس کا قلم بوڑھا نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ میرا لاہور جو پاکستان کا سب سے بڑا تہذیبی شہر ہے — محبت سے اپنے دونوں بازو پھیلا کر اِس کا خیر مقدم کر رہا ہے۔

باہر کے رابطے اندر کے رشتے

رحیم گل

عام طور پر ندیم صاحب سے میرا رابطہ بہت کم رہتا ہے۔ مگر جہاں تک ذہنی اور قلبی رشتے کا تعلق ہے۔ اس کی عمر ربع صدی سے بھی کچھ زیادہ ہے —— ندیم صاحب ساٹھویں سالگرہ منا رہے ہیں اور میں ہاف سنچری سے ایک دو منزلیں ادھر کھڑا ہوں۔ مگر ہمارے تعلق خاطر کا معصوم بچہ مکمل طور پر جوان ہو چکا ہے۔

ندیم صاحب کو میں اُس زمانے سے جانتا ہوں۔ جب اپنے آپ کو نہیں جانتا تھا —— اپنے آپ کو جانا۔ تو مجھے ندیم صاحب کو بھول جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ تو پلٹ کر میرے دل میں بیٹھ گئے۔

جب میں باجرے کے کھیت کے منڈیر پر پاؤں پھیلا کر ندیم صاحب کے افسانے پڑھتا تھا۔ تو ایک چھم چھم کرتی ہوئی لڑکی ہرے بھرے باجرے کے کھیت سے جھانکتی نظر آتی تھی —— یہ ندیم صاحب کے افسانوں کا اثر تھا کہ پنجاب کی الھڑ مٹیار میرے ذہن میں بُری طرح بیٹھ گئی تھی۔

یہ کریڈٹ بھی ندیم کو جاتا ہے کہ بالآخر میں اس الھڑ مٹیار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور آج وہ باجرے کے کھیت میں سے جھانکتی ہوئی مٹیار میرے بچوں کی ماں ہے۔

اور یہ ڈِس کریڈٹ بھی ندیم صاحب کو ہی جاتا ہے کہ ایک بار اِن کے افسانے کے نشے میں، میں اِس قدر سرشار ہو گیا تھا کہ منڈیر پر لیٹے ہوئے سانپ پر بے خبری میں ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور سانپ نے مجھے ڈس لیا تھا۔ اور میں مرتے مرتے بچا تھا۔ مگر اس ڈس کریڈٹ کے ساتھ ایک اور کریڈٹ نے بھی جنم لیا کہ سانپ کے زہر نے میرے جسم میں داخل ہو کر میری فطرت کے زہر کو مار ڈالا۔

بعض اوقات اِن کے افسانوں کے ایکسپریشن سے متاثر ہو کر میں ورق پلٹ کر ان کی تصویر دیکھتا کہ اس شخص نے کیسے کیسے خوبصورت عشق کئے ہیں۔ لیکن اِن کے چہرے پر ایسی شرافت اور آنکھوں میں ایسی طہارت نظر آتی کہ متزلزل ہو جاتا اور سارے الزامات واپس لے لیتا۔

میری عمر اُس وقت سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہو گی۔ جب میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھی تھی —— یہ سچ ہے کہ میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھ کر ان کی شخصیت سے قربت محسوس کی تھی —— جس طرح بعض لوگوں کی شکلیں دیکھ کر اُن سے خدا واسطے کا بَیر ہو جاتا ہے۔ اس طرح مجھے ندیم صاحب سے خدا واسطے کی محبت ہو گئی تھی۔

دیکھا ہے —— لوگ آپس میں جھگڑتے ہیں کہ ندیم صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور بڑے شاعر ہیں۔ افسانہ نگاری محض

بہتان ہے —— اور بعض انھیں بنیادی طور پر افسانہ نگار کہتے ہیں۔ بڑا افسانہ نگار ——

میں اپنی بات بتاؤں۔ میں جب تک لاہور نہیں آیا تھا۔ انھیں افسانہ نگار ہی سمجھتا رہا۔ لاہور آ کر انکشاف ہوا کہ وہ تو شاعر بھی ہیں اور چند گنے چنے شاعروں میں سے ایک —— مثلاً یہ شعر بھی ندیم صاحب کا ہے۔

انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا ——— دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا
ندیم کوئی میرے فن کا اجر کیا دے گا ——— کہ خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں

تب مجھے اُن کے افسانے کنجری، سناٹا، گنڈاسہ یاد آئے اور میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ندیم صاحب شاعر بڑے ہیں یا افسانہ نگار بڑے — ؟ اخبار نویس بڑے، مدیر بڑے اور یا انسان بڑے —!؟

اِس شہر میں اور اِس ملک میں کتنے لوگ ہیں۔ جن کے متعلق دعوےٰ کیا جا سکے کہ ان میں کوئی عیب نہیں ہے تحقیق کریں۔ تو پھر اسی سے لے کر ملک کے سرحد تک میں کوئی نہ کوئی عیب نکل آئے گا۔ لیکن ایک شخص اِس " Q " سے باہر تنہا کھڑا ملے گا۔ جس کے دامن پر کوئی معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی داغ نہیں ملے گا۔ اور اس کی روشن پیشانی پہ جلی حروف میں پیرزادہ احمد شاہ لکھا ہوگا ——!

اگر یہ شخص مجھے انیسویں صدی میں ملتا اور میرا نام رحیم گل کی بجائے رحیم گل خان ہوتا۔ تو میں بلا دریغ اِس شخص کو اغوا کر کے وزیرستان پہنچا دیتا۔ اور پورے قبائل کو جمع کر کے، نذرانۂ عقیدت کے طور پہ انھیں شہید کر دیتا —— اور پھر ساری زندگی ان کے مزار کا مجاور بن کر گزارتا —!

لیکن یہ زارِ روس کی انیسویں صدی نہیں ہے — یہ الگزینڈر سولزنیٹسن کی بیسویں صدی ہے۔ اُس سولزنیٹسن کی، جو کینسر کا مریض تھا۔ جس نے نہ صرف کینسر جیسے مُوذی اور ناقابلِ شکست مرض کو شکست دی۔ بلکہ سنگینوں کے بارے میں اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔

میں اگر الگزینڈر سولزنیٹسن کو روسی سماج کا ضمیر کہتا ہوں تو احمد ندیم قاسمی کو پاکستانی سماج کا ضمیر کہوں گا ——!

یہ نہ سمجھئے کہ دو متضاد نظریوں کے نمائندہ آدمیوں کو داد دے کر میں کنفیوژن پیدا کر رہا ہوں۔ بے شک راہیں الگ الگ ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ سچ، جو انسانی ضمیر سے عبارت ہے۔ اُس کے دو ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔

سچ تو سچ ہوتا ہے۔ وہ گنگا رام کے سینے میں ہو، یا ولیم متھائی کے سینے میں، اور یا دین محمد کے سینے میں، اُس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ کوئی نسل نہیں ہوتی۔ کوئی مذہب نہیں ہوتا —— وہ باہر کی نہیں۔ اندر کی چیز ہوتی ہے!

یہ اندر کی چیز میں نے سولزنیٹسن میں محسوس کی تھی۔ یہ اندر کی چیز میں نے احمد ندیم قاسمی کے سینے میں دیکھی ہے —— یہ اندر کی چیز تھی جس نے سقراط کو زہر کا پیالہ دیا۔ یہ اندر کی چیز تھی۔ جو سولزنیٹسن کو وطن بدر کر گئی —— یہ اندر کی چیز ہے۔ جو احمد ندیم قاسمی کی پیشانی پر ساٹھ سال سے جگمگا رہی ہے ——

تو دوستو —— میں جو ایک سیدھا سادہ پٹھان ہوں۔ میں جو کسی ادبی گروہ کا آدمی نہیں ہوں —— نہ نقوش کا، نہ اوراق کا، نہ فنون کا، اور نہ سیپ کا، میں ان سب کا آدمی نہیں ہوں۔ مگر میں اِن سب کا آدمی ہوں —— کیونکہ میرے پاس

کوئی اوزان نہیں ہیں کہ آپ کو بتاؤں ——

میں کس سے کتنی نفرت کرتا ہوں اور کس سے کتنی محبت کرتا ہوں —— بات یہ ہے کہ جو نفرت کے قابل ہیں۔ میں تو ان سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ لیکن جو محبت کے قابل ہیں۔ اُن سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں۔ میں جن سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں۔ اُن میں سے ایک نام احمد ندیم قاسمی کا ہے ——!

اگر یہ جانبداری ہے۔ تو مجھے یہ الزام قبول ہے۔ اگر اس الزام کے تحت کوئی گروہ مجھے ادیبوں کی فہرست سے خارج کرتا ہے۔ تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔ لیکن مجھے یہ منظور نہیں کہ کوئی مجھے ندیم صاحب کی محبت سے باز رکھے۔

یہ دور جو ایک دوسرے کو رد کرنے کا دور ہے۔ یہ صدی جو انتشار کی صدی ہے۔ اس میں اگر اتفاق سے مجھے دو چار آدمیوں کی محبت میسّر آئی ہے۔ تو میں ایسا بیوقوف کیوں بنوں گا کہ اس محبت کو کھو دوں گا۔

اگر اسرار زیدی کی طرح مجھے عارف عبدالمتین اچھا لگتا ہے۔ اگر عدم کے لئے میرے دل میں بے پناہ جذبات ہیں۔ اگر عطاً الحق قاسمی میں مجھے قربت کا احساس ملتا ہے۔ اور اگر خالد احمد جیسے فتنے سے بھی میں پیار کرتا ہوں۔ تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں دوستو —— یہ تو اندر کی بات ہے ——!

اور بھی کچھ لوگ ہیں۔ جنھیں میں پیار کرتا ہوں لیکن فہرست طویل ہو جائے گی اور میں نفسِ مضمون سے ہٹ جاؤں گا ——

تو یہ طے ہوا —— کہ ندیم صاحب میرے ہیں۔ اتنے زیادہ میرے کہ شاید ناہید ندیم کے بھی نہ ہوں گے نعمان ندیم کے بھی نہ ہوں گے —— یہ معاملہ تو لیں میں ہی جانتا ہوں۔ بے چارے ندیم صاحب کیا جانیں ——!؟

اِس عقیدت و احترام کی بنیادیں بڑی ٹھوس اور گہری ہیں۔ دیوارِ چین کی طرح مضبوط، اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اسے کوئی حملہ آور عبور نہیں کر سکتا۔

خدا واسطے کا پیار اپنی جگہ —— کہ وہ اندر کی بات ہے۔ میں باہر کی باتیں بنا کر بھی ثابت کر دوں گا کہ جس نے ندیم صاحب کو نہیں پہچانا۔ وہ شخص عرفان سے خالی ہے۔ اُس عرفان سے خالی، جس سے بندہ اپنے گھونسلے کی طرف لوٹتا ہے!

مجھے یاد ہے۔ آج سے ٹھیک تیئیس برس پہلے، جب میں نے داتا کی نگری میں قدم رکھا تھا۔ تو نہایت سرشار دل لے کر آیا تھا۔ اُن لوگوں کے لئے میرے دل میں ایک عجیب جذبہ موجزن تھا۔ جن کی کتابیں میں نے باجرے کے کھیت کے منڈیروں پر پڑھی تھیں —— میرے معصوم دل اور کچے ذہن نے سوچا تھا۔ وہ کیسے کیسے لوگ ہوں گے۔ جنہوں نے موتیے کی کلیوں کی طرح الفاظ چُن چُن کر شعر پروئے ہیں —— کیسے کیسے خوب صورت لوگ ہوں گے۔ میں ان کے نیاز حاصل کروں گا۔ اُن کی قربت کے احساس سے جھولیاں بھروں گا۔ موقع ملا۔ تو آنکھ بچا کر موتیے کی کلیاں چراؤں گا اور اپنے من کا آنگن آباد کروں گا۔ لیکن اِس شہرِ بے پُرساں میں جہاں شاعروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ ہے۔ مجھے وہ شاعر نہ ملا۔ جس نے الفاظ کی کلیوں سے میرے ذہن و شعور کو معطر کر رکھا تھا۔ —— وہ ادیب بھی نہ ملا۔ جس نے میری روح میں محبت کے بھربھر جام انڈیلے تھے ——

میں نے چند لوگ دیکھے۔ نفرتوں کے میلے پیرہن پہنے ہوئے، میکلوڈ روڈ کے چائے خانوں میں، ادبی حلقوں میں اور ٹی ہاؤسوں

ہیں، جو میری طرح ناشتا کرتے تھے اور پلیٹ میں سب سے اچھی بوٹی پر ندیدوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی برائیاں کرتے تھے —— یوں میرا شیشۂ دل ٹوٹ گیا۔

وہ مافوق الفطرت شاعر اور ادیب کا تصور جو میرے کچے ذہن نے بسایا تھا۔ بکھر بکھر کر رہ گیا —— اب مجھے خوف آنے لگا۔ وہ چند نام جو میرے سینے میں محفوظ تھے۔ میں انھیں دیکھنے اور ملنے سے کترانے لگا —— یہ اندیشہ کہ کہیں وہ بھی میری طرح گوشت پوست کے آدمی نکل آئے۔ تو میرا کیا بنے گا۔ !

اس فہرست میں سب سے پہلا نام ندیم صاحب کا تھا۔ پورے دو سال اپنے آپ پر جبر کئے رکھا اور ان سے ملنے کے مواقع عمداً ضائع کرتا رہا۔

میرے دل میں ندیم صاحب کے لئے جو محبت اور احترام تھا۔ مجھے پسند نہیں تھا کہ اس میں ذرہ بھر کی بھی کمی آئے۔ میں انھیں دوسرے لوگوں کی سطح پر دیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ آخر مجھے بھی تو کسی آسرے اور سہارے کی ضرورت تھی۔ میں اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتا تھا کہ انسان کی ہستی محض نفرت سے عبارت نہیں ہے اور یہاں اگر محبتوں کی فراوانی نہیں ہے۔ تو محبتوں کا یکسر فقدان بھی نہیں ہے

یہی وجہ ہے کہ میں کیکر کے تاحد نظر پھیلے ہوئے جنگل میں آم کے پیڑ کی تلاش جاری رکھتا ہوں۔ پیڑ ملے نہ ملے —— کم از کم میرے تصور میں تو یہ پیڑ موجود ہے۔ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے یہ تصور بہت تقویت پہنچاتا ہے۔

آخر ایک دن، منیر نیازی کھینچے کھینچے مجھے میکلوڈ روڈ سے ہسپتال روڈ کی طرف یہ کہہ کر لے گیا "کہ آج تم ایک خوبصورت آدمی سے ملاقات کرو گے!"

میں نے کہا "تم کم خوب صورت ہو کیا —؟"

بولے —" وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے!"

یوں ہم دفتر امروز کی سیڑھیاں طے کر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ میں نے چونک کر دیکھا — یہ تو وہی شخص تھا۔ جس کی تصویر میں نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں دیکھی تھی۔ اور جس کے چہرے سے شرافت اور آنکھوں سے طہارت جھلکتی تھی۔

منیر نے تعارف کرایا "یہ ہیں ندیم صاحب اور یہ ہے رحیم گل!"

ندیم صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر کہا —" ہاں میں انھیں جانتا ہوں!"

میں چونکا — یعنی، یہ شخص مجھے جانتا ہے — یقین کرو دوستو، میں بالکل بدحواس ہو گیا مجھ جیسے بے نام اور گم نام آدمی کو ندیم صاحب جانتے ہیں۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ واقعی میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ اب بھی کیا ہوں۔ مگر آج سے اکیس برس پہلے کون جانتا تھا مجھے!

مگر ندیم صاحب مجھے جانتے تھے —— دراصل لاہور میں یہ میری پہلی پہچان تھی۔ میں نے کیکر کے جنگل میں آم کا پیڑ پا لیا تھا۔ مجھے وہ شاعر بھی مل گیا۔ جسے میں نے تصور کے ریشمی غلاف میں چھپا رکھا تھا —

اب حقیقت میرے سامنے تھی۔ ایک مافوق الفطرت —— وجود بن کر مجھ سے مخاطب تھا اور میں خوش تھا کہ مجھ پر عظمت انسانی

کا ایک عقدہ وا ہو گیا تھا۔

تب مجھے قرآن کی وہ بات یاد آئی کہ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے۔ یقیناً خدا کے وہ نائب مجھ جیسے لوگ نہیں ندیم صاحب جیسے لوگ ہوتے ہیں۔

منیر نیازی باتیں کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا — ”ہاں میں انھیں جانتا ہوں!“

اِس چھوٹے سے جملے میں کیا بھید تھا کہ میری روح کھل اُٹھی تھی۔

دراصل اِس فقرے کے بطون میں ایک عظیم آدمی کی پہچان کی خوشبو رچی بسی تھی۔

وہ دن اور یہ دن، میں نے ندیم صاحب پر کبھی شک نہیں کیا —— اُن کی اِس ادا سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن کا گرد بلکہ غلام بن گیا تھا ——۔

ندیم صاحب جب سے سمن آباد منتقل ہوئے ہیں۔ باقاعدگی سے عید ملنے جاتا ہوں۔ گذشتہ سے گذشتہ عید کا ذکر ہے۔ نمازِ عید کے بعد گھر واپس آیا۔ بچوں سے عید ملا اور ندیم صاحب سے عید ملنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرا بڑا بیٹا عدیم عادل، جس کی عمر تقریباً گیا برس ہے بولا —”ابو آپ کہاں جا رہے ہیں —؟“

میں نے کہا —”ندیم صاحب کے پاس“

کہنے لگا —”وہی نا، جو ٹی وی پر کبھی کبھی آتے ہیں؟“

میں نے کہا ”ہاں وہی“

کہنے لگا —”میں بھی اُن سے ملوں گا“

میں نے کہا —”یہ تو ثواب کا کام ہے چلو“

عید ملنے کے بعد واپس آنے لگے۔ تو ندیم صاحب نے عدیم عادل کو دس روپے عیدی پکڑا دی — میں نے راستے میں عدیم عادل سے پوچھا —”تم ندیم صاحب کو دیکھنے گئے تھے۔ یا عیدی لینے گئے تھے؟“ وہ شرمندہ و محجوب پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھنے لگا۔

اب کے عید آئی۔ میں ندیم صاحب سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔ عادل سے پوچھا۔”کیوں بھئی، ندیم صاحب سے عید ملنے نہیں جاؤ گے ؟“

لڑکے نے ذومعنی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مُسکرا کر بولا —”نہیں، وہ مجھے پھر عیدی پکڑا دیں گے!“

تو دوستو —— کیا کیا جائے کہ بچے جو اِن سے بڑوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ ندیم صاحب انھیں مٹھائی کھلا کر ناراض کر دیتے ہیں۔ اِن کی اِس عادت سے بعض بڑے لوگوں کو بھی شکایت ہے کہ وہ ہر آدمی کے ساتھ اتنا میٹھا سلوک کیوں کرتے ہیں کہ قرابت دب جاتی ہے اور احترام سامنے آجاتا ہے —:

کیا بتاؤں — ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

دوستوں اور غیروں سے اُن کے شریفانہ رویّے کی ایک مثال اور سنیئے۔

نام یاد نہیں، کئی برس اُدھر کی بات ہے۔ ایک عرب ادیب پاکستان آیا تھا۔ اُن کے اعزاز میں کئی تقاریب بھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ میں کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اخباروں میں خبریں پڑھتا رہا۔ اِس سلسلے میں روزنامہ "مشرق" میں جناب انتظار حسین کا کالم پڑھا تو مجھے یہ عرب ادیب مسخرہ لگا۔ لیکن دوسرے ہفتے روزنامہ "جنگ" میں ندیم صاحب کا کالم پڑھا۔ تو یہ عرب ادیب مجھے واقعی دانشور لگا۔

تب معلوم ہوا کہ حقیقتیں کس طرح افسانے بن جاتے نہیں!

اور تب یہ راز بھی کھلا — کہ جو لوگ دوسروں کو احترام دیتے ہیں۔ دراصل خود ہی "محترم" ہوتے ہیں —!

سامعین کرام — مضمون ختم کرنے سے پہلے میں اپنی آخری خواہش کا اظہار کر دوں کہ جب ندیم صاحب کی پچھترویں سالگرہ منائی جا رہی ہو۔ تو میں ایک بار پھر مضمون پڑھوں اور جب ندیم صاحب اپنی بے مثال زندگی کے ایک سو سال پورے کر لیں۔ تو میرا وہ بیٹا جو ان کی محبتوں سے خوف زدہ ہے۔ باپ کی جگہ اسٹیج پہ آ کر اُس عیدی کا ذکر اِس انداز میں کرے کہ محبت کا خوف جوان ہو کر کس طرح محبت کی انتہا میں بدل جاتا ہے اور نسل در نسل، کس طرح محبت کا چراغ روشن رہتا ہے !؟

بانو قدسیہ

پروین عاطف

برسوں پہلے شب برات کی ایک شام میرے اُبا نے آتشبازی کی دُکان سے ایک معصوم سا سفید دانہ خرید کر دیا۔ بولے یہ سانپ ہے۔ میں نے حیرت سے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا ساتنا بے ضرر سا مسالے کا دانہ۔ نہ اس کی ساخت سانپ ایسی نہ اُٹھان، نہ رنگ، نہ پھنکار۔ پھر یہ سانپ کیسے ہوُا۔ ؟؟ ـــــ پھر نہ جانے کس نے اسے ذراسی دکھا دی۔ مسالے کے معصوم دانے میں اندر ہی اندر ایسا بھونچال آیا کہ اچانک اس کے چاروں طرف سے چکیلی چمک دار بل کھاتی ہوئی انوکھے رنگوں کی سپنولن نکلنا شروع ہوئی۔ مجھے اور کچھ یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ اس ناگن کی پھنکار میں نہ زہریلے الاؤ تھے نہ اس کے وجود پہ دہشتناک چتکبری کوڑیاں۔ بس ایک فن تھا۔ ایک چلتر تھا کہ جس کی حیرت سے کئی سال تک میرا وجود تڑختا رہا۔ اور اسے پا لینے کی حسرت نے عجیب انمٹ سی کھوج لگا دی۔ مسالے کی فن کار ناگن کا لشکارا ابھی ماند ہی پڑا ہوگا کہ ممتاز مفتی انگلی پکڑ کر مجھے بانو قدسیہ کے گھر لے گئے۔

ممتاز مفتی دوستوں کی محبت کے بارے میں بڑے دیالو ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کی اسرار بھری محبت کے سوا باقی تمام محبتوں کو ممتاز نے دیوالی کی مٹھائی کی طرح تھال میں سجا کر ایک دوسرے میں بانٹنے کا کام سدا جاری رکھا۔ LADY FRiENDS کو ذرا خاص مقام حاصل ہے۔ مجھ سے کہیں گے بھئی مسرت پراچہ تجھے سخت یاد کر رہی ہے۔ کہتی تھی کیسی خوش رنگ شخصیت ہے پروین کی۔ مسرت سے کہیں گے پروین کہتی تھی بڑے ہی اچھے مضمون لکھ رہی ہے۔ مسرت کل کو ضرور بڑی لکھاری بنے گی۔ مسز عابد کو کراچی خط لکھیں گے تمہارا خط پڑھتے ہی پروین آبدیدہ ہو گئی۔ تم اُسے فوراً خط لکھو۔ بانو قدسیہ کی محبت کا "نیوز ندرہ" تو ان کے پاس خاص بہتات میں ہوتا ہے۔ اسے جھولی بھر بھر لٹانے کے موڈ میں رہتے ہیں۔ آج جب ممتاز کی مہربانیوں کے طفیل میں قدسیہ کی شخصیت میں گھٹنے گھٹنے کھُب گئی ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ممتاز سے پوچھوں یہ اپنے ذمے کی محبتیں بھورا بھورا بانٹنے میں کیا کوئی صوفیانہ عظمت پوشیدہ ہے یا جس میں چنگاری چھوڑنے والی بی جمالو کا چسکا جن دنوں مجھے بانو کے ہاں گھر لئے پہ مصر تھے ان کے اپنے وجود کا ذرہ ذرہ قدسیہ کی شخصیت کے تاثر سے HAMORRAHG ICVIRAL FEVER کی ہمت تھی نہ یارا تھا ورنہ ضرور ان 'VIRUS' کی ایک چنگاری میرے وجود میں 'INJECT' کرتے۔ کر دیتے تو کاکی سے مل لوگ تیری کی آنکھیں بھی بند ہو گئی۔ پھر یوں ہونے لگتے جیسے دائرے میں بیٹھا ہوا اچھر سیا۔ اُن کے سرور کی شدت دیکھ کر اُس سُنئے کی لاٹ سے ملنے کا میں نے بھی تہیہ کر لیا۔ لیکن ملنے کی خواہش میں نمایاں جذبہ حسد تھا۔ ٹی وی پہ دیکھی تھی میں نے قلمی مصنفی سی۔ دنیا بھی جاذب نظر نہیں۔ جانے ممتاز مفتی کس ادا پہ مرتا ہے اس کی۔ میں نے سوچا خیر دیکھی جائے گی۔

پھر ایک روز میں ممتاز مفتی کی انگلی پکڑے ماڈل ٹاؤن میں اُن کی نئی تعمیر شدہ کوٹھی "داستان سرائے" پہنچی تو جانے کیوں شب برات کی وہ شام یاد آئی جب میں اباکے ساتھ بازار آتش بازی خریدنے گئی تھی۔ تیکھے نقوش والا چاکلیٹ رنگ کا بچہ، ہمیں سیدھا باورچی خانے لے گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی ممتاز نے میری انگلی چھوڑ دی۔ اور خود زمین سے اٹھتے ہوئے ہوا میں معلق ہو گئے۔ عورت ہونے کے ناطے سے میرے لئے بڑے چیلنج کی بات تھی۔ میں نے بالوں کی لٹ انگلی کے اشارے سے ماتھے پر ڈالی اور وولی (WOOLLY) جارجٹ کی نارنجی ساڑھی کا پلو جسم کی گولائیوں پر سے یوں گھوٹ کر گذارا کہ کوئی چیز مبہم نہ رہ جائے باورچی خانہ میں پہنچے تو چھینٹ کے بدرنگے سوٹ میں ملبوس پسینے میں شرابور ایک خاتون بوسیدہ سے کپڑے کے اِتو سے چولھے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی پھلکوں کا پیٹ پھلانے کے عمل میں سرتاپا مشغول تھی۔ ایک کترنی داڑھی والا گورا اور ایک چمکارے مارتی سرخ و سفید رس بھری میم باورچی خانے میں رکھی میز پہ بیٹھے پھولے پھولے گرم گرم پھلکے اُڑا رہے تھے۔ میں قدسیہ سے ملنے کو بے چین تھی۔ "یہ بانو قدسیہ ہے" ممتاز نے چولھے کے پاس بیٹھی کلثوم کی طرف اشارہ کیا اور چھینٹ کے سوٹ والی کو بارہ وفات کے متبرک زردے کی تھالی کی طرح چپکے سے میری جھولی میں ڈال دیا۔ بھک سے فیوز اڑا نہ وہاں بانو تھی نہ اُس کی قدسیائی۔ پھر مجھے اشفاق کی ایک کزن یاد آئی جو میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ "ہماری قدسیہ آپا تو بس نری گائے ہیں، کہانیاں لکھتا ہے ہمارا بھائی۔ اور نام کرتا ہے بیوی کا۔" LOVE MARRIAGE ہو تو بس ایسی ہو" ... زرین ٹھیک ہی کہتی ہو گی پھر میں نے سوچا۔ بانو قدسیہ کہیں ایسی ہوتی ہے بھلا؟ میکسی پاک آٹے کی "پتیری توان" جیسی!! پھر شعلوں کی طرح تڑپتی، بھڑکتی، لپکتی کئی کہانیاں میرے اردگرد پھیل گئیں۔ 'پہردا'، 'سوغات'، 'توجہ کی طالب'، 'رشتہ و پیوند'۔ امر بیل کی زری کے اندر باہر کھولتے ہوئے مہیب لاوے، اُس کی گنجلک محبت کے مجسم ہوتے ہوئے ہیرو شیما یہ جذبات کے کس موچنے سے اچک اچک کر ہمارے سامنے لاتی ہو گی "آخر"۔ "گرداب محیط آب میں" کی سسکتی ہوئی مینا کی خاموش ہچکیوں کی آوازیں قرن ہا قرن سے تہذیب ہیولوں کی صورت میں عورت کی روح کو چاٹ رہی ہیں۔ اُس نے دال کو لہسن کا بگھار لگایا۔ یہ وہی پروین ہے مفتی جی جس کے آپ اس قدر دان ہیں۔ کھانا کھالو پروین کھٹائی والی دال بڑے مزے کی ہے۔ جب قدسیہ کا IMAGE پھک سے اُڑ گیا۔ تو میرے اندر کی انا کو بڑی تقویت ملی۔ اُونہہ، ممتاز واقعی بڑا ٹھرکی ہے۔ بھلا اس بچاری سکینہ یا کلثوم میں کون سی ایسی جاذبیت ہے جس کے لئے یہ بندہ ہلکان ہوتا پھرے۔

پھر وہاں بیٹھے بیٹھے جانے کتنا وقت گزر گیا۔ دہی میں بڑے ملاتے ہوئے مٹکی سے اچار نکالتے ہوئے اچانک وہاں [illegible] لامذہبیت کا ذکر چل نکلا۔ PARA PSYCHLOGY کے مابعد الطبیعاتی تجربوں کے بارے میں گفتگو ہوئی، کلثوم [illegible] رہی اور قدسیہ نے چھینٹ کے سوٹ میں سے باہر نکلنا شروع کیا۔ فرائڈ، رسل، مارکس، ماوزے تنگ، امن، SUFI-ISM مشرق، مغرب، شاعری، ادب اور جانے کیا کیا۔ بس ہم متوحش سے سنتے رہے اور اُس نے بیٹھے بٹھائے زندگی کے بہت سے اہم زاویوں کو کھیل کھیل کر دیا۔ لگتا تھا چھینٹ کا سوٹ SHORT CIRCUIT ہو گیا ہے کلثوم بھک سے اُڑ گئی اور اب چاروں طرف قدسیائی ہی قدسیائی تھی۔ کترنی داڑھی والا انگریز عالم ہچکولے سے کھا رہا تھا۔ اس نے POWER PLUG میں ہاتھ ڈال

دیا۔ اسلام کے بارے میں کوئی CONTROVERTIAL بات کر دی۔ اسلام کے بارے میں میں تو بالکل اَمیّوں کی حیثیت رکھتی ہوں۔ ممتاز کی رائے مستند ہو سکتی تھی۔ پر قدسیہ کے آگے جائے پرواز نہ تھی۔

اسلام کے نام پر اس کا چہرہ لال چقندر بن گیا وجود سے غصے کے کئی HAND GRANADE نکلے دھماکے ہوئے اور پھر وہ TEARGAS کی طرح سارے میں پھیل گئی۔ اس نے حضورؐ کے بارے میں اور قرآن مجید کے بارے میں متعصب مغربی ادیبوں کے نامکمل علم اور بے بنیاد تحقیق کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں۔ کترنی داڑھی والا عالم اور اس کی رس بھری میم لیموں کی طرح نچڑتے رہے۔ ممتاز گنگ بیٹھا رہا اور میں نے بالوں کی لٹ کو چپکے سے پیچھے کر کے پن میں اٹکا دیا۔ ساری کے پلو کو اپنے آپ پر چھوڑ کر میں نے سوچنا شروع کیا یا اللہ کلثوم کہاں ختم ہوتی ہے اور قدسیہ کہاں شروع ہوتی ہے۔ گر اس شخصیت کے تاثر سے میرے اندر نہ سوڈے کی بوتلیں ٹوٹیں، نہ راتوں کی نیندیں حرام ہوئیں۔ پھر بھی مجھے یہ واضح احساس ہوا کہ ممتاز کی اس سہیلی سے مل کر میرے دماغ کے کچھ قیمتی CELLS اپنی اپنی POCKETS سے نکل کر ہوا میں معلق ہو گئے ہیں اور ارد گرد ہوا کا دباؤ بڑھ گیا ہے۔ اسے مزید جاننے کی کھوج سی لگ گئی۔ تب میں نے تابڑ توڑ داستان سرائے جانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا اپنا گھر میرے دوست میرے تمام ملنے والے ریت کے ٹھاٹھیں مارتے صحراؤں میں اندر ہی اندر دھنس گئے اور میرے ارد گرد چاروں طرف داستان سرائے ہی داستان سرائے پھیل گیا۔ آپ کہیں گے قدسیہ کی بات کرتے کرتے ہم "داستان سرائے" پر کیوں جا پہنچے۔ اور یہ داستان سرائے ہے کیا وہ" داستان سرائے" ماڈل ٹاؤن کے آغاز میں سیدھے ہاتھ مبہم سی ایک سڑک پر پھیکے چاکلیٹی رنگ کی وہ کوٹھی ہے جو آپ اگر گذر جائیں تو آپ کو کبھی آواز نہ دے گی۔ یہ کوٹھی بھی باہر سے کلثوم ہے اور اندر سے قدسیہ۔ اس کے مکمل ہونے پر کئی لوگوں کو دکھ ہوا تھا۔ ان لوگوں کو دکھ ہوا تھا جو اس پہ لگے ہوئے گارے، اینٹ کا حساب روپوں میں کرتے تھے ان کا دکھنا بے جا ہے کیونکہ وہ یہ بالکل نہیں جانتے کہ داستان سرائے اینٹ۔ گارے، سیمنٹ سے بالکل نہیں بنا۔ اگر اینٹ، گارے، سیمنٹ سے بنا ہوتا تو وہاں آپ کے اور میرے گھر کی طرح ایک سسٹرن میاں بیوی الجھے گبڑے ہوئے بچے اور میاں کے تنومند بڈھے ضدی ماں باپ ضرور ہوتے۔" داستان سرائے" تو وہ داستان ہے جس میں نیو سے لے کر آخری برجی تک گارے کی ہر تُرکی اور رنگ کی ہر کوچی میں بانو کا وجود بھورا بھورا سا گندھا ہوا ہے ایک ہی دن میں آپ جان جائیں گے کہ وہاں گھاس کے ہر تنکے، چولھے کی ہر نیلی لاٹ اور چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کے ہر گرم بھبھاکے سے بانو قدسیہ آپ کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہو گی۔ پھر بنا بتائے وہ قدسیہ اور داستان سرائے آپ کے حواس پر چھائے جائیں گے چھلتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ آپ کو احساس ہو گا کہ قدسیہ اور اُس کا گھر ایک ایسا OCTOPUS ہے جس کے اَن گنت غیر مرئی اعضا آپ کو یوں جکڑ لیتے ہیں کہ آپ کے اوپر ایک لذیذ بے بسی طاری ہو جاتی ہے اور آپ کہیں اور جوگے نہیں رہتے۔ آپ کو جب کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہو متحیر نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے اندر جاتے ہی دفعتہً آپ کو مختلف النوع انسانوں ملکی، غیر ملکی، علم شمار، گویے اخبار نویس بوڑھے، جوان، ویشیا اور صوفی سے اچانک واسطہ پڑ جائے۔ یہ رنگ رنگی ایک ایک، دو دو، کے گروہ میں بے فکری سے پورے گھر میں یوں بکھری پڑی ملے گی۔ جیسے ہزاروں برس پہلے ٹیکسلا کے آشرم میں لوگ فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ کسی کمرے سے سات سروں کی پھوار برس رہی ہوتی ہے۔ کہیں اخبار نویس اپنے انداز

ا کے اختلاف پر لڑ رہے ہوتے ہیں۔ اور کہیں ہومیو پیتھی کے فوائد کے بارے میں گرماگرم بحث جاری ہوتی ہے جب کبھی گھر میں ایسا سماں ہو (اور ایسا سماں اکثر ہوتا ہے) تو پھر وہاں نہ آپ کو کلثوم ملے گی نہ قدسیہ۔ پھر آپ کو مرزا غالب کی چاندنی ملے گی۔ یا امراؤ جان ادا۔ اگر چاندنی چودھویں کی طرح کھلی ہوئی دیکھنی ہو تو پھر آپ کو کھانے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس گھر کے کھانے کو اگر لنگر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ لنگر کی گھنٹی بجتی ہے تو لوگ جوق در جوق دسترخوان کی طرف بڑھتے ہیں۔ تب وہ آپے سے باہر ہوتی ہے ریاض بھائی یہ دال بھری روٹیاں میں نے خود بنائی ہیں ماسی جیونی کے ساتھ مل کر۔ تابش جی یہ میٹھا تو کھا کر دیکھیے یہ جاپانی ہے۔ پروین یہ سوہانجنے کی پھلیوں کا اچار تو تو کہتی تھی تجھے بہت پسند ہے۔

ANDREW TAKE THIS MEAT BALL. IT IS A TYPICAL PAKISTANI DISH.

خان جی یہ تربوز میں نے صبح سے کاٹ کر آپ کے لئے فرج میں رکھا تھا (خان جی وہ اشفاق کو کہتی ہے) خان جی ایسے ہیں، جانے کیوں اپنے اوپر ایک جملہ معترضہ کی سی کیفیت طاری کر لیتے ہیں۔ گو اچی گاں جیسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو اُنھاں استھان منہ مارے پہ نیت کسی نہ ہو۔

شاید اسی کیفیت کی تپش میں وہ چڑھی کمان بن جاتی ہے ایسا وسیع و عریض دسترخوان ایسے بے معنی جھگڑے دیکھ کر شروع شروع میں میرا دل وسوسوں نے گھیر لیا۔ اتنی شدید مہنگائی اور اس قدر دھاندلی کے اخراجات۔

قدسیہ کونسی نظام حیدر آباد کی پوتی ہے اور اشفاق کون سا شکار گاہوں کا مالک ہے۔ ہاں میں نے سوچا پاکستانی INTELLECT دساور کی منڈیوں میں اچھے بھاؤ بک رہا ہے آج کل۔ تب اچانک ٹی وی سٹیشن جانا ہوا ایک دن ایک پروڈیوسر صاحب کی میز سے ایک چٹ ہاتھ لگ گئی۔

محترم صبح کے دو چکر کاٹ چکی ہوں، آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سکرپٹ کئی روز سے آپ کی میز کے دراز میں پڑا ہے۔ ہم [illegible] ک ہیں، دیہاڑی نہ ملے تو کام نہیں چلتا۔ برائے کرم سکرپٹ کے بارے میں جلد کوئی فیصلہ کیجئے۔ مخلص قد [illegible]۔

[illegible] منجمد سی ہو گئی، یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ کئی بار محفلوں کی تام جھام میں اچانک میں نے اس کے ارد گرد اک غبار سا [illegible] دھند سی۔ اس دھند میں قدسیہ، کلثوم اور امراؤ جان ادا تینوں ہی کچھ مٹی مٹی سی کچھ شکستہ یا تھکی ہوئی سی نظر آئیں۔ پھر [illegible] اس کی پلکوں کے بہت اندر بے شمار ستارے لرزاں دیکھے جو ٹوٹ کر نکلنے کی خواہش میں جانے کب سے وہاں جگ [illegible] قدسیہ جب ایسی کیفیت میں گھر جائے تو اشفاق احمد چونک جاتے ہیں لیکن ایسے جیسے سوئے بچے کے منہ میں کوئی برف کی ڈلی [illegible]۔ جسے وہ ہڑبڑا کر پرے کر دے اور پہلو بدل کر دوبارہ سو جائے۔ اشفاق کے چونک جانے کے عمل سے قدسیہ کی [illegible] ہوئی روح میں LASER BEAMS کی حدت بھر جاتی ہے اور داستان سرائے کے ہر کونے میں محبت کے سورج مکھی کھل اٹھتے ہیں۔ [illegible]ب قدسیہ اشفاق اور داستان سرائے نے میرے شعور پر کئی جالے بن دیئے تو پتہ نہیں کیسے قدسیہ کی ذات کے کئی اہم پہلو آپ ہی مجھ پر پرتی پرتی کھلنا شروع ہو گئے۔ ان کئی ایک پہلوؤں میں سے اہم ترین پہلو قدسیہ اور اشفاق کے آپس کے تعلقات کا پہلو ہے۔ اس تعلق کی شدت گہرائی اور یک رخی آپ پر واضح ہو تو آپ ذرا سمجھ جائیں گے کہ آپ کا وجود اس گھر میں اس زیر، زبر، پیش کا سا

ہے جس کے بغیر لفظ کی سالمیت کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ سارے حیلے یہ سارے بہانے۔ قدسیہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پھولوں بھری چنگیر اس کے جسم سے نکلتی ہوئی محبت کی اَن گنت ’ULTRA RAYS‘ اور پاؤں میں بندھے گھنگھرو صرف ایک ہی شخص کی توجہ کے طالب ہیں۔ میں نے عورتوں میں ایسی یکچر عورت آج تک نہیں دیکھی۔ سنتے ہیں اشفاق احمد نے سات برس کی خجستہ پائی، سات برس کی تپسیا کے بعد اس کنیا کو اپنے نام دان کروایا تھا۔ دان سے جھولی بھر گئی تو اس کی روح کو اپنے اصل کی کھوج لگ گئی۔ اسے تپسیا کا چسکا پڑ چکا تھا اس نے چپکے سے قدسیہ کو تلسی کے پوتر بوٹے کی طرح آنگن میں گاڑا اور خود کھوج میں چل پڑا۔ انجانی، ماورائی چیزوں کی کھوج میں اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ آنگن میں وہ تلسی کا بوٹا نہیں بجلی کی لہر گاڑ کر آیا ہے۔ اور یہ لہر اسے بھسم کر لینے کے لئے مسلسل اس کے گرد تھرکتی رہی ہر انگ سے، ہر زاویے سے۔ وہ لکھاری تھا۔ وہ ایسی لکھاری بنی کہ آج ہندوستان اس کا DAY منانا چاہتا ہے۔ اشفاق کو دوستوں کے جھمگھٹے پسند تھے۔ اس نے ممتاز، انشا، شہاب، زوبی کو ایسے دوست بنایا کہ اب انھیں خود یاد نہیں وہ اصل میں کس کے دوست ہیں۔ اشفاق کے خاندان میں لڑکوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس نے چھ چھ فٹ کے تین مشٹنڈے بنا دیئے پر لڑکی کا CHROMOSOME اس کے جسم کے قریب نہیں جا سکا۔

تلسی کا بوٹا راج نرتکی بن گیا۔ بیس برس دھمال جاری رہی۔ تھراہٹ قائم رہی۔ اگر کچھ دیر اور اشفاق مبہم بنا رہتا تو بہت سے جھگڑے چلتے اور قدسیہ کی ذات سے علانیہ انا لاشفاق کی آوازیں آتیں۔ جھگڑے چلنے سے بہت پہلے اشفاق احمد جو اپنی ”میں“ کو بغل میں دابے ساری عمر اوپر ہی اوپر اڈاریاں مارتا رہا۔ تھکے ہوئے بے بال و پر پرندے کی طرح ریزہ ریزہ بانو کی جھولی میں پڑا اسے پرکھنے میں گم آیا بھی تو ٹوٹا پھوٹا۔ زندگی بھر محبوبیت کے چسکے میں دور رہ کر ادا قدسیہ کے عشق کی کاوشوں کے مزے لیتا رہا۔ سچ کی کھوج لگی تو اوپر والے نے تیمارداری اسے اس کی محبت میں لت پت کر کے [illegible] کھا رہا ہے۔ قدسیہ [illegible] یہاں ہے پہلے تو عشق کی [illegible] پھر [illegible] [illegible] کی دیوار کو چاٹ چاٹ کر جب اس نے [illegible] PARK [illegible] بنایا تو اس میں ادیب و استاد محبت کا شہر دیکھا [illegible] ہو گیا۔ اب جو تصوف کے لق و دق صحرا کی طرف رجوع [illegible] اسے کون واپس لائے گا۔ خان صاحب کو ۹۹ داستان ہم نے یہ نیلے پیلے جھنڈے پڑ گئے ہیں ہم لوگ جو اتنے دن محض ایکسٹرا کے رول ادا کرتے رہے بغلیں جھانک رہے ہیں۔ اور راج نرتکی پتی دیو کے پیچھے SUFI - ism کی کھوج میں گٹھڑی باندھ رہی ہے۔ شاید اشفاق کی کھوج لگاتے لگاتے اسے کسی صبح کسی افق پر کسی دھنک کسی گھٹا میں اشفاق کو اشفاق بنانے والا خود مل جائے تب کمال تھم جائے اور اس کی پلکوں کے اندر ہی اندر چھپے ہوئے تابندہ ستارے روشنی کی اٹل کرن بن جائیں اور داستان سرائے بقعہ نور بن جائے۔ پھر ہم سارے جو ہمیشہ اُن کی محبت کے زعم میں وہاں حلوے پوریاں ہی اُڑاتے رہے از خود EDIT ہو جائیں۔

میں بحیثیت ایک دوست کے اگر قدسیہ کی زندگی سے EDIT بھی ہو جاؤں تو سودا گھاٹے کا نہیں۔ میرے لئے اس زعم کا بھرم بھی خاصا دلچسپ ہے کہ میں ایک ایسی خاتون کو جان چکی ہوں جس کی شخصیت ہار سنگھار کے درخت کی طرح رنگا رنگ پھولوں سے لدی پھندی ہے۔ لیکن جس درخت کی ہر ڈالی کا رنگ مختلف اور ہر رنگ دوسرے سے تیز ہے یا یوں کہیے کہ اس کی شخصیت کی ڈالی ڈالی تضادات کے نہایت SUBTLE شگوفوں سے لدی پھندی رہتی ہے۔ تحریروں میں تو یہ تضادات نہایت

اندر ہی اندر EMBOSS ہیں۔ CHINESE EMBRIODRY کی طرح انھیں، دھاگہ دھاگہ کرنا بہت مشکل ہے۔ انھیں جانچنے کے لئے اس کی غیر تحریری قربت نہایت لازم ہے یوں تحریروں میں تو مجھے وہ کوئی TYPICAL لکھاری بھی نہیں لگتی۔ بس کچھ رنگریزیا للارن قسم کا درجہ لگتا ہے مجھے ادب میں اس کا۔ بس بیٹھے بیٹھے زندگی کی کسی گہرائی، کسی نزاکت، کسی دھڑکن، کسی درد کو جذبے کی چٹکی سے پکڑا اور کھولتے ہوئے تیز ارغوانی، کیسری، عنابی MAGENTA دھانی، گلابی کسی مناسب رنگ کے کڑاہے میں ڈبو دیا دے کر نکال لیا اور بس پھر لشکارے ہی لشکارے۔ رنگ ہی رنگ۔ قاری رنگ کی چکاری سے لت پت ہو جاتے ہیں اور للارن نئے رنگ گھولنا شروع کر دیتی ہے۔ تضادات کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی۔ مثلاً نظریاتی طور پر شادی کی INSTITUTION سے بانو کا جی الجھ گیا ہے۔ وہ اس IUSTIHUTION کو نائلن کے اس تنگ اور سخت بنائی کے جال سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی جس میں مچھلیوں کو ان کی مرضی کے بغیر بند کر کے جال کا منہ باندھ دیا جائے اور وہ جال کے جس میں گھٹ گھٹ کر مر جائیں وہ کہتی ہے جلنے کیوں دو بے گناہ انسان برس ہا برس آزادی سے زندہ رہنے کا ہر حق قربان کر کے بیلوں کی طرح شادی کا بوجھ اپنی لاگا لگی گردنوں پہ اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ گھسٹتے چلے جاتے ہیں۔ قبر کی تاریک دیواروں تک۔ پر جہاں تک اس کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے وہ کسی ستی ساوتری سے کم نہیں۔ اور اپنی شادی کو مثالی مشرقی شادی بنانے کے لئے اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بلکہ اپنی اولاد کو بھی آئندہ شادیاں ...میاب بنانے کے مجرب نسخے بتایا کرتی ہے۔ جنس کے بارے میں بھی اس کی دو رخی بہت دلچسپ ہے وہ برٹرینڈ رسل کی طرح جنس کو ہر انسان کا انتہائی INTIMATE معاملہ سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک جنس کے متعلق معاشرے میں جس شدت کی ... ہے وہ بے معنی ہے۔ اس شدت کی سے دے نے اسے خواہ مخواہ شجر ممنوعہ بنا کر سات پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ اور سات ... چھپا شجر ممنوعہ تو تلذذ کی رسیات کو خواہ مخواہ بھٹی پہ چڑھائے رکھتا ہے۔ اگر پورے معاشرے کے ذہن کا اہم حصہ بھٹی پر ... ہے تو نتائج CONSTRUCTIVE ہونا ناممکن ہیں۔ پر جہاں تک اس کی اپنی افتاد اس کے اپنے کردار کا تعلق ہے اب تو ... نے اپنی زینتوں کو اشفاق احمد سے بھی چھپانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی ذاتی SEX کے بارے میں بات کریں تو یوں لگتا ہے ...وح پڑھ رہے ہیں۔ FREE SEX کے تصور سے گھن آنے لگتی ہے۔ جانے پھر وہ یوں تاشوں میں کیوں بٹ جاتی ہے EADIPUS COMPLEX یا MOTHER FIXATION سے وہ پاکستان کی ہر حساس خاتون کی طرح بے حد ... ہے۔ اس کے نقصان وہ پہلوؤں پہ رائے زنی کرنا اسے بے حد EXCITE کرتا ہے۔ میں بہت مرعوب تھی سمجھا کرتی تھی قدسیہ ... کے بیٹوں کے آپس کے تعلقات مشہور زمانہ ہوں گے۔ بیٹے اور مائیں آ آ کر درس لیا کریں گی۔ پر تضاد کا اتنا بڑا BEAN STALK کہیں میں نہیں آیا ہوگا۔

ایک روز گئی تو قدسیہ ہاتھ میں دوائی کی شیشی اور چمچہ لئے دیوانہ وار کمرہ کمرہ پھر رہی تھی۔ نوقی او نوقی۔ جانے کہاں گیا یہ لڑکا۔ دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔ کیسے ٹھیک ہوگا۔ اچانک سیڑھیوں سے ایک گھنی سیاہ داڑھی اور سیاہ مونچھوں والا جنا اترا۔ کیا ...ی؟ آیا اور آ کے چاروں شانے چت اس کے زانو پہ لیٹ گیا۔ قدسیہ نے نہایت جذباتی ہو کر چمچہ اس کے منہ میں ڈال دیا۔ دوسرا ... اللہ بارھویں میں ہے۔ شلوار میں ازار بند تک قدسیہ کے علاوہ کوئی نہیں ڈال سکتا۔ تیسرے کی بھی خیر سے مسیں بھیگنے کو آئی ہیں جب

تک قدسیہ خود غسل نہ کرائے اپنے ہاتھ سے وہ بنا نہائے ہی پھرتے رہیں گے ۔ بادی النظر میں بات نہایت نارمل اور مشرقی لگے گی آپ کو لیکن میں نے جو ذرا بغور مطالعہ کیا ہے تو قسمیہ کہہ سکتی ہوں کہ MOTHER FIXATION کا امرت دھارا اتنی مقدار اور اس نوعیت سے رچ بس گیا ہے اُن لڑکوں کی شخصیت میں کہ وہ زندگی بھر قدسیہ کے IMAGE کی گھمن گھیری میں ایسے الجھیں ہیں کہ کوئی لڑکی اس بت کو DISPLACE نہ کر سکے گی کبھی ۔ قصہ مختصر، نیل اُن کے منہ سے خود نہیں نکالتی اور تھر تھر کانپتی ہے MOTHER FIXATION سے ۔ ببلوں اور کیچڑوں سے بڑا پیار ہے قدسیہ کو لیکن جب تک وہ صرف آپ کے دامن کی سجاوٹ ہیں ۔ یوں وہ کہتی ہے کہ ہر کیچڑ کا چھینٹا ہر میل کا دھبہ ہر الجھی ہوئی گانٹھ انسان کی ذات میں ایک نیا دریچہ کھولتی ہے ۔ نئے جھرنے پھوٹتے ہیں کیچڑ میں سے گذر کر ذات کا کندن دمک جاتا ہے اور شخصیت پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے ۔ خود طہارت کی چٹی کبوتری کو سینے سے لگائے لپے پُتے چوکے پہ جا نماز بنی سدا ہی میلے لوگوں کی منتظر رہی ۔ جب وہ آپ کی ذات کے متعفن بدنما داغ پھیلتے ہوئے تھامے BEAUTY CLINIC کی شاطر SPECIALIST کی طرح مہربانی اور محبت کی سوندھی خوشبو سے صاف کرتی ہے تو سمجھ نہیں آتی کہ جس نفاست سے آپ کی غلاظت وہ اپنے سینے پہ چپکائی ہے صیقل آپ کی ذات ہوتی ہے یا اس کی ۔ البتہ متنجن کی دیگ کی طرح جتنا بھی اُس کی ذات پھرولتے جائیں گے کھٹے میٹھے رنگوں کی بوچھاڑ اور خوشبوئیں دُھند کی طرح آپ کے ارد گرد پھیلتی جائیں گی ۔ ادب ۔ بے سلیقگی ۔ سنجیدگی ۔ شوخی ۔ محبت INDIFFERENCE جذبات کی شدت پھر یخ بستگی چاندی کے ورقوں کی تھدی کی طرح ہر پرت میں نیا ورق ہر تہہ میں نیا روپ ۔ اگرچہ مجھ جیسے عام تمام لوگوں کے لئے اتنی پھیلی ہوئی شخصیت سے دوستی کرنا چڑھے پٹھے کی تیز اور لذیذ درد سے کم نہیں ۔ پر اب جو اس درد کا چسکا پڑ ہی گیا ہے تو باقی کے دن بھی کیوں نہ اسی تلذذ میں گذار دوں؟

فکر تونسوی کا اغلاط نامہ

مجتبیٰ حسین

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں فکر تونسوی کی نئی تصنیف "بدنام کتاب" کی رسم اجرا کے موقع پر ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی نیا مضمون پڑھوں۔ پرانی شخصیت کے بارے میں کوئی نیا مضمون پڑھنا یوں بھی دشوار کام ہے۔ ابھی دو سال پہلے میں نے ان کی شخصیت پر ایک بھرپور خاکہ لکھا تھا۔ اب پھر ان کی شخصیت کے بارے میں نیا مضمون لکھنے کی فرمائش پر مجھے وہ لطیفہ یاد آرہا ہے کہ "ایک نواب صاحب کو کسی نے بتا دیا کہ علی الصبح گھوڑے کی سواری کی جائے تو صحت اچھی رہتی ہے۔ نواب صاحب فوراً بازار گئے ایک سائس خرید کرلے آئے اور ایک گھوڑے کو ملازم رکھ لیا۔ سائس کو پابند کیا کہ وہ انہیں گھوڑا سواری کے لئے علی الصبح جگایا کرے دوسرے دن سائس علی الصبح گھوڑے کو تیار کرکے نواب صاحب کی خواب گاہ میں انہیں جگانے کے لئے پہنچا۔ بڑی آوازیں دیں تو نواب صاحب نے سوتے سوتے ہی پوچھا "بولو کیا ہے؟" سائس بولا "حضور گھوڑا سواری کے لئے تیار ہے۔" نواب صاحب نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو پھر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "تم ذرا گھوڑے پر زین ڈال دو میں ابھی بیدار ہوتا ہوں۔" آدھے گھنٹے بعد وہ پھر نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا اور دوبارہ انہیں جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب کی بار نواب صاحب نے لال، لال ڈوروں والی آنکھیں کچھ دیر کے لئے کھولیں اور پوچھا "بولو کیا ہے؟"

سائس نے دست بستہ عرض کی "حضور گھوڑا سواری کے لئے تیار ہے بیدار ہو جائیے۔"

نواب صاحب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "میں نے تو تم سے کہا تھا کہ گھوڑے پر زین ڈال دو۔"

سائس نے کہا "سرکار آپ کے احکام کی تعمیل میں میں نے گھوڑے پر زین ڈال دی ہے۔"

اس پر نواب صاحب نے ایک لمبی جماہی لے کر کروٹ بدلتے ہوئے کہا "جاؤ تھوڑی سی زین اور ڈال دو۔"

اب میرے اس نئے مضمون کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ میں فکر تونسوی پر تھوڑی سی زین اور ڈالنے چلا ہوں۔ مجبوری سائس اور ے کیا نہیں رہ واقعی۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ میں نے ان پر پہلا مضمون دو سال پہلے لکھا تھا۔ ان دو برسوں میں بہت کچھ ہو گیا ہے۔ ان دو برسوں میں وہ مزید بوڑھے ہو گئے ہیں اور میں مزید جوان ہو گیا ہوں۔ قانون قدرت کو یہی منظور تھا۔ پھر ان دو برسوں میں وہ مجھ سے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت دور ہو جائیں گے۔ میں نے پہلے مضمون میں بہت سی ایسی باتیں لکھ دی تھیں جنہیں بعد میں انہوں نے اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیا۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ فکر تونسوی کا ایک اغلاط نامہ شائع کیا جائے چاہے اس تھوڑی سی زین اور ڈالنے کی زحمت کیوں نہ اٹھانی پڑ جائے۔

یہ حضرت "ہمپ بیک آف ناترے ڈیم" سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ بڑے عجیب و غریب آدمی ہیں۔ اونٹ کی کل سیدھی بھی ہو سکتی ان کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس دنیا میں کیا کرنے کے لئے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔ آپ کہیں گے اردو

میں طنز نگاری کرنے آتے ہیں۔ مانا کہ طنز نگاری کرنے آتے ہیں مگر میری غرض یہ ہے کہ طنز نگار بڑا ہوشیار آدمی ہوتا ہے وہ دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے اپنے مکان کی دیواروں کو نہ صرف بلند کر لیتا ہے بلکہ انھیں مضبوط بھی بنا لیتا ہے وہ بڑی ہوشیاری اور کسی حد تک عیاری سے اپنی ذات کو کچھ اس طرح ڈھانپتا ہے کہ کسی کو اس پر طنز کرنے کا موقع نہ ملے۔ اگر اس کو معیار مانا جائے تو گستاخی معاف یہ جو حضرت فکر تونسوی اردو کے بڑے طنز نگار بنے پھرتے ہیں۔ دنیا کے سب سے بے وقوف ترین آدمی ہیں۔ ان کی ذات بابرکات کا جتنا مذاق اڑایا جا سکتا ہے۔ اتنا شاید ہی کسی کا اڑایا جا سکے۔ یہ اتنے بڑے طنز نگار ہیں مگر چھوٹی سی چھوٹی بات پر اتنے خوش ہوں گے کہ دیکھنے والا افسوس کرنے لگ جائے۔ ایک بار میرے ساتھ بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہے تھے ابھی انتظار کے دو سکنڈ بھی نہ گزرے تھے کہ بس آ گئی اور اتفاق سے خالی آ گئی اب اس بات پر جو فکر تونسوی خوش ہوئے تو خوش ہوتے ہی چلے گئے۔ "یار یہ کتنے کمال ہے آج ہمیں اتنی آسانی سے بس مل گئی"۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے وہ بس میں داخل تو ہوئے ہی تھے کہ جب بس سے اترنے لگے تب بھی تالیاں بج رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر چلنے لگے تو پھر کہا "یار ایمان سے مجھے تو حیرت ہو رہی ہے یقین ہی نہیں آتا کہ ہمیں اتنی آسانی سے بس ملے گی"۔ کافی ہاؤس پہنچے تو دوستوں کی میز پر پہنچتے ہی خوشی سے اچھل کر کہا "یارو! تم یقین نہیں کرو گے آج ہمیں دو سکنڈ میں ہی بس مل گئی آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ آؤ آج اس خوشی میں ہم سب کو کافی پلاتے ہیں"۔ وہ سکنڈ میں بس کو پکڑ کر وہ یوں سمجھ رہے تھے جیسے وہ زندگی میں آگے نکل گئے ہوں۔ میں چپ چاپ انھیں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

چند دنوں بعد ان کی کتاب "چوپٹ راجہ" کو اتر پردیش اردو اکیڈمی کا انعام ملنے کی اطلاع آئی۔ میں نے سوچا جو آدمی بس پکڑ کر اتنا خوش ہو سکتا ہے وہ یقیناً ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام پا کر پھولے نہیں سمائے گا۔ میں ان سے شام میں کافی ہاؤس میں ملا تو بڑے اداس بیٹھے تھے۔ لگتا تھا گھر میں بیوی سے لڑ کر آئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید انھیں انعام کی خوشخبری اب تک نہ ملی ہو۔

میں نے کہا "کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ کی کتاب کو یو پی اکیڈمی کا انعام ملا ہے؟"

یہ سنتے ہی آنکھوں میں تقریباً تین چار آنسو لا کر بولے "یار یہ بہت برا ہوا۔ ایمان سے میں انعام شنام میں یقین نہیں رکھتا۔ تم نے ہی زبردستی میری کتابیں بھجوا دی تھیں مجھے تو بڑا دکھ ہو رہا ہے ایمان سے وہ کون ہوتے ہیں مجھے انعام دینے والے کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہ سب کچھ انعام اور صلے کے لئے لکھتا ہوں تم نے میرے خلاف ایک بڑی سازش کی ہے میں اپنے آپ کو کرپٹ نہیں کرنا چاہتا"۔

میں نے کہا "آخر بات کیا ہوئی آپ اتنے خفا کیوں ہیں؟"

بولے "ایمان سے مجھے بڑی شرم آ رہی ہے کیا تم نے انعامات کی فہرست میں ڈیڑھ ہزاری منصب داروں کے نام پڑھے ہیں"۔

میں نے کہا "ہاں میں نے سارے نام پڑھے ہیں"۔

بولے "بیٹا، کچھ تو شرم کرو میں اچھا خاصا کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ تم نے مجھے زبردستی [illegible] [illegible] کے ساتھ [illegible] [illegible] ہے"۔

اس کے بعد میں مسلسل ہنستا رہا اور وہ مجھے مسلسل کوستے اور گالیاں دیتے رہے۔ پھر وہ کئی دن تک کافی ہاؤس نہیں آئے۔

میں نے ایک دن فون کر کے وجہ پوچھی تو کہنے لگے "یار ایمان سے اب میں منہ دکھانے کے قابل [illegible] [illegible] [illegible] بالکل برباد کر دیا"

مجھے چھیڑ رہا ہے۔ میں مزید چند روز تک کافی ہاؤس آنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے رہ رہ کر تم پر غصہ آرہا۔

ایک طرف تو ان حضرت کے غصہ کا یہ عالم تھا چند دنوں بعد نارمل ہو گئے تو ایسے نارمل ہو
نہ ملوں یا فون نہ کروں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک بار میں کسی مصروفیت کی وجہ سے آٹھ دنوں تک ا
اتفاق سے ان ہی دنوں میرا دفتر بھی منتقل ہو گیا وہ مجھے فون بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بے خبری کے آٹھ دن بڑے بے
نویں دن ایک دوست میرے دفتر آئے اور کہنے لگے یار فکر صاحب تمہارے لئے بہت بے چین ہیں تم آج ان سے کسی طرح
مل لو۔ یہ دوست گئے تو ایک اور صاحب آئے اور کہنے لگے "بھئی فکر صاحب کو تم سے ایک ضروری کام ہے وہ سخت پریشان
ہیں تم ان سے آج ضرور ملو۔" اس کے بعد تین چار اصحاب ملے اور انہوں نے ہو بہو یہی پیغام دیا۔ میں فطری طور پر پریشان ہو گیا کہ نہ
جانے فکر صاحب کس آفت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ شام کو ٹیکسی لے کر کافی ہاؤس پہنچا تو موصوف کافی ہاؤس کی ایک ٹیبل پر صحیح و
سلامت بیٹھے ہیں۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو بڑی گرمجوشی سے ملے۔ بڑی شکایت کی کہ
اتنے دن کہاں غائب رہے ادھر میں نے مثالیں دے کر اپنے غائب رہنے کی ساری وجہیں بیان کیں۔ سن کر میری باتوں پر ایمان
لے آئے اور خاموش ہو گئے۔ پھر میں نے پوچھا یہ تو بتائیے آخر وہ کیا کام تھا جس کی خاطر آپ نے اتنے سارے دوستوں کے ذریعہ
مجھ تک پیغام پہنچایا۔"

بولے "کام؟ کیسا کام؟ کیا کام کے بغیر ہمیں نہیں ملنا چاہیے۔ کیا کام کے بغیر میں تمہارے لیے بے چین نہیں رہ سکتا؟ میں
تو بس یہ چاہتا تھا کہ تم آج شام کو کافی ہاؤس آؤ کافی پیو کچھ باتیں ہوں۔ کچھ گپ شپ ہو۔ کیا یہ کچھ اہم کام نہیں ہے؟" میں نے کہا۔
مگر ٹیکسی کا کرایہ؟"

ہنس کر بولے "وہ تو ٹیکسی ڈرائیور کے پاس ہی رہے گا۔"

اس دن میں نے محسوس کیا کہ یہ حضرت پٹری سے اترے ہوئے ہیں ان کے ساتھ نارمل آدمیوں کی طرح پیش نہیں آنا چاہیے۔
وہ [illegible] مجھ سے کہتے ہیں "مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔" ہوا کرے مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے عشق فرمانے کے لئے مئی جون کی چلچلاتی
دھوپ میں پیدل چل کر میرے دفتر پہنچیں اور صرف پانی کا ایک گلاس پی کر واپس ہو جائیں۔

میں نے فکر تونسوی کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ اردو کے اس بڑے طنز نگار کے اندر ایک معصوم
[illegible] چھپا ہوا ہے۔ یہ گنوار انہیں اپنے گھر کے خوب صورت صوفہ پر اکڑوں بٹھواتا ہے۔ یہی گنوار ان کے کان میں سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا
[illegible] ہے۔ یہی گنوار انہیں چائے کی پیالیوں میں سگریٹ کی راکھ جھاڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور تو اور یہی گنوار ان سے ریفریجریٹر میں "بدنام
کے نسخے رکھواتا ہے۔ پرسوں میں نے ان کے گھر کا فریج کھولا تو دیکھا کہ "بدنام کتاب" کے دو نسخے بڑی قابلِ رحم حالت میں وہاں
[illegible] میں ریفریجریٹر میں کتابیں دیکھ کر ہنسنے لگا تو خفت مٹانے کے لئے بولے "بھئی میں نے اصل میں پانی پینے کے لئے فریج کھولا تھا شاید
غلطی [illegible] وہاں رہ گئے ایمان سے۔" پھر خود ہی کچھ سوچ کر ایک طنزیہ فقرہ میری طرف اچھالتے ہوئے بولے "مگر یار یہ کوئی غلط بات
ہے۔ اردو کی کتابیں اب ریفریجریٹر میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔"

میں پھر ہنسنے لگا تو بولے "دیکھ بیٹا۔ مجھے یہ فریج، یہ ٹی وی، یہ صوفہ سیٹ، یہ قالین ایک نہیں بھاتے ایمان سے۔ میں تو بڑی مشکل

کے ساتھ ان سے اڈجسٹ کرتا ہوں۔ یہ بھول کمار نہ جانے گھر میں کیا کیا لا کر بھرتا چلا جا رہا ہے۔"

فکر تونسوی نے یہ بات کچھ اس معصومیت سے کہی کہ میں اپنے سارے وجود میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس کرنے لگا مجھے اپنے بچپن اور نوجوانی کے وہ دن یاد آ گئے جو کھیتوں کے درمیان گذر رہے تھے۔ تازہ تازہ فصلوں کی مہک ہرے بھرے کھیتوں کی دوشیزگی مویشیوں کی آوازیں سب کچھ ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے فکر تونسوی کے اندر چھپا ہوا گنوار میرے اندر چھپے ہوئے گنوار کو آنکھ مار رہا ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ ٹی وی سیٹوں ریفریجریٹروں، گیزروں، ایر کنڈیشنوں، صوفہ سیٹوں اور نیون سائن لائٹوں کے نیچے دبے ہوئے گنوار جب جاگ پڑتے ہیں تو کتنے معصوم اور قابل محبت نظر آتے ہیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ یہ جو فکر تونسوی اپنے مضامین میں سچ بات کہتے ہیں تو یہ اس میں وہ نہیں کہتے بلکہ ان کے اندر بیٹھا ہوا گنوار ان سے سچ کہلواتا ہے۔ اسی لئے تو ان کے سچ پر اعتقاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان حضرت کی کوئی ایک خامی ہو تو بیان کروں۔ ان کی ذات میں تو خامیوں کے دفتر کھلے ہیں۔ ایک بار مجھے اور قبلہ حضرت کو ایک جلسہ میں شرکت کے لئے حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ ریل کا ریزرویشن نہیں مل رہا تھا میں نے بڑی بھاگ دوڑ کی اور جان پہچان کے ایک کلرک کو فی برتھ دس روپے رشوت دے کر ریزرویشن کروا لیا۔ میں نے موصوف کو سارا ماجرا کہہ سنایا تو دوسرے دن "پیاز کے چھلکے" میں اس کلرک کے خلاف ایک لمبا چوڑا کالم لکھ مارا۔ کلرک دوسرے دن بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "غضب ہو گیا آپ کے فکر صاحب نے میرے خلاف کالم لکھ دیا ہے۔ میں نے تو آپ کی مدد کی تھی آپ نے اس کا خوب صلہ دیا۔" کالم پڑھ کر مجھے بھی غصہ آیا اور اسی حالت میں حضرت کے پاس پہنچا۔ جب سارا ماجرا کہہ سنایا تو بڑے نادم ہوتے کہنے لگے: "بھول ہو گئی آج کا کالم تو جا چکا ہے پرسوں کا کالم اس کلرک کی حمایت میں لکھوں گا۔" میں نے کلرک کو اطلاع دی کہ "اب اگلا کالم تمہاری حمایت میں آئے گا تم فکر مت کرو۔" دوسرے ہی دن کلرک نے مجھے فون کر کے کہا "فکر صاحب سے کہیے کہ وہ اب میری حمایت میں کالم نہ لکھیں کیوں کہ ہمارے ڈپارٹمنٹ نے اب تک ان کے پہلے کالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا ہے۔ اب خواہ مخواہ اس مسئلہ کو چھیڑنے سے کیا حاصل؟" کلرک کی بات معقول تھی میں پھر فکر تونسوی کے پاس گیا اور بولا "حضرت اب آپ کالم نہ لکھیے۔ کیوں کہ آپ کے پہلے کالم کا ڈپارٹمنٹ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ معاملہ دب گیا ہے۔ اب آپ اس مسئلہ کو پھر کیوں چھیڑتے ہیں؟" یہ سنتے ہی حضرت آگ بگولہ ہو گئے بولے "کیا کہا ڈپارٹمنٹ نے میرے کالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یہ تو سراسر میری توہین ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا میں کل ہی اس ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھوں گا کہ وہ عوامی شکایتوں کا کوئی نوٹس نہیں دیتا۔" وہ تو ڈپارٹمنٹ کے خلاف کالم لکھنے پر تلے بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے نتائج و عواقب سے انہیں آگاہ کر دیا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ ان نتائج و عواقب سے اس بیچارے کلرک کی قسمت کس طرح وابستہ ہے۔ بڑی دیر کے بعد ان کی سمجھ میں بات آئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ورنہ بیچارے کلرک کا نہ جانے کیا بنتا۔

اسی حیدرآباد والے سفر کی بات ہے کہ ہم فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے اور فکر صاحب کا بیان تھا کہ وہ پہلی بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے ہیں۔ اسی لئے ڈبہ میں سوار ہوتے ہی انہوں نے ڈبے کی ایک ایک شئے کو چھو کر دیکھنا شروع کیا تاکہ پتہ چلا سکیں کہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ کیسا ہوتا ہے۔ ابھی وہ ڈبے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ دو فوجی عہدیدار جنہیں ہمارے کیبن میں جگہ ملی تھی داخل ہو گئے حضرت نے دبی زبان میں مجھ سے کہا: "یار یہ تو بہت برا ہوا کیا یہ حیدرآباد تک ہم پر پہرہ دیتے رہیں گے؟"

میں نے کہا "لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

کچھ دیر تک حضرت سہمے رہے پھر کھلکھلاتے ہوئے فوجی عہدیداروں سے بولے "معاف کیجیے گا میں پہلی بار فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

وہ بولے "ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

پھر حضرت خود ہی بولے "میں فکر تونسوی ہوں اردو طنز و مزاح کا بریگیڈیر اور یہ ہیں مجتبیٰ حسین اردو طنز و مزاح کے فیلڈ مارشل۔"

فوجی عہدیداروں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اب جو حضرت نے اس قہقہہ کو پکڑ کر ان دونوں کے "چھلکے" اتارنے شروع کئے تو میں گھبرا گیا کہ کہیں یہ فکر تونسوی کے خلاف سنگینیں تان کر کھڑے ہو جائیں۔ عجیب عجیب سوالات ان سے پوچھتے رہے۔ پوچھا "محاذِ جنگ پر اگر آپ شکست کھا جائیں اور آپ کو مورچہ چھوڑ کر بھاگنا پڑے تو کیا آپ جوتوں سمیت بھاگتے ہیں یا جوتے اتارنے پڑتے ہیں؟ اس معاملہ میں فوجی قانون کیا ہے؟" اب بیچارے فوجی عہدیدار اس کا کیا جواب دیتے نظریں جھکا کر خاموش ہو گئے۔ فکر تونسوی نے پے بہ پے ان پر حملے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ آدھے سفر کے بعد دونوں تقریباً پسپا ہو گئے اور اپنی اپنی وردیوں سے باہر نکل آئے۔ حیدرآباد تک فکر تونسوی انھیں اس طرح تنگ کرتے رہے کہ لگتا تھا یہ دونوں فوجی عہدیدار نہیں PRISONERS OF WAR ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ سکندرآباد کے اسٹیشن پر یہ دونوں عہدیدار ہم سے نظریں بچا کر چھپتے چھپاتے اپنا سامان لے کر بھاگنے لگے تو حضرت نے پکار کر کہا "اب بھاگے جا رہے ہو تو ضرور بھاگنا مگر محاذِ جنگ پر خدا کے لیے ہرگز نہ بھاگنا یہ میری وصیت ہے مجھے ایمان سے۔"

میں نے بعد میں حضرت کو آڑے ہاتھوں لیا کہ "یہ کیا آپ خطرناک مذاق کرتے ہیں فوجی عہدیدار ہیں بندوق چلا دیں تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے؟"

بولے "یار! یہ تو دشمن پر ٹھیک ڈھنگ سے گولی نہیں چلا پاتے دوست پر کیا گولی چلائیں گے۔ یہ بات کہ میں نے انھیں کیوں چھیڑا تو بیٹا جواباً عرض ہے کہ ٹکر ہمیشہ اپنے سے طاقتور آدمی سے لینی چاہیئے اور یہ بات بھی دھیان میں رکھو کہ تلوار اور قلم کی جنگ میں ہمیشہ فتح قلم کی ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر حضرت نے سینہ یوں تان لیا جیسے وہ محاذِ جنگ سے فتح یاب ہو کر واپس ہوئے ہوں۔"

ان کی ایک اور کمزوری لاہور ہے جسے وہ پیار سے "لہور" کہتے ہیں۔ بات کسی بھی شہر کی چلے وہ اسے لاہور پر ہی لے جا کر ختم کریں گے۔ دہلی میں انھیں رہتے ہوئے ۲۵ برس بیت گئے مگر ابھی تک اپنے آپ کو دہلی کی سڑکوں اور گلیوں کے قابل نہیں بنا سکے۔ لاہور کا کہیں سے ذکر کیجیے اور دیکھیے کہ کس طرح لاہور ان کی آنکھوں میں سمٹ کر آجاتا ہے۔ ذرا اور ذکر کیجیے تو دیکھیے کہ کس طرح لاہور ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگتا ہے۔ کہیں گے "جب سے لاہور چھوٹا ہے تب سے کسی شہر میں رہنا نصیب نہیں ہوا لاہور کی کیا بات ہے۔ وہاں کا سورج ہی اور ہے چاند ہی الگ ہے وہاں پانی ایسے نہیں بہتا جیسے یہاں بہتا ہے وہاں چڑیاں ایسے نہیں چہچہاتیں جیسے یہاں چہچہاتی ہیں۔"

ایک بار ایک پاکستانی نوجوان پاکستان سے ہندوستان آئے تو فکر تونسوی کو فون کیا۔ وہ بھاگے بھاگے میرے پاس آئے کہنے لگے۔

"بھئی لاہور سے ایک نوجوان ادیب دہلی آیا ہوا ہے چلو ہم چل کے مل لیتے ہیں۔"

میں وہ اور مظفر حنفی مل کر پاکستانی ادیب کے پاس گئے تو فکر تونسوی وہاں جاتے لاہوری ادیب سے یوں بغل گیر ہوئے جیسے انھیں

پتہ ہی نہ ہو کہ ہم بھی ان کے ساتھ آئے ہیں۔

میں اور مظفر حنفی بے وقوفوں کی طرح بیٹھے رہے اور وہ دونوں "لہور لہور" کہتے رہے۔ فکر تونسوی لاہوری ادیب سے مل کر سرحد پار چلے گئے اور میں اور مظفر حنفی ہندوستان میں رہ گئے تھے۔

لاہوری ادیب کو یہ پتہ نہیں تھا کہ فکر تونسوی ہندو ہیں۔ وہ نام کی مناسبت سے انھیں مسلمان ہی سمجھ رہا تھا اس نے رازدارانہ انداز میں فکر تونسوی سے پوچھا "یہ بتایئے آپ لوگ یہاں کس حال میں ہیں؟" فکر تونسوی بولے "یہاں کیا اچھے رہیں گے جی۔ زندگی تو بس لاہور ہی میں ختم ہو گئی" اس پر بھی نہ فکر تونسوی اس ادیب کی بات سمجھ سکے اور نہ ہی وہ ادیب فکر تونسوی کی بات کا مطلب سمجھ سکا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی اور رازدارانہ بات کہتا میں نے مذاق میں کہا "قبلہ یہاں ہم لوگ کس حال میں ہیں؟ یہ سوال تو آپ ہم سے پوچھئے خدا کے فضل سے اچھے ہیں اور فکر تونسوی جیسے ہندو دوست ہمیں یہاں ملے ہوئے ہیں۔ وہ معاملہ کو تاڑ کر فوراً سنبھل گیا مگر فکر تونسوی تب بھی بات کا مطلب نہیں سمجھے اور "لہور لہور" کی رٹ لگاتے رہے۔"

لاہور کے ایک ایک ادیب ایک ایک شاعر کے بارے میں تفصیل سے پوچھا پھر لاہور کی سڑکوں کی جانب متوجہ ہوئے پوچھا "وہ روڈ کیسی ہے۔ وہ گلی کیسی ہے۔ کیا انار کلی پر اب بھی شام کو رونق لگتی ہے اور یار وہ ایک پنواڑی ہوا کرتا تھا کیا وہ اب بھی زندہ ہے۔ نہ جانے وہ کیا کیا پوچھتے رہے مگر جب انہوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ سوال پوچھا کہ "یار یہ بتا کہ انار کلی کے چوراہے پہ ایک بھوری گائے بیٹھا کرتی تھی۔ میں اسے روز روٹی کھلایا کرتا تھا کیا وہ اب بھی وہاں بیٹھتی ہے؟"

اس سوال کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب لاہور سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں نے حضرت کو ٹوکتے ہوئے کہا "قبلہ وہ گائے تو انار کلی کے چوراہے پر ضرور بیٹھتی ہوگی مگر اب کم از کم آپ تو یہاں سے اٹھیے دفتر کے لیے دیر ہو رہی ہے" بادل ناخواستہ اٹھے مگر لہور لہور کی گردان کرتے چلتے رہے۔

دوسرے دن میں نے ان کے بچپن کے دوست بلراج ورما سے کہا "ورما جی یہ فکر صاحب ہمیشہ لہور لہور کیا کہتے رہتے ہیں۔" یہ سنتے ہی ورما جی نے کہا۔ "کیا؟ لاہور؟" میں نے کہا "جی نہیں فکر تونسوی!" وہ بولے "ارے صاحب لاہور کی کیا بات ہے لاہور تو بس لاہور ہے وہاں کا سورج ہی اور ہے چاند ہی الگ ہے وہاں پانی ایسے نہیں بہتا جیسے یہاں بہتا ہے۔"

اس پر میں نے کہا "اب بس کیجیے میں جانتا ہوں کہ وہاں چڑیاں ایسی نہیں چہچہاتیں جس طرح یہاں چہچہاتی ہیں۔" مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لاہور شہر نہیں ایک مرض ہے اور وہ بھی متعدی جس کے سامنے ذکر کیجیے وہ ہذیان بکنے لگتا ہے۔

ہاں تو میں حضرت قبلہ کا ذکر کر رہا تھا۔ حضرت قبلہ نے اس دنیا میں آ کر کوئی کام کیا ہے تو بس یہی کہ بیٹھے فقرے ڈھالتے رہتے ہیں کسی نے انھیں کچھ کہہ دیا اور انہوں نے ایک فقرہ نکال کر اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سماج نے ان کے خلاف کوئی زیادتی کی اور انہوں نے سماج کے خلاف ایک زوردار پھڑکتا ہوا طنزیہ فقرہ نکال دیا اور مطمئن ہو گئے۔

انھیں جب بھی دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے گاؤں کا وہ مجذوب یاد آ جاتا ہے جو دن بھر پاگلوں کی طرح گھومتا رہتا تھا۔ ہم بچوں کی طبیعت موج میں ہوتی تو ہم میں سے کوئی جا کر اسے چھیڑ دیتا تھا۔ اس پر وہ ایک گندی گالی ہم لوگوں کی طرف پھینک دیتا تھا۔ ہم لوگ خوش

ہو کر تالیاں بجاتے اور وہ ایک اور زبردست گالی ہماری طرف اچھال دیتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ وہ ایک سے ایک اعلیٰ وارفع گالی ہمیں دیتا پھر ہم میں سے کوئی شریر بچہ اسے پتھر دے مارتا اس کے ساتھ ہی وہ مجذوب زور زور سے چیخنے لگتا اور رونے لگتا۔ اس کی چیخوں کو سنتے ہی ہمارے ہاتھوں سے پتھر خود بخود چھوٹ جاتے۔ ہم حیرت سے اسے دیکھتے رہتے پھر رفتہ رفتہ ہماری آنکھیں بھی بھیگ جاتیں پھر ہم میں سے کوئی اس کے لیے روٹی لاتا کوئی اس کے لیے پانی لاتا۔ کوئی اسے سگریٹ دیتا اور وہ پاگل پھر سے ہنسنے لگتا۔

نہ جانے کیوں میں اپنے ذہن میں فکر تونسوی کا تقابل اس مجذوب سے کرنے لگ جاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ فکر تونسوی کو جب بھی سماج چھیڑتا ہے تو وہ ایک طنزیہ فقرہ اس کی طرف اچھال دیتے ہیں فقرے نکالتے نکالتے اب ان کا طنز ایک چیخ بن گیا ہے۔ لیکن مجھے دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ جب گاؤں کے مجذوب کی گالی چیخ بن جاتی تھی تو ہمارے ہاتھوں سے پتھر خود بخود چھوٹ جاتے تھے اور ہم اس کے زخم کا مرہم بن کر اس کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔ فکر تونسوی کی بدقسمتی یہ ہے کہ سماج کے ہاتھوں میں پتھر جوں کے توں موجود ہیں۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب سماج ہاتھوں کے پتھر پھینک کر اور اپنی آنکھوں میں آنسو لاکر فکر تونسوی کی جانب بڑھے اور ان کے زخموں پر مرہم رکھ دے۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا۔ اس وقت کے آنے تک میں یہی سمجھوں گا کہ میرے گاؤں کا مجذوب اتنا بدنصیب نہیں تھا جتنا کہ فکر تونسوی ہیں۔

(یہ مضمون فکر تونسوی کی تازہ تصنیف "بدنام کتاب" کی رسم اجرا کے جلسے کے موقع پر پڑھا گیا۔)

ایک مصرع کا جشنِ اجرا

فکر تونسوی

اور پھر یُوں ہُوا کہ ایک دن جناب گوہرؔ مرادآبادی میرے پاس تشریف لائے اور بولے: ”فکر صاحب! کیا آپ میری خاطر ایک زحمت گوارا فرمائیں گے؟“

میں نے کہا: ”اس ناچیز نے زندگی میں گوارا کرنے کے علاوہ اور کیا بھی کیا ہے؟ فرمائیے۔“ ان کا لب ولہجہ بالکل گداگروں ایسا تھا، حالانکہ وہ امپورٹڈ کار پر سوار ہو کر آئے تھے۔ اگر گداگر حضرات کار پہ بھیک مانگنے نکلیں تو خیرات دینے والے کی پوزیشن کافی نازک ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ایک دعوتی کارڈ میری طرف اس عاجزی سے بڑھایا جیسے وہ دعوتی کارڈ نہ ہو، کشکول ہو حالانکہ اس کشکول پر سنہری حاشیہ لگا ہوا تھا۔ کہنے لگے: ”آپ جانتے ہیں کہ ناچیز شاعر ہے۔“

میں نے عرض کیا: ”جناب! یہ تو میں جانتا تھا کہ آپ شاعر ہیں لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ آپ شعر بھی لکھتے ہیں۔“

”ہی ہی ہی“۔ انھوں نے ”ہی ہی ہی“ یُوں کہا جیسے میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہوں۔ مزاح نگار کی ٹریجڈی یہ ہے کہ لوگ اس کی ہر بات کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی بیوی سے کہا تھا ”تم بہت ذہین ہو“ تو اس نے کہا تھا آپ کو تو ہر وقت مذاق سُوجھتا ہے۔ بچے سن لیں گے تو کیا کہیں گے؟“

میں نے کہا: ”گوہرؔ صاحب!“ جواباً ”ہی ہی ہی۔ اب آگے فرمائیے۔“

انھیں میرے جواب پر شرمندہ ہونا چاہیے تھا لیکن شرمندہ ہونے کا نادر موقع انہوں نے کھو دیا اور بولے: ”میں اپنے مصرع کا جشنِ اجرا کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے پُوچھا: ”مصرع طرح کا؟“

وہ بولے: ”جی نہیں یہ مصرع خالص میری تخلیق ہے مصرعِ طرح نہیں ہے۔“

”اوہ، میں سمجھا شاید آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں مصرع طرح پر غزل لکھنا چاہتا ہُوں اور آپ غلطی سے غزل کو جشنِ اجراء کیے جا رہے ہیں۔ چلو خیر، مصرع ہی سہی، مگر آپ نے مصرعِ ثانی کیوں نہیں لکھا کم از کم پُورا شعر تو بن جاتا۔ میرے خیال میں آپ اس پہ گرہ لگا ہی دیجیے۔ یعنی کم از کم ایک شعر کا تو جشن اجرا منائیے۔“

وہ آہ بھر کر (یہ آہ سرد تھی) بولے: ”فکر صاحب! آپ تو جانتے ہیں شاعری ایک ریاضت ہے میں نے بھی بہت ریاضت کی مگر ایک مصرع سے آگے بات بڑھی ہی نہیں۔ گرہ لگ ہی نہیں سکی۔ اس لیے میں نے سوچا فی الحال ایک مصرع کا ہی جشنِ اجراء منا لیا جائے۔“

میں ان کی مجبوری سمجھ گیا اس لیے کہا "کوئی حرج نہیں دو چار سال بعد جب گرہ لگ جائے تو گرہ کا جشن اجرا منا ڈالیے گا۔ ویسے گوہر صاحب! آپ کی حالت بھی میر تقی میر سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔"

بولے: "وہ کیسے؟"

میں نے کہا: "کیونکہ شعر لکھنا آسان کام نہیں۔ میر نے بھی بالکل آپ ہی کی طرح اعتراف کیا تھا کہ: ؎

خشک سیروں تن شاعر سے لہو ہوتا ہے
جب نظر آتی ہے ایک مصرع تر کی صورت

میں نے دیکھا کہ وہ میر کی اس تصدیق پر کافی مطمئن ہو گئے بولے: "تو پھر کیا ارشاد ہے میرے بارے میں؟"

میں نے کہا: "آپ بالکل میر تقی میر لگتے ہیں۔"

وہ بولے: "آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "شرمندگی آپ سامعین پر چھوڑ دیجیے یہ فرمائیے مجھے کیا کرنا ہے؟"

کہنے لگے: "آپ میرے اس مصرع کے جشن اجرا کی صدارت قبول فرمائیے۔ اس مرتبہ شرمندہ ہونے کی باری میری تھی لیکن میں نے بھی یہ نادر موقع کھو دیا۔ مصرع کا جشن اجرا میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ معلوم ہوتا تھا یا میری معلومات ناقص تھیں اور یا . . . . . یا پھر میری ہی معلومات ناقص تھیں امیورنڈ کار کے خوف سے میں انھیں شاعر تو کہہ سکتا تھا لیکن وہ مجھ سے مصرع کے جشن اجرا کی صدارت بھی کروانا چاہتے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی کہہ رہا ہو: فکر صاحب! میں نے لکڑیوں کا ایک ٹال عرض کیا ہے، آپ اس پر داد دیں گے۔"

میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا: "میں حاضر ہو جاؤں گا لیکن بہتر یہ تھا کہ آپ حضرت مہجور دہلوی کو صدارت کے لیے بلاتے۔"

وہ بولے: "انھیں فالج ہو گیا ہے۔"

"اور مجھے اس صدارت کے بعد ہو جائے گا" میں نے دل میں کہا۔ زبان پر یہ فقرہ اس لیے نہیں لایا کیونکہ جب سے گُڑ کے بیوپاری اپنے آپ کو شاعر کہنے لگے تھے میں نے سچی باتیں کہنا آئندہ جنم پر ملتوی کر دی تھیں اور ویسے بھی گوہر صاحب نے ایک مرتبہ مجھے ایک بلیک مارکیٹیے سے سیمنٹ کی بوری کنٹرول پر لے کر دی تھی اور یہ بوری ادب عالیہ پر بھاری تھی۔ لہٰذا میں نے صدارت کے لیے ہامی بھر لی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب شعر و ادب پر کرائسیس آ رہا تھا لوگوں نے کتابیں خریدنے کی بجائے نکٹائیاں اور جرابیں خریدنا شروع کر دی تھیں اور یوں بھی اگر نکٹائیاں اور جرابیں شوکیس میں رکھی ہوتیں تو دُور سے کتابوں کے ٹائٹل پیج معلوم ہوتی تھیں۔

دراصل یہ شو کا زمانہ تھا جو چیز دنیا میں پیدا ہو جاتی اسے مصدقہ کرنے کے لیے شو کیے جاتے تھے فلم شو، بیوٹی شو، فیشن شو، ڈاگ شو ——— حتیٰ کہ کسی کے گھر سوء اتفاق سے ایک بے بی پیدا ہو جاتی تو بے بی شو کیے جاتے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے بے بی ہی سمجھا جائے کتاب نہ سمجھا جائے۔ ان کی دیکھا دیکھی شاعروں اور ادیبوں نے بھی بک شو کرنا شروع کر دیے تھے کیونکہ وہ سوسائٹی کے رہنما سمجھے جاتے تھے۔ سوسائٹی سے پیچھے کیوں رہتے اور بک شو کو جشن اجرا کا نام دے دیتے۔ جوں ہی

کسی ادیب کے بطن سے کوئی کتاب پیدا ہوتی اس کا جشنِ اجرا کر ڈالتے بلکہ کئی ادیب تو کتاب پیدا بھی نہیں کرتے تھے صرف چھپوا دیتے اور جشنِ اجرا منا ڈالتے۔

چنانچہ جناب گوہر نامراد آبادی نے دیکھا کہ ادب کی امت پر عجب وقت آن پڑا ہے۔ تو انہوں نے اس صورت حال کو غنیمت سمجھا۔ انھیں ذرا جلدی تھی۔ ریاضتِ شاقہ سے وہ ایک مصرع ہی لکھ سکے تھے جب وہ ایک مصرع پر گرہ لگا کر شعر تک پورا نہیں کر سکتے تھے تو دیوان کے مکمل ہونے کا انتظار کہاں تک کرتے انھیں تو اس کے لیے صدیاں چاہییں تھیں اور پھر انھیں یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر جشنِ اجرا کا یہ نیا نظام کہیں جلدی زوال کی منزل پر پہنچ گیا تو انھیں تاریخ ادب میں کوئی شاعر ہی تسلیم نہیں کرے گا۔ لہٰذا اسی ایک مصرع کا جشنِ اجرا کیوں نہ منا لیا جائے۔ اور ویسے بھی اہلِ کتاب اور اہلِ مصرع میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے جو روپے اور ریزگاری میں ہوتا ہے۔

وعدہ صدارت کے بعد دو چار دن گزر گئے تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے صدارت کرنی ہے تو مصرع کے مصنف کے متعلق کچھ معلومات بھی حاصل کرنی چاہییں تاکہ صدارتی تقریر کے کام آ سکیں۔ صدارتی تقریر میں جھوٹ بولنے کی گنجایش تو کافی ہوتی ہے لیکن اس میں اگر تھوڑے بہت سچ کی ملاوٹ بھی کر دی جائے تو کیا حرج ہے؟

صاحبِ مصرع کے متعلق میری معلومات صرف ان کے تخلص تک محدود تھیں اور یہ معلومات ناقص تھیں بلکہ سرے سے تخلص ہی ناقص تھا۔ گوہر نامراد آبادی! ہُنھ! جگر مراد آبادی کا ناقص ترجمہ۔ چنانچہ میں نے ان کے ایک قریبی دوست سے رابطہ قایم کیا اور پوچھا: ”گوہر صاحب کی کوالیفکیشن کیا ہے؟“

وہ بولے: ”تین کوٹھیاں، چار فیکٹریاں اور پانچ بل ڈاگ۔“

میں نے پوچھا: ”کوئی معقول کوالی فکیشن بتائیے۔“

وہ بولے: ”ان کی نیم ولایتی بیوی پورا راک اینڈ رال ڈانس کر سکتی ہے۔“

”ایک آدھ معقولیت اور؟“

”ایک طوطا فرانس سے منگوایا ہے جو ان کے مصرع کو فرنچ میں گا کر سناتا ہے۔“

صدارتی تقریر کے لیے یہ معلومات کافی تھیں مزید معلومات گوہر صاحب نے ٹیلی فون پر بتا دیں کہ،

۱۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری سامنے رکھ کر ہر تیسرے آدمی کو دعوت نامہ بھیج دیا گیا ہے۔

۲۔ میرا مصرع فلاں لیڈر صاحب ریلیز کریں گے۔

۳۔ لیڈر صاحب وعدہ ایفا نہ کر سکے تو ایک سیکنڈ ہینڈ لیڈر نے بھی وعدہ کر لیا ہے۔

میں نے انھیں بتایا کہ لیڈر اور سیکنڈ ہینڈ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا کیونکہ لیڈر کوئی بھی ہو ایک ہی قسم کی تقریر کرتا ہے۔ چاہے ڈبل روٹی کا ادگھاٹن کرے یا کتاب کا۔ یہ لیڈر لوگ بڑے دور اندیش ہوتے ہیں حاضرین کو احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ کون سی چیز ریلیز کر رہے ہیں، ڈبل روٹی یا مصرع۔

اور اس کے بعد گوہر صاحب نے مجھے اس مصرع کی ایک نقل عنایت کر دی جو فل اسکیپ سائز کے آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی تھی۔ آرٹ پیپر کے چاروں طرف ایک پنج رنگا حاشیہ لگایا گیا تھا جیسے لال قلعے کی دیواروں پر ہوتا ہے۔

"یہ مصرع تو بالکل لال قلعہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے تعریف کی

وہ چپ رہے۔

"آپ شاعری کے شاہجہان بادشاہ ہیں۔"

وہ چپ رہے۔

"میں اس لال قلعے کے اجرا کے لیے ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔"

جشنِ اجرا ان کی قرمزی کوٹھی پر تھا جس کے مین گیٹ پر ایک شیر ببر کا مجسمہ مُنہ میں بانسری بجا رہا تھا۔ کوٹھی کو طرح طرح کے ماٹوز، جھنڈیوں اور پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا جیسے وہ جشنِ اجرا نہ کر رہے ہوں بلکہ جھگوتی جاگرن کروا رہے ہوں۔ میں بطور کمیٹنگ پندرہ منٹ دیر سے پہنچا کیونکہ صدر اگر وقت پر پہنچ جائے تو اسے صدر ہی نہیں مانا جاتا لیکن، یہاں جا کر معلوم ہوا کہ مدعوین بھی ابھی نہیں پہنچے۔ مدعوین صدر سے بھی کمینے نکلے۔

چند بیرے مغل لباس زیب تن کیے اٹن شن کھڑے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں صاحب مصرع سو فی صدی استادانہ اچکن لٹکاتے ہوئے تین چار قاتل کٹار قسم کی حسین خواتین کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے اور یوں ہنس رہے تھے جیسے استقبالیہ مسکراہٹ کی ریہرسل کر رہے ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے گوہر صاحب کی بیگم کون سی تھیں بظاہر تو مجھے سبھی ان کی بیویاں معلوم ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ہر حسینہ مصرع تر معلوم دے رہی تھی۔ اُن سے تو گوہر صاحب کی پوری غزل تیار ہو سکتی تھی۔

"سامعین کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا

"انھیں لانے کے لیے چاروں طرف گھوڑے دوڑا دیے گئے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا تاکہ اطمینان سے ٹھنڈی آہیں بھر سکوں۔ کبھی کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتے بھرتے اکتا جاتا تو کنکھیوں سے ان تر مصرعوں کی طرف دیکھ لیتا۔ بیرے شاید میرا دم غنیمت سمجھ کر باری باری میرے پاس آ جاتے ایک جام پیش کرتے اور میں باری باری سرِ انکار ہلا دیتا حتیٰ کہ ایک بار ایک کافرادا حسینہ میرے پاس سرِ تسلیم خم کرنے آئی میں نے سرِ انکار ہلا دیا۔ غرض وقت گُشی کے لیے میرے پاس کافی سامان تھا۔ ٹھنڈی آہیں، تر مصرعے، سرِ انکار، شیر کی بانسری۔

اچانک گوہر صاحب نے آ کر بتایا کہ لیڈر صاحب تشریف نہیں لا رہے ہیں۔ مفادِ عامہ کے تحت جناب نے وجہ نہیں بتائی البتہ وہ اپنی بیگم کو بھیج دیں گے کیونکہ مستقبل قریب میں ان کے بھی لیڈر بننے کا امکان ہے۔

آہستہ آہستہ سامعین کاروں پر نمودار ہونا شروع ہو گئے جو ادیب کم اور معززین زیادہ معلوم ہوتے تھے وہ اپنی کاروں سے یوں اُترتے جیسے سبھی لیڈر ہوں۔ یوں لگتا تھا مصرع کا نہیں لیڈروں کا جشنِ اجرا ہونے والا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پھولوں کے بڑے بڑے ہار بھی لائے تھے۔ لیکن جب بالآخر یہ اعلان بھی کیا گیا کہ لیڈر کی بیگم صاحبہ اپنی کُتیا کے اچانک زکام کے باعث تشریف نہیں لا سکیں گی۔

تو وہ کسی نہ کسی بہانے کاروں سمیت کھسک گئے البتہ دوچار حضرات اہلِ ذوق ثابت ہوئے اور انھوں نے بیگم گوہر کی صراحی دار گردن میں ہار ڈال دیے اور لوٹ گئے۔

چند حضرات کاروں کی بجائے سکوٹروں اور بائیسکلوں پر تشریف لائے تھے وہ چیلنچر ہونے کے باوجود ادیب معلوم ہوتے تھے انھوں نے صوفوں پر بیٹھتے ہی بیروں کو اشارے سے بلایا کہ وھسکی کا جشنِ اجراء شروع کر دیا جائے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک واقعی ادیب سے پوچھا: "کیوں جناب! یہ حضرات کاروں کی بجائے بائیسکلوں پر کیوں تشریف لائے ہ؟"

وہ بولے: "جیسے کئی مصرعے وزن سے خارج ہوتے ہیں اسی طرح انھیں بھی آپ وزن سے خارج ہی سمجھیے۔"

بہر کیف ہائی کمانڈ کی ایک سرگوشیانہ میٹنگ کے بعد اعلان کیا گیا کہ لیڈر کی بجائے محفل کا چیف گیسٹ سردار دربھاگیہ سنگھ چیئرمین دربھاگیہ ٹرانسپورٹ کمپنی کو نامزد کیا جاتا ہے۔ اور جشنِ اجراء کی کارروائی شروع کی جا رہی ہے۔

چنانچہ کارروائی شروع کر دی گئی۔ ایجنڈا کی ترتیب یوں رکھی گئی:

۱۔ سردار دربھاگیہ سنگھ کا تعارف، کہ یہ بڑے سخن فہم ہیں انھوں نے ڈائری میں بائیس اشعار قلم بند کر رکھے ہیں۔ (لہذا پھولوں کا ہار اور تالیاں)

۲۔ حاضرین میں سے ہر ایک کو آرٹ پیپر کا مصرع پیش کیا جائے۔ (مسلسل تالیاں)

۳۔ مقررین حضرات باری باری وہ اسٹیج پر آئیں وھسکی کا پیگ ہمراہ لائیں اور اپنے اپنے حق میں تالیاں سنتے جائیں۔

۴۔ ان حضرات کے پیغام پڑھ کر سنائے جائیں جو زکام یا پیچش کے باعث تشریف نہیں لا سکے۔ اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب جناب رونق علی رونق، جناب گوہر کے مصرع کے متعلق اپنے خیالات کا جامع اظہار فرمائیں گے۔

جناب رونق نے مائکروفون پر آ کر فرمایا: "حضرات! المختصر یہ کہ ایسا مصرع ادب عالیہ میں کہیں نہیں دکھائی دیا۔ لہذا آداب عرض۔"

وہ جانے لگے تو سامعین میں سے ایک آواز آئی: "کل تو آپ کہہ رہے تھے یہ مصرع ادب کے ساتھ بھونڈا مذاق ہے۔"

"آپ میری تقریر کا بھونڈا ترجمہ کر رہے ہیں۔"

اس پر زوردار تالیاں بجائی گئیں۔ کچھ حضرات نے رونق صاحب کے حق میں اور کچھ نے ان کے خلاف بجائیں۔ صاحب صدر یعنی میں نے بھی تالی بجائی اور کافی دیر تک نہیں سمجھ سکا کہ حق میں بجائی یا خلاف۔ اس وقت تک تمام دانشوروں کے معدے میں چار چار پیگ جا چکے تھے اور ہلکی ہلکی رنگ کو منتری حرکت، حرارت اور اسی عالم میں ایک ادھیڑ عمر مقرر جناب رنگین بدنام پوری نے تقریر شروع کی جس میں تقریر کم اور لڑکھڑاہٹ زیادہ تھی وہ کہنے لگے: "یہ مصرع؟ میں کہتا ہوں، یہ مصرع ہے بھی اور نہیں بھی وجود لاوجود اور ہمہ وجود کا تضاد ان ستاروں کی پیچیدہ گہرائیوں میں سے نکلا ہے۔ جن میں بنی نوع انسان کی خاردار لطافتیں اور کثافتیں۔ کثافتیں جو کائنات کے نصیب ہیں۔ صاحبِ صدر! نقیبِ گوہر، نقیبِ مصرع یا اس ازلی نغمے کا ——— ذرا داد دینا حضرات اس تصور بے پایاں کی جو مصرع کا اور عالم وجود کے مظہر ہیں....؟

ایک دانشور نے دوسرے دانش ور سے کانا پھوسی کی۔ "زوردار تقریر معلوم ہوتی ہے۔"

دوسرے دانشور نے مائکروفون پر آکر کہا "جب تک تقریر سمجھ میں نہ آئے یہ فیصلہ مت کیا جائے کہ زوردار ہے کہ نہیں۔"

اسٹیج سکریٹری نے مائیک چھین لیا "سوری! تقریر کی باری جناب رنگین کی نہیں تھی جناب راتب کی تھی۔"

رنگین نے کہا "یہ میری توہین ہے۔"

ایک سامع نے کہا "توہینِ شایانِ شان معلوم ہوتی ہے۔"

اس پر قہقہہ پڑا اور جناب رنگین جام سمیت واک آؤٹ کر گئے۔

ان کے واک آؤٹ کرنے پر مزید تالیاں بجائی گئیں۔ اسٹیج سکریٹری صاحب ان کے تعاقب میں گئے مگر وہ ہاتھ نہ آسکے سکریٹری کے لوٹ آنے پر مزید تالیاں بجائی گئیں اور اعلان کیا گیا کہ اب جناب راتب تشریف لائیں۔

ایک بیرے نے اسٹیج سیکریٹری کے کان میں آکر کہا کہ جناب راتب برآمدے میں قے فرما رہے ہیں یعنی مسلسل مصرع پر مصرع باہر نکال رہے ہیں۔ چنانچہ اسٹیج سکریٹری نے جناب ریاض ثانی کو تقریر کے لیے بلایا مگر اس سے پہلے ایک جناب اضطراب صاحب اسٹیج پر چڑھ آئے اور کہنے لگے: "یہ مصرع وہ ہے جسے پڑھ کر مجھے متلی آنے لگی ہے۔"

"آرڈر! آرڈر!" صاحبِ صدر نے مجبوراً فرمایا

"مگر میں پہلے بولوں گا" ایک اور صاحب دانش شہسواری نے مائک چھین کر کہا "کیونکہ مجھے ان سے پہلے متلی آرہی ہے۔"

دانش صاحب کی مجاہدانہ پیش قدمی پر تین چار اور دانشور اسٹیج پر آگئے اور ایک دوسرے سے مائکروفون چھیننے لگے جیسے وہ مائکروفون نہ ہو، وھسکی کا پیگ ہو اب محفل مصرع کی حدود سے نکل کر مائکروفون کی حدود میں داخل ہوگئی تھی اسٹیج سکریٹری نے اپنی خودی اُس حد تک بلند کی جس حد تک کر سکتے تھے اور اعلان کیا:

"جشن اجرا کی محفل برخاست کی جاتی ہے۔"

سامعین شکر بجا لائے اور میز پر دھری ہوئی مرغیوں کی ٹانگوں پر ٹوٹ پڑے۔ اچانک صاحبِ صدر کو خیال آیا کہ مصرع ریلیز کرنے کی رسم تو ادا نہیں کی گئی چنانچہ انھوں نے ایک ہاتھ میں مرغے کی ٹانگ لے کر دوسرے ہاتھ سے مصرع کا کاغذ ریلیز کر کے گوہر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ گوہر صاحب اتنے سرمست ہو رہے تھے کہ انھوں نے صاحبِ صدر کے ہاتھ سے مُرغے کی ٹانگ لے لی۔ اور یوں مصرع کی بجائے مُرغے کی ٹانگ ریلیز ہوگئی۔

آخری اطلاع ———

صُبح جب گوہر صاحب نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ مصرعے کے آرٹ پیپر والے کاغذ جو دانشوروں کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے سبھی فرش پر یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے سوڈا اور وھسکی کی بوتلوں کے ٹکڑے۔ آرٹ پیپر کا مصرع کوئی بھی اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا انُسے سوڈا واٹر کی خالی بوتل سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔

میرزا ادیب

محمد طفیل

یہ تقریب میرزا ادیب کے ڈراموں کے مجموعۂ خاک نشین" کے سلسلے میں منعقد ہوئی ہے۔ خاک نشین اِس کتاب کا ایک ڈراما ہے۔ جو کہ ایک مدرس کے گرد گھومتا ہے۔ جو قُربانیوں کا مجسمہ ہے۔ جو ایثار کا پیکر ہے۔ جو انسانیت کی معراج ہے۔

جب میں نیاز علی کے کردار کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے وہ نیاز علی کے روپ میں دلاور علی ہو۔ جسے زیادہ تر لوگ میرزا ادیب کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ ڈراما نگار جس کی اپنی زندگی میں کوئی ڈراما نہیں۔ جو دھیرے دھیرے زندگی گزارنے کا چلن جانتا ہے۔ جو خاموش رہو اور کچھ نہ کہو کی عبادت میں مصروف نظر آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کے دیکھیں۔ مگر اس سے پہلے کچھ باتیں میری بھی سن لیں۔

رسالے کے مدیر کا کام دوسروں سے مضامین حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جب کوئی مجھ سے مضمون مانگتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اب امام مسجد کے اپنے گھر میں مولود شریف ہوگا۔ کیونکہ مولوی حضرات دوسروں کے گھروں ہی میں، مولود شریف پڑھنے کو ثواب کا کام جانتے ہیں۔

ادارت کے ساتھ ساتھ میں ایک اوٹ پٹانگ سی حرکت یہ کرتا ہوں کہ خاکے لکھتا ہوں۔ جس کسی کا بھی خاکہ لکھا۔ یہ جان کر لکھا کہ دوست ہے مگر ہوتا عموماً یہ ہے کہ جب خاکہ حاضر کرتا ہوں تو تعلقات غائب ہو جاتے ہیں۔

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ دوست اصرار کر کے مضمون لکھواتے ہیں۔ میں اُن سے کہتا ہوں "بھئی نہ لکھواؤ، دوستی کو کمیاب چیز جانو" مگر کوئی مانتا ہی نہیں۔ کہتے ہیں۔ جو چاہو لکھو۔ مگر میں جو چاہتا ہوں۔ وہ نہیں لکھتا تو بھی دوست ناراض ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک مجھ سمیت ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا۔ جسے آئینہ دیکھنے کا سلیقہ ہو۔

میں نے آج تک جتنے بھی دوستوں کے خاکے لکھے۔ اُن کے ساتھ خاصی رعایت برتی۔ مثلاً دوستی کے صدقے میں، جو لیکچرر ہوتے ہیں۔ انھیں پروفیسر بنا دیتا ہوں۔ جو پروفیسر ہوتے ہیں۔ انھیں پرنسپل بنا دیتا ہوں۔ خود ہی بتائیں۔ اس سے بھی زیادہ لفظی ترقیاں کیسے دوں؟

لگے ہاتھوں طریقۂ واردات بھی عرض کر دوں؟ جب مجھے کسی شخصیت پر مضمون لکھنا ہوتا ہے تو مجھے ہینری کسنجر قسم کا آدمی بننا پڑتا ہے۔ کبھی دل کو سمجھاتا ہوں کبھی دماغ کو، جب دیکھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بات سننے کے لئے آمادہ نہیں تو وہ وقت، میں کسی شخصیت پر لکھنے کے لئے موزوں سمجھتا ہوں۔ امریکہ اور روس کی بھی یہی پالیسی ہے۔ ایک دوسرے

کی نہیں سنتے۔ مگر جب چاہتے ہیں، کسی نہ کسی ملک کا خاکہ لکھ ڈالتے ہیں۔

ان حالات میں، اگر میں میرزا صاحب کی شخصیت پر مضمون لکھوں گا تو بلاشک میرزا صاحب مجھ سے قطع تعلق نہ کریں گے مگر ان کی خاموش گفتگو، پسے پردے رہنے والی قربت، میری زندگی کو اجیرن بنا سکتی ہے۔

میں نے ایک مضمون منٹو پر لکھا تھا۔ وہ مجھے اچھا لگا۔ کیونکہ منٹو کی زندگی دھوپ چھاؤں قسم کی تھی۔ دھوپ ہی دھوپ اور چھاؤں ہی چھاؤں، اس کا دل مسلمان تھا۔ اس کا دماغ کافر، وہ وضو کا اخلاقاً قائل تھا اور اشنان کا عادتاً، وہ شریف آدمی بھی تھا۔ وہ ممد بھائی بھی تھا۔ وہ بڑا لکھنے والا بھی تھا۔ وہ معمولی چیزیں لکھ کر بھی دل خوش کر دیا کرتا تھا۔

اب اپنے میرزا صاحب کی سنیئے۔ یہ اوّل تا آخر شریف آدمی ہیں۔ شرافت کی بھی آخری حد پر، جہاں آدمی شریف کم، نیک زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اللہ میاں نے انھیں آدمی خواہ مخواہ کو بنایا۔ سیدھا ولی اللہ بنا دینا چاہئے تھا۔

میرا خیال ہے کہ میرا مضمون پھر غلط رُخ پہ تیرنے لگا ہے۔ لہٰذا اپنے اُوپر جبر کر کے عین منجدھار میں میرزا صاحب کی شخصیت کو چھوڑنے کا عزم کرتا ہوں اور ان کی زندگی کے ایک دوسرے رُخ کی بات شروع کرتا ہوں۔ وہ رُخ جو کہ میری بھی چنیدہ کمزوری ہے۔ جناب میرزا ادیب کبھی ایک عدد مشہور رسالے کے ایڈیٹر بھی ہوتے تھے۔

میرا اور ان کا ایک لطیفہ مشہور ہے یعنی اس کا تو ٹائیٹل بھی اچھا نہیں۔ اگر وہ لطیفہ آپ تک نہیں پہنچا تو وہ مجھ سے ایک بار پھر سُن لیں۔

میں نے نقوش کا کوئی خاص نمبر چھاپا۔ بڑے فخر سے میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ رسالے کی ورق گردانی کرتے رہے۔ جب میں نے محسوس کر لیا کہ اب انھیں مندرجات وغیرہ سے، رسالے کے معیار کا اندازہ ہو گیا ہو گا تو میں نے دریافت کیا۔ کیسا رہا پرچہ؟ ان کا جواب یہ تھا "ٹائیٹل اچھا ہے"۔

میں اس تبصرے پر تلملا کے رہ گیا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ جونیئر اور سینئر کا معاملہ تھا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد، یہ ادب لطیف کا سالنامہ لے کے آ گئے۔ معاً میرے ذہن میں ان کا وہ فقرہ آن دھمکا، دل نے کہا۔ کاش میرزا صاحب بھی مجھ سے پوچھ لیں کہ پرچہ کیسا ہے؟ چنانچہ انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ "پرچہ کیسا ہے؟"

میں نے جھٹ اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کر ڈالا "اس کا تو ٹائیٹل بھی اچھا نہیں"۔

ایسی چہلیں اپنی جگہ، مگر جب میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ اُن دنوں دو رسالوں کی دھوم تھی۔ ایک رسالہ تھا "نیرنگ خیال" دوسرا "ادب لطیف"۔ یوں تو رسائل اور بھی بہت سے تھے۔ ہمایوں، شاہکار، ادبی دنیا، عالمگیر یہ رسائل بے شک اپنی جگہ قدر و قیمت رکھتے تھے۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں کہ مجھے ان سب رسائل میں نیرنگِ خیال اور ادب لطیف سے دلچسپی تھی۔ یا اُدھر نیاز فتحپوری کے "نگار" سے!

"نگار" کیوں پسند تھا؟ وہ اس لئے کہ نیاز تنہا ایسا شخص تھا جو چومکھی لڑ سکتا تھا۔ پھر اس کے قلم میں جادو تھا۔ نیرنگِ خیال مجھے اس لئے پسند تھا کہ اس کی پالیسی میں وہ اعتدال تھا جو سب کے لئے قابلِ قبول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندستان

کیسے بڑے بڑے اہلِ قلم کی شاہکار تحریریں اس میں چھپیں۔

'ادبِ لطیف' کا گرویدہ اس لیے تھا کہ وہ نقیب تھا مستقبل کا، جنم داتا تھا ایک تحریک کا، ادبِ لطیف نے ذہنوں کو شعور بخشا تھا۔ 'ادبِ لطیف' نے حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ ادبِ لطیف نے ادب کو گل و بلبل کے چکر سے نکال کر دار و رسن تک کی ضرورت کا احساس دلا دیا تھا۔

پہلے پہل وہ راستہ میرزا ادیب ہی نے دکھایا تھا۔ خود راہیں کاٹی تھیں۔ خود لہولہان ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں آنے والے اس راستے پر دندناتے چلے گئے مگر ابتدا میں ادب کی یہ کھیتی میرزا ادیب ہی نے اپنے خون سے سینچی تھی۔

یہ ضروری نہیں کہ جو پودا لگائے۔ وہ اس کا پھل بھی کھائے۔ بے شک کچھ کاریگر لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پودا ہی اس نیت سے لگاتے ہیں کہ پھل بھی خود کھائیں گے۔ ان میں ایسی ہوش مندی ہے ہی نہیں۔ یہ تو دوسروں کی ہوش مندیوں کا نشانہ بنتے آئے ہیں۔ یہ شخص مات اس لئے کھاتا ہے کہ دوسرے اپنی فتح مندیوں کے جھنڈے گاڑ سکیں۔ یہ شخص پیچھے اس لئے ہٹتا ہے تاکہ دوسرے آگے بڑھ سکیں۔ یہ مرنجاں مرنج قسم کا شخص جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ اردو ادب کا دیوتا ہے اور مجھ ایسے کئی اس کے پجاری!

میرزا ادیب صحیح معنوں میں ادیب ہیں۔ اس ملک میں کوئی شاعر ہے اور کوئی افسانہ نویس اور کوئی مضمون نگار، مگر ادیب برائے نام ہیں۔ میں ادیب اُسے سمجھتا ہوں جو نگارش کی جملہ اصناف پر حاوی ہو۔ جیسے اس ملک میں مولانا غلام رسول مہر تھے اور نیاز فتحپوری۔ میں یہاں مرتبوں کی بات نہیں کر رہا جہتوں کی بات کر رہا ہوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرزا ادیب مکمل ادیب نہیں ہیں۔ اس لئے کہ شاعر نہیں ہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ میرزا صاحب شعر کہہ سکتے ہیں مگر نہیں کہتے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح بعض شعر نہیں کہہ سکتے مگر کہتے ہیں۔

میرزا ادیب کیا ہیں اور ان کا ادبی مقام کیا ہے؟ اس کا اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا۔ ابھی تو اندازہ انہی لوگوں کا لگایا جا سکا ہے جو سرکار دربار میں رسائی رکھتے ہیں۔ یہ دور اُن کا ہے۔ یہ دور میرزا ادیب کا نہیں۔ کیونکہ سچے ادیب کا المیہ یہ ہے کہ اُن کی زندگی، اُن کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔

میرزا صاحب کو زمانے بھر سے شکایتیں ہیں۔ شکایتوں کا پشتارہ ہلکا نہیں ہو رہا بلکہ بھاری ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کچھ کہے میں تو ان کو شکایتوں میں بھی حق بجانب ہی پاتا ہوں اس لئے کہ زمانے نے ان کو دیا کیا ہے؟ یہ اس دور میں فٹ نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ زمانہ کسی کو بھی اس کا حق نہیں دیتا۔ یہ دور تو اپنا حق بزور منوانے کا ہے۔ یہ دور مانگنے کا نہیں، زبردستی چھین لینے کا ہے۔ یہ دور انکساری کا نہیں، طنطنے کا ہے۔ جو یہ کچھ نہیں کر سکتا وہ میرزا ادیب بن جاتا ہے۔

میں نے ایک دن سنا کہ میرزا ادیب کو ریڈیو والوں نے سبکدوش کر دیا ہے۔ اگر میرزا ادیب کو ایک فالتو آدمی سمجھا جا سکتا ہے تو یہ اربابِ حکومت کی اپنی بے تدبیری ہے کیا حکومت یا اس کے ماتحت چلنے والے نیم سرکاری ادارے یہ چاہتے ہیں کہ ان

کے قلم کو زنگ لگ جائے ؟ کیا حکومت یہ چاہتی ہے کہ ان کا قلم سو جائے ؟

وہ شخص جس کے قلم کی دھوم پاک و ہند کی سرحدیں عبور کر کے بیرونی دنیا تک پہنچ چکی ہو وہ شخص اگر اس ملک میں اکھڑا اکھڑا سا ہو تو وہ صرف حیران ہو سکتا ہے اور حیران ہونا، اس دور میں ہر قابلِ ذکر شخصیت کا مقدر بنا دیا گیا ہے۔

مرزا صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ انھیں اکثر عجائب گھر میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ یاروں نے ٹوہ لگائی آخر یہ عجائب گھر میں جا کر کرتے کیا ہیں ؟ معلوم ہوا یہ اُس ہال میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں مہاتما بدھ کے مجسمے پڑے ہیں۔ سماں یہ ہوتا ہے کہ بُت کے سامنے بُت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔

جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آخر آپ یہاں آنا زیادہ کیوں آتے ہیں ؟ تو ان کا جواب یہ تھا — "مجھے یہاں سکون ملتا ہے۔"

آخر ایک دن مہاتما بدھ کا مجسمہ بول ہی پڑا — "ہو سکے تو میرے بُت کو اُٹھاؤ اور کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں مجھے بھی سکون مل سکے۔"

پروفیسر سیّد وقار عظیم — فن اور زندگی

مُرتبہ: ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن

پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب (وصال، لاہور ۱۷۔ نومبر ۱۹۷۶ء) سے دو گھنٹے کی یہ بات چیت ۲۰۔ جنوری ۱۹۷۵ء کی دوپہر ایک بجے سے تین بجے تک ہُوئی۔ اِس گفتگو کا ٹیپ ریکارڈ راقم الحروف کے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہے۔

(سیّد مُعین الرحمٰن)

ناصر قریشی[1] : ہماری خوش قسمتی ہے کہ سنٹرل پروڈکشن یونٹ (لاہور) کے اسٹوڈیوز میں آج اُردو ادب کے ممتاز نقّاد سیّد وقار عظیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ اُن کے فن اور اُن کی زندگی کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے موجود ہیں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی[2] اور ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب[3]۔ مَیں سیّد مُعین الرحمٰن صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ سیّد صاحب سے گفتگو کا آغاز کریں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن : وقار عظیم صاحب! مجھے دس بارہ برس سے آپ کے قُرب اور ہم نشینی کی عزّت حاصل ہے۔ شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں آپ کی رفاقتِ کار کی سعادت بھی میرے حصّے میں آئی۔ مَیں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے، اور یہ صرف میرے احساس کی بات نہیں، میری ذات پر آپ کے اثرات بہت ہی نمایاں ہیں جنھیں محسوس کرنے کیلئے کسی خاص بصیرت کی ضرورت نہیں۔ اُس تعلقِ زمانی کی بنا پر جو بہت طویل نہیں لیکن اُس تعلقِ خاطر کے باعث جو بہت گہرا ہے، آپ کی ذات، آپ کی سوانحِ حیات، میرا محبوب موضوع رہی ہے۔ — میرا پہلا سوال آپ کی تاریخِ ولادت سے متعلق ہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی اقبال عظیم صاحب[4] نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ آپ کا نام "وقار عظیم" تاریخی ہے جس سے ۱۳۲۷ کا عدد نکلتا ہے جو آپ کا ہجری سالِ ولادت ہے۔ ۱۳۲۷ ہجری مطابق ہوتا ہے ۱۹۰۹ء عیسوی کے لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ اور پاسپورٹ پر تاریخ پیدائش ۱۵۔ اگست ۱۹۱۰ء درج ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تاریخ غلط ہے یا دونوں؟ اِس صورت میں صحیح تاریخ کیا ہے؟

---

[1] ناصر قریشی، سینئیر پروگرام پروڈیوسر، پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن، لاہور

[2] ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

[3] ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن : وائس پرنسپل، پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لائل پور

[4] اقبال عظیم : (ولادت : ۸۔ جولائی ۱۹۱۳ء)، ۶۷۔ ڈی آفیسرز کالونی، گارڈن روڈ، کراچی

سید وقار عظیم: معین صاحب! پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کر دوں کہ آپ نے جس محبت سے میرا ذکر کیا ہے، جن الفاظ میں ذکر کیا ہے، وہ یقیناً اُس تعلقِ خاطر کا نتیجہ ہے جس کا آپ نے تذکرہ کیا۔ میں اس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ تاریخِ ولادت والی بات واقعی ایسی ہے جس سے بعض الجھنیں پیدا ہوئیں۔ نام میرا تاریخی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ کسی صاحب نے قطعہ کہا تاریخ کا، وہ قطعۂ تاریخ تو کہیں گم ہو گیا، صرف یہ بات یاد رہی لوگوں کو کہ یہ نام تاریخی ہے اور یہی بات میرے چھوٹے بھائی کو بھی یاد رہی اور انہوں نے یہ صحیح لکھا۔ حقیقت میں میری تاریخِ ولادت دسمبر ۱۹۱۰ء ہے۔ اس اعتبار سے وہ دسمبر ۱۹۱۰ء اور ۱۳۲۷ھ میں مطابقت ہے[1]۔ لیکن داخلے کے وقت اسکول میں، بعض باتیں تھیں، اُس وقت میٹرک کا امتحان ایک خاص عمر سے پہلے نہیں دے سکتا تھا طالب علم، تو جن صاحب نے میرا داخلہ کرایا، انہوں نے دسمبر ۱۹۱۰ء کے بجائے اگست ۱۹۱۰ء لکھوا دی[2]، تو اس طرح صحیح تاریخِ ولادت کچھ بھی رہی لیکن دستاویزات میں پندرہ اگست ۱۹۱۰ء رہی اور اسی کو میں اب صحیح تاریخِ ولادت سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: سید صاحب! ادب و تنقید میں "گلشن" آپ کا خاص موضوع ہے، لیکن آپ نے مختلف اصنافِ سخن اور مختلف شعرا پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ براہِ کرم ہمیں یہ بتائیے کہ آپ کے شعری مذاق اور ہمہ گیر ادبی ذوق کی نشوونما میں تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثرات کو کہاں تک دخل ہے؟

سید وقار عظیم: یہ سوال ایسا ہے کہ اس کے جواب میں، میں اپنی بات کو چند برسوں میں پھیلاؤں گا۔ ابتدائی تعلیم، مکتب کی تعلیم ـــ آپ کے علم میں ہے، میں پیدا ہوا الٰہ آباد میں۔ وہاں سے میرے والد صاحب[3] جو پولیس میں ملازم تھے، ان کا تبادلہ کانپور ہو گیا۔ وہاں کئی سال ہم

---

[1] دسمبر ۱۹۱۰ء اور ۱۳۲۷ھ میں مطابقت نہیں ہے۔ وقار عظیم صاحب سے یہ گفتگو ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اس سلسلے میں THE MUSLIM AND CHRISTIAN CALENDARS BY: G.S.P. FREEMAN GRENVILLE (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۶۳ء) سے رجوع کیا [وقار عظیم صاحب بھی ۱۹۶۶ء کے بعد سے اسی کیلنڈر پر انحصار کرتے تھے]۔ تو معلوم ہوا کہ ۱۳۲۷ ہجری شروع ہوا ۲۳ جنوری ۱۹۰۹ء کو۔ یعنی ۱۳۲۷ ہجری کے پہلے دن یکم محرم کو عیسوی تاریخ ۲۳ جنوری ۱۹۰۹ء تھی اور ۱۳۲۷ ہجری ختم ہوتا ہے ۱۲ جنوری ۱۹۱۰ عیسوی کو، گویا ۱۳۲۷ ہجری کے آخری روز ذی الحجہ کی تیسویں تاریخ کو عیسوی تاریخ ۱۲ جنوری ۱۹۱۰ء تھی ـــ اس اعتبار سے دسمبر ۱۹۱۰ء اور ۱۳۲۷ ہجری میں مطابقت پیدا نہیں ہوتی۔ عیسوی مہینہ وقار عظیم صاحب بزرگوں سے ہمیشہ دسمبر سنتے آئے تھے، بدیہا یہ تاریخ دسمبر ۱۹۱۰ء کے بجائے دسمبر ۱۹۰۹ء رہی ہوگی، دسمبر ۱۹۰۹ء اور ۱۳۲۷ ہجری میں مطابقت بھی قائم ہو جاتی ہے۔ اس لئے میرے نزدیک وقار عظیم صاحب کی ولادت کا صحیح ماہ و سال دسمبر ۱۹۰۹ء رہے، برادرم اقبال عظیم صاحب بھی میرے اس نقطۂ نظر اور حساب سے متفق ہیں۔

[2] وقار عظیم صاحب نے ۱۹۲۸ء میں میٹرک کیا۔ سرٹیفکیٹ پر درج تاریخ کے مطابق اُس وقت اُن کی عمر ۱۸ برس بنتی ہے، اسی اندازے کے پیشِ نظر ابتداءً اُن کا سال ولادت ۱۹۱۰ء درج کرایا گیا ہوگا۔ ایک آدھ سال عمر کم درج کرانے کی عام روایت رہی ہے اور اب تک باقی ہے۔

[3] سید مقبول عظیم متخلص بہ عرش۔ اقبال عظیم صاحب فرماتے ہیں کہ والد بزرگوار کے نام میں "محمدی" کے اضافے سے اُن کا سال ولادت برآمد ہوتا ہے: (مقبول عظیم + محمدی = ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۸۸۲ء تا یکم نومبر ۱۸۸۳ء)۔ وقار عظیم صاحب کے دادا افضل عظیم صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے، اُن کی پہلی تقرری ہمیر پور (کانپور) میں ہوئی تھی۔

رہے اور اس کے بعد اُناؤ ـــ اُناؤ، کانپور کے اور لکھنؤ کے بیچ میں ایک مقام ہے۔ اُناؤ، جب ہم لوگ آئے ہیں تو اس وقت میں ساتویں جماعت میں تھا اور یہ سنہ ۲۴ء ہے تو حقیقت میں اگر کچھ اثرات ہیں جو میری شخصیت پر یا میرے کردار پر اور جو میرا طرزِ فکر ہے اُس پر پڑے تو وہ سنہ چوبیس سے شروع ہوئے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک میں وہاں گورنمنٹ ہائی اسکول (اُناؤ) میں پڑھتا رہا۔

اُناؤ ایک چھوٹی سی بستی لیکن اس کے باوجود ضلع ـــ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہاں کی آبادی کل بارہ ہزار تھی۔ آج کل گاؤں بھی اس سے بڑے ہوتے ہیں لیکن بعض خاص باتیں تھیں۔ کانپور اور لکھنؤ کے بیچ میں ہے یہ شہر۔ چھوٹا سا شہر، کانپور سے گیارہ میل کے فاصلے پر اور لکھنؤ سے چونتیس میل کے فاصلے پر۔ ریل دن بھر چلتی ہے۔ دن میں کوئی آٹھ گاڑیاں کانپور سے لکھنؤ جو جاتی ہیں اور پھر واپس آتی ہیں وہ اُناؤ ہو کر گزرتی ہیں، تو اُناؤ کا لکھنؤ سے اور کانپور سے بڑا گہرا رابطہ ہے۔ کانپور کا مزاج ہے بالکل کاروباری، وہاں کارخانے اور مزدوروں کی زندگی، اس شہر پر اُس کاروباری مزاج کا اثر تھوڑا سا پڑا ـــ لکھنؤ کا مزاج خالصتاً علمی، ادبی اور تہذیبی، اس کا اُناؤ پر اثر پڑا تو ایک ملی جلی معاشرت کا نمونہ یہ چھوٹا سا شہر۔

پھر بعض باتیں ایسی ہیں کہ اُناؤ خود اتنا زیادہ مشہور نہیں ہے لیکن اُناؤ کے ضلع میں بعض مشہور قصبے ہیں، ان میں سے ایک موہان، حسرت موہانی کا وطن، میونتی ایک قصبہ ہے، بڑا مردم خیز ـــ وہاں بڑے علما بھی پیدا ہوئے جنہوں نے شہرت حاصل کی، ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے بڑے اقتدار حاصل کئے۔ اسی طرح ایک قصبہ صفی پور، جہاں کے رہنے والے عزیز صفی پوری، مولانا ولایت علی خاں صاحب، وہ غالب کے شاگردوں میں سے تھے۔ اسی طرح گنج مراد آباد وہاں ایک جگہ ہے جہاں مولوی فضل الرحمٰن صاحب کا مزار ہے، تو جو لوگ صفی پور جاتے ہیں، گنج مراد آباد جاتے ہیں، موہان جاتے ہیں، میونتی جاتے ہیں، وہ سب اُناؤ سے ہو کر گزرتے ہیں تو اس طرح ایک روحانی رشتہ پیدا ہوتا ہے ان مقامات کے ساتھ ـــ خود اُناؤ میں بعض مزار ہیں جہاں عرس ہوتے ہیں اور باہر سے لوگ آتے ہیں تو یہ ماحول تھا جس میں میں وہاں پہنچا اور اسی ماحول کا یہ نتیجہ تھا کہ مشاعرے ہوا کرتے تھے بڑے پیمانے پر بھی اور گھروں پر مجلسیں ہوتی تھیں۔

میرے والد صاحب غزل بھی کہتے تھے اور نعت ـــ اس رشتے سے وہاں جو شعر کہنے والے تھے، اُن کے ہاں اُن کا جانا ہوتا تھا اور بعض صاحبان آتے بھی تھے ہمارے ہاں ـــ تو جو مشہور شاعر میرے ہوش میں وہاں موجود تھے، اُن میں ایک مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور جگت موہن لال رواں، آپ ان سے واقف ہیں ـــ اسی طرح رضی بدایونی ایک صاحب تھے، بہت اچھے غزل گو تھے، ضیا بدایونی کے بھائی۔ اسی طرح فرخ بنارسی تھے۔ وہ داغ کے شاگردوں میں بہت اچھے غزل گو ـــ ایک راؤ صولال مست تھے اور واقعی مست اور مجذوب بالکل ان کا ایک شعر مجھے یاد آ رہا ہے، اس وقت :

وہ لحد میں بوئے مے تھی کہ نہ آ سکے فرشتے
میں عذاب میں پھنسا تھا جو نہ بادہ خوار ہوتا!

تو یہ غیر معروف شاعر وہاں اس طرح کے تھے جو اتنے اچھے شعر کہہ سکتے تھے ـــ تو شعر و شاعری کا ماحول اور وہ بارہ ہزار کی بستی، تو اس میں ہر چھوٹا بڑا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے سے قریب ہے۔

پھر ایک بات اور تھی مسلمانوں میں، کہ وہ جاگیردارانہ تہذیب میں بسے ہوئے تھے۔ امیروں اور رئیسوں نے تعلیم کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جتنی ہندوؤں نے ——— تو معاشرتی زندگی میں ہندوؤں کو اہم مقامات حاصل ہو گئے۔ تجارت پر بھی وہ قابض ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمیں ایک الگ جتھا بنانا چاہیے، اپنی تہذیبی روایات کو محفوظ رکھنا چاہیے اس کی وجہ سے پھر یہ ہوتا تھا کہ بڑی اچھی مجلسیں ہوتی تھیں محرم میں۔ لکھنؤ سے ذاکر آتے تھے، لکھنؤ سے سوزخواں آتے تھے اور مشہور مشہور۔ اسی طرح میلاد ہوتے تھے اور میلاد میں کوشش یہ ہوتی تھی کہ بڑے سے بڑے عالم کو بلایا جائے اور بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ بہار سے بعض اوقات مولانا پھلواری، مجھے اچھی طرح یاد ہے مولانا جعفر شاہ پھلواری کے والد، ایک دفعہ میلاد پڑھنے آئے۔

اسی طرح نوجوانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اپنی ایک تنظیم قائم کرنی چاہیے۔ میں یہ اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب میں آٹھویں جماعت میں تھا، تو ہم نے ایک تنظیم بنائی۔ ایک چھوٹی سی لائبریری وہاں قائم کی، گھروں میں گئے، وہاں سے کتابیں لا کے جمع کیں اور پھر انھیں جمع کرتے تھے تو شوق سے پڑھتے بھی تھے ——— تو یہ سب چیزیں تھیں جس سے وہاں کا ماحول علمی اور تہذیبی بنا اور اس علمی اور تہذیبی ماحول میں شاعری بطورِ خاص اُبھری ——— کانوں میں ہر وقت اچھے شعر پڑے اور معلوم ہوا کہ شاعری اصل زندگی ہے ——— اور اچھے شاعروں کے قریب جا کر، اُن کی زندگی کے طور طریق دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ انھیں کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے ——— شعر اس طرح سے گویا شخصیت کا ایک جزو بن گیا اور میں سمجھنے لگا کہ شعر حقیقت میں ہماری تہذیبی زندگی کی ایک خاص بنیاد ہے ——— اس سے الگ اور اس سے قطع نظر مذہب کا ایک تصور تھا جو گھر سے لیا، تو مذہب اور شعر یہ دو چیزیں ہیں جو زندگی میں ہر قدم پر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہیں ——— تو یہ ماحول ہے جس میں میں نے پرورش پائی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: مشاعرے آپ کے گھر اور دیار کی روایت تھی لیکن شعر گوئی آپ نے باقاعدہ کبھی نہیں کی۔ اگرچہ "بے قاعدہ" ہی سہی، آپ نے شعر گوئی کی ضرور ہے! مجھے ایک حوالہ یاد آتا ہے، آپ نے ایک موقع پر بیان کیا ہے کہ ۱۹۲۳-۲۴ء میں جب آپ اٹاوہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول کی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے، آپ کو خود شعر کہنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا تھا اور مشاعروں کے لیے آپ اکثر غزلیں کہتے تھے، لیکن اس شاعری کو آپ نے "اوٹ پٹانگ سلسلہ" یا "تُک بندی" کہا ہے۔ یہ محض انکسار ہے یا واقعی تخلیقِ شعر کو آپ نے اپنا فن نہیں ٹھہرایا؟

سید وقار عظیم: معین صاحب! میں ایک تو اس میں تھوڑی سی تبدیلی کروں گا، "اکثر نہیں غزلیں کہیں، کبھی کبھی! اسکول میں جب مشاعرہ ہوتا تھا تو اس میں اپنی غزل بھی کہتا تھا اور اپنے بعض ساتھیوں کی غزل بھی کہتا تھا، سب ہلکے پھلکے مضامین، اپنے تجربے کے ——— یہ صحیح ہے کہ بعض غزلیں کہیں لیکن طالب علمی کے زمانے کے بعد وہ سلسلہ ختم ہو گیا ——— اور اس کی وجہ، جب میں نے تجزیہ کیا تو یہ محسوس ہوا کہ آٹھویں جماعت میں، میں جب تھا تو مجھے وظیفہ ملا۔ اس امتحان میں پچیس روپے وظیفہ ملتا تھا، اس زمانے کے لحاظ سے خاصی رقم تھی۔ والد صاحب نے بطورِ خاص یہ کہا کہ یہ پچیس روپے جو تمھیں ملتے ہیں، ان کی کتابیں خریدا کرو ——— تو پہلا وظیفہ جب ملا ہے تو میں لکھنؤ گیا اپنے ایک عزیز کے ساتھ، اور وہاں صدیق بکڈپو بڑی مشہور دوکان ہے کتابوں کی، وہاں سے میں چار کتابیں خریدیں ——— ان میں سے ایک "آبِ حیات" تھی۔ یہ آٹھویں جماعت کے اخیر کا قصہ ہے ——— تو میرے ابتدائی مطالعے میں

جو کتابیں آئیں، ادب کی اور شعر کی اور تنقید کی اُن میں "آبِ حیات" کا ایک خاص مقام ہے۔

"آبِ حیات" پڑھنے کے بعد یہ خیال ہُوا کہ شعر کہے بغیر آدمی نثر میں بھی شعر کہہ سکتا ہے اور ایک تھوڑا سا رجحان تھا جو شعر کہنے کا، وہ منتقل ہو گیا نثر کی طرف — اور میں نے ایسی نثر شروع کی کہ جس سے خود، وہ جو ایک موزونیت تھی طبیعت میں، اور شعر کہنے کا جو ایک احساس تھا، وہ اُدھر منتقل ہو گیا — اور یہ کہ کوئی اُستاد نہیں تھا، نہ کسی نے کبھی ترغیب دلائی شعر کہنے کی — تو میں نے اِس تبدیلی کو قبول کیا اور پھر اُسی راستے پر چلتا رہا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ، ایک سوال یہاں اور ہے — ابھی ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب نے فرمایا، ادب میں "فکشن" آپ کا خاص موضوع اور میدان ہے۔ چالیس برس پہلے ۱۹۳۵ء میں ایک ساتھ آپ کی دو کتابیں "ہمارے افسانے"[1] اور "افسانہ نگاری"[2] شائع ہوئیں۔ یہ اب تک ہندوستان اور پاکستان کی مختلف جامعات میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان چالیس برسوں میں بھی آپ برابر افسانے کے فن، اس کے امکانات اور افسانہ نگاروں کے اکتسابات کا تنقیدی جائزہ لیتے رہے۔ "نیا افسانہ"[3]، "ہماری داستانیں"[4] اور "داستان سے افسانے تک"[5]۔ آپ کی بعد کی معروف تنقیدی کتابیں ہیں، لیکن ایک بات جو عام طور پر نہیں معلوم یہ کہ افسانے کی تنقید سے پہلے خود آپ نے افسانہ نگاری بھی کی، یہ ۱۹۳۰ء کے پس و پیش کی بات ہے۔ سن اُنتیس یا تیس کا رہا ہوگا آپ کا — آپ کے کچھ افسانے رسالہ "ساقی"، "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کے پُرانے پرچوں میں میری نظر سے گُزرے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ افسانہ نگاری آپ نے کیوں ترک کر دی؟ افسانوں کی تخلیق سے افسانے کی تنقید تک کے سفر کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایئے؟

سید وقار عظیم: ہاں، اِس میں معین صاحب بات یہ ہے، دو چیزیں ہیں: وہ افسانے اگر آپ نے اُن میں سے بعض افسانے پڑھے ہیں، کچھ رومانی انداز کے ہیں — اور وہ رومانی انداز، نیاز فتح پوری کے، ل۔ احمد اکبر آبادی کے اور پھر اُس زمانے میں مجنوں گورکھپوری کا بڑا شہرہ تھا، انھیں پڑھ کر، سجاد حیدر یلدرم تھے، انھیں پڑھ کر، اثر قبول کیا اور اُسی انداز کی کہانیاں لکھیں۔ — لیکن وہ جیسا میں نے عرض کیا آپ سے "آبِ حیات" پڑھ کر جو ایک رجحان پیدا ہُوا تھا ادب پر اپنے خیال ظاہر کرنے کا اور شاعری پر اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کا، وہ غالب آتا رہا برابر — اور اس کے غالب آنے کی ایک وجہ وہ ماحول تھا جس میں میں نے تعلیم پائی۔

---

[1] طبع اوّل: سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد، ۱۹۳۵ء، باضافہ و ترمیم: اُردو مرکز لاہور، ۱۹۵۰ء

[2] طبع اوّل: سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد، ۱۹۳۵ء، باضافہ و ترمیم: نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۰ء طبع سوم: اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱ء

[3] طبع اوّل: ساقی بک ڈپو، دہلی ۱۹۴۶ء، باضافہ و ترمیم: اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۷ء

[4] طبع اوّل: ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ۱۹۵۶ء، باضافہ و ترمیم: اُردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۶ء

[5] طبع اوّل: اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء، طبع دوم: ۱۹۶۶ء

انٹرمیڈیٹ میں، میں جس زمانے میں پڑھتا تھا، وہاں دو اُستادوں سے سابقہ رہا: ایک حامد اللہ افسر میرٹھی، وہ افسانے لکھتے تھے اور ان کے دوست نیاز فتحپوری۔ ہر وقت اُن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، میں جاتا تھا حامد اللہ افسر صاحب کے ہاں، وہاں نیاز صاحب سے ملاقات ہوتی تھی اور افسانے کے موضوع پر باتیں ہوتی تھیں ـــــ پھر دوسرے اُستاد علی عباس حسینی۔ وہ آپ کو معلوم ہے بڑے معروف افسانہ نگار، انہوں نے ناول نگاری کی تاریخ پر کتاب بھی لکھی ہے۔ اُن کے بھانجے (توقیر) میرے ہم جماعت تھے، تو ہم حسینی صاحب کے پاس بیٹھا کرتے تھے جاکے۔ اُن کی کہانیاں بھی سنتے تھے اور خاص کر وہ جو تاریخ لکھ رہے تھے ناول کی، اُس کے بعض حصے وہ شوق میں ہمیں سُنایا کرتے تھے، کچھ ہمیں سکھانے کے لئے ـــــ تو یہ مجھے خیال پیدا ہوا کہ ناول اور افسانے پڑھنا اور اِس کے متعلق رائے ظاہر کرنا ایک بڑا دلچسپ شغل ہوگا۔ یہ ایک بات ذہن میں رہی۔

اب یہ ہوا کہ وہاں سے پھر جب ایم۔ اے کرنے کے لئے الہ آباد گیا تو الہ آباد کے قیام کے زمانے میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی، اُن میں احمد علی، وہ ایک خاص طرح کا افسانہ لکھتے تھے، سجاد ظہیر بھی اُس زمانے میں وہیں تھے اور یہ نئی طرح کا جو افسانہ تھا، اُس نے میرے ذہن پر اثر ڈالنا شروع کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ شروع میں جو مضامین میں نے لکھے ہیں، وہ "نیرنگِ خیال" میں اور "عالمگیر" وغیرہ میں ـــــ یہ پرچے اور ان کے خاص خاص نمبر آنے شروع ہوئے تو اُن میں کہانیاں پڑھیں اور کہانیاں پڑھنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کہانیاں تو لوگ لکھ رہے ہیں، کہانی کی تنقید کوئی نہیں لکھ رہا تو میں جس زمانے میں ایم اے میں پڑھ رہا تھا، میں نے اپنے ذہن میں یہ بات طے کر لی کہ تعلیم سے فارغ ہو کر میں اس کام کی طرف توجہ کروں گا ـــ کہانیاں اچھی طرح پڑھوں اور کہانیوں کا تجزیہ کروں، لیکن کہانیوں کا تجزیہ کرنے سے پہلے خود مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کہانی کا فن کیا ہے؟

کہانی کا فن کیا ہے، اِس کی جستجو میں پھر میں نے فراق گورکھپوری، وہ الہ آباد یونیورسٹی میں تھے انگریزی کے اُستاد، فراق صاحب کے علاوہ انگریزی کے ایک اور بڑے معروف اُستاد تھے دیب صاحب، اُن سے مل کر خاص طور سے گویا فکشن کے فن پر جو چیزیں مل سکتی تھیں، وہ جمع کیں اور اس انتظار میں رہا کہ امتحان سے فارغ ہو جاؤں تو انھیں یکسوئی سے پڑھوں۔ امتحان سے فارغ ہوتے ہی چنانچہ میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا اور ان کتابوں سے متاثر ہو کر پھر یہ دو کتابیں ("ہمارے افسانے" اور "افسانہ نگاری") لکھیں۔

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن: ۱۹۳۴ء میں؟

سید وقار عظیم: بس ایم۔ اے کا امتحان دینے کے فوراً بعد تقریباً چھ مہینے میں، ۱۹۳۴ء کے اپریل میں سمجھیے کہ یہ کام شروع کیا۔ اس کے بعد چھ مہینے میں یہ دونوں کتابیں لکھی گئیں اور ۱۹۳۵ء میں شائع ہو گئیں۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: جنابِ والا! آپ کا ایک بیان یہ ہے کہ آپ کی تنقید نگاری کی ابتدا جن دو مضامین سے ہوئی، وہ دونوں غالب کے زیرِ بارِ احسان ہیں۔ یہ دو مضامین کیا تھے؟ کب چھپے اور کہاں چھپے؟

سید وقار عظیم: تنقید کی ابتدا، ہاں صحیح معنوں میں جب ایم۔ اے میں تھے ہم لوگ، تو اس طرح کا ماحول تھا کہ جی چاہتا تھا کہ جو کچھ پڑھ

رہے ہیں۔ اُس پر اپنے خیال کا اظہار کریں، تو ایم۔ اے کی تعلیم کے زمانے میں میں نے بہت سے تنقیدی مضمون لکھے یعنی یہ زمانہ ہے جب ہم نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ایک رسالہ نکالا "نیساں" — "نیساں" میں یہ تھا کہ طالب علموں کے مضامین ہونے چاہئیں۔ اس میں پہلا مضمون جو میرا چھپا ہے وہ تھا "غالب بحیثیت نقاد" — غالب کے خطوں سے جو ایک تنقیدی مزاج اُن کا اُبھرتا ہے، اُس پر میں نے یہ مضمون لکھا — اچھا، اسی طرح "نیساں" کے لئے میں نے ایک اور مضمون لکھا، اس کا عنوان تھا: "شعر میں سادگی" مقدمہ پڑھا تھا حالی کا، کچھ تصورات تھے اس کی وجہ سے، اور کچھ غالب کی وہ غزلیں جو آسان زمینوں میں ہیں، میر کی غزلیں، تو میں نے ان دونوں شاعروں کے حوالے سے، میر اور غالب کے حوالے سے شعر کی سادگی کے مفہوم کی وضاحت کی، تو اِس طرح نظم میں جو بات کہی گئی وہ غالب کے شعر سے متاثر ہو کر اور نثر میں، تنقید میں ایک بات کہی تو اُن کے خطوں سے متاثر ہو کر۔ اِس طرح غالب میری تنقیدی زندگی کا آغاز ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: یہ بات آپ کے الٰہ آباد تشریف لے جانے کے بعد کی ہے؟

سید وقار عظیم: جی، جی!

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: کہ تنقیدی مضامین آپ نے لکھنا شروع کئے؟ اس سے پہلے ۱۹۳۰ء میں آپ نے انٹر اور ۱۹۳۲ء میں بی۔ اے کیا لکھنؤ سے۔ آپ نے حامد اللہ افسر صاحب اور علی عباس حسینی صاحب کا ذکر کیا۔ اِن اساتذہ کے علاوہ کچھ اور اساتذہ سے بھی آپ کا سابقہ رہا ہوگا؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، وہ یونیورسٹی میں جا کر۔ یہ دونوں صاحبان تو انٹرمیڈیٹ کالج میں تھے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: جوبلی کالج میں؟

سید وقار عظیم: جی، جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج (لکھنؤ) میں۔ وہ بڑی مشہور عمارت، جو شعر ہے آتش کا:

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

اُس میں ہمارا کالج تھا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: اچھا! اچھا!؟

سید وقار عظیم: افسر صاحب نے ہمیں یہ بتایا کہ بھئی یہ کالج اُس عمارت میں ہے جس کے متعلق آتش کا یہ شعر ہے۔ افسر صاحب آپ کو معلوم ہے، شاعر بھی بہت اچھے تھے اور افسانہ نگار بھی اور نقاد بھی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: بچوں کے لیے انہوں نے نظمیں بھی لکھیں بڑی اچھی۔

سید وقار عظیم: جی ہاں! تو اُن کا بڑا اثر پڑا ذہن پر۔ یہاں یونیورسٹی میں آنے کے بعد اُس میں ایک طرح کی پختگی پیدا ہوئی اور ایک راستہ ملا تنقید کو، وہ مسعود حسین رضوی صاحب کے زیرِ سایہ۔ بی۔ اے میں حالی کا مقدمہ تھا ہمارے نصاب میں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مقدمے کو سامنے رکھ کر مسعود صاحب نے کتاب لکھی ہے "ہماری شاعری" تو وہ مقدمہ پڑھاتے تھے اور جو کچھ انہوں نے

"ہماری شاعری" میں کہا ہے، اُسے زبانی بیان کرتے تھے ـــ تو بجائے اس کے کہ ہم ان چیزوں کو پڑھتے، ہم نے یہ خیالات اُن سے سُنے اور ان کا اثر قبول کیا، تو مسعود حسین رضوی صاحب کا میں سمجھتا ہوں کہ بے حد اثر ہے اور میں جتنا بھی ذکر کروں اُس احسان کا، جو ہے اُن کی تحریروں اور تقریروں کا، وہ کم ہوگا[1]۔ پھر مولوی محمد حسین صاحب ایک تھے۔ وہ پُرانی وضع کے استاد تھے۔ بہت اچھا شعری ذوق رکھتے تھے اور روایت میں رچے ہوئے۔ اُن سے بھی ہم لوگ بہت مانوس تھے اور اُن کی تنقیدوں اور خیالات سے متاثر ہوتے تھے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ایک بات یہ کہ ۱۹۳۲ء میں آپ نے لکھنؤ سے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے کے لیے الٰہ آباد تشریف لے گئے کیا یہ نقلِ مکانی ضروری تھی؟

سید وقار عظیم: بات یہ ہے کہ اُردو کا ایم۔ اے اُس وقت تک وہاں کھلا ہی نہیں تھا اور ضمناً یہ بات عرض کروں کہ جب میں نے بی۔ اے کیا تو مسعود صاحب نے مجھے ایک دن باتوں میں کہا کہ بھئی وقار، وہ ہم اُردو ایم۔ اے کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور خیال یہ ہے کہ شاید دو تین برس اس میں لگیں گے، تو جی یہ چاہتا ہے کہ ہمارا کوئی شاگرد یہاں پہلا اُستاد ہو شعبے کا، جو ایم۔ اے کی تدریس میں حصہ لے تو اگر آپ اُردو میں ایم۔ اے کر لیں تو بڑی خوشی ہوگی ـــ اور پھر اس کے لئے الٰہ آباد جانا ضروری تھا، علی گڑھ میں بھی اُس زمانے میں اُردو ایم۔ اے نہیں تھا۔ پھر حامد اللہ افسر سے ملاقات ہوئی، اُن سے زیادہ ملنا تھا۔ ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے، اُن سے ذکر آیا مسعود صاحب کے اس مشورے کا، تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: ہاں جاؤ اور فرسٹ کلاس لے کر آنا اور پھر ان شاء اللہ زندگی میں، دیکھو ہم تصور کر سکتے ہیں کہ تم کیا کرو گے ـــ تو ان دو اُستادوں کی ترغیب پر اُن کے حکم پر پھر میں الٰہ آباد گیا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ایک موقع پر آپ نے کہیں لکھا ہے کہ ایم۔ اے کے لئے آپ کو لکھنؤ سے الٰہ آباد آنا پڑا، یہ سفر آپ کی زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس کی تفصیل آپ کچھ بتائیے۔

سید وقار عظیم: یہ کچھ گھریلو صورتِ حال۔ والد صاحب ہمارے پولیس میں تھے جیسا میں نے آپ سے عرض کیا۔ وہ ریٹائر ہو چکے تھے اُس وقت تک[2]۔ یہاں ایک بات، ہم چھ سات بہن بھائی، اُن میں میں سب سے بڑا ہوں، تو ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد والد صاحب پر یہ ذمہ داری تھی کہ چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھائیں۔ بی۔ اے میں نے کر لیا تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ اب تعلیم مکمل ہو گئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اب میں ایم۔ اے کر دوں۔ میں نے جب اُن سے اجازت لی تو وہ خاموش ہوئے اور خاموشی کی

---

[1] وقار عظیم صاحب سے یہ گفتگو ہوئی (۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء) تو مسعود حسن رضوی ادیب حیات تھے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ وقار صاحب سے اس کا تذکرہ آیا تو انہوں نے گہرے اور دلی رنج کا اظہار کیا تھا۔ وہ خود بھی نہ رہے! اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی!

[2] وقار عظیم صاحب کے والد مقبول عظیم صاحب کا سالِ ولادت ۱۳۰۰ ہجری (۸۳-۱۸۸۲ء) ہے۔ وقار عظیم صاحب کے بی۔ اے کرنے تک (۱۹۳۲ء) وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو اُن کی عمر پچاس سال یا اس کے قریب رہی ہوگی۔

وجہ یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ جو تھوڑی سی پنشن اب ملتی ہے، اُس میں وہ میری تعلیم کا بار اب نہیں اُٹھا سکیں گے۔ مَیں نے اس پر اُن سے یہ کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ پر ذمہ داریاں ہیں، چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ مَیں صرف آپ کی اجازت چاہتا ہوں اور آپ کی دُعا — پھر مَیں انشاء اللہ آپ کو کسی طرح کی — خیر، تو انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ اس کی دلی خواہش ہے تو پچاس روپے کا انھوں نے انتظام میرے لئے کیا اور وہ پچاس روپے لے کر پھر میں وہاں الٰہ آباد گیا، اور اس کے بعد پھر مَیں نے جب تک ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کی اپنے والد صاحب سے نہیں کچھ لیا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: تو پچاس روپے اور دُعا، یہ زادِ راہ لے کر آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے سفر پر نکلے۔

سید وقار عظیم: بالکل، اس کے بعد پھر اُن کی دُعاؤں ہی کا اثر کہ وہاں جا کے مختلف طرح کے چھوٹے چھوٹے کام مَیں کرتا رہا تحریر کے، کبھی شرح لکھ دی کسی کتاب کی، کبھی کسی کا ترجمہ کر دیا اور ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر نام بھی نہیں ہے میرا، تو اس طرح وہ دن گزرے وہاں۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: سید صاحب! ۱۹۳۴ء میں آپ نے الٰہ آباد یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے اُردو کے امتحان میں فرسٹ کلاس لیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئے اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو ہی میں بطور لیکچرار کے آپ کا تقرر بھی ہو گیا۔ یہ سلسلہ کب تک رہا اور کیوں ختم ہو گیا۔؟

سید وقار عظیم: وہ صدیقی صاحب! بات یہ ہے کہ جب مَیں نے ایم۔ اے کیا ہے تو ایم۔ اے کرنے کے بعد شعبے میں ایک وظیفہ تھا، جو اوّل آنے والے طالب علم کو تحقیق کے لئے دیا جاتا تھا۔ اِس وظیفے کی میرے لئے منظوری ہو گئی، لیکن اسی زمانے میں ہمارے اُستاد ڈاکٹر حفیظ سید، بھرتری ہر، بھرتری کی "من لگن" پر اُن کا مقالہ ہے، آپ نے دیکھا ہو گا، وہ انگلستان گئے چھٹی پر، تو اُن کی جگہ میرا تقرر ہوا۔ وہ عارضی تقرر تھا، اُن کی چھٹی تک۔ چنانچہ مَیں نے کوئی چھ مہینے، وہاں بی۔ اے اور بی۔ اے (آنرز) کی کلاسوں کو پڑھایا اور ڈاکٹر حفیظ سید صاحب کے آنے کے بعد وہ تقرر کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: سید صاحب! ابھی آپ نے فرمایا کہ ریسرچ کے لیے شاید آپ کو وظیفہ ملا تھا، تو وہ ریسرچ کی تکمیل کیوں نہ ہو سکی؟

سید وقار عظیم: ایم۔ اے کے لیے میرے مقالے کا موضوع تھا: "اُردو شاعری پر مقامی اثرات" اصل میں وہ موضوع انگریزی میں تھا: "INFLUANCE OF LOCAL ENVIRONMENT ON URDU POETRY" اُس وقت تک اُردو میں مقالہ لکھنے کی اجازت نہیں تھی، ایم۔ اے اُردو کے طالب علموں کو بھی۔ اُس سال سے پھر اجازت ہوئی کہ ہاں اُردو میں لکھ سکتے ہیں، خیر، پھر وہ "اُردو شاعری پر مقامی اثرات" کے موضوع پر مَیں نے مقالہ لکھا سال بھر میں۔ لیکن ظاہر ہے اُس کا معیار وہی تھا، جیسا گویا ایم۔ اے کے پہلے سال کے بعد ایک سال میں لکھ سکتا ہے آدمی، لیکن اسے ضامن صاحب (صدر شعبۂ اُردو) نے پسند کیا اور پھر سفارش کی کہ اس کی بنیاد پر پی ایچ۔ ڈی کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ وہاں (الٰہ آباد یونیورسٹی) سے پی ایچ۔ ڈی کی اجازت مل گئی۔

اب اس کے بعد کے بعض واقعات ہیں جن کی حیثیت ایک طرح کے سانحے کی ہے — ایم۔ اے کرنے کے چھ مہینے کے بعد میری والدہ صاحبہ کا بھی انتقال ہو گیا اور والد صاحب کا بھی، اور مَیں گھر میں سب

سے بڑا ہوں، اپنے بہن بھائیوں میں۔ سات بہن بھائی ہیں میرے[1] ——— تو کچھ ان کی تعلیم کی ذمہ داری، ان کی پرورش کچھ میری شادی بیاہ[2]، اس طرح اب میری ساری توجہ اس بات پر تھی کہ جب تک میں الہ آباد میں ہوں میری اتنی آمدنی ہو کہ اپنے خرچ کے علاوہ، میں ان کی ضروریات بھی پوری کر سکوں، تو اس لئے وہ پھر تعویق میں جا پڑا تحقیق کا قصہ، اور پھر وہ اسی طرح تشنہ رہا اور میری خواہش کے باوجود اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: وقار صاحب! آپ کی شخصیت کے دو رخوں کا عکس بالعموم دلوں پر نقش ہے۔ ایک رخ معلّم کا اور دوسرا وہ جس میں آپ بحیثیت ادیب اور نقاد، دنیا کے سامنے آئے، لیکن پہلے رخ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے تحقیقی کام

---

[1] وقار عظیم صاحب کی حقیقی والدہ کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اس وقت وہ اپنے میکے میرٹھ میں تھیں۔ وقار عظیم صاحب کے والد مقبول عظیم صاحب اس موقع پر دو تین ماہ وہاں رہے اور جب وہ میرٹھ سے واپس کانپور آئے تو وقار عظیم صاحب کی سگی خالہ (کلثوم بیگم)، دوسری والدہ کی حیثیت سے ان کے ہمراہ تھیں۔ وقار صاحب کی ان دوسری والدہ کا انتقال ۱۹۳۵ء میں مارچ کے مہینے میں ہوا۔ مارچ کے تیسرے یا چوتھے ہفتے کی بات ہے۔ اس کے دو مہینے بعد مئی ۱۹۳۵ء میں والد صاحب بھی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ پہلی والدہ (متوفی ۱۹۲۲ء) سے چار بھائی بہن:

۱۔ وقار عظیم صاحب (دسمبر ۱۹۰۹ء — ۱۷؍ نومبر ۱۹۷۶ء)
۲۔ اقبال عظیم صاحب (ولادت: ۵؍ جولائی ۱۹۱۳ء) مقیم کراچی۔
۳۔ مسعودہ بیگم صاحبہ (ولادت: ۱۹۱۶ء) اہلیہ محمود رضوی صاحب، کراچی میں مقیم۔
۴۔ معراج عظیم صاحب (ولادت: ۱۹۱۹ء، وفات: کراچی ۱۹۵۰ء)

دوسری والدہ (متوفی مارچ ۱۹۳۵ء) سے تین بہن بھائی:

۱۔ محبوب مشیر مرحومہ، بیگم مشیر احمد علوی (دہلی)
۲۔ احمد عظیم صاحب مقیم دہلی۔
۳۔ حامد عظیم صاحب مقیم دہلی۔

اقبال عظیم صاحب کا بیان ہے کہ ہماری دوسری والدہ وقار صاحب کو بالخصوص بہت عزیز رکھتی تھیں اور انھیں اپنا "کماؤ پوت" کہا کرتی تھیں! انتقال کے وقت بھی انھوں نے بطور خاص وقار صاحب کو یاد کیا اور جب وقار صاحب آ گئے تو انھیں کے زانوؤں پر انہوں نے دم دیا۔

[2] وقار عظیم صاحب کی شادی آگرے کے کوتوال عابد حسین خاں صاحب کی صاحبزادی عابدہ بیگم صاحبہ سے ۲۷؍ دسمبر ۱۹۳۸ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ عابد حسین خاں صاحب بہت محبت کرنے والے بزرگ تھے نومبر دسمبر ۱۹۷۱ء میں وہ علی گڑھ سے لاہور تشریف لائے تو مجھے ان کی زیارت کا موقع ملا، افسوس، صد افسوس کہ وقار صاحب کے انتقال کے تین ہفتے بعد وہ بھی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وقار عظیم صاحب کے انتقال کی خبر انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے سنی "اے غضب!" کا کلمہ منہ سے نکلا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے اور پھر اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے ۹؍ دسمبر ۱۹۷۶ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ ع عمر بھر روئیں گے، تجھ کو تیرے دیوانے بہت!

کی رہبری کی ۔ یعنی بحیثیت اُستاد، ایسے بہت سے شاگردوں کے رہنما بنے جنہوں نے آپ کی رہبری اور رہنمائی میں پی ایچ۔ ڈی کی سندِ فضیلت حاصل کی اور اعلیٰ درجے کے تحقیقی کارنامے انجام دیئے۔ اِن اصحاب میں سے ایک ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب اِس وقت ہمارے ساتھ تشریف رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی[1]، ڈاکٹر سہیل بخاری[2]، ڈاکٹر عبیداللہ خاں[3]، ڈاکٹر ظہیر حسین فتح پوری[4]، ڈاکٹر محمد اسلم قریشی[5]، ڈاکٹر آغا مسعود رضا[6]، ڈاکٹر ناصر احمد خاں پروازی[7]، اور ڈاکٹر محمد اقبال احمد خاں[8] چند نام ہیں جو اِس وقت ذہن میں آتے ہیں، جنہوں نے آپ کی رہنمائی میں منزل پائی اور تکلف برطرف غالب یہ خود اپنے تحقیقی کام کو بھی آپ کے فیضان سے خالی نہیں[9] پاتا۔ اِس لیے آپ کو ”ڈاکٹر گر“ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا — ملک میں تحقیق کا جتنا اور جیسا صحیح مذاق آپ کے طفیل عام ہوا، اس کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے پیش کی جا سکتی ہے۔ خود آپ نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں ”تاریخِ ادب کے بہت سے“ تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی اور نئے حقائق منکشف کئے ہیں، لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ اپنے محقق ہونے کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ کہا ہے اُس میں انکسار کو بہت دخل ہے، مثلاً ایک جگہ تو آپ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ: ”میں تحقیق کے میدان کا مَرد نہیں“ (ہماری داستانیں، طبع دوم، صفحہ ۳۵۴) — اِس کے بارے میں آپ یہاں کچھ کہنا پسند کریں گے؟

سیّد وقار عظیم: معین صاحب! بات یہ ہے کہ جن صاحبان کے آپ نے نام لیے اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ ”ڈاکٹر گر“ آپ کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان سب کی ڈاکٹری کی ڈگری، اُن کے اپنے ذاتی شوق، اپنے ذاتی انہماک اور ذاتی محنت کی بنا پر ہے اور جو کچھ انہوں نے حاصل کیا ہے، وہ میرے لیے باعثِ عزّت و تکریم ہے کہ مجھے ایسے شاگرد ملے کہ جن کی بدولت میں نے خود پڑھا۔ کسی تحقیقی مقالے کی نگرانی کرنے کے لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جتنا وہ محقق طالب علم مطالعہ کرتا ہے، اُتنا ہی کم و بیش خود نگرانی کرنے والے کو بھی پڑھنا پڑتا ہے۔ اِس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُن پر میرا احسان نہیں

---

[1] ڈاکٹر ناظر حسن زیدی: اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

[2] ڈاکٹر سہیل بخاری: نائب مُدیر، ترقیِ اُردو بورڈ، کراچی

[3] ڈاکٹر عبیداللہ خاں: لیکچرار شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

[4] ڈاکٹر ظہیر حسین فتح پوری: اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، راولپنڈی

[5] ڈاکٹر محمد اسلم قریشی: حشمت میموریل کالج، راولپنڈی

[6] ڈاکٹر آغا مسعود رضا: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، باغبانپورہ، لاہور

[7] ڈاکٹر ناصر احمد خاں پروازی: لیکچرار شعبۂ اُردو تعلیم الاسلام کالج، ربوہ

[8] ڈاکٹر محمد اقبال احمد خاں: وائس پرنسپل، پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، ایف سی کالج، لاہور

[9] راقم الحروف اور اقبال احمد خاں صاحب نے اُستادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب (صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد) کی نگرانی اور رہنمائی میں تحقیقی کام مکمل کیا۔ ہم اپنے کام کی تکمیل کے دوران میں وقار عظیم صاحب سے بھی مشورہ کرتے رہے۔

ہے، اُن کا مجھ پر احسان ہے کہ میرا جو مبلغ علم ہے، اُس میں برابر وسعت پیدا ہوتی رہی، انہی مقالوں کی بدولت۔

باقی وہ دوسری بات جو آپ نے تحقیق کے سلسلے میں کہی تو کوئی نقاد صحیح تنقید اُس وقت تک کر ہی نہیں سکتا جب تک اُس کا مزاج تحقیقی بھی نہ ہو۔ کسی شاعر، یا کسی نقاد کے متعلق کچھ کہتے ہوئے، اُس کے پورے ماحول کا، اُس کی شخصیت کا اور اُس پہ جو کچھ بیتتی ہے اُس کا، اُس کے ردِ عمل کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے اور میرے نزدیک یہ بھی تحقیق ہے۔ لیکن ہُوا یہ کہ بعض صاحبان جو چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بہت توجہ دیتے ہیں مثلاً کسی شاعر کی تاریخ وفات کے سلسلے میں کہیں ۱۱ اگست ہے تو وہ ایک پورا مقالہ لکھیں گے اِس بات پر 'نہیں، ۱۱ اگست نہیں ہے' ۱۲ اگست ہے ٹھیک ہے یہ بھی ایک اہم بات ہے — لیکن اگر کسی شخص کا مزاج ایسا نہیں ہے کہ وہ اِس طرح کی باتوں کی طرف توجہ کرے اور وہ تحقیق کے اُس رُخ کو اپنائے جسے میں نے کہا کہ وہ بنیاد بنتا ہے تنقید کی تو ایسے مُحقق کو مُحقق نہیں گردانا جاتا —— تو میں اس معنی میں یقیناً مُحقق نہیں ہوں کہ وہ باریک بینی جس سے بعض محقق کام لیتے ہیں اور جس کی اہمیت سے میں انکار نہیں کرتا، اُس میں میں کبھی نہیں اُلجھا اور اس میدان کا واقعی میں مَرد نہیں ہوں، تو اِس اعتبار سے میں نے یہ بات کہی ہے۔ ورنہ محقق ہونے کا میں دعویٰ نہیں کرتا، لیکن تنقید میں اگر میری بات کچھ سُنی جاتی ہے اور پسند کی جاتی ہے تو ہر تنقید کے پیچھے تھوڑی بہت تحقیق ضرور ہے۔

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن: محنت اور تحقیق، اچھی تنقید کے لئے، اس میں کیا شک ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: سید صاحب! آپ نے ۱۹۴۳ء میں غالباً ٹیچرز ٹریننگ کالج، علی گڑھ سے بی۔ ٹی کا امتحان دیا تھا، علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں آپ کن اصحاب سے خاص طور پر مُتاثر و مستفید ہوئے؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، وہ بی۔ ٹی کا قصہ بھی یہ ہے کہ جس زمانے میں، میں الٰہ آباد میں تھا، ایم۔ اے کے بعد تحقیق کر رہا تھا، اور پھر وہ عارضی سی ملازمت کا مختصر سا دور، اُسی زمانے میں خواجہ غلام السیدین آئے وہاں کسی کام سے اُن سے ملاقات ہوئی، اور اب میرے سامنے کوئی آئندہ کا پروگرام نہیں تھا کہ میں کیا کروں گا، سوائے اس کے کہ وہ پی ایچ۔ ڈی کی تحقیق، تو اسی زمانے میں سیدین صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے توجہ دلائی کہ بھئی اگر فی الحال کچھ نہیں کرنا ہے تو آپ بی ٹی کر لیجئے۔ علی گڑھ میں تو بی۔ ٹی کہتے تھے اسے اور الٰہ آباد میں ایل ٹی کہا جاتا تھا۔ ایل۔ ٹی میں عام طور سے داخلہ اُردو، فارسی والوں کو، عربی والوں کو نہیں ملتا تھا۔ سیدین صاحب نے کہا کہ ہم اُردو، فارسی اور عربی والوں کو ترجیح دیتے ہیں اپنے ہاں، اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اُستاد اِن چیزوں سے خاص شغف رکھتے ہوں —— تو سیدین صاحب کی تشویق سے میں نے پھر وہاں (علی گڑھ میں) داخلہ لیا بی۔ ٹی میں۔

اُس دور کو میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا بڑا اچھا دور ہے کہ وہاں رشید احمد صدیقی سے، پہلے سے نیازمندی تھی اور آل احمد سرور سے دوستانہ مراسم تھے۔ یہ لوگ وہاں موجود تھے، پھر مُعین احسن جذبی وہاں شعبے میں آ چکے تھے، اختر انصاری افسانے بھی بہت اچھے لکھتے تھے، شعر بھی کہتے تھے، بڑے خاموش طبع اور تنہائی پسند، لیکن مجھ سے خاصا خلا ملا تھا اور میں اُن کے پاس جاتا تھا۔ پھر خواجہ منظور حُسین، اُن سے اُس زمانے میں بہت بے تکلفی پیدا ہوئی اور جیسے چھوٹے بڑے کا رشتہ ہے، اُن سے بہت کچھ سیکھا، بلکہ انگریزی ادب کے مُطالعے کا اور خاص طور پر انگریزی ادب میں تنقید کے مطالعے کا جو شوق

پہلے سے تھا، اُسے جلا ملی خواجہ منظور حسین صاحب کی صحبت میں اور اُن سے لے کر جو میں نے کتابیں پڑھیں تنقید کی اور خاص کر اُس تنقید کی جس کا تعلق افسانوی ادب سے ہے۔ اُس کا عکس پھر میری بعض آگے کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔

خواجہ منظور حسین صاحب سے ناول پہ اچھی اچھی کتابیں لے کر پڑھیں، ان کا اثر قبول کیا اور ان کے نوٹس لیے جو کئی موٹی موٹی جلدوں میں ہیں اور اپنے طالب علموں کو بھی یہ حوالے برابر دیتا رہا کہ انگریزی کی ان کتابوں کو پڑھے بغیر صحیح افسانوی ادب کے جو رموز ہیں، اور اس کے تنقید کرنے کے جو اُصول ہیں، اُن سے واقف ہی نہیں ہو سکتا کوئی، جب تک وہ ان سے بڑا قریبی تعلق نہ پیدا کرے۔ چنانچہ افسانے کے فن پر، ناول کے فن پر، ڈرامے کے فن پر، تاریخی ناول کے فن پر انگریزی میں جو کتابیں میں نے پڑھیں، اُن سے متأثر ہوا۔ ان کے خیالات لیے، انہیں اپنے اندر جذب کیا، انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیا اور اسے ضروری سمجھتا ہوں میں کہ جو چیز ہم مغرب سے لاتے ہیں، اُس کا فن بھی وہیں سے آئے گا۔ البتہ اسے اپنے ماحول میں اور یہاں کی ضروریات کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔ اس کی میں نے کوشش کی ہے اپنی تحریروں میں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: وقار صاحب! یہ بی ٹی آپ نے ۱۹۳۷ء میں کیا۔ اُس وقت تک لکھنؤ میں کیا شعبۂ اُردو قائم نہیں ہوا تھا، جس کے پیشِ نظر مسعود حسین رضوی صاحب نے آپ کو اُردو میں ایم۔ اے کرنے کا مشورہ دیا تھا؟

سید وقار عظیم: جی، وہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں شعبۂ اُردو اُس وقت قائم ہوا جب میں بی ٹی میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے لئے ایک اُمیدوار میں بھی تھا، درخواست دینے والوں میں مجنوں گورکھپوری تھے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: اچھا؟!

سید وقار عظیم: اور ایک احتشام حسین ۔۔۔ احتشام حسین کا ذکر پہلے نہیں آیا، اور وہ اِس سلسلے میں آنا چاہیے تھا کہ جب ایم۔ اے میں تھا میں، تو ایک سال پیچھے تھے احتشام حسین۔ وہ بی۔ اے میں تھے تو میں ایم۔ اے (پریویس) میں تھا، یعنی جب میں الٰہ آباد میں ایم۔ اے میں داخل ہوا ہوں تو اُس وقت گویا یہ وہاں بی۔ اے میں تھے اور جب ہم لوگ (میں، طالب الٰہ آبادی اور صغیر احمد جان وغیرہ) فائنل میں آئے ہیں تو احتشام حسین پریویس میں تھے ۔۔۔ تو اُمیدواروں میں ایک احتشام حسین تھے، مجنوں گورکھپوری تھے۔ اچھا، اب یہ ہوا کہ احتشام حسین کے خیالات اور اُن کی تربیت کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ کانگریس کی طرف مائل تھے، تھوڑا سا جھکاؤ کمیونزم کی طرف بھی ۔۔۔ انتخاب کے وقت جن کو دخل تھا اس انتخاب میں، وہ سیاسی لوگ زیادہ تھے۔ کانگریس کا بڑا غلبہ تھا وہاں (یونیورسٹی میں)، تو اس بنیاد پہ، یعنی اُن کی احتشام حسین کی لیاقت میں بھی شبہ نہیں، لیکن یہ چیز گویا ترجیح کا سبب بن گئی اور پھر احتشام حسین کا وہاں تقرر ہوا۔ ۔۔۔ میں بیچ میں بی ٹی کا امتحان چھوڑ کر وہاں گیا تھا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: انٹرویو کے سلسلے میں۔

سید وقار عظیم: جی ہاں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: تو بی۔ ٹی کرنے کے بعد جامعہ ملیہ

اچھی تعلیم کو سارے ملک میں عام دیکھنا چاہتے تھے۔ پالی ٹیکنیک ایک نئی طرح کا ادارہ تھا اور جس طرح سر جان سارجنٹ کا یہ خیال تھا کہ اس ادارے میں ہمیں اچھے استاد لانے چاہئیں، اسی طرح ذاکر صاحب بھی کہ ہمارا ادارہ تو چل ہی رہا ہے اور یہاں اور بھی استاد ہیں، تو اگر اپنے اس تھوڑے سے نقصان سے کہ وقار صاحب وہاں چلے جائیں، اس ادارے کو زیادہ فائدہ پہنچے تو وہ علم کی خدمت ہوگی، ایک وسیع تر پیمانے پر، تو اس جذبے کے تحت انھوں نے —— اور وہ جو واقعہ میں نے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن کا سنایا، وہ خود پالی ٹیکنیک میں مجھے بھیجنے کے بعد کا ہے، افسوس کر رہے تھے، جی ہاں، تو وہ یہ تھا قصہ ——

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: پالی ٹیکنیک سے چار برس آپ کا تعلق رہا۔ وہاں بعض رفقا ہوں گے، کچھ اور لوگ، کن کا ساتھ رہا، کن لوگوں سے...

سید وقار عظیم: یوں تو بہت سے ساتھی ہیں اور وہ یاد آتے ہیں لیکن ایک رفاقت ایسی ہے جو ابھی تک بھی جاری رہی اور وہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی۔ نیا نیا ادارہ کھلا تھا، اسلامیہ کالج، لاہور میں انھیں یہی تھا کہ تنخواہ کم ملتی ہوگی۔ تو وہ پالی ٹیکنیک میں آ گئے۔ ایک ملاقات وہ اس کے علاوہ بعض اور احباب، بعض ہندو، بعض عیسائی دوست۔ ویسے کہ یہاں آنے کے بعد بھی، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر بہتر انسانوں کی ایک فہرست مرتب کرنی پڑے، مجھے اچھے دوستوں کی، تو میں اس میں، انھیں بھی شامل سمجھوں گا، تو بہت سے آدمی مجھے ملے۔ حمید احمد خاں صاحب کا نام تو میں نے اس لیے لیا کہ وہ بعد میں بھی تعلق قائم رہا —— ایک مولوی رشید احمد صاحب، وہ یہاں آئے، مختلف اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر رہے وہ ہمارے ساتھی تھے، تو ہم سب چونکہ سرکاری ملازم تھے، اس لیے ہمیں یہ موقع دیا گیا کہ تھا کہ ہم وہاں رہیں یا یہاں آئیں تو ہاں سے "آج کل" میں رہ کر پاکستان آنے کا فیصلہ کیا اور ان اساتذہ نے حمید احمد خاں صاحب اور رشید احمد صاحب نے پالی ٹیکنیک میں رہتے ہوئے، تو پھر ہم سب اپنے محکموں کی طرف سے یہاں آ گئے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: یہ بات بھی ذہن میں آتی تھی کہ "آج کل" سے آپ "ماہِ نو" میں کیا براہِ راست آ گئے؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، دیکھیے ناں، وہ تو سرکاری رسالہ تھا "آج کل" —— پبلی کیشنز ڈویژن انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے ہم ملازم تھے، تو سرکاری ملازموں سے، سب سے پوچھا گیا مسلمانوں سے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: آپشن، ایک طرح سے؟

سید وقار عظیم: آپشن، ہم نے آپٹ کیا پاکستان کے لیے، بلکہ پورے "آج کل" کے عملے نے پاکستان کے لیے آپٹ کیا

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: سید صاحب! آپ کی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی جس سے اس دور کے باشعور ادیب بے حد متاثر ہوئے۔ آپ نے کس حد تک اس تحریک کے اثرات قبول کئے؟

سید وقار عظیم: ہاں، جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا کہ وہ ایک لحاظ سے ادبی زندگی کا آغاز ہی ہے وہ، ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس یا کانفرنس، جس کی صدارت پریم چند نے کی، وہ ہوئی لکھنؤ میں، اس زمانے میں ہم میں اور احتشام حسین وہیں تھے، ابھی الٰہ آباد میں —— یہ بھی میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ یہاں جن لوگوں سے ملاقاتیں رہتی تھیں، ان میں پروفیسر احمد علی اور سجاد ظہیر پھر کنور محمد اشرف ایک صاحب تھے، بڑے مشہور، تو صرف ہم دو طالب علم تھے جو طالب علم کی حیثیت سے اس کانفرنس

میں شریک ہونے کے لیے یہاں سے گئے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: آپ اور احتشام صاحب؟ طالب علم نمائندے؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، نمائندے نہیں کہہ سکتے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: اپنے شوق سے۔

سید وقار عظیم: نہیں، خود انھوں نے بھی کہا سجاد ظہیر نے اور احمد علی نے کہ بھئی تم لوگوں کو ضرور چلنا ہے، تو ہم لوگ وہاں شریک ہوئے۔ اِس طرح ترقی پسند تحریک سے وابستگی پہلے دن ہی سے ہوئی اور وہ وابستگی رہی، برابر قائم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ پاکستان آنے کے بعد بھی قائم رہی ——— اسے ترکِ تعلق تو نہیں کہنا چاہیے لیکن دوری اس لیے پیدا ہو گئی کہ ترقی پسند تحریک میں سے بعض مصنفین نے اسے بالکل سیاسی جماعت سمجھ لیا، اور جن ادیبوں کے ہاں اُن سیاسی رجحانات کا عکس نہ ملے انہیں وہ ترقی پسندی کا جزو سمجھتے تھے، انھیں اپنی تحریک . . . . . تو اسی لیے وہ تعلق نہیں رہا، لیکن اس کے مقاصد سے، اس سے الگ ہو کر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق رہا قائم اور اب بھی ان مقاصد میں سے بعض ہیں، جنھیں میں سمجھتا ہوں کہ بہت اچھے ہیں اور مفید ہیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: یہاں ترقی پسند تحریک سے خواہ مخواہ حلقوں، چائے خانوں اور اس طرح کی دوسری بیٹھکوں اور مصروفیتوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ آپ اس طرح کی مصروفیت کو ادب کے حق میں کس حد تک مضر یا مفید سمجھتے ہیں؟

سید وقار عظیم: بات یہ ہے کہ جب تک میں لکھنؤ یا الٰہ آباد میں رہا، میں نے دیکھا کہ لکھنؤ اور الٰہ آباد میں حلقوں میں، ان چائے خانوں اور قہوہ خانوں میں جا کر جو بیٹھتے تھے، اُن میں سے بعض لوگ بڑے سنجیدہ تھے اپنے مسائل کے سلسلے میں اور وہاں جب بیٹھتے تھے تو انھیں سنجیدہ مسائل پر گفتگو کرتے تھے، بلکہ چائے خانوں اور قہوہ خانوں کو ایک مرکز سمجھتے تھے اجتماع کا، کہ اس بہانے سے وہاں لوگ جمع ہو جاتے تھے ——— اور وہاں بالعموم وہ اس مقصد سے ہرگز نہیں آتے تھے کہ ہم دوسروں کی تعریف کریں گے اور وہ ہماری تعریف ——— یا دوسرا، جسے ہم پسند نہیں کرتے اُس کی تنقیص ہوگی، ہم اس میں شریک ہو جائیں گے، بلکہ زندگی اور ادب کے رشتے سے جتنے مسائل ذہن میں اُبھرتے تھے اور جتنی تخلیقات سامنے آتی تھیں، اُن پر کھل کر وہاں گفتگو کی جاتی تھی ——— آگے چل کر پھر یہ ہوا کہ اس میں ذاتیات شامل ہو گئیں ——— اور وہ ذاتیات، ہندوستان میں تو میں نے نہیں دیکھا تقسیم کے بعد کیا ہوا، لیکن پاکستان بننے کے بعد یہاں چائے خانوں اور قہوہ خانوں میں جو کچھ دیکھا، یقیناً اسے دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ جو لوگ وہاں بیٹھتے ہیں، اُن کا وقت زیادہ ضائع ہوتا ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کو قطعاً کچھ سہارا نہیں ملتا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: اگرچہ بعض صورتوں میں وہ خود بہت ذہین اور بڑی توانائی اور بہت استعداد کے مالک ہوتے ہیں۔

سید وقار عظیم: یقیناً، بالکل ——— تو بعض لوگ ہیں، جاتے ہیں وہاں، اس طرح کی باتیں بھی کرتے ہیں مگر عام ماحول وہاں کا ایسا ہے کہ نوجوانوں کے لیے اور ایسے نوجوانوں کے لیے جن کا مطالعہ محدود ہے یا اونچ نیچ کا جن میں امتیاز نہیں، وہ پھر غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، بعض دفعہ مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ترقی کے اور نشوونما کے جو امکانات ہیں اُن میں، وہ یا تو محدود ہو

جاتے ہیں اور یا پھر غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں ۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: وقار صاحب! غالب کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ مجھے سب شاعروں اور نثر نگاروں سے زیادہ عزیز ہے۔ غالب صدی پر پنجاب یونیورسٹی (لاہور) شعبۂ اُردو میں کرسیٔ غالب (غالب چیئر) قائم ہوئی۔ پہلا غالب پروفیسرشپ آپ کو ملا۔ غالب صدی پر پاکستان اور ہندوستان میں جو کام ہوا، اُس کی تحقیقی اور تنقیدی اہمیت؟ جو کام ہوا اُس کے بارے میں آپ کی رائے؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، معین صاحب! اصل میں بات یہ ہے کہ غالب پر کام کا آغاز تو صحیح معنوں میں اُس وقت ہوا جب حالیؔ نے غالب پر کتاب لکھی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ۱۸۹۷ء میں "یادگارِ غالب"۔

سید وقار عظیم: تو پہلی مرتبہ صحیح فکر غالب کے سلسلے میں صحیح فکر کی رہنمائی حالیؔ نے کی اور جو مختلف طرح کی غلط فہمیاں تھیں غالب کے متعلق، حالیؔ نے انھیں رفع کیا۔ اس کے چھپنے کے بعد پھر گویا فکر کی نئی راہیں کھلیں، آپ کو معلوم ہے غالب پر جو چیزیں لکھی گئیں، اُس میں مدح سرائی کا وہ عالم ہے، عبدالرحمٰن بجنوری کے ہاں اور پھر بعض دفعہ تنقیص میں وہ مغربی تنقید کے اثر سے ڈاکٹر لطیف ہیں — لیکن کام ہوتا رہا برابر۔ اب یہ ہوا، خاص کر یہ میں نے محسوس کیا پاکستان بن جانے کے بعد، جس طرح دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے متعلق سنجیدہ کام کی کمی نظر آتی ہے، اسی طرح غالب پر بھی اکادکا مضامین تو لکھے جاتے رہے لیکن غالب کی صحیح طرح تدوین، غالب کو موجودہ حالات اور ان موجودہ حالات سے قطع نظر، پوری دنیا کا جو پس منظر ہے ادبی اور علمی، اُس کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی خواہش، یہ اُس وقت نمایاں ہوئی جب یہ ہوا کہ غالب کی صد سالہ برسی منائی جائے اور اس سلسلے میں پاکستان میں اور ہندوستان میں دونوں جگہ جو کام ہوا —— وہ اوّل تو اس اعتبار سے بڑا اہم اور قیمتی ہے کہ غالب کے مسودات، اُن کی کتابیں، اچھی طرح ایڈٹ ہو کر ہمارے سامنے آگئیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: غالب کا اصل سرمایہ

سید وقار عظیم: غالب کا اصل سرمایہ، دستیاب ہوا، سامنے آیا، اچھا پھر غالب کے بعض نسخوں کے متعلق باتیں تھیں، فلاں نسخہ ہے، فلاں لائبریری میں پڑا ہے، نسخۂ شیرانیؔ[1] ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: یہ معلومات، وہ چیزیں سامنے آگئیں۔

سید وقار عظیم: وہ سب کے سب۔ شاید یہ صد سالہ تقریب نہ منائی جاتی تو وہ کتابیں اتنی تیزی سے چھپ کر سامنے نہ آتیں —— پھر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جو ہمارا نیا نقاد ہے جس کا ایک خاص اندازِ فکر ہے تجزیاتی، اور تجزیاتی بھی اس مفہوم میں نہیں کہ ہم شخصیت کا اور مزاج کا تجزیہ کریں بلکہ وہ "سائیکو اینے لیسز" (PSYCHO - ANALYSIS) انداز

---

[1] دیوانِ غالب نسخۂ شیرانی، مطبوعہ مجلس ترقیِ ادب، لاہور، اگست ۱۹۶۹ء

گرانی میں جاتے ہیں۔ اس طرح پھر نئے ادیبوں نے، نئے شاعروں نے اور نئے نقادوں نے اس پر غور کرنا شرو
کیا تو یہ چیزیں تحقیقی نقطۂ نظر سے اور علمی نقطۂ نظر سے جو اُس وقت سامنے آئیں، وہ مستقل اضافہ ہیں، مَیں سمجھتا ہوں
ہمارے کتب خانوں کا —— لیکن وہ جو ایک اندازِ فکر اور کام کرنے کے جو نئے زاویے سُجھائے اس صدی نے وہ اہم چیز
ہے۔ آئندہ بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ نئی چیزیں آتی رہیں گی، چنانچہ مجنوں گورکھپوری کی جو کتاب آئی ہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: "غالب — شخص اور شاعر"[1]۔

سید وقار عظیم: یہ اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے کہ غالب پر کتاب نہ لکھتے مجنوں گورکھپوری، اگر اس طرح کا ماحول نہ ہو جاتا، اِس صدی میں، اور وہ اسی طرح آپ کی اور فرمان فتح پوری کی کتاب۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: "غالب اور انقلاب ستاون"[2] اور فرمان صاحب "غالب، شاعرِ امروز و فردا"[3]؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، تو یہ انہی محرکات کا نتیجہ ہے جو اس "صدی" کے ماحول نے پیدا کیے اور اسے پاکستان کا جہاں تک تعلق ہے، مَیں سمجھتا ہوں کہ ہمیں پروفیسر حمید احمد خاں کے احسان کو نہیں بھولنا چاہیے۔ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں جو کام ہوا ہے[4]، غالب کے جو اچھے ایڈیشن مرتب ہوئے، ان میں خاص کر دیوانِ غالب جو چھپا ہے، اس کی
بہت اچھے نسخوں میں اس کا شمار۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: اُردو دیوان، جسے مولانا حامد علی خاں نے مرتب کیا ہے۔

سید وقار عظیم: مولانا حامد علی خاں نے۔ پھر مجلسِ ترقیِ ادب (لاہور) سے جو نسخۂ شیرانی چھپا، پھر بیاضِ غالب والا کا نسخہ[5] اور وہ بھوپال کا نسخہ، نسخۂ حمیدیہ[6]، وہ نئے سرے سے مرتب ہو کر سامنے آیا۔ مجلسِ ترقیِ ادب، (لاہور) میں جو کام ہوا، اُس میں بھی پروفیسر حمید احمد خاں کی کوششوں کو دخل ہے۔ کراچی میں ادارۂ یادگا

---

[1] غالب — شخص اور شاعر، مطبوعہ: مکتبۂ اربابِ قلم، کراچی، ۱۹۷۴ء

[2] غالب اور انقلاب ستاون۔ طبعِ اول: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، جون ۱۹۷۴ء
طبعِ دوم: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، اگست ۱۹۷۶ء

[3] غالب، شاعرِ امروز و فردا، مطبوعہ، اظہار سنز، لاہور، ستمبر ۱۹۷۰ء

[4] یونیورسٹی کی جانب سے اٹھارہ، اُنیس چیزیں چھپیں جنھیں یونیورسٹی سے باہر کے اسکالرز میں سے مولانا غلام رسول مہر، مولانا حامد علی
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور یونیورسٹی سے متعلق اصحاب میں سے ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر سراج الدین، ڈاکٹر شکور احسن، وزیر الحسن عابدی، سید فیاض
سجاد باقر رضوی اور اقبال حسین نے تصنیف و تالیف کیا۔

[5] بیاضِ غالب مشمولہ: رسالہ "نقوش" غالب نمبر ۲، اکتوبر ۱۹۶۹ء، نیز محمد طفیل صاحب کے مرتبہ "نقوش" کے تین یادگار غالب نمبر۔

[6] نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، جولائی ۱۹۶۹ء

سید وقار عظیم : جی ہاں، پھر معین صاحب! جب میں نے بی ٹی کر لیا، تو ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کیا کروں کہ معلوم نہیں کہاں سے گھومتا پھرتا خواجہ غلام السیدین کا خط آیا میرے پاس۔ وہ میرے اُستاد تھے (بی۔ ٹی میں)، خط کا مضمون کچھ یہ کہ ڈاکٹر ذاکر حسین یورپ گئے تھے اور یورپ جاتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کر گئے تھے کہ ہمارے ہاں اُردو کے شعبے میں جگہ ہے۔ اگر وقار عظیم یہاں آنے پر آمادہ ہوں تو انھیں لایا جائے۔ — تو آپ اگر جامعہ جانا چاہتے ہیں تو وہاں یہ خط لے کر جائیے اور مجیب صاحب سے مل لیجیے۔

جس زمانے میں ہم بی ٹی میں پڑھتے تھے تو ہمیں جامعہ دکھانے کے لیے لے گئے تھے سیدین صاحب اور وہاں کا ماحول دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ صحیح علمی ماحول اور تعلیمی ماحول۔ — تو یوں جب سیدین صاحب کا یہ خط ملا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں پھر وہاں چلا گیا اور پڑھانا شروع کیا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : یہ کس زمانے کی بات ہے۔ کیا ۱۹۳۷ء کے فوراً بعد کی؟

سید وقار عظیم : جی، ۱۹۳۸ء کے سیشن میں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : تو مجیب صاحب کے علاوہ وہاں اور کن اصحاب سے آپ کا ربط؟

سید وقار عظیم : وہاں آپ کو معلوم ہے ذاکر صاحب اُس زمانے میں یورپ گئے ہوئے تھے جب میں وہاں گیا ہوا تھا۔ چند مہینے بعد واپس تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر عابد حسین وہاں تھے۔ اُن کی بیگم، صالحہ عابد حسین، مجیب صاحب سے بھی بہت قریبی تعلقات تھے لیکن زیادہ مراسم ڈاکٹر عابد حسین سے اور صالحہ عابد حسین سے، یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ صالحہ عابد حسین، جو عابد صاحب کی بیگم ہیں، سیدین صاحب کی سگی بہن ہیں۔ — تو میں چونکہ سیدین صاحب کے بھیجنے سے آیا تھا تو خود بخود عابد صاحب سے ایک قریبی سا تعلق پیدا ہوا اور پھر اُن کی شفقتوں نے اس تعلق کو اور مضبوط کر دیا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ابھی وقار صاحب! آپ نے فرمایا کہ جامعہ ملیہ (دہلی) کے ماحول کا آپ پر بہت اثر پڑا، واقعی یہ ایک خاص مزاج اور طرز کا ادارہ تھا۔ آپ نے جو اثرات قبول کیے اُس کی کچھ تفصیل آپ اس وقت . . . . .

سید وقار عظیم : معین صاحب! پہلے تو میں ذاکر صاحب کی ایک بات بتا دوں کہ جب میں چار سال یہاں رہ کر چلا گیا پالی ٹیکنیک میں اور وہ بھی ذاکر صاحب کے ایما پر گیا، تو ایک دن علی گڑھ کے اسٹیشن پر، ذاکر صاحب دہلی جا رہے تھے، انھیں پہنچانے سرور صاحب اور رشید احمد صدیقی آئے تھے۔ میں بھی اتفاق سے وہاں پہنچا تو ذاکر صاحب اُسی محبت سے ملے، جیسے بڑے ملتے ہیں چھوٹوں سے۔ اُنھوں نے سرور صاحب سے کہا کہ بھئی سرور صاحب جامعہ میں بہت سے اُستاد آئے اور آ کے چلے گئے، مگر وقار صاحب کے جانے کا ہمیں بڑا رنج ہے۔ اس پر رشید صاحب نے کوئی ہنسی کی بات کہی اور وجہ پوچھی تو ذاکر صاحب نے کہا، وجہ یہ کہ ہم جس مزاج کا استاد چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں آئے، وقار صاحب وہ مزاج لے کر خود آئے تھے، یہاں آ کر انھیں اپنا مزاج بدلنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ کچھ یہ، اور جامعہ کے ماحول کو پسند کرنے کی اصل وجہ وہاں کی ایک خاص طرح کی سادگی اور شائستگی — اور سادگی کا جو معیار جامعہ میں میں نے دیکھا، اگر انسان طرح طرح کے تکلفات کو ایک طرف رکھے اور جامعہ میں

جس طرح کی سادگی برتی جاتی تھی اُسے ایک طرف تو میں سمجھتا ہوں کہ تکلفات کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں اس کے سامنے۔ اِس لیے کہ اس سادگی میں ایک صفائی، شستگی اور تہذیبی عنصر، سب چیزیں . . . .

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: اور رکھ رکھاؤ،

سید وقار عظیم: جی، رکھ رکھاؤ لباس میں، بات کرنے میں، رہنے سہنے میں۔ آپ کسی کے گھر جائیں چھوٹا سا گھر ہوگا۔ اس میں فرنیچر بالکل نہیں ہوگا لیکن اتنا صاف ستھرا کہ جی چاہتا ہے آدمی کا کہ اس گھر میں رہے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ایک اپنائیت کی فضا۔

سید وقار عظیم: ہاں، یگانگت۔ اب ایک واقعہ سناؤں، مثلاً اس طرح کا جب میں شروع شروع میں پہنچا تو تنخواہ وہاں کم تھی اسّی روپے زیادہ سے زیادہ تنخواہ تھی، جو ذاکر صاحب کی تنخواہ تھی اور عابد صاحب کی، میں اور مجیب صاحب ساٹھ روپے لیتے تھے اور اس زمانے میں کچھ مالی بحران تھا تو دو تہائی تنخواہ ملا کرتی تھی یعنی ساٹھ روپے والے کو چالیس روپے ملتے تھے — جب میں دہلی پہنچا، صبح کا وقت تھا۔ مجیب صاحب ناشتہ کر رہے تھے۔ ناشتے میں شریک کیا اور پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ کی شادی ہو چکی؟ میں نے کہا جی ہاں ہو چکی۔ کہنے لگے تو کب ہوئی شادی؟ میں نے بتایا۔ کہا، پھر تو آپ کی بیگم صاحبہ کا یہاں آ کر رہنا ضروری ہے ورنہ تنہائی میں آپ یکسوئی سے کام نہیں کر سکیں گے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ پہلے گھر دیکھیں آپ کے لیے۔ مجیب صاحب مجھے لے کر قرول باغ گئے، ایک محلّہ ہے تین گھر دیکھے۔ ایک بارہ روپے کرائے کا تھا، ایک پچیس روپے اور ایک چالیس روپے۔ بارہ روپے والا تو واقعی وہ ایسا تھا کہ خیال ہوتا تھا کہ اس میں رہیں گے تو تکلیف ہوگی۔ پچیس والا، پچیس روپے والا، میں نے کہا . . .

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: پچیس روپے کرائے والا پسند کر لیا آپ نے۔؟

سید وقار عظیم: جی، تو مجیب صاحب نے کچھ میری وضع قطع سے، کپڑوں سے، باتوں سے، اندازہ لگایا کہ نہیں، یہ گھر آپ کے لئے موزوں نہیں۔ آپ وہ گھر چالیس روپے والا . . . . اب میں بڑا گھبرایا کہ چالیس روپے تنخواہ ہے اور یہ مشورہ دے رہے ہیں، کہنے لگے بس توکل پر آپ یہ گھر لے لیں۔ چنانچہ وہ چالیس روپے والا گھر لیا اور میں اپنی بیوی کو وہاں لے آیا اور کبھی وہ چالیس روپے والا گھر لینے کے بعد اس کا افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے کیوں اتنا مہنگا گھر لے لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایک ایسی برادری تھی وہ کہ ہر دوسرے آدمی کے دکھ کو تیسرا آدمی جو تھا، اپنا دکھ سمجھتا تھا اور اسی طرح شریک رہتے تھے چھوٹے چھوٹے اور بڑے بڑے غموں میں، خوشیوں میں کہ آدمی تکلیف میں بھی رہتا تھا تو اُسے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اوّل تو سادگی سے زندگی بسر کرنے کے لئے اِتنے سامان تھے خاص کر لکھنے پڑھنے والے کے لیے کہ مجھے وہ وقت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ پھر چھوٹے بڑے کا خیال — ایک واقعہ میں آپ کو سناؤں۔ ایک چھوٹی سی گاڑی تھی آسٹن کار، جو ضرورت کے وقت اُستادوں کو کرائے پر مل جاتی تھی۔ اسے ہی ذاکر صاحب بھی استعمال کرتے تھے اور باقی اُستاد بھی۔ ایک دن، نئی نئی میری شادی ہوئی تھی، خیال ہوا کہ ہم کار لیں اور بیوی کو کہیں گھمانے لے چلیں تو کار

کے لیے میں نے لکھ دیا اور میرے لیے مخصوص ہو گئی۔ شام کو ڈرائیور گاڑی لے کے آیا، بیچارہ ہندو تھا، اس کا انتقال ہو گیا وہ ہمیں لے کے چلا تو کہنے لگا وقار صاحب آج گاڑی ذاکر صاحب نے بھی مانگی تھی، لیکن آپ کو مل گئی۔ میں نے کہا تو بھئی پھر اُن کو ملنی چاہیے تھی۔ کہنے لگا کہ نہیں، ذاکر صاحب نے مانگی تھی، لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ آپ نے مانگ رکھی ہے تو انھوں نے کہا کہ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا، وقار صاحب نے مانگ رکھی ہے تو گاڑی انھیں کو ملنی چاہیے، تو اِس طرح ......

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: یہ قدروں کا احساس۔

سید وقار عظیم: آپ اندازہ لگائیے کہ وہ شخص جو صدر ہوا ہندوستان کا، وہ زندگی کی، جو روزانہ کی سطح ہے، اُس پر لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا تھا — اور ایسے بےشمار واقعات ہیں، تو وہاں رہ کر جو یگانگت کا احساس، کام کا شوق، کام کی لگن اور کام پر اپنے آپ کو مٹا دینے کی ایک خواہش جو آدمی میں پیدا ہوتی ہے، اُسے میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی ----

سید وقار عظیم: بالکل، ہر کام۔ مثلاً طالب علموں کو اپنے کمروں کی صفائی، اپنے مطبخ کا انتظام، مطبخ میں کھانا کھلانے کا اہتمام اور اُن کی انجمنیں تھیں مختلف، اُن کے سارے انتظامات، سب طالب علم اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن / ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: خوش دلی سے؟ کوئی عار؟

سید وقار عظیم: قطعاً عار کا کوئی سوال ہی نہیں۔ جلسے ہوتے تھے، اُس میں اُستاد شاگرد مل کر سب میزیں کرسیاں اُٹھا کے رکھ رہے ہیں، فرش بچھا رہے ہیں اور کام کرنے والا کوئی، یہ نہیں سمجھتا تھا کہ میں بڑا ہوں، اس لیے مجھے یہ کام نہیں کرنا چاہیے اور چھوٹا یہ سمجھ کے کام نہیں کرتا تھا کہ میں چھوٹا ہوں، تو یہ بڑا کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ کام کرنا ہے اور پورا جی لگا کے کرنا ہے اور جو کام کر رہے ہیں، اُسے مقصد سمجھ کے۔ وہ حالی کا کہ جب کوئی کام کرنا شروع کرے تو آدمی یہ سمجھے کہ ایک جاودانی ہے ہماری زندگی کی۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: سید صاحب! آپ کی ملازمت کا آغاز شعبۂ تعلیم سے ہوا، جامعہ ملیہ اور ...

سید وقار عظیم: جی ہاں پہلے تو گویا الہ آباد یونیورسٹی کی ملازمت، مختصر۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: جی جی! اور آخری دور میں بھی آپ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے متعلق رہے۔

سید وقار عظیم: جی، بجا ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: اس سے پہلے پنجاب یونیورسٹی میں آنے سے پہلے ادبی صحافت سے آپ کا عملی تعلق رہا اور اس میدان میں بھی آپ نے ممتاز مقام حاصل کیا، بڑی خدمت کی۔ آپ کے زمانے میں ان پرچوں کا "ماہِ نو" اور "آج کل" کا بڑا اونچا معیار تھا اور پھر اس کے بعد صحافت کے پیشے کو خیرباد کہہ دیا، تو اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا آپ اس سے غیر مطمئن تھے؟ یا اور کوئی بات تھی؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، اگر میں یہ کہوں کہ "غیر مطمئن" تھا تو وہ بھی غلط نہیں ہوگا، اِس لیے کہ "آج کل" اور "ماہِ نو" دونوں سرکاری پرچے تھے، آپ کو معلوم ہے، تو سرکاری پرچوں میں جو کام مُدیر کی حیثیت سے کرنا پڑتا ہے (مضامین جمع کرنا، ان کی ترتیب،

ن کی اصلاح، ادیبوں کو خط، ان سے ملاقاتیں۔ اُس کے علاوہ سرکاری جو چیز بھی ہوگی، اُس میں پھر وہ جسے آپ "لال فیتہ" کہتے ہیں، اُس کی وجہ سے مصروفیت دفتر میں غیر ضروری وقت . . . . اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک میں "آج کل" میں اور "ماہِ نو" میں رہا۔ میرے ادبی کاموں کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا، تو جہاں بعض خوشی کے پہلو تھے، وہاں ایک بڑا نقصان یہ بھی تھا کہ میرے ادبی کام، ایک دم سے معطّل ہوگئے ـــــ اب (یہاں خود ایک سوال) کہ یہ احساس مجھے پہلے کیوں نہیں ہوا اور میں کیوں "آج کل" میں؟ اور یہ بھی ابھی شاید میں نے نہیں بتایا کہ جامعہ ملیہ سے میں آیا پالی ٹیکنیک میں تو اگر جامعہ ملیہ میں اتنی زیادہ خوبیاں تھیں تو میں جامعہ ملیہ چھوڑ کے وہاں کیوں آگیا؟

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: جی ہاں، اس کا تذکرہ نہیں ہوا، ابھی۔

سید وقار عظیم: جی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں سرکار میں سرجان سارجنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر تھے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے اتنے مدّاح تھے کہ میں اگر یہ کہوں کہ وہ مُرید تھے اُن کے، تو بجا ہوگا۔ انہوں نے جب یہ پالی ٹیکنیک کھولا، سرجان سارجنٹ نے ایک خاص مقصد سے، تو ذاکر صاحب سے کہا کہ ہمیں اُردو کا ایک آدمی چاہیے۔ سارجنٹ صاحب نے جب اُردو کے آدمی کا نام لیا تو ذاکر صاحب نے فوراً یہ طے کر لیا کہ مجھے وہاں جانا چاہیے اور اپنے اس فیصلے سے ایک دن مجھے آ کے آگاہ کیا کہ بھئی ہم شرمندہ ہیں، سارجنٹ صاحب سے یہ وعدہ کر آئے ہیں، آپ کو وہاں جانا ہے اور اب رختِ سفر باندھیے۔ چنانچہ میں، اُن کے کہنے سے وہاں چلا گیا اور پھر چار سال وہاں رہا۔ اُس زمانے میں اُستادوں کے جو گریڈ تھے تنخواہوں کے وہ اچھے نہیں تھے، آپ کو معلوم ہے، تو جو تنخواہ مجھے پالی ٹیکنیک میں مل رہی تھی، "آج کل" کے لئے اُس سے تین گنی تنخواہ کی پیش کش ہوئی ـــــ وہ ہوا یہ کہ "آج کل" میں میرے ایک دوست جو پہلے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، انھیں اس شرط پر ترقی مل رہی تھی کہ وہ اپنا بدل دیں کوئی۔ وہ مجھ سے واقف تھے۔ میں "آج کل" میں ریویو وغیرہ لکھا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ میں نے کہا کہ میں سرکاری ملازم ہوں، درخواست نہیں دے سکتا، تو انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں، آپ درخواست نہ دیں، صرف انٹرویو دے دیں۔ آپ لے لئے جائیں گے تو استعفیٰ دے کر یہاں آجائیے گا۔ چنانچہ یہی ہوا، انٹرویو ہوا، اُس میں مجھے لے لیا گیا اور تنخواہ میں سمجھیے کہ وہاں اگر ڈیڑھ سو دیتے تھے تو یہاں ساڑھے چار سو روپے، اتنا فرق . . . .

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: یہ تو بہت فرق تھا، نمایاں فرق۔

سید وقار عظیم: تو یہ ایسا نمایاں فرق تھا کہ میں نے کچھ نہیں سوچا اور میں "آج کل" میں آگیا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: یہاں ایک ضمنی بات ذہن میں اُبھرتی ہے کہ ذاکر صاحب آپ کے بہت مدّاح تھے۔ بہت محبت اور شفقت، انہوں نے جامعہ سے پالی ٹیکنیک کے لئے آپ کا نام تجویز کیا تو ایک طرح سے ایثار سے کام لیا، اپنے ادارے کے حوالے سے، کہ آپ جامعہ سے . . . . .

سید وقار عظیم: بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب کی شخصیت سے جو واقف ہیں، اس میں بڑا پھیلاؤ تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ جو تعلیمی کام وہ

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : ادارے کی خدمات کے بارے میں کچھ ؟

سید وقار عظیم : ادارے کے قیام کا اصل مقصد یہی تھا کہ ہم اصطلاحات بنائیں سائنس کی اور آرٹس کی ۔ تو ہم نے پہلے طبعیات کو اور معاشیات ، ان دو مضامین کو منتخب کیا ۔ پھر مرکزی اُردو بورڈ (لاہور) جب بن گیا تو سائنس کی اصطلاحات کا کام اُنہوں نے اپنے ذمے لے لیا جسٹس ڈاکٹر ایس ۔ اے رحمٰن صاحب جو مرکزی اُردو بورڈ کے بھی چیئرمین تھے اور ہمارے ادارے کے بھی تو انہوں نے کہا کہ بھئی آپ نے سائنس کا جو کام کیا ہے وہ مرکزی اُردو بورڈ کو بھیج دیجیے اور آپ صرف آرٹس کا کیجیے — تو پھر ہم نے معاشیات ، سیاسیات ، فلسفے اور نفسیات کی اصطلاحیں کیں اور وہ کتابی شکل میں چھپیں ۔ کچھ اور مضامین کی اصطلاحیں بھی تھیں ، جو کتابی شکل میں نہیں چھپ سکیں ۔ لیکن اس سے یہ ہُوا کہ ایک تحریک پیدا ہوئی پوری یونیورسٹی میں اور میں نے یہ دیکھا کہ میرے وہاں ہوتے ہوئے بہت سے شعبوں میں ایم اے کے جو مقالے ، پہلے کسی جھجک کی وجہ سے اُردو میں نہیں لکھتے تھے لوگ ، اب وہ مقالے انہوں نے اُردو میں لکھنا شروع کر دیئے — وہ ادارے میں ہمارے پاس آتے تھے کہ ہمیں فلاں اصطلاح کا ترجمہ چاہیے ، ہم مہیا کرتے تھے ، تو اس ادارے سے اُردو میں لکھنے کی ایک تحریک پوری یونیورسٹی میں عام ہوئی ۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : کب تک آپ اِس ادارے میں رہے ؟

سید وقار عظیم : بیس ستمبر ۱۹۷۰ء میں میں فارغ ہوا ہوں یونیورسٹی کی ملازمت سے ۔ اسی وقت ادارے سے بھی علاحدگی ہوئی ۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : اس دور میں خوب کام ہوا ، جب تک آپ اِس ادارے میں رہے ، تھوڑے سے عرصے میں بڑی تیزی سے بڑی ترقی ہوئی ۔ اب ایک تعطّل سا طاری ہے ۔

سید وقار عظیم : نہیں وہ تعطّل ، میرا خیال یہ ہے کہ اُسے تعطّل تو نہیں کہنا چاہیے ۔ کام کا رُخ البتہ بدل گیا ۔ ادارہ اصل میں قائم ہوا تھا اس لیے کہ جتنی اصطلاحات بھی ہم کر سکیں مختلف مضامین کی ، وہ بہتر ہے ——— پھر اچھا یہ بات کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب آج کل اس کے سربراہ ہیں ۔ اُن کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ سائنس کی کتابیں اُردو میں آئیں اور غلط یا صحیح سے قطع نظر اُردو میں چھپ جائے کوئی کتاب — تو اُنہوں نے پھر کام کا رُخ گویا بدل دیا ۔ کتابوں کا لکھنا چونکہ آسان نہیں ہوتا ، ان کے مُرتب کرنے میں بھی وقت لگتا ہے ، خرچ بھی ہوتا ہے اور اُس خرچ کا ادارہ متحمل نہیں ہو سکتا ، تو اس لیے غالباً کام کی وہ رفتار قائم نہیں رہ سکی ۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : سید صاحب ! کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ تدریسی کام سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی آپ اس ادارے سے متعلق رہتے ، کچھ خدمات انجام دیتے ؟

سید وقار عظیم : میری خواہش تو تھی ، لیکن شاید بعض انتظامی مجبوریاں اور گویا بعض مصلحتیں ، وہ تعلّق ختم ہو گیا ۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : انتظامی مجبوریاں ؟ معاشی ، مالی مجبوری کیا یونیورسٹی کی ؟

سید وقار عظیم : [illegible]

روپے مہینے کا — تو مجھے چونکہ اس کام سے شغف تھا، مجھے ستمبر ۱۹۷۰ء میں فارغ ہونا تھا، میں نے اس سے دو تین مہینے پہلے خط لکھا کہ ادارہ چونکہ میں نے یہ قائم کیا، اس کام سے مجھے دل چسپی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اب بھی اس سے متعلق رہوں اور پیش کش میری یہ ہے کہ الاؤنس اب میں نہیں لیا کروں گا۔ مجھے تو اتنی دل چسپی تھی لیکن شاید کسی وجہ سے وہ (یونیورسٹی والے) سمجھتے تھے یہ کہ ایک نظیر قائم ہو جائے گی کہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے والا آدمی یونیورسٹی کے کسی اور شعبے میں کام کر رہا ہے۔ میں تفصیل اس کی کچھ زیادہ نہیں جانتا، سنا میں نے یہی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ایسی نظیر پہلے بھی رہی شاید؟

سید وقار عظیم : ہاں، وہ شاید — ہیں، مثلاً ایک ڈاکٹر سید عبداللہ کی ہے، لیکن انھیں تو ایک کل وقتی ملازمت وہاں ملی ہوئی ہے اور ایک معاہدے کے تحت وہ وہاں کام کر رہے ہیں۔ مختلف سی صورت بہر حال تفصیلات میں کیا جاؤں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : وقار عظیم صاحب! آپ ہی کا نقطۂ نظر ہے کہ آدمی کے لئے آدمی کی پرکھ سے زیادہ مشکل اور دشوار کام شاید کوئی نہیں کہ وہ جتنا باہر سے نظر آتا ہے، اُس سے بھی زیادہ اندر چھپا ہوتا ہے۔ اُس کے چھپے ہوئے حصے کو دیکھنے اور اس کا پورا بھید جاننے کے لیے آپ کا احساس ہے اور بالکل بجا ہے کہ، دیکھنے والے کو ظاہری آنکھ سے کہیں زیادہ دل کی آنکھ اور بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے — آپ کو خدا تعالیٰ نے یہ بصیرت بدرجۂ وافر عطا کی ہے — اس احساس سے میں یونیورسٹی کے آپ کے بیس برس کے جو رفقا تھے اُن کے بارے میں اور تلامذہ کے بارے میں کچھ جاننا چاہوں گا کہ آپ کن کا خاص طور پر ذکر کرنا پسند کریں گے، اس وقت — ؟

سید وقار عظیم : بڑا مشکل سوال ہے معین صاحب! چونکہ میں جب پچھلے بیس برس کی مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو بے شمار نقش ہیں جو ابھرتے ہیں، سامنے آتے ہیں — اور ان کے ساتھ واقعات کا ایک سلسلہ ہے لامتناہی — تو میرے لیے امتیاز کرنا بے حد دشوار ہے اور امتیاز کر کے پھر بعض نام لینا، یہ بات شاید میرے بعض عزیزوں کی آزردگی کا باعث بھی ہو — لیکن یہ ضرور کہتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ فہرست بہت چھوٹی نہیں، خاصی طویل ہے اور اس طویل فہرست میں جو لوگ کہ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد بھی مجھ سے ملتے رہے اپنے کاموں کے سلسلے میں، یا بے غرض، ذاتی تعلقات کو اسی سطح پر قائم رکھنے کے لئے، ظاہر ہے کہ اُن کا خیال پھر زیادہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ بعض شاگرد ایسے ہیں اور بعض عزیز کہ جو قریب ہیں اور اُن سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملتا ہے مثلاً اسلامیہ کالج میں کئی لیکچرار، جتنی اُستانیاں ہیں اُردو کی، سب شاگرد ہیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : اسلامیہ کالج برائے خواتین، کوپر روڈ۔ لاہور ؟

سید وقار عظیم : اب تو وہ بھی سرکاری ہو گیا کالج — تو اس میں رضیہ حسینی ایک ہیں، بڑی پرانی شاگرد، الطاف فاطمہ ہیں ہماری شاگرد، نئی شاگردوں میں زہرا معین ہیں، پھر وہ عظمیٰ ہیں، یعنی میں نام لے رہا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہی نام یاد آ رہے ہیں — محسنہ ہیں، بہت پرانی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : محسنہ قریشی۔

سید وقار عظیم : جتنا سوچتا ہوں نام یاد آتے چلے جاتے ہیں اور میرے لئے امتیاز واقعی بڑا مشکل ہے، ان میں سے کسے — اور اسی طرح رفقار کے معاملے میں، جن رفقا، نے مجھے گویا بھائیوں کی طرح عزیز رکھا اور ہمیشہ مجھے بڑا بھائی سمجھ کر میرے ساتھ سلوک کیا — ان میں آپ اور صدیقی صاحب یہاں موجود ہیں، نہ ہوتے جب بھی آپ کا نام سرفہرست ہوتا۔ پھر ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ہیں ڈاکٹر عبید اللہ خاں ہیں، اسی طرح سجاد باقر رضوی ہیں، سہیل احمد خاں ہیں — اور آپ نام لیں کچھ ؛

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : طاہر فاروقی صاحب، مشرف انصاری صاحب، ڈاکٹر عبادت بریلوی ...

سید وقار عظیم : جی، یہ لوگ — اور باقی بعض اساتذہ ایسے ہیں کہ بعض مفادات کے تصادم ہوتے ہیں، ان سے خلشیں پیدا ہوتی ہیں لیکن میں تو جتنے میرے پرانے ساتھی ہیں، اس سے قطع نظر کہ اُن سے بعض اختلافات پیدا ہوگئے، اُن سب کو، اُس پرانی رفاقت کی بنا پر اب بھی عزیز رکھتا ہوں اور اگر یہ جو دُنیا کے بکھیڑے ہیں اور مفادات کا جو قصہ ہے، یہ درمیان میں نہ رہے اور ہم اسی طرح ایک دوسرے کو ہم آغوش کر سکیں تو یہ زندگی کی سب سے بڑی راحت ہے، میں سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : آپ کو اور آپ کی نسل کے بیشتر اساتذہ کو اپنے شاگردوں کی نگاہ میں بڑی عزت و احترام کا جو مقام حاصل تھا، وہ غالباً آج کے اساتذہ کو نصیب نہیں اس درجے کے اس اُفتاد کا سبب آپ کے نزدیک کیا ہے؟

سید وقار عظیم : ایک تو صدیقی صاحب زمانہ — اب جن مصائب میں مبتلا ہے آج کل کا اُستاد، اور مصائب دنیوی، جن سے ہم آپ سب دو چار ہیں اور معاشی مسئلہ سب سے زیادہ، پھر ذاتی حالات، تو اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے کام سے اُسے وہ شغف باقی نہیں رہا جو پہلے کے اُستاد کو تھا۔ شاگرد اور اُستاد کے رشتے میں بنیادی بات یہ ہے کہ شاگرد یہ محسوس کرے کہ ہر لمحہ میرا جو اُستاد کے ساتھ گزرتا ہے، وہ بڑا قیمتی ہے اور میں اس سے کچھ سیکھ رہا ہوں — اوّل تو طالب علموں میں علم کے سیکھنے کا وہ شوق نہیں کہ وہ اُن لمحوں کی قدر کر سکے جو اُستاد کے ساتھ گزرتے ہیں — پھر اُستاد کی صورت بھی یہ ہو گئی ہے کہ وہ شوق اور انہماک سے علمی تعلق اپنے شاگرد کے ساتھ قائم نہیں رکھتا — ایک وجہ تو بدیہی یہ — اور دوسرے اُستاد اور شاگرد کے رشتے کے بارے میں میرا اپنا ایک تصور ہے اور اس تصور کو میرے اُستادوں کی صحبت اور تعلیم کی برکت کہنا چاہیے کہ اُستاد، صحیح معنوں میں وہ اُستاد ہے جو طالب علم کی تعلیمی زندگی سے الگ ہٹ کر اُس کی نجی زندگی میں بھی اسی طرح شریک ہو جیسے اس کی علمی اور ادبی زندگی میں ہوتا ہے — اور نجی زندگی میں شامل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اُستاد کو شاگرد کے دکھ درد کا علم ہو اور علم کے بعد وہ اسے اُسی طرح دُور کرنے کی کوشش کرے، جیسے اپنا دکھ درد دور کرنا چاہتا ہے اور اس بات کا اندازہ ہو طالب علم اور شاگرد کو کہ یہاں رہ کر میں جب پڑھ رہا ہوں اور علم حاصل کر رہا ہوں اور ایک شخص علمی حیثیت سے میرا رفیق اور رہنما ہے تو زندگی کے اور معاملات بھی جب کبھی اُلجھیں گے تو انھیں سلجھانے والا یہاں موجود ہے، تو وہ رشتہ مضبوط ہوتا ہے، لیکن اُسے زیادہ مضبوط اور استوار کرنے کے لیے، وہ ذاتی سطح ضروری ہے — تو وہ ذاتی سطح کو [illegible] طالب علم [illegible] کے ساتھ قائم رکھ، ہمیشہ اور [illegible]

کارگزاری نہیں۔ جن اُستادوں سے پڑھا، اِن سے یہی بات سیکھی کہ وہ قدم قدم پر ہمارے رفیق تھے، ہمارے جذبات اور احساسات کے رفیق تھے اور ہماری خوشیوں میں اور ہمارے غموں میں اس طرح شریک ہوتے تھے جیسے ہمارے عزیز — اور قدم قدم پہ ان ساری چیزوں میں ہماری رہنمائی کرتے تھے — تو جو کچھ ہم نے سیکھا ہے، اس کے علاوہ زندگی کو برتنے کا جو سلیقہ آدمی اپناتا ہے، وہ بھی ان استادوں کا طفیل ہے — تو اگر میرے شاگردوں کو یہ احساس ہے کہ میں نے اُن کی زندگیوں میں وہ دلچسپی لی جو عام طور سے اُستاد نہیں لیتے تو اس پر بھی میں اپنے اُستادوں کا اور اُن کی شفقت کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے یہ مزاج دیا کہ ہم شاگردوں کو اپنے سینے سے لگائیں اور اُن کی زندگی میں قدم قدم پہ انھیں یہ محسوس ہونے دیں کہ ہم اُن کے ہیں اور کالج سے رُخصت ہونے کے بعد بھی ہمیشہ اُن کے رہیں گے۔

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن: وقار صاحب! تحریکِ پاکستان کا جس زمانے میں شور تھا، علی گڑھ کے طلباء نے یہاں لاہور میں اسلامیہ کالج کے طلباء نے بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا۔ آپ اُس زمانے میں ایک بہت ہی حسّاس مرکز، یعنی دہلی میں تشریف رکھتے تھے۔ اِس تحریک میں عملاً آپ کے طلباء کا کچھ حصّہ یا آپ کا دخل کسی طرح کا؟

سید وقار عظیم: بات یہ ہے مُعین صاحب کہ استاد کی حیثیت سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ طالب علموں کے حق میں یہ بات اچھی نہیں ہوتی کہ اُستاد برملا کسی تحریک میں سامنے آجائے۔ اُستاد کا اس سے زیادہ کام یہ ہے کہ وہ ذہنوں کی تربیت کرے۔ تو جو کچھ اِس تحریک کے متعلق ہمارے جذبات اور احساسات تھے، وہ جماعتوں میں سبق کے دوران میں، جہاں اس کا امکان ہوتا تھا کہ وہ بات بتائی جا سکے، اور عام زندگی میں بھی ہم یہ کوشش کرتے تھے کہ تحریک کے ساتھ اُن کی جو وابستگی ہے وہ کسی سوچ کی بناء پر ہو۔ محض جذباتی وابستگی، اسے گویا میں نے ہمیشہ بُرا سمجھا۔ جذباتی وابستگی جو سوچ کے بعد پیدا ہو اور فکر کے بعد اور منطقی تجزیے کے بعد، وہ مستحکم بھی ہوتی ہے اور مُفید بھی — تو یہ خرابی، کوشش یہ رہی کہ ہم اپنے طالب علموں میں پیدا نہ ہونے دیں اور خُدا کا شکر ہے کہ اکثر صورتوں میں اس میں کامیابی ہوئی۔

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن: وقار صاحب، ریڈیو کا آغاز ہُوا جس زمانے میں، دہلی میں پہلا براڈکاسٹنگ اسٹیشن قائم ہُوا، آپ وہیں تشریف رکھتے تھے اور ابھی گفتگو میں آپ نے بتایا کہ ریڈیو سے تبصروں کا سلسلہ جاری رہا آپ کا، تو نشریات سے آپ کا تعلق کب سے ہے اور اب اس کی نوعیت؟

سیّد وقار عظیم: بس جب جامعہ میں آیا، تین چار مہینے ہوئے تھے تو ایک دن مُجیب صاحب نے جو ریڈیو کی ایک طرح کی انتظامیہ کمیٹی میں تھے، مُجھ سے کہا کہ بھئی اب کے جو اگلا تبصرہ ہوگا، کتابوں کا، وہ آپ سے لیں گے ریڈیو والے آ کے، اور آپ کر دیجیے گا۔ بڑی میرے لیے خوشی کی بات تھی — ریڈیو پر جب سُنتے تھے آوازیں تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا، گوّیا بھی بڑا آدمی ہے — تو وہ ۲۹–۱۹۲۸ء میں کتابوں کے تبصرے شروع ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک وہ برابر جاری رہے۔ یہاں ایک بات کا میں بڑے فخر کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ دو تبصرہ نگار تھے تقریباً سات آٹھ سال کی مُدت میں، ایک مرزا محمد سعید صاحب کہ وہ اُستاد الاساتذہ ...

غالب[1] اور انجمن کا کام[2] —— اسی طرح ہندوستان میں جو کام ہوا ہے، جن افراد نے اس میں دلچسپی لی اُن کے علاوہ، خود حکومت نے وہاں جس طرح سے تعاون کیا، اس سارے کام میں، اُسے اپنا سمجھ کے کیا، علمی نقطۂ نظر سے اُس کی قدر کرنی چاہیے اور سیاسی اعتبار سے اسے خواہ کچھ بھی کہیں —— اچھا، پھر ایک اور بات ہوئی کہ ایران اور افغانستان تک تو شاید غالب کا نام تھا، پھر دوسرے اسلامی ممالک میں مصر میں، ترکیہ میں، اب ایران سے اور ایشیا سے باہر نکل کے امریکہ میں اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں، انگلستان میں، جرمنی میں —— اور امریکہ میں آپ کو معلوم ہے کتنے ترجمے ہوئے، پھر بعض محقق ایسے ہیں مغرب کے جنہوں نے خاص طور سے غالب کو اپنا موضوع بنایا اور اب بھی وہ غالب پر کام کر رہے ہیں[3]

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: وقار صاحب! ایک موقع پر آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ "اتفاقات اور حادثات نے غالب کو مجھ سے چھین لیا —" اور اس غم کو آپ نے اپنی زندگی کا بہت بڑا غم بتایا ہے تو آپ کا یہ اظہار کیا اس احساس کا نتیجہ ہے کہ غالب پر آپ کوئی مستقل کام نہیں کر سکے؟ یا کوئی اور بات؟

سید وقار عظیم: جی ہاں، یقیناً، دیکھیے ناں، غالب سے تعلق جس کا ذکر میں نے کیا، ابتدائی تعلیم، اسکول کے زمانے ہی میں ہوا اور پھر جب بی اے اور ایم - اے کی تعلیم حاصل کی اُس وقت بھی —— تو، جی یہ ضرور چاہتا رہا کہ غالب پر کوئی ایسی چیز لکھی جائے جس سے میری تشفی ہو۔ اکادکا مضامین، کبھی خطوں پہ لکھ دیا، کبھی اس کی تنقید پر لکھ دیا، کبھی غزلوں پہ لکھ دیا، کبھی کوئی تقریر کر دی، اسے میں بڑی ناحق شناسی کہتا ہوں اور یہ بڑی حق تلفی ہے غالب کی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: آپ کی اپنی نمائندگی بھی نہیں ہوتی۔

سید وقار عظیم: جی، یقیناً نہیں۔ غالب کی نثر اور نظم دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ انھیں اگر آدمی اپنی زندگی کا سرمایہ نہیں سمجھتا اردو اور فارسی جاننے والا، اور اُسے یہ احساس نہیں ہے کہ وہ بڑا عظیم سرمایہ ہے تو وہ ایک بہت بڑی دولت سے محروم ہے —— تو مجھے گویا اُسی محروم کا احساس ہے، جس نے یہ بات مجھ سے کہلوائی۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: غالب پر کسی مستقل تصنیف کا اب کوئی منصوبہ آپ کے پیشِ نظر ہے؟

سید وقار عظیم: اب شاید حالات اِس طرح کے نہیں ہیں کہ میں غالب پر جم کے کوئی کام کر سکوں، اس لیے کہ میرے بعض اور

---

[1] ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی (مہتمم: مرزا ظفر الحسن صاحب) نے منجملہ امورِ دیگر غالب کے بارے میں پروفیسر کرّار حسین، پیر حسام الدین راشدی، محمد عمر مہاجر، عبدالرؤف عروج، مسلم ضیائی، ابن حسن قیصر، سحر انصاری کی قابلِ قدر کتابیں شائع کیں۔ غالب کے تعارف میں بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو وغیرہ زبانوں میں پروفیسر کرّار حسین کی کتاب کے تراجم بھی شائع کیے گئے۔

[2] انجمن ترقیِ اردو، پاکستان، کراچی نے اپنے رسالہ "اردو" اور "قومی زبان" کے بہت اہم غالب نمبر شائع کیے۔ "اردو" کے مضامین کا انتخاب شائع کیا، نیز ڈاکٹر شوکت سبزواری اور پروفیسر ممتاز حسین کی تصنیفات اور سید قدرت نقوی کے مرتبات۔

[3] خصوصیت سے پروفیسر ڈاکٹر رالف رسل، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز، لندن۔

منصوبے ہیں چھوٹے چھوٹے جن کی میں چاہتا ہوں کہ تکمیل ہو جائے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں فکشن کے ساتھ ساتھ آپ نے اقبالیات کا بھی برسوں درس دیا اور اس سلسلے میں آپ کے مضامین "اقبال — شاعر اور فلسفی" کی صورت میں سامنے آئے، بہت خوب صورت کتاب ہے اور آپ نے اسے پروفیسر حمید احمد خاں کے نام انتساب کیا۔ اقبال پر کچھ اور کی توقع بھی، اس کے باوجود آپ سے رہتی ہے۔ اس کا کوئی امکان؟

سید وقار عظیم: وہ کتاب بھی جیسا آپ نے دیکھا مضامین کا مجموعہ ہے۔ اچھا تو اس کتاب کے چھپنے کے بعد بھی میں نے اقبال پر دو تین مضمون لکھے اور وہ "اقبال" رسالے میں چھپے اور خاصے طویل مضمون ہیں۔ بعض موضوعات ہیں جو اب بھی میرے ذہن میں ہیں اور جن کاموں کی تکمیل کا گویا ارادہ رکھتا ہوں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ان موضوعات پر میں مضمون لکھوں اور وہ مجھے یقین ہے کہ مقدار میں اتنے ہو جائیں گے کہ پھر شاید ایک کتاب مرتب ہو جائے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ڈرامے کے فن پر بھی آپ کے مضامین کا ایک مجموعہ بڑی آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے یعنی جو کچھ لکھ چکے ہیں — اور جو سوچ رہے ہوں، وہ دوسری بات ہے۔

سید وقار عظیم: جی ہاں، معین صاحب، وہ آپ نے تو شاید وہی محبت کا جو رشتہ ہے، اُس کی بنا پر یہ بات کہہ دی۔ ڈرامے پر وہ مضامین میری نظر میں بھی ہیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس میں کہیں کہیں خلا ہے۔ اگر وہ خلا پُر ہو جائے مثلاً دو تین مضمون اور لکھے جائیں تو پھر شائد وہ کتاب ایسی ہو کہ طالب علم کے لیے — کیوں کہ اب اسے لوگ عیب سمجھتے ہیں، بعض دفعہ مذاق بھی اڑاتے ہیں کہ وہ "استاد نقاد" تو میں اُستاد نقاد ہونے کو عیب نہیں سمجھتا، اس لیے کہ جو اُستاد نقاد ہے، اُس میں دوسرے نقادوں سے الگ ایک بات یہ ہوتی ہے کہ اُس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ بات کو سمجھا سکے — اور جب بات کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو پہلے خود سمجھتا ہے اور پھر اُسے اپنی سیدھی سادی زبان میں بیان کرتا ہے، تو اس نقطۂ نظر سے میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی فکر کے جو مختلف پہلو ہیں — کیوں کہ میں اقبال کو محض مُفکّر" نہیں، مُفکّر شاعر، بہت بڑا مُفکّر" مانتا ہوں جس نے شاعری کو اظہار کا وسیلہ بنایا اور شاعری کے سارے تقاضے پورے کیے تو اس طرح میں چاہتا ہوں کہ اقبال پر۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: اقبال پر اور ڈرامے کے فن پر، ڈرامے سے متعلق۔

سید وقار عظیم: اچھا، اس طرح اقبال پر اور وہ ڈرامے کے فن پر جو خلا ہے بعض جگہ، تو جن چیزوں کی تکمیل میں نے آپ سے عرض کیا، کہ جن کا ارادہ رکھتا ہوں تو اُس میں وہ پیشِ نظر ہے ڈرامے کے موضوع پر مضامین کا مجموعہ بھی۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: سید صاحب! آپ نے دہلی پولی ٹیکنیک کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ اُس وقت حمید احمد خاں صاحب وہاں موجود تھے تو غالباً مرحوم سے آپ کے دوستانہ تعلقات کی ابتدا وہیں ہوئی ہوگی، لیکن بعد میں بڑے استوار ہو گئے آپ

کے تعلقات اور بہت ہی گہرے مراسم۔ خان صاحب مرحوم بھی آپ کو اپنے مخلص ترین دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ ہم آپ سے باہمی تعلقات کی مختلف نوعیتوں کے بارے میں کچھ زیادہ جاننا چاہتے ہیں کہ کس طرح۔

سید وقار عظیم: بات یہ ہے صدیقی صاحب کہ یہ صحیح ہے کہ حمید احمد خاں صاحب سے جس طرح کے تعلقات میرے رہے، ان کی عمر سمجھیے کہ اب تیس سال سے بھی زیادہ ہے، تو خود میں جو کچھ سمجھتا ہوں اس سے قطع نظر، وہ جب کبھی ذکر کرتے تھے اور بات کرتے تھے تو وہ یہی سوچتے تھے کہ ان کے جو دو بڑے بھائی اس وقت ہیں، ان کے علاوہ تیسرا میں بھی ہوں۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کوئی سرکاری دستاویز انھیں مرتب کرنا تھی وہ مرتب کی، ایک بڑے سرکاری افسر کے پاس جب وہ پہنچی اور انھیں دکھائی تو انھوں نے کہا کہ ہاں یہ بہت اچھی ہے، اس پر اور کچھ غور کیجئے اور اپنے دونوں بھائیوں سے مشورہ بھی کیجیے تو اس پر انھوں نے کہا نہیں میرے تین بھائی ہیں، ایک اور بھائی بھی ہے، اس سے بھی مشورہ کروں گا۔ آپ اجازت دیجیے کہ یہ بات، راز کو افشا کرنے کے مترادف تو نہیں سمجھی جائے گی، تو وہاں انہوں نے میرا نام لیا۔ یہ بات خود اس سرکاری افسر نے مجھے بتائی کہ یہ واقعہ اس طرح ہے، تو یہ ان کی شفقت اور میں اگر ان کے قریب ہوا اتنا تو اس میں میرے نزدیک زیادہ دخل ان کی شفقت کو ہے، مہربانیوں کو ہے کہ میری کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے بھی انہوں نے اپنائے رکھا۔

اتفاق ہے کہ ملاقات کی ابتدا جس طرح ہوئی، میرے خیال میں وہی بنیاد بن گئی، ایک مستحکم رشتے کی۔ نام سے تو ان کے واقفیت تھی، غالب پر ان کے کام کی وجہ سے، تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہمارے دفتر میں کسی کام سے آئے ہیں، تو میں نے اندازہ لگایا کہ یہی حمید احمد خاں ہیں — میں گیا اور میں نے السلام علیکم کر کے کہا کہ میں وقار عظیم ہوں، تو میں نے یہ کہا اور انہوں نے معانقہ — تو خود انہوں نے دہرایا کہ آپ کی وہ بے تکلفی اور بے ساختگی مجھے اتنی اچھی لگی کہ خود آئے، بجائے اس کے کہ انگریزی معاشرت ہے کوئی تعارف کرائے، آپ نے خود . . . تو اسی دن سے میں نے یہ محسوس کیا کہ میں آپ کے بہت قریب ہوں اور وہ واقعی پھر صدیقی صاحب! سب سے بڑی وجہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی کے جو رشتے قائم ہوتے ہیں، اس میں، ایک تو کمزوریاں ہر ایک میں ہوتی ہیں، ان کی نوعیت البتہ مختلف ہوتی ہے، تو بھائی اور بہن اور ماں باپ کے رشتے سے الگ دوست کے رشتے میں اگر کہیں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور آدمی اپنے دوست کی کسی برائی کی وجہ سے اسے چھوڑتا ہے تو میں اسے دوستی کا رشتہ نہیں سمجھتا۔ یہ ایک بڑی اہم بات ہے — حمید احمد خاں صاحب نے ہمیشہ یہی کیا اور اپنے متعلق تو میں یہ نہیں کہوں گا، لیکن مجھے تو ان میں کوئی کمزوری نظر ہی نہیں آئی سوائے اچھی باتوں کے — اور کتاب کا انتساب جو میں نے کیا کہ تو وہ انھیں خوش کرنے کے لئے نہیں، بلکہ صحیح جذبے کی طرح — صحیح مسلمان کی جو شان ہے اور مسلمان میں جو اوصاف، اقبال چاہتے

ہیں کہ دیکھیں، وہ مجھے اگر کسی آدمی میں زندہ نظر آئے، یہاں پاکستان میں، تو ———

اگر میں فہرست بناؤں اچھے آدمیوں کی تو سیاسی اختلافات سے قطع نظر، ذاکر صاحب کا نام بھی اُسی فہرست میں آئے گا کہ جو اچھے آدمیوں کی فہرست ہے کہ جو آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں — تو وہ تعلق پھر بھی زندگی میں طرح طرح سے — مثلاً یہ ہوا کہ وہاں دہلی میں جب ملاقات ہوئی، اتفاق سے ہم ایک ہی محلے میں تھے، سرکاری مکان ملا ہوا تھا، ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا۔ کسی تقریب میں حمید احمد خاں صاحب جاتے ہی نہیں تھے، جب تک میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوں — پھر جب کوئی پروگرام ریڈیو کا ہوتا تھا، تو اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی، اگر وہ پروگرام دو یا تین آدمیوں کا ہے تو اُس میں، میں ضرور رہوں — اس رفاقت میں ایک راحت محسوس کی میں نے ہمیشہ — اور وہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بات خاص محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا جی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ مل کے کام کیا جائے، تو یہ چیز پھر زندگی کے مختلف مرحلوں اور مرحلوں پر۔ اس طرح یہاں ماتحتی اور افسری کا رشتہ بھی قائم ہوا، اس میں، میں نے جس بات کا بے حد لحاظ رکھا کہ اُن کی جو شفقت ہے برادرانہ، اُسے الگ رکھ کے انھیں، میں اپنا افسر سمجھوں — تو یہ کہتے تھے کسی دوست کا ذکر کر کے کہ یہ جو آپ نے ایک لکیر کھینچ رکھی ہے ذاتی تعلقات میں اور منصبی تعلقات میں، یہ بڑی مشکل ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو دوسروں کو بھی دیکھنی چاہیے۔ اس طرح کی باتیں۔

پھر وہ بڑے حساس تھے۔ آپ کو صدیقی صاحب اس کا اندازہ ہوگا زیادہ — تو مجھے یہ معلوم تھا بعض اوقات اِس، گویا احساس کی شدت کی بنا پر اس کا جو ردّ عمل ہوتا تھا، بڑا شدید ہوتا تھا۔ دوسرے اس ردِ عمل کے معنی غلط سمجھتے تھے اور مجھے اس ردِ عمل میں احساس کی شدت کا چونکہ اندازہ رہتا تھا، اس لیے میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ یہ رَدِ عمل جو ہے دھیما ہو، ہلکا ہو — تو یہ ساری باتیں۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا اور یہ یقین رکھنا کہ ہماری دوستی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی اور کسی طرح کی غلط فہمی کوئی پیدا کرے، کسی طرح کے راستے میں رخنے ڈالے، اس میں کوئی فرق نہ آئے۔ اس طرح کی دوستی اور وہ دونوں طرف سے، عام طور سے تو کہا جاتا ہے کہ ہوتی ہے، لیکن اس دوستی کو میں سمجھتا ہوں کہ یہ یک طرفہ زیادہ ہے اور اس میں اُن کی بڑائی کو زیادہ دخل رہا — انہوں نے مجھے ہمیشہ چھوٹا بھائی سمجھا اور ایک دفعہ جب چھوٹا بھائی کہا تو اسی طرح کا سلوک رکھا بھی۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی : سیّد صاحب! پنجاب یونیورسٹی کے ادارۂ تالیف و ترجمہ سے آپ کا تعلق کتنے عرصے رہا۔ یہ تعلّق کب قائم ہوا اور کتنی مدت تک۔ ؟

سیّد وقار عظیم : یہ ادارہ ۱۹۶۴ء میں قائم ہوا تھا اور یہ بھی اصل میں حمید احمد خاں صاحب کی تحریک پر۔ اُس زمانے میں وہ اسلامیہ کالج (لاہور) کے پرنسپل تھے اور سنڈیکیٹ کے ممبر، تو وہاں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہماری قومی زبان اُردو ہے، اور ہم یہ ارادہ بھی رکھتے ہیں کہ مضامین ڈگری کی سطح پر اُردو میں پڑھائے جائیں، تو اس کی تیاری کچھ کرنی چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اُردو میں کتابیں چھپیں، اصطلاحات بنیں، اِس مقصد سے یہ ادارہ قائم ہوا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : پطرس کے محبوب اور مرشد!

سید وقار عظیم : جی ہاں — تو ایک تبصرہ وہ کرتے تھے، ایک میں کیا کرتا تھا۔ تو اس دوران میں مرزا صاحب سے بھی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور اُن سے بہت کچھ سیکھا — تو وہ تبصرے جو ہیں، معین صاحب! آپ اندازہ لگائیے کہ سات آٹھ سال کی مدت کے تبصرے — جتنے اُس زمانے میں افسانوی ادب سے متعلق اور شاعری سے متعلق اہم مجموعے شائع ہوئے، اُن سب پر دہلی ریڈیو سے میں نے تبصرے کیے، افسوس کہ کچھ بھی محفوظ نہیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی، جب آپ لاہور تشریف لائے ۱۹۵۰ء میں؟

سید وقار عظیم : نہیں، وہ تو اس سے پہلے کراچی میں، کراچی میں بھی جب ۱۹۴۸ء میں آیا تو اس کے فوراً بعد ریڈیو سے تعلق ہوا اور وہاں بھی شروع، اتفاق کی بات ہے کہ تبصروں ہی سے بات ہوئی، اور بعض ادبی موضوعات پر بھی ......

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : یہاں ریڈیو پاکستان کے لاہور کے اسٹیشن پر؟

سید وقار عظیم : لاہور میں پہلا پروگرام، آپ سن کر شاید ہنسیں، میں فروری میں آیا تھا یہاں، پہلی یا دوسری کو۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ۱۹۵۰ء میں۔

سید وقار عظیم : جی۔ ۱۹۵۰ء میں، تو ایک فیچر ہونے والا تھا غالب پر، حمید احمد خاں مرحوم کا، "اسد اللہ خاں تمام ہوا" — میرے سامنے وہ لکھا کرتے تھے، کچھ باتیں واتیں بھی ہوتی تھیں، تو اس میں غالب کا کردار میں نے پہلی مرتبہ کیا!

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ..... کیا؟

سید وقار عظیم : کیا، جی!

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : اچھا، ادا کیا، یعنی پس پردہ بول آپ کے تھے!؟

سید وقار عظیم : جی ہاں! میرے تھے۔ باقی پھر ریڈیو سے جس طرح کا تعلق مجھ جیسے آدمی کا ہو سکتا ہے، علمی اور ادبی موضوعات پر، برابر وہ تعلق .....

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : اس طویل تعلق میں بعض "ریڈیائی" شخصیات سے، اُن کی کارکردگی سے متأثر ہوئے ہوں گے؟

سید وقار عظیم : معین صاحب، وہ فہرست بڑی لمبی ہے اور وہ شروع ہوتی ہے پطرس بخاری سے۔ پطرس بخاری جیسا شخص، اس کا وجود کسی ادارے میں بھی ہو، اسے ایک جلا مل جاتی ہے۔ اُن کی شخصیت میں جو ایک روشنی تھی، واقعی، اور اُن کی طبّاعی، ذہانت اور لیاقت، ان سب چیزوں کا ریڈیو کی تنظیم پر اثر پڑا — چنانچہ دہلی میں جن لوگوں کو جمع کیا، انہوں نے ریڈیو میں — سوچتے چلے جائیے، مثلاً، مولانا حامد علی خاں تھے — نئے لکھنے والوں میں کرشن چندر وہاں تھے، ن۔ م۔ راشد وہاں تھے، اوپندر ناتھ اشک وہاں تھے، میرا جی وہاں تھے اور ایسے ڈھیروں — لوگوں نے پھر وہ پیشہ چھوڑ کے اور دوسرے میدان اختیار کیے۔ کوئی طبّاع، ذہین آدمی جو یونیورسٹی سے پڑھ کے نکلتا تھا [illegible]

ہیں، کہ آدمی کا جی چاہتا تھا کہ وہاں جائے اور بیٹھے وہاں جا کے ــــ ایک خاص طرح کی تہذیبی روایت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم سانسیں لے رہے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: شوکت تھانوی سے بھی تعلق؟

سیّد وقار عظیم: شوکت تھانوی سے تعلق وہاں نہیں ہوا، اس لئے کہ شوکت تھانوی، اُس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ وہ پھر لاہور آئے۔ لاہور میں یہاں عشرت رحمانی تھے۔ شوکت تھانوی تھے اور امتیاز علی تاج تھے، گویا ریڈیو کے تعلق سے بھی اور ویسے بھی شخصی حیثیت میں ڈرامے سے خاص کر اُن کا تعلق، پھر حجاب امتیاز علی، مولانا صلاح الدین احمد مرحوم ــــ اُن کے ساتھ ریڈیو پر بہت پروگرام ہوئے اور اُن کی یاد ایک کسک سی پیدا کرتی ہے کہ اُن کے ساتھ اور زندگی کے دن بسر ہوتے ــــ اور یہاں آنے کے بعد تو، وہ اتنی لمبی ہو گئی واقعی فہرست، جن سے جدائی ہوئی ہے کہ اس کا خیال بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ خلیفہ عبدالحکیم، وہ رئیس احمد جعفری، ایم۔ ایم شریف صاحب۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: ایس، ایم۔ اکرام، مولانا غلام رسول مہر، حکیم حبیب اشعر، عابد علی عابد۔

سیّد وقار عظیم: سالک صاحب کیسے کیسے آپ کہیں گئے۔ نثر میں، نظم میں، تنقید میں اتنا بڑا مرکز تھا یہ لاہور، کہ وہ ایک ایک کر کے اُٹھتے چلے گئے ــــ اور اب ان کا فیض ہے کہ وہ مرکزیت اب بھی لاہور کی اسی طرح قائم ہے۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: یہ تو اکابر کا ذکر کیا آپ نے لاہور کے اس پچیس برس کے ــــ دوسرے نوجوان نسل کے لوگوں میں؟

سیّد وقار عظیم: جی ہاں، خاص طور سے، ایک وہ نسیم الظفر مرحوم، بہت اچھے دوستوں میں اور ریڈیو کے بہت اچھے کارکن ــــ

اب ایک بات: اسے آپ شکایت سمجھ لیجیے یا مجبوری کہ پہلے جی چاہتا تھا کہ ہم یہاں آئیں۔ ریڈیو اسٹیشن جانے کے لیے ایک آدھ آدمی کا تصور رہتا تھا کہ اُس کے پاس جائے بیٹھیں گے۔ اب بدقسمتی سے کوئی ایسا آدمی نہیں کہ میں یہ سوچ سکوں کہ ریڈیو جاؤں گا تو اُس کے پاس بیٹھوں گا۔ اب شخصی کشش باقی نہیں رہی ریڈیو میں۔ اس کی وجہ جو کچھ بھی ہو، لیکن یہ میرا ذاتی احساس ہے، ممکن ہے غلط ہو اور جو صاحبان وہاں (ریڈیو میں) ہیں وہ مجھے معاف بھی کریں، میری اس صاف گوئی پر، لیکن ہے یہ حقیقت۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: نہیں۔ بڑی دردمندی سے آپ نے تو فرمایا، اصل میں ہم عصر شخصیتوں کی بات بھی تو ہے نا، تعلقِ خاطر کی ــــ میں ایک بات اس سلسلے میں اور پوچھنا چاہتا تھا کہ آج اور کل کی نشریات سے وابستہ افراد میں کوئی بہت زیادہ فرق محسوس آپ کرتے ہیں؟ تبدیلی افراد کے آنے سے؟

سیّد وقار عظیم: معین صاحب ایک فرق تو یہ کہ مثلاً دہلی میں ہم تھے تو ایک دن گاڑی آ کے رُکی ریڈیو کی۔ اس میں سے ن م راشد کرشن چندر۔ اوپندر ناتھ اشک، وشوامتر عادل اور ابو سعید قریشی تو یہ سب کے سب آ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ ہم صحن میں بیٹھ گئے، تو کہنے لگے ہم سیریز ڈسکس کرنے آئے ہیں ــــ تو سیریز ڈسکس کرنے کے بہانے سب ادیبوں سے اور لوگوں سے ملا کرتے تھے اور اپنے کام میں جتنا شغف اُن لوگوں کو تھا، اتنا شغف آج کل کے لوگوں میں نہیں ہے۔

آج کل تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس کے گھر ٹیلی فون ہے، اُسے بلا لو پروگرام میں — جس کے ہاں نہیں ہے، اُسے فون زحمت دے — تو اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے، اپنے پروگراموں کی خاطر — ایک بات اور کہ جس دن پروگرام ہوتا تھا، اُس زمانے میں نیا نیا ادیب تھا میں، کوئی بہت بڑا ادیب نہیں تھا، یہ اب بھی نہیں ہوں — لیکن جب مَیں پہنچتا تھا ریڈیو اسٹیشن تو جن صاحب کا پروگرام ہوتا تھا، وہ سیڑھیوں پر کھڑے انتظار کر رہے ہوتے تھے، تو کسی آدمی کو بھی بلائیں اُن کی نظر میں اُس کی اتنی عزت ہوتی تھی کہ وہ اُسے پوری تکریم کے ساتھ اور برابری کے ساتھ — بہرحال یہ ایسی چیزیں ہیں کہ فرق زمانے میں ہُوا ہے اور انحطاط ہُوا ہے ہمارے عام معاشرتی اخلاق میں — اور وہ مجبوریاں بھی بعض ہیں۔ مَیں انھیں قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔ جب آدمی کی زندگی کی اُلجھنیں بڑھ جائیں تو سب ہی کاموں میں اُس کی دلچسپیاں نسبتاً کم ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: اِس سلسلے کا ایک آخری سوال، اب ایک نیا ادارہ اسی نوعیت کا ٹیلی وژن ہمارے ہاں شروع ہُوا ہے اس نے کچھ، یا جیسی چاہیے، توقع تھی، خدمت کی ہے، معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی حوالے سے؟

سیّد وقار عظیم: بات یہ ہے کہ سرکاری ادارے جتنے ہیں، اُن کا سارا کام اُن حدود میں رہ کر ہوتا ہے جو سرکار کی طرف سے مقرر ہوتی ہیں، تو سرکاری اداروں میں، آپ اور مَیں جس طرح کی توقع کرتے ہیں، وہ ریڈیو اور ٹیلی وژن والے شاید نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس میں بعض مصلحتیں حائل ہوتی ہیں، تو یہ ٹیلی وژن کے لیے بھی ہے۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: خاصا وقت ہو گیا۔ چلتے چلتے جی تو یہ چاہتا تھا کہ نئے افسانے کے بارے میں اور نئے افسانہ نگاروں کے بارے میں بہت اختصار سے، جو افسانے کا فن ہے اختصار، آپ سے کچھ بات ہو جاتی۔

سیّد وقار عظیم: مختصر طور پر تو یہ کہ کرشن چندر نے، بیدی نے، منٹو نے افسانے کو جہاں پہنچایا تھا، ابھی وہ اُس سے اونچا نہیں گیا۔ نئے رُخ ضرور اس نے اختیار کئے ہیں اور اس میں بعض نئے پہلو ہیں — نام مَیں اس لئے نہیں لوں گا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ وقت کم ہے — اور میرا ارادہ ہے کہ نئے افسانے پر انشاء اللہ بہت جلد اپنے تأثرات تحریر کی شکل میں پیش کروں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: آپ کے ارادے سے ایک بات، بس بالکل آخری، ذہن میں یہ آتی ہے کہ اب موجودہ مصروفیات یا مشاغل یا عزائم آپ کے، کیا ہیں؟

سیّد وقار عظیم: ایک تو مجلسِ ترقیِ ادب (لاہور) نے کلاسیکی ڈراموں کا ایک سلسلہ امتیاز علی تاج مرحوم سے مرتب کرانا شروع کیا تھا۔ اُن کی زندگی میں چھ جلدیں مرتب ہوئی تھیں۔ اب وہ کام میرے سپرد ہُوا ہے، سات جلدیں مَیں مرتب کر چکا ہوں (یہ چھپ گئی ہیں) باقی آہستہ آہستہ، چوبیس جلدوں کا منصوبہ ہے اور باقی وہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جن کا پہلے مَیں نے آپ سے ذکر کیا، اُن میں لگا رہتا ہوں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن: مجلسِ یادگارِ حمید احمد خاں" کا کام ---

سید وقار عظیم: جی، وہ ہے، اسی طرح زبانِ دفتری، وہاں لغت کی ترتیب کا کام، اس میں تھوڑا بہت وقت دیتا ہوں۔

ناصر قریشی: وقار عظیم صاحب! ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے بڑا قیمتی وقت ہمیں عطا کیا اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب بھی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب بھی شریکِ گفتگو رہے۔ میں آپ سب حضرات کا سینٹرل پروڈکشن یونٹ، ریڈیو پاکستان لاہور کی جانب سے بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سید وقار عظیم: مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سب صاحبان کا شکریہ ادا کروں دل سے، کہ آپ نے میری باتیں اتنی توجہ سے سنیں، شکریہ۔

(لاہور، ۲۰ - جنوری ۱۹۷۵ء)

ندیم نامہ

احمد ندیم قاسمی کی ۶۰ ویں سالگرہ کے موقع پر
ان کی خدمت میں
ایک ادبی دستاویز پیش کی گئی۔ جس میں پاک و ہند
کے تمام ادیبوں نے انھیں خراجِ عقیدت
پیش کیا ہے
یہ دستاویز محمد طفیل اور بشیر موجد نے مرتب کی اور اس
مجموعے میں احمد ندیم قاسمی کے نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے
قیمت ۵۰ روپے

درِ دل کش

منظور الٰہی کی تحریر میں جتنی زندگی اور خلوص ہے
وہ اُردو کے کم لکھنے والوں کے حصے میں آیا ہے۔
یہی وجہ ہے،
کہ اہلِ علم نے ان کی تحریروں کو چونک کر پڑھا اور
سینے سے لگا لیا۔
پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ختم ہو گیا اور یہ دوسرا ایڈیشن ہے
اس کتاب پر آدم جی ادبی انعام بھی ملا ہے
قیمت دس روپے

ادارۂ فروغِ اُردو، ایبک روڈ انارکلی۔ لاہور
ادارۂ التحریر، کبیر اسٹریٹ اُردو بازار۔ لاہور

(تبصرے)

زرگزشت

مصنف: مشتاق یوسفی۔ صفحات: ۳۳۰۔ کتابت و طباعت: نہایت عمدہ اور خوبصورت قیمت پچیس (۲۵) روپے

ناشر: مکتبہ دانیال۔ کراچی۔ مبصر: میرزا ادیب۔

ڈاکٹر تاثیر کی ایک غزل کا حاصلِ غزل شعر یہ ہے:

اُف وادیٔ جنوں کے وہ پُرپیچ راستے
دیوانگی کو بھی کوئی فرزانہ چاہیے

وادیٔ جنوں کے پُرپیچ راستوں سے گزرنے کے لئے فرزانگی ہی کی ضرورت ہے شاید اس وجہ سے کہ فرزانگی اپنی حدِ آخر پر پہنچ کر دیوانگی ہی کا روپ دھار لیتی ہے اور مشتاق احمد یوسفی نے جو ہمارے لئے صرف مشتاق یوسفی رہ گئے ہیں مزاح نگاری کے جس میدان میں قدم رکھا ہے اس کی پیچیدہ راہیں طے کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کی سنجیدگی چاہیئے — ایک ایسی سنجیدگی جو زندگی کے لطیف و کثیف تجربوں کا زہر کام و دہن میں اتارنے کے بعد کہیں جاکر حاصل ہوتی ہے۔

مشتاق یوسفی کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ ایک بال سے باریک پُل پہ چلے ہیں لیکن ان کے قدم کہیں بھی ڈگمگائے نہیں اور اگر کہیں ڈگمگائے بھی ہیں تو انہوں نے اپنی اس لغزش کو لغزشِ مستانہ بنا دیا ہے جس کا اپنا حسن اور اپنی معنویت بہرصورت برقرار رہتی ہے۔ مگر یہ لغزشِ مستانہ جگر مراد آبادی کی نہیں، اصغر گونڈوی کی ہے جو خود نشاطِ روح کا نتیجہ ہوتی ہے اور دوسروں کے لئے بھی نشاطِ روح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

زیڈ اے بخاری نے اپنی عمر کا طویل حصہ ریڈیو سے وابستگی کے عالم میں گزارا اور جب ریڈیو سے باہر آگئے تو انہوں نے ان حالات و کوائف کی روداد لکھ کر اسے 'سرگذشت' کا نام دے دیا۔ مشتاق یوسفی ابھی دنیائے زر سے باہر نہیں آئے مگر انہوں نے 'زرگذشت' لکھ دی ہے۔ مگر یہ 'سرگذشت' ہو یا 'زرگزشت' دونوں میں ایک قدرِ مشترک موجود ہے اور وہ یہ کہ نہ تو بخاری کی 'سرگذشت' سر سے گزری ہے اور نہ یوسفی کی 'زرگذشت' ہاتھ کی میل سے کوئی واسطہ رکھتی ہے۔ بہر ایک کی روداد اس راہ سے گزری ہے جو سیدھی دل کی طرف جاتی ہے۔ سچ ہی کہا ہے کسی نے دل سے نکلی ہوئی ہر بات دل ہی کا رُخ کرتی ہے۔

'زرگزشت' کے اجزائے ترکیبی پر غور کیا جائے تو دو چار بنیادی باتیں سامنے آجاتی ہیں اور میں مختصراً ان کا ذکر کرتا ہوں۔

مشتاق یوسفی کی ہنرمندی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ تفصیلاً نہیں کہتے بلکہ اسے ایک ڈرامائی موڑ دے کر خود بخندہ زیرِ لب آگے نکل جاتے ہیں۔ یہ ان کے اسلوب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مثلاً دیکھئے:

ایک لفظ 'روکن' کے بارے میں بحث ہو رہی ہے بحث کرنے والا اسے کریہہ لفظ گردانتا ہے اور اس امر پہ

رضامند ہو جاتا ہے کہ یوسفی صاحب اس لفظ کے صحیح یا غلط [illegible] نے اپنی اہلِ زبان بیگم سے [illegible] یہ فتویٰ اُن کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔

اب یہ واقعہ اُن کی اپنی زبان سے سُنئے:

"میں نے شام کو بیگم سے پوچھا تم نے لفظ 'رد کوں' سُنا ہے؟" بولیں "ہاں ہاں، ہزار بار"۔ جی خوش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سند کو مزید معتبر بنانے کے لئے پوچھا "تم نے یہ لفظ کہاں سُنا۔" بولیں "تمہیں کو بولتے سنا ہے"۔

تفصیل سے پہلو تہی اور ڈرامائی کیفیت کا اظہار ایک اور مقام پر اس انداز میں ملتا ہے۔

'کاک ٹیل' کے ضمن میں ایک صاحب ہدایات دے رہے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"واپسی میں اپنا سارا وزن کار کے بریک پر ڈالے رکھو۔ بجلی کے کھمبے سے کار روکنے سے گریز کرو ورنہ کھمبے گر جائیں۔ تو کتوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

یوسفی کے اسلوب کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مشہور شعروں، مصرعوں اور فقروں میں موقعہ و محل کے اعتبار سے ایک معنی خیز تبدیلی بروئے کار لا کر طنز یا مزاح کا سماں باندھ دیتے ہیں، یہ خصوصیت اُن کی تحریر میں از اول تا آخر چھائی ہوئی ہے اور اس سلسلے میں متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

علامہ اقبال کی ایک غزل کا مصرع ہے ؎

رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

یوسفی نے اسے یوں بدل دیا ہے:

پیشہ بھی ڈھونڈ، سُود کا سودا بھی چھوڑ دے

'قطرہ قطرہ بہم شود دریا' کو 'خدشہ خدشہ بہم شود خطرہ' میں بدل دیا ہے۔

غالب نے کہا ہے "گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی"۔ یوسفی کہتے ہیں: "گر نہیں وصل تو حضرت ہی سہی"۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایک طوائف کے باب میں کہا تھا۔ ع 'سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا'

یوسفی کہتے ہیں۔ 'سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے بیوی کے سوا'

مشہور محاورہ ہے 'مفلسی میں آٹا گیلا'۔ یوسفی آٹا کو جوتا بنا کر فرماتے ہیں 'مفلسی میں جوتا گیلا'۔ ایک جگہ لکھا ہے "جوش کی شہوالخمری"۔ سوانح عمری جب جوش سے متعلق ہو کر شہوالخمری بن جاتی ہے تو بلاغت کے کس مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ اِس کا اندازہ ہر وہ شخص بآسانی کر سکتا ہے جو جوش کی سوانح عمری "یادوں کی برات" پڑھ چکا ہے۔

یوسفی کے ہاں بعض فقرے تو اتنے خوب صورت، تشبیہات اتنی حسین اور استعارات ایسے دلکش ہیں کہ پڑھنے والا انہیں پڑھ کر تڑپ جاتا ہے۔ تحریر کی یہ نادرہ کاری آتش کے زاویۂ نگاہ سے مرصع کاری کہلائی جا سکتی ہے، یہ مرصع کاری ہے یا جدت طرازی یا کچھ اور، اصل میں معجزۂ فن ہے اور یہ معجزۂ فن بڑی جان کاوی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

یوسفی کردار نگاری کا بڑا خوبصورت ڈھنگ جانتے ہیں۔ اپنی 'زرگزشت' میں وہ جن لوگوں سے ملے ہیں۔ یا جن کے ساتھ انھیں کام کرنے کا موقع ملا ہے اور جو کسی نہ کسی حیثیت سے ان کی زندگی میں آتے ہیں ان کے شخصی خدوخال اس طرح واضح کر دیتے ہیں کہ یہ ساری شخصیتیں اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ آموجود ہوتی ہیں۔

ایک شخص کی پہچان بڑا مشکل کام ہے۔ ہر شخص بظاہر عام، نارمل انسان معلوم ہوتا ہے لیکن ہر انسان میں — وہ کتنا ہی نارمل کیوں نہ ہو بعض ایسے خصائص بھی ہوتے ہیں جو اسے دوسرے انسانوں سے الگ کر دیتے ہیں۔ ان خصائص کی پہچان ہی حقیقی معنوں میں ایک شخص کی اصل پہچان ہوتی ہے۔

غالب نے ہر شخص کو ایک 'ورقِ ناخواندہ' کہا ہے اور یہ درست بھی ہے۔ لیکن اس ورق کو پڑھنے کے لئے ایک صاحبِ بصیرت کی نگاہِ حقیقت آشنا و صداقت جو کی ضرورت ہوتی ہے جب ایسی نگاہ مل جائے تو ورقِ ناخواندہ — ورقِ خواندہ بن جاتا ہے۔

یوسفی نے کچھ ایسے ہی اوراقِ خواندہ یعسوب الحسن غوری۔ ڈی سوزا۔ عبادالرحمٰن تالب۔ نحاس پاشا کینجو، چوکیدار فضل دین سیف الملوک خاں، بلیغی اور بینک کے جنرل مینیجر ڈبلیو۔ جی۔ ایچ اینڈرسن کی صورتوں میں پیش کئے ہیں۔

ان میں سے ہر کردار کہیں کہیں ابنارمل ہونے بلکہ اکثر و بیشتر ابنارمل ہونے کے باوجود جیتا جاگتا، کھاتا پیتا، ہنستا بولتا انسان نظر آتا ہے۔ یہ سب کردار بڑے دلچسپ ہیں مگر سب سے مؤثر کردار وہ ہے جس کا ذکر انہوں نے بڑے اختصار کے ساتھ کیا ہے اور یہ کردار ان کے والد گرامی کا ہے۔ جنھیں وہ آخری بار اس وجہ سے نہ دیکھ سکے کہ جب وہ تدفین کے وقت قبرستان میں پہنچے تو میت قبر میں اتاری جا چکی تھی۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ کردار بھی بڑے جاندار، بڑے مؤثر ہیں جو ایک بلی اور اس کے بچوں کے روپ میں آتے ہیں — کتاب میں ایک اور کردار کا نام بھی بار بار آتا ہے اور یہ کردار ہے پروفیسر قاضی عبدالقدوس — مگر یہ کوئی کردار نہیں بن سکا کیونکہ یوسفی نے انھیں احترام اور عقیدت ہی کا احرام پہنائے رکھا ہے اور احترام و عقیدت کا احرام پہن کر کوئی بھی کردار — کردار نہیں بنتا۔

مشتاق یوسفی کی 'زرگزشت' میں ایک شے بافراط پائی جاتی ہے اور ایک شے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ جو شے فراواں طور پر موجود ہے وہ ہے حکمت سے معمور سنجیدگی جو اکثر و بیشتر مزاح کا رنگ اختیار کر لیتی ہے مگر یہ مزاح مزاح کا رنگ اختیار کرے اس کا اپنا حکیمانہ پہلو مجروح نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یوسفی کے ہاں مزاح اور سنجیدگی ایک دوسرے سے اس طرح گلے مل جاتے ہیں کہ کہنا پڑتا ہے ؎

تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اور جو شے ان کی تحریر میں عنقا کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے سطحیت۔ سطح بینی، سطح طرازی ان کے یہاں بالکل نہیں۔ کہیں کہیں میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ابھی بلندی سے چھلانگ لگا کر نیچے کود پڑیں گے — مگر جب دوسرے فقرے پر پہنچا ہوں تو محسوس کیا ہے کہ یوسفی تو اپنی پہلی بلندی سے بھی کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ "مارواڑی رانگڑ" — یہ صفت اپنی ذاتِ والا صفات کے لئے خود انہوں نے استعمال کی ہے — نے ہمارے ادب میں ایک ایسے مزاح کا اضافہ کیا ہے جو ہماری عام مزاحیہ تحریروں سے بہت مختلف ہے اور یہ مزاح بے حکمت نہیں، حکمت افروز اور حکمت آموز بھی!

زرگزشت کسی شخص کی داستانِ زر اندوزی ہرگز نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ کتاب کے متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے زر کے معاملے میں ابو ذر غفاریؓ کا مسلک اپنایا ہے ۔ زرگزشت اصل میں رودادِ مشقت ہے بینک سے وابستہ ایک ایسے دیانتدار ملازم کی جو بینک بند ہو جانے کے بعد بھی اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے روپے ، آنے اور پائیوں کا حساب کرتا ہے اور اس وقت تک گھر جانے کے لئے دروازہ نہیں کھولتا جب تک حساب کتاب کی صحت پر اس کا ضمیر پوری طرح مطمئن نہ ہو جائے ۔ یوسفی مصنف کے الہامی نظریے کے قائل معلوم نہیں ہوتے جبھی تو انہوں نے تخلیقی محنت میں ایک پائی کی بھی کمی نہیں رہنے دی ۔ یہ ان کا اپنا رویہ ہے — اور اس رویے کی صداقت پر مجھے بھرپور یقین ہے ۔

علمی اُردو لغت (جامع)

لغات کسی زبان کا سرمایہ ہوتی ہے ۔ اس سرمائے کے اعتبار سے اُردو زبان میں فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات کو بہت نمایاں حیثیت حاصل ہے صحتِ زبان میں انہیں اب بھی سند کا درجہ حاصل ہے ۔ ان کے ساتھ ساتھ ، اور اُن کے بعد بھی دوسری اور بھی قابلِ قدر لغاتیں مرتب ہوئیں جو اپنے وقت میں بہت جامع تھیں ۔ ان سے زبان میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے ۔

زندہ زبانوں کی یہ علامت ہے کہ ان کا دامن وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا رہتا ہے چنانچہ انگریزی کا تسلط برصغیر پاکستان و ہند میں جو کم و بیش ڈیڑھ سو سال جاری رہا ، تو ان کی زبان کے متعدد الفاظ اُردو میں اسی طرح جذب ہوئے کہ اب تو یہ اُردو زبان ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں ترکی ، عربی و فارسی سے گہرا اور قدیمی رابطہ ہونے کی وجہ سے ان زبانوں کے بہت سے الفاظ و ترکیب اُردو زبان میں شامل ہوئے ۔ جوں جوں اُردو ارتقائی منزلیں طے کرتی جاتی ہے ، نئے نئے الفاظ و تراکیب ، جزوِ زبان بنتے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے لغاتوں کی اہمیت اور ضرورت بڑھتی جا سیاسی ، فکری اور تہذیبی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنس و دیگر علوم شعر و ادب کی تنقید اور صحافت کی بدولت لغاتوں کی اہمیت میں اضافہ ہوا ۔ اب ضرورتاً پاکستان کے انتظامی محکموں کے اصطلاحاتِ خاص کے فرہنگ بھی منظرِ عام پر آ رہے ہیں مختلف علوم سے متعلق ذاتی کوششوں بھی قانون اور دیگر علوم کے قاموس شائع ہو چکے ہیں ۔ زبان و ادب کے لیے یہ کوششیں فالِ نیک کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ حال ہی میں علمی کتاب خانہ اُردو بازار لاہور نے بہت جامع اور محیط علمی اُردو لغت شائع کیا ہے جسے تو کہنا چاہیے یہ نہ تو اتنی مفصل ہے کہ کئی جلدوں پر مشتمل ہو اور نہ اتنی مختصر کہ ضرورت کے عام الفاظ بھی اس میں نہ مل سکیں ۔ اسے اگر جامع کہہ دیا جائے تو مناسب ہوگا ۔ اس سے عام قاری کے علاوہ مختلف علوم سے تعلق رکھنے والے طلبائے علم یکساں استفادہ کر سکتے ہیں ۔ اس میں اعرا کا اہتمام بھی کیا گیا ہے جس سے صحیح تلفظ میں بڑی مدد مل سکتی ہے ۔ اُردو میں جو جدید الفاظ رواج پذیر ہو چکے ہیں انھیں بالالتزام شامل کیا گیا ہے ۔ مرتب یہ کوشش قابلِ تحسین ہے ۔ مرتب کو ایسا کوئی دعویٰ نہیں کہ اس میں فنی اصطلاحات بھی آ گئی ہیں لیکن اگر اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا جاتا ا فنی اصطلاحات جو تدریس کے لئے لازم ہیں ، ان میں شامل کر دی جائیں تو اس سے علمی لغاتِ اُردو کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ۔ تاہم یہ ضرور مدِ نظر رکھنی پڑتی ہے کہ کتاب عام خریداروں کی قوتِ خرید سے باہر نہ ہو ۔ مصنف نے یہ کام بڑی خاموشی سے مگر لامثال دیدہ ریزی سے انجام دیا ہے اس کے لئے وارث سرہندی اور [redacted] مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ (ڈاکٹر سید عبداللہ)

165421
29.9.96